جلد ۷، شمارہ ۳

ماہِ نو

جون ۱۹۵۴ء

چندہ سالانہ:- پانچ روپے آٹھ آنے (پاکستان میں) سات روپے (ہندوستان میں) فی کاپی: آٹھ آنے (پاکستان میں) دس آنے (ہندوستان میں)

کچھ اپنی باتیں

یہ ایک بین حقیقت ہے کہ آج کل کے بدلے ہوئے حالات میں تعلیمی اقدار کا بدلنا نہایت اہم ہے۔ پچھلے دنوں کراچی یونیورسٹی کے پہلے جلسۂ تقسیم اسناد کے موقع پر بجا طور پر اس اہم معاملہ کی طرف توجہ دلائی گئی اور یہ کہا گیا کہ یونیورسٹیاں "قدیم و جدید افکار کو پرکھنے کا ترقی یافتہ معمل ہونی چاہئیں، ہمیں ان کے ذریعہ باقاعدہ تحقیق و تنظیم کے ساتھ اخلاقی، معاشری اور ذہنی اصول و حقائق دریافت کرنے چاہئیں اور ایسے آلات و ذرائع پیدا کرنے چاہئیں جن سے علوم جدیدہ کی مضر قوتوں کو نوع انسان کی بہبودی کے لئے استعمال کیا جا سکے۔ اس سلسلہ میں سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ محض علم کی تحصیل اور فروغ کی بجائے ایسے علم کی ترویج ہو جو زندگی کے حقیقی مسائل کو سلجھا سکے۔

ہمارے نظامِ تعلیم کی کامیابی تمامتر ذوقِ تحقیق پر منحصر ہے جس سے ہم زندگی کے بارے میں تازہ بتازہ نو بہ نو اصلیتیں دریافت کر سکیں اور انسان کو اپنی عملی سرگرمیوں کے لئے زیادہ سے زیادہ مفید بنائیں۔ بہ الفاظ دیگر ہماری یونیورسٹیاں محض بیت الحکمت نہیں ہونی چاہئیں بلکہ ایسی تجربہ گاہیں ہونی چاہئیں جہاں ہر قسم کے نظریوں کا امتحان کیا جا سکے۔ علم و حکمت کا بے روح طومار عجائب گھروں کی زینت تو بن سکتا ہے لیکن عملی جد و جہد میں کسی کام نہیں آسکتا۔"

•

تجریدی آرٹ اب اتنا غیر مانوس نہیں رہا جتنا اب سے چند سال پہلے تھا۔ کراچی میں ان دنوں مصوری کی چند دلچسپ نمائشیں منعقد ہوئیں۔ جن سے اس اسلوب کی مقبولیت کا پتہ چلتا ہے۔ اس سلسلے میں دو نوجوان فن کاروں کی نمائشیں خاص طور سے مقبول رہیں۔ پرویز اور شہزاد۔ یہ دونوں مصور تجریدی "تکنیک" کے حامی اور پیرو ہیں، گو ان کے مختلف اور انفرادی اسٹائل ہیں جو الگ الگ پہچانے جا سکتے ہیں۔ فن کے جو نمونے ان مصوروں نے پیش کئے ان کی اہمیت و حیثیت در اصل تجرباتی ہے، لیکن خطوط اور رنگوں کے چونکا دینے والے استعمال سے ان کی جرأت اور اختراع پسندی کا بہ آسانی اندازہ ہو سکتا ہے۔

اس سال حلقۂ اربابِ ذوق، شاخ کراچی کے سالانہ جلسہ میں ایک دلچسپ چیز پیش کی گئی۔ یہ "ڈرامہ خوانی" ہے۔ ظاہر ہے کہ ڈرامہ کو اسٹیج پر پیش کرنے کے لئے بہت کچھ اہتمام کی ضرورت ہے۔ سب سے بڑی مشکل ساز و سامان کی ہے جو آسانی سے میسر نہیں آسکتا۔ "ڈرامہ خوانی" سے یہ مشکل ایک حد تک حل ہو جاتی ہے۔ کیونکہ اس کے لئے کسی سامان، کسی جگہ، اسٹیج، پس منظر، پردہ اور اداکاری کی لمبی چوڑی مشق کی ضرورت نہیں۔ اس کی کامیابی عبارت کو موثر پیرایہ میں ادا کرنے اور مناسب حرکات و سکنات پر موقوف ہے۔ اس طرح اس میں وہ نمائش پیدا نہیں ہوتی جو تھیٹر میں دکھائی دیتی ہے بلکہ اس پر فن کی متانت غالب نظر آتی ہے۔ باذوق ناظرین یقیناً اس قسم کی سنجیدہ پیشکش کو زیادہ پسند کریں گے کیونکہ اس میں اصل کی روح جھلکتی ہے، ہنگامہ آرائی نہیں ہوتی۔

•

اس شمارہ میں دو نوجوان پاکستانی مصوروں کے شاہکار پیش کئے جا رہے ہیں: ناگی اور علی امام۔ ناگی کا طرۂ امتیاز رنگ ہے۔ اور اس کی مصوری کی روح شوخی و پرکاری ہے۔ جو مشاہدہ و احساس کو ایک شعبدۂ رنگ بنا دیتی ہے۔ اس شمارہ میں اس کی جو تصویر شامل ہے اس میں غیر معمولی گویائی، رچاؤ اور حرکت ہے۔ بادلوں کے چھٹنے پر چاند کی دھیمی دھیمی سیمیائی شعاعیں خالی کشتیوں پر بڑی خاموشی سے بکھر رہی ہیں اور اس حسنِ ترتیب کی وجہ سے تصویر بلند اور پر معنی ہو گئی ہے۔

علی امام منظر نگاری کا دلدادہ ہے۔ وہ زندگی اور قدرت کے مناظر کو بڑے واقعاتی پیرایہ میں پیش کرتا ہے۔ اور ہمیں روز مرہ کی چہل پہل اور دھوپ چھاؤں کے آغوش میں لے جاتا ہے۔ اس طرح کہ ہم جانی پہچانی چیزوں میں بھی بلا کی تازگی محسوس کرتے ہیں۔ اس شمارہ میں اس کے جو نقوش شامل ہیں وہ پنجاب کی دیہی زندگی کے آئینہ دار ہیں۔

فنی تخلیق اور درد

محمد حسن عسکری

ایذرا پاؤنڈ نے کہا ہے کہ نقاد کو کچھ سوال ایسے بھی اٹھانے چاہئیں جن کا کوئی جواب نہ دیا جا سکے۔ ان میں سے بعض سوال ایسے بھی ہونے چاہئیں جن سے نہ تو ادیبوں کو کسی قسم کا فوری فائدہ پہنچ سکے نہ ادب کو۔ اسی قسم کا ایک سوال میں نے پچھلی دفعہ اٹھایا تھا، یعنی تخلیقی کام کے ذریعے لکھنے والے کو ذاتی طور سے کتنی تسکین مل سکتی ہے؟ اصل بات تو یہ ہے کہ اس معاملے میں صرف اسی کو بولنے کا حق حاصل ہے جس نے کوئی بڑی چیز تخلیق کی ہو، اور آج اردو ادب کی دنیا میں ایسے آدمی صرف ایک فراقؔ صاحب ہیں۔ لیکن چونکہ بڑے ادیب کے ذہنی عوامل عام آدمیوں سے اتنے مختلف نہیں ہوتے کہ ہم جیسے لوگ ان کے بارے میں کچھ سوچ ہی نہ سکیں۔ اس لئے نفسیات کی مدد سے اس مسئلے کو سمجھنے کی کوشش کی جا سکتی ہے۔ مجھے نفسیات کے متعلق جو تھوڑی بہت معلومات حاصل ہے اس کے بل پر شاید میں کچھ کہنے کی جرأت نہ کرتا۔ لیکن اتفاق سے مجھے اس موضوع پر ڈاکٹر محمد اجمل سے گفتگو کرنے کا موقع مل گیا۔ جن لوگوں سے سقراط نے عقل مندی سیکھی تھی ان کی تو خیر کہیں بھی کمی نہیں ہوتی، لیکن ہمارے یہاں مشکل یہ ہے کہ اگر کوئی ایسی بات آ پڑے جس میں فلسفہ، نفسیات یا عمرانیات کے کسی ماہر سے مشورہ لئے بغیر گزارہ نہ ہو سکے تو ایک آدمی ایسا نہیں ملتا جس کی رائے پر بھروسہ کیا جا سکے۔ لے دے کے اجملؔ صاحب ہیں جن سے مجھے مدد ملتی ہے اور جن کے علم پر مجھے اعتبار بھی ہے۔ شاید ان کی علمیت بھی میرے کام نہ آتی اگر ان کا ادبی شعور پختہ نہ ہوتا، اور انہوں نے بھی اسی قسم کا ادب نہ پڑھا ہوتا جو میں نے پڑھا ہے۔ اسی لئے میں نے انہیں اپنا استاد بنا رکھا ہے۔ غرض ادب کی تخلیق اور فن کار کی ذاتی تسکین کے مسئلے پر تین چار دن تک گفتگو کرنے کے بعد ہم دونوں اسی نتیجے پر پہنچے کہ نفسیاتی نقطۂ نظر سے بھی اس معاملے میں کوئی قطعی فیصلہ ناممکن ہے، کیونکہ ادیبوں میں ہر قسم کے نمونے اور ہر قسم کی شہادتیں ملتی ہیں۔ اگر ہم چاہیں تو نفسیات کی رو سے یہ بات بڑی آسانی سے ثابت کر سکتے ہیں کہ ادب کی تخلیق لکھنے والے کے درد کا مداوا ہے، بلکہ تخلیق کے ذریعے ادیب کی شخصیت نشوونما پاتی ہے۔ ایک زمانے میں کئی انگریزی نقادوں کو ان دونوں چیزوں کا تعلق دکھانے کا خبط ہو گیا تھا، گو ان کا نقطۂ نظر نفسیاتی نہیں تھا، بلکہ متصوفانہ۔ مثلاً مڈلٹن مری اور ہیو آئنسن فوسٹ۔ پھر جب سے یونگ کی نفسیات کو ادیبوں میں مقبولیت حاصل ہوئی ہے یہ رجحان تنقید میں اور بھی نمایاں ہو گیا ہے۔ مثلاً ایلزبتھ ڈریو نے ایلیٹ کے شخصی نشوونما کا پورا خاکہ بنا کے رکھ دیا ہے۔ ایسے نقادوں کا خیال ہے کہ تخلیقی کام فن کار کی شخصیت کو مربوط بناتا ہے۔ ویسے بھی آج سے سوا سو سال پہلے شیلی نے کہہ رکھا ہے کہ شاعر سب سے عقلمند، سب سے عمدہ، اور سب سے زیادہ خوش آدمی ہوتا ہے، اور اگر اس کی اندرونی زندگی پر غور کریں تو سب سے خوش قسمت بھی۔ آئی، اے، رچرڈز نے بھی اس خیال کی تصدیق کی ہے۔ انہوں نے تو ایک مستقل پیمانہ بنا رکھا ہے، ہر چیز کو اسی سے ناپتے ہیں — جبلتوں کی ترتیب اور تنظیم ہو گئی یا نہیں؟ اس نظریے کے حق میں بہت سی باتیں میں بھی طوطے کی طرح دہرا سکتا ہوں۔ لیکن جب فن کاروں کی تخلیقات، اور ان کی ذاتی زندگی کو ملا کر دیکھا جائے تو اس خیال کی حمایت اتنی آسان نہیں رہتی۔ اس لئے فی الحال میں صرف وہ دلائل پیش کروں گا جو اس نظریے کے خلاف جاتے ہیں۔

یوں تو ارتفاع کا نظریہ فرائڈ ہی سے چلا ہے، لیکن اس کے آخری دور کے خیالات کا مجموعی تاثر کچھ اس قسم کا ہوتا ہے ؎

غمِ ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج ۔ شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

(اس شعر میں خوبی یہ ہے کہ مرگ اور سحر ایک بات بن گئے ہیں، اور اس طرح اس میں فرائڈ کا (AMBIVALENCE) والا نظریہ بھی آ گیا ہے) آخری زمانے میں تو فرائڈ یہ کہنے لگا تھا کہ پوری تسکین زندگی میں دستیاب ہی نہیں ہو سکتی، ہر چیز محض ایک بدل ہے، کوئی زیادہ تسلی بخش، کوئی کم تسلی بخش، بلکہ بعض حالات میں تو زندہ رہنے کے لئے اپنے آپ کو فریب دینا لازمی ہو جاتا ہے۔ اسی لئے بعض بڑی تہذیبوں نے افیم کھانے کو زندگی کی ضروریات میں شمار کیا ہے، اور یہ بات اُن تہذیبوں کی حقیقت پسندی پر دلالت کرتی ہے۔ اس نظریے کے مطابق تو ہم ادب اور فن کو بھی افیم کے زمرے میں شامل کر سکتے ہیں، یعنی ادب کی تخلیق درد کا مداوا نہیں بلکہ درد کو بھلانے کی کوشش ہے۔ خیر، فرائڈ کے خیالات کی ترجمانی اس تیقن کے ساتھ نہیں کرنی چاہیئے۔ اس کا ذہن اتنا ہمہ گیر تھا کہ اس کے یہاں بعض دفعہ متضاد خیالات بھی مل جاتے ہیں۔ اس خیال کو فرائڈ سے زیادہ فرائڈ کے مقلدین نے رواج دیا ہے کہ فن کے ذریعے جبلتیں ارتفاع پاتی ہیں، اور جو تسکین زندگی میں حاصل نہیں ہو سکتی وہ ادب کے ذریعے مل جاتی ہے۔ اس نظریے پر رائخ نے یہ اعتراض کیا ہے کہ اگر بھوک بھی جبلتوں میں شامل ہے تو اس کا ارتفاع کس طرح ہوتا ہے؟ بھوکا آدمی کھانا نہیں کھائیگا تو مر جائیگا۔ کھانے کا کوئی بدل نہیں ہو سکتا۔ یہ جبلت نہیں، بلکہ حیاتیاتی عمل ہے۔ رہا جنس کے ارتفاع کا مسئلہ، تو رائخ کو اس سے بھی انکار ہے۔ جنس بھی جبلت نہیں، حیاتیاتی عمل ہے۔ اسکی تسکین بھی براہِ راست ہونی چاہیئے۔ اس کے بغیر بھی حیاتیاتی نظام کا عمل ٹھیک طرح جاری نہیں رہ سکتا۔ جنس کے ارتفاع کے بھی کوئی معنی نہیں۔ ارتفاع تو صرف وہ جبلتیں پا سکتی ہیں جن کے مظاہر کو فرائڈ نے (POLY-MORPHOUS PERVERSE SEXUALITY) کہا ہے۔

اس ارتفاع کی گنجائش بھی اس وقت نکلتی ہے جب حیاتیاتی عمل کی حیثیت سے جنس کی براہِ راست تسکین حاصل ہو چکی ہو۔ اس تسکین کا بدل کوئی نہیں۔ جبلتوں کا ارتفاع اسی تسکین کی بنیاد پر شروع ہوتا ہے۔ اس تسکین کے بغیر آدمی جو کام بھی کرے گا اس کی حیثیت ارتفاع کی نہیں بلکہ ردِ عمل (REACTION FORMATION) کی ہوگی۔ حیاتیاتی عوامل کے رک جانے سے جو اضطراب (STASIS ANXIETY) پیدا ہوتا ہے وہ ان سرگرمیوں سے ختم نہیں ہوتا جن کی حیثیت محض ردِ عمل کی ہو۔ ارتفاع کی حالت میں آدمی اپنے کام سے لُطف لیتا ہے، ردِ عمل کی حالت میں یا تو کام بڑی مشکل سے ہوتا ہے یا آدمی ایک مجبوری کے سے عالم میں کام کرتا ہی چلا جاتا ہے، لیکن کام کرنے میں اسے کوئی مزا نہیں آتا۔

رائخ کی اس تصریح کی بنیاد پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ ادب دو طرح کا ہوتا ہے۔ ایک تو ارتفاع کا، دوسرے ردِ عمل کا۔ لیکن ہمیں ادیبوں کی ذاتی زندگی کے متعلق ایسی تفاصیل معلوم نہیں جن کی رو سے یہ فیصلہ کر سکیں کہ فلاں شاعر میں ارتفاع ہو رہا ہے اور فلاں شاعر میں ردِ عمل۔ ارتفاع کی مثال کے طور پر زیادہ سے زیادہ گیٹے کا نام لیا جا سکتا ہے، کیونکہ وہ سکون اور فنی تخلیق کے ذریعے حاصل ہونے والی خوشی کا بہت ذکر کرتا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ گیٹے کی شخصیت میں خود فریبی اور روحانی جارحیت کتنی تھی؟ اپنے روحانی سکون کا ڈھنڈورہ پیٹنا ارتفاع کی علامت نہیں بلکہ یہ خود ردِ عمل کی کیفیت ہے۔ بڑے شاعروں میں سے ایک بودلیئر ایسا ہے جس نے خود تفصیل کے ساتھ بتایا ہے کہ وہ نظمیں کس طرح لکھتا تھا۔ اس کے لئے تخلیقی کام ایک عذابِ جان تھا۔ وہ نظمیں لکھنے سے پہلے پبلشر سے معاوضہ لے لیتا، اور پیسے خرچ کر ڈالتا۔ پھر قرض چڑھنا شروع ہو جاتا، اور قرض خواہوں کے ڈر سے بودلیئر گھر سے نکلنا چھوڑ دیتا، دن رات کمرے میں بند پڑا رہتا۔ آخر جب کوئی چارہ کار نہ رہتا تو نظمیں لکھتا۔ کچھ اسی قسم کا حال ایڈگر ایلین پو کا ہے۔ تیسری مثال مارسل پروست کی ہے جو یا تو بے کار لیٹا رہتا یا پھر مستقل اڑتالیس اڑتالیس گھنٹے سوئے بغیر لکھے چلا جاتا۔ ان سب لوگوں کا تخلیقی کام ردِ عمل کی قسم کا ہے۔ یہاں ایک ادبی سوال پیدا ہوتا ہے۔ کیا ارتفاع کی شاعری ردِ عمل کی شاعری سے قدر و قیمت میں لازمی طور پر بہتر ہوگی؟ اگر بودلیئر کو پورا ارتفاع حاصل ہو جاتا تو کیا وہ اپنے معاشرے کے بارے میں ایسی گراں قدر باتیں کہہ سکتا جن کی بدولت اس کی شاعری کو پیغمبری کا رتبہ حاصل ہوا؟ رائخ تو کہتا ہے کہ ایسے بیماروں کی بھی ایک سماجی قدر و قیمت ہے، یہ لوگ سماجی حقیقت کا ایسا گہرا شعور رکھتے ہیں جو ظاہری طور پر صحت مند لوگوں کو حاصل نہیں ہوتا۔ بقول اجمل صاحب، رائخ کی کتاب پڑھ کے تو یہ جی چاہتا ہے ہم بھی SCHIZOPHRENIC ہوتے۔ تو مطلب یہ کہ اگر شاعری ارتفاع کی نہیں بلکہ ردِ عمل کی ہے تو بھی پڑھنے والوں کے لئے کوئی فرق نہیں پڑتا، ساری مصیبت شاعر کو اٹھانی پڑتی ہے۔ لیکن میرا سوال تو ان لوگوں سے ہے جو شاعری کو تسکین کا وسیلہ یا شخصیت کے ارتقا کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ وہ ردِ عمل والی شاعری کو ادب میں کیا درجہ دیں گے؟

اچھا، ادب کے بارے میں ایک نظریہ تو یہ ہوا جس میں تخلیق کو بلیو ۔کے ارتفاع کا ذریعہ سمجھا جاتا ہے اور ادب زندگی کا قائم مقام بن کے رہ جاتا ہے۔ دوسرا نظریہ وہ ہے جس میں ادب کو خواب کے مترادف سمجھا جاتا ہے۔ ب سوال یہ ہے کہ خواب کیا ہوتا ہے؟ خوابوں کے متعلق ایک مقبول نظریہ یہ ہے کہ ان کے ذریعے محرومیوں کی تلافی ہوتی ہے۔ یعنی خواب میں بھی رتفاع کی ایک کوشش ہوتی ہے، چاہے یہ کوشش اتنی کامیاب نہ ہو جتنی فنی تخلیق۔ ارتفاع والے نظریئے پر تو میں ابھی بحث کر ہی چکا ہوں۔ خوابوں کے متعلق ایک دوسرا نظریہ ہے کہ وہ اپنے بارے میں علم حاصل کرنے کا ایک ذریعہ ہیں۔ لیکن یہ علم ہمیں براہِ راست حاصل نہیں ہوتا بلکہ علامتوں کے ذریعے۔ یعنی خواب لاشعور کے دو رجحانات کے درمیان جھوتے سے پیدا ہوتے ہیں۔ ایک تو اپنے آپ کو جاننے کی خواہش اور دوسرے جاننے کی خواہش۔ پھر ان دونوں خواہشات کے اندر بھی دو متضاد جحانات ہوتے ہیں۔ جاننے میں لذت بھی ہے اور تکلیف بھی۔ اسی طرح جاننے میں بھی ان دو باتوں سے سابقہ پڑتا ہے۔ اس لئے خواب ہو ادب، دونوں لذت اور تکلیف کے تصادم اور آویزش سے پیدا ہوتے یں۔ اگر لکھنے والے کے اندر نہ جاننے کی خواہش غالب ہے تو اسے اپنے لیقی کام میں یقیناً زیادہ تکلیف ہوگی۔ لیکن چونکہ اس کے اندر اعتراف خواہش بھی ساتھ ساتھ کام کر رہی ہے، اس لئے وہ لکھنے پر بھی مجبور ہو گا۔ جیسا میں نے پچھلے مضمون میں کہا تھا، ورڈز ورتھ نے ٹھیک ندازہ لگایا ہے۔ تخلیق کے دوران میں وہ درد پیدا ہوتا ہے جو پہلے بھی نہ اٹھا تھا۔ ادب کے ذریعے لکھنے والے کو اپنے بارے میں م تو حاصل ہوتا ہے، لیکن اس کی قیمت بھی ادا کرنی پڑتی ہے۔ آڈلڈ نے کہا ہے کہ دیوتا نغمے کی بڑی زبردست قیمت وصول کرتے ہیں۔ وہ ت یہی درد ہے۔

خواب (یا ادب) کے بارے میں ایک اور نظریہ ہے۔ خواب عتراف کرنے کی خواہش سے پیدا ہوتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ آدمی عتراف کیوں کرنا چاہتا ہے؟ اس کا ایک جواب یہ ہے کہ اپنے آپ کو یل کرنے یا اپنے آپ کو سزا دینے کے لئے۔ یہ خود اذیتی کا ایک مظہر ہوا۔ ، تخلیق میں آدمی کو جو مزا ملتا ہے وہ بڑے خوفناک قسم کی لذت ہے۔ ن آ کے بات مضحکہ خیز سی ہو جاتی ہے، اسے چھوڑیئے۔ اعتراف راہش کو تھیوڈور رائک نے ایک اور طرح سمجھا ہے۔ اعتراف

کے ذریعے آدمی کسی حقیقی یا خیالی واقعے کو تصور میں دہرا کر لطف اندوز ہونا چاہتا ہے۔ اس حد تک تو آپ کہہ سکتے ہیں کہ ادب کی تخلیق کرنے سے آدمی کو تسکین ملے گی۔ لیکن ایک واقعے یا چند واقعات سے جذباتی طور پر ایسا چپک کے رہ جانا کہ ان کے حقیقی یا خیالی اعادے سے شدید لذت حاصل ہو بذاتِ خود ایک بیماری ہے۔ شخصیت کے ارتقا کا تو مطلب ہی یہ ہے کہ آدمی حقیقی یا خیالی ماضی پر غالب آئے اور اس سے آزادی حاصل کرے۔ اگر ادب اعتراف ہے، اور اعتراف کے معنی ہیں ماضی کا اعادہ، تو فنی تخلیق کے ذریعے شخصیت کا ارتقا کس حد تک ممکن ہے؟

یہاں آپ چھوٹی شاعری اور بڑی شاعری کے فرق کی طرف توجہ دلائیں گے۔ چھوٹا شاعر ایک وقتی تجربے سے مطمئن ہو جاتا ہے، اس کے لئے لمحاتی تسکین بہت ہوتی ہے۔ بڑا شاعر اپنے تجربات کی تنظیم کرتا ہے اس لئے بڑی شاعری کے ذریعے شاعر کی شخصیت بھی منظم ہوگی اور نشوونما پائیگی۔ اس بات پر رچرڈز نے بڑا زور دیا ہے۔ ان کے خیال میں شاعری جتنی زیادہ جبلتوں کی تنظیم کرے گی اور یہ تنظیم جتنی اچھی ہوگی، شاعری بھی اتنی ہی بڑی ہوگی۔ رائخ نے بھی کہا ہے کہ وقتی خود آگاہی تو ذہنی بیماروں کو بھی حاصل ہو جاتی ہے، لیکن اس چیز کی موجودگی یا شدت اتنی ضروری نہیں جتنی خود آگاہی کے ان ٹکڑوں کی تنظیم۔ اسی تنظیم کا نام شعور ہے۔ تو اگر کسی شخص کی شاعری میں تجربات کی تنظیم نظر آئے تو اس نقطۂ نظر کے مطابق ہم یہ سمجھنے میں حق بجانب ہوں گے کہ اس کی شخصیت بھی اس حد تک تنظیم اور نشوونما پا چکی ہے۔ شیلی کی تقلید میں رچرڈز نے بھی یہ تنبیہہ کر دی ہے کہ ایسے لوگوں کی ظاہری نہیں بلکہ باطنی زندگی دیکھیئے، وہاں آپ کو پوری تنظیم ملے گی۔ یعنی اگر اس تنظیم کا اثر خارجی زندگی پر نہ پڑے تو بھی اس کی خوبی میں کوئی فرق نہیں آتا۔ بلکہ رچرڈز نے دبی زبان سے یہ بھی کہا ہے کہ اچھی تنظیم وہی ہے جو خارجی عمل پر نہ اکسائے، بس اندر ہی اندر ساری جبلتیں ایک نقش کی شکل میں مرتب ہو جائیں۔ اسکے برخلاف رائخ نے سارا زور اسی بات پر صرف کیا ہے کہ اندرونی تنظیم اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتی جب تک کہ وہ خارجی حقیقت سے ہم آہنگی نہ پیدا کر لے۔ اس ہم آہنگی میں مشکل یہ پیش آتی ہے کہ موجودہ معاشرہ استحصال اور احتساب کی بنیادوں پر قائم ہے، اس نے کردار اور عمل کا جو ڈھانچہ بنا رکھا ہے اس کے علاوہ کسی اور قسم کی تنظیم کا وہ

ار نہیں۔ اس لئے اگر آدمی اندرونی طور سے تنظیم پیدا کرے تو بھی خارجی دنیا سے متصادم ہوتے ہی ٹوٹنے لگتی ہے۔ اتنی بات تو ز نے بھی تسلیم کی ہے کہ دنیا ایسے لوگوں کی سخت مخالفت کرتی لیکن ان کا خیال ہے کہ یہ تنظیم مخالفت کے باوجود برقرار رہ سکتی۔ رائخ نے بتایا ہے کہ اسے برقرار رکھنا بڑا مشکل کام ہے خصوصاً ادیبوں کے لئے، کیونکہ وہ ایسے رجحانات کو بھی قبول کرکے اپنے م میں شامل کرنا چاہتے ہیں جن سے معاشرہ خائف ہے۔ چونکہ ادیبوں کو ان دونوں چیزوں کے تصادم کا احساس شدید ہے، اس لئے ان کی شخصیت میں انتشار پیدا ہونے کا خطرہ ہر وقت ہے۔ یہاں رائخ نے ویگنر، ابسن، دوستو فسکی، نیٹشے وغیرہ ے فن کاروں کی مثالیں پیش کی ہیں جو اپنی تخلیقات کا شکار ہو گئے۔ بحث کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ فن پارے میں تو ضرور تنظیم ہوگی لیکن ضروری نہیں کہ یہ تنظیم فن کار کی شخصیت کا ایک مستقل حصہ بن جائے زیادہ امکان تو اس بات کا ہے کہ تخلیق کے دوران میں اندرونی یم کا اتنا زبردست تجربہ حاصل کر لینے کے بعد اس کی شخصیت اور جائے جو لوگ فنی تخلیق کو شخصیت کے ارتقا کا ذریعہ سمجھتے ہیں وہ فن اور ن کار کو الگ کرکے نہیں دیکھ سکتے۔ یا پھر جو خوبیاں فن پارے میں ہیں نہیں ن کار کو بخشنا شروع کر دیتے ہیں۔ دوسری کمزوری ان لوگوں میں یہ ہے وہ فن کی عزت تو کرتے ہیں، اگر کسی اور مقصد کے حصول کا ذریعہ سمجھ کر۔ فن کو نہیں دیکھتے بلکہ فن کی افادیت کو۔ وہ رائخ کی طرح یہ نہیں کہہ سکتے۔ خود آگاہی کسی اور مقصد کے حصول کا ذریعہ نہیں۔ بلکہ ہمارے جسمانی نظام کا ایک حیاتیاتی عمل ہے۔ یعنی ہم ادب تخلیق کرتے ہیں تو کسی فائد کے لئے نہیں، بلکہ ادب کی تخلیق ایک حیاتیاتی مجبوری ہے۔

رچرڈز نے ادب کا ایک فائدہ اور بتایا ہے۔ ایک طرف تو ادب کے ذریعے جبلتیں تنظیم پاتی ہیں، دوسری طرف ادیب کی شخصیت کسی جبلت سے نہیں ڈرتی، اُسے دبانے کی کوشش نہیں کرتی، ہر نئی جبلت کو قبول کرتی ہے، اور اس کی خاطر اپنے اندرونی نظام کو بدل دیتی ہے۔ چونکہ ادیب کے اندر اس تنظیم کا سلسلہ برابر چلتا رہتا ہے، اس لئے اعصاب کا تناؤ دور ہوتا رہتا ہے اور اس عمل سے ایک آرام کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ ادب کی تخلیق کا یہ حیاتیاتی فائدہ ہے جو ادیب کی شخصیت ہی کو نہیں بلکہ اس کے جسم کو بھی پہنچتا ہے۔ رائخ نے اپنی نفسیات کی بنیاد اعصاب کے عمل پر نہیں بلکہ ایک طبیعیاتی قوت پر رکھی ہے جس کا نام ہے — "اورگون" اس کے نزدیک صحت مند آدمی وہ ہے جو اپنے اندر "اورگون" کی لہروں کے بہاؤ کو روکے نہیں، بیمار وہ ہے جس کے اندر ان لہروں کی گردش میں کمی آجائے۔ فنی تخلیق اس بات کی علامت ہے کہ آدمی کسی نہ کسی حد تک ان لہروں کو گردش کرنے کی آزادی دے رہا ہے۔ یہاں تک تو رائخ بھی رچرڈز کے خیال کی تائید کرے گا۔ لیکن اس سے آگے بڑھ کے اس نے یہ بھی بتایا ہے کہ ہر آدمی "اورگون" کی صرف ایک مخصوص مقدار کو سہار سکتا ہے، یہ مقدار زیادہ ہوئی اور اس کے ذہنی اور جسمانی نظام میں خلل آیا۔ بڑے فن کار چونکہ "اورگون" کو پوری جرأت کے ساتھ قبول کرتے ہیں، اس لئے انہیں اپنی اس ہمت سے نقصان پہنچنے کا اندیشہ بھی زیادہ ہوتا ہے۔ یہاں پھر رائخ نے ابسن اور نیٹشے وغیرہ کی مثالیں پیش کی ہیں جنہیں "اورگون" کے احساس کی شدت نے پاگل کر دیا۔ غرض خالص حیاتیاتی نقطۂ نظر سے بھی فنی تخلیق کو ہمیشہ اور ہر حالت میں سکون آور نہیں کہہ سکتے۔ یہاں بڑے ادیب اور چھوٹے ادیب کا فرق بھی کوئی معنی نہیں رکھتا۔ فنی تخلیق سے جتنا فائدہ یا نقصان چھوٹے ادیب کو پہنچ سکتا ہے اتنا ہی بڑے ادیب کو بھی رچرڈز صاحب کو آجکل کے افادیت پرست زمانے میں ادب کی اہمیت ثابت کرنی تھی۔ اس لئے انہوں نے لکھنے والوں اور پڑھنے والوں دونوں کو یہ لالچ دلایا ہے کہ میاں، اس میں بڑے نفسیاتی اور حیاتیاتی فائدے ہیں۔ لیکن نفسیات اور حیاتیات کی رو سے آپ تخلیقی عمل میں خوفناک باتیں بھی جتنی چاہے نکال سکتے ہیں۔ فنی تخلیق کو دارالعلم سمجھنے والوں پر مجھے اعتراض یہ ہے کہ انہیں یہ عمل اُس وقت گراں قدر معلوم ہوتا ہے جب اس میں کسی اور قسم کے فائدے کا پہلو نکلتا ہو۔ اس نقطۂ نظر نے آجکل کی بہت سی مغربی تنقید کو خراب کر رکھا ہے۔ اس لحاظ سے ادبی تنقید پر یونگ کے اثرات اچھے نہیں ثابت ہوئے۔ حالانکہ ان لوگوں کا دعویٰ ہے کہ ہم انیسویں صدی کی افادیت پرستی سے بہت آگے نکل آئے ہیں، لیکن بنیادی اعتبار سے ان کا رویہ بھی یہی ہے کہ ایک چیز کے وجود کا جواز کسی اور چیز کے نقطۂ نظر سے ثابت کیا جائے۔ مثلاً جنسی جبلت کا جواز یہ ہے کہ بچے پیدا ہوں۔ بچے پیدا ہونے کا جواز یہ ہے کہ نسلِ انسانی قائم رہے۔

(باقی صفحہ ۶۰ پر)

اقبال کے کلام میں ساقی کی علامتی اہمیت

عابد علی عابد

تمام فنونِ لطیفہ مخصوص اصطلاحات اور علامات سے کام لیتے ہیں۔ ہر صنعت گری کے اسرار و رموز ہوتے ہیں۔ شاعری فنونِ لطیفہ میں غالباً سب سے زیادہ پیچدار، پُراسرار اور دقیق فن ہے۔ اس لئے اسکے رموز، اس کی اصطلاحات اور اس کی علامات بھی نسبتاً زیادہ پیچدار، اور پُراسرار ہیں۔ بات صرف یہیں ختم نہیں ہوتی۔ بلکہ ان مخصوص اصطلاحات کے علاوہ جو ہر صناع، صنعت گری کے سلسلہ میں اقدارِ مشترک کے طور پر استعمال کرتا ہے۔ ہر صنعت گر اور ہر شاعر کچھ علامتیں اور کچھ رموز وضع بھی کرتا ہے، جب تک اس قسم کی علامات اور رموز قاری کے ذہن نشین نہ ہوں، بہت سے اشعار کا مطلب یا تو خبط ہو جاتا ہے یا ٹھیک سمجھ میں نہیں آتا۔ یا جو سمجھ میں آتا ہے وہ بعض اوقات شاعر کے منشا کی عین ضد ہوتا ہے۔

اقبال چونکہ نہایت دقیق مطالب اور پیچدار مسائل سے بحث کرتا ہے۔ اس لئے طبعاً اس کے ہاں رموز و علامات زیادہ ہیں۔ مثال کے طور پر عشق، خبر، نظر، خودی، نسیم سحر، لالہ اور ساقی؛ اقبال کے کلام کی مشہور علامتیں ہیں۔

اُردو اور فارسی کی کلاسیکی روایت میں ظاہر ہے کہ ساقی محفلِ رندان کی زینت ہے، یارانِ بادہ سنج کو شراب پلاتا ہے۔ کبھی کبھی مے فروش اور پیرِ مغاں کا بھی روپ دھارتا ہے کہ یہ سب ساقی گری ہی کے کرشمے ہیں۔ اس عالم میں اسے مغبچہ بھی کہتے ہیں۔ کلاسیکی روایت کا یہ ساقی نہایت شوخ و شنگ اور شریر ہے لیکن ساتھ ہی معجزہ کار بھی ہے۔ میر کہتا ہے:

> کیا آبروئے حضرتِ علامہ لے گیا
> اک مغبچہ اتار کے عمامہ لے گیا

اور جلال کہتا ہے:

> ہے یہ ساقی کی کرامت کہ نہیں جام کے پاؤں
> اور پھر سب نے اسے بزم میں چلتے دیکھا

اس ساقی کے لئے اس ساقی کے ہاتھوں شرفا کی بہت مٹی پلید ہوئی ریاض کا تجربہ یہ ہے:

> وہ کون لوگ ہیں جو مے اُدھار لیتے ہیں
> یہ مے فروش تو پگڑی اُتار لیتے ہیں

اور ذوق پر یہ بیت گئی کہ:

> میکدہ میں کل ہوئی تھی ایک پگڑی رہن مے
> ذوق وہ تیری ہی دستارِ فضیلت ہو تو ہو

اُردو اور فارسی کی کلاسیکی روایت میں آخر تصوف کی بھی صورتوں نے ساقی کے تصور کو بدل دیا اور اس کی ایک علامت اور اہمیت پیدا ہوگئی چنانچہ صوفی شعرا کے ہاں ساقی کو مرکز تسلیم کرکے علامات و کنایات کا ایک سلسلہ قائم کیا گیا جس کی کچھ کڑیاں یہ ہیں۔ ساقی مرشدِ کامل سے عبارت ہے، رند صوفی اور عاشقِ صادق ہے۔ ساغر دل ہے، مے عشقِ الٰہی ہے پیرِ مغاں بھی ساقی ہی کا دوسرا روپ ہے کہ مرشدِ کامل ہے۔ حافظ کا مشہور شعر آپ نے ضرور سنا ہوگا:

> بہ مے سجادہ رنگیں کن گرت پیرِ مغاں گوید
> کہ سالک بے خبر نہ بود زراہ و رسم منزلہا

اور اکبر نے ساقی کی علامتی اہمیت سے کیا خوب فائدہ اُٹھایا ہے:

> تصور عرش پر ہے اور سر ہے پائے ساقی پر
> غرض کچھ اور دھن میں اس گھڑی میخوار بیٹھے ہیں

ساقی کا یہ ترفع اس کی علامتی اہمیت اور ساقی کے مقام کی تجلیل اُردو شعرا میں اقبال سے قطع نظر درد کے ہاں ایسی پائی جاتی ہے کہ باید و شاید۔

دردؔ کہتا ہے ؎

ساقیا یاں لگ رہا ہے چل چلاؤ
جب تک بس چل سکے ساغر چلے

اور وہی کہتا ہے ؎

تر دامنی پہ شیخ ہماری نہ جائیو
دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں

اقبال کے کلام میں ۱۹۰۵ء سے پہلے تک ساقی علامت کے طور پر استعمال نہیں ہوتا تھا۔ اس کلمے کا مفہوم بالکل وہی تھا جو اردو تغزل کی کلاسیکی روایت میں ہے یعنی شراب تقسیم کرنے والا اور نتیجۃً اپنی مشہور غزل میں وہ کہتا ہے ؎

کہوں کیا آرزوئے بے دلی مجھ کو کہاں تک ہے
مرے بازار کی رونق ہی سودائے زیاں تک ہے
وہ مے کش ہوں فروغِ مے سے خود گلزار بن جاؤں
ہوائے گل فراقِ ساقیٔ نا مہرباں تک ہے

اور اسی دور کی غزل کا ایک شعر ہے ؎

مری نگاہ میں وہ رند ہی نہیں ساقی
جو ہوشیاری و مستی میں امتیاز کرے

واضح رہے کہ یہ وہ زمانہ ہے۔ جب اقبال اپنی تلاش میں تھا، اپنی جستجو میں مصروف تھا۔ ابھی اسے اپنی راہ متعین کرنا تھی۔ ابھی تک اس کی فکر کے ریشے اُلجھے ہوئے تھے، ابھی تک وہ ہندو فلسفے سے، ویدانت سے بہت متاثر تھا، مشرق اور مغرب کے دقیق النظر فلسفیوں کی تصانیف کے مطالعہ نے اس کے ذہن کو جلا ضرور بخشی تھی لیکن فکری اور روحانی اُلجھنیں ابھی باقی تھیں۔ ان دنوں گویا وہ روشنی کی تلاش میں سرگرداں تھا، جہاں کہیں شعاعِ نور نظر آتی تھی اسی طرف لپکتا تھا۔ اس کا سیاسی مسلک بھی اس وقت وہی تھا جسے اغیار آج تک پسند کرتے تھے "ترانۂ ہندی" اسی زمانے میں لکھا گیا ہے۔ "تصویرِ درد" اسی دور کی طویل نظم ہے۔ وطنیت کا مغربی تصور ابھی تک اقبال کے ذہن پر چھایا ہوا ہے اور صاف معلوم ہو رہا ہے کہ وہ مغرب کے فلسفیوں اور نکتہ طرازوں سے زیادہ متاثر ہے۔ ۱۹۰۵ء سے لے کر ۱۹۰۸ء تک کا زمانہ وہ ہے جب اقبال کی جستجو جاری ہے لیکن اس کی ذہنی اُلجھنیں بہت حد تک رفع ہو چکی ہیں۔ مغربی تہذیب اور مغربی فلسفہ، جس نے اسے بہت متاثر کیا تھا اس کے عیوب اقبال پر واضح ہو چکے ہیں مغرب کے اقتصادی نظام کا کھوکھلا پن، وطنیت کے تصور کی خرابیاں، فلسفے کی بے ثمری، خرد کی بے بصری، اور قال کی بے لذتی اس پر واضح ہو چکی ہے۔ اس دور میں اس نے ساقی کے قدیم کلاسیکی مفہوم کو بدلا لیکن یہ تغیر بہت واضح نہیں تھا۔ ہاں موجود ضرور تھا۔ اس زمانے کی مشہور غزل؛

زمانہ آیا ہے بے حجابی کا عام دیدارِ یار ہوگا
سکوت تھا پردہ دار جس کا وہ راز اب آشکار ہوگا

میں اس نے بالتصریح تہذیبِ حجازی اور تمدنِ اسلامی کو مشعلِ راہ تسلیم کر لیا۔

۱۹۰۸ء کے بعد اقبال کا مسلکِ فکر اور اس کا پیام بالکل واضح ہوتا چلا جاتا ہے۔ "شکوہ" اور "جوابِ شکوہ" اسی دور میں لکھے گئے ہیں۔ یہی وہ دور ہے جب اقبال نہ صرف اپنے مسلکِ فکر کو متعین کرتا ہے بلکہ اپنے پیچدار اور دقیق مطالب بیان کرنے کے لئے نئی علامتیں اختیار کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ اس دور میں اقبال کے ہاں خالص تغزل یعنی وارداتِ حسن و عشق اور کیفیاتِ ناز و نیاز کا بیان بہت کم ہو جاتا ہے۔ وہ تمام ادب اور وہ تمام اشعار جو روایتی تغزل کی افیون پلا کر ملت کے شیرازے کو پریشان کرنا چاہتے ہیں اس کی نظر میں زوال پذیر اور مہلک ہو جاتے ہیں۔ اس دور میں وہ یہ سمجھتا ہے کہ شاعر کو جو قوتِ تخلیق عطا کی جاتی ہے اس کی غایت یہ نہیں کہ جوانی کی گزری ہوئی راتوں اور ناز و نیاز کی سہانی باتوں کو قلمبند کرے بلکہ اس کا اصل مقصد یہ ہے کہ ہم قوموں کی سوئی ہوئی قوتوں کو بیدار کرے، زندگی بخش عناصر کی تربیت کرے اور زوال پذیر تصورات و تخیلات سے احتراز کرے۔ اس اعتبار سے شاعر کا منصب اور اس کا مقام اقبال کی نظر میں بہت بلند ہو جاتا ہے۔ آپ کو یاد ہوگا میں نے عرض کیا تھا کہ صوفی شعراء کی اصطلاح میں ساقی مرشدِ کامل کو کہتے ہیں۔ ساقی کی یہ علامتی اہمیت اقبال کی نظر میں تھی۔ وہ اس میں کچھ ترمیم کر کے مصلحِ قوم شاعر کو ساقی کہتا ہے ترمیم میں نے اس لئے عرض کیا کہ پیرِ مغاں بھی مصلح ہے لیکن وہ مصلحِ فرد ہے، انفرادی تربیت کرتا ہے، ایک صوفی یا چند صوفیوں کو حقائق سے آشنا کرتا ہے۔ شاعر اقبال کی نظر میں ہماری اجتماعی ہیئت کی اصلاح کرتا ہے اور اجتماع کی حیثیت اور ملت کا مقام فرد کے مقابلے میں ظاہر ہے کہ زیادہ ہے۔ انہی باتوں کو ملحوظ رکھ کر اقبال نے اس شاعر کو جو حقائق کا محرمِ اسرار ہے اور ملت کی اجتماعی

شیرانہ مجدی کرنا چاہتا ہے۔ ساقی کہہ کر پکارا۔ اسی دور میں اقبال پر واضح ہوا کہ اہلِ عالم کی بہتری اسی میں ہے کہ وہ اسی تمدن و تہذیب کی طرف لوٹ جائیں جس کا مرکز حجاز تھا اور جو فیضانِ محمدی کی مرہونِ منت ہے۔ اس دور میں اقبال نے ساقی کی علامت کو مشخص کر دیا اور اس سے خطاب کر کے بالتصریح کہا کہ قوم کا شیرازہ منتشر ہے، اس وقت وارداتِ تغزل کی ضرورت نہیں مسلمانوں کو تمدنِ حجازی کی اہمیت یاد دلانے کی ضرورت ہے، مقامِ محمدیؐ سے آگاہ کرنے کی ضرورت ہے، جنابِ رسالتؐ سے عقیدت پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ اس نے کہا ہے

نشہ پلا کے گرانا تو سب کو آتا ہے
مزا تو جب ہے کہ گرتوں کو تھام لے ساقی
جو بادہ کش تھے پرانے وہ اٹھتے جاتے ہیں
کہیں سے آبِ بقائے دوام لے ساقی
کٹی ہے رات تو ہنگامہ گستری میں تری
سحر قریب ہے اللہ کا نام لے ساقی

غزل کے بعد جو فارسی شاعری کا رنگ ہو گیا تھا اس پر کیسی اچھی تنقید ان اشعار میں ہے۔

میں نے عرض کیا تھا کہ انسان کے فکری سلسلے اور پیمانے بدلتے رہتے ہیں اور نئے نئے قالب میں ڈھلتے رہتے ہیں ۱۹۰۵ء کے بعد اقبال نے اس نہج پر سوچنا شروع کر دیا تھا کہ کیا فلسفے کے دقیق ترین نظام ہمارے روحانی مسائل کا تسلی بخش حل پیش کر سکتے ہیں۔ اور انسان کی تسکین کا باعث ہو سکتے ہیں۔ مغرب کے فلسفے میں ادراک کا منبع حواسِ خمسہ ہیں۔ ہر وہ چیز جو حواسِ خمسہ کے ذریعے پہچانی نہیں جاتی، باطل ہے۔ اس کے علاوہ فلسفے کے ذریعے جو علم ہمیں حاصل ہوتا ہے وہ خود فلسفیوں کے قول کے مطابق نہایت محدود اور نہایت ناقص ہے کیونکہ خود حواسِ خمسہ جن پر سارے چیز کا دار و مدار ہے ناقص ہیں اور یہ بھی ایک متنازعہ فیہ مسئلہ ہے کہ کسی چیز کا علم ہمیں کہاں تک حاصل ہو سکتا ہے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ امام غزالیؒ بھی اسی منزل اور اسی مرحلے سے گزرے ہیں۔ پہلے انہوں نے فلسفے کو اس طرح حاصل کیا کہ فلسفیوں کے امام کہلائے اور پھر جب فلسفے کی موشگافیوں میں تسکینِ قلب کا کوئی سامان نہیں پایا تو فلسفے کو اس طرح مردار ٹھہرایا ہے کہ اپنے زمانے میں فلسفے کے سب سے بڑے دشمن اور تصوف کے سب سے بڑے دوست قرار دئے گئے ہیں۔ اقبال بھی رفتہ رفتہ فلسفہ و حکمت کے تذبذب میں مبتلا کر دینے والے تصورات اور افکار سے پریشان ہو گیا، اب اس نے تصوف کی طرف رجوع کیا اور تصوف سے میری مراد بھی تصوف کی وہ کارفرمائیاں اور ہنگامہ زائیاں نہیں ہیں جنہوں نے اسلامی تعلیمات کو یکسر گدلا کر دیا ہے بلکہ وہ مسلکِ فکر مراد ہے جو دعوے کرتا ہے کہ ادراکِ حقائق کے ذریعے دو ہیں۔ ایک کا سرچشمہ حواسِ خمسہ ظاہری ہیں، ان سے جو معلومات حاصل ہوتی ہیں وہ طبعاً اور عملاً ناقص ہیں۔ دوسرے حواسِ خمسۂ باطنی ہیں، ان سے جو معلومات حاصل ہوتی ہیں وہ درست اور یقینی ہوتی ہیں۔ ظن و تخمین سے بالا ہوتی ہیں۔ یہی وہ دور ہے جب اقبال کو مولانا رومؒ کی ذاتِ گرامی میں وہ تمام صفات نظر آئیں جو تسکینِ قلب کا سامان مہیا کر سکتی ہیں۔ اسی دور میں اقبال نے محسوس کیا کہ مذہبی تجربات اور تصورات بھی انسانی معلومات کا نہایت اہم سرچشمہ ہیں۔ کشف، شہود، وحی، القا، الہام حقیقتیں ہیں اور ان کے ذریعے بھی معلومات ہم پر منکشف ہوتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ کشف اور الہام اور شہود و القا فیضانِ الٰہی کے بغیر ناممکن ہے۔ اس طرف کا اشارہ ہو تب ہی دل کہ مصدرِ فیضان اور مرکزِ تجلیات ہے حقیقت کا ادراک کرتا ہے۔

چاک مت کر جیب بے ایامِ گل
کچھ اُدھر کا بھی اشارہ چاہیئے

اقبال کے خیال میں فیضانِ الٰہی شاملِ حال ہو تو وہ تمام صعوبت سے پُر منزلیں چشم زدن میں طے ہو جاتی ہیں جنہیں فلسفہ صدیوں میں بھی نہیں طے کر سکا۔ گریز پا حقیقت معلوم نہیں ہوتی ہمیشہ منکشف ہوتی ہے۔ علم و خرد حقیقت کو پارہ پارہ کر کے کلیت میں اجزا کا مطالعہ کرتے ہیں کشف اور شہود کہ فیضانِ الٰہی کا ثمر ہے حقیقت کی کلیت کا مشاہدہ کرتا ہے۔ انسان کو دونوں قوتیں بخشی گئی ہیں۔ علم و خرد بھی کہ خبر ہے اور عشق و بصیرت بھی کہ نظر ہے خود اقبال کہتا ہے:–

دل سوز سے خالی ہے نگہ پاک نہیں ہے
پھر اس میں عجب کیا کہ تو بے باک نہیں ہے
ہے ذوقِ تجلی بھی اسی خاک میں پنہاں
غافل تو نرا صاحبِ ادراک نہیں ہے

انسان میں یہ جو عجیب و غریب بات ہے کہ وہ حواسِ خمسۂ ظاہری اور حواسِ خمسۂ باطنی دونوں کے ذریعے معلومات حاصل کر سکتا ہے نظر کو خبر پر اور

خبر کو نظر میں سمو سکتا ہے اس لئے بعض اوقات بڑی سخت الجھنیں پیدا ہوتی ہیں۔ بعض افکار و تصورات، کشف اور الہام کا روپ دھار کر سامنے آتے ہیں۔ اس مقام پر کبھی کبھی انسان خیرہ ہو کر بہک جاتا ہے۔ اپنی کیفیات کا صحیح اندازہ نہیں کر سکتا۔ کبھی انا الحق کہتا ہے کبھی پیغمبری کے دعوے کرتا ہے۔ مختصر یہ کہ یہ بڑا نازک مقام ہے ؎

کھو نہ جا اس سحر و شام میں اے صاحبِ ہوش
اک جہاں اور بھی ہے جس میں نہ فردا ہے نہ دوش
کس کو معلوم ہے ہنگامۂ فردا کا مقام
مسجد و مکتب و میخانہ ہیں مدت سے خموش
صاحبِ ساز کو لازم ہے کہ غافل نہ رہے
گاہے گاہے غلط آہنگ بھی ہوتا ہے سروش

اس تمام تمہید کا مقصد یہ ہے کہ رفتہ رفتہ اقبال کا یہ عقیدہ ہو گیا تھا کہ کشف و بصیرت کے بغیر ادراکِ حقائق ناممکن ہے۔ فیضانِ الٰہی کے بغیر کوئی کام بن نہیں پڑتا۔ "بالِ جبریل" کی پہلی اشاعت ۱۹۳۵ء میں ہوئی ہے۔ اس کتاب کی غزلوں اور نظموں میں اقبال نے ساقی کی علامتی اہمیت میں مزید ترمیم کی اور اس کی معنویت میں اضافہ کیا۔ اس سے پہلے ساقی اس شاعر کی علامت تھا جو زندگی بخش عناصر کے ذریعے ملت کی اجتماعی خدمت کرے۔ ۱۹۳۵ء کے بعد ساقی فیضانِ الٰہی کی علامت قرار پایا اور یہ اس علامت کے تغیر و تبدل کی آخری صورت ہے۔

"بالِ جبریل" میں وہ کہتا ہے ؎

دگرگوں ہے جہاں تاروں کی گردش تیز ہے ساقی
دلِ ہر ذرہ میں غوغائے رستاخیز ہے ساقی
وہی دیرینہ بیماری وہی نامحکمی دل کی
علاج اس کا وہی آبِ نشاط انگیز ہے ساقی
حرم کے دل میں سوزِ آرزو پیدا نہیں ہوتا
کہ پیدائی تری اب تک حجاب آمیز ہے ساقی

اور پھر "بالِ جبریل" ہی میں وہ کہتا ہے ؎

لا پھر اک بار وہی بادہ و جام اے ساقی
ہاتھ آ جائے مجھے میرا مقام اے ساقی
تین سو سال سے ہیں ہند کے میخانے بند
اب تمنا ہے ترا فیض ہو عام اے ساقی

صرف یہی نہیں ساقی کی علامتی اہمیت میں اس تغیر نے اور علامتوں کے معنی بھی بدل دیئے۔ چنانچہ عشق اور بصیرت کے ذریعے کہ وہ ہی فیضانِ الٰہی ہے، جو کیفیات حاصل ہوتی ہیں ان کو حدیثِ رندانہ کہا گیا ہے۔ اقبال کہتا ہے ؎

خرد نے مجھ کو عطا کی نظر حکیمانہ
سکھائی عشق نے مجھ کو حدیثِ رندانہ
نہ بادہ ہے، نہ صراحی نہ دورِ پیمانہ
فقط نگاہ سے رنگیں ہے بزمِ جانانہ
مری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ
کہ میں ہوں محرمِ رازِ درونِ میخانہ
مقامِ عقل سے آساں گزر گیا اقبال
مقامِ شوق میں کھویا گیا وہ فرزانہ

نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ

خلیل الرحمٰن

ویرانے کے مانند ذرا بھی نہیں لگتا

ہر چند کہ ہے شیفتہ دِلی وطن اپنا

وطن کی ویرانی، دِلّی سے بیزاری اور وہ بھی شیفتہ کی زبانی جس قدر عجیب تحیّر خیز بات ہے اسی قدر عبرت انگیز بھی ہے۔ ۱۷۵۷ء سے ۱۸۵۷ء تک کچھ تو غیر ملکیوں کی دست درازیوں اور کچھ اپنوں کی رقابتوں سے برصغیر ہند و پاک غیر ملکی استعمار اور باہمی رلیشہ دوانیوں کا ایک اکھاڑہ بن گیا تھا۔ اس زمانہ میں شاہ عبدالعزیز، شاہ اسمٰعیل شہید اور سید احمد بریلوی ایسی برگزیدہ ہستیاں بھی ظہور میں آئیں جنہوں نے اپنی مساعیٔ جمیلہ ملّتِ اسلامیہ کو تباہی و بربادی سے بچانے پر صرف کیں۔ بالآخر ۱۸۵۷ء میں ہندوستان کے بیشتر حصوں بالخصوص اسلامی تہذیب و تمدن کے مراکز دہلی، رامپور اور لکھنؤ میں ہندوستانیوں نے برطانوی استعمار کے خلاف علمِ جہاد بلند کر دیا۔ دہلی جو شہنشاہِ ہند کا پایۂ تخت تھا۔ اس کا مرکزِ خصوصی ہو کر رہ گیا۔ دہلی کے علماء و مشایخ اور شعراء و ادباء نے جن کے دل میں قومی درد تھا۔ اس جنگِ آزادی میں عملی حصہ لیا۔ ۱۰ مئی ۱۸۵۷ء کو میرٹھ سے انگریزوں کے خلاف نعرہ بلند ہوا۔ اہالیانِ دہلی نے لبیک کہا اور سر بکف میدان میں اُتر آئے۔ انگریزی استعمار سے نجات حاصل کرنے کی آخری جد و جہد کی جس شہر سے ابتدا ہوئی اسی شہر کے ایک نامور شخص نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ پر کیا گزری، کچھ نہ پوچھئے۔ ٹھاکروں نے گھر کا سامان لوٹا، محل میں آگ لگائی، گھر کا سامان تو پھونکا ہی تھا، عمر بھر کا سرمایۂ کلام بھی جلا دیا گیا۔ خوش نصیبی سے نواب یوسف علی خاں والیٔ رامپور نے جو اپنی فوج لے کر دہلی جا رہے تھے۔ راہ میں ان ٹھاکروں سے شیفتہ کو نجات دلائی۔ کچھ عرصہ کے بعد انگریزوں نے حالات پر قابو پالیا تو عمائدینِ شہر پر ظلم ڈھائے گئے۔ صہبائی کو پھانسی دی گئی۔ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کو سات سال تک قیدِ فرنگ میں رہنا پڑا۔ آزردہ کو بھی کچھ عرصہ قید و بند کے مصائب جھیلنے پڑے۔ مولانا فضلِ حق خیر آبادی کو عبورِ دریائے شور کی سزا دی گئی۔ اس موقع پر دہلی کی تباہی اور اسلامی شان و شوکت کی بربادی کے مرثیے اور "شہر آشوب" تقریباً ہر شاعر نے لکھے۔ آزردہ کے "شہر آشوب" کے آخری بند ملاحظہ فرمائیے :۔

روز وحشت مجھے صحرا کی طرف لاتی ہے

سر ہے اور جوشِ جنوں سنگ ہے اور چھاتی ہے

ٹکڑے ہوتا ہے جگر، جی ہی پہ بن جاتی ہے

مصطفیٰ خاں کی ملاقات جو یاد آتی ہے

کیونکر آزردہ نکل جائے نہ سودائی ہو

قتل اس طرح سے بے جرم جو صہبائی ہو

مصطفیٰ خاں سے مُراد یہی مصطفیٰ خاں شیفتہ ہیں۔ دوسرے صاحبان تو دہلی کے اُجڑ جانے کے بعد بھی دہلی ہی میں رہے۔ لیکن شیفتہ پر تو اسکا اس قدر اثر ہوا کہ وہ دہلی ہی چھوڑ کر جہانگیر آباد چلے گئے۔ اس دِلّی کو چھوڑ کر چلے گئے، جس کے لئے کبھی کہا کرتے تھے کہ

عجب ہی شہر ہے دِلّی بھی شیفتہ ہرگز

میں ردم و شام نہ لوں اس دیار کے بدلے

●

وادیٔ نجد کو دِلّی سے نہ دینا نسبت

ہے وہ مجنوں کا بیاباں، یہ بیاباں میرا

نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ نے بھی ایک "شہر آشوب" لکھا جسکے دو شعر یہ ہیں :۔

ہائے دہلی وز ہے دل شدگانِ دہلی
آپ جنت میں ہیں اور دل نگرانِ دہلی
گر نہ کہوں کہ یہ دلّی ہے تو ہرگز نہ پڑھے
دلّی والوں کو بھی دلّی پہ گمانِ دہلی

نواب مصطفٰے خاں شیفتہ نواب عظیم الدولہ سرفراز الملک نواب مرتضٰے خاں بہادر مظفر جنگ کے صاحبزادے تھے۔ ۱۸۰۶ء میں پیدا ہوئے۔ بچپن میں مہابتی مالامال سے عربی فارسی اور دیگر علوم متداولہ کی تحصیل کی۔ حاجی نور محمد دہلوی اور مولوی کرم اللہ محدث دہلوی سے قرأت وحدیث کی تعلیم پائی۔ ۱۲۵۵ھ مطابق ۱۸۳۹ء میں حج بیت اللہ کو گئے۔ حضرت عبداللہ سراج حنفی سے صحاح کے ابتدائی حصے پڑھے۔ مدینہ منورہ میں شیخ عابد سندھی سے حدیث شریف کے خاص خاص مقامات پڑھے۔ صوفی مشرب ہونے کے باوجود محفل سماع سے دُور رہتے تھے۔ تمام عمر متقی اور پرہیزگار رہے۔ پلول کا علاقہ والد کی جاگیر میں ملا۔ اور جہانگیر آباد ضلع بلند شہر کا علاقہ نواب صاحب نے خود خریدا تھا۔ انقلاب ۱۸۵۷ء کے بعد شیفتہ مستقلاً جہانگیر آباد ہی میں اقامت گزیں ہو گئے تھے۔ اُردو میں شیفتہ اور فارسی میں حسرتی تخلص کرتے تھے۔ مشہور ہے کہ اُردو میں مومن اور فارسی میں غالب کے شاگرد تھے۔ ہر ہفتہ باری باری سے آزردہ اور شیفتہ کے یہاں مشاعرہ ہوتا تھا جس میں شہر کے تمام شعراء، علماء اور فضلاء شریک ہوتے تھے۔

شیفتہ کو اُردو اور فارسی دونوں زبانوں پر مکمل دستگاہ حاصل تھی۔ انہیں سخن فہمی کا زبردست ملکہ تھا۔ چنانچہ اُن کے اُستاد مومن نے ان کی سخن فہمی کی تعریف کرتے ہوئے کہا ہے ؎

زتحسین او حسنِ معنی نیاز
ہزار آفریں بر چنیں امتیاز

شیفتہ کی طبیعت بہت ہی متین اور فطین تھی۔ انہوں نے اپنے مطالعہ سے چند نتائج اخذ کئے، جسے ان کا انتقادی کارنامہ کہہ سکتے ہیں۔ ان کا کسی چیز کو اچھا یا بُرا کہنا محض ان کی ذاتی پسند یا ناپسند پر مبنی نہ تھا بلکہ اس کے چند مخصوص منطقی اسباب ہوتے تھے۔ شیفتہ اُردو زبان کے سب سے پہلے ادیب ہیں جنہوں نے سب سے پہلے اُردو زبان میں تنقید کو جگہ دی۔ ان کے یہی نظریات بعد میں ایک فن کی صورت اختیار کر گئے۔ اُس وقت ان کے یہ نظریات قبولیتِ عام سے

فراہمٹ کر واقع ہوئے تھے اور شاعری کے متعلق عام تصورات کے خلاف تھے۔ رفتہ رفتہ شیفتہ نے اپنے معاصرین کو بھی بڑی حد تک اپنے نقطۂ نظر سے ہم آہنگ بنا لیا۔

اکثر تذکرہ نگار حالی کو اُردو زبان کا سب سے پہلا ناقد کہتے ہیں لیکن انہیں یہ فیض اپنے اُستاد شیفتہ سے ہی پہنچا تھا۔ شیفتہ کی مصاحبت نے ہی ان کے تنقیدی نظریات کو اُبھارا تھا۔ جس کا اعتراف حالی نے نہایت صریح الفاظ میں کیا ہے۔ مومن اور آزردہ ان کے تنقیدی نظریات اور معیارِ سخن سنجی کو ایک سند سمجھتے تھے۔ چنانچہ مومن خاں نے اپنے دیوان کا دیباچہ شیفتہ سے ہی لکھوایا۔ آزردہ نے تو شیفتہ کی انہیں صلاحیتوں کی داد دیتے ہوئے یہاں تک کہہ دیا کہ "تنقید کے لئے شیفتہ کا سا ذہن ہونا چاہیئے"۔ غالب نے آزردہ اور شیفتہ کے ہی مشورے سے اپنے دیوان کا انتخاب کیا تھا ؎

غالب بہ فنِ گفتگو نازد بدیں ارزش کہ او
ننوشت در دیواں غزل تا مصطفٰے خاں خوش نکرد

شیفتہ کی تنقیدی صلاحیتیں بہت ہی جلد پختہ ہو گئی تھیں ؎

اے شیفتہ اس فن میں ہوں اک پیرِ طریقت
گو عمر ہے میری ابھی اکیس برس کی

ابھی وہ صرف چھبیس ہی برس کے تھے کہ "گلشنِ بیخار" سا تذکرہ لکھ ڈالا جس کی تقاریظ مومن، آزردہ، غالب، صہبائی، وحشت اور علوی وغیرہ نے لکھ کر خراجِ عقیدت پیش کیا۔ شیفتہ دوسروں پر تنقید کرتے ہوئے ذرا احتیاط سے کام لیتے ہیں۔ صاف کھُل کر نہیں کہتے۔ وہ اس عملی تنقید میں ایسے لیے دبے ہوئے نشتر چبھو جاتے ہیں کہ ان کی خلش بہت دیرپا ہوتی ہے۔ مثلاً جرأت کے متعلق فرماتے ہیں کہ "چوں از اصول قوانینِ ایں فن بہرہ نہ داشت۔ نغمہائے خارج از آہنگ می سرودہ۔ آوازہ اش کہ چوں بلبل دور نہ رفتہ از آں است کہ بہ پذیرائی خاطر و گوارائی طبع اوباش والواط حرف می زدہ"۔

شیفتہ اوباش والواط (کم پڑھے لکھے لوگوں) کے معیارِ سخن فہمی کو اپنی تنقید کی کسوٹی پر بہت کمتر خیال کرتے تھے اور ان کے تصوراتِ شاعری کو پوچ سمجھتے تھے۔ شیفتہ نے جرأت کے بارے میں صرف ایک فقرہ کہہ کر ایجاز کا حق ادا کر دیا ہے۔ شیفتہ نے کبھی کسی شاعر کے اچھے اشعار کو کسی صورت میں بھی نظر انداز نہیں کیا۔ چنانچہ جرأت ہی کے متعلق انہوں نے

یہ بھی کہا ہے کہ اس کے بعض اشعار نہایت خوش ادا اور دلرباواقع ہوئے ہیں۔ شیفتہ نے "گلشن بیخار" میں ہر شاعر کے اچھے اشعار کا انتخاب درج کیا ہے جو ایک خاص نقطۂ نظر کے تحت کیا گیا ہے۔ اس سلسلہ میں انہوں نے دوسرے شعرا اور تذکرہ نگاروں کا تتبع نہیں کیا چنانچہ جرأت کے شاگرد رشید غضنفر کے بارے میں لکھتے ہیں کہ تذکرہ نویسوں کا خیال ہے وہ جرأت کے تمام شاگردوں میں افضل اور ممتاز تھے لیکن مجھے تو کوئی شعر ایسا نظر نہ آیا جس سے اس خیال کو صحیح تسلیم کر لیا جائے۔ یہی نہیں بلکہ شیفتہ نے سودا کی غزل کو قصیدہ پر فوقیت دی جبکہ عام طور سے سودا کے قصیدے کو غزل سے بہتر سمجھا جاتا تھا۔ اس کے بعد قائم کے حال میں لکھتے ہیں کہ بعض ناشناسان سخن نے اس کے اشعار کو سودا کے اشعار کا ہم پلہ ٹھہرایا ہے حالانکہ "از بہرہ اندوزان دانش نباید زیں طرا بافراز فلک بے دانستن و ارباب بصیرت چشم از حق نتوانند بست چگونہ ذرہ را آفتاب می تواں گفت۔ بہرحال قائم در سخن دستگاہے دل پسند دارد"

اسی طرح شیفتہ نے ہر ایک شاعر کا مقام متعین کرنے میں انتہائی احتیاط سے کام لیا ہے۔ لیکن اس کے باوجود نظیر اکبرآبادی کے متعلق انکے دو تین جملے اس زمانہ کی دنیائے ادب میں ایک قیامت بپا کر گئے۔ چنانچہ نظیر کے بارے میں فرماتے ہیں کہ :"گویند کہ نظیر در علم و خلق و انکسار بے نظیر روزگار است۔ بہ تعلیم صبیان بسری برد۔ کہ مدت است کہ ازیں خاکدان بروضۂ رضوان رفت۔ ما شعا طبیار دارد کہ بر زبان سوقیین جاریست۔ دلظر بآں ابیات در اعداد شعراء نشایدش شمرد۔ اما برعایت ابیات منتخب نطع نظر کردہ شد"

نظیر کے ایک شاگرد حکیم قطب الدین باطن نے "گلشن بیخار" کے جواب میں "گلستان بے خزاں" لکھ ڈالی جس میں نظیر کو ہادی الشعراء اور غالب کو اُن کا شاگرد ٹھہرایا۔ باطن کا خیال تھا کہ شیفتہ نے صرف اپنے سات آدمیوں کو چھوڑ کر بقیہ سب کی ہجو ملیح کی ہے۔ چنانچہ باطن نے ان سب آدمیوں کی ہجو کہی۔ جن کی شیفتہ نے مدح کی تھی۔ اور اسکے برعکس شیفتہ نے جنہیں برا کہا تھا۔ باطن نے ان کی تعریف کی۔ قطب الدین شیفتہ کے جس انداز کو ہجو کہتا ہے۔ وہ شیفتہ کا طرۂ امتیاز ہے۔ وہ دبے دبے لہجہ میں بہت کچھ کہہ جاتے ہیں۔ اسی لئے محمد حسین آزاد نے لکھا ہے کہ:

"نواب مصطفےٰ خاں کا "گلشن بیخار" دیکھتا ہوں۔ تو خار کا نہیں کس کا زخم دل پر لگتا ہے؟"

لیکن یہ سب زیادتی ہے۔ بات در اصل یہ ہے کہ شیفتہ کی طبیعت متین ہے۔ انہیں چھچھورا پن اور سوقیانہ انداز بالکل نہیں بھاتا۔

"گلشن بیخار" کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ شیفتہ سب سے پہلے شخص ہیں جنہوں نے اردو زبان و ادب کو تنقید سے روشناس کرایا، اور الفاظ کی شان و شوکت پر مرنے والوں کو ان کے مضامین کی سُبکی کی طرف متوجہ کیا۔ شیفتہ کے کلام میں گرمی اور لذت کے ساتھ ساتھ شکوہِ الفاظ اور چستیٔ ترکیب بھی ہے۔ اس رنگ میں وہ مومن اور غالب سے قریب نظر آتے ہیں۔ مثلاً مومن کے انداز میں شیفتہ کا رنگِ طبیعت ملاحظہ فرمائیے:

سہ : یاں یک حرفِ ملامتٗ واں گراں عرضِ نیاز
سخت جاں میں کب نہ تھا اور نازنیں کو کب نہ تھا

نہ دیا ہائے مجھے لذتِ آزار نے چین
دل ہوا رنج سے خالی بھی تو جی بھر آیا

یاں عجز بے ریا ہے نہ واں نازِ دلفریب
شکوہ بجا رہا گلہٗ بے سبب تلک

کیا جانے گذری غیر پہ کیا اس کی بزم میں
آئے وہ اس طرح کہ مجھے پیار آ گیا

اے اجل نیم نگہ کی تو مجھے مہلت دے
اہلِ ماتم میں یہ چرچا ہے کہ دلبر آیا

کہیں کہیں ناسخ اور آتش کا اسلوب بھی نظر آتا ہے سہ

دیکھیے کہ جدائی میں ہے کیا حال وہ بدظن
اس واسطے شب گھر میں مرے بے خبر آیا

وا رہیں صورتِ آغوش سحر تک آنکھیں
شوقِ ہمخوابیٔ دلدار نے سونے نہ دیا

گھٹا چھائی ہے، لالہ کھل رہا ہے، صبح ہے، مے ہے
عنانِ عزم کیوں گلشن سے بے تاخیر پھرتی ہے

میر کے انداز میں بھی شیفتہ کے اشعار ملاحظہ فرمایئے ؎

شاید اسی کا نام محبت ہے شیفتہ
اک آگ سی ہے سینہ کے اندر لگی ہوئی

مرنے کا نہ میرے ذکر کرنا
تا مجھ وہ بہت الم کریں گے

اظہار عشق اس سے نہ کرنا تھا شیفتہ
یہ کیا کیا کہ دوست کو دشمن بنا دیا

ہائے وہ شیفتہ کی بے تابی
تھام لینا وہ تیرے محمل کو

اور یہ مشہور عام اشعار بھی شیفتہ ہی کے ہیں ؎

اتنی نہ بڑھا پاکیٔ داماں کی حکایت
دامن کو ذرا دیکھ، ذرا بندِ قبا دیکھ

ہم طالبِ شہرت ہیں ہمیں ننگ سے کیا کام
بدنام اگر ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا

شیفتہ کا فارسی کلام بھی کچھ کم درجے کا نہیں۔ فارسی میں مرزا غالب کے شاگرد تھے۔ اور اس شاگردی کو خوب نبھایا۔ ۱۸۴۷ء میں مرزا غالب کو قماربازی کے الزام میں ۶ مہینے کی قید با مشقت اور ۲۰۰ روپیہ جرمانہ کی سزا ہوئی تو ایسی صورت میں مرزا کے اعزہ نے بھی مرزا کی قرابت سے انکار کر دیا تھا۔ احباب بھی کنارہ کش ہو گئے تھے جس کا اظہار خود غالب نے اس شعر میں کیا ہے ؎

بسکہ خویشاں شدہ بیگانہ ز بدنامیٔ من
غیر شگفت خورد گر غمِ ناکامیٔ من

لیکن نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ واحد شخص تھے جنہوں نے کہا کہ "مجھے مرزا سے عقیدت ان کے زہد و اتقا کی بنا پر نہ تھی، فضل و کمال کی بنا پر تھی۔ جوئے کا الزام آج عائد ہوا، شراب پینا تو ہمیشہ سے معلوم تھا۔ پھر اس الزام و گرفتاری سے میری عقیدت کیوں متزلزل ہو جائے۔ گرفتاری کے بعد بھی ان کا فضل و کمال ویسا ہی ہے جیسا پہلے تھا اور مصطفیٰ خاں شیفتہ آئندہ بھی ان کا ویسا ہی گرویدہ رہیگا۔" مرزا غالب نے بھی اس کا اعتراف کیا ہے۔

مصطفیٰ خاں کہ دریں واقعہ غمخوارِ من است
گر بمیرم چہ غم از مرگ، عزادارِ من است

ایک اور جگہ غالب نے شیفتہ کو یاد کیا ہے ؎

وحشت و شیفتہ اب مرثیہ کہویں شاید
مر گیا غالبِ آشفتہ نوا کہتے ہیں

شیفتہ کے فارسی کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو:۔

درحریمِ دلِ اصحابِ صفا جا داریم
وائے آں کس کہ بود در دلِ او کینۂ ما

کارِ ساقی و مغنی ہمہ می کرد حبیب
حسرتی بود چہ خوش صحبتِ دوشینۂ ما

شیفتہ کا دیوان سب سے پہلے ۱۸۵۴ء میں مطبع آئینہ سکندری میرٹھ سے ان کی حیات ہی میں چھپ کر شائع ہوا تھا۔ ۱۲۵۰ھ میں "گلشنِ بیخار" تمام ہوئی۔ ایک فارسی دیوان، ایک اردو دیوان، ایک مجموعہ انشائے فارسی جس میں ۸ خطوط ہیں، ایک سفرنامہ موسوم بہ "ترغیب السالک الی احسن المسالک" جس کا فارسی نام "رہ آورد" ہے اور "گلشنِ بیخار" شیفتہ کی یادگار ہیں۔ سفرنامہ میں شیفتہ نے سفرِ حجاز کے حالات درج کئے ہیں جس کا اردو ترجمہ بھی "سراج منیر" کے نام سے ۱۹۱۰ء میں شائع ہو چکا ہے۔ ۱۹۱۰ء میں شیفتہ کے صاحبزادے نواب اسحٰق نے ان کا اردو و فارسی کلام، ان کے حالات اور ایک دیباچہ کے ساتھ نظامی پریس بدایوں سے شائع کیا۔ شیفتہ نے ۱۸۶۹ء یعنی ۱۲۸۶ھ میں انتقال فرمایا۔

(بشکریہ ریڈیو پاکستان۔ لاہور)

○

اردو نثر کے اسالیبِ بیان

شوکت سبزواری

نثر بھی نظم کی طرح ادب کی ایک شاخ ہے لیکن دونوں کے مزاج میں اختلاف ہے۔ نثر کی افتاد نظم سے کچھ الگ سی ہے عام طور سے نثر پر بحث کرتے وقت نثر کے مزاج اور اس کی طبعی افتاد کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ انگلستان کے مشہور نقاد ہربرٹ ریڈ نے لکھا ہے کہ نظم تخلیق ہے اور نثر تعمیر۔ ادب کا تعلق الفاظ سے ہے لیکن الفاظ کی نوعیت نظم میں اور ہے اور نثر میں اور۔ نظم میں الفاظ خیالات کا پرتو ہوتے ہیں جو خیالات کے ساتھ وجود میں آتے ہیں۔ خیال کے ابھار اور جذبے کے جوش کے ساتھ ہی ذہن کی سطح پر الفاظ ابھر آتے ہیں، جیسے پانی کی موج خیز چھاتی پر ہوا کے زور سے بلبلے۔ لفظ اور خیال کے ابھرنے میں وقفہ نہیں ہوتا۔ نثر بنے بنائے لفظوں کا کھیل ہے۔ یہاں الفاظ پہلے سے ہوتے ہیں جنہیں نثر نگار آگے پیچھے رکھ کر خیال کی عمارت کھڑی کرتا ہے۔ اس لئے مغرب کے جدید نقادوں کی رائے ہے کہ الفاظ نثر نگار کی ذہنی حالت کا تجزیہ کرتے ہیں۔ سوچنے والے کے ذہن میں خیال ٹکڑے ٹکڑے ہو کر نہیں آتا بلکہ ہر تصور، کے ساتھ تصدیق کا دم چھلا لگا ہوتا ہے۔ منطق میں ایک مکمل خیال کو قضیہ PROPOSITION کہتے ہیں۔ سوچنے والا جب خیال کو دوسرے تک پہنچانا چاہتا ہے تو اسے لفظوں کا جامہ پہناتا ہے۔ یہ اظہار ہے۔ نظم و نثر دونوں میں اظہار ابلاغ کے لئے ہوتا ہے کم سے کم ادب میں اظہار کی بڑی اہمیت ہے۔ بعض نقادوں نے نظم و نثر کا فرق کرتے ہوئے لکھا ہے کہ شعر اور نثر میں کیفیت کا فرق ہے جس کی ایک خفیف سی جھلک ہمیں اظہار میں نظر آتی ہے۔ نثر میں اظہار مقابلتًہ زیادہ واضح اور زیادہ روشن ہوتا ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ ایک مکمل خیال کو ایک مکمل لفظی پیکر ہی میں ڈھالا جا سکتا ہے۔ مکمل لفظی پیکر کو ہم جملہ کہتے ہیں جملہ ادب میں اظہار کی اکائی ہے لیکن زبان کی تاریخ (لسانیات) خیال کی تاریخ (منطقیات) سے ذرا مختلف ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ جملہ ناقابلِ تحلیل وحدت ہوا کرتا تھا جس کو جدا جدا لفظوں میں توڑنا ممکن نہ تھا۔ سنسکرت میں لفظوں کے اوپر ایک طویل خط کھینچ کر سب کو جوڑ دیا جاتا ہے یہ شاید اسی قدیم عہد کی روایتی یادگار ہے۔ انسان کی ذہنی ترقی اس کی تجزیاتی صلاحیتوں کے نشو و نما پانے سے ہوئی۔ جوں جوں انسان کا قدم جہالت کی تاریکی سے علم کی روشنی کی طرف بڑھا زبان کے عقدے کھلتے گئے اور جملہ تو رہا ایک طرف الفاظ تک ٹوٹ پھوٹ کر سالموں (مادوں، سابقوں، لاحقوں) میں بٹ گئے۔ آج ایک مکمل خیال کو ایک مکمل اکائی کی صورت میں پیش کرنا ناممکن ہے۔ اس لئے کہ زبان اس کی متحمل نہیں۔ خیال لفظی جامہ پہننے کے ساتھ ہی ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا ہے۔

اس کے علاوہ خیال ذہن میں ایک سادہ قضیہ کی شکل میں ابھرتا ہے جس کے نمو اور ارتقا کا رخ سامنے کی طرف ہوتا ہے۔ یہاں چھوٹے بڑے جملوں کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ جملے تین قسم کے ہیں۔ سادہ۔ مرکب۔ ملتف (پیچیدہ)، سادہ جملہ مفرد لفظوں (کلموں) سے مل کر بنتا ہے اور مرکب دو یا دو سے زیادہ ایک حیثیت کے مفرد جملوں سے جنہیں "اور" "یا" "مگر" وغیرہ حروف سے جوڑ دیا جاتا ہے۔ پیچیدہ جملہ بھی ایک طرح مرکب جملہ ہے لیکن اس کے ترکیبی اجزا ایک حیثیت کے نہیں ہوتے۔ ان میں ایک اصلی اور بنیادی ہوتا ہے۔ باقی فقرے اس کے گرد بُن دئے جاتے ہیں۔ مثلاً وہ گھر سے باہر نکلا اور قتل کر دیا گیا۔ (مرکب)۔ گھر سے باہر نکلا + قتل کر دیا گیا۔

جونہی وہ گھر سے باہر نکلا قتل کر دیا گیا (ملتف) = وہ قتل کر دیا گیا +

جونہی گھر سے باہر نکلا اس خیال کو سادہ جملے میں بھی ادا کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً وہ گھر سے باہر نکلتے ہی قتل کر دیا گیا۔

خیال جیسا کہ میں نے عرض کیا، تاک کی سیدھ ارتقا پاتا ہے۔ ہر خیال کے دو حصے ہوتے ہیں۔ مسند الیہ اور مسند۔ یسپرسن کا بیان ہے کہ جملہ اس وقت وجود میں آیا جب اسم اور فعل یعنی اشیاء اور ان کی صفات میں لوگوں نے فرق کرنا سیکھا۔ جملے کے اجزاء اصلی اس کے یہی دو بازو ہیں جنہیں خیال کے مذکورہ بالا دو حصوں کا خارجی پیکر سمجھنا چاہیئے۔ ذہن میں خیال اول اول انہی دو اجزا کے ساتھ ابھرا۔ یہ اور بات ہے کہ اسم کے ساتھ اس کی کچھ صفات اور فعل کے ساتھ اس کے کچھ متعلقات بھی تھے۔ خیال کے مختلف پہلو کیا ہیں؟ یہی صفات اور متعلقات جو خیال کے ساتھ سطح ذہن پر ابھرے۔ خیال کے اجزا کیا ہیں؟ اس کے اصلی عناصر یعنی مسند الیہ اور مسند۔ آریائی نسل کی زبانوں میں جملے کی ترتیب اس طور پر ہے کہ اول مسند الیہ اپنی تمام صفات کے ساتھ آتا ہے۔ اس کے بعد مسند اور اس کے متعلقات۔ اسے مثال سے سمجھئے۔ غالب کا شعر ہے ؎

نقشِ نازِ بتِ طنّاز بآغوشِ رقیب
پائے طاؤس پئے خامۂ مانی مانگے

اس میں مسند الیہ بت طناز کا نقش ناز ہے جو رقیب کی آغوش میں ہے اور ذیل کے مصرعے میں ؏

مہرِ گردوں ہے چراغِ رہ گزارِ بادیاں

چراغِ رہ گزارِ باد مسند ہے۔ یہ دونوں مقید ہیں، نقش ناز کے ساتھ آغوش رقیب کی قید لگی ہوئی ہے اور چراغ کے ساتھ رہ گزر باد کی۔

عام طور سے لوگ سمجھتے ہیں کہ غالب نے خیال کو اسی طرح ادا کر دیا جیسے وہ ان کے ذہن میں ابھرا، اور اگر وہ اس کو کسی اور طرح ادا کرتے تو یہ ریزہ ریزہ ہو جاتا اور پڑھنے والے کے ذہن میں اس کی تصویر مکمل نہ ہوتی۔ یہ خیال غلط ہے۔ خیال تو اسی وقت تسبیح کے دانوں کی طرح بکھر گیا تھا جب اس نے لفظی جامہ زیب تن کیا اور زبان کے تحلیلی مزاج کی گرفت اس پر سخت ہوئی۔ فن کار خیال کو ٹھیک اسی طرح دیانت کے ساتھ ادا نہیں کر دیتا جیسے وہ اس کے ذہن میں پیدا ہوتا ہے۔ وہ آئینۂ کلام میں ذہن کی چلتی پھرتی تصویریں نہیں دکھاتا۔ اس کا مقصد اظہار و ابلاغ ہوتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ جو اثر کسی واقعہ سے اس نے لیا وہ پڑھنے والے پر بھی ہو اس لئے وہ خیال میں کتر بیونت کر لیتا ہے اور کاٹ چھانٹ کر اس طرح ہمارے سامنے پیش کرتا ہے کہ ہم اس سے اثر لئے بغیر نہیں رہتے۔

ہربرٹ ریڈ نے لکھا ہے کہ چھوٹے چھوٹے جملوں کا سلسلہ حرکت کا سا اثر رکھتا ہے۔ اس لئے کسی عمل یا تاریخی واقعہ کے بیان کا موزوں ترین پیرایہ چھوٹے جملوں کا استعمال ہے۔ بڑے جملے اس موضوع سے مناسبت رکھتے ہیں جس میں سنجیدگی اور فکر کا عنصر غالب ہو۔ جیسے منطق، مابعد الطبعیات، قوانین، سیاسیات وغیرہ۔ لیکن ادیب کو اس بات کا خیال رکھنا چاہیئے کہ جملہ کتنا ہی طویل اور پیچیدہ کیوں نہ ہو اس کی ترکیب سہل بھی ہو اور سادہ بھی۔ ادب کا مقصد اظہار ہے اور غیر معمولی طور سے پیچیدہ جملے اس کی راہ میں رکاوٹ پیدا کرتے ہیں۔

اردو ادب پر فارسی کا گہرا اثر ہے۔ فارسی نثر کی تاریخ بتاتی ہے کہ اول اول فارسی میں چھوٹے چھوٹے جملے لکھے جاتے تھے۔ قدیم فارسی اور پہلوی ادب کی ایک خصوصیت جملوں کا اختصار و ایجاز ہے۔ اسلام کے بعد غزنویہ عہد تک فارسی نثر کا یہ رنگ قائم رہا۔ اس کے بعد غالباً عربی کے اثر سے پیچیدہ جملے لکھنے کا شوق انشا پردازوں میں رونما ہوا۔ یہ رجحان ایران میں صفویوں کے زمانے تک موجود تھا۔ ہندوستان میں اس نے جنون کی شکل اختیار کی۔ نثر ظہوری، پنج رقعہ، مینا بازار قسم کی پیچیدہ انداز میں لکھی ہوئی کتابیں اس کا واضح ثبوت ہیں۔ اردو نثر کا آغاز اگرچہ فارسی کے زیر اثر ہوا لیکن ابتدائی نثر کا سرمایہ تمام تر داستانوں اور عاشقانہ قصوں پر مشتمل تھا جن میں طویل جملوں کی روایت نہیں کھپ سکتی تھی، اس لئے ان میں سادہ اور مرکب جملے لکھے گئے سرسید کے عہد تک یہی ڈھرا رہا۔ سرسید کے زمانے سے اردو نثر میں ایک نیا موڑ آیا۔ ٹھوس اور سنجیدہ موضوعات سے سرسید اور ان کے رفقا کی دلچسپی بڑھی نثر کے اسالیب بدلے گئے۔ اظہار کی راہیں کھلیں۔ اور سرسید، مولوی چراغ علی، نذیر احمد اور مولانا حالی نے خاص طور

موضوعات کی مناسبت سے طویل اور پیچیدہ جملے لکھے لیکن ساتھ ہی اس کا خیال بھی رکھا کہ صفائی، وضاحت اور روش کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹے۔ جدید نثر نگاروں میں سے مہدی، ابوالکلام آزاد (الہلال والے) اور ظفر علی خاں کے یہاں یہ رجحان پایا جاتا ہے۔

اسم کے ساتھ صفاتی الفاظ یا فقرے لانے کا مسئلہ بھی بہت اہم ہے۔ اردو میں اسم کے ساتھ لگاتار کئی صفات بیان کرنے کی صلاحیت بھی ہے۔ چاہے اردو محاورے کے مطابق یہ صفات اسم کے شروع میں ہوں یا فارسی کی طرح آخر میں۔ اردو کے قدیم اور درمیانی عہد کے نثری ادب میں صفاتی کلمات کا استعمال بہت ہوا ہے بلکہ کہیں کہیں صفات کا ایک تانتا باندھ دیا گیا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ کسی اسم کے ساتھ ایک سے زیادہ صفات کا ذکر صحیح ادبی ذوق کے لئے بڑی آزمائش کی چیز ہے اور اس سے جملے کی پرداز میں فرق آتا ہے۔ بقول ایک نقاد کے تیر اسی وقت نشانہ پر آسانی کے ساتھ پہنچتا ہے جب بہت سے پر لگا کر اسے گراں بار نہ بنا دیا گیا ہو۔ مفہوم کی ذہن قاری تک رسائی کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس میں یکے بعد دیگرے صفاتی کلمات کے پن چھلے نہ لگائے جائیں۔

صفت کو ضمنی فقرے کے طور پر موصوف کے بعد لانے سے خیال کے تسلسل اور اس کی فطری ترتیب پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ "اسکول میں پڑھنے والا لڑکا" اور "لڑکا جو اسکول میں پڑھتا ہے" ان فقروں میں کوئی فرق نہیں۔ ان سے تصویر کا ایک ہی رخ سامنے آتا ہے صفت کو جملۂ وصفی کے طور پر بیان کر دینا ایک لحاظ سے بہتر ہے۔ کسی موصوف کو سمجھنے کا فطری طریقہ یہ ہے کہ پہلے اس کی عام تصویر ذہن میں ہو اس کے بعد صفات کی مدد سے اس سے ملتی جلتی تصویروں سے اسے الگ کر لیا جائے۔ یہ فطری اس لئے ہے کہ اس میں ارتقا کا عمل نامعلوم سے معلوم اور عام سے خاص کی طرف ہوتا ہے، جو فطرت کے عام قانون کے مطابق ہے۔

انگریزی میں سبھی کچھ تقلید کے لائق نہیں۔ ہمارے لکھنے والوں نے جو انگریزی ادب سے مرعوب ہیں کچھ ایسے بیان کے پیرائے بھی انگریزی ادب سے لے لئے ہیں جنہیں خود انگریزی نقادوں نے اچھی نگاہ سے نہیں دیکھا۔ مثلاً اسم کے ساتھ ان صفات کا ذکر کرنا جو درحقیقت ان میں پائی نہیں جاتیں۔ جیسے گاتی ہوئی راہیں اور ہنستے ہوئے خواب، یہ بقول ایک نقاد کے بے جان استعارے ہیں۔ استعارے میں جان اس کی ایمائی کیفیت سے پڑتی ہے۔ اگر استعارے تصور کی دنیا آباد نہ کر سکیں تو وہ مردہ اور بے جان ہیں۔ "گاتی ہوئی راہیں" بے جان ہے۔ یہ SINGING STREETS کا لفظی ترجمہ ہے۔ اس کے مقابلے میں "بپھرا ہوا دریا" جاندار ہے۔ اس سے دریا کے جوش اور طغیانی کا تصور روشن ہو کر ذہن میں آتا ہے اور یہی اس کی تصور زائی اور ایمائیت ہے۔

تخیل کے دو تخلیقی کام ہیں جن میں بظاہر تضاد سا ہے۔ یا یوں کہئے کہ ایک کا رخ دوسرے کے خلاف ہے۔ ایک اختلافات میں مماثلت دکھانا۔ دوسرے مماثلات میں اختلاف ڈھونڈھ نکالنا۔ تخیل بھان متی کی طرح ادب میں تخلیقی عمل کا کھیل انہی دو صورتوں میں دکھاتا ہے۔ کسی اسم کو صفت کے ساتھ متصف کرنا مماثل چیزوں میں اختلاف ڈھونڈنا ہے۔ کپڑے مختلف قسم کے ہیں لیکن کپڑے ہیں۔ "سوتی کپڑا" کہنے سے ان میں ہم فرق کرنے لگتے ہیں، اور ان کی دو بڑی قسمیں بن جاتی ہیں۔ سوتی اور وہ جو سوتی نہ ہوں۔ پھر جو سوتی نہیں بظاہر ایک جیسے ہیں۔ ادنیٰ کہہ کر ہم ان کو بھی دو قسموں میں بانٹ دیتے ہیں۔ اگر ہم اختلافات میں مماثلت دکھانا چاہیں تو ہمیں استعارے سے مدد لینی پڑے گی۔ ارسطو نے ادب میں استعارے کی اہمیت دکھلاتے ہوئے لکھا تھا۔

> "استعارے کا استعمال ادیب کی تخلیقی صلاحیتوں کو ظاہر کرتا ہے۔ ایک اچھا اور مناسب استعارہ اس وقت تک ذہن میں نہیں آتا جب تک فنکار مختلف چیزوں میں مماثلت ڈھونڈھ نکالنے کی صلاحیت نہ رکھتا ہو۔" (بوطیقا ۲۲ : ۱۴)

صفاتی الفاظ کا استعمال ایک طرح کا تجزیاتی عمل ہے جس کے ذریعے خیال کو ریزہ ریزہ کر کے پیش کیا جاتا ہے۔ یہ ادب کی مقراض ہے۔ خیال جب تک ذہن میں ہے ایک اکائی ہے۔ صفاتی الفاظ کی مدد سے جب اسے ادا کیا جاتا ہے تو بکھر جاتا ہے۔ ریزہ کاری صفاتی الفاظ کا کام ہے۔ ع

ایک تاریک خانہ، سرد و خموش

فن کار کے ذہن میں گھر، اس کی تاریکی، سردی اور خموشی

سب تصورات ملے جلے تھے۔ مذکورہ بالا مصرعے نے پڑھنے والے کے ذہن میں پہلے گھر کا تصور قائم کیا اور جیسے جیسے اس کی صفات آتی گئیں اس تصور کے ٹکڑے ہوتے گئے۔ اس کے برعکس مشاہدے کی متعدد وحدتوں کو ترکیب دے کر ایک وحدانی صورت میں پیش کرنا استعارہ ہے۔ استعارہ اس اعتبار سے ایک طرح کا پیچیدہ اور مرکب عمل ہے۔ اس میں فجائی کیفیت پائی جاتی ہے۔ وہ بجلی کی لہر ہے جو آناً فاناً ادھر سے ادھر پہنچ جاتی ہے۔ اقبال کا مصرع ہے۔

"فیلِ بے زنجیر کی صورت اڑا جاتا ہے ابر"

اس میں ابر کو فیلِ بے زنجیر قرار دے کر اس کی سیاہی، بڑائی ہنگم پن، تیز رفتاری بھاری بھرکم پن تمام کیفیتیں بہ یک وقت ذہن میں جمع کر دی گئی ہیں جو شاید استعارے (نیز تشبیہ) کے بغیر کبھی اس طرح جمع نہ ہوتیں۔ استعارے کی اس خصوصیت کو سامنے رکھ کر ہی غالباً مغرب کے بعض نقادوں نے لکھا ہے کہ نثر تجزیاتی طرز اظہار کا فن ہے۔ اس کا استعارے سے تعلق نہ ہونا چاہیئے۔ کبھی کبھی استعارہ نثر کے خط و خال کو بگاڑ کر اسے حد سے زیادہ تاریک و باریک بنا دیتا ہے نثر میں براہ راست اظہار ہوتا ہے اور نظم میں بواسطہ یا در پردہ۔ ڈاکٹر جانسن نے سوفٹ کی بابت لکھا تھا کہ وہ استعارے کے جھمیلے میں کبھی نہیں پڑتا۔ استعارے کی دو حیثیتیں ہیں جیسا کہ مڈلٹن مرے نے لکھا ہے نثر صحت اور درستی کا فن ہے۔ اس میں صرف استعارے کی گنجائش ہے جو ایک موزوں اور مناسب صفتی لفظ کا کام دے سکے۔ بہت سے صفاتی الفاظ ایسے ہیں جو کسی قدیم زمانے میں استعارے کا کام دیتے تھے لیکن آج وہ صفت کے طور پر مستعمل ہیں۔ بعض صفاتی کلمات کی تعمیر میں آج بھی استعارے کا تصور کام کر رہا ہے اور ان کی بناوٹ میں تشبیہ کی کارفرمائی پائی جاتی ہے۔ جیسے دودھیا اور بھونرالی۔ دودھیا کے معنی ہیں دودھ کی طرح سفید اور تازہ اور بھونرالی بھونرے کی طرح کالی بھجنگ۔

نثر و نظم کا فرق بتاتے ہوئے میں نے عرض کیا تھا کہ شعر میں اظہار بڑی چیز ہے۔ اظہار و بیان میں بھی فرق ہے۔ چیزوں کو ان کے وضعی ناموں سے پکارنا بیان ہے۔ غزل کی شاعری خالص جذبات کی شاعری ہے اور جذبات کسی نام سے موسوم نہیں ہوتے۔ کالنگ وڈ کہتا ہے۔ اگر تم خوف کے جذبے کو ظاہر کرنا چاہو تو کسی وضعی لفظ مثلاً "خوفناک" وغیرہ سے ظاہر نہ کرو۔ وضعی لفظ جذبے کو ظاہر کرنے کی بجائے اس کو بیان کرتا ہے اور بیان سے زبان و جذبات سرد پڑ جاتے ہیں۔ جذبات کا سرد پڑ جانا ظاہر ہے۔ جذبے میں تیزی، حرارت، اور پیچیدگی ہوتی ہے جس کا پامال قسم کے وضعی الفاظ میں سمونا مشکل ہے۔ فن کے لحاظ سے ہماری شاعری پر اتنا کچھ لکھے جانے کے باوجود ابھی بہت کم لکھا گیا ہے۔ شعر میں الفاظ طلسم کا سا سماں باندھتے ہیں۔ غالب کے یہاں یہ طلسم گنجینہ معانی کا ہے اور میر کے یہاں آتشیں پیکر کا۔ معمولی الفاظ احساس کا اظہار کرتے ہیں، اور علامات سے احساس کی اس ارتقائی منزل کی طرف ہماری رہنمائی ہوتی ہے جہاں احساس پختہ خیال کی صورت اختیار کرتا ہے۔ تخلیقی ادب میں احساس ہی سب کچھ ہے۔ یہ صحیح ہے لیکن احساس جب پختہ خیال کی صورت اختیار کرتا ہے تو نثر وجود میں آتی ہے یہی وجہ ہے کہ دنیا کی ہر ترقی یافتہ زبان کے ادب میں نثر کسی قدر بعد کی پیداوار ہے۔ الفاظ دعویٰ ہی دعویٰ ہیں اور علامات دعویٰ بھی ہیں اور دلیل بھی۔ معمولی الفاظ کی مدد سے فطرت کی عکاسی ممکن ہے ترجمانی ممکن نہیں۔ اور ایک مشہور فنکار کا قول ہے کہ آرٹ عکاسی نہیں ترجمانی ہے۔ میلارمے کہا کرتا تھا کہ کسی شے کو اس کے مروجہ نام سے پکارنا شعر کے تین چوتھائی حسن کو ضائع کر دیتا ہے۔

یہاں استعارے اور تمثیل کا فرق بھی ذہن نشین کر لینا چاہیئے۔ استعارہ ایک لفظ میں ہوتا ہے اور تمثیل ایک سے زیادہ لفظوں میں گویا ایک مسلسل استعارے کا نام تمثیل ہے۔ اردو غزل سے زیادہ شاید ہی کوئی صنف شاعری تمثیل کے لئے موزوں ہو۔ غزل کی اشاریت تمثیل کا ایک بڑا اچھا پردہ ہے۔ جگر کا شعر ہے،

صیاد نے پھونکا تھا عنادل کا نشیمن
صیاد کا گھر جلتے ہوئے دیکھ رہا ہوں

اس میں شاعر نے ایک پورے خیال کو مرکب استعارے کے پیرایہ میں بیان کیا ہے جس کے اجزا صیاد، عنادل، نشیمن، گھر اور اس کا جلنا وغیرہ ہیں۔

نثر ادب کی وسیع ترین صنف ہے جس کا ہر موضوع سے قریب قریب یکساں تعلق ہے۔ اس کا اپنا کوئی موضوع نہیں جیسا کہ لب ولہجہ اس کا اپنا ہے نثر کو ہم عام حالات میں لب ولہجہ ہی سے پہچانتے ہیں۔

(باقی صفحہ ۵۵ پر)

کتاب الاغانی

رئیس احمد جعفری

دنیا کی زبانوں میں عربی وسعت اور جامعیت کے اعتبار سے اپنی مثال آپ ہے۔ الفاظ کی کثرت پر غور کیجئے تو عربی ادب کا ذخیرہ السنہ عالم کے مقابلہ میں بہت ممتاز اور نمایاں ہے۔ اور پھر یہ کثرت صرف اس اعتبار سے قابلِ ذکر نہیں کہ الفاظ کی فہرست بہت طویل ہے۔ فہرست کا بجائے خود طویل ہونا بھی ایک بات ہے، لیکن خاص بات یہ ہے کہ یہ الفاظ مختلف المعنیٰ ہیں۔ پھر ایک بات اور بھی ہے، ایک ایک مفہوم کے لئے بہت سے الفاظ ہیں۔ جن لوگوں نے عربی زبان کی مایۂ ناز کتاب "مقامات" بدیع الزماں ہمدانی" کا مطالعہ کیا ہے، انہیں قدم قدم پر یہ حقیقت واشگاف نظر آئے گی، اور ایک "مقامات" بدیع الزماں ہی پر کیا منحصر ہے، ادب اور محاضرات کی کتابوں میں بہت سی ایسی کتابیں شامل ہیں جو ندرتِ الفاظ و قوافی کے اعتبار سے اپنی نظیر نہیں رکھتیں۔

عربی زبان کی ایک اور عجیب خصوصیت یہ ہے کہ اس کا حال کبھی بھی ماضی سے اپنا رشتہ منقطع نہ کر سکا۔ کوئی عرب، عربی ادب کا اس وقت تک ماہر نہیں تسلیم کیا جا سکتا جب تک وہ ادبی اعتبار سے ماضی اور حال کا جامع نہ ہو۔ اسلام کی نہضت نے عربِ جاہلی کے ادب، تہذیب، ثقافت، معاشرت، رسم و آئین، وضع و طریق، اندازِ فکر و عمل، زبان و ادب، فصاحت و بلاغت ہر چیز میں ایک زبردست انقلاب پیدا کر دیا۔ لیکن اسلام کے عہدِ عروج و ارتقا میں بھی ادبِ جاہلی کا پایۂ استناد برابر قائم رہا۔

پھر عرب اپنے ملک کی تنگنائے سے نکلے، اور ساری دنیا پر چھا گئے وہ جہاں بھی پہونچے۔ اسلام اور عربی زبان کو اپنے ساتھ لیتے گئے۔ رفتہ رفتہ عربی صرف عربوں ہی کی نہیں، بہت سے غیر عربوں کی بھی مادری زبان بن گئی۔ پھر وہ دور آیا کہ عربوں کا عروج ختم ہو گیا۔ بہت سی قوموں کے ساتھ متنوع قسم کے تعلقات قائم کرنے پر وہ مجبور ہو گئے، کہیں محکوم، کہیں نیم محکوم۔ اختلاط و امتزاج کے ایسے مواقع پر ایک زبان دوسری زبان سے ضرور متاثر ہوتی ہے۔ ہر زبان کچھ لیتی ہے کچھ دیتی ہے۔ نپولین، مصر کا فاتح بن کر قاہرہ پہونچا تو وہاں ہمیشہ کے لئے نہیں رہ پڑا۔ تھوڑے ہی دن رہا لیکن اس مختصر سی مدت میں بھی عربی اور فرانسیسی ایک دوسرے سے متاثر ہوئیں۔ فرانسیسی ہمارے دائرۂ بحث سے فی الحال خارج ہے۔ جہاں تک عربی کا تعلق ہے، ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس نے فرانسیسی زبان کے بہت سے الفاظ قبول کر لئے۔ خاص طور پر علمی، سائنسی اور اصطلاحی الفاظ تو بڑی بے تکلفی سے اپنا لئے۔ جدید عربی زبان کا علمی لٹریچر اس شخص کی سمجھ میں قطعاً نہیں آ سکتا جو فرانسیسی زبان کے الفاظ سے ناآشنا ہو۔ بہرحال اس اختلاط و امتزاج نے عربی زبان کا دامن اور زیادہ وسیع کر دیا۔ اس نے صرف فرانسیسی ہی سے نہیں، انگریزی اور دوسری زبانوں سے بھی الفاظ مستعار لئے۔ لیکن "جدید" کی طرف اس تیز رفتاری سے بڑھنے اور لپکنے کے باوجود عربی زبان "قدیم" ادب سے بے نیاز نہیں ہو سکی، مسلمانوں کو چھوڑیئے۔ آج مصر، شام، اور لبنان میں غیر مسلم عربوں کی جو درسگاہیں ہیں، وہاں کی درسی اور نصابی کتابوں میں غیر مسلم عرب مصنفین کی لکھی ہوئی کتابوں میں فصاحت اور بلاغت کا سب سے بڑا معیار قرآن ہی ہے!

دوسری زبانیں غیر زبانوں کے الفاظ لیتے ہوئے جھجکتی ہیں، اور ان کا استعمال اس طرح کرتی ہیں کہ اجنبیت نمایاں ہوئے بغیر نہیں رہتی۔ لیکن عربی زبان اس اعتبار سے بھی یگانہ اور منفرد ہے، معرّب الفاظ کی فہرست بڑی لمبی ہے۔ یعنی وہ الفاظ جو دوسری زبانوں سے عربی زبان میں داخل ہو گئے۔ اور جیسے ہی داخل ہوئے ان پر عملِ تعریب شروع ہو گیا یعنی ان کا حلیہ اس طرح بدلا گیا کہ ان "نو عرب" اور "قدیم عرب" الفاظ

میں کوئی مغائرت نہیں باقی رہ گئی۔ گوشت اور ناخن کا تعلق قائم ہوگیا۔ دونوں میں بغیر بڑے بڑے لغت دیکھے ہوئے یہ امتیاز کرنا مشکل ہے کہ کوئی لفظ عربی ہے یا معرب ہے اور یہ تعریب کا فن کچھ نئے زمانہ کی پیداوار نہیں، عرب جاہلیت میں بھی یہ اصول رائج تھا۔ جب ادباب میں غرق خرج پیمانہ کلہے۔ چنانچہ محققین نے بڑی کاوش، دیدہ کاوی اور عرق ریزی سے ایسے کئی الفاظ تلاش کئے ہیں جو قرآن کریم میں ہیں لیکن خالص عربی نہیں، کسی دوسری زبان سے لئے گئے، معرب ہوئے اور رفتہ رفتہ عرب و عجم کا فرق مٹ گیا!

عربی زبان کی ایک اور خصوصیت جس میں کوئی دوسری زبان اس کی شریک و سہیم نہیں، یہ ہے کہ ہر عرب خواہ وہ کسی مذہب سے تعلق رکھتا ہو عربی کا پرستار ہے، اسے جس طرح اپنے وطن پر فخر ہے، اسی طرح وہ اپنی زبان پر بھی نازاں ہے۔ اس میں مسلمان، عیسائی، قبطی کا سوال کبھی نہیں پیدا ہوا۔ موجودہ زمانہ میں بھی جب بہت سی نئی عصبیتیں پیدا ہوگئی ہیں، یہ کیفیت بدستور قائم ہے۔ آج بھی عربی زبان و ادب کی خدمت جس تندہی اور جاں فشانی کے ساتھ عیسائی کر رہے ہیں، مسلمان ان سے آنکھ نہیں ملا سکتے۔ جو شخص عربی کا حرف آشنا بھی ہے وہ عربی کے مختصر لیکن جامع لغت "المنجد" سے ناواقف نہیں ہو سکتا۔ یہ مصر سے شائع ہوا ہے۔ اور ایک عیسائی کی محنت کا پھل ہے۔ قدیم عربی ادب کے حفظ و بقا کے سلسلہ میں غیر مسلم عرب اہلِ قلم نے جو وقیع اور غیر فانی کارنامے انجام دئے ہیں۔ وہ کبھی بھی فراموش نہیں ہو سکتے۔ خاص طور پر سینکڑوں ہزاروں صفحات کی ضخیم کتابوں کے ایسے منتخبات کہ اپنی طرف سے ایک حرف بھی نہ بڑھایا جائے، صرف اصل کتاب کے غیر ضروری الفاظ حذف کر کے اس کا عطر نکال لیا جائے، زیادہ تر غیر مسلم عرب مصنفین ہی کی کد و کاوش کا نتیجہ ہیں۔ اس طرح نہ صرف یہ کہ عربی زبان کا سرمایہ محفوظ ہوگیا بلکہ قدیم اور جدید ادب کے مابین ربط و تعلق قائم رکھنے کے جذبہ کو اور زیادہ استحکام حاصل ہوگیا۔ مثلاً موجودہ زمانہ میں ہر شخص کے لئے یہ ممکن نہیں کہ "اغانی" کے "طلسم ہوش ربا" جیسے ضخیم مجلدات خریدے اور پڑھے۔ خریدے تو غیر معمولی سرمایہ چاہئے۔ پڑھے تو غیر معمولی وقت درکار ہے۔ اسی اغانی کا خلاصہ "اغانات المثالث والمثالث فی روایات الاغانی" کے نام سے دو حصوں میں شائع ہوا، پہلا حصہ چند سو صفحات پر مشتمل ہے اور صرف روایات ادبی کا مجموعہ ہے، دوسرا روایات تاریخی کا مجموعہ ہے جو

عہدِ قبل از تاریخ کی تاریخ پر مشتمل ہے، یہ وہ تاریخ ہے جو کہانیوں، روایتوں، شعروں اور افسانوں کا لباس پہن کر نمودار ہوتی ہے۔ دونوں حصوں کی افادیت اور اہمیت مسلّم ہے لیکن ان سے عام استفادہ ناممکن تھا۔ اگر ایک مستند اور جامع خلاصہ نہ تیار کر لیا جاتا۔ ہم ہر روز اس حقیقت کو زیادہ نمایاں دیکھ رہے ہیں کہ عربی زبان کے برعکس، اردو زبان کے قدیم اور جدید ادب کے درمیان ناواقفیت، اجنبیت، اور بیگانگی کی ناقابلِ عبور خلیج پیدا ہو چکی ہے جس کی وسعت میں کمی نہیں ہوتی بلکہ مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ صرف اس لئے کہ ہم عملی طور پر اب تک اپنے قدیم اور جدید ادب کے درمیان ربط و تعلق نہیں پیدا کر سکے ہیں۔

عربی ادب میں "اغانی" کو غیر فانی مقام حاصل ہو چکا ہے۔ درحقیقت یہ کتاب عربی لٹریچر کا لعلِ شب چراغ ہے، بظاہر یہ داستانوں اور روایتوں کا مجموعہ ہے، لیکن حقیقتاً اموی اور عباسی عہدِ حکومت کی ایک تصویر گویا ہے۔

اس زمانہ میں فقر و فلاکت کے مفہوم سے بھی لوگ ناواقف تھے۔ بے کاری اور بے روزگاری کا نام بھی نہیں جانتے تھے، عسرت اور بیچارگی کے ذکر سے بھی ان کے کان ناآشنا تھے، دولت کی پیداوار اتنی ہوتی تھی کہ غیر مساوی تقسیمِ دولت کا سوال بھی نہیں پیدا ہوتا تھا۔

بہرحال یہ ایک دور تھا، خلافتِ راشدہ اور حکومتِ الٰہی کے دور سے اگرچہ بالکل مختلف اور متضاد، لیکن دوسرے فرماں رواؤں اور شہنشاہوں کے مقابلہ میں بے انتہا برتر اور بہتر۔ اسی دور کے منظرات کا "کتاب الاغانی" ایک مرقع ہے ؎

گرچہ تھے صفحۂ ہستی پہ ہم اک حرفِ غلط
لیک اٹھے بھی تو اک نقش بٹھا کر اٹھے

ابوالفرج علی بن حسین بن محمد بن احمد بن الہیثم بن عبدالرحمٰن بن مروان بن عبداللہ بن مروان، بن محمد بن مروان بن الحکم بن ابی العاص بن امیہ بن عبد شمس بن عبد مناف قرشی اموی امامِ دوراں، علامۂ وقت، ملقب بہ کاتب اصبہانی صاحب کتاب الاغانی، خاندان بنی امیہ کے آخری خلیفہ مروان بن محمد، ابوالفرج کے اجداد میں سے تھا، اس کی ولادت معتضد باللہ کے عہد میں اصفہان میں ہوئی، بغداد میں نشو و نما کے مراحل طے کئے، حدیث کی سماعت بھی کی، اور اس فن میں باریک بینی اور نکتہ سنجی کا ثبوت دیا۔ اوائل عمر ہی سے مدینۃ السلام (بغداد) کو وطن بنا لیا۔ وہ وہاں ہر فن کے ماہروں

اور مصنفوں میں شمار ہونے لگا، علما، کی بہت بڑی تعداد سے روایت کی، شاعری کا پایہ بھی بہت بلند تھا، افراد و قبائل کے حسب و نسب پر بھی بڑا عبور تھا، باوجود اموی ہونے کے شیعی تھا، جس پر ابن اثیر نے حیرت کا اظہار کیا ہے، قبائل کے حرب و پیکار کی تاریخ پر بھی بہت اچھی نگاہ تھی، انساب و سوانح کا بھی بڑا عالم تھا۔

تنوخی کا قول ہے، جن ارباب فضل و کمال کی میں نے زیارت کی ہے۔ ان میں ابوالفرج اصبہانی ایک ایسا شخص تھا جو بے شمار اشعار کا حافظ تھا، اور اغانی یعنی راگوں کا بہت بڑا واقف کار اور مورخ، فن حدیث میں بھی اسے اچھا خاصا درک تھا، آثار صحابہ و تابعین کا بھی وہ عالم تھا، احادیث مسندہ کا بھی ماہر تھا اور فن نسب میں بھی اسے غیر معمولی عبور تھا۔ سچ تو یہ ہے میں نے اس کی سی قوت حافظہ کسی میں نہیں دیکھی۔ مذکورہ بالا علوم و فنون کے علاوہ لغت، نحو، داستان گوئی، سوانح و سیر اور مغازی کے فنون میں بھی وہ اپنا نظیر آپ تھا، اور لوازم علم مجلسی از قسم بیطاری، شکاری، پرندوں کا علم، طب اور نجوم وغیرہ سے بھی باخبر تھا۔ اس کے اشعار میں علما کے کلام جیسی پختگی اور ظریف الطبع شعراء جیسی خوبیاں تھیں۔ کتابیں اچھوتی اور بے مثل لکھیں، انہیں میں سے کتاب الاغانی ہے، جس کے متعلق ارباب نظر کا اتفاق ہے کہ اس موضوع پر اس سے بہتر کتاب نہیں لکھی جا سکی ہے۔

ابو محمد المہلبی[1] کا قول ہے کہ میں نے ابوالفرج سے پوچھا یہ روایات و آثار تم نے کتنے عرصے میں جمع کئے؟ کہا، پچاس سال میں! زندگی میں پہلی مرتبہ جب اس نے انہیں اپنے ہاتھ سے لکھ کر سیف الدولہ کی خدمت میں پیش کیا تو اس نے ایک ہزار دینار صلہ بھیجا۔ یہ خبر جب صاحب بن عباد[2] کو پہنچی تو اس نے کہا، سیف الدولہ نے ناقدری کی، ابوالفرج تو اس سے

[1] ابو محمد الحسن بن ہارون الاسدی المہلبی معز الدولہ کی وزارت کے منصب پر بغداد میں فائز رہا، بصرے میں وفات پائی (۳۵۲ھ، ۹۶۳ء)

[2] ابوالقاسم محمد اسمٰعیل بن عباد الطالقانی اپنے فضائل و مکارم کے اعتبار سے نادر روزگار اور عجوبۂ عصر شخصیت کا مالک تھا، "الصاحب" اس لئے کہتے تھے کہ ابوالفضل بن عمید کا مصاحب خاص تھا، اور اس لئے بھی کہ بچپن سے موید الدولہ بن بویہ کا ساتھی تھا، موید کا منصب وزارت پر بھی فائز ہوا جب موید الدولہ نے وفات پائی اور اس کا بھائی فخر الدولہ تخت حکومت پر قابض ہوا، تو اس نے بھی اسے وزارت پر قائم رکھا۔ وفات کا سال ہجری، ۳۸۵ھ اور عیسوی ۹۹۵ء ہے۔

کہیں زیادہ کا مستحق تھا، قابل رشک محاسن اور بچے تلے فقروں کے استعمال میں اس کا کون حریف ہو سکتا تھا، اس کے الفاظ و فقرات ایک زاہد گوشہ نشین کے لئے مایۂ تفریح، عالم خشک کے لئے اضافۂ معلومات و معاد کا سبب، انشا پرداز اور جویائے ادب کے لئے پونجی اور تجارت، سپاہی اور دلاور کے لئے ہمت و شجاعت کی ڈھال، تہی دست کے لئے ریاضت و صناعت، بادشاہ و کشور کشا کے لئے اسباب سرور و لذت ہیں۔ میرے کتب خانہ میں ایک لاکھ ستر ہزار کتابیں ہیں، اس سے بڑھ کر کوئی میری انیس نہیں تھی، کوئی چیز ایسی نہیں تھی۔ جس کی مجھے جستجو ہو، اور وہ اس میں نہ مل گئی ہو، جو واقعات و حالات علماء نے اپنی ان گنت کتابوں میں تحریر کئے ہیں، وہ سب اس میں حسن تالیف اور لطف بیان کے ساتھ موجود ہیں۔ سیف الدولہ کا تو یہ حال تھا کہ چاہے سفر میں ہو یا حضر میں، اس کتاب کو ہر وقت اپنے ساتھ رکھتا تھا، اس کا ایک مسودہ بغداد کے بازار میں چار ہزار درہم میں فروخت ہوا۔

ابن خلکان کا بیان ہے کہ ابن عباد تیس اونٹوں کے بوجھ جتنی کتابیں جو ادب و انشا سے متعلق ہوتی تھیں، ہر سفر میں اپنے ساتھ رکھتا تھا، لیکن جب اسے کتاب الاغانی دستیاب ہوئی تو اس نے سب کو سینت کر رکھ دیا اور یہی کتاب اس کی ندیم اور دمساز بن گئی[1] کیونکہ

[1] کتاب الاغانی کے خلاصے اور منتخبات مرتب کرنے کا کام ایک جماعت ہمیشہ انجام دیتی رہی، اسی کے ایک فرد الوزیر حسین بن علی بن حسین ابوالقاسم ہیں جو ابن مغربی کے نام سے مشہور ہیں۔ سال وفات ۴۱۸ھ ۱۰۲۷ء۔

قاضی جمال الدین محمد بن سالم (المتوفی ۶۹۷ھ ۱۲۹۷ء) نے بھی اس کا ایک انتخاب مرتب کیا تھا جس کے متعلق ابوالفداء نے تعریفی الفاظ استعمال کئے ہیں، اس کا ایک قلمی نسخہ کتب خانہ یاصوفیہ میں موجود ہے، شروع کے اوراق سونے کے پانی سے دلکش بنائے گئے ہیں، ہر صفحے میں ۲۱ سطریں ہیں۔

ابوالقاسم عبداللہ معروف بہ ابن باقیا کاتب حلی (المتوفی ۴۸۵ھ، ۱۰۹۲ء) نے بھی ایک جلد میں اس کا خلاصہ کیا تھا۔ ابن خلکان نے اسے سراہا ہے۔

امیر عزالملک (المتوفی ۴۲۰ھ، ۱۰۲۹ء) نے بھی ایک خلاصہ لکھا تھا، ابن خلکان نے اس کی بھی تعریف کی ہے۔

جمال الدین محمد بن مکرم (المتوفی ۷۱۱ھ ۱۳۱۱ء) نے بھی "مختار الاغانی" کے نام سے ایک کتاب لکھی تھی۔

الرشید نے بھی ایک کتاب جو تیار کیا تھا جس کا ابن مکرم نے ذکر کیا ہے

اس سے وہ دوسری کتابوں سے مستغنی ہوگیا۔

ابوالفرج کی مجملہ اور تصانیف کے ایک کتاب "نزہتہ الملوک الاعیان فی اخبار القیان المغنیات الاوائل الحسان" ہے جس میں مشہور و معروف گانے والیوں کے حالاتِ زندگی، اور ان کے طرزِ موسیقی پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ایسے دلچسپ لطیفے اور پُرکیف حالات تحریر کئے ہیں، جن سے ممکن نہیں آدمی لطف اندوز نہ ہو۔ ایک کتاب "الاماء الشواعر" بھی ہے۔ "کتاب الدیارات" اور "دعوۃ التجار" بھی بہت مشہور رہیں۔ علاوہ ازیں "مجرد الاغانی" "اخبار جحظتہ البرمکی"، "مقاتل الطالبیین"[1]، "کتاب الحانات" اور "کتاب آداب الغرباء" بھی کم معروف نہیں ہیں۔

اندلس کے شاہانِ بنی اُمیّہ کے لئے بھی اصبہانی نے متعدد کتابیں لکھیں جو چوری چھپے وہاں بھیجی گئیں اور اسی طرح وہاں سے انعام بھی آیا۔ ان میں سے "نسب بنی عبد شمس" "ایام العرب الف و سبعماۃ یوم"، "کتاب التعدیل والانتصاف"[2]، "کتاب نسب المہاعبہ"، "کتاب نسب بنی تغلب و نسب بنی کلاب" اور "کتاب الغلمان المغنیین" ہیں۔

اوپر جن تصانیف کا تذکرہ ہوا، ان کے علاوہ بھی ابوالفرج کی متعدد تصانیف ہیں جن کا اصحاب تراجم و سیر نے ذکر نہیں کیا ہے۔ ہم کشف الظنون وغیرہ کے حوالے سے اس کی متعدد کتابوں میں سے چند کا ذکر کرتے ہیں:۔

(۱) مجموعۃ الاخبار والنوادر (۲) المحالیک الشعراء (۳) اخبار الفرس (۴) الفرق والمعیار بین الاوغاد والاحرار (۵) تحفۃ الوشاۃ فی اخبار الولائد (۶) تفضیل ذی الحجہ (۷) کتاب الطعلیبین (۸) مناجیب الخصیان (۹) دیوان ابوتمام مرتب کیا اور اس کی ترتیب حروف پر نہیں، بلکہ انواعِ کلام پر رکھی۔ مصر سے جو نسخہ شائع ہوا ہے وہ یہی ہے۔ (۱۰) ابونواس کا دیوان بھی اسی طرح مرتب کیا،

اور (۱۱) بحتری کا دیوان بھی۔

ابوالفرج وزیر مہلبی ہی کے دامنِ کرم سے وابستہ رہا، اس کی شان میں اس نے متعدد قصائد لکھے ہیں۔ ایک جگہ اس کی مدح کرتے ہوئے لکھتا ہے:۔

"جب ہم سائل بن کر اس کے دامن میں پناہ لیتے ہیں تو وہ مدد کرتا ہے، اور احسان نہیں جتاتا۔"

۲۸۴ھ میں ابوالفرج کی ولادت ہوئی، اسی سال مشہور شاعر بحتری کی وفات ہوئی۔ ابوالفرج نے بدھ کے دن ۱۴ ذی الحجہ ۳۵۶ھ میں بہ مقام بغداد وفات پائی، وفات سے قبل جنون میں مبتلا ہو گیا تھا۔ ۳۵۶ھ وہ سن ہے جس میں دو بہت بڑے عالم اور تین بہت بڑے بادشاہ اس جہانِ فانی سے رخصت ہوئے۔ علماء میں ایک تو خود ابوالفرج اصبہانی ہیں۔ دوسرے ابوعلی القالی۔ بادشاہوں میں (۱) سیف الدولہ (۲) معزالدولہ بن بویہ (۳) کافور الاخشیدی۔

کبھی کبھی ہجو سے بھی ابوالفرج اپنا دامن آلودہ کر لیتا تھا جب ابو عبداللہ البریدی منصب وزارت پر فائز ہوا تو ابوالفرج نے ایک قصیدۂ ہجویہ لکھا جس کا پہلا شعر یہ تھا۔

اے آسمان تو ٹوٹ کیوں نہیں پڑتا؟
اے زمین تو دھنس کیوں نہیں جاتی؟
کہ ابن البریدی وزارت پا گیا!

کوئی شبہ نہیں ابوالفرج کے انتقال سے ادب کے بُستان سچ مچ ویران ہو گئے، انساب کے شگوفے اور پھول مرجھا گئے، ادبائے دہر یتیم ہو گئے، لیکن جس نے ایسی زندۂ جاوید کتابیں یادگار چھوڑی ہوں، وہ مر نہیں سکتا۔ اس کا ذکر ہمیشہ ہوتا رہے گا، اس کی یادگار کبھی محو نہ ہوگی:۔

وما مات من ابقی لنا ذخر علمہ
واحیا لہٗ ذکراً علی غابر الدھر

---

[1] ۱۳۶۸ھ میں یہ کتاب طہران سے شائع ہو چکی ہے۔

[2] آغانی میں اس کتاب کا ذکر ایک موقع پر اس طرح ہے "میں نے اس کی تشریح کتاب النسب میں کردی ہے جس کے بعد کسی تشریح کی ضرورت نہیں۔ ابن خلکان نے تو اس طرح بیان کیا ہے گویا کتاب التعدیل اور جمہرۃ النسب دو الگ الگ کتابیں ہیں لیکن درحقیقت کتاب ایک ہی ہے صرف نام دو ہیں۔ خود ابوالفرج کے قول سے اس کی تائید ہوتی ہے۔ وہ خالد بن عبداللہ کے حالات میں لکھتا ہے کہ اس کی پوری تفصیل جمہرۃ النساب العرب میں میں نے لکھی ہے جس کا نام کتاب التعدیل والانتصاف رکھا ہے

گریزپا

یوسف ظفر

یہ بزمِ زندگی بھی رزمِ زندگی سے کم نہیں
ہر ایک قہقہہ مرا جوابِ قہقہہ تو تھا
تکلفات و ربطِ باہمی کا سلسلہ تو تھا—

غلافِ یاس تھے وہ قہقہے، یہی گلہ تو تھا
خوشی نہ تھی وہاں مگر خوشی کا شائبہ تو تھا
تکلفات و ربطِ باہمی کا سلسلہ تو تھا

گریزپا حیات کی وہ ساعتیں، گراں بہا
کہ جن کو ڈھونڈتا رہے گا ہر نفس، نفس نفس
ہوس کے دام میں الجھ کے پارہ پارہ ہوگئیں
وہ ساعتیں کہ جن کو پھر نہ پاسکے گی زندگی
فریبِ عارضی کی دلکشی میں رہ کے کھو گئیں—

فسانے تھے کہاں کہاں کے، جن کا رنگِ دلنشیں
الم چشیدہ مسکراہٹوں سے داد لے گیا
طرب کا سلسلہ تھا، جس کا نغمۂ سکوں فریب
بس ایک لحظے کے لئے غموں کی یاد لے گیا
بسیط دائروں میں پھیل کر طویل قہقہے
فضا میں چھوڑتے گئے مسرتوں کے مقبرے—

(۲)

کہاں تک اس طرح کی ہار ہو کہ زندگی نہیں
کہاں تک اس طرح کی زندگی کہ موت بھی نہیں

سحر سے شام تک جہاں معاش کا الم رہے
نشاطِ بیش و کم تو کیا ہے فکرِ بیش و کم رہے
وہاں گراں بہا ہو کیا، حیاتِ موت آشنا—

کشاکشِ نفس نفس، اگر یہی ہے مدعا
اگر ہوس ہے اور بس— تو اے فریبِ زندگی!
وہی نشاطِ عارضی رہے، وہی ہما ہمی
وہی تکلفاتِ دوستی و ربطِ باہمی—

●

کشمکش جاوداں

عبدالعزیز خالد

گردشِ سیارگاں دورِ زمان و مکاں / فرصتِ یک دو نفس معرضِ سود و زیاں
رونقِ بزمِ جہاں صبحِ نخستیں سے ہیں / حسن کی سر مستیاں، عشق کی دلسوزیاں
سینہ میں سیماب وار کب سے تڑپتا ہے دل / شاہدِ مقصود کا جلوۂ حیراں کہاں
حسن ہے افسانہ خواں عشق ہے تمکیں نواز / ایک شمیمِ جناں، ایک نشاطِ فغاں
عاشقی شیرازہ ہے، خوابِ پریشاں حیات / عبرت و سوز و گداز دل کی متاعِ گراں
چاکِ جراحت بھی ہے، نسخۂ اعجاز بھی / یہ خمِ زلفِ دوتا یہ شکنِ ابرواں
جس کے طلسمات سے ہو دلِ خارا بھی موم / جس کی توجہ کرے ذرہ کو سنگِ فساں
وہ نفسِ کیمیا آج زمانہ میں ہے / یا لبِ شیوا بیاں یا کفِ گوہر فشاں
خود نگری خود سری خود شکنی خود گری / کیا نظرِ عارفاں کیا نگہِ سالکاں
عرضِ تمنا نہیں ایک نگہ سے فزوں / حرفِ تمنا مگر سلسلۂ بے کراں
گنجفہ بازِ خیال محفلیں برہم کرے / شوق فراہم کرے داغِ دلِ دوستاں
خانہ خرابی کرے ذوقِ نظر کا فساد / اک نگہِ نیم رس سوجگر آشوبیاں
کون ہے محرم یہاں رسم و رہ شوق کا / زندگی محرومیاں عاشقی رسوائیاں
طرۂ دریوزگی تاب و تبِ مستعار / نسخۂ آرامِ جاں کشمکشِ جاوداں
کیا نفسِ رائیگاں کیا جگر لخت لخت / پنجۂ مرجاں ہوئے دو مژۂ خونفشاں
یہ دلِ خوباں پرست مستِ شرابِ الست / خسروِ اقلیمِ شوق خاکِ رہِ دوستاں
یہ دلِ عزلت پسند بالِ ہما کو کمند / ساز و یراقِ یلاں زینتِ برگستواں

جادۂ راہِ فنا آنکھ سے اوجھل نہ ہو
پردۂ ظلمت میں ہے نورِ سحر گہہ نہاں!

تفاوتِ راہ

ضمیر اظہر

کبھی وہ عہدِ فسوں ساز تھا کہ جامِ حیات
ترے جمال کی مے سے مہ منور تھا
تری جمیل محبت کے فیضِ رنگیں سے
مری ہر ایک نظر میں شفق کا منظر تھا

تری بہارِ جوانی کی اوٹ میں چھپ کر
جہاں کو پیکرِ رنگ و شمیم سمجھا تھا
مقامِ دل کو ترے التفاتِ پیہم سے
گلاب و لالہ و گل کا حریم سمجھا تھا

خیال و فکر کے زرکار عرش بوس محل
ضیائے انجم و مہتاب سے فروزاں تھے
نشاط و کیف و طرب کے حسین افسانے
برنگِ خوابِ شگفتہ نظر میں رقصاں تھے

گذر چکا ہے وہ عہدِ طرب نواز اور اب
حریمِ دل کئی رنگینیوں کا مدفن ہے!
خیال و فکر کے بے رنگ و آب محلوں میں
فقط مہیب سی تاریکیوں کا مسکن ہے!

غبار بن کے پریشاں ہیں رہگزاروں میں
فسردہ پتیاں میرے گلِ تمنا کی!
اجڑ چکا ہے گلستان آرزوؤں کا
نظر پہ طاری ہے شامِ خزاں کی ویرانی!

بدلتے وقت کی رفتارِ تیز گام کے ساتھ
بدل گیا ہے کچھ اس طرح زیست کا نقشہ
کہ دل کو رات کی غمگین خلوتوں میں بھی
گذشتہ عیش کا احساس تک نہیں ہوتا!

شباب

جلیل حشمی

دیکھ کر آئینۂ شبنم میں کیا
رنگ و بُو کی لاڈلی لہرا گئی

بیکراں نیلاہٹوں کی چھاؤں میں
نکہتوں کے بوجھ سے بل کھا گئی

دھڑ دھڑ اُٹھے شفق کے شعلہ زار

پتّی پتّی پر نمی سی آ گئی
رنگ و بو کی لاڈلی، اُٹھتی کلی

اک حسیں دھوکے کا دھوکہ کھا گئی

دیکھ کر اپنا سراپا، اپنا رنگ
وسعتِ گلزار سے شرما گئی!

افسانہ

نیا کاروبار

آغا بابر

کباڑیئے کی دکان سے آئی ہوئی چند مشکی بوتلیں پڑی تھیں۔ دو ایک ٹوٹے ہوئے ڈبے تھے، جن میں کچھ کوٹی ہوئی دوائیں رکھی تھیں، کچھ چھوٹی چھوٹی بندھی ہوئی پڑیاں چنگیر میں موجود تھیں اور آمینہ کا خاوند بیچ میں بیٹھا ایک سفوف کپڑچھان کر رہا تھا۔ اس کے انہماک سے یہی معلوم ہوتا تھا کہ وہ کوئی کیمیا تیار کر رہا ہے جس سے دنیا کی ساری ناانصافیاں نتھر کر نیچے بیٹھ جائیں گی، آب کوثر سے دھل کر انسانیت کی صورت چاندی سی نکل آئے گی۔ تمام روحانی اور جسمانی ناداریاں دور ہو جائیں گی، اور اس ڈھال پر زندگی کی تمام نامرادیاں تلخیاں اور ناکامیاں اپنی کاری ضربیں لگانے سے قاصر رہیں گی۔

وہ سفوف کو بڑے اعتماد سے کپڑچھان کرتا رہا جیسے وہ اپنے اس خفیہ ہتھیار سے دشمن کو پچھاڑ دے گا۔ چولھے کے سامنے بیٹھی آمینہ نے دو چار دفعہ آواز دے کر کہا "میں جانوں دفتر کا وقت ہو گیا ہے"

"ابھی اٹھتا ہوں" وہ یہی جواب دیتا رہا۔

آخر آمینہ نے پرات میں پڑے پانی سے ہاتھ دھوئے اور دوپٹے سے پونچھتی گلیارے میں آگئی۔ اپنے خاوند کو منہمک دیکھ کر مسکرائی اور بولی "باقی کام دفتر سے آکر کر لینا، مجھے بتا جاؤ۔ کچھ کام میں کر چھوڑوں گی۔"

"اٹھتا ہوں! بس باقی کام میں خود آکر کر دوں گا۔ ان چیزوں کو اسی طرح احتیاط سے پڑے رہنے دو۔ کوئی بچہ نہ چھیڑے۔"

وہ چیزوں کو سنبھال کر اٹھا۔ پھر اسے ایک خیال آیا۔ اس نے کہا "اچھا تم اتنا کام کر چھوڑو۔ یہ جو گتے کے پیکٹ چھپے ہوئے آئے ہیں۔ ان کی تہوں کو یوں کھول کر پیکٹ کی شکل میں تبدیل کرتے رہنا۔ جتنے بھی ہو سکیں۔" اس نے چھپا ہوا ایک گتا اٹھایا، اس کی تہوں کو سیدھا کیا، وہ پیکٹ بن گیا۔

"اس میں بوتلیں بند کریں گے۔ کیوں کیسا رہے گا"

"پیکٹ بڑا اچھا ہے" آمینہ بولی

"اب دعا کرو یہ کام چل جائے۔" یہ کہہ کر وہ جلدی سے دفتر کے کپڑے بدلنے چلا گیا۔

اس کے جانے کے بعد آمینہ گلیارے میں آ بیٹھی اور نرم گتے کی تہیں کھول کر جوڑ جوڑ کر پیکٹ بنانے لگی۔ پیکٹ کے ایک طرف شعر لکھا تھا ؎

حکیموں کا ہے کام کرنا دوا کا
شفا بخشنا کام ہے کبریا کا

دوسری طرف لکھا تھا۔ پیٹ اور معدے کی ہر بیماری کے لئے یہ سفوف کیمیا ہے۔ آمینہ نے تیسری طرف دیکھی، وہاں لکھا تھا۔ ہاضمہ کے لئے اکسیر ہے۔

چند روز ہوئے اسی گلیارے میں بیٹھ کر خاوند کے دوستوں نے اسے دفتری اوقات کے بعد اس نئے کاروبار کا مشورہ دیا تھا۔ پیش پیش مرزا صاحب تھے جو دکانداروں کو ڈھیروں نقلی بوٹ پالش دے چکے تھے۔ خالی ڈبیاں کباڑیوں سے لے لیتے تھے اور موم کے ساتھ کچھ اوٹ پٹانگ چیزیں ملا کر انہوں نے گھر میں ڈبیاں بھرنے کی فیکٹری کھول لی تھی۔ پھر ماسٹر مولا داد آیا کرتا تھا جس کے پاس سات ٹیوشنیں تھیں۔ ایک دفعہ اس سے پوچھا گیا کہ وہ اتنی ٹیوشنیں کس طرح بھگتا لیتا ہے تو اس نے بتایا وہ چھٹی ہونے سے پہلے ہی ٹیوشن والے لڑکوں کو سکول میں بلا لیتا ہے۔ جب کسی نے پوچھا کیا ہیڈ ماسٹر کچھ نہیں کہتا، تو وہ بولا ہیڈ ماسٹر خود اس وقت سینما کے اشتہار لکھ رہا ہوتا ہے۔

گویا سب نے آمینہ کے خاوند کو کچھ ہاتھ پیر ہلانے کا مشورہ دیا تھا

ی گزرا وقات میں کوئی سہولت نکل آئے اور گھر کے احتیاجات کچھ پورے
بسکیں چنانچہ ڈیڑھ سو روپیہ کی جو کمیٹی ملی تھی اسی سے یہ کاروبار جنم لے رہا تھا
خاوند دفتر اور بچے سکول جا چکے تھے۔ آمینہ کا لاڈلا بھائی نفاست
سل خانہ میں نہا رہا تھا اور ساتھ ساتھ گا رہا تھا:

"گائے چلا جا، گائے چلا جا
اک دن تیرا بھی زمانہ آئے گا"

امینہ بیٹھی پیکٹ جوڑتی رہی اور سوچتی رہی کہ اس نے کس طرح ہر مہینہ
ہوں کا پیٹ کاٹ کاٹ کر کمیٹی کے روپوں کی کفایت کی تھی۔ شاید اس کا ابا
ں خدا برکت ڈال دے۔

نفاست تیار ہو کر منہ میں سگرٹ دبائے کلائی پر گھڑی باندھتا
ہر نکلا "آپا اگر مجھے کوئی ملنے آئے تو کہنا میں ٹی ہاؤس میں مل سکتا ہوں۔
ج ایک بہت بڑے آدمی سے میری ملاقات ہے۔ دعا کرنا"

امینہ کس کس کے لئے دعا کرے۔ گھر کی خوشحالی کے لئے، خاوند کی
رقی کے لئے، بچوں کی صحت کے لئے، نئے کاروبار کی بہتری کے لئے،
فاست کے روزگار کے لئے۔ مگر وہ پیکٹ بناتی رہی۔

نفاست کو بیکار رہتے کافی دیر ہو چکی تھی۔ وہ دن بھر ملازمت کی
لاش میں بار بار ٹی ہاؤس جاتا تھا۔ شام کو جب آتا اور دن بھر کی روئیداد
سناتا تو امینہ اور اس کا خاوند یہی اندازہ لگا سکتے کہ اس نے ٹی ہاؤس،
کافی ہاؤس یا ہوٹلوں کو یوں سمجھ رکھا ہے کہ روزگار اسے وہیں سے
ملے گا۔ ایک روز امینہ کے خاوند نے تنگ آ کر کہا "میں نہیں سمجھتا
ہوٹلوں میں دن بھر بیٹھے رہنے سے نفاست کو ملازمت
س طرح مل جائے گی" امینہ نے یہی بات نفاست سے کہہ دی جسے سن کر
وہ بولا "آپا! بھائی جان نے کبھی ہوٹل کا منہ دیکھا ہو کبھی ٹی ہاؤس گئے
ہوں تو انہیں معلوم ہو کہ وہاں ملازمت کیونکر مل سکتی ہے۔ ٹی ہاؤس
یں مختلف لوگوں سے ملاقات ہوتی ہے۔ شام کو کسی اعلیٰ درجہ کے
ہوٹل میں جا بیٹھیو، بڑے سے بڑا آدمی وہاں موجود ہوتا ہے۔ باتیں
کرتے ہیں، تعارف ہوتا ہے۔ بات سے بات نکلتی ہے کئی بزنس والے
لئی زمینوں والے وہاں ہوتے ہیں۔ بھائی جان کیا چاہتے ہیں کہ میں دفتروں
یں جا کر دھکے کھاتا پھروں"

آمینہ یہ سنکر خاموش ہو گئی مگر اس نے دل میں یہ ضرور محسوس کیا
کہ نفاست نے اس کے خاوند کے متعلق ناگوار سی بات کہہ دی تھی۔

اگر اس کا خاوند ہوٹل بازی کرنے لگتا تو آج بچوں کے تن پر کپڑا نہ ہوتا
گھر میں بھنگ ناچنے لگتے۔ اس زمانہ میں گزراوقات کیسے ہوتی ہے نفاست
کو کیا معلوم۔ وہ ان فکروں میں نہیں پڑا تھا۔

امینہ سوچنے لگی۔ اس وقت اس کا خاوند دفتر میں کاغذوں پر جھکا
ہوا ہوگا، شام کو تھکا ہوا آئے گا وہ ہوٹل میں جا کر چائے کیوں پئے۔
وہ ٹی ہاؤس میں کیوں جائے۔ میرے بچے اس وقت سکول میں پڑھ
رہے ہیں وہ سہ پہر کو گھر آئیں گے۔ جب وہ آ کر امی امی کرتے میرے
ساتھ لپٹ جائیں گے، مسرت کی کیسی لہر میری رگ رگ میں دوڑ جائیگی
بچوں کا خیال آتے ہی اسے یوں محسوس ہوا جیسے انہیں چھٹی ہو گئی ہو اور وہ
وہ تیز دھوپ سے بچتے سڑک کے کنارے کنارے چھدرے درختوں
کے سائے میں گھر کی طرف چلے آ رہے ہوں۔ گرم گرم تپی ہوئی بھربھری
مٹی اُن کے جوتوں میں گھس رہی ہے۔ سلیمان سب سے پیچھے آہستہ آہستہ
چل رہا ہے کیونکہ اس کا بوٹ زیادہ پھٹا ہوا ہے۔ اس نے کل دکھایا تھا
اپنا بوٹ الٹا کر کے۔ مٹی اس میں سے گرنے لگی تھی۔ اس کا پاؤں بوٹ
کے اندر ہی اندر خاک آلود ہو گیا تھا۔ "امی مجھے نیا بوٹ لے دو۔ ان
سوراخوں میں سے مٹی اندر گھس جاتی ہے، مجھ سے چلا نہیں جاتا"

نجمی نے جب بھائی کو یہ کہتے سنا تو اس نے کہا "امی سلیمان کو ضرور
لے دو بوٹ۔ یہ سب سے پیچھے رہ جاتا ہے۔ میں اگلے مہینہ لے لوں گی"

امینہ نے اس کا سینڈل دیکھا وہ سلیمان کے جوتے سے بھی گیا گزرا
تھا۔ امینہ نے نجمی کی آنکھوں میں محبت اور ہمدردی کی ایک چمک دیکھی۔
میری بچی کتنی صابر اور شاکر ہے۔ اس نے دل میں کہا اور سلیمان کی طرف
منہ کر کے بولی "خواہ کچھ ہو میں اپنے لال کو کل بوٹ خرید دوں گی۔ تم
آؤ گے سکول سے تو بوٹ موجود ہوگا"

امینہ پیکٹ بناتے بناتے اکتا گئی۔ اس نے سوچا تھا کہ کمیٹی کے روپے
ملنے پر وہ سلیمان اور نجمی کو نئے بوٹ خرید دے گی مگر کمیٹی کا ڈیڑھ سو روپیہ
یہ سب الا بلا خریدنے پر صرف ہو گیا اور بچے منہ دیکھتے رہ گئے۔ وہ اکتا کر
اٹھ بیٹھی۔ اس نے الماری دیکھی۔ پرس کھولا۔ اس وقت اس کے پاس
صرف تین روپے اور کچھ ٹوٹے ہوئے پیسے تھے۔ وہ چارپائی پر لیٹ
گئی اور چھت کی طرف دیکھنے لگی۔ عطار کی بیوی کو خدا نے بھیج دیا۔ کچھ دن
ہوئے وہ ایک پرانی الماری امینہ سے خرید کر لے گئی تھی۔ اس نے دس روپے
کا نوٹ، جسے اس نے کئی تہیں دیکر پلو میں باندھا ہوا تھا کھول کر آمینہ کو دیا۔

"۔مجھے بڑی ضرورت تھی۔میں سوچ ہی رہی تھی کہ تمہاری طرف کسی کو بھیجوں"

جونہی لڑکا سودا لے کر آیا آمینہ نے اس سے کہا "دیکھو میں سلیمان کا جوتا لینے بازار جا رہی ہوں"۔

نفاست میٹرو ہوٹل کے باہر کھڑا سگرٹ پھونک رہا تھا آمینہ نے بھائی کو دیکھ کر تانگہ روک لیا۔ "کہاں جا رہی ہو آپا؟"

"سلیمان کا جوتا خریدنے۔ تم کھڑے ہو یہاں؟"

"مجھے ایک آدمی سے ملنا تھا۔اس کا انتظار کر رہا ہوں۔آؤ۔چائے کی ایک پیالی پی لیں"

آمینہ تانگہ سے اتر آئی۔

ٹائلوں کے صاف ستھرے فرش پر شیشے کی چمکتی میزیں، گرداگرد چھوٹی چھوٹی کرسیاں آمینہ کو یوں معلوم ہوئیں جیسے کسی پُرسکون جھیل میں کنول کے پھول تیر رہے ہیں۔ سبز رنگ کے موٹے موٹے پردوں کے پیچھے ہال میں ایک ٹھنڈک سی پھیلی ہوئی تھی جو سکون کا سانس لینے کے ساتھ ساتھ رگ و پے میں گھلتی جاتی تھی اور اس جگہ پاؤں پسارنے کو خواہ مخواہ ہی جی چاہتا تھا۔ دست بستہ بیرے یوں کھڑے تھے جیسے غلام گردشوں میں حبشی شاہی آقاؤں کی راہ دیکھ رہے ہوں۔ امینہ کے مضطرب دماغ میں بادِ صبا کے جھونکے سے چلنے لگے اور یہ نویلی سی فضا اس کے بے چین اعصاب پر ٹھنڈک کے پھاہے رکھنے لگی۔ اس نے کرسی پر بیٹھ کر ایک لمبا سا سانس لیا اور نفاست کی طرف دیکھ کر زیرِ لب مسکرا دی۔

"چائے لاؤ"۔ نفاست نے بیرے سے کہا۔

امینہ بولی "میں تو کچھ کھاؤں گی بھیا"

"ضرور ضرور۔ میں تو کہنے ہی والا تھا" نفاست نے کہا "بیرا دیکھو کٹلس لاؤ۔ کچھ چانپ سپیشل اور چکن سینڈوچز۔ سمجھے"

دیواروں کی میناکاری اور سبز سبز پردے امینہ کی آنکھوں میں ٹھنڈک گھولتے رہے۔ اور اس کا بوجھل دل بھائی کے ساتھ یوں اس نویلی فضا میں بیٹھ کر پُرسکون جھیل میں تیرنے والے کنول کی طرح سبک اور سہانا سا ہو گیا۔ اور گرد کی کچھ نقرئی آوازیں اور بھائی کا بار بار اصرار "یہ کھاؤ۔ یہ چکھو۔ اب گھر جا کر کھانا تھوڑے ہی کھانا ہے تمہیں"۔ اس کی روح میں تحلیل ہونے لگا۔

بل کے ساتھ نفاست نے بیرے سے سگرٹ کی ڈبیا بھی منگائی۔

نفاست بل پر نظریں جمائے دیکھتا چلا گیا۔

امینہ نے پوچھا "کیوں؟ کیا ہوا؟ کتنا ہے؟"

"کوئی نہیں بارہ روپے" نفاست نے پتلون کی جیب میں ہاتھ ڈال کر کہا "آپا میرے پاس صرف ایک روپیہ چار آنے ہیں۔ تم اپنے پاس سے دیدو"۔

یہ سن کر امینہ کو ایک جھرجھری آئی۔ دل کا کٹورا کنول ایک دم جھیل میں ڈوب گیا۔

جب وہ باہر آکر تانگہ میں بیٹھنے لگی تو اس کی آنکھوں کے آگے آنسوؤں کی نمی کا ایک غبار چھا گیا جس میں بھربھری سی مٹی اڑ رہی تھی۔ تپتی ہوئی خاک جیسے سلیمان کے ٹوٹے ہوئے جوتے میں سے جھڑتی ہو۔

امینہ نے تانگے والے سے کہا "واپس چلو"

نفاست بولا "واپس کیوں؟ سلیمان کے لئے بوٹ نہیں خریدنا؟"

"نہیں، مجھے کچھ پیکٹوں کا کام کرنا ہے تمہارے بھائی جان سے وعدہ کیا تھا" امینہ نے جواب دیا۔

"مجھے تو یہ نیا کاروبار قطعاً پسند نہیں۔ بھائی جان کی عقل کو پتہ نہیں کیا ہو گیا ہے" نفاست نے کہا اور ساتھ ہی تانگے پر چڑھ بیٹھا اور بولا "تانگے والے! اس طرف سے ہو جاؤ۔ راستے میں مجھے ٹی ہاؤس اتار دینا"

جب امینہ اتر کر مکان میں داخل ہوئی تو گلیارے میں کباڑیئے کی دکان سے آئی ہوئی چند ہمشکل بوتلوں، دو ایک ٹوٹے ہوئے ڈبوں اور تسلے میں کچھ کرتی ہوئی دواؤں نے اس کا خیر مقدم کیا اور ان کے بیچ میں بیٹھے ہوئے اپنے خاوند کا منہمک چہرہ اس کی نگاہوں کے سامنے آ گیا جس سے آج صبح یہی معلوم ہوتا تھا کہ وہ کوئی ایسا کیمیا تیار کر رہا ہے جس سے دنیا کی ناانصافیاں نتھر کر نیچے بیٹھ جائیں گی اور اس ڈھال پر زندگی کی تمام تلخیاں ضرب کاری لگانے سے قاصر رہیں گی۔ اس کی ناگوار سوچ کو نفاست کے الفاظ بھی سنائی دیئے: "بھائی جان کی عقل کو پتہ نہیں کیا ہو گیا ہے"

آنسوؤں کی نمی کا ایک غبار پھر اس کی آنکھوں کے آگے چھا گیا۔ اس کے دل پر جیسے ایک کاری ضرب لگی، اور وہ بے جان ہو کر چارپائی پر بیٹھ گئی ❊

افسانہ

مائی خیراں

ابوسعید قریشی

ــنے بی بی سنبھال لے اپنی چیزیں۔ مجھ سے نہیں ہوتا کام اب اس گھر میں ......"

یہ الفاظ ہمارے، گھر میں اکثر گونجا کرتے اور ہمیں اُن پر کبھی تعجب نہ ہوتا۔ یہ مائی خیراں کا دستور تھا کہ ذرا کوئی بات مرضی کے خلاف ہوئی اور اس نے بُرقع سنبھالا۔ اس پر کبھی بحث نہ کی جاتی، کیونکہ مائی خیراں کا فیصلہ ہمیشہ اٹل ہوتا اور اُسے روکنا ناممکن۔

اماں بیمار رہتی تھیں۔ ان کا بیشتر وقت مصلّے پر گذرتا تھا۔ جہاں وہ اپنی بیماری کو یادِ الٰہی میں محو رکھتیں۔ ان کی صحت اس بات کی اجازت نہ دیتی تھی کہ گھر کا کام کاج کر سکیں۔ ایسے میں مائی خیراں کا یکایک یہ فیصلہ کر لینا کہ میں چلی ہوں، گویا گھر کو اندھا کر دینے کے برابر ہوتا۔ لیکن اماں اس سے کبھی پریشان نہ ہوتیں۔ وہ نہایت اطمینان سے قل سے آنکھیں اُٹھائیں، سلام پھیرتیں، یا تسبیح ختم کر کے دعا کے لئے ہاتھ اُٹھاتیں، اور اپنی نحیف آواز میں پوچھتیں:۔

"پھر کب آؤ گی مائی؟"

اس کا وہی ایک جواب ملتا:

"نہ بابا میں نہیں آتی اب۔ بیاہ کر دو بیٹے کا۔ بہو لے آؤ، گھر سنبھال لے اپنا"

اماں کہتیں:

"بہو تو تم ہی لاؤ گی جا کے"

مائی خیراں کچھ نہ بولتی اور بظاہر یوں دکھائی دیتا کہ شاید اس نے اپنا ارادہ ترک کر دیا ہے لیکن اس کا برقع لہراتا۔ اس کے مہندی رنگے بال برقعے کی میلی ٹوپی کے نیچے چھپ جاتے۔ وہ پُراسرار نظروں سے، جن سے افسوس اور غصہ دونوں کا پتہ چلتا، اماں کو دیکھتی اور سیڑھیوں کا رُخ کرتی۔ اس کے سلیپر ضدی بچوں کی طرح تالیاں پیٹتے سنائی دیتے۔ اور پھر خاموشی چھا جاتی۔ مائی خیراں کی ناراضگی کا باعث اکثر و بیشتر میں یا میرا چھوٹا بھائی ہوا کرتے۔ ہم مجرمانہ نظروں سے اماں کی طرف دیکھتے لیکن وہ ہمیں ندامت کے اظہار کا کبھی موقع نہ دیتیں۔

"کوئی بات نہیں۔ دو ایک دن میں خود ہی لوٹ آئے گی۔ اتنے نسیمہ بھیج دیا کرے گی کھانا"

نسیمہ، اللہ بخشے، اپنے میاں کے ساتھ ۱۹۴۷ء کے ہنگاموں کی نذر ہوئی، میرے تایا زاد بھائی کی بیوی تھی۔ ان کا مکان ایک پُل کے ذریعے ہمارے مکان سے ملا ہوا تھا۔ جب مائی خیراں کا مزاج خراب ہوتا۔ اماں بھابی نسیمہ کو کہلوا بھیجتیں اور میرا اور میرے چھوٹے بھائی کا کھانا اُدھر سے آ جاتا۔ رہیں اماں، انہیں تو ذکرِ الٰہی ہی بس تھا۔ بہت ہوا تو قہوہ پی لیا۔ دو تین بار دن میں۔ ساتھ سادہ روٹی کے دو ایک سوکھے لقمے کھا لئے۔ یا پھر ہمارے مجبور کرنے پر دوائی پی لی۔ لیکن میرا اور میرے چھوٹے بھائی کا انہیں بہت دھیان رہتا تھا۔

"بیٹا نا شتہ کر لیا؟ ... چاء پی لی؟ ..... کھانا کھا لیا؟"

ہم کہتے:

"آپ کیوں اتنی فکر کرتی ہیں ہماری؟"

جواب ملتا:

"جب اپنی اولاد ہو گی نا پھر پوچھنا یہ۔ ایک سوچتی ہوں کہ شاید مائی خیراں ٹھیک ہی کہتی ہے۔ بیاہ کر دوں تمہارا۔ پھر کہتی ہوں کہ نہیں۔ ابھی انہیں پڑھنا لکھنا ہے۔ اور عمر بھی کیا ہے ابھی۔ ہر کام کا وقت ہوتا ہے۔" مجھے سہارا مل جاتا۔

"مائی خیراں کا تو دماغ خراب ہے یہ چودھرائٹ کو جی چاہتا ہوگا کہ

دو چار دن ذرا رونق میسر ہو جائے۔"

دراصل خیراں کی یہی چڑچڑاہٹ ہی ساری گڑبڑ کا باعث بنا کرتی تھی۔ اُسے ذرا شبہ ہوا کہ کسی نے اُس کی نیت پر شبہ کیا ہے۔ اس کے کام میں نقص نکالا ہے یا تلخی سے بات کی ہے، تو چہرہ لال ہوا مائی کا، برقع سنبھالا اس نے اور پہونچی اماں کے کمرے میں۔

"لے بی بی سنبھال لے اپنا گھر..... بیاہ کر دو اب بیٹے کا....."

اور پھر وہ رو کے نہ رکتی۔ لیکن ہمیں اس بات کا یقین ہوتا کہ دو چار دس دن بعد وہ ضرور لوٹ آئے گی۔ اس کی واپسی کے لئے ہرکارے بلاوے کی ضرورت نہیں تھی جس طرح وہ اچانک چلی جاتی تھی اسی طرح واپس بھی آجاتی تھی۔ کچھ عجیب جوار بھاٹے کی سی کیفیت تھی۔ نہ اس کے جانے کا وقت جانچ لیا جاتا تھا نہ آتے وقت اُسے کچھ سونپا جاتا تھا۔ بگڑتے وقت وہ جس بے اعتنائی سے کام ادھورے چھوڑ جاتی تھی اسی بے تکلفی سے وہ واپسی پر کام شروع کر دیتی تھی۔

"اللہ کیا حال بنا رکھا ہے گھر کا۔ یہ دیگچی ہے کہ توا۔ ابھی دس دن بھی نہیں ہوئے قلعی کروائے۔ جلا کے رکھ دیا ہے پیندا۔ داڑھی کے لئے پانی گرم ہوا ہوگا نا۔ تمہارے بس کا دھندا نہیں ہے یہ۔ بہو لے آؤ....."

مائی خیراں آپ سے آپ بولے جاتی اور اماں مصلے پر بیٹھی زیر لب مسکرایا کرتیں لیکن مصلے پر اُن کی مسکراہٹ دھندلا جاتی۔

"بہو تو تم ہی لاؤ گی خیراں۔ میرا کیا ہے آج نہیں تو کل ——"

اس پر خیراں بہت بگڑتی

"نا بی بی۔ مجھے نہیں اچھی لگتیں ایسی باتیں"

"غلط تھوڑی کہہ رہی ہوں ——"

"نہیں یہی کہنا ہے تو میں جاتی ہوں پھر جانے کیا مزا آتا ہے تمہیں ایسی باتوں میں"

اتنے اماں پھر کسی وظیفے میں محو ہو چکی ہوتیں۔ انہیں مصروف دیکھ کے مائی خیراں پھر اپنے کام میں لگ جاتی۔

مائی خیراں ہمارے ہاں کب اور کس کے توسط سے آئی تھی؟
... یہ مجھے یاد نہیں۔ اس بارے میں سوچتا ہوں تو مجھے یہی جواب ملتا ہے کہ بس وہ تھی۔ جس طرح ہمارا گھر تھا اور گھر کے دوسرے لوگ تھے جس طرح وہ آپس میں ایک دوسرے سے بگڑتے منتے رہتے تھے اسی طرح مائی خیراں بھی منتی بگڑتی رہتی تھی —— ویسے نام کو وہ ہماری تنخواہ دار ملازمہ تھی لیکن اصل میں اس کا دائرۂ عمل باورچی خانے تک محدود نہیں تھا۔ گھر کی سیاست، اس کے بغیر تصور نہیں کی جا سکتی تھی۔ دسترخوان کی تفصیل سے لے کر، خاندان کے رشتے ناطے، جھگڑے، فساد دکھ، سکھ کی ہر تقریب میں بالواسطہ یا بلاواسطہ اس کا دخل ضرور ہوتا۔ اور دسترخوان کے معاملہ میں تو اس کا فیصلہ آخری ہوتا بلکہ اس میں تو وہ کسی کی رائے طلب کرنے کی قائل ہی نہیں تھی —— کہے کچھ، پکے کچھ اور جو کسی نے پوچھ لیا کہ یہ کیوں؟ تو بس برقع سنبھالا مائی خیراں نے۔

"لے بی بی سنبھال لے اپنی چیزیں۔ میرے ہاتھ کا پکا پسند نہیں آتا اب اس گھر میں۔ بہو لے آؤ"

اس کے جاتے ہی ہمارا چولہا سونا پڑ جاتا۔ اس کے آتے ہی باورچی خانے کی خوشبوؤں سے بھوک چمک اٹھتی۔ وہ کھانا اتنا عمدہ پکاتی تھی اور اسے معمولی چیزوں کو بھی لذیذ بنانے کے ایسے ایسے نسخے یاد تھے کہ بس۔

ہاں اس پر خرچ بہت اٹھتا۔ مہینے بھر کا گھی دس دن میں ختم۔ شکر ہفتہ بھر کی ہوتی تو دو دن میں مرتبان خالی۔ دودھ دہی کی کھپت دگنی۔ اور جو اماں نے دبی زبان میں کہہ دیا کہ مائی خرچ ذرا ہاتھ روک کے کیا کرو، تو مائی کا چہرہ اس کے بالوں کی طرح لال ہو گیا۔

"میں خود تھوڑی کھا جاتی ہوں۔ انہی کے لئے ہے نا..... صاف کہہ دو نا کہ میری ضرورت نہیں ہے اب اس گھر میں —— بہو لے آؤ گھر سنبھال لے اپنا مجھ سے نہیں سنی جاتیں روز روز کی باتیں۔
—— ڈھب کی چیز پکے گی تو خرچ بھی ہوگا"

اس خرچ میں اکثر و بیشتر اس کی اپنی تنخواہ بھی شامل ہو جاتی۔ وہ جب بھی اپنی خفگی کا دورہ ختم ہونے کے بعد لوٹتی تو اس کے بقچے کے نیچے مرغ، بٹیر، مچھلی یا اسی نوع کی کوئی مزیدار چیز نکلتی۔ یہ سب کچھ اس کی اپنی گرہ سے ہوتا اور اس کی لاگت ہم سے کبھی نہ مانگی جاتی لیکن اس کے باوجود اگر دوسرے دن پھر کوئی بات اس کی مرضی کے خلاف ہو گئی تو پھر یہ جا وہ جا۔

اماں کی حالت آئے دن بگڑتی گئی۔ آخر وہ بستر پہ ایسی لیٹیں کہ پھر نہ اٹھیں۔ اب وہ نماز بھی اشاروں سے ادا کرتیں۔ ان دنوں مائی خیراں کا معمول یکایک بدل گیا۔ ایک تو وہ دن تھے کہ ذرا موقع ملا اور برقع سنبھالا مگر اب وہ میری اور میرے بھائی کی کڑوی کسیلی بھی پی جاتی —— ایک وہ زمانہ تھا کہ وہ بلاوجہ بڑبڑاتی رہتی تھی مگر اب چپ چاپ اپنے کام میں مصروف

نظر آتی۔ کام کرتے کرتے کنکھیوں سے اماں کے کمرے کی طرف دیکھ لیتی اور پھر اپنے خیالات میں کھو جاتی۔

ایک دن ڈاکٹر نے ہم سے کہا کہ اب مریضہ کو مزید دواؤں سے پریشان نہیں کرنا چاہیئے۔ میں اور میرا چھوٹا بھائی اب ہر وقت اماں کے پاس رہنے لگے۔ مائی خیراں جو کبھی کام کاج سے فارغ ہو کر اپنے گھر چلی جایا کرتی تھی اب ہمارے یہاں ہی پڑی رہتی۔ کام سے وقت ملتا تو اماں کے پاس آ بیٹھتی اور پاؤں دابنے لگتی۔ اماں اسے دیکھ دیکھ کے مسکرائیں اور یوں لگتا جیسے کچھ کہنا چاہتی ہیں۔ مگر خیراں شاید ان کے خیالات بھانپ لیتی اور اٹھ کے چلی جاتی۔ جب وہ لوٹتی تو اس کی آنکھیں سرخ ہوتیں۔ وہ انہیں ہاتھ سے ملتے ہوئے کہتی۔

"ہاتھ لگ گیا ہے مرچوں والا۔ ابلی پڑتی ہیں آنکھیں۔۔۔۔"

"صاف صاف کیوں نہیں کہہ دیتیں کہ رو رہی تھیں" اماں کی نحیف آواز آتی "مگر فائدہ؟"

"لے لو۔ اور سنو۔ اللہ ایسا دن نہ لائے کہ میں روؤں"

"پر کب تک ٹل سکتا ہے وہ دن؟ آج نہیں تو کل ـــ اب ان بچوں کا تم ہی کو دھیان رکھنا ہوگا؟"

"تو میں کون ہوتی ہوں۔ جیتی رہو تم اپنے بچوں کے سر پہ۔ خوشیاں دیکھو۔ ابھی تو انہیں بیاہ رچانے ہیں ان کے دلہنیں لانی ہیں"

"وہ تو اب تم ہی لاؤ گی"

اماں کے ہونٹوں پر ایک یاس آلود مسکراہٹ پھیل گئی اور پھر وہ خلاؤں میں دیکھنے لگیں۔

"دھیان رکھنا ان بچوں کا۔ تم نے خود ہی ان کی عادتیں بگاڑ رکھی ہیں۔ خود ہی سنبھالنا اب"

●

اماں کا کمرہ خالی ہو گیا مصلیٰ لپٹ گیا، رحل بند ہو گئی۔ قرآن جزدان میں چلا گیا اور تسبیح کے دانے خاموش ہو گئے۔

وہ عزیز جو ہمارا غم بٹانے کے لئے آئے تھے ایک ایک کر کے اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے اور چار منزلے مکان میں میرا چھوٹا بھائی اور میں اکیلے رہ گئے۔ مگر مائی خیراں۔ جو کبھی چھلاوے کی طرح آج یہاں ہوتی تھی اور کل وہاں، اب ہمارا سایہ بن گئی۔ ابھی گئی ہے ہمارے پاس سے تو ابھی پھر موجود۔

"کیا بات ہے مائی خیراں؟"

"آواز دی تھی تم نے"

"نہیں تو"

"میں سمجھی بلایا ہے"

خیر دھوکہ ہو جاتا ہے کبھی کبھی۔ مگر یہ پھر کیوں آ رہی ہے۔

"میں نے کہا کیا پکے گا"

"کچھ پکا لینا"

"اچھا"

چلئے بات ختم ہوئی۔ مگر یہ پھر موجود ہے۔

"ہاں مائی؟"

"سودا لینے جا رہی تھی بازار۔ سوچا پوچھتی جاؤں کچھ منگوانا تو نہیں ہے؟"

چالیسویں کے ختم تک اس کا یہی دستور رہا۔ منہ سے کچھ نہیں بولتی تو ویسے ہی جھانک کے چلی جاتی ہے ــــ جیسے جیسے وقت گزرتا گیا یہ سایہ گھٹتا گیا۔

گھر کی ویرانی کو دور کرنے کے لئے ہمارا چچیرا بھائی بھی ہمارے یہاں رہنے لگا تھا۔ اس کے کھانے پینے کا بھی کوئی ٹھیک نہیں تھا۔ اس لئے وہ ہمارے دسترخوان میں بھی شریک ہو گیا۔ مگر اس سے بھی بات نہ بنی۔ ہماری آوازیں اس چار منزلہ مکان کو آباد نہ کر سکیں۔ ہماری یہی کوشش ہوتی کہ جہاں تک ممکن ہو گھر سے باہر رہا جائے۔ دن کالج میں کٹ جاتا۔ شام کالج کے کلب میں۔ پھر سینما چلے گئے۔ اکثر رات کے نو بجے گھر لوٹتے۔ مائی خیراں ہمارا انتظار کر رہی ہوتی۔

"یہ وقت ہے تمہارے لوٹنے کا! اللہ بخشے تمہاری جنتی ماں کا دھیان آ جاتا ہے نہیں کون ماں کی بیٹی یہاں ٹکتی۔ اور اب بھی چلی جاؤں گی کسی روز۔ پہلے سے بتائے دے رہی ہوں۔ اور میری مانو تو بیاہ کر لو اب۔ آخر کب تک سونے گھر میں پڑے رہو گے ـــــ مجھ سے تو ہونے کا نہیں اب یہ کام یہ تمہارے گھر لوٹنے کا وقت ہے!"

ہم کھسیانے ہو کے کہتے:۔

"ابھی تو کل نو بجے ہیں مائی"

"تو واپس چلے جاؤ نا پھر آدھی رات کو آ جانا۔ نہ بابا مجھ سے نہیں ہوتا اب یہ چوکیدارا ـــ بیاہ کر لو۔ رات رات بھر انتظار

کرو۔ بیوی سے۔ میں بوڑھی جان۔ نماز بھی تو نہیں پڑھتی اس ڈر سے کہ تم لوگ دروازہ نہ پیٹتے رہو۔"

"ہم وعدہ کرتے ہیں کہ پھر کبھی دیر سے نہیں آئیں گے۔"

"دیر سے آؤ گے تو میرا کیا ہے۔ یہی ایک ٹھکانا تو نہیں رہ گیا میرے لئے۔ اللہ نے ہاتھ پاؤں دئے ہیں۔ دو وقت کی روٹی سے بھوکی نہیں مرتی۔"

اس کا مزاج بگڑتا گیا اور اماں کے انتقال کو ابھی چھ ماہ بھی نہیں ہوئے تھے کہ ایک روز اس نے برقع سنبھالا۔ پاؤں کا پنجہ سلیپر میں اڑایا۔

"لو بابا۔ چیزیں سنبھال لو اپنی۔ مرنے والوں کی خاطر بہت کام کرلیا اس گھر میں۔ اب دلہن لے آؤ۔"

ہمیں معلوم تھا کہ وہ روکے نہ رکے گی اس لئے ہم بس اتنا کہہ کے چپ ہو رہے کہ اچھا مائی تمہاری مرضی۔ لیکن پھر کب آؤ گی۔ جواب میں اس کے سلیپروں کے تالیاں پیٹنے کی آواز آئی اور ہمیں شام کے کھانے کی فکر ہوئی۔

اس دن سے ہماری زندگی کا قلندری دور شروع ہوا۔ آج مرغ بھن رہا ہے تو کل فاقہ ہے۔ لیکن عین ایسے میں جب ہم اس زندگی کے عادی ہو چکتے مائی خیراں آ دھمکتی۔

"ہائے اللہ یہ کیا اندھا کر رکھا ہے گھر کو۔۔۔ نہ بابا تم لوگوں کے بس کا دھندا نہیں ہے یہ۔ عورتوں کے کام مرد کر سکتے تو بات ہی کیا تھی ۔۔۔۔ بیاہ کرلو اب۔"

میں اس کے مشورے پر ہمیشہ ہنس دیتا۔ دن اسی طرح گذرتے گئے۔ ہمارے باورچی خانے سے دس دن دھواں نکلتا اور بیس روز چولھے سرد پڑے رہتے۔ انگیٹھیاں بھبوت ملے دم سادھے پڑی رہتیں۔ جب وحشت زیادہ ہوتی تو ہم لاہور چلے آتے، جہاں دن میں سینما کے تین شو دیکھنے کے بعد آخری گاڑی سے امرتسر لوٹ آتے۔ اور ایک عجیب بیہوشی کے عالم میں پڑے کے پڑے رہ جاتے۔ کبھی کبھی یوں بھی ہوتا کہ ہم دو دو دن اپنے اپنے کمروں میں بند کتابوں کی دنیا میں دفن رہتے۔ جب ہم مراقبے سے نکلتے تو ہمیں اپنے عزیزوں کی زبانی پتہ چلتا کہ ہم بگڑ گئے ہیں۔ ناولیں پڑھتے ہیں، آوارہ ہیں، دو دو دن گھر سے غائب رہتے ہیں اور بزرگوں کے گاڑھے پسینے کی کمائی برباد کر رہے ہیں۔ امتحان میں دو ایک م۔۔۔

ناکامی۔۔۔ ان الزامات کی تائید ہو گئی۔ میں اس شہرت کا خاص نشانہ تھا۔ ایک دن میں نے ہنسی ہنسی میں مائی خیراں سے کہا:۔

"سنا مائی خیراں تم نے؟"

"کیا؟"

"لوگ کہتے ہیں کہ میں آوارہ ہوں۔"

"غلط۔ میرے سامنے تو آؤ کہنے والے کو۔ منہ نہ توڑ دوں ۔۔۔ پر میری مانو تو بیاہ کرلو۔ جھوٹوں کے منہ آپ سے آپ بند ہو جائیں گے۔ دلہن لے آؤ۔"

"تم ہمیشہ یہی کہتی ہو مائی خیراں۔ مگر یہ بھی تو سوچو کہ لے تو آؤں لیکن کھلاؤں گا، پہناؤں گا کہاں سے اُسے؟"

"یہی تو خرابی ہے تم آجکل کے نوجوانوں میں۔ یہ نہیں سمجھتے، کہ دانے دانے پر مہر ہوتی ہے۔ وہ جس نے سب کو پیدا کیا ہے پتھر کے کیڑے کو بھی رزق دیتا ہے۔ پر مشکل تو یہ ہے کہ تم لوگوں کو بھروسہ نہیں رہا اللہ پر۔ ایمان کمزور ہے تمہارا۔"

"یہ تو سب صحیح ہے مائی خیراں۔ پر اللہ نے آدمی کو عقل بھی تو دی ہے۔ یہ آدمی کو خود ہی دیکھنا ہوگا کہ میں کیا کر سکتا ہوں اور کیا نہیں کر سکتا۔۔۔ میں کسی کی بیٹی کو لے تو آؤں۔ مگر اس کی ضرورتیں، اس کی حسرت اپنی خواہش کے مطابق پوری نہ کر سکوں تو؟"

"تو یوں کہو نا کہ ذمہ نہیں لینا چاہتے۔ بھئی ہم نے یہی سنا کہ آدمی جب کسی کام کا ذمہ لے لے تو پھر وہ ہو جاتا ہے۔"

مائی خیراں کی منطق میری سمجھ میں نہ آئی اور میں اس کے مشورے کو ٹالتا گیا۔ اور شاید ابھی چند برس اور اسی طرح گذر جاتے لیکن ایف۔ اے پاس کرنے کے بعد جب ہم کشمیر کی سیر سے لوٹے تو غیر آباد مکان کی [illegible] نے کسی بگولے کی طرح مجھے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اس وقت وہ چار منزلہ مکان جس میں آسائش کی ہر چیز موجود تھی مجھے، اُن اہرام مصر کی طرح معلوم ہوا جن پر یہ عبارت کندہ ملتی تھی کہ اس میں داخل ہونے والا زندہ نہیں رہ سکتا۔ اور ایک پُراسرار آواز میرے کانوں میں گونجی:۔

"بیاہ کرلو۔ دلہن لے آؤ۔ گھر سنبھال لے اپنا۔"

میں نے مڑ کے دیکھا لیکن وہاں کوئی نہ تھا۔ مگر میں سوچنے لگا۔ اس مکان کو گھر بنانے کے لئے واقعی کسی عورت کی ضرورت تھی۔ اس کے سرد چولھے کو سلگانے کے لئے اس سانس کی ضرورت تھی۔ جو زندگی کو حرارت

شتا ہے اور جو آدم کے سانس سے مل کر زندگی کو بقا عطا کرتا ہے۔

میری عمر اُس وقت بائیس برس کی تھی۔ میرے والد کے انتقال کو
ات سال اور والدہ کو چار سال گذر چکے تھے۔ امتحانوں میں بار بار ناکامی
دسے اس طرح منسوب تھی کہ لوگوں کو میری کامیابی کا یقین نہیں آ رہا تھا۔
مری آوارگی کے چرچے تھے —— ناولیں پڑھتا ہے۔ کہانیاں لکھتا ہے
رتوں کے پیچھے گھومتا ہے۔ مُنڈے دیکھتا ہے۔ شراب پیتا ہے۔ اور
عر کہتا ہے —— اس نامۂ اعمال کے بارے میں مجھے صرف یہ کہنا
کہ کاش اس کے بہت سے اندراجات کا میں اقرار کر سکتا لیکن میرے
م زمانہ مُصر تھے کہ میں واقعی اتنا تجربہ کار ہوں۔ ایسے میں، میرے بزرگوں
نام کے باوجود کون تھا جو اپنی بیٹی کا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دیتا۔ پھر
ری بھی تو ایک ضد تھی۔

میں ابھی بچہ ہی تھا جب اس زمانے کے دستور کے مطابق میرے
الد نے اپنے ایک خوشحال دوست کی بیٹی سے میری نسبت ٹھہرا دی تھی
ن لڑکی والوں کے حالات بگڑ گئے اور ایک بزرگوار نے جو اپنی بیٹی کو کسی
خاندان میں لگانا چاہتے تھے کچھ ایسی باتیں کیں کہ ابا نے برسوں پہلے کی
ت کو یہ کہہ کر ختم کر دیا کہ لڑکا ابھی تعلیم کے لئے انگلستان جانا چاہتا ہے
رو وغیرہ...... مجھے یہ بات بُری لگی۔ میں نے کہا کہ شادی ہوگی تو
ںہوگی جہاں پہلے بات ٹھہری تھی —— سات سال بعد مجھے اپنی
ت پھر یاد آ گئی۔ میں نے اپنی منگیتر کو (اُسے اس وقت میں منگیتر بھی
ں کہہ سکتا تھا) بچپن میں دیکھا تھا۔ میری عمر اُس وقت کوئی دس برس کی
ی۔ اور وہ کوئی چھ برس کی۔ میرے بچپن کی یاد جوان ہو گئی اور میرے
ہن نے اس میں وہ رنگ بھرے جو تصویر ہی کا حصہ ہوتے ہیں ——
ے خوابوں کا پیکر میری زندگی کا مقصد بن گیا۔ مگر ابا کے انکار کے
اس تک رسائی کیسے ہوتی —— رشتے کی بھابیاں، بہنیں اپنی پسند کا
ستہ چاہتی تھیں۔ میری بات سے اُن کے ماتھے پر بل پڑ گئے —— میرے
ڑے بھائی نے کہا کہ خیراں کو بھجوا دو۔ اور ایک دن جب مائی خیراں
مری نظروں سے اماں کے کمرے کی طرف تا رہی تھی۔ میں نے بات
ر دی۔

"مائی خیراں۔ تم کہا کرتی ہو دُلہن لے آؤ۔"

"تو اور کیا۔ گھر سنبھال رہنا کے اپنا۔ کب تک رکھوالی کرو گے بیٹھے۔"

"تمہیں یاد ہے اماں کیا کہا کرتی تھیں"

مائی خیراں اماں کے کمرے کی طرف دیکھنے لگی۔

"ہاں"

"تم ہی لاؤ گی"

مائی خیراں کا چہرہ گویا سامنے سے روشنی میں آ گیا اور اس نے
کھڑے کھڑے دس رشتے گنوا دیئے لیکن اس میں اس کا نام نہیں تھا جسے
میں نے بچپن میں دیکھا تھا۔ میں نے بتایا تو مائی خیراں چپ ہو گئی۔

"کیوں مائی؟ کیا سوچ رہی ہو؟" میں نے پوچھا

"کچھ نہیں"

"تو"

"جو اللہ کو منظور۔ اگر کہیں اور بات پکی نہیں ہو گئی تو بیاہ لائے گی"

"ڈرتا ہوں کہیں انکار نہ ہو جائے!"

"دیکھیں گے"

مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ ایک دنیا کو دعوتِ مبارزت
دے رہی ہے۔

اس بات کو آج سولہ برس بیت چکے ہیں۔ میرے بچپن کی منگیتر
آج سولہ برس سے میرے دکھ سکھ کی ساتھی ہے —— ہم جب اپنی
یادوں کا مرقع دیکھتے ہیں تو اس میں ایک تصویر بار بار اُبھرتی ہے۔
اس کے میلے برقعے کے نیچے مہندی رنگے بالوں کی لٹیں نظر آ رہی ہیں۔
اس کے پاؤں میں بغیر ایڑی کے سلیپر ہیں۔ جونٹ کھٹ بچوں کی
طرح سیڑھیاں اُترتے چڑھتے تالیاں پیٹ رہے ہیں۔ وہ کبھی ہم سے
خفا ہو کے چلی جاتی ہے اور کبھی خنگی کو بھول کے پھر چلی آتی ہے۔

ہماری یادوں کے مرقع میں اب خون کی چھینٹیں اور آگ کی لپٹیں نظر آ رہی ہیں۔
سات سات پشت کے پڑوسی دکھ سکھ کے پرانے ساتھی اب ایک دوسرے کو زیادہ سے
زیادہ دکھ دینے کی دھن میں دیوانے ہوتے جا رہے تھے.... مائی خیراں خاندانوں
کی خیریت دریافت کرتی بڑبڑاتی پھر رہی تھی "یہ کیا ہو گیا لوگوں کو۔ یہ تو ایسے
نہیں تھے..... نفرت کی لہر ایک بار دب کے پھر ابھری۔ مائی خیراں کو
خبر ملی کہ مائی تیری گلی میں کوئی مارا گیا —— اس نے برقع سنبھالا
میرے گھر کے لوگ روکتے رہ گئے۔

اسے گئے آج ساتواں سال جا رہا ہے لیکن ہمیں یوں محسوس ہوتا
ہے جیسے اس کے سلیپر نٹ کھٹ بچوں کی طرح تالیاں پیٹنے لگیں گے اور
مائی خیراں اپنے برقع میں ہمارے لئے ضرور کوئی مزے کی چیز لائے گی☆

افسانہ:

برات

امیر محمد آفریدی
اخذ و ترجمہ:۔ رضا ہمدانی

تھکے ہارے ظریف نے جب کنڈا ذرا پر کھڑے ہو کر اپنے گھر کا نظارہ کیا تو اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ نامعلوم قسم کے وسوسوں نے اس کے ذہن پر جالے سے تن دئے۔ اور جیسے اس کے چھالوں بھرے پاؤں زمین کے ساتھ چمٹ کر رہ گئے۔ گھروں کے دروازے کھلے ہوئے تھے اور دوسرے گاؤں کے لوگ چیونٹیوں کی طرح رینگتے نظر آرہے تھے، وہ تشویشناک انداز میں ایک لمحے تک یہ منظر دیکھتا رہا۔ اور پھر تیز تیز قدموں سے روانہ ہو گیا، زمین نے اس کے پاؤں چھوڑ دیئے تھے۔ وہ آبلوں کی سوزش اور سفر کی تھکن کو ایک دم بھلا بیٹھا۔ اب اس کی آنکھوں کے سامنے لیلیٰ اور معصوم صنوبر آکھڑے ہوئے، اس کی عزیز بیوی اور بچہ، انسان کی زندگی کی حقیقی مسرت۔

وہ ابھی اپنے گاؤں تک پہنچا بھی نہ تھا کہ خالہ بیبو نے بین کرتے ہوئے اس کا استقبال کیا:

"میرے مسافر بچے! بے وقت پہنچے۔ بدنصیب کے دل میں آخری ملاقات کا بھی ارمان رہ گیا!"

"آخری ملاقات"! ظریف کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ جیسے کسی نے اس کا خون نچوڑ لیا ہو، وہ کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن الفاظ اس کے حلق ہی میں اٹک کر رہ گئے۔ وہ سمجھ گیا کہ بیبو خالہ یا تو لیلیٰ کے متعلق کچھ کہنا چاہتی ہے۔ یا پھر صنوبر کے بارے میں۔ اس کے ذہن میں جلدی جلدی ان دونوں کی تصویریں پھرنے لگیں ــ محبت کی دیوی لیلیٰ اور دل کا ٹکڑا صنوبر۔ وہ یہ فیصلہ نہ کر سکا کہ ان دونوں میں سے کس کی موت کی خبر کو وہ برداشت کر سکے گا۔

"ہائے بدقسمتی! کاش تم کل آجاتے بیٹا! کل شام تک وہ تمہاری آخری دید کے انتظار میں رہی، اس کی آنکھیں تو مرنے کے بعد بھی تمہاری ہی راہ دیکھتی رہیں۔"

بیبو خالہ کی غمناک آواز دوسری عورتوں کے کہرام میں ڈوب گئی۔

ظریف سر نہوڑائے، لڑکھڑاتا ہوا صحن میں داخل ہوا۔ محلے کی بے شمار عورتوں اور بچوں سے بھرا ہوا صحن اسے صحرائے بے لیلیٰ نظر آیا۔ اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ لیکن اس نے انہیں شرم و حجاب کے رومال سے پونچھ ڈالا۔ اور فرطِ غم سے لرزتے ہوئے ہونٹ دانتوں سے کاٹنے لگا۔ وہ ابھی تک اس چارپائی پر بھی نہ بیٹھا تھا جو ماتی نے اس کے لئے دالان میں بچھائی تھی کہ ماتی کا بھائی اشرف خان آگیا۔ اب اس کے غم شریکوں میں اضافہ ہو چکا تھا۔ لیلیٰ کا ماموں اور اس کی ماں، ان دونوں نے مل کر اس کے بارِ غم کو ہلکا کر دیا۔

"ماتی! صنوبر کہاں ہے؟" ظریف نے کھاٹ پر بیٹھتے ہوئے دریافت کیا۔

"صنوبر! بیٹا، وہ تو لیلیٰ کے بیمار ہو جانے کے بعد سے ہی اپنی ماسی شیریں کے پاس رہتا ہے۔ اور اس کے ساتھ اتنا ہل گیا ہے کہ اب کسی دوسرے کے ہاتھ سے پانی بھی نہیں لیتا، بیچارا صنوبر!" اور یہ کہتے ہوئے ماتی کی باتیں ایک دم سرد آہوں میں تبدیل ہو گئیں۔

"شیریں کہاں ہے؟" ظریف کے سوال میں شبہات کی لرزش تھی۔

"تھوڑی دیر ہوئی، وہ صنوبر کو گود میں لئے قبرستان کی طرف جا رہی تھی!"

اشرف خان نے ظریف کے سوال کا جواب دیا۔

"قبرستان کی طرف!" اور اس کے ساتھ ہی ظریف چارپائی سے اٹھ کھڑا ہوا "کیوں بیٹا! کیا بات ہے!" ماتی نے پریشانی کے عالم میں کھڑے ہوتے ہوئے پوچھا "میں ذرا قبرستان جاتا ہوں"۔ اور ظریف نڈھال، سر جھکائے صحن سے باہر نکل گیا۔ ماتی نے اپنے بھائی اشرف خان کو اشارے سے سمجھایا کہ تم بھی اس کے ساتھ جاؤ۔ لیکن ظریف اتنی دیر میں باہر جا چکا تھا۔ اور جب اشرف خان اس کے پیچھے گیا تو وہ بڑے کھیت کا دوسرا سرا بھی عبور کر چکا تھا۔ اشرف خان بڑبڑاتا ہوا اس کے پیچھے پیچھے جا رہا تھا۔

"کتنی محبت تھی ان دونوں میں! خدا بخشے اس نیک بخت کو! آخر وقت تک اسی کا نام جپتی رہی۔ آہ! یہ غریب کس طرح اپنے ارمانوں کے مزار کی طرف دوڑا جا رہا ہے!" اشرف خاں نے سرد آہ بھرتے ہوئے اپنی بڑبڑاہٹ کا سلسلہ جاری رکھا: "اے خدا! لیلیٰ میری بھانجی اور ظریف کی بیوی تھی، تو ہم دونوں کو صبر عطا کر!" اور جب اس کے دل کا بخار آنکھوں تک آیا تو وہ اپنی غمناک آنکھیں اپنی پگڑی کے شملے سے خشک کرنے لگا۔

ظریف جب قبرستان پہنچا تو اس نے دیکھا کہ شیریں بیٹے ایک قبر کے سرہانے لوحِ مزار کی طرح ساکت و صامت کھڑی ہے۔ اور اس کی غمگین آنکھیں دور افق کے دامن پر پھیلی ہوئی خونیں شفق میں کچھ تلاش کر رہی ہیں۔ اس کے پہلو میں کھڑے صنوبر نے جب ظریف کو دیکھا تو تتلا کر شیریں بیبے سے کہنے لگا "بی بی تپ دادُ، توئی آلہا ہے"[1]

اور جب شیریں نے مڑ کر دیکھا تو اس کی آنکھیں ظریف کے چہرے پر گڑ کر رہ گئیں وہ اشک بھری آنکھوں سے شکایت کرنے لگی "اب کس لئے آئے ہو لالہ؟ میری بہن، آہ! جب وہ مر رہی تھی، تمہارا ہی نام تھا اس کی زبان پر ہم نے تمہیں کئی خط لکھے کہ لیلیٰ سخت بیمار ہے۔ خدا کے لئے جلدی آؤ! لیکن تم لیلیٰ کو کیا کرتے، تم تو ملازمت کے نشے میں مست تھے"! اور جب ظریف نے اس کے جواب میں پنج سالہ صنوبر کو گود میں اٹھا لیا، تو شیریں کی آواز سسکیوں میں ڈوب کر رہ گئی۔ اور معصوم صنوبر، کبھی ظریف کی اشک بھری آنکھوں اور کبھی سسکیوں میں ڈوبی ہوئی شیریں کو سہمی سہمی نظروں سے دیکھنے لگا۔

تھوڑی دیر بعد ظریف، اشرف خاں کے ساتھ لیلیٰ کی قبر سے واپس گھر کی طرف چل دیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے اور قدم منوں بھاری ہو گئے تھے۔ شیریں نے گم سم صنوبر کو اپنی گود میں لے لیا ظریف نے جاتے جاتے ایک بار پھر پلٹ کر لیلیٰ کی قبر کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھا۔ اور ایک دم اس کے صبر و تحمل کا بند ٹوٹ گیا، آنکھوں سے آنسوؤں کے چشمے بہہ نکلے، اشرف خاں نے، ظریف کے کندھے پر دستِ تشفی پھیرتے ہوئے کہا:

"خدا کو یہی منظور تھا بیٹا! صبر کرو۔ جوان پٹھان مرد، عورتوں کی طرح روتا اچھا نہیں لگتا۔ ہمت نہ ہارو لوگوں کو اپنے اوپر ہنسنے کا موقع نہ دو۔ موت تو ایک قرضہ ہے، جو ہر ایک کو ادا کرتا ہے۔ کسی کو پہلے کسی کو بعد میں۔ خوش نصیب رہی ہے جس کے بعد اتنا کوئی ہو جو عزت کے ساتھ اسے آخری منزل تک پہنچا دے۔ اور دعائے خیر سے یاد کرے"!

ظریف نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا: "ماما! وہی جگہ جلتی ہے جہاں آگ لگی ہو"! "بے وقوف، لیلیٰ کی جواں مرگی کا دکھ، تجھ سے زیادہ مجھے پہنچا ہے۔ لیلیٰ، اگرچہ میری بھانجی تھی، لیکن میں نے اسے بیٹی سمجھ کر پالا تھا۔ اگر لیلیٰ کی خاطر نہ ہوتی تو تم جیسے کم ہمت آدمی کے ساتھ میں بات بھی نہ کرتا"!

اشرف خاں غصے میں نہ معلوم اور کیا کچھ کہتا کہ ظریف نے اس کی تمام باتوں کو اس کے منہ میں ہی رہنے دیا اور اونچی آواز سے کہنے لگا "اشرف ماما! مجھ سے غلطی ہوئی، میرا مطلب تمہارا دل دکھانا نہیں تھا۔ مجھے معاف کر دو۔ میرا کوئی قصور نہیں غم نے مجھے دیوانہ کر دیا ہے۔ میرے منہ سے جو کچھ نکل رہا ہے، اس کی مجھے خود بھی خبر نہیں، اشرف ماما! لیلیٰ میرے ارمانوں کو کراہتے چھوڑ گئی ہے۔ میں اس کے بغیر اتنی لمبی زندگی کس طرح گذاروں گا" اور ظریف کی آواز فرطِ غم سے ڈوبنے لگی۔

"زندگی گذر ہی جاتی ہے، یہ گذرنے ہی کے لئے ہے۔ پابہ زنجیر ہو یا گل بدست، زندگی ہر حال میں کٹ ہی جاتی ہے۔ میرے اور تمہارے غموں سے بے نیاز، برق رفتاری کے ساتھ"۔ اشرف خاں نے ظریف کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا: "جس طرح تم نے لیلیٰ کے بغیر چار سال سمندر پار گذارے، بموں اور گولیوں کی بارش، زخمیوں کی دلدوز کراہوں، اور آتش و خون کے دریا میں۔ اسی طرح باقی دن بھی گذر ہی جائیں گے۔ مجھے نہیں دیکھتے کہ میری بیوی کے ہاتھوں کی مہندی بھی نہیں اتری تھی کہ موت نے اسے مجھ سے چھین لیا۔ تم تو خوش نصیب ہو کہ لیلیٰ تمہارے لئے اپنی نشانی صنوبر چھوڑ گئی ہے۔ اب اپنے لئے نہ سہی صنوبر کے لئے جیو۔ اسے خوش رکھنے کی کوشش کرو۔ اب تم ہی اس کے کفیل ہو" اور اشرف خاں ظریف کی طرف ملتجیانہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

"بہت اچھا، اشرف ماما! میں صنوبر کے لئے زندہ رہوں گا، لیلیٰ کی نشانی کو جان سے زیادہ عزیز رکھوں گا" ظریف کی غمزدہ آواز میں خلوص تھا۔ اور کسی کے لئے زندہ رہنے کی سچی تمنا۔

ظریف کی چھٹی میں ایک ہفتہ باقی رہ گیا۔ بہاریں نکہت میں ڈوبی ہوئی رات کو سناٹے اور تاریکی نے اپنی آغوش میں لے رکھا تھا۔ نیچے کی لو نصف شب کے ہلکے ہلکے ہوا کے جھونکوں سے جھوم رہی تھی۔ ظریف چارپائی پر بیٹھا، خواب کی سرحدوں سے دور، غور و فکر کے جھولے

---

[1] "بی بی چپ جاؤ کوئی آ رہا ہے"

میں اڑا جا رہا تھا۔ ایک دم اُس کے سامنے اپنی مامی کی وہ باتیں جو دن کو اس نے لی تھیں۔ جواب طلب انداز میں آکر کھڑی ہوگئیں ۔ "بیٹا! اس دنیا میں خدا کے بغیر میرا کوئی نہیں۔ میں نے لیلیٰ کا ہاتھ تمہارے ہاتھ میں اس لئے دیا تھا کہ میرا کوئی بیٹا نہ تھا۔ میں نے تمہیں کو اپنا بیٹا سمجھا۔ لیکن خدا کو یہ منظور نہ تھا۔ اس نے لیلیٰ کو ہم سے چھین لیا۔ آہ! میرا دل ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا۔ لیکن اب میرا سہارا تم ہی ہو۔ میرا مطلب یہ ہے کہ اگر تمہاری مرضی ہو تو میں شیریںؔ کو تمہارے حوالے کر دوں۔ بیٹا! ذرا اچھی طرح سوچ سمجھ کر جواب دینا۔ کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے یہ ضرور خیال رکھنا کہ میں تمہاری لیلیٰ کی ماں اور صنوبر کی نانی ہوں۔ اور تمہارے فیصلے کے ساتھ بہت سی زندگیاں وابستہ ہیں۔"

اور پھر تمام دن ظریفؔ، صنوبر اور شیریںؔ کو کنکھیوں سے دیکھتا رہا اور دل ہی دل میں کہتا رہا "سچ مچ لیلیٰ کی بہن ہے، کتنی ملتی جلتی ہے لیلیٰ کے ساتھ وہی خد و خال، وہی خو بو۔ اور صنوبر کتنی محبت کرتا ہے اس کے ساتھ۔"

لیکن دوسرے لمحے ظریفؔ کے سامنے اپنی سوتیلی ماں آگئی، وہ بھی شیریںؔ کی طرح خوبصورت تھی، اور پہلے پہل وہ بھی ظریفؔ کے ساتھ بڑی محبت کرتی تھی۔ ایک لمحے کے لئے بھی وہ اسے اپنے سے جدا نہ کرتی، لیکن اس کی اپنی اولاد نے ظریفؔ کی محبت ختم کر دی تھی۔ اور پھر مدتوں اس کے لاتعداد مظالم نے ظریفؔ کو سلگتی ہوئی لکڑی بنائے رکھا اور پھر جب ایک دن صبح تیراہ کے اونچے اونچے پہاڑوں کی چوٹیوں کو الوداع کہہ رہا تھا، تو وہ بھوکا پیاسا ننگے سر ننگے پاؤں چیتھڑے لٹکائے، خون کے آنسو روتا ہوا ماموں کے گھر آگیا تھا۔ اور ماموں اسے اس حال میں دیکھ کر آگ بگولا ہوگیا تھا۔ اور خود اس کے باپ کے پاس گیا تھا۔ اور جب وہ شام کو واپس آیا تو مامی کو بلا کر ظریفؔ کو اس کے سپرد کرتے ہوئے کہا تھا "اسے اپنا ہی بیٹا سمجھو، ظریفؔ کے باپ کی فرسودہ عقل پر اس کی نئی دلہن نے جادو کر دیا ہے۔" اور لیلیٰ سے کہا تھا "بیٹی! ظریفؔ تیرا ساتھی ہے، اس کی خاطر مدارات کرنا۔" اور جب ظریفؔ کو اپنی سوتیلی ماں کا سلوک یاد آیا تو اس نے ایک جھرجھری لی اور دل ہی دل میں عہد کرنے لگا "تو سچ ہے میری! میں ایسا کبھی نہ کروں گا۔ اپنی خوشی کے لئے صنوبر کی زندگی برباد نہیں کروں گا۔"

دوسرے دن اس نے مامی سے یہی کچھ کہا۔ اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہا "میں صنوبر کو اپنے ساتھ لے جاؤں گا، وہاں وہ سبق پڑھے گا۔"

مامی کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا اور اس نے سہمی ہوئی آواز میں کہا "بیٹا صنوبر، شیریںؔ کے بغیر، زندہ کیسے رہے گا! یہ تو کسی کے ہاتھ سے پانی بھی نہیں لیتا، ابھی اس روز جب شیریںؔ بیمار تھی تو یہ سارا دن بھوکا رہا جب تک شیریںؔ نے اسے کھانا نہ کھلایا۔"

"ہاں کچھ دن شیریںؔ کو یاد کرے گا۔ آخر بچہ ہے، بھول جائے گا۔ صنوبر کی دو چار دن کی بامات ہٹ تو میں برداشت کر لوں گا، لیکن سوتیلی ماں کا برا سلوک مجھ سے نہ دیکھا جائے گا۔ اور پھر شیریںؔ مجھے بھی عزیز ہے مامی! میں یہ نہیں چاہتا کہ کسی وقت بھی لیلیٰ کی بہن سے نفرت کرنے لگوں۔"

ظریفؔ یہ کہکر ایک دم خاموش ہوگیا۔

"بیٹا! تمہاری مرضی، جیسا مناسب سمجھو کرو۔ افسوس تم نے نہ تو لیلیٰ کی ماں کی ڈھارس بندھائی اور نہ اس کی بہن کی۔ تم اگر اصرار ہی کرتے ہو تو لے جاؤ صنوبر کو اپنے ساتھ، خدا کرے وہ تمہارے ساتھ ہل جائے، اور شیریںؔ کی یاد اس کے دل سے مٹ جائے مگر میرا دل نہیں مانتا، تم پھر سوچ لو شیریںؔ اپنی ساری عمر صنوبر کی خاطر بغیر شادی کے بتا دینا گوارا کر لے گی۔ تمہاری یہ دھتکار کبھی برداشت نہ کر سکے گی۔" اور یہ کہتے ہوئے مامی کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

"میں نے اچھی طرح سوچ لیا ہے۔ میں صنوبر اور شیریںؔ کی عمریں برباد نہیں کرنا چاہتا مامی!" یہ کہتے ہوئے ظریفؔ اٹھ کر باہر چلا گیا۔

آخر وہ دن آ ہی پہنچا ـــــ صنوبر، خچر پر سوار، اپنے باپ کے ساتھ پشاور روانہ ہوگیا۔ شیریںؔ اپنی ماں کے ساتھ کھڑی اس وقت تک انہیں دیکھتی رہی جب تک وہ کنڈاؤ کے اُس پار نہ اتر گئے۔

کچھ مہینے گذر گئے۔ لیکن معصوم صنوبر کے آنسوؤں کا سلسلہ نہ تھما، ظریفؔ کے اردلی نے اس کے بہلانے کی لاکھ تدبیریں کیں لیکن کوئی بھی کارگر نہ ہوئی۔ شیریںؔ کی یاد کے نقوش اس کے معصوم دل کی لوح سے نہ مٹ سکے۔

ایک دن جب ظریفؔ پریڈ سے واپس آیا تو صنوبر کو شدید بخار میں مبتلا پایا۔ اس کا تکیہ آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا۔ اور اس پر ہذیانی کیفیت طاری تھی۔ اس عالم میں بھی صنوبر کی زبان سے "بی بی، بی بی" سن کر ظریفؔ کا دل نامعلوم خدشات سے بیٹھنے لگا۔

ڈاکٹر کے علاج سے بخار کی شدت تو کم ہوگئی لیکن جب بھی بے ہوشی کا دورہ پڑتا صنوبر ٹھنڈی ٹھنڈی آہوں اور سسکیوں میں "بی بی، بی بی" کر کے شیریںؔ کو یاد کرتا۔ ڈاکٹر کی تدبیر نے تقدیر کے ساتھ بڑی جنگ کی۔ لیکن بے سود، ریت کے رستے کون ہٹ سکتا ہے؟ دوا سے بخار تو اتر گیا لیکن بیماری کی جڑیں نہ کٹ سکیں۔

آخر ایک دن ڈاکٹر نے ظریف کو مشورہ دیا کہ "صنوبر کو گھر لے جائیے۔ اسے دوا سے زیادہ ماں کی ممتا کی ضرورت ہے"

"ماں کی ممتا؟ اگر وہ ہوتی تو یہ دن ہی نہ آتا ڈاکٹر صاحب!" یہ کہتے وقت ظریف کی پتلیاں آنسوؤں میں تیر رہی تھیں۔

"بہرحال اس کے ننھے سے شکستہ دل کو کسی ایسی عورت کی محبت ہی جوڑ سکتی ہے جس میں ماں کی ممتا ہو۔ اسے فوراً گھر لے جائیے سمجھے آپ صاحب!" ڈاکٹر نے تشویش اور ہمدردی کے ملے جلے لہجے میں کہا۔

گرمیوں کا موسم تھا، آدھی رات جا چکی تھی۔ بجلی کی روشنی میں زار و نزار صنوبر ہسپتال کے کمرے میں چارپائی پر بے ہوش پڑا تھا، کمرے میں سناٹا تھا، بجلی کے پنکھے کی آواز ظریف کے کانوں کو ایسی لگ رہی تھی جیسے کوئی بچہ کراہ رہا ہو، سسکیاں بھر رہا ہو، اس نے یہ ساری رات آنکھوں میں کاٹی، وہ تمام رات خدشات و خطرات کے دام میں الجھا ہوا تڑپتا رہا، اور جب صبح ہوئی تو اس نے ہنگامی رخصت حاصل کر کے گھر جانے کی تیاری شروع کر دی۔

عصر کا وقت تھا، دھوپ زرد پڑ چکی تھی، تیراہ کے فلک بوس پہاڑوں کی چوٹیوں اور اونچے اونچے چیل کے درختوں کی پھنگوں سے سورج آہستہ آہستہ اپنا دامن سمیٹ رہا تھا، ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکے درختوں کے پتوں سے سرگوشیاں کر رہے تھے کہ صنوبر کا خچر "کنڈاؤ" پر جا پہنچا۔ شدید چڑھائی کے سبب ظریف سخت تھک چکا تھا، ایک لمحے کے لئے وہ کنڈاؤ کی بلندی پر ٹھہرا، ایک ٹھنڈی آہ بھری، اور پیشانی سے پسینہ خشک کیا، خچر والے نے لگام پکڑ لی، اور ڈھلانوں پر بڑی احتیاط کے ساتھ قدم قدم اترنے لگا۔ ظریف نے اداس مگر للچائی ہوئی نگاہوں سے اپنے گاؤں اور گھر کو دیکھا جو اتنی بلندی سے مٹی کے چھوٹے چھوٹے کھلونے معلوم ہو رہے تھے۔ اور لوگ باگ ان میں یوں آ جا رہے تھے جیسے چیونٹیاں اپنے بلوں میں۔ اور جب اس نے مزید غور کیا تو اسے ایک برات سی جاتی دکھائی دی۔ سرخ کپڑے میں لپٹی لپٹائی دلہن گٹھڑی بنی گھوڑی کی پیٹھ پر سرخ گیند کی طرح لگ رہی تھی، بندوقوں کے فائروں اور نفیری کی آوازیں کسی کے ارمان "اتن ناچ" ناچ رہے تھے اور مختلف ناچ کے دائرے جیسے سارے قبیلے کی تہذیب کا سر چکرا رہا ہو۔ ڈھول کی میٹھی میٹھی آواز، سماج کی مصنوعی قیمت پر قہقہے لگا رہی تھی۔ خچر نے چلتے چلتے ایک ٹھوکر کھائی، صنوبر کو اس جھٹکے نے نیم بے ہوشی کے عالم سے یک لخت چونکا دیا۔ اور جب ظریف اس کے قریب پہنچا تو وہ کراہ رہا تھا "بی بی! بی بی!"

"بیٹا! بس اب گھر پہنچا ہی چاہتے ہیں، وہ دیکھو، بی بی دروازے میں کھڑی تمہاری راہ تک رہی ہے۔" لیکن صنوبر میں اتنی سکت کہاں تھی کہ وہ سر اونچا کر کے بی بی کو دیکھ سکتا۔

اور پھر تھوڑی دیر کے بعد صنوبر، نحیف و نزار صنوبر، اپنی نانی کی گود میں کملائے ہوئے پھول کی طرح نیم جان پڑا تھا گلی محلے کی عورتیں اس کے گرد حلقہ کئے کھڑی تھیں۔ اور ظریف پشیمان و حیران ایک طرف سر لٹکائے کھڑا سسکیاں بھر رہا تھا۔ صنوبر تمام رات بے ہوش رہا اور جب رات رانی کی سیاہ اور بکھری ہوئی زلفیں مشاطۂ سحر نے آراستہ کیں تو صنوبر نے آنکھیں کھولیں "بابا! میری بی بی کہاں ہے؟" اور ظریف پر جیسے سکتے کا عالم طاری ہو گیا، اس کا گلا رندھ گیا، وہ کوئی جواب نہ دے سکا!

"بیٹا! تمہاری بی بی کو تمہارے ابا کی ہٹ نے تم سے جدا کر دیا۔" صنوبر کی نانی ہچکیاں لینے لگی۔ "میں تو ایک سال تک تمہارے ابا کی راہ تکتی رہی۔ کئی پیغام بھیجے لیکن اس نے پروا بھی نہ کی۔ اور تمہاری بی بی خیرن تو پوری برات کے ساتھ تمہیں خوش آمدید کہنے نکلی تھی۔" اور بوڑھی کی آواز اس کی ہچکیوں کے ہجوم میں گم ہو گئی۔ ظریف کی آنکھوں سے آنسوؤں کی ندیاں بہہ نکلیں صنوبر کی کراہیں آہستہ آہستہ دبتی گئیں۔ بوڑھی کی زار نالی سے عرش ہلنے لگا۔ لیکن بقولِ رحمان بابا:

"رونے سے کبھی مردے بھی زندہ ہوئے ہیں"

بوڑھی کی دعائیں اور گریہ و زاری صنوبر کو غلبۂ مرگ سے بچا نہ سکی، ظریف کا زخمی دل اور گرم آنسوؤں سے بھی موت کے فرشتے کا دل نہ پسیجا۔ اور جب سورج کی پہلی کرن نے دنیا کو نئی زندگی بخشی تو صنوبر آخری ہچکی کے ساتھ موت کی آغوش میں سو گیا!

ظریف اپنے لختِ جگر کے سرہانے، سر بزانو بیٹھا رو رہا تھا، صنوبر کی نانی دھاڑیں مار مار کر کہہ رہی تھی "بیٹا! بی بی تو ایک سال تک تمہارا انتظار کرتی رہی، اور تم نے سات دن بھی اس کی راہ نہ دیکھی!"

سات دن گزر گئے۔

قبرستان کا ماحول غم و اندوہ میں ڈوبا ہوا تھا۔ الواحِ مزار ساکت و خاموش مغموم قبروں کے سرہانے استادہ تھیں۔ ہوا کے جھونکے جب زیتون کے پتوں سے ٹکراتے تو سسکیوں کی آوازیں آتیں۔ خیرن نے

(باقی صفحہ ۵۰ پر)

منظوم داستان

ہیر رانجھا (۳)

وارث شاہ
مترجم: رفیق خاور

مقولۂ شاعر

یونہی لڑتے بھڑتے رات کاٹی، صبح ہوتے ہی رانجھا چل نکلا — کیسے ہیر کا جا دیدار کرے، یہی دل میں مسلا میں کرتا تھا
بولیاں مار کے بھائیوں نے دیا بھگا، اپنا دیس وطن سب بھول گیا — وارث! رب بھی ہے کتنا بے پروا، جس نے عاجزوں کو یوں خوار کیا

رانجھا کی مسجد سے روانگی

چڑیاں بولتے ہی جو چلے راہی، دیکھے دودھ بلونے کی دھوم مچی — صبح صادق کا سب جگ نور پھیلا، کُھلیں آن پہنچیں چلاتی ہوئی
کوئی اُٹھ کر دہی بلونے لگی، کوئی دودھ کے باسن مانجھتی تھی — کوئی چلنے لگا ہل پھیرنے کو، کہیں بینیوں کی تھی ڈھونڈ پڑی
لے کے چلے وہ جوڑیاں بیلوں کی جنہیں کھیتوں کو دینا تھا پانی — گھر والیاں چکی چلانے لگیں، جیسے روٹیاں ڈھیروں پکانی تھیں
کاروبار میں لگا جہان سارا، عورتیں اُٹھ کر چرخے گھمانے لگیں — . . . .
پانی دینے کو رہٹ چلانے لگے، بیٹھے گادی پہ ساٹنے لے کے چھڑی — ملی وانے کو گدھے کمہار کسیں، اور جولاہوں نے کی تیار مانڈی
زاہد وضو کر کے تسبیح پکڑیں، بانگ مسجدوں میں ملاؤں نے دی — کیا کوچ سراؤں سے قافلوں نے نوبت گونج اُٹھی صبح چلنے کی
رانجھا چل کے ندی تک آن پہنچا، جہاں پار لے جاتے تھے مانجھی — وارث! اللّٰہن ملاح، بڑی تو ند والا، جیسے بنیوں کی کپّی شہد بھری

رانجھا کی منت سماجت

کہا رانجھے نے پار لے جا بابا، مجھے کشتی میں رب کا واسطہ ہے — "میں رب کا واسطہ کیا جانوں؟ مجھے صرف طلب کا واسطہ ہے
ہمیں رزق کمانا ہے جیسے بھی ہو، ناؤ کھینے میں ذر کا واسطہ ہے" — ہاتھ جوڑ کے منتیں کرے رانجھا، منت کرنے میں رب کا واسطہ ہے
مجھے آنے دو کشتی میں بہرِ خدا، جیو جیو گا رب کا واسطہ ہے — وارث! روٹھ کے آگیا بھائیوں سے جلدی کرنے میں سب کا واسطہ ہے

ملاح

پلیہ کمول کے دھرے جو ہاتھ پہ تو، لے کے گود میں پار اُتارتا ہوں — یونہی شہد لٹے جو شور سے مغز چاٹے میں اٹھا کے زمین پہ مارتا ہوں
جو کوئی کپڑے دے اور نقد مجھ کو، اس کے سارے کام سنوارتا ہوں — چور ڈاکو جو آن کے جھولی بھرے، پروا میں نہیں اس کی پھاڑتا ہوں

لے: کمیرے ۔ سلہ: اصل لفظ اس سے کہیں زیادہ شنیع ہے۔

زبردستی جو ناؤ میں آن چڑھے، آدمی رہ میں ڈبو کر مارتا ہوں — واسطے تو بہو کے کشتی میں بیٹھا پڑا پار ہی پار پکارتا ہوں
ڈوموں، جوگیوں فقیروں، مفت خوروں سب کو دُور ہی دُور دھتکارتا ہوں — وارث شاہ جیسے پیرزادوں کو مطلق کشتی میں نہیں گزارتا ہوں

رانجھا کی آزردگی

رانجھا منتیں کر کر ہار تھکا، آخر دور کنارے سے جا بیٹھا — چھوڑ کے آگ بیگانی، گوشے میں اپنا پریت الاؤ جلا بیٹھا
گئے اور فراق میں پڑا روئے، بول جسی پہ دل کے بجا بیٹھا — جو بھی گھاٹ پہ مرد اور عورتیں تھیں سب کو اپنے گرد بلا بیٹھا
. . . . — ماجھی غصے میں منہ پر کف لائے، کیسے دونوں کے دل ہرا بیٹھا
دوڑو گاؤں والو! ایک جاٹ چتر یہاں اور ہی رنگ جما بیٹھا — مرد عورتیں اس نے موہ لئے، وارث جانے ہے کون بلا بیٹھا

رانجھا کی دریا کی طرف روانگی

رانجھا باندھ کے تُلا[1] تیار ہوا، پاؤں جا دریا میں لٹکائے — لوگ کہتے رہے یونہی کود نہ تو، تیری جان جائے جیسے نیر جائے
بیویاں لڈن ماجھی کی روک دیں، رانجھا روکنے سے کب باز آئے — "ڈوب مرے گا مورکھ!" سب نے کہا، جان دیکھ چناب کی لہر جائے
کہا رانجھے نے دکھی کو موت بھلی، سکھی کب ہے دیس جو چھوڑ آئے — "رزق چلے موت بہانے سے" گھر بیٹھے نہ کوئی خیر پائے
دکھ پایا جو ماں اور باپ مرے، دشمن یوسف کی طرح سب ہاں جائے — وارث شاہ کو آسرا رب کا ہے، کہو اور وہ کس کے پاس جائے

لوگوں کا رانجھا کو منع کرنا

سو سو بانس چناب کا انت نہیں، ڈوب مرے گا چل نہ سمجھنا تو — تجھے شاؤں پہ رے کے جاتے ہیں، یونہی جا مرے نے کل نہ سمجھنا تو
تو نے عقل شعور سب چھین لیا، اُلٹی چالیں چل نہ سمجھنا تو — پتلی بن کر آنکھوں میں ڈال ڈیرا، دیکھ ذرا کبھی ٹل نہ سمجھنا تو
دست بستہ غلام ہیں ہم تیرے نیچ ڈال، پر سہل نہ سمجھنا تو — وارث شاہ میاں! تیرے ہم قربان، یونہی دل کو مسل نہ سمجھنا تو

رانجھے کو کشتی میں بٹھانا

دونوں بانہوں سے پکڑ کر رانجھے کو، کشتی کے بیچ دھکیل ڈالا — تقصیر معاف کر آدم کی پھر اُس کو بہشت میں پہنچایا
عزازیل کو خواب میں دیکھ کے پھر اُسے عرش بریں پر بٹھا دیا — وارث شاہ کو جلدی نہلا کر، بیوی ہیر کے پلنگ پہ دیا چڑھا

پلنگ کی حقیقت

کیا پلنگ ہے یہ جو بیچ ڈالا؟ — کہا لوگوں نے ہیر جٹیٹڑی[2] کا — یہ آرام کی جا ہے سر بھری، عشق مشاک کے بستر لیٹڑی کا
شاہ پری کی بھی ملے جس سے اماں، ہے مقام اس مشک لپیٹڑی کا — وہ بورانی ہے سیالوں کے ترنجنوں کی مہر چوچک خاں کی بیٹڑی کا

---

[1] بگڑس سا گٹھا [illegible] سیا کو پکا جاتا ہے۔ [2] اس بند کے تمام قافیے وارث شاہ کے [illegible] زور بیان ظاہر کرتے ہیں۔ اس لئے ان کو بجنسہ پیش کر دیا ہے: جٹیٹڑی، جاٹ [illegible] بیٹھنے والی، مشک لپیٹڑی۔ مشک میں لپٹی ہوئی، بیٹڑی۔ بیٹی، چھٹیٹڑی۔ گھائل کرنے والی، نیٹھرڑی۔ نیوڑائے [illegible] حدت اعلیٰ [illegible] ہوئی، چکٹیٹڑی۔ خالب چک کے مالک کی بیٹی۔ سلٹیٹڑی، سیال قوم کی عورت، مہر بیٹڑی۔ مہر یعنی چودھری کی بیٹی

اسے ملے جہاں میں نہ کوئی اماں، جو ہو گھائل ایسی پھیٹیڑی کا　　بڑا جھنگ میں ہے قسمت کا دھنی تار پود سیالوں کی شیڑی کا
یہ ہے تسیر کی جا اس کمانی کی، ذوق شوق میں جیو تیسٹڑی کا　　ایک حکم رواں ہے سہیلیوں پر، جس بالڑی عشق سیٹڑی کا
جیسے باگھ کا خوف ہو بکری کو، ویسے لڈن کو خوف چکیٹڑی کا　　ہم سارے ملاح اور گھاٹ تین، سب پہ حکم ہے اسی سلیٹڑی کا
ساتھ سکھیوں کے کرے سیر سدا، باپ مانتا حکم ہر ٹیٹڑی کا　　وارث شاہ میاں! جگ جانتا ہے نام ہیر ہے حسن لپیٹڑی کا

مقولۂ شاعر

ناؤ کہاں کی، برات کی بیٹھک تھی، جو کوئی آتا اس کو بلا لیتا　　چھوٹے بڑے، امیر فقیر سارے کس سے پوچھنا، کس دیس کا تھا
جیسے شمع پہ گریں پتنگ دھڑ دھڑ، آر پار بندھا تھا اک تانتا　　گویا خضر کا ہالکا اتر آیا، ہر کوئی نذر کو شیرینی لاتا
لڈن نے اسے پار نہ پہنچایا، اس پہ رہ رہ کر پچھتاتا تھا　　. . . . .
ہر ہر شخص سے کہتا پھرے لڈن، اسے ڈھنگ آتا ہے موہنے کا　　اک بلاوے کے ساتھ یہ جان لے لے پنچھی گراتا ہے ہرن پھنسا لیتا
ٹھگ سنے مشہور بنارس کے، یہ تو ٹھگ ہے چناب کی وادیوں کا　　وارث شاہ! ولی ہے ظاہر یہ، ابھی دیکھو ملاح پھنسے گی کیا

جھنگ میں چرچا

جا حسینوں نے گاؤں میں چرچا کیا، سگھڑ ناؤ میں اک پڑا گیت گائے　　بات کرنے میں منہ سے پھول جھڑیں لاکھ لاکھ اک بات کا مول پائے
. . . .　　وارث شاہ! کنواریاں آفتیں ہیں، دیکھو ابھی کوئی نیا فتور لگنے!

لوگوں کا استفسار

"میاں کون ہو تم؟" کہا لوگوں نے، "ان پانی بھی کسی نے لاکے دیا؟　　ساری رات گزاری ہے تم نے یونہی گھونٹ دودھ کا کسی نے پلایا؟
تیرا جسم شہزادوں کی طرح نازک کیوں دکھوں سے اسکو پھونک ڈالا؟　　اپنے پیاروں کو چھوڑ کے کیوں بھاگا؟ بدھی ماں کو باپ کا دل توڑا؟
تجھے آنکھوں سے اوجھل کیسے کیا؟ کن دشمنوں کا قول پورا کیا؟　　وارث حال ہوگا ماں باپ کا کیا جن کا لال نظر سے دور ہوا؟

رانجھا کی آپ بیتی

ان لوگوں کو رانجھے نے اپنا سارا حال احوال سنا ڈالا　　ماں باپ کے گھر تو تھا لاڈلا میں، دیکھو رب نے ہے کھیل دکھایا کیا
ماں باپ مرے تو پڑی آفت، مجھے بھائیوں نے گھر سے راند دیا　　وارث! اسباب کے بغیر نہیں آس کوئی، بدلے ٹھاٹ کے فقر کا بھیس بھرا

رانجھا کا آرام کرنا

ہنس کے رانجھے نے رات گزار ڈالی، صبح اٹھ کے جی کو اداس کیا　　راہ چلتے کو جھونپڑی نظر آئی، ڈیرا آ ملاحوں کے پاس کیا
آگے پلنگ تھا ناؤ میں بچھا ہوا، اس پہ خوب بچھونے کو راس کیا　　بیچ ناؤ بجا کر ونجلی کو، اس نے پلنگ پہ عام و خاص کیا
لوگ گرد بیٹھے، رانجھا گاتا رہا، ہر کسی کے جی کو راس کیا　　وارث شاہ! جا ہیر کو خبر ہوئی، تیری سیج کا جاٹ نے ناس کیا

ہیر کے دیس میں

مغربی پنجاب کی دیہی زندگی



’’ دیکھئے دودھ بلونے کی دھوم مچی ،،



’’ کاروبار میں لگا جہان سارا ،،



قلعہ رہتاس
(سرحد)



قدیم قلعہ کا ایک برج



"عظمت دیرینہ کے آثار"

چوڑی فصیل



راجہ مان سنگھ کا بنوایا ہوا محل



لڑکیوں کی تعریف

کیسے کریں تعریف سہیلیوں کی اک دیری سے نینوں کے ملنگ بنتے
بھاری جسم کی گوریاں، حسن روشن، عاشق دیکھ چراغ پتنگ بنتے

سرمہ کھلا کالک[1] منہ بھارتا ہے، اب دیکھو محبوبوں کی جنگ بنتے
ہیں دریائے چناب کے نازنیں سارے، اصلی سیالوں کے ہیں جھنگ بنتے

ابرو جیسے کمانیں لاہور کی تھیں، پاس پلکوں کے تیر خدنگ بنتے
جیسے نقش بچے تھے سیالوں میں ایسے بیچ نہ چین فرنگ بنتے

ہاتھ ہاتھوں میں ڈال مٹکتی چلیں عاشق مارنے کے بڑے ڈھنگ بنتے
زلفیں ناگنیں کالی مکھڑے پہ خاطر عاشقوں کے تھے ڈنک بنتے

پانچ تورے کی چنریاں چہرے پہ کنگن ہاتھوں میں شوخ اوشنگ بنتے
ماتھے سجدوں کے محراب بجل صفیں چوٹیوں کی، خوب سنگ بنتے

گھر بار اجاڑ بھول بھال چلیں، سڑے چرخے پاس چورنگ بنتے
جنہیں شوق ہے وارث، راجھن کا، بات چیت میں ہی اک انگ بنتے

ہیر کی آمد

لے کے ساتھ سہیلیاں ساتھ آئی ہیر روپ گمان کی متوالی
موتیا اور کہ بھرکانوں میں جھولتا تھا کسی حور پری کی شان بھاری

لال کرتی پھبتی تھی سینے پر، اڑا ہوش زمین آسمان کا بھی
بلاق ناک میں جیسے قطب تارا، ڈولی حسن کے غضب طوفان میں تھی

اسے ہندوں والی، آٹل جا تو، آگے کئی گئے تبو تان کے ری!
وارث شاہ میاں اچھی غضب کی وہ بھری کبر گھمنڈ اومان کی تھی

ہیر کا حسن

کیا ہیر کی کرے تعریف شاعر، چمک ملتے پر مہتاب کی تھی
خونی چوٹیاں، چاند کے گرد جیسے شب کو سرخ لکیر شہاب کی تھی

نین نرگسی ہرن موہے کے، لہک گالوں میں پھول گلاب کی تھی
بھویں جیسے کمان لاہور کی ہو، حد کوئی نہ حسن، شباب کی تھی

سرمہ نینوں کی دھار میں پھبتا ہوا، چڑھی ہند پہ فوج پنجاب کی تھی
ساتھ سکھیوں کے جھولتی آتی تھی، پر جھولتی شان عقاب کی تھی

کھلم کھلا ترنجنوں میں گھومتے جیسے ہتھنی مست نواب کی تھی
جو تھے دیکھنے کے مشتاق ہوتے، اک قیامت ان کے عذاب کی تھی

سندر چہرے پہ نقش و نگار پیارے، خوشخطی یہ حرف کتاب کی تھی
چلو لیلۃ القدر کی کرو زیارت وارث! طلب یہ کار ثواب کی تھی

ہیر کے نقش و نگار

ہونٹ سرخ یاقوت کہ لعل چمکیں، ٹھوڑی سیب ولایتی بہار میں سے
دانت چنبے کی لڑی کہ ہنس موتی، دانے نکلے حسن انار میں سے

ناک تیغ حسینی کی نوک تیکھی، زلف ناگ خزانے کی بار میں سے
چینی نقش کشمیر کی جنتی سا، قد سرو، بہشت گلزار میں سے

گردن کونج کی، انگلیاں روانہ پھلیاں ہاتھ نرم ہے برگ چنار جیسے
. . . .

سنگی ہونٹوں کی، وموم دبلے کی، خوب ہے، کھتری کل بازار میں تھے
باہیں ڈال کے کمن چلی ہوئیں سینہ سنگ مرمر گنگ دھار میں سے

شاہ پری کی بہن پنج پھول رانی، چھپی رہے نہ ہیر ہزار میں سے
ساتھ سکھیوں کے شکتی مان بھری جیسے ہرنیاں تیز ہوں بار میں سے

لنکا باغ کی پری کہ اندر رانی، حور نکلی چاند کی دھار میں سے
گڑیا چین کی نقش تھے روم والے، اتر آئی یہ چاند اجاڑ میں سے

جیسے غضب کی تیز تلوار چمکے، یک لخت میان کی دھار میں سے
جو کوئی دیکھتا حسن جمال اس کا کھاتا زخم ہزار تلوار میں سے

(باقی آئندہ)

---

[1] کالک لشکر بار کے علاقے میں زہریلے سانپوں کی مشہور جگہ۔ [2] دریا [3] گنگا کے کنارے پہاڑی جگہ۔

غزل

عابد علی عابدؔ

دیکھتے ہیں مرے اشعار میں صاحب نظراں — وصفِ خوباں کا تماشا بہ حدیثِ دگراں

اس کے ریزوں کی چبھن ہی مجھے سامانِ نشاط — وہ جو شیشہ مرے پہلو میں تھا اے شیشہ گراں

ایک میں آبلہ پا دشتِ بلا سے گذرا — ہار کے بیٹھ گیا قافلۂ ہم سفراں

پسِ دیوار سمٹتے ہوئے سائے ہیں گواہ — ابھی آئے گا یہاں نور کا سیلِ گذراں

یہی مسکن، یہی گلشن، یہی زنداں ہے ہمیں — تیری محفل سے کہاں جائیں گے آشفتہ سراں

کوئی بتلاؤ مجھے پھاند کے دیوارِ چمن — آج کس رخ پہ گیا نالۂ خونیں جگراں

آستیں میں رسن و دار نہاں رکھتے ہیں — وہ جو اس دور کے منصور ہیں اے دیدہ وراں

کب اُترتا ہے یہاں قافلۂ فصلِ بہار — دیر سے باغ میں ہے دیدۂ نرگس نگراں

سب ہیں محفل میں کہ عابدؔ کو غزل خواں دیکھیں

دلبراں، گُل بدناں، نغمہ گراں، دیدہ وراں

غزل

سراج الدین ظفر

کل رات اس طرح کوئی زلفِ دوتا کھلی
فہرستِ آرزو زدگاں جا بجا کھلی

شب ہوگئی خنک جو اٹھی وہ نقابِ رخ
موسم بدل گیا جو وہ زلفِ دوتا کھلی

ڈالی خرابی دو جہاں پر جو اک نظر
کیا کیا نہ سازشِ نگہِ سرمہ سا کھلی

بھرنے لگے شلنگ غزالانِ خوردسال
آئی نظر جو حلقۂ رنداں میں جا کھلی

خالی ہنر سے تھی کسی نوخیز کی نظر
دل کی گرہ جو آج کھلی بھی تو کیا کھلی

آزردہ دل تھے زندگیٔ سست رو سے ہم
آئے غزال شب تو طبیعت ذرا کھلی

ہر بات کا ہوا سرِ میخانہ فیصلہ
ہر شب یہاں عدالتِ قدر و قضا کھلی

آئی تھی آج خلوتِ گل میں ترانہ سنج
دیکھا ہمیں تو پھر نہ زبانِ صبا کھلی

پوچھیں گے ایک آہوئے رم خوردہ کا پتہ
ہم سے کبھی جو گردشِ دوراں ذرا کھلی

میخوار ایک دور میں پہنچے سرِ ابد
خم کیا کھلا کہ راہ گذارِ بقا کھلی

اے زلف، دستِ شوق کی کوشش کے باوجود
کچھ ابتدا کھلی، نہ تری انتہا کھلی

خلوت میں سب ہوا ترے قامت کا راز فاش
کھلتی نہ تھی جو بات یہاں برملا کھلی

تھا حسنِ کائنات خریدار کے بغیر
ہم آ گئے تو قیمتِ ارض و سما کھلی

دن بھر شعور خوابِ گراں میں تھا مبتلا
کھنکے جو شب کو جام تو چشمِ ذکا کھلی

کیا صدق تھا ہماری نوا میں ظفر نہ پوچھ
حسنِ غزل کھلا کہ بیاضِ صفا کھلی

غزل

ناصر کاظمی

درد کانٹا ہے اس کی چبھن پھول ہے
درد کی مسکراہٹ کرن پھول ہے

اڑتا پھرتا ہے پھلواریوں سے جدا
برگِ آوارہ جیسے پون پھول ہے

اس کی خوشبو دکھاتی ہے کیا کیا سمے
دشتِ غربت میں یادِ وطن پھول ہے

تختۂ ریگ پر کوئی دیکھے اسے
سانپ کے زہر میں رس ہی پھن پھول ہے

میری لَے سے مہکتے ہیں کوہ و دمن
میرے گیتوں کا دیوانہ پن پھول ہے

غزل

فارغ بخاری

لالہ زاروں کو ڈس گئی ہے خزاں
اب بنائیں گے آشیانہ کہاں

دیکھ کر آپ کو مچل ہی گیا
دل ناداں ہے پھر دل ناداں

اس جہاں میں تو تجکو پا نہ سکے
اب کریں تیرا انتظار کہاں

اب یہاں فصلِ گل کی قید نہیں
کوئی موسم ہو چاک ہے داماں

میری ناکامیوں کا حال نہ پوچھ
اپنی رہ میں ہوں آپ سنگِ گراں

چل پڑا ہے سفینۂ غمِ دل
دیکھئے جا کے ڈوبتا ہے کہاں

اک نظر میں ہی بک گیا فارغ
ہم سمجھتے تھے دل کو جنسِ گراں

مشرقی پاکستان کی عوامی رسمیں

احسن احمد اشک

مشرقی پاکستان کا رقبہ ۵۴۹۲۰ مربع میل اور اس کی آبادی چار کروڑ سے زیادہ ہے۔ اس صوبے کی قدیم تاریخ ماضی کے اندھیرے میں دفن ہے۔ مسلمانوں کے ہزار سالہ عہدِ حکومت میں اسے تاریخ کی روشنی میسر ہوئی اور اسی زریں عہد میں اس کی آبادی کا بیشتر حصہ بغیر کسی جبر و تشدد کے مشرف بہ اسلام ہوا۔ یہاں کے ہندوؤں کے قبولِ اسلام کی داستانیں بڑی پرلطف ہیں۔ اس سلسلے میں T.W. ARNOLD کی کتاب PREACHING OF ISLAM اور ڈاکٹر انعام الحق کی تاریخ تصوّف "HISTORY OF SUFISM IN BENGAL" خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

مشرقی پاکستان اپنی شادابی اور ہریالی کے لئے جنت نظیر ہے — اگر ایک طرف یہ ندیوں نالوں اور دریاؤں کا دیس ہے تو دوسری طرف یہ درویشوں اور صوفیوں کا وطن بھی ہے۔ مشرقی پاکستان میں تبلیغ اسلام کا کام صوفیوں، درویشوں اور سوداگروں نے کیا۔ ناچ، رنگ، موسیقی یا اس قسم کے دوسرے فنونِ لطیفہ اسلام میں ممنوع ہیں مگر اس کے باوجود یہاں ان کی کثرت ہے — یہاں کی آبادی کا بیشتر حصہ دیہاتوں میں آباد ہے اور دیہاتوں کا سماجی ماحول آج بھی وہی ہے جو صدیوں پہلے تھا۔ شہری زندگی میں گو کہ تصنع اور بناوٹ روز بروز بڑھتی اور پھیلتی جارہی ہے۔ اس کے برعکس یہاں کی دیہاتی زندگی میں قدیم ٹھہراؤ، سکون اور سادگی اب بھی موجود ہے۔ انقلاب کے طوفان عموماً شہروں پر برس کر نکل جاتے ہیں ان کے جھٹکے دیہاتوں میں بعد کو محسوس ہوتے ہیں اور وہ بھی بہت ہی ہلکے ہلکے۔

مشرقی پاکستان کی دیہاتی زندگی پر گرد و پیش کی فضا اثر انداز ہے۔ زندگی ہر حال میں مسرت کی دلدادہ ہے، یہ مسرت ڈھونڈتی ہے اور مسرت کے رستے مسدود نہیں — دیہاتی زندگی اگر سائنس کے جدید ساز و سامان سے آراستہ نہیں تو نہ سہی، یہ حصولِ مسرت کے ذرائع نکال ہی لیتی ہے، ایسے دلچسپ ذرائع جن میں معصومیت بھی ہے اور رنگینی بھی، سادگی بھی ہے۔ اور پُرکاری بھی۔

مشرقی پاکستان کی رومانی فضا میں نغمے اور گیت پروان چڑھتے ہیں۔ صدیوں سے یہاں عوامی گیتوں کا ایک سلسلہ جاری ہے اور نہیں معلوم کب تک جاری رہے۔ یہی وہ گیت ہیں جو یہاں کے بسنے والوں کی ذہنی ساخت ان کی تہذیب و معاشرت اور ان کے رہن سہن کے طور طریقوں کے آئینہ دار ہیں۔ بچے کی پیدائش کے ساتھ ساتھ ڈھولک اور گیتوں سے فضا گونجنے لگتی ہے چھٹے دن بڑے اہتمام اور دھوم سے چھٹی کی رسم منائی جاتی ہے۔ عورتیں خاص طور پر مل کر گیت گاتی ہیں۔ یہ رسم دراصل ہندوانہ ہے مگر مسلمان کاشتکاروں میں عام ہے۔

بچہ جب کچھ بڑا ہوتا ہے تو چاول کھلانے کی رسم ادا کی جاتی ہے جسے مقامی زبان میں "بھات کھا دانی" کہتے ہیں۔ عورتیں اس رسم میں بھی پیش پیش رہ کر اسے اپنے گیتوں اور گانوں سے رنگین بناتی ہیں۔

پھر جب بچہ آٹھ سال کا ہوتا ہے تو ختنے کی رسم ادا کی جاتی ہے جسے مقامی بولی میں "مسلمانی دیوا" کہتے ہیں۔ مشرقی پاکستان میں عام طور پر عورتیں پردہ نشین ہوتی ہیں، زندگی میں انہیں ایک دوسرے سے ملنے ملانے کا موقع کم ہی نصیب ہوتا ہے۔ عزیز و اقارب دور دراز کے دیہاتوں سے یکجا ہو کر جشن مناتے ہیں اور دل کھول کر گاتے ہیں۔

شادی بیاہ کے موقعوں پر یہاں گانے اور گیت رسم کے طور پر گائے جاتے تھے۔ ہندو مسلمان دونوں اس کے دلدادہ تھے خاص طور پر چاٹگام کے علاقے میں اس رسم کے بغیر کوئی شادی مکمل نہیں سمجھی جاتی تھی۔

نسبت کے ٹھہرتے ہی پڑوس کی عورتیں دلہن کے گھر اور مرد دولہا کے گھر پہنچکر مبارک باد کے گیت گانا شروع کر دیتے۔ ڈھول باجوں کے ساتھ خوشی اور مسرت کا اظہار لاٹھی کے کھیلوں کے ذریعہ بھی کیا جاتا۔ بیاہ کے دن مرد کہار بن کر نوشاہ کی پالکی اپنے کاندھوں پر اٹھائے دلہن کے گھر تک لے جاتے ہیں۔ شادی کی مختلف رسموں سے متعلق خاص خاص گیت وضع کئے گئے ہیں۔ دلہن اور نوشاہ کو نہلانے کے گیت، سنوارنے کے گیت، حجامت کے گیت غرض یہ اور اس قسم کے بیشمار گیت اب بھی ذہنوں میں موجود ہیں۔

راج شاہی ضلع کے نوگاؤں علاقے میں ہندو لڑکیوں کی ٹولیاں سرخ و سبز لباس پہنے کے بعد دیگرے دلہن کے گھر پہنچکر ناچتی گاتیں اور معاوضے کے طور پر پیسے اور چاول لیتیں۔ انگریزی تعلیم اور نئی تہذیب کے سبب یہ رسمیں ختم ہوتی جا رہی ہیں، اونچے گھرانوں میں ناچنا اور گانا اب معیوب سمجھا جاتا ہے۔

پوس کے مہینے میں مشرقی پاکستان کی دیہاتی زندگی میں خوشی اور مسرت کی ایک لہر دوڑ جاتی ہے، دور دور تک پھیلے ہوئے دھان کے کھیت سنہرا روپ دھار لیتے ہیں، زمین گویا سونا اگلنے لگتی ہے۔ ہوا میں بسنتی اور دھانی آنچل لہرانے لگتے ہیں۔ فضا گنے اور کھجور کے نئے گڑ کی خوشبو سے بس جاتی ہے۔ گھر گھر رساول، کھیر اور پکوان بڑے اہتمام سے پکائے جاتے ہیں۔ رات کے وقت پیپل یا برگد کے تلے رکھوالوں اور کسانوں کی ٹولیاں جمع ہوتی ہیں۔ آگ جلائی جاتی ہے اور اس کے گرد بیٹھ کر گیتوں اور گانوں کا سلسلہ شروع ہوتا ہے اور رات بھر جاری رہتا ہے۔ اس موقع پر عموماً جو گیت گائے جاتے ہیں وہ "جاگ گان" کے نام سے مشہور ہیں۔ ہندو کسان اور رکھوالے کرشن جی اور دوسرے ہندو دیوتاؤں کی مدح و ستائش کے گیت الاپتے ہیں اور مسلمان مانک پیر اور سونا پیر کے قصیدے پڑھتے ہیں۔ سونا پیر اور مانک پیر کو مشرقی پاکستان کے عوامی گیتوں میں بڑی اہمیت حاصل ہے، یہ دونوں بزرگ اپنے معجزوں اور کارناموں کے لئے بہت مشہور ہیں۔ پبنہ ضلع میں "سونا بازو" "سونا جھیل" اور "سونا پرگنہ" اپنے ناموں سے سونا پیر کی یاد آج بھی تازہ کئے ہوئے ہیں۔ "جاٹ ہر" سونا پیر کی خواب گاہ ہے اور اس علاقے کے مسلمانوں کے لئے زیارت گاہ۔ یہاں ایک قدیم مسجد بھی ہے۔

صوفیوں اور درویشوں کی بدولت مشرقی پاکستان میں اسلام کی بنیادیں بڑی مستحکم ہیں۔ ہر خوشی اور غم کے موقع پر یہاں میلاد اور فاتحہ خوانی کی رسم عام ہے۔ اگلے وقتوں میں شادی بیاہ کے موقعوں پر جس طرح گانوں اور گیتوں کی رسم عام تھی اسی طرح غم کے موقعوں پر بھی گیتوں سے کام لیا جاتا۔ موتا کے گھر میں پڑوس کی عورتیں جمع ہو کر بین کیا کرتیں اور مرنے والے یا مرنے والی کی خصلتیں گا گا کر بیان کیا کرتیں، اب یہ رسم بالکل ختم ہو چکی ہے۔

شہری زندگی میں محبت اور خلوص کا فقدان ہے۔ مگر دیہاتی زندگی میں امیر اور غریب ایک دوسرے کے خوشی اور غم میں برابر کے شریک ہیں۔ شب برات میں یہاں دیوالی کی سی شان ہوتی ہے۔ امیر غریب اپنی بساط کے مطابق گھروں میں چراغاں کرتے ہیں۔ بچے اور جوان ہوائیاں پھلجھڑیاں، اور پٹاخے چھوڑتے ہیں، حلوے اور روٹیاں پکائی اور تقسیم کی جاتی ہیں۔ بڑے بوڑھے عبادت اور تلاوت میں رات گذار دیتے ہیں۔ اسی طرح عید بقر عید کے موقعوں پر عام طور پر خوشیاں منائی جاتی ہیں۔ سویوں کا پکنا ازبس ضروری ہے۔

وہابی تحریک سے پہلے پیر پرستی اور مزار پرستی یہاں عام تھی۔ مگر رفتہ رفتہ یہ کم ہوتی جا رہی ہے اور اب قیام پاکستان کے بعد یہ بالکل روبہ زوال ہے۔ بزرگان دین کے مزاروں پر نذر و نیاز کا سلسلہ پہلے کی طرح جاری ہے اور عرس کے موقعوں پر اچھے خاصے میلے لگ جاتے ہیں۔

آج سے تقریباً ۲۵ سال پہلے غازی میاں اور شاہ مدار کے جلوس اکثر مقامات سے نکلا کرتے تھے، مشرقی پاکستان کے تمام ضلعوں میں بوگرا اس معاملے میں بہت ہی پیش پیش تھا۔ چنانچہ شیرپور کے علاقے میں غازی میاں کے نام پر کچھ زمینیں بھی وقف تھیں جن کی آمدنی اسی تقریب پر صرف کی جاتی، اب یہ رسم مفقود ہو چکی ہے۔

حضرت خضر سے متعلق ایک رسم "بیڑا" کے نام سے یہاں بہت مشہور تھی، عورت اور مرد دونوں اس تقریب میں حصہ لیتے۔ پھول مہندی اور رنگین کاغذوں سے سجا کر گیت اور گانوں کے ساتھ "خضر کے بیڑے" کو دریا کی موجوں کے حوالے کر دیا جاتا۔ یہ رسم بھی اب مشرقی پاکستان سے ناپید ہو چکی ہے۔

شہدائے کربلا کی یاد میں یہاں عام طور پر عقیدت کے آنسو بہائے جاتے ہیں۔ محرم کے دس دن مرثیہ خوانی نذر نیاز، کھیر کھچڑے دیگر مقامات کی طرح یہاں بھی رسم کے طور پر موجود ہیں۔ تعزیہ داری کا رواج کم ہے مگر لاٹھی اور تلوار کے کھیل عام ہیں۔ جلوس بڑے

اہتمام اور شان و شوکت سے نکالے جاتے ہیں۔ مقامی زبان میں جلوس کو لوگ "مِشل" کہتے ہیں ۔ مرد عورت، بوڑھے، بچے اور جوان مشل کے بے انتہا دلدادہ ہیں جن راستوں سے ہو کر یہ مشل گزرتے ہیں وہاں تماشائیوں کا ایک سیلاب امڈتا نظر آتا ہے ۔

مشرقی پاکستان کے عوامی گیتوں میں "زاری" گانے سب سے زیادہ مقبول اور محبوب ہیں ۔ ان کے سُر تال اتار اور چڑھاؤ میں بنگال کا وہ جادو پنہاں ہے جو اپنی تیزی اور گرمی سے پتھر اور فولاد کو بھی پگھلا دیتا ہے سننے والا خواہ وہ زبان سے واقف ہو یا نہ ہو، مسحور ہو کر رہ جاتا ہے۔ دراصل یہ گیت ظلم اور ناانصافی، جبر اور تشدد کے خلاف بیکسوں اور مجبوروں کی ترنم اور موسیقی میں ڈوبی ہوئی فریادیں ہیں جو روح کو تڑپا کر سینوں میں بغاوت اور انتقام کے آتشکدے بھڑکا دیتی ہے دیہات کی آبادی ساکت اور جامد اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھی اسے سنتی ہے ۔ فضا پر ایک رقت آمیز خاموشی طاری رہتی ہے ۔

کربلا کی تپتی ہوئی زمین، لُو کے تھپیڑے، پانی کے لئے بچوں کا بلکنا، یزید اور شمر کی سخت دلی اور سقاکی حسینؓ کا صبر اور تحمل، غرض کربلا اور اس کے سارے خونچکاں واقعات کو گانے والے اپنے گیتوں میں بیان کر دیتے ہیں۔

آج سے سترا اسی سال پہلے حضرت شاہ علی بغدادی کا عرس بڑی دھوم دھام سے ہوا کرتا تھا، آپ کا مزار میرپور میں ہے جو ڈھاکہ سے کچھ فاصلے پر آباد ہے۔ احسن منزل کے سامنے بوڑھی گنگا کے ساحل سے کشتیوں، بجروں اور ڈونگوں کا ایک رنگین کاروان عرس کے موقعہ پر روانہ ہوتا۔ لوگ پھول صندل اور شیرنی خوانچوں اور چنگیروں میں لئے ہوتے، ہر کشتی پر مراسین ہوتیں اور عقیدت کے گیت گاتیں۔ گیت ڈھاکے کی مخصوص اردو میں ہوتے جس کشتی کا گانا سب سے بہتر ہوتا اسے انعام ملتا ۔ چنانچہ گانوں کا ایک اچھا خاصا مقابلہ ہو جاتا۔ نواب سلیم اللہ کے والد نواب احسن اللہ اکثر اس قسم کی تفریحوں میں حصہ لیا کرتے ۔ واپسی پر راستے میں تیگن باڑی کے مقام پر رنگ رلیوں کا بیکارواں کچھ عرصے کے لئے رک جاتا ۔ نواب صاحبان یہاں شیر کا شکار کھیلا کرتے۔

مشرقی پاکستان اور کشتیاں لازم و ملزوم ہیں۔ برسات کے موسم میں یہاں ندیوں اور دریاؤں کا مزاج بہت تند ہو جاتا ہے، ان میں ایک سیلابی کیفیت ہوتی ہے، ملاحوں اور ماہی گیروں کے لئے یہ زمانہ بڑا ہی حوصلہ فرسا ہوتا ہے ۔ آندھیاں، طوفان، تلاطم، منجدھار اور اس قسم کی بے شمار مصیبتوں کا مقابلہ کرنا کوئی آسان کام نہیں۔ چپو کھیتے کھیتے بازو شل ہو جاتے ہیں ۔ ماحول کی تلخیوں کو دور کرنے کے لئے ایسے موقعوں پر مشہور لوک سنگیت "ساری" سے کام لیا جاتا ہے جسے سب مل کر گاتے ہیں ۔

قیام پاکستان کے بعد یوم آزادی کی تقریب بڑے جوش و خروش سے منائی جاتی ہے، گھر گھر چراغاں ہوتا ہے، قومی جھنڈے بلندیوں پر لہرائے جاتے ہیں، کہیں قوالی کی محفلیں آراستہ کی جاتی ہیں تو کہیں کشتیوں کا مقابلہ ہوتا ہے ۔ خاص طور پر بوڑھی گنگا میں کشتیوں کا مقابلہ کافی دلچسپ ہوتا ہے ۔ اسے دیکھنے کے لئے دریا کے دونوں کناروں پر دور دور تک لوگوں کا ہجوم ہوتا ہے ۞

○

برات

بقیہ صفحہ ۱۷

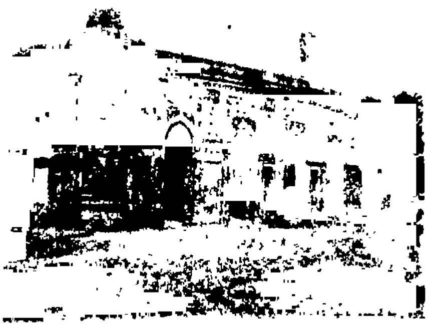
لیلیٰ کی قبر کے پہلو میں ایک ننھی سی قبر کے سرہانے لوح مزار کی طرح گم سم کھڑی تھی۔ اس کی صدف ایسی آنکھوں میں آنسو موتیوں کی طرح بھرے ہوئے تھے اور وہ ان موتیوں کو آنکھوں میں لئے دور افق کے شفق آلود دامن میں کچھ تلاش کر رہی تھی ۔۔ ظریف سر جھکائے مضمحل، صنوبر کی قبر کی طرف آ رہا تھا لیکن آج شیرینے کو توتلی زبان سے کوئی یہ کہنے والا نہ تھا۔ "بی بی ننھی ڈاڈا ، توئی آ رہا ہے"

مشرقی پاکستان

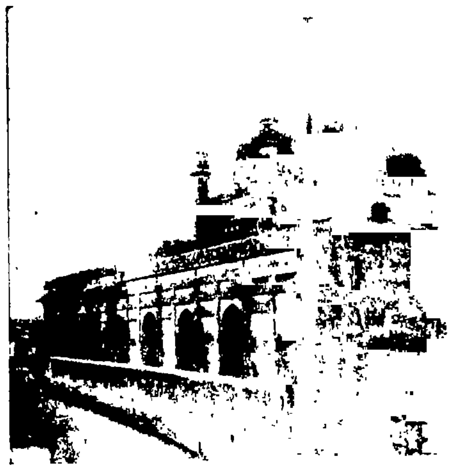
(قدیم فن تعمیر کے نمونے)



(۱)



(۳)



(۲



(۴)

۱ - مسجد ست گنبد - ڈھاکہ

۲ - مسجد خان محمد میرو - ڈھاکہ

۳ - باگھا مسجد - راجشاہی

۴ - ایک قدیم شاہی مسجد - جیسور

۵ - ڈھاکہ کی ایک پرانی مسجد



روڈ ہز مجسٹی
سلطان سعود
بن عبدالعزیز



چی میں نماز جمعہ کی امامت



درگئی پاور ہاؤس کا افتتاح



وزیر اعظم پاکستان کے ہاں عشائیہ



میئر بلدیہ کراچی
شاہ کی خدمت میں
حقوق شہریت
پیش کر رہے ہیں

ثقافت

تمدنِ عالم اور موسیقی (۳)

سجاد سرور نیازی

چندرگپت موریا ۲۹۷ ق.م میں فوت ہوا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا بندوسارا اور پھر اشوک تخت نشین ہوا۔ کلنگ کی لڑائی کا اشوک کے دل پر اس قدر گہرا اثر پڑا کہ اس نے اپنا طریق عمل یکسر بدل دیا اور بدھ مت کی پیروی اختیار کرکے سپاہ سالاروں اور جنگی سرداروں کی جگہ دھرم مہاماتری مقرر کئے تاکہ وہ اخلاقی و مذہبی امور میں رعایا کی رہنمائی کریں۔ اس نے جگہ جگہ استوپا یعنی مذہبی گول گھر تعمیر کرنے کا حکم دیا، چٹانوں اور لاٹوں پر بدھ مت کے زریں اقوال کندہ کرائے اور مشرق و مغرب میں مبلغ بھیجے۔ جنوبی ہند، سیلون، شام، مصر اور وہ علاقے جہاں سکندرِ اعظم کے جانشین برسرِ اقتدار تھے، بدھ مت سے اثر پذیر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔

یوں تو موریا حکومت کے دوران میں یونانی پاٹلی پترا اور دیگر بڑے شہروں میں آباد ہو گئے، اور بااکثر نے اپنا مذہب بھی تبدیل کر لیا تھا لیکن اس خاندان کے کمزور ہو جانے کے بعد ملک چھوٹے چھوٹے راجواڑوں میں تقسیم ہو گیا، اور یونانی نسل کی وسط ایشیا میں رہنے والی قوموں نے دوبارہ ہندوستان پر حملے کرکے کم از کم پنجاب کو اپنے علاقے میں شامل کر لیا، اس طرح شمال مغربی ہندوستان دو سو سال تک یونانیوں کے قبضے میں رہا۔ چونکہ اب یونانی حکومت نے اپنے قدم جما لئے تھے، اس لئے یونانی علماء، حکماء اور اصحابِ فن ہندوستان میں بڑی تعداد میں آئے۔ اور حکمت و فن سے اپنے زیرِ نگیں علاقوں کو مالا مال کیا۔ بہت سے ہندوستانیوں نے شمالی افغانستان اور ترکستان میں مستقل سکونت یا بغرض تجارت بود و باش اختیار کر لی، نتیجہ یہ ہوا کہ یونانی اور ہندی نغمے ایک ہی فضا میں الاپے جانے لگے اور اکثر و بیشتر دونوں قوموں کی موسیقی کے قواعد اور قوانین کے اختلاط سے گانوں کی طرزیں مرتب ہوئیں، بالکل اسی طرح جس طرح آجکل پاکستان اور ہندوستان میں مغربی موسیقی کی دھنوں کو اپنایا جا رہا ہے۔ اور ان پر ہندی اور اردو زبان کے گانے باندھے جا رہے ہیں۔

جب بھی دو مختلف قوموں کی معاشرت کا آپس میں ملاپ ہوا تو ایک دوسرے کی موسیقی کے دونوں قوموں کی زبان میں چربے اتارے گئے۔ قدامت پسند لوگ چیختے چلاتے رہ جاتے ہیں کہ فنِ موسیقی کی تذلیل ہو گئی۔ آبا و اجداد کی وراثت میں ناموزوں پیوند لگ گئے، وغیرہ وغیرہ لیکن ہونے والی بات ہو کر رہتی ہے، باہمی تعلقات سے جہاں زبان، لباس، خورد و نوش، رسم و رواج اور دیگر مشاغل میں تبدیلیاں پیدا ہو جاتی ہیں وہاں فنونِ لطیفہ بھی نئی راہیں ڈھونڈنے لگتے ہیں، اور انوکھی شکلیں اختیار کر لیتے ہیں۔ موجودہ زمانے کے فلمی گانوں پر ناک بھوں چڑھانے والوں کے باوجود مشرق کی موسیقی پر مغربی رنگ تیزی کے ساتھ چڑھ رہا ہے اور پھر ایسے حالات میں کہ انگریز ملک سے جا چکے ہیں اور محکومیت کا احساس ختم یا انتہائی درجے تک کمزور ہو چکا ہے۔

ہندوستان نے یونانی طب کو حاصل کیا، یونانیوں نے آیورویدک طریقۂ علاج اور جڑی بوٹیوں کے علم سے فائدہ اٹھایا۔ شاہ مینانڈر نے جب بدھ مذہب اختیار کیا تو اپنے قدیم دیوتا "اپالو" کے نمونے پر رومی سنگتراش سے مہاتما گوتم بدھ کا ناک نقشہ تیار کرایا اور ہندوستانی سادھوؤں کا لباس پہنایا۔ گندھارا میں بدھ کے ان ابتدائی بتوں نے ہندوستانی بت تراشوں کی ذہنیت میں کافی انقلاب پیدا کیا۔ دوسرے فنون کے ساتھ بھی یہی معاملہ پیش آیا۔

پہلی صدی عیسوی میں جب پارتھین نے یونانی باختریوں سے ان کا ملک چھین لیا تو پنجاب اور اس کی سرحدوں سے یونانی اثر و اقتدار اٹھ گیا، اور ایک نئے دور کا آغاز ہوا پہلے پارتھین اور اس کے بعد کشان خاندان نے ہندوستان کو زیر نگین کیا۔ پارتھین نے ٹیکسلا کو دارالخلافہ بنایا، اور متھرا اور کاٹھیاواڑ تک اپنا نظم و نسق پھیلایا۔ پچاس سال کے اندر اندر پارتھین کے قدم بھی اس حکومت سے اکھڑ گئے۔ اور کشان قوم سندھ اور بنارس کے علاقوں تک ہندوستان پر چھا گئی۔ کشانوں کا سب سے بڑا بادشاہ کنشک تھا جس نے بدھ مت اختیار کر کے اس مذہب کی بہت بڑی خدمت کی، رفتہ رفتہ اس نے اپنی مملکت میں کشمیر، یارقند، ختن بھی شامل کر لئے۔ اس کے ملک کی سرحدیں بخارا سے سندھ اور ایران سے بہار تک پھیلی ہوئی تھیں۔ کشان خاندان نے تقریباً ایک سو ستر برس تک حکومت کی ۲۲۰ء میں اس کے خاتمے پر ملک پھر چھوٹے چھوٹے حصوں میں تقسیم ہو گیا، اور اسی حالت میں ہندوستان نے ایک سو برس اور گزار دیئے۔ موریا حکومت کی ابتدا یعنی ۳۲۴ ق۔م سے لیکر ۳۲۰ عیسوی تک کے زمانے میں موسیقی اور دیگر فنون لطیفہ کو ترقی حاصل کرنے کا کافی موقع ملا۔ یہ وہ زمانہ ہے جس میں ایک ہی بادشاہ یا راجہ کی حکمرانی میں ہزاروں میل لمبے چوڑے علاقے آ گئے۔ سلطنت کا نظام پہلے سے کہیں بہتر ہو گیا اور ملک میں امن بڑھ گیا۔

اس عہد کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ کاشتکاروں کو عزت کی نگاہ سے دیکھا گیا اور ان کو بڑی رعایات دی گئیں۔ عوام کے تین درجے تھے، کاشتکار، چرواہے اور شکاری۔ کاشتکار کھیتی باڑی کرتے، چرواہے مویشیوں کی نگہبانی کرنے اور ان کے لئے چارہ مہیا کرتے، شکاری جنگل کے درندوں اور دیگر مہلک اور خطرناک جانوروں سے انسانوں اور حیوانوں کو محفوظ رکھتے۔ ان دیہاتیوں پر ملک کی خوراک اور دیگر آسائشوں کا انحصار تھا۔ اس لئے ان کی ہستی کو باعث صد برکت سمجھا جاتا۔ یہاں تک کہ لڑائی کے دنوں میں بھی طرفین کی فوجیں نہ تو فصل کو تباہ و برباد کرتیں اور نہ دیہاتیوں کو کسی طرح کا نقصان پہنچاتیں۔ کاشتکاری کے لوازمات کو مکمل رکھنے اور دیہاتی زندگی کی روزمرہ کی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے لوہار، بڑھئی، بنجارہ، جولاہا، تیلی، کمہار، سنار، چمار وغیرہ گاؤں کی آبادی کے ضروری اجزا تھے۔ دھرم کرم کے لئے پروہت، شادی بیاہ اور خوشی کے موقعوں کے لئے گانے اور ناچنے والے بھی ہوتے۔ زرعی پیداوار کی افراط تھی۔ دیگر اشیائے خوردنی کی بھی فراوانی تھی، ایسے حالات میں فنون لطیفہ کس طرح نہ پلتے۔ دل خوش کرنے کے لئے قصے کہانیاں گھڑی گئیں، یونانی خوش بیان ڈی اون کریسوسٹوم کہتا ہے کہ ہندوستان میں یونانی اقتدار کے زمانے میں ہومر کے کلام کا مقامی زبان میں منظوم ترجمہ مقامی طرز اور انداز میں گایا جانے لگا۔ مذہبی بھجنوں کے علاوہ دیگر مضامین بھی گیتوں کی شکل و صورت اختیار کرنے لگے، حقیقت میں یہ لوک گیت کی ترقی کا زمانہ تھا۔ مذہبی کیرتن تو عبادت کا ایک ضروری حصہ تھے، شادی بیاہ کے گیت، سال کی مختلف فصلوں کے گیت، تہواروں کے گیت، ہل چلانے، نلائی کرنے، فصل کاٹنے اور کھلیان پر کام کرنے کے گیت، کشتی رانی، رہٹ بانی کے گیت۔ یہ گیت دیہاتی فی البدیہہ تیار کرتے تھے۔ زمانے کی رفتار کے ساتھ ساتھ ان کے لفظوں اور طرزوں میں معمولی تبدیلیاں ہوئیں، اصلی ڈھانچے قریب قریب وہی رہے۔ ان چھ صدیوں میں ہندوستانی دیہاتیوں کی خوش حالی نے ہندی لوک گیتوں کو معیار کمال پر پہنچایا، بڑے بڑے شہروں اور درباروں میں ان گیتوں نے راگ راگنیوں کی شکل اختیار کی اور بعد میں ہندی کلاسیکی موسیقی کے سرمائے میں انہی کی بدولت معقول اضافہ ہوا۔

اس زمانے میں ہندوستانیوں کی یونان اور اٹلی میں سالہا سال آمد و رفت رہی، اور کئی ہندوستانی مفکر، تاجر اور سیاح ایتھنز کی علمی مجلسوں اور سکندریہ کی منڈیوں میں مصروف کار نظر آتے تھے، یونانی حکیموں اور سائنس دانوں کے لئے ہندوستانیوں کے دل میں بڑی توقیر تھی بلکہ ان کو رشیوں کا درجہ دیا جاتا۔ ادھر یونانی مصنفین نے ہندی رشیوں کے متعلق اپنی تصنیفات میں تعریفی جملے لکھے ہیں۔ پہلی صدی عیسوی میں بھڑوانچ مشرق کا ایک بہت بڑا تجارتی مرکز تھا۔ وہاں کا راجہ مغرب سے عمدہ قسم کی شرابیں، گانے والے لڑکے، اور حرم کے لئے خوبصورت لڑکیاں نیز چاندی کے قیمتی برتن، باریک ملبوسات، اور بہترین خوشبودار کریمیں منگوایا کرتا تھا۔ مغربی ممالک ہندوستان سے موتی، قیمتی پتھر، گرم مصالحے اور بنگال کی باریک ململ منگواتے تھے۔ مشرق اور مغرب کی اس باہمی تجارت سے دونوں کے فنون لطیفہ ایک دوسرے سے متاثر ہوتے رہے

سنہ ۳۲۰ء میں مگدھ کا ایک خاندانی نوجوان چندرگپت سپاہیوں کی ایک معمولی سی جماعت کے ساتھ پاٹلی پتر پر حملہ آور ہوا، اور اس کے اردگرد کے علاقے کو بھی مسخر کر کے گپتا خاندان کی حکومت قائم کر دی، اُس کا بیٹا سمدرگپت باپ کی وفات کے بعد سنہ ۳۲۶ء میں تخت نشین ہوا، تھوڑے ہی عرصے میں اس نے آگرہ، اودھ، اڑیسہ، چھوٹا ناگپور، بنگال اور دکن کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا، سمدرگپت نہ صرف ایک اعلیٰ درجے کا کوی تھا بلکہ مروّجہ سنگیت کا بھی بہت بڑا ماہر تھا۔ ملک بھر میں اس سے بہتر وینا بجانے والا کوئی نہ تھا۔ اور اس کو اس فن پر اتنا ناز تھا کہ اُس کے عہدِ حکومت کے مروّجہ سکّوں میں سے ایک پر اُسے وینا بجاتے ہوئے دکھایا گیا ہے، اُس کے دربار میں بے شمار علماء، فضلاء، شاعر، اور موسیقی داں موجود تھے۔ اس کے علاوہ اس نے دوسرے مختلف علاقوں کے موسیقار اپنے دربار میں ملازم رکھے ہوئے تھے، لہٰذا اس کے دورِ حکومت میں شاعری اور موسیقی کے فنون نے خاص طور پر بڑا عروج حاصل کیا۔

سمدرگپت کے بعد اس کا بیٹا چندرگپت ثانی اس لحاظ سے بہت خوش قسمت تھا کہ اس کے زمانے میں علم ادب، ڈرامہ، اور فنِ موسیقی کو بہت فروغ حاصل ہوا۔ اور بہت سی کتابیں نظم، گیت اور ڈرامہ پر تصنیف ہوئیں۔ سنسکرت کا مشہور کوی کالیداس جس نے رزمیہ نظم "رگھوامساہ" گیتوں کا مجموعہ "میگھ دوت" اور ڈرامہ "شکنتلا" تصنیف کیا۔ اس کے دربار میں ملازم تھا۔ اس کا عہدِ حکومت سنسکرت لٹریچر، اور فنونِ لطیفہ کی تاریخ کا سنہری باب سمجھا جاتا ہے۔

اس زمانے تک لوک گیت کے علاوہ کلاسیکی موسیقی بھی ایک حد تک نشو و نما پا چکی تھی، مگر کلاسیکی موسیقی کے گیتوں کے بول عموماً مذہبی رنگ لئے ہوئے تھے جن میں ہلکا پن کسی عنوان بھی مناسب نہ تھا۔ وید کے منتروں کی طرزوں میں بھی سنگیت کے اعتبار سے بہت سادگی مگر ثقاہت تھی۔ لہٰذا چندرگپت کے زمانے میں ایسی موسیقی ایجاد کرنے کی ضرورت پیش آئی جس میں تفریح کا سامان زیادہ ہو۔ اس مقصد کو پورا کرنے کے لئے سنگیت نے ڈرامے اور اسٹیج کو سنوارنا شروع کیا، ڈرامہ دھارمک ہو یا خواہ سوشل اس کی موسیقی میں تفننِ طبع کا حصہ زیادہ رکھا گیا اور اس قسم کی موسیقی کو بڑی شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی۔ کلاسیکی موسیقی کی تنظیم سن ۳۵۵ ق۔م سے ذرا پہلے شروع ہو چکی تھی، جبکہ بھرت نے "نٹ شاستر" کے نام سے ایک بسیط کتاب ڈرامہ، ناچ اور سنگیت کے فن پر تصنیف کی تھی، اور جس میں سُر، شُرتی، سپتک، گرام اور مورچھنا پر بھی بحث کی گئی تھی، اور سنگیت جاتیوں سے مرتب تھا، راگ راگنیوں کا سلسلہ باقاعدہ طور پر ابھی نہیں چلا تھا۔ راگ راگنیوں نے کہیں چوتھی صدی عیسوی کے لگ بھگ جا کر جنم لیا، اور یہ زمانہ چندرگپت وکرمادتیہ کا تھا۔ اسی زمانے میں "متنگ" نامی ایک شخص نے سنگیت پر ایک کتاب لکھی جس کا نام "براہت دیشی" تھا۔ اس میں سنگیت کو راگ راگنیوں سے مرتب کیا گیا۔

سنہ ۶۰۶ء میں ہرش نے قنوج کو راجدھانی بنا کر ایک بہت بڑی سلطنت کی بنیاد رکھی، یہ راجہ شاعر تھا، اور ڈرامہ لکھنے میں بھی بڑی دسترس رکھتا تھا، اس نے اپنے دربار میں بڑے بڑے کوی اور اربابِ فن جمع کر لئے۔ ملک میں امن تھا اور کھانے پینے اور پہننے کی چیزوں کی کوئی کمی نہ تھی، جابجا درسگاہیں کھولی گئیں جن میں ابتدائی تعلیم کے بعد شاستروں کی تعلیم دی جاتی تھی یعنی (۱) گرامر (۲) طب (۳) منطق و استدلال (۴) فلسفہ (۵) فنونِ لطیفہ اور دستکاری۔ فنونِ لطیفہ میں شعرگوئی، ڈرامہ نویسی، تصویرکشی، اور موسیقی شامل تھی، موسیقی میں رقص، سازنوازی اور گائیکی کی مکمل تعلیم دی جاتی تھی۔ چونکہ اس دور میں رقص و سرود کا دور دورہ تھا اسلئے بڑی تعداد میں لڑکے اور لڑکیاں اس فن کو ان درسگاہوں سے حاصل کرتی تھیں۔

مشہور چینی سیّاح ہیوان سانگ سنہ ۶۳۰ء میں ہندوستان آیا اور سنہ ۶۴۵ء میں افغانستان اور ترکستان سے ہوتا ہوا واپس چین پہنچا۔ جب وہ صحرائے گوبی سے گذر رہا تھا تو اُسے کم از کم دو ایسے آباد اور شاداب مقام ملے جہاں کے باشندوں کی تہذیب و تمدن، ان کی معاشرت اور ان کے فنون مختلف قوموں کے اختلاط کا ایک خوب صورت نتیجہ تھے، پہلا مقام "ترفان" تھا، یہاں ہندوستانی، چینی، فارسی اور یونانی تمدن نے مل کر ایک نئی خوش آیند شکل اختیار کر لی تھی، بدھ مت اور سنسکرت زبان دونوں ان پر اثر انداز تھے، دوسرا مقام "کچہ" تھا۔ وسط ایشیا کے اس شہر میں بھی مخلوط قسم کی تہذیب تھی۔ یہاں کے لوگوں نے مذہب اور فنونِ لطیفہ ہندوستان کے اختیار کر رکھے تھے، تجارت اور معاشرتی قوانین ایران کے مرہونِ منت تھے اور زبان سنسکرت، ایرانی

(باقی صفحہ ۵۹ پر)

ر۔ خ

نقد و نظر

تنقیدیں اور خاکے

از جلیل قدوائی
ناشر:۔ اردو اکیڈمی سندھ۔ مشن روڈ۔ کراچی
صفحات ۱۹۰، قیمت تین روپے

جلیل قدوائی صاحب ہمارے ان پرانے لکھنے والوں میں سے ہیں جو ایک خاص وضع کے مالک ہیں اور اپنے موضوعات کی طرف ایک خاص انداز میں اعتنا کرتے ہیں۔ ان کی تحریروں میں اُن گئے دنوں کی جھلک نظر آتی ہے جب نگار اور علی گڑھ میگزین۔ جلیل صاحب مدتوں ثانی الذکر کے مدیر رہ چکے ہیں۔ میں تنقید زیادہ تر سوانح نگاری کی شکل میں ظاہر ہوتی تھی۔ اور آج کل کی طرح ذہنی، معاشری، نفسیاتی اور فنی تجزیوں کا زور نہ تھا۔ جلیل صاحب کو خود بھی اس کا احساس ہے۔ چنانچہ انہوں نے اپنے نقوش کو بجا طور پر 'خاکے' قرار دیا ہے۔ ساتھ ہی وہ فرماتے ہیں کہ "میں نہیں کہہ سکتا کہ ان مضامین کو تنقید جیسے اعلیٰ اور مقدس فن سے منسوب کرنا کہاں تک صحیح ہے مگر کسی اور فن سے نسبت دینا بھی مشکل معلوم ہوتا ہے ...... کہا جاتا ہے کہ اردو کے موجودہ دور میں تنقید نے بے حد ترقی کی ہے۔ میں اتفاق سے اب سے ذرا پہلے پیدا ہوا تھا" اس سلسلہ میں ان کی اپنی رائے ہی کو سند سمجھنا چاہئیے۔

اس میں شبہ نہیں کہ خاکہ کشی کی حد تک جو جلیل صاحب کا خاص میدان ہے۔ زیرِ نظر مجموعۂ مضامین نہایت دلچسپ اور کامیاب ہے۔ اس کی وجہ غیر معمولی عقیدت ہے جو جلیل صاحب اپنے پسندیدہ اہلِ قلم کے ساتھ پیدا کر لیتے ہیں۔ اور ان کی عادات و اطوار کے بارہ میں ایسی چھوٹی چھوٹی تفصیلات پیش کرتے ہیں کہ ہم ان میں کھو جاتے ہیں۔ اس سلسلہ میں ان کی بامحاورہ زبان بہت مدد دیتی ہے اور عبارت میں خوب چٹخارہ پیدا کر دیتی ہے۔

انتخاب حسرت

از جلیل قدوائی
ناشر:۔ اردو اکیڈمی سندھ
صفحات ۲۳۰، قیمت دو روپے

حسرت موہانی

(طبع ثالث)

از عبدالشکور ایم اے (علیگ)
ناشر:۔ انوار بک ڈپو لکھنؤ
صفحات ۲۰۰، قیمت دو روپے آٹھ آنے

جلیل قدوائی صاحب کو مولانا حسرت موہانی مرحوم سے جو شیفتگی رہی ہے۔ اس کا تقاضا تھا کہ وہ ان کی شخصیت اور کلام دونوں کا تعارف کرائیں۔ جلیل صاحب نے یہی خدمت ۱۹۲۶ء میں انجام دی تھی۔ اور "انتخاب حسرت" کے نام سے ایک مجموعہ ترتیب دیا تھا۔ یہ انتخاب بہت مقبول ہوا۔ مولانا کی وفات کے بعد اس کام کو مزید اہتمام کے ساتھ سرانجام دینا لازمی تھا۔ ہمیں مسرت ہے کہ جلیل صاحب نے پھر اس کا بیڑا اٹھایا اور کلام حسرت کا ایک "بالکل نیا اور سیر حاصل" انتخاب تیار کر کے شائع کرا دیا۔ شروع میں فاضل مرتب کا وہ مضمون بطور "مقدمہ" درج ہے جو مولانا کی وفات پر "ماہ نو" میں شائع ہوا تھا۔ اور جس میں شاعر کے ذاتی حالات اور کلام کے بعض پہلوؤں کو اجاگر کیا گیا ہے۔

خود مولانا نے عرصہ ہوا اپنے کلام کا ایک انتخاب کیا تھا جس کو انوار بک ڈپو لکھنؤ نے جناب عبدالشکور صاحب ایم اے (علیگ) کے مبسوط مقدمہ کے ساتھ شائع کیا تھا۔ اس مقدمہ میں مولانا کے حالات اور خصوصیاتِ کلام پر بسیط روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس وقت اس کتاب کا تیسرا اڈیشن ہمارے زیرِ نظر ہے۔ جو جلیل صاحب کی پیشکش کے ساتھ مل کر ہماری معلومات کو اور بھی وسیع بنا دیتا ہے۔ اور دونوں انتخابات کے موازنہ کلام کا موقع بھی مہیا کرتا ہے۔

مولانا کا اپنا انتخاب موضوعات کے اعتبار سے تھا یعنی عاشقانہ عارفانہ، فاسقانہ، ماہرانہ، نا فعانہ، ضاحکانہ، شاعرانہ، واصفانہ اور باغیانہ، اس سے شاعر کی طبیعت اور کلام کے مختلف پہلو بیک وقت نظر کے سامنے آ جاتے ہیں۔ اگرچہ یہ تقسیم مذاق کے اعتبار سے کچھ ایسی پسندیدہ نہیں۔ جلیل صاحب نے تمام دواوین کا انتخاب پیش کیا ہے۔ جو حقیقتہً بہت "سیر حاصل" ہے۔

جو لوگ مولانا کی شخصیت اور کلام میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ ان کے لئے یہ دونوں کتابیں بہت مفید اور اہم ہیں۔

انتخاب اصغر

مرتبہ جمیل نقوی
ناشر:۔ اردو اکیڈیمی سندھ
صفحات ۱۲۳ قیمت درج نہیں

اصغر گونڈوی ان شاعروں میں سے ہے جن تک ہماری شاعری کی روایات غالب کے ذریعہ سے پہنچیں اور ان کی مخصوص افتادطبع کے ساتھ ایک نئے سانچے میں ڈھل کر نکلیں۔ اس لئے اصغر کے افکار اور اسلوب پر غالب کا سایہ بہت گہرا ہے۔ اور اس کے سنجیدہ مزاج نے اس سایہ کو اور بھی گہرا بنا دیا ہے۔ وہ نئے دور کا ذرّ ہ ہے۔ اور اس حیثیت سے اس کی شخصیت اور کلام کا مطالعہ ازبس ضروری ہے۔ اور مختلف زاویہ ہائے نگاہ سے تاکہ ان دونوں کے زیادہ سے زیادہ پہلو نمایاں ہوسکیں۔ فاضل مرتب نے یہ خدمت بڑی خوش اسلوبی سے سرانجام دی ہے۔ اس مجموعہ میں مرتب کے اپنے مقدمہ کے ساتھ اصغر پر پانچ ممتاز نقادوں کے مضامین بھی شامل ہیں جن سے شاعر کی افتادِ فکر اور طرزِ بیان کے ساتھ ساتھ ناقدین کے اندازِ بیان پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ یہ تجزیے جال ہیں جن میں شاعر کا مرغِ روح گرفتار ہونے کے باوجود آزاد ہی رہتا ہے۔ اور ہمیں نئے جال لانے کی دعوت دیتا ہے۔ اصغر کے کلام کا جو انتخاب اس مجموعہ میں شامل ہے۔ شاید اسی غرض کی تکمیل کے لئے ہے۔ اس کی بہترین خصوصیت یہ ہے کہ یہ فی الحقیقت انتخاب ہے۔ اور زیادہ 'سیر حاصل' نہیں۔ اس میں بہت کچھ حذف کر دینے کے بعد اتنا کچھ باقی رہ گیا ہے کہ ہم پھر بھی اصغر کی قوتوں اور کمزوریوں کو بخوبی سمجھ سکیں۔

تحقیقی مطالعے

از ڈاکٹر نذیر احمد
ناشر:۔ دانش محل امین الدولہ پارک لکھنؤ
صفحات ۱۶۰، قیمت دو روپے
کتابت و طباعت نہایت عمدہ

اعلیٰ تحقیق کی علامت یہ ہے کہ وہ ہم پر اچھوتی حقیقتوں کا انکشاف کرے۔ اور پیچیدہ گتھیوں کو سلجھائے۔ یہ کتاب ان دونوں مقاصد کو بخوبی پورا کرتی ہے۔ اور اس سنجیدگی اور ماہرانہ بصیرت کے ساتھ جو اس کام کے لئے ضروری ہے۔ جن موضوعات پر تحقیق کی گئی ہے وہ حسب ذیل ہیں۔

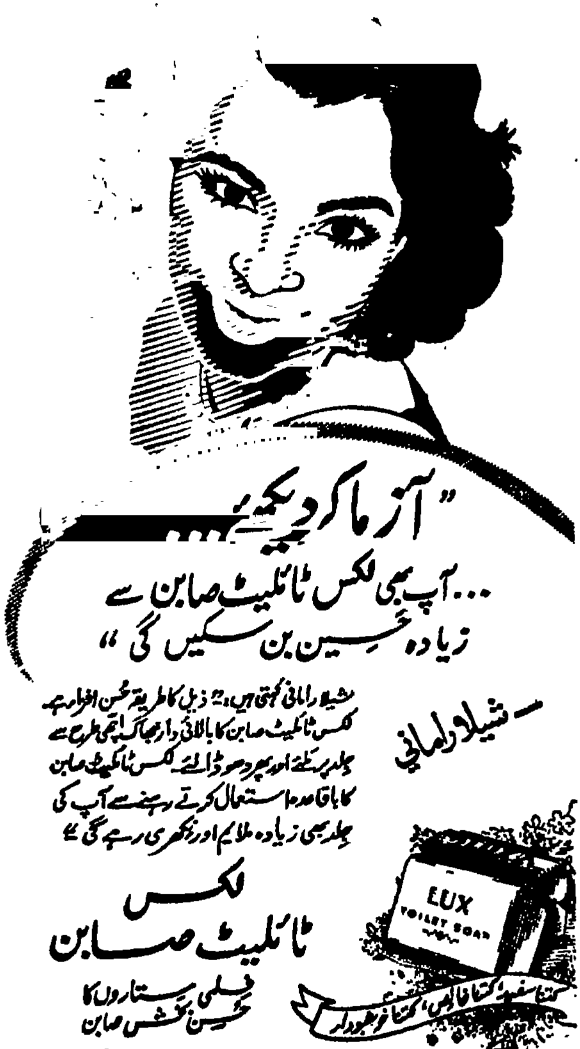
غالب اور ظہوری، کتاب نورس، کتاب نورس کے مخطوطات، ابراہیم و خوانِ خلیل، اردو شہ پارے پر ایک نظر، اور معدن الشفائے سکندر شاہی۔

ان موضوعات کی اہمیت محتاجِ بیان نہیں۔ اور ان کے بارے میں فاضل مصنف کے انکشافات بھی اسی نسبت سے اہم ہیں۔ غالب دو سلسلوں کی آخری کڑی تھا اور ان سے متعلق روایات کا جامع بھی۔ دبستانِ فغانی اور دبستانِ ہندی۔ اس نے ان دونوں سلسلوں سے کیا اخذ کیا۔ اور اس میں اپنی طرف سے کیا اضافہ کیا۔ یہ دونوں باتیں اس کی شخصیت اور فن کے سلسلہ میں بنیادی حیثیت رکھتی ہیں۔ اس سے قبل متعدد مضامین میں واضح کیا جا چکا ہے کہ غالب نے نظیری، عرفی، بیدل اور میر وغیرہ سے کیا حاصل کیا۔ ایسے بیشمار خیالات، اشعار، ترکیبیں، استعارے اور اسالیب آئے دن دیکھنے میں آتے ہیں جو بظاہر غالب کے طبع زاد معلوم ہوتے ہیں لیکن دراصل مستعار ہیں۔ مثلاً غالب نے کئی اشعار میں فلسفۂ آزار کی ترجمانی کی ہے جو اس کے ذاتی تجربہ کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے۔ خواجہ عباداللہ اختر کی تصنیف "بیدل" سے پتہ چلتا ہے کہ بیدل نے اس فلسفہ کا شد و مد سے اظہار کیا ہے۔ جس سے ہمیں غالب کا ماخذ معلوم ہو جاتا ہے۔ ایسے ہی اہم انکشافات زیرِ نظر کتاب کے پہلے مضمون "غالب اور ظہوری" سے ہوتے ہیں۔ سوال اٹھتا ہے کہ پھر غالب کا امتیاز کیا ہے؟ یہ ایک بڑا پیچیدہ سوال ہے۔ جس کا صحیح حل اس قسم کے محققانہ مقالوں ہی سے پیش کیا جا سکتا ہے۔

اس مجموعہ کے دیگر مضامین بھی نہایت اہم معلومات پر مشتمل ہیں۔ زبان نہایت صاف ستھری اور شستہ ہے۔ اور متانت کے ساتھ ساتھ ادبی چاشنی بھی لئے ہوئے ہے۔ دکنی ادبیات اور تاریخ سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے یہ معلومات کا بیش بہا ذخیرہ ہے۔

رسید کتب

قارابانی۔ رئیس احمد جعفری۔ المطبوعات۔ ۲۶ بہار کالونی۔ کراچی نمبر ۵
تنقیدی اصول اور نظریے۔ حامد اللہ افسر۔ الناظر بکڈپو۔ لکھنؤ
چند ہم عصر۔ ڈاکٹر مولوی عبدالحق۔ انجمن ترقی اردو۔ کراچی
مبارک بکڈپو۔ بندر روڈ۔ کراچی
قول کتابت۔ ضیاء الحسن موسوی۔ مرکز ادب۔ بیشن روڈ کراچی



LTS. 304-X30UD

تمدن عالم اور موسیقی — بقیہ صفحہ ۵۰

فارسی، لاطینی اور "سیلٹک" کا مرکب تھی۔ یہ علاقہ عورتوں کے حسن اور موسیقی کی دلکشی میں بہت شہرہ رکھتا تھا۔ ان مقامات کی تہذیب اس امر کا ثبوت دیتی ہے کہ صرف ہندوستانی موسیقی نے ہی بیرونی ملکوں کی موسیقی سے استفادہ نہیں کیا بلکہ ہندی موسیقی سے دیگر ممالک کی موسیقی بھی اثر لئے بغیر نہ رہ سکی۔

اردو نثر کے اسالیب بیان — بقیہ صفحہ ۲۲

شاعرانہ آب و رنگ اور خیال طرازی نثر کے مزاج کے خلاف ہے۔ خیال طرازی جذبات کی پیداوار ہے جیسے جیسے جذبات میں شدت اور طغیانی رونما ہوتی جاتی ہے خیال طرازی یا بیان کی رعنائی بڑھتی چلی جاتی ہے۔ عام طور سے تخیلی نثر کو لوگ اچھا سمجھتے ہیں اور اسے رنگینی بیان سے تعبیر کرتے ہیں۔ یہ ذوق کی خامی کی دلیل ہے۔ نثر کا حسن سادگی اور راستی میں ہے جو صحت بیان اور حقیقت نگاری سے حاصل ہوتی ہے۔

اردو نثر کے گوناگوں امکانات کا ابھی اچھی طرح جائزہ نہیں لیا گیا ہے۔ ضرورت ہے کہ جدید تنقید کی روشنی میں اس سے بحث کی جائے۔ سماج کے بدلتے ہوئے حالات کا اثر اردو نظم کے مقابلے میں نثر پر زیادہ پڑا ہے اس پر بھی تفصیل اور تحقیقی بحث کی ضرورت ہے۔

فنی تخلیق اور درد — بقیہ صفحہ ۱۱

بقیہ صفحہ ۱۱

مارٹن پوچھتا ہے کہ نسلِ انسانی کیوں قائم رہے؟ اس کا جواز کیا ہے؟ یہاں تک معاملہ ٹھپ ہو جاتا ہے۔ یہی گھپلا ایسے لوگوں نے ادبی تنقید میں کیا ہے۔ ادب کا جواز یہ ہے کہ اس سے ہمیں فلاں فلاں قسم کے فائدے پہنچتے ہیں! اس سے اچھا ر دیہ تو قرونِ وسطیٰ میں ST. THOMAS AQUINAS کا تھا۔ ان کے نزدیک فنی تخلیق کی صلاحیت ایک الوہی صلاحیت ہے، فن کار کے اندر خدا کی تخلیقی صفت کام کرتی ہے، اس لئے فن اپنا جواز خود ہے۔ فن سے آدمی کو کیا فائدہ پہنچتا ہے اس کا قطعی فیصلہ تو اسی وقت ہو سکتا ہے جب ہم دو باتیں طے کر لیں۔ ایک تو یہ کہ فنی تخلیق اور انسانی شعور کا آپس میں کیا رشتہ ہے۔ دوسرے یہ کہ شعور انسانی ارتقا کے کس درجے میں پیدا ہوا، اور اس کی حیاتیاتی ضرورت کیا ہے۔ میں تو حیاتیات جانتا نہیں۔ لیکن راتخ اور ہربرٹ ریڈ دونوں کے یہاں میں نے یہی پڑھا ہے کہ سائنس داں اس سوال کا ابھی تک کوئی جواب نہیں دے سکے۔ البتہ راتخ نے اتنا ضرور کہا ہے کہ انسانی شعور تو الگ رہا، خود آگاہی ہرنا میاتی جسم کا ایک فطری عمل ہے، یہاں نقصان اور فائدے کا کوئی سوال نہیں پیدا ہوتا۔ یہ چیز تو کھانے پینے کی طرح ایک حیاتیاتی فعل ہے۔ یعنی اگر ہم فنی تخلیق کو عقلی طور سے بالکل نقصان دہ چیز سمجھنے لگیں تو بھی فنی تخلیق کا کام ہم سے حیاتیاتی مجبوری کے ماتحت سرزد ہوتا رہے گا۔ جو آدمی سکون حاصل کرنے کے خیال سے شعر کہتا ہے اُس کی ذہنیت بلیک مارکیٹ کرنے والوں کی ہے۔ درد اٹھانے کی ذمہ داری سے بھاگ کے سچا ادب تخلیق نہیں ہوتا۔ کیا شیکسپیئر نے اپنے ڈرامے اس لالچ میں لکھے تھے کہ اگر میں نے دس بیس سال یہ کام جاری رکھا تو میری شخصیت بڑی منظم اور مربوط بن جائیگی؟ نقاد اور سائنس داں جو چاہے کہا کریں، فن کار کو کچھ پتہ نہیں ہوتا کہ مجھے سکون مل رہا ہے یا تکلیف پہنچ رہی ہے۔ وہ ادب کی تخلیق نہیں کرتا، ادب تو اس کے اندر سے رِستا ہے۔

سو باتوں کی ایک بات فراق صاحب نے کہہ دی ہے:

میاں رو پیٹ کر بیٹھے ہیں سو باران فریبوں کو
یہ ہم سے پوچھنے آؤ ہو غم کیا تھا خوشی کیا تھی

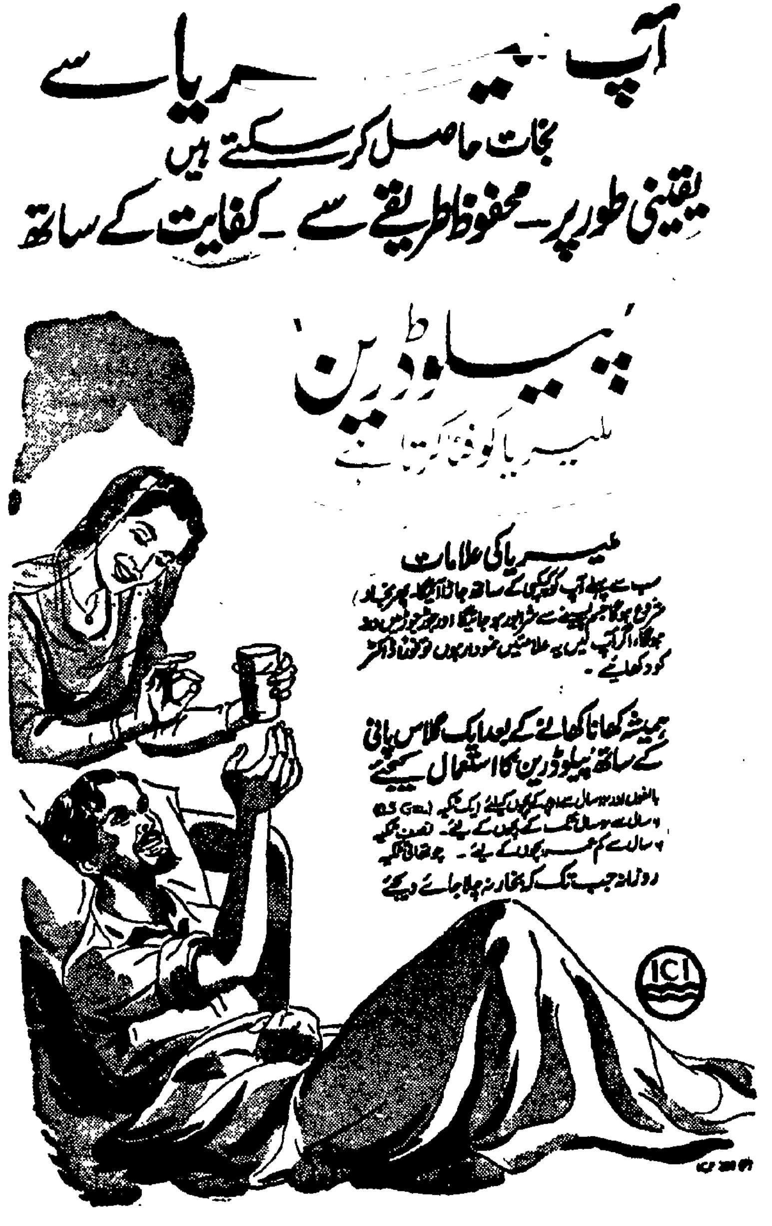


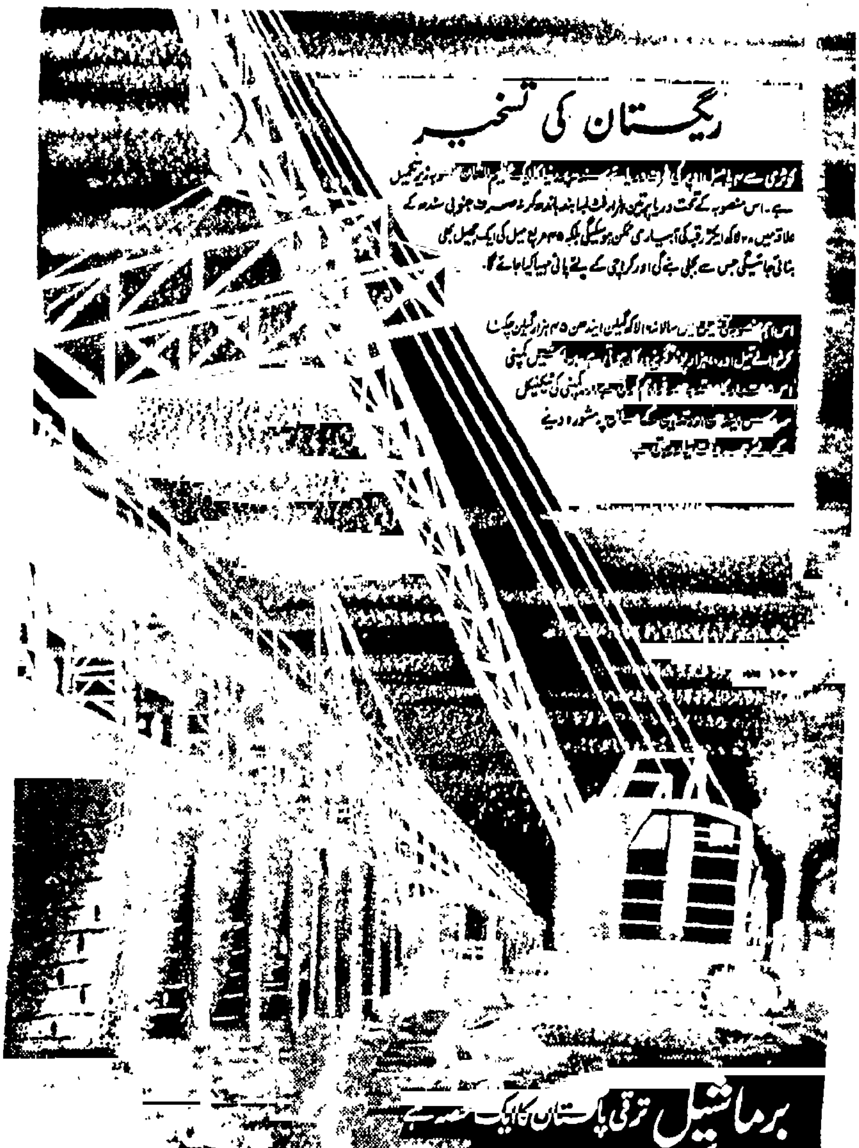



ڈالڈا سے میرے بیٹے کی کھوئی ہوئی قوت واپس آگئی!
جی ہاں۔ مجھ میں اتنا دم ہی نہ تھا کہ میں کھلے گول میں بال مار دیتا
کیا تم پھر ہار گئے
یہ اس کے بھوک نہ لگنے کا نتیجہ ہے۔ کھانا چھوتا تک نہیں۔
ڈالڈا سے پکائیے۔ اسی سے اس کی قوت بڑھیگی۔
جی ہاں۔ ڈالڈا وہ چکنائی فراہم کرتا ہے جسکا ہر ایک کے کھانے میں ہونا ضروری ہے
کیا ڈالڈا سے کھوئی ہوئی قوت واپس ہو سکتی ہے
ہم جیت گئے۔ ... حیرت انگیز ... کی بدولت
تمہارا مطلب حیرت انگیز ڈالڈا!
ڈالڈا نہایت قوت بخش اور خالص ترین چکنائی ہے جو آپ خرید سکتے ہیں!
بیشک یہی وہ قوت بخش ڈالڈا ہے جس کا آپ کی روزانہ غذا میں شامل ہونا ضروری ہے۔ مہر بند ڈبہ میں صاف و تازہ ڈالڈا کھانے کی لذت میں چار چاند لگا دیتا ہے۔ ڈالڈا استعمال کیجئے اور کھانے کے اوقات کو پُر لطف بنائیے۔ یہ نہایت کم خرچ بھی ہے۔
ڈالڈا وناسپتی صرف ایک ہے اور تاڑ کا درخت اس کا نشان ہے۔
DALDA VANASPATI
ڈالڈا وناسپتی
ڈالڈا وناسپتی
HVM. I — 193UD


دِن بدِن
صاف اور حسین جلد
آپ کے لئے بھی رکسونا کا کیڈل
یہ جادو جگا سکتا ہے
رکسونا کے کیڈل سے مالامال
جھاگ کو اپنی جلد پر نرمی سے ملئے
اور پھر دھو ڈالئے پھر دیکھئے آپ کی جلد
دن بدن نرم اور ملائم ہوتی جائے گی جس سے
آپ کا حسن درخشاں ہو جائے گا
رکسونا
*کیڈل آمیز واحد صابن
* جلد کو ملائم کرنے اور مقوی جلد تیلوں کے ایک خاص مرکب کا ملکیتی نام ہے۔
RP.4—193UD


خالص ڈالڈا صحت کی حفاظت کرتا ہے۔
ڈالڈا نہایت صحت بخش خالص روغن ہے جو آپ خرید سکتی ہیں!
ڈالڈا خریدتے وقت آپ کو یقین ہوتا ہے کہ پکوان کے لئے یہ نہایت ہی قابل اعتماد روغن ہے جو کہ بہترین اجزاء سے تیار کیا گیا ہے۔ بغیر ہاتھوں سے چھوئے ڈالڈا آپ کو ہمیشہ مہر بند ڈبہ میں تازہ و خالص ملتا ہے۔ یاد رکھئے ڈالڈا تمام پکوان کیلئے بہترین ہے۔ آج ہی ڈالڈا کا ڈبہ خریدیئے۔ یہ نہایت کم خرچ بھی ہے۔
ڈالڈا
وناسپتی
صرف تاڑ کے درخت کے نشان والے ڈبہ میں خالص ڈالڈا ملتا ہے۔
DALDA
VANASPATI
HVM. 6 — 193UD


آپ ریا سے
نجات حاصل کر سکتے ہیں
یقینی طور پر ـ محفوظ طریقے سے ـ کفایت کے ساتھ
پیلوڈرین
ملیریا کو دفع کرتا ہے
ملیریا کی علامات
سب سے پہلے آپ کو کپکپی کے ساتھ جاڑا آئیگا۔ پھر بخار شروع ہوگا جس کے بعد پسینہ سے شرابور ہو جائیگا اور بخار اتر جائیگا۔ اگر آپ میں یہ علامتیں ظاہر ہوں تو فوراً ڈاکٹر کو دکھائیے۔
ہمیشہ کھانا کھانے کے بعد ایک گلاس پانی کے ساتھ پیلوڈرین کا استعمال کیجئے
بالغوں اور ۱۰ سال سے اوپر کے بچوں کیلئے ایک ٹکیہ (0.3 Gm.)
۱۰ سال سے ۵ سال تک کے بچوں کے لیے۔ نصف ٹکیہ
۵ سال سے کم عمر بچوں کے لیے۔ چوتھائی ٹکیہ
روزانہ جب تک کہ بخار نہ چلا جائے دیجئے
ICI



ریگستان کی تسخیر
بنائی جا سکیگی جس سے بجلی بنے گی اور کراچی کے لیے پانی مہیا کیا جائے گا۔
برما شیل ترقی پاکستان کا ایک حصہ ہے
پاکستان شاہراہ ترقی پر
BSP-521

ماہِ نو

جلد ۹ شمارہ ۱ — اپریل ۱۹۵۵ء

مدیر: رفیق خاور
نائب مدیر: ظفر قریشی

چندہ سالانہ: پانچ روپے آٹھ آنے (پاکستان میں) سات روپے (ہندوستان میں) فی کاپی آٹھ آنے (پاکستان میں) دس آنے (ہندوستان میں)

کچھ اپنی باتیں

اقبال ـــــ ہمارے پہلے "مردِ آفاقی" اس دور میں پیدا ہوئے جب مشرق و مغرب ایک بار پھر نئے حالات میں ایک دوسرے سے ہمکنار ہو رہے تھے اور ان کے اختلاط سے ایک نئی فضا ابھر رہی تھی جو تاریخی اعتبار سے خاص اہمیت رکھتی ہے۔ کیونکہ اس سے پہلے بھی مشرق و مغرب کو کئی بار ایک دوسرے سے میل جول کا اتفاق ہوا تھا۔ اور اس سے بہت ہی دور رس نتائج رونما ہوئے تھے۔ مگر اب کی بار یہ اختلاط پہلے سے کہیں زیادہ وسیع پیمانہ پر رونما ہوا اور اس سے کہیں زیادہ شدت کے ساتھ ایک ایسا یورپ جو محض ایک جغرافیائی ہیئت ہی نہ تھا بلکہ "سفید قوموں کے پشتارہ" کا حامل تھا یعنی وہ ہزارہا سال کے تہذیبی و تمدنی ارتقا کا آئینہ دار تھا اور حرکی اصولوں پر گریز پا ترقی کر رہا تھا۔ ایک ایسے ایشیا سے دوچار ہوا جو قبل تاریخ کے دھندلکوں سے لے کر اب تک ایک باوقار قدامت کا حامل تھا اگرچہ حالات کی ناگریز منطق نے اسے مقابلۃً پس ماندہ ہونے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس آخری مگر سب سے زیادہ وسیع اختلاط نے ایک نیا ماحول، ایک نیا شعور، نئے تقاضے نئی تحریکات اور نئے رجحانات پیدا کئے یعنی اگرچہ مشرق کچھ عرصہ پیچھے ہی رہا اور مغرب کی رفتار برابر تیز رہی مگر جلد ہی مشرق کے یارانِ تیز گام نے بھی منزل تک پہنچنے کی سرتوڑ کوشش شروع کر دی۔ فرزندانِ مشرق کے قدرتی جوہر پھر ابھرے اور عالمگیر تحریکیں اور رجحان بروئے کار آنے لگے۔ "شکریۂ یورپ" بہت جلد یورپ کے مطالعہ اور تعریض و تنقید میں بدل گیا اور ایک نئی بحث و پز شروع ہوئی۔ مغرب کی سیاست حکمت، تہذیب، تمدن ہر بات پر سرگرمی سے بحث ہونے لگی اور مشرق کے بھی ہر پہلو کا ٹٹول ٹٹول کر معائنہ کیا جانے لگا اس لئے کہ نوعِ انسان ان دونوں سے بلند تر نظام پیدا کرے۔ اس طرح ایک زیادہ آفاقی نقطۂ نظر رونما ہونے کا امکان پیدا ہوا۔ اور یہ ممکن ہو گیا کہ مشرق کی شوخیٔ فکر مغرب سے آگے بڑھ جائے اور زیادہ پُر مغز افکار سے دانایانِ فرنگ پر بھی غالب آ جائے۔

عین اس موقع پر علامہ اقبالؒ میدان میں آئے۔ انہوں نے مشرق و مغرب کے حالات کا پورا پورا جائزہ لیا۔ رفتہ و آئندہ پر بھرپور نظر ڈالی اور ایک ایسا جامع حکیمانہ نقطۂ نظر پیدا کیا جس نے انہیں حقیقی معنوں میں ہمارا پہلا مردِ آفاقی بنا دیا جس کی رفتارِ فکر اپنے ہمعصروں سے بہت آگے تھی۔ ان سے پہلے بھی بعض دیدہ ور پیدا ہوئے جن کی شخصیت عالمی تھی لیکن اقبال نے مشرق و مغرب کو محض سیاسی حیثیت ہی سے نہیں بلکہ عمرانی اور فکری زاویۂ نگاہ سے دیکھا ـــــ ایک دانائے راز کے زاویۂ نگاہ سے جو زمانہ کی طبیعت کا تقاضا دیکھ لیتا ہے اور ماضی و حال کے تمام اہم سررشتوں کو ملا جلا کر ان سے اہم ترین بنیادی حقائق کا سراغ لگاتا اور آئندہ امکانات کی نشان دہی کرتا ہے۔ اقبال کا فکر صرف مشرق یا مغرب ہی نہیں بلکہ تمام نوعِ انسان کو محیط ہے اور اس لئے محض آفاقی بھی نہیں بلکہ اس سے بھی ایک درجہ آگے ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اب مغرب بھی وہ مغرب نہیں رہا جو اپنے علم و حکمت کے نشے میں کسی کو خاطر میں نہیں لاتا تھا آج یورپ کے کئی اربابِ دانش کی نظریں مشرق کی طرف اٹھ رہی ہیں اور وہ اقبال کے نظریات پر غیر معمولی توجہ دے رہے ہیں۔ ان حکماء کے خیالات لازماً جمہور پر اثر انداز ہوں گے۔ اور آگے چل کر نئی نئی تحریکات اور تجربات کا پیش خیمہ ثابت ہوں گے۔ ان سے ایسا معلوم ہوتا ہے گویا مغرب ہزارہا سال بعد اس تہذیب کو خیرباد کہہ رہا ہے جو ارسطو کے تتبع میں "صورت" کو اپنانے سے پیدا ہوئی تھی اور اس مقام سے آغازِ سفر کر رہا ہے جہاں سے بالکل ابتدائی نصرانیت شروع ہوئی تھی ـــــ وہ مقام جو الیسانڈر دلبزانی جیسے بالغ نظر نقاد کی رائے میں اسلام سے پوری پوری مطابقت رکھتا ہے۔ اقبال کے مردِ آفاقی اور صاحبِ نظر ہونے کا اس سے زیادہ ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے؟

مطالعۂ رومی کی تاریخ میں اقبال کا مقام

سید عبد اللہ

مطالعۂ اقبالؒ کے سلسلے میں رومی کو جو اہمیت حاصل ہے اس کا اعادہ لاحاصل ہے۔ کیونکہ یہ ایک ایسا موضوع ہے جس کو اقبالؒ کے معمولی سے معمولی ناقد یا شارح نے بھی نظر انداز نہیں کیا۔ مگر مطالعۂ رومی کے سلسلے میں اقبالؒ کو جو اہمیت حاصل ہے اس کی طرف اب تک کوئی خاص توجہ نہیں ہوئی حالانکہ یہ موضوع بذاتِ خود اہم ہونے کے علاوہ اقبال اور رومی دونو کے تقابلی مقام کو سمجھنے کے لئے بھی ضروری ہے۔ اس خیال کے ماتحت میں نے اس مضمون میں مطالعۂ رومی کی تحریک کا عہد بہ عہد مگر مختصر جائزہ لینے کی کوشش کی ہے اس سے مقصد یہ بھی ہے کہ مختلف ادوار میں رومی کے اثرات و فیوض کا سراغ لگایا جائے اور یہ بھی کہ رومی کو تاریخ افکار میں جو رتبہ اقبال نے دلایا ہے اور ان کے معارف و اسرار کو جس طرح علومِ ثانیہ کی روشنی میں بے نقاب کیا، اس کا صحیح صحیح اعتراف کیا جا سکے۔ اس لحاظ سے یہ کہنا شاید غلط نہیں کہ اگر رومی نے اقبال کے فکر کو چار چاند لگائے ہیں تو اقبال نے بھی رومی کے افکار عالیہ کو بڑی عزت و شان سے دنیا میں متعارف کرایا۔ جس سے اُن کے رتبہ و مقام کو پہلے سے کہیں زیادہ سربلندی نصیب ہوئی یہ اقبال کی سعادت مندی ہے کہ وہ رومی کی غائبانہ شاگردی سے مفتخر ہوئے مگر یہ فکر رومی کی بھی خوش نصیبی ہے کہ اُس کو اقبال جیسا ہوشمند اور بالغ نظر شارح ملا جس نے اپنے نامور استاد کی عظمت کے مینار اور اونچے کر دئے۔ اور ان کی شہرت کو فلک الافلاک تک پہنچا دیا چنانچہ مثنوی کے زمانۂ تصنیف سے لے کر آج تک جتنے علماء و فضلا نے افکار رومی کا تجزیہ کیا ہے ان میں شاید اقبال ہی مثنوی کے وہ واحد ترجمان ہیں جن کی توجیہات نے مثنوی کو ایک زندہ فکر اور مثبت و پائدار اقدار زندگی کا حامل ثابت کیا ہے اور ان کی اُن حکمتوں کو دریافت کیا ہے جن سے کائنات اور حیات کے ارتقاء و تکمیل کے بڑے بڑے راز دریافت ہوئے ہیں۔

مطالعۂ رومی کے سلسلے میں اقبال کی یہ اہمیت تبھی ثابت کی جا سکتی ہے کہ ہم پہلے مثنوی کے پُرانے تنقید نگاروں یا عالموں کے کام پر نظر ڈال کر یہ واضح کر دیں کہ اقبال سے پہلے رومی کے مطالعہ کی نوعیت جزوی اور انفرادی سی تھی۔ یہ اقبال ہی تھے جن کے طفیل رومی کے افکار کی وہ تشریح ہوئی جس سے وہ حیات اجتماعی اور ارتقائے انسانی کے ایک بڑے ترجمان اور محرم اسرار ثابت ہوئے۔

مولانا روم کا انتقال ۶۷۲ھ / ۱۲۷۳ء میں ہوا ہے۔ اسکے بعد آج تک تقریباً سات سو سال کا عرصہ گزرا ہے۔ اس طویل مدت میں تقریباً ہر دور میں مثنوی پر کام کرنے والے بیسیوں کی تعداد میں نظر آتے ہیں جو مثنوی کی مقبولیت کا ایک ناقابل تردید ثبوت ہے۔ اس معاملہ میں اگر مثنوی کے مقابلے پر فارسی کی کوئی اور کتاب لائی جا سکتی ہے تو وہ دیوان حافظ ہے۔ مگر دیوان حافظ کی حیثیت محض شعر و معرفت کی کتاب کی ہے۔ مثنوی ان دونو حیثیتوں کے علاوہ اسرار دین اور علم کلام کا مجموعہ بھی ہے۔ اس وجہ سے ایران و خراسان بلکہ ترکی اور ہندوستان میں بھی مثنوی کو ایک مقدس الہامی کتاب کا درجہ حاصل رہا ہے۔ چنانچہ یہ مشہور مصرع ع

ہست قرآں در زبانِ پہلوی

اسی حقیقت کا اعلان کر رہا ہے۔ غرض مثنوی رومی ادبیات فارسی کی مقبول ترین کتاب ہے جس کا ثبوت اس بات سے بھی مہیا ہوتا ہے کہ اس کی لاتعداد شرحیں، ترجمے اور فرہنگ لکھے گئے جن میں سے بعض کی

---

[1] مثنوی کی شرحوں، ترجموں، انتخابوں کا ذکر جن میں عربی، فارسی، ترکی، اور مغرب کی زبانوں کی سب تصنیفات شامل ہیں بانکی پور لائبریری کی فہرست مخطوطات ج ۱ ص ۹۵، نیز حاجی خلیفہ کشف الظنون ج ۵، ص ۳۷۵ میں ملاحظہ ہو۔

اپنی علمی سطح بھی اتنی بلند ہے کہ ان کو بذاتِ خود ادبیاتِ عالیہ میں شمار کیا جاسکتا ہے۔

رومی کے مطالعہ و تتبع کی تحریک خود رومی کی زندگی میں ہی شروع ہو چکی تھی۔ ان کے بعد ان کے فرزند سلطان ولد نے رباب نامہ کے نام سے ایک مثنوی لکھی جس میں اپنے والدِ بزرگوار کی مثنوی کا تتبع کیا۔ سلطان ولد کی مثنوی ولدی کے دیباچے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے والد (مولانا روم) کی مثنوی بہت جلد ان کے متبعین میں مقبول ہو گئی تھی اور کثرتِ مطالعہ و تلاوت کے سبب اس کا اسلوب اور وزن و بحر بھی اس قدر خاطر نشین ہو گیا تھا کہ مثنوی نگاری کے لئے (خصوصاً صوفیانہ مطالب کے سلسلے میں) کوئی دوسرا اسلوب لوگوں کو پسند ہی نہ آتا تھا "زاں وزن از خواندن بسیار خو کردہ اند و ایں وزن در طبع شاں نشستہ است"۔

مثنوی رومی کے مطالعہ کی لہر نویں صدی ہجری کے آغاز میں اور بھی تیز ہو گئی۔ حسین خوارزمی اسی زمانے کے ایک مصنف ہیں جنکی شرح مثنوی (جواہر الاسرار کے نام سے) ۸۴۰ھ میں تصنیف ہوئی۔ دسویں صدی ہجری میں مثنوی رومی عام مطالعہ کے علاوہ نصاب درس و تدریس میں بھی شامل ہو گئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایران و خراسان میں اس کی مشکلات کو سمجھنے اور سمجھانے کی خاصی کوششیں ظہور میں آتی ہیں۔ اس تدریسی رجحان کا ایک اثر یہ بھی ہوا کہ مثنوی کے اسرار و معارف کی پردہ کشائی کی بجائے اس کی لفظی مشکلات کی طرف زیادہ توجہ ہونے لگتی ہے۔ اس زمانے میں علامہ داعی شیرازی (متوفی ۹۱۵ھ) کی شرح اور شاہدی کا انتخاب گلشنِ توحید (تصنیف ۹۳۰ھ) اور سروری متوفی ۹۶۹ھ کی شرح مثنوی قابلِ ذکر ہیں۔ ان شرحوں میں صرف داعی شیرازی کا اندازِ تدوین اس قسم کا ہے کہ اس سے لفظی فرہنگ نویسی کے علاوہ مثنوی کے معارف کی بھی کچھ رہنمائی اور نقاب کشائی ہوتی ہے۔ یہ داعی حضرت شاہ نعمت اللہ کے دوست تھے اور ان کی رفاقت میں انہوں نے عمر کا ایک حصہ زہد و عبادت میں بھی گزارا تھا۔ چنانچہ ان کی اس زاہدانہ زندگی کا اثر ان کے مطالعات میں بھی نظر آتا ہے اور اس کے واضح نقوش ان کی اس شرح میں بھی دکھائی دیتے ہیں۔ مگر داعی کی شرح محض تدریسی یا محض زاہدانہ رنگ کی نہیں اس میں فکر کی برجستگی بھی کسی حد تک ہے یہ اور بات ہے کہ ان کے افکار میں تصوف اور زہد کا رنگ شوخ ہے۔

دسویں صدی کے آخر اور گیارھویں صدی کے شروع میں رومی کی مثنوی ہندوستان میں بھی باقاعدہ طور پر درس و تدریس میں شامل ہو جاتی ہے مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اکبر کا دورِ عقلیت مثنوی کی عرفانی اور وجدانی روح کا متحمل نہ تھا۔ اس لئے بظاہر مثنوی رومی اکبر کے زمانے کے اہم مطالعات کے دائرہ میں جگہ نہیں پا سکی۔ اور تعجب تو یہ ہے کہ اس زمانے کا شاید سب سے باشعور مصنف ابوالفضل جو عقل کے تصرفات کا قائل ہوتے ہوئے عرفان اور وجدان کی برکتوں کا بھی معترف تھا۔ ایک موقع پر مثنوی کے کمیاب ہونے کی شکایت کرتا ہے۔ وہ جلال الدین اکبر کے ساتھ میدان پکھلی سے گزر رہا ہے اور فرصت کے اوقات کو کسی علمی مشغلہ میں گزارنا چاہتا ہے۔ اور اس وقت اس کی طبیعت مطالعۂ مثنوی کی طرف مائل ہے مگر بدقسمتی سے اسے اس گرد و نواح میں مثنوی کا کوئی مکمل نسخہ نہیں ملتا۔ اسلئے ناچار ابوبکر شاشی کے انتخاب مثنوی سے ہی کام نکالتا ہے اور اس سے اپنے ذوق و حال کے مطابق اشعار کا انتخاب کر لیتا ہے، اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس زمانے میں (کم از کم اس گرد و نواح میں) مثنوی رومی شاید وقت کی مقبول ترین کتابوں میں نہ تھی — بظاہر یہ بات تعجب خیز ہے مگر یہ دیکھ کر کہ مثنوی کا مزاج ایک خاص نفسی کیفیت اور اجتماعی شعور کا مطالبہ کرتا ہے اور بعض خاص ادوار میں اس کے مطالعہ کی طلب اور ادوار کے مقابلے میں زیادہ ہوتی ہے۔ اس صورت حال پر کچھ زیادہ تعجب نہیں رہتا کہ اکبری دور میں مثنوی کا چرچا کیوں کم ہو گیا تھا۔ تاہم اکبری اور خصوصاً جہانگیری عہد اس معاملے میں بالکل کورا بھی نہیں۔ اور آنے والے ادوار میں تو مثنوی کا ذوق اس قدر بڑھ جاتا ہے کہ ہر طرف اس کے شارح اور فرہنگ نویس بہ تعداد کثیر نکل آتے ہیں۔ چنانچہ گیارھویں صدی ہجری کے ہندوستان اور ایران میں لکھی ہوئی شروح مثنوی کی فہرست خاصی طویل ہے۔ ان میں عبد الفتاح کی مفتاح المعانی (۱۰۴۹ھ) عبد اللطیف عباسی (متوفی ۱۰۴۸ھ) کی لطائف المعنوی، محمد رضا کی مکاشفات رضوی (تصنیف ۱۰۸۴ھ) اور شرح شاہ عبد الفتاح (متوفی ۱۰۹۰ھ) چند قابلِ ذکر کتابیں ہیں۔

عبد اللطیف عباسی کی کتاب لطائف المعنوی مثنوی کی مکمل شرح نہیں کیونکہ عباسی نے صرف مشکل اشعار کی شرح کی ہے جس میں عربی عبارتوں اور قرآن مجید کی آیتوں کا ترجمہ بھی ہے۔ عبد اللطیف عباسی عہد شاہجہانی کے بزرگ تھے۔ انہوں نے عمر کا بیشتر حصہ مثنوی کے

مطالعہ و تجزیہ میں صرف کیا۔ اس شرح کے علاوہ انہوں نے مثنوی کا ایک مستند نسخہ بھی تیار کیا جس کا نام نسخہ ناسخہ مثنویاتِ سقیمہ رکھا، اور لطائف اللغات کے نام سے مثنوی کے مشکل الفاظ کا فرہنگ بھی مرتب کیا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاہجہاں کے آخری زمانے میں مطالعہ مثنوی کی تحریک پہلے سے بھی زیادہ زور سے اٹھی اور آہستہ آہستہ اس میں اتنی شدت اور وسعت پیدا ہوتی گئی کہ اورنگ زیب کے زمانے میں مثنوی ہی وقت کی محبوب ترین کتاب بن جاتی ہے، اسکی بے شمار شرحیں لکھی جاتی ہیں، ترجمے ہوتے ہیں اور انتخابات تیار کئے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ درس میں اس کو مرکزی اہمیت حاصل ہوجاتی ہے۔ اس کے اشعار مجالس اور محافل میں بڑے ذوق و شوق سے پڑھے جاتے ہیں اور اس سے واعظ اور خطیب تذکیر و تلقین کا کام لینے لگتے ہیں۔ غرض اس زمانے میں اسکو نہایت ہمہ گیر مقبولیت ملتی ہے اور عام و خاص سب اس کے مطالعہ سے لطف اور سعادت حاصل کرتے ہیں۔

عہدِ عالمگیری کے مثنوی شناسوں میں دو اہم شخص ایسے تھے جن کی مثنوی دانی کی اس عہد کے مورخین نے بڑی تعریف کی ہے۔ ان میں سے ایک عاقل خاں رازی (میر عسکری) تھے۔ جو اس زمانے کے اچھے شاعروں اور ادیبوں میں شمار کئے جاتے تھے۔ اور دوسرے انہی کے داماد سید شکر اللہ خاں خاکسار تھے جن کی شرح مثنوی خاصی شہرت رکھتی ہے۔ عاقل خاں رازی کے متعلق مآثر الامرا میں لکھا ہے:—

"درحلّ تدقیقاتِ مثنوی مولانائے روم خود را یگانہ می دانست"

اور نواب شکر اللہ خاں کے متعلق شیر خاں لودھی نے مرأۃ الخیال میں ہم کو یہ اطلاع دی ہے کہ:

"کمترین شاگردانش بہ مثنوی دانی معروف و ادنیٰ تلمیذش بصفاتِ صوفیہ موصوف۔"

ان خوش ذوق امرائے عہد کی بدولت مثنوی کے مطالعہ کا شوق اور بھی بڑھ جاتا ہے۔ چنانچہ اس زمانے میں اور اس کے بعد مثنوی کا علم شائستگی اور اوصافِ مجلسی کا لازمی عنصر بن جاتا ہے جس کے زیرِ اثر شرحوں اور فرہنگوں کا سلسلہ بدستور قائم رہتا ہے۔ اس موقع پر اس عہد کی ان سب کتابوں کا تذکرہ جو مثنوی سے متعلق ہیں دشوار بھی ہے اور بے ضرورت بھی۔ البتہ ان میں سے قابلِ ذکر کتابوں کے نام لکھے جاسکتے ہیں مثلاً محمد عابد کی المغنی (۱۱۰۰ھ)، شاہ افضل الہ آبادی کی حلِ مثنوی (۱۱۰۴ھ)، شکر اللہ خاں کی شرح مثنوی، خواجہ ایوب پارسا لاہوری کی شرح مثنوی (۱۱۲۰ھ)، ولی محمد اکبر آبادی کی مخزن الاسرار (۱۱۴۹ھ)، بہلول برکی (۱۱۲۴ھ) کی شرح مثنوی، عبد الفتاح کی درِ مکنون، خلیفہ خوشگل قصوری کی اسرارِ مثنوی وغیرہ۔ ان سب کے آخر میں ملا عبد العلی بحر العلوم متوفی ۱۲۳۵ھ/۱۸۱۹ء کی شرح مثنوی آتی ہے جس پر مطالعۂ مثنوی کا پچھلا دور ختم ہوجاتا ہے اور کچھ دیر کے بعد نئے حالات کے ماتحت مثنوی سے استفادہ کی جدید (اور کئی معنوں میں پچھلی تحریکوں سے مختلف) تحریک پیدا ہوتی ہے۔

اس تحریک کا آغاز شبلی نعمانی کی کتاب سوانح مولانا روم سے ہوا جس کی اشاعت سے حکمتِ رومی کا (جدید زمانے میں) پہلا علمی تعارف ہوا۔ اس علمی تعارف سے مطالعۂ رومی کی شاہراہیں بہت کشادہ ہوئیں مگر اس اثنا میں قدرت نے ایک اور دانائے راز ایسا پیدا کیا جس نے مثنوی کو ایک نئے عصر کی تخلیق کا وسیلہ اور ایک نئی زندگی کی تشکیل کا ذریعہ بنا کر اسکو مستقبل کی "عصر آفریں کتاب" بنا دیا۔

مطالعۂ مثنوی کی اس طویل تاریخ میں کم و بیش پانچ اہم سنگ میل ہمارے سامنے آتے ہیں۔ اوّل خوارزمی کی جواہر الاسرار جو ۸۴۰ھ میں تصنیف ہوئی۔ دوم عبد اللطیف عباسی کی تصنیفات جو شاہجہاں کے زمانے سے متعلق ہیں۔ سوم ملا بحر العلوم کی شرح مثنوی جو ۱۲۳۵ھ/۱۸۱۹ء میں ہوئی۔ چہارم شبلی کی سوانح مولانا روم، پانچواں اقبال کا استفادۂ رومی۔ تاریخ پر نظر ڈالنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مطالعہ رومی کے یہ پانچوں سنگ میل تاریخ اسلامی کے نہایت پُر اضطراب زمانوں سے متعلق ہیں۔ اور یوں مثنوی خود بھی ایک ایسے پُر آشوب زمانے کی یادگار ہے جس میں خدا پر ایمان و یقین اور انسان پر اعتقاد و اعتماد حملۂ تاتار کے سیلاب میں خس و خاشاک کی طرح بہہ گیا تھا۔ اور یہ ایک ایسا قیامت خیز واقعہ تھا جس نے تہذیب کے پچھلے نقوش کو تقریباً مٹا دیا تھا گویا رومی کی تصنیف کا زمانہ ایک خلا اور ابہام کا زمانہ تھا جس میں روحیں کسی نئی منزل کی تلاش میں بھٹک رہی تھیں اور ذہن انسانی کسی نئی دنیا کی جستجو میں آوارہ و سرگرداں تھے۔ ایسے روحانی انتشار اور ذہنی خلفشار کے زمانے میں مثنوی ظہور میں آئی۔ اس میں وہ جذب و سرور، وہ وجد و حال اور وہ بےخودی و مستی تھی جس کی اس زمانے کی پریشان و سرگرداں روحوں کو ضرورت تھی کیونکہ لوگ عام طور سے خدا، انسان اور کائنات تینوں کا اعتقاد کھو بیٹھے

تھے، ایسی حالت میں رومی نے جب اپنا نغمۂ عشق سنایا تو اس سے اعتقاد زندگی کی بجھی ہوئی چنگاریوں میں پھر گرمی پیدا ہوئی اور حیات نے اپنی بکھری ہوئی کڑیوں کو پھر سے جوڑا۔ غرض مثنوی کے پیغام اور اس کے بیان کی یہ مسلّم خصوصیت معلوم ہوتی ہے کہ اس سے بے یقینی، جمود اور روحانی بے اعتقادی کے ہر زمانے میں احیائے جدید کا کام لیا گیا جس کا سبب یہ ہے کہ رومی کے کلام میں ڈھارس بندھانے اور امید پیدا کرنے کی خاص صلاحیت پائی جاتی ہے۔ لہٰذا جب بھی روح کو امید کے آبِ بقا کی ضرورت ہوئی ہے رومی کے فیضانِ عام سے ہی اس کی پیاس بجھائی گئی ہے۔

حملۂ تاتار کی طرح تیمور کی ترکتازیوں کا زمانہ بھی انسانی شرافتوں کے لحاظ سے تاریکی کا زمانہ تھا۔ اس کی ظلمتوں میں خوارزمی نے پھر رومی کی شمع جلائی۔ اسی طرح ہندوستان میں اکبر کا زمانہ اگرچہ سیاسی عروج کا زمانہ تھا مگر عقلیت نے وجدان و یقین کے سرچشمے خشک کر دئے تھے۔ جہانگیر کے عہد میں رومانیت کی ایک لہر ضرور پیدا ہوئی جس میں مقبول ترین ادبی ہیرو حافظ تھے مگر یہ رومانیت لذت اندوزی اور روبہ انحطاط مسرت کوشی میں اعتقاد رکھتی تھی ـــ اس لئے روحانی تسکین کے لئے کسی اور آب زندگی کی ضرورت پیدا ہوئی چنانچہ شاہجہاں اور اورنگ زیب کے زمانے میں پھر مثنوی کا غلغلہ بلند ہوا جس نے دل کے شیرازوں کو مجتمع کیا۔ غرض اسی طرح ہر زمانۂ زوال میں تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد رومی کی روحانی امداد کی طلب پیدا ہوتی رہی یہاں تک کہ وہ زمانہ آ گیا جس میں اقبال نے دنیا کے سامنے رومی کے پیغام کی نئی تعبیر پیش کی۔

مثنوی کے زمانۂ تصنیف سے لے کر اس وقت تک اس کے مطالعہ کے چار مختلف مطمحِ نظر اور مقصد نظر آتے ہیں۔ اوّل زبان کی مشکلات کے نقطۂ نظر سے۔ دوم صوفیانہ اسرار و معارف کے نقطۂ نظر سے۔ سوم علم و ادب کے نقطۂ نظر سے۔ چہارم علوم اجتماعیہ اور فلسفہ و حکمت کے نقطۂ نظر سے! بعض صورتوں میں پہلا اور دوسرا نقطۂ نظر ملا جلا سامنے آتا ہے۔ پرانے زمانے کے اکثر شارح اور مفسر مثنوی کو عموماً اسی نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں۔ ان میں سے تصوف اور عرفان کے نقطۂ نظر سے خوارزمی نے مثنوی کی نئی تعبیر و توجیہ کی۔ داعی شیرازی نے بھی کسی حد تک اسی حیثیت سے مطالعہ کیا۔

عبداللطیف عباسی نے زیادہ تر زبان و بیان کی مشکلات کی طرف توجہ کی۔ ہندوستان میں شاید علامہ ابوالفضل پہلے شخص تھے جنہوں نے مثنوی کے مطالعہ کے لئے دانش رسمی اور عرفان دونوں کی اہمیت پر زور دیا مگر ابوالفضل کا مطمحِ نظر بھی فرد کی روحانی اصلاح و تہذیب سے زیادہ کچھ نہ تھا۔ مغلوں کے آخری دور میں مثنوی کا عام مطالعہ دراصل روحانی سکون و تسکین کے خیال سے ہوتا رہا۔ اور یہ اس ذہنی اور روحانی انتشار کے خلاف ایک نسخۂ شفا تھا جس سے طبائع کو عارضی طور پر مسرت اور تفریح مل جاتی تھی۔

مطالعۂ مثنوی کی تاریخ میں اقبال سے پہلے شاید سب سے بڑا نام مُلا بحرالعلوم کا ہے جن کی طویل و ضخیم شرحِ مثنوی نہ صرف مثنوی کی مبسوط ترین تفسیر ہے بلکہ اس کا درجہ فارسی تصوف، اور علمِ کلام میں بھی بہت بلند ہے۔ مولانا عبدالعلی بحرالعلوم اس نامور خاندان کے ایک فرد ہیں جس کو اسلامی ہندوستان کے دورِ آخر میں احیائے علوم عربیہ کی تحریک کا بانی اور علم بردار سمجھا جاتا ہے۔ بحرالعلوم کے والد مولانا نظام الدین سہالوی نے درسِ نظامیہ کی بنیاد رکھی اور فلسفہ و حکمت پر بہت سی کتابیں لکھیں (انتقال ۱۱۶۱ھ) ـــ بحرالعلوم تجدید و احیاء کے لحاظ سے موروثی طور پر غیر معمولی صلاحیتوں کے مالک تھے۔ وہ اپنے والد کی طرح حکمت، منطق اور علم کلام وغیرہ میں بھی کامل دسترس رکھتے تھے۔ انہوں نے مثنوی کو علمِ کلام اور محی الدین ابن عربی کے متصوفانہ نقطۂ نظر سے پڑھا۔ اور اس کی ایسی شرح لکھی جس میں فتوحاتِ مکیہ کا پورا پورا رنگ منعکس ہے۔ اس لحاظ سے ان کی شرح معارفِ دین سے کہیں زیادہ معارفِ طریقت کی کتاب بن گئی ہے۔ اور یہی اس کی خصوصیت ہے۔ مطالعۂ مثنوی کے سلسلے میں شبلی کی یہ اہمیت ہے کہ انہوں نے مثنوی کے اس حصے پر خاص توجہ دی جس کا تعلق احیائے دین اور علوم طبعیہ کے بعض انکشافات سے ہے۔ شبلی نے مثنوی کو ابن عربی کے اثرات سے نجات دلا کر اس کو غزالی کی تحریک تجدیدِ دین و تکمیلِ اخلاق سے منسلک کر دیا۔ انہوں نے مجرد فکر اور فلسفہ اجتماع دونوں کے نقطۂ نظر سے بھی اس کا علمی تجزیہ کیا ـــ! مثنوی رومی اور علوم جدید میں مطابقت پیدا کرنے کی یہ پہلی کوشش تھی جس نے آگے چل کر مثنوی کی علمی تشریح و تعبیر کی بڑی حوصلہ افزائی کی۔

جدید زمانے میں مطالعہ رومی کی تحریک کا نقطۂ عروج اقبال کا تجزیۂ مثنوی ہے۔ اس سلسلے میں اقبال کے مطالعہ رومی کا امتیازی وصف یہ ہے کہ انہوں نے مثنوی کو محض مطالعہ کی کتاب سے ثباتی فکر و عمل کی کتاب میں بدل دیا۔ ان کے نزدیک مثنوی کی غایت تفریح یا روحانی سطح پر اوجد و حال نہیں بلکہ عمل اور فکر کی وہ تعمیر ہے جس کے سہارے انسان عالمِ انفس و

آفاق کی تسخیر کرسکتا ہے اور یا فقرہ ہے کہ اقبال کی تسخیر نفس و آفاق کا دائرہ اثر صرف ذات اور فرد کی انائی تک محدود نہیں بلکہ اس کے قوس صعودی کی حد ملت اور اس سے بھی آگے نوع انسان کے نوعی اور اجتماعی ارتقا کے بعید ترین گوشوں سے ٹکرا رہی ہے۔

میں نے سطور بالا میں یہ عرض کیا ہے کہ اقبال نے مثنوی کو مطالعہ کی کتاب سے عمل کی کتاب بنا دیا۔ اس سے میری یہ مراد نہیں کہ اقبال سے پہلے مثنوی ایک بے اثر کتاب رہی۔ مثنوی اس سے پہلے بھی یقیناً بڑی بااثر، مقبول اور مفید کتاب ثابت ہوتی رہی ہے۔ (جیسا کہ گذشتہ صفحات میں ثابت کیا گیا ہے) مگر اس میں کچھ کلام نہیں کہ مثنوی کے فیوض کی جو حدیں اقبال نے دریافت کی ہیں وہ ان سے پہلے کسی نے دریافت نہیں کیں۔ اور سوائے چند مستثنیات کے عموماً یہ نظر آتا ہے کہ مثنوی دانوں اور مثنوی خوانوں نے مولانا روم کی اس نصیحت پر عمل نہیں کیا جو انہوں نے (ایک روایت کے مطابق) مثنوی کے مطالعہ کرنے والوں کے لئے لکھی تھی۔ ان کی نصیحت یا ہدایت یہ تھی:

"مثنوی را جہت آں نگفتہ ام کہ حمائل کنند و تکرار کنند بلکہ زیر پا نہند و بالائے آسماں روند کہ مثنوی نردبان معراج حقائق است نہ آنکہ نردبان را بگردن گیری و شہر بہ شہر بگردی، ہرگز بر بام مقصود نروی و بمراد دل نرسی"

اور حق تو یہ ہے کہ مثنوی کے مطالعہ کی عمومی حیثیت اقبال تک ایک لحاظ سے یہی رہی جو "حمائل کنند و تکرار کنند" میں درج ہے۔ — اقبال نے اس کمی کو محسوس کیا۔ اور رومی کی ہم نوائی میں جاوید یا نژادِ نو کو یوں خطاب کیا۔

پیر رومی را رفیق راہ ساز	تا خدا بخشد ترا سوز و گداز
....	....
شرح او کردند و اورا کس ندید	معنی او چوں غزال از ما رمید
رقص تن از حرف او آموختند	چشم را از رقص جاں بر دوختند
رقص تن در گردش آرد خاک را	رقص جاں برہم زند افلاک را
علم و حکم از رقص جاں آید بدست	ہم زمیں ہم آسماں آید بدست
رقص جاں آموختن کارے بود	غیر حق را سوختن کارے بود

مطالعہ مثنوی کے سلسلے میں اقبال کا نصب العین یہی رقص جاں ہے جس سے علم و حکمت تک رسائی ہوتی ہے — ایسے علم و حکمت تک جس سے زمین و آسمان کی تسخیر ممکن ہے۔ اقبال کے نزدیک قرآن کے بعد جو کتاب اس مقصد عظیم کو پورا کرسکتی ہے وہ مثنوی رومی ہے۔ اقبال کے مطالعۂ مثنوی کا یہی پہلو نیا اور انوکھا ہے جس تک متقدمین و متاخرین میں سے کوئی نہیں پہنچا۔

اقبال کے میلانات کا ایک عجیب انداز یہ ہے کہ وہ مثنوی رومی کے اثر کا تو اعتراف کرتے ہیں مگر حدیقۂ سنائی کا چنداں اعتراف نہیں کرتے اور عطار کی عظمت تو ان کی نظر میں کچھ مشکوک سی ہے حالانکہ یہ دونوں بزرگ رومی کے مرشدانِ روحانی تھے۔ ع

ما از پئے سنائی و عطار آمدیم

اس کا سبب یہ ہے کہ سنائی اور عطار کی کتابیں (اقبال کی نظر میں) اس رقص جاں یعنی اس ذوق و شوق اور علم و حکمت سے محروم ہیں جس سے رومی کی مثنوی از سر تا پا لبریز ہے۔ حدیقہ میں اخلاقیات کا پہلو غالب ہے اور عطار کی مثنویوں میں ظاہری دین داری پر زیادہ زور ہے — اقبال کی نظر میں یہ دونوں باتیں فرداً فرداً چنداں لائق توجہ نہیں۔ اقبال کو جس کی طلب ہے وہ ہے زندگی کا سوز، اور ایک مثبت فلسفۂ حیات! ان مسائل میں اقبال کو رومی سے بہتر کوئی رہنما میسر نہیں آیا ؎

رومی آں عشق و محبت را دلیل
تشنہ کاماں را کلامش سلسبیل

اقبال نے شعر و شاعری میں بھی اس سلسبیل سے پیاس بجھائی ہے۔ اور اپنے حکیمانہ خطبات میں بھی، مگر اقبال کا استفادہ صرف استفادہ ہی نہیں، افادہ بھی ہے، انہوں نے رومی سے صرف لیا ہی نہیں، ان کو کچھ دیا بھی ہے — بہت کچھ! معتد بہ! اقبال کی پیش کش رومی کی بارگاہ میں وہ نئی تعبیر و توجیہ مثنوی ہے جس سے رومی کے خیالات میں نئی تابانی نئی چمک پیدا ہو گئی ہے — رومی کی روح پہلی مرتبہ ان قیود سے آزاد ہوئی جن میں پرانے فرہنگ نویسوں اور شرح نگاروں نے اس کو قید کر رکھا تھا۔ اقبال نے رومی کو جدید حکمت سے متعارف کرایا ہے اور علم و دانش کے جدید ترین دبستانوں پر یہ ثابت کر دیا ہے کہ رومی کے پاس عصر حاضر کے ان مسائل پیچیدہ کے کامیاب حل موجود ہیں جن سے انسان حواس باختہ ہو کر خود انسان کی روشن تقدیر سے مایوس ہو رہا ہے۔ موجودہ دور میں دنیا کو ایک ایسے مذہب (یا مسلک فکر و عمل) کی تلاش ہے جس کے اساسی اصولوں سے سائنس بھی انکار نہ کرسکے۔ اور ایک ایسے سائنسی نقطۂ نظر کی ضرورت ہے جس میں وجدانیات کے وجود کو تسلیم کئے

بغیر چارہ نہ رہے۔ زیرکی اور عشق کا یہ اجتماع انسان کے روشن مستقبل کے لئے اتنا ہی ضروری ہے جتنا جسمِ انسانی کے لئے آب و ہوا کا وجود، اقبال نے ان میں سے اکثر مسائل کے حل رومی کے حوالے سے پیش کئے ہیں۔ اور یہ حکمت رومی کی سب سے بڑی خدمت ہے۔

اقبال نے رومی سے خود ہی استفادہ نہیں کیا بلکہ ایک دبستانِ فکر رومی کی بنیاد بھی رکھی ہے۔ ان کے زیرِ اثر رومی کے مطالعہ و تجزیہ کی تحریک کو بڑا فروغ ہوا ہے۔ چنانچہ اب اقبال کے خاص نقطۂ نظر سے رومی کے افکار کی چھان پھٹک کا کام بڑے زور سے ہو رہا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ محض روحانی ذوق و شوق کے خیال سے بھی رومی کی تلاوت کا عمل پہلے سے کم نہیں مگر اقبال کے زیرِ اثر ان کی حکمت کی تشریح کی طرف بھی توجہ کی جا رہی ہے۔ اس نقطۂ نظر سے سب سے نمایاں کام ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کا ہے جن کی کتاب حکمتِ رومی، رومیاتی[1] ادب کی ایک ممتاز تصنیف ہے جس سے فکرِ رومی کے بہت سے عقدے حل ہوئے ہیں۔ ان سب پہلوؤں سے اگر دیکھا جائے تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ جس طرح مطالعۂ اقبال کے سلسلے میں رومی کی مثنوی اور ان کے افکار ایک اہم بلکہ اہم ترین ماخذ کا درجہ رکھتے ہیں۔ اسی طرح مطالعۂ رومی کے سلسلہ میں اقبال کی شرح و تعبیر یکتا اور منفرد حیثیت رکھتی ہے ؛

•

---

[1] نئے زمانے میں جن لوگوں نے مثنوی رومی کا خاص مطالعہ کیا ہے ان میں ڈاکٹر نکلسن کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ مولانا شاہ اشرف علی تھانوی نے مثنوی کا ذوق عام کیا؛ مولانا میر ولی اللہ، عبدالماجد دریابادی اور قاضی تلمذ حسین نے مثنوی سے استفادہ بھی کیا اور اس کی ترتیب و تدوین کی بھی کوشش کی۔ ڈاکٹر عشرت حسن بھی حکمت رومی کے بعض پہلوؤں کی اسرار کشائی میں مصروف ہیں۔ (س۔ع)

اس سلسلہ میں اطالوی مفکر ایسا ندرو بوزانی کا ذکر بھی ناگزیر ہے۔ جس کے حقائق و بصائر نہایت دور رس اور ـــ انقلاب آفریں ہیں! (مدیر)

کتب [illegible] اسلامیہ دہلی



پنسل   عمل: زین العابدین

دانتے اور اقبال

الیساندرو بوزانی

آدمی اندر جہانِ ہفت رنگ ‏ ‏ ‏ ہر زماں گرمِ فغاں مانندِ چنگ!
آرزوئے ہم نفس می سوزدش ‏ ‏ ‏ نالہ ہائے دل نواز آموزدش
لیکن ایں عالم کہ از آب و گل است ‏ ‏ ‏ کے تواں گفتن کہ دارائے دل است
بحر و دشت و کوہ و کہ خاموش و کر ‏ ‏ ‏ آسمان و مہر و مہ خاموش و کر!
گرچہ بر گردوں ہجومِ اختر است ‏ ‏ ‏ ہر یکے از دیگرے تنہا تر است!
ہر یکے مانندِ ما بیچارہ ایست ‏ ‏ ‏ در فضائے نیلگوں آوارہ ایست!
کارواں برگِ سفر نا کردہ ساز! ‏ ‏ ‏ بیکراں افلاک و شب ہا دیر یاز!
ایں جہاں صید است و صیادیم ما؟ ‏ ‏ ‏ یا اسیرِ رفتہ از یادیم ما؟

زار نالیدم صدائے برنخاست
ہم نفس فرزندِ آدم را کجاست؟

اے خوش آں روزے کہ از ایام نیست ‏ ‏ ‏ صبح او را نیمروز و شام نیست
روشن از نورش اگر گردد رواں ‏ ‏ ‏ صوت را چوں رنگ دیدن می تواں
غیب ہا از تابِ او گردد حضور
نوبتِ او لایزال و بے مرور! (جاوید نامہ)

اقبال کے "جاوید نامہ" کے شروع میں جو افسردگی نظر آتی ہے ویسی ہی افسردگی دانتے کی "ڈیوائن کومیڈی" کے شروع میں بھی دکھائی دیتی ہے۔ جہاں شاعر "تاریک جنگل" میں بہت غمگین نظر آتا ہے جہاں تک اقبال کا تعلق ہے جدید انسان، کے لئے جس نے فاؤسٹ کا تجربہ یونہی حاصل نہیں کیا۔ یہ "تاریک جنگل" اس احساس بلکہ ہیجان، کا آئینہ دار ہے، جو بندۂ مجبور اس جہانِ بے کراں کے روبرو محسوس کرتا ہے۔ اس بے بس انسان کا احساس جو تمام کائنات پر قدرت کاملہ حاصل کئے بغیر مطمئن نہیں ہو سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال اپنے سفرِ افلاک پر روانہ ہو جاتا ہے صرف اس لئے کہ وہ تمام افلاک کو پاش پاش کر دے!

اقبال اپنے رہنما رومی سے پوچھتے ہیں:۔

باز گفتم پیشِ حق رفتن چساں؟
کوہِ خاک و آب را گفتن چساں؟
آمر و خالق بروں از امر و خلق
ما ز دست روزگاراں خستہ حلق

دانتے کے سفر کا مقصد بالکل مختلف ہے اس نے اپنے سفر کے گیت میں، جو در حقیقت دورِ حاضر کا صحیفہ ہے، اس مسئلہ کو بالکل چھوا ہی ہے۔ وہ تو اپنے سفر پر صرف اس لئے روانہ ہوتا ہے کہ اپنے آپ کو تزکیۂ نفس سے مشاہدۂ حق کے قابل بنائے۔

میں نے کہا ہے کہ دانتے کے سفر کا مقصد بالکل مختلف ہے۔ مگر زیادہ غور اور امعانِ نظر سے دیکھا جائے تو حقیقتاً یہ اقبال کے مقصد سے اتنا مختلف نہیں جتنا کہ بظاہر معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ اقبال کا سفرِ فتح و تسخیر اسی وقت ممکن ہے جب دانتے اپنی تزکیۂ نفس کی مہم سے واپس آ جائے۔ برائے خدا! اقبال کو جو مذہبی روح سے اس قدر سرشار تھا۔ ان وجود پرستوں، میں شمار نہ کیجئے جن کے خیالات میں الحاد اور ترقی پسندی کا تال میل نظر آتا ہے اور جن سے آج کل ہماری دنیا بھری پڑی ہے ؎

از طریقِ آذری بیگانہ باش
بر مرادِ خود جہانِ نو تراش!
دل برنگ و بوئے و کاخ و کو مدہ
دل حریمِ اوست جز با او مدہ!

ایک اور جگہ اقبال نے عبد اور عبدہ، کے فرق پر زور دیا ہے۔ عبد قابلِ نفرت ہے مگر حق کے سامنے تسلیم اور عبودیت کے بغیر انسان

ہمیشہ بے بس و ناتواں اور محدود رہتا ہے۔

لہٰذا جب دانتے کی متوازن یونانی دنیا جدید افکار و خیالات سے پارہ پارہ ہو جاتی ہے تو انسان فاؤسٹ کی شکل میں پھر بندگیٔ حق کا احساس تازہ کرتا ہے اور ناکام رہتا ہے۔ اقبال پھر سے دانتے کی طرف رجوع کرنے کا فیصلہ نہیں کرتا بلکہ ایک نیا سفر اختیار کرتا ہے جس میں اہلِ وجد و شوق اس خدا کی طرف گامزن ہوتے ہیں جو "امر و خلق سے ماوراء" ہے اور اس طرح وہ صحیح معنوں میں ایک قوت بن جاتا ہے نہ کہ محض ابال۔

اقبال کے آسمانی سفر میں ابتداءً کچھ ایسی کیفیت ہے کہ یہ دانتے کے سفر سے مختلف معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ اس میں جہنم کی سیر کا کوئی ذکر نہیں۔ اور نہ گناہ کا زیادہ تذکرہ ہے۔ ان کا سفر، بجز در حقیقت فتح و تسخیر کا سفر ہے۔ اور اس میں کم از کم گناہ کی ادنیٰ صورتوں پر فتح پہلے ہی سے فرض ہے، ایک چونکا دینے والی "تمہید آسمانی" سے شروع ہوتی ہے جس میں آفرینش کے پہلے دن آسمان زمین کو طعنہ دیتا ہے کہ یہ محض آب و گل سا بے ہنگم انبار اور نوری و بے نوری کا طومار گراں ہے اور بس:-

طعنہ زد بر زنِ نیلی بر زمیں
روزگارِ کس ندیدم این چنیں
چوں تو در پہنائے حق کورے کجا
جز بقندیلم ترا نورے کجا
خاک اگر او ند شد جز خاک نیست
روشن و پائندہ چوں افلاک نیست

مگر ندائے حق اسے بشارت دیتی ہے کہ زمین پر قرآن مجید کی اصطلاح میں خلیفۃ حق مقرر کیا جائے گا جو مادی ارتقا کی انتہا اور اس سے بھی زیادہ حیران کن روحانی ارتقا کی ابتدا ہے ؎

اے امینِ از امانت بے خبر
غم مخور، اندر ضمیرِ خود نگر
روز ہا روشن ز غوغائے حیات
نے ازاں نورے کہ بینی در جہات

چنانچہ ملائکہ انسان کے حسنِ فردا کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ان الفاظ میں اس کی سطوت کا گیت گاتے ہیں:-

پیکرِ دَرخشی آدم گر! از ما چہ می پرسی
ہنوز اندر طبیعت می خلد موزوں شود روزے!

دانتے کی "تمہید آسمانی" پر نسوانی شفقت و کرم اور نجات دہندگی کا سایہ ہے۔ بالفاظ دیگر اس پر بی بی مریم، لوسی اور اس بیاٹریس کا پرتو نظر آتا ہے جس کے متعلق شاعر یوں نغمہ سنج ہے کہ "اس کی آنکھیں ستاروں سے بھی زیادہ تابناک تھیں!" اس کے برعکس اقبال کے یہاں، کہیں دور انسان کی حیرت انگیز صلاحیتوں کی ایک دھندلی دھندلی بشارت دکھائی دیتی ہے۔

اتنے میں اقبال زمین پر اپنا رہنما تیرھویں صدی عیسوی کے مشہور ایرانی عارف شاعر رومی کی شکل میں پا لیتے ہیں۔ جسے دنیا کے بزرگ ترین اہلِ معرفت میں شمار کرنا چاہیے اور جب وہ سفر کا آغاز کرتے ہیں تو اسی مرشدِ روحانی کے یہ نہایت ہی جدید بول ان کے کانوں میں گونج رہے ہوتے ہیں:-

گفتم کہ یافت می نشود جستہ ایم ما
گفت آنکہ یافت می نشود آنم آرزوست

اس کے بعد ہم اقبال کو یکے بعد دیگرے ہفت افلاک کی سیر کرتے ہوئے پاتے ہیں جہاں وہ عارف ہندی وشوامتر[1] سے ہمکلام ہوتے ہیں اور الوہیت کے چار مہتم بالشان مظاہر گوتم بدھ، زرتشت، حضرت مسیح اور حضرت محمدؐ کے متعلق غور و فکر کرتے ہیں۔ یہ اختلافِ خیال کا ایک عجیب کرشمہ ہے کہ دانتے ان میں سے ایک کے سوا غالباً سب کو معتوبین حق میں شمار کرتا!

"فلک عطارد" پر اقبال کو بڑے بڑے مشرقی سیاست دانوں، مثلاً سید جمال الدین افغانی اور سعید حلیم پاشا کے ساتھ سرمایہ داری و اشتراکیت اور دنیائے مشرق و مغرب کے متعلق تبادلۂ خیالات کا موقع ملتا ہے۔ اپنی غیر معمولی بصیرت کی مدد سے وہ اشتراکیت کے مثبت پہلو کا ادراک کرتے ہیں یعنی پرانے فریب کارانہ نظام کی تباہی و بربادی۔ مگر ساتھ ہی وہ معاملانہ حیثیت سے اس کی نااہلی کا بھی راز فاش کرتا ہے کہ یہ ایک حقیقی معنوں میں نئی دنیا تخلیق کرنے سے قاصر ہے کیونکہ یہ اس اعلیٰ درجہ کی روحانیت سے بیگانہ ہے جس کی بدولت انبیاء نئی نئی دنیائیں تخلیق کرنے میں کامیاب ثابت ہوئے۔ اقبال،

---

[1] وشوامتر کے لغوی معنی ہیں بالکل شدہ یعنی پاک و صاف انسانی دانائی۔ "جاوید نامہ" میں وشوامتر کو "جہاں دوست" کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔

اسلام کی مذہبی جمہوریت (یعنی حق اور صرف حق تمام چیزوں کا آقا و مولا ہے۔ تمام انسان عباد اللہ ہونے کی حیثیت سے برابر ہیں۔ کوئی شخص کسی چیز کا مالک نہیں کیونکہ حقیقی مالک صرف خدا ہے) میں دنیا کے تمام مسائل کا حل پاتے ہیں۔

"فلک زہرہ" خصوصیت سے یورپ کی مخالفت میں ڈوبا ہوا ہے۔ کیونکہ اس میں کہیں عہد رفتہ کے سراغرساں ماہرین آثار قدیمہ پر حملے کئے گئے ہیں جو آثار کہن سے لذت حاصل کرتے ہیں، اور ان پارینہ تہذیبوں کے احیائے ثانیہ میں دلچسپی لیتے ہیں جن میں صنم سازی حیرت آفریں درجۂ کمال تک پہونچ گئی تھی۔ اور کہیں لارڈ کچنر کے ان مظالم کو ہدف تنقید بنایا گیا ہے جو اس نے سوڈان کے مہدوی فرقہ پر برپا کئے تھے۔

گفت مردودِ آدم از یزداں گریخت
از کلیسا و حرم نالاں گریخت
تا بیفزاید بہ ادراک و نظر
سوئے عہدِ رفتہ باز آید نگر!
می برند لذت ز آثارِ کہن
از تجلی ہائے ما دارد سخن!

گفت اے کشتہ اگر داری نظر
انتقامِ خاک درویشے نگر!
آسماں خاکِ ترا گورے نداد
مرقدے جز در یمِ شورے نداد

"فلک زہرہ" کو پاش پاش کرتے ہوئے شاعر فلک مریخ پر جا پہنچا ہے۔ یہ وہ زمین ہے جس کا آدم شیطان کے دامِ فریب میں نہ آیا۔ اسکے بجائے اس نے شیطان کو ہماری بدنصیبی کے لئے زمین پر دے پٹکا۔

اس فلک سے گذرنے کے بعد شاعر فلک مشتری پر پہونچتا ہے جس کا شمار نہایت ہی خوبصورت افلاک میں ہے اور جو اسلام کے تین بڑے جلیل القدر "ملحدین" منصور الحلاج، غالب اور ایران کی بابی فرقہ کی مشہور شاعرہ قرۃ العین طاہرہ سے منسوب ہے۔ جنہوں نے الحاد کے باوجود اپنی قربانیوں سے نئی دنیائیں تخلیق کیں:۔

شوقِ بے پروا ندیدستی نگر!
زورِ ایں صہبا ندیدستی نگر!

غالب و حلاج و خاتونِ عجم
شور ہا افگندہ در جانِ حرم!
ایں نوا ہا روح را بخشد ثبات
گرمیٔ او از درونِ کائنات

دوسروں کی متعدد دلچسپ چونڈی بحثوں کے بعد طاہرہ کی عاقلانہ اور مجمل گفتگو بے اختیار دانتے کی بیاڈی ٹورومی کی یاد دلاتی ہے:۔

از گناہِ بندۂ صاحب جنوں
کائناتِ تازۂ آید بروں!

شوقِ بے حد پردہ ہا را بر درد
کہنگی را از تماشا می برد!
آخر از دار و رسن گیرد نصیب
بر نگردد زندہ از کوئے حبیب!
جلوۂ او بنگر اندر شہر و دشت
تا نہ پنداری کہ از عالم گذشت!

یہ ایک عجیب توارد ہے کہ اسی فلک میں نصرانی دانتے نے بھی دو کافر ملحدوں یعنی ری فیلس اور ٹراجن کو جگہ دی ہے۔ بہشت میں ملحدوں حق یہ ہے کہ ہر پُرخلوص اقدام کے لئے پُرزور رواداری بلکہ اس کی قدر دانی عظیم انسانوں کی ایک اہم مشترکہ خصوصیت ہے۔ دانتے بھی کیتھولک فرقہ کا اتنا ہی اچھا پیرو تھا جتنا اقبال اسلام کا۔ مگر دانتے رومن شہنشاہ کی خسروانہ کرم گستری کے سامنے سر تسلیم خم کئے بغیر نہ رہ سکا۔ اور اقبال نے شاید زیادہ تہور کا ثبوت دیتے ہوئے ——— کیونکہ بعض اوقات کافر کی بہ نسبت ملحد کی داد دینا زیادہ مشکل ہوتا ہے ——— طاہرہ جیسی شیریں ہستی (جسے ۱۸۵۴ء میں طہران میں گلا گھونٹ کر مار دیا گیا) اور منصور (جس کو بغداد میں ۹۲۲ء میں نذر دار کر دیا گیا) کی شہادت کے سامنے سر جھکا دیا!

اور یہی فلک ہے جس میں "خواجۂ اہلِ فراق" اور "خونیں ایاق" ابلیس انسان کے نکما اور بودا ہونے پر فریاد کرتا ہے!

اس کے بعد آخری فلک یعنی "فلک زحل" آتا ہے جو غداروں کا ٹھکانہ ہے:۔

منزلِ ارواحِ بے یوم النشور
دوزخ از احراقِ شاں آمد نفور

میں اس فلک کو وطن کے غداروں کا ٹھکانہ کہنے والا تھا۔ مگر یہ لوگ

اقبال کے نزدیک "ملت" کے مفہوم سے ہے۔ اور ملت کے معنی محض ملک یا وطن سے کہیں زیادہ وسیع ہیں۔ دانتے یا کسی اور مذہبی انسان کی طرح اقبال کا ملک تو اہلِ ایمان کی وہ عظیم جماعت ہے جو وطن سے کہیں برتر و بالا ہے۔ یہ ملک کچھ کچھ "مقدس رومن سلطنت" سے ملتا جلتا ہے۔ اقبال کو بھی غدارانِ ملت سے اتنی ہی نفرت ہے جتنی دانتے کو تھی۔ جو انہیں عین دوزخ کے دروازے پر جگہ دیتا ہے۔

"فلکِ زحل" کے بعد ہم افلاک کی آخری حد پر پہونچ جاتے ہیں۔ مگر اقبال کا نامبور ذوقِ تجسس اسے آنسوئے افلاک بھی لے جاتا ہے۔ اور یہاں ایک روح اس کے سامنے ظاہر ہوتی ہے:۔

برتر از گردوں مقامِ آدم است — no;

بر تغورِ ایں جہانِ چون و چند
بود مردے با صدائے دردمند!
دیدۂ او از عقاباں تیز تر
طلعتِ او شاہدِ سوزِ جگر!
دمبدم سوزِ درونِ او فزود
بر لبش بیتے کہ صد بارش سرود!
"نہ جبریلے نہ فردوسے نہ حورے نے خداوندے
کفِ خاکے کہ می سوزد زجانِ آرزومندے!"

یہ نٹشے کی روح ہے جو ہر روحانی قدر سے کلیتہً ماورا ہونیکی علامت ہے۔ یہ روح کائنات کی آخری حد پر ظاہر ہوتی ہے جو جہانِ بے جہات کے محاذی واقع ہے۔ یہ دیکھ کر دل پر عجیب اثر ہوتا ہے کہ بیچارہ نٹشے جس کو ہر مذہب کے گندم نما جو فروش متقی پرہیزگار اور زاہدانِ ریاکار اس قدر شدید نفرت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ اس کا آخرکار خیر مقدم بھی کیا گیا تو اس عالم میں جہاں شاعر کو اس فن کا لطیف وسبک پر پرواز لے گیا یعنی بہشت میں بلکہ آنسوئے افلاک! اور یہ بھی محض اتفاق نہیں کہ نٹشے کی اس مذہبی رنگ میں مرتبہ شناسی کا حق ایک ایسے مذہب کے پیرو نے ادا کیا جو شاید تمام مذاہب سے زیادہ شدت کے ساتھ ذاتِ باری کی صفاتِ جلال کی تفصیل کرتا ہے!

بود حلاجے بہ شہرِ خود غریب
جاں ز ملا برد و کشت او را طبیب!

اقبال کی رائے میں نٹشے کے نظریات کبھی تخریب کی حد سے آگے نہ بڑھ سکے۔ اور اس نے اس "ورقِ خالی" پر کوئی مثبت چیز تحریر نہ کی جو بقول شوپنہار انسان کی تمام فضول بیہودہ سرائیوں میں سے باقی رہ جاتی ہے۔ لیکن

آنچہ او جوید مقامِ کبریاست
ایں مقام از عقل و حکمت ماوراست

نٹشے کے بعد ہم خود کو حقیقی بہشت میں پاتے ہیں جو روایتی تصور کے مطابق طلسماتی باغات مشرقی سلاطین کے حیرت انگیز قصور و ایوان اور خوبصورت حوروں سے آراستہ و پیراستہ ہے۔ اس "کاخِ بریں" دانتے نے بھی کاخِ بریں کا ذکر کیا ہے۔ اور یہ اقبال کے یہاں کس قدر مناسبت لئے ہوئے ہے! حالانکہ دونوں مقامات میں کتنا ہی فاصلہ ہے۔ یہ بات بھی اس سلسلہ میں خاص اہمیت رکھتی ہے) میں اقبال پھر بھی رک کر دیگر ارواحِ جلیلہ سے ہمکلام ہونا چاہتے ہیں۔ مگر ان کا دلِ بے تاب تو صرف ذاتِ باری کے لازوال حسن ہی سے مطمئن ہو سکتا ہے:

گرچہ جنت از تجلی ہائے اوست
جاں نیاساید بجز دیدارِ دوست!

اس لئے اگرچہ کیفیت یہ تھی کہ

با دلِ پُرخوں رسیدم بر درش
یک ہجومِ حور دیدم بر درش!
بر لبِ شاں زندہ رود، اے زندہ رود
زندہ رود، اے صاحبِ سوز و سرود!
شور و غوغا از یسار و از یمیں
یک دو دم با ما نشیں، با ما نشیں!

لیکن پھر بھی وہ یہ نوا بلند کرتے ہوئے حوروں کو حیران و ششدر چھوڑ کر بہشت سے آگے بڑھ جاتے ہیں کہ

دگر بشاخِ گل آویزد آب و نم در کش
پریدہ رنگ! ز بادِ صبا چہ می جوئی؟

اقبال کے نغمۂ سرمدی کا خاتمہ خاص طور پر دلچسپ ہے۔ "جمالِ جاوداں" کے حضور پہنچنے کے بعد زندہ رود اور محبوبِ حقیقی میں چند باتیں، چند سوال و جواب ہوتے ہیں۔ آخر میں زندہ رود التماس کرتا ہے کہ:

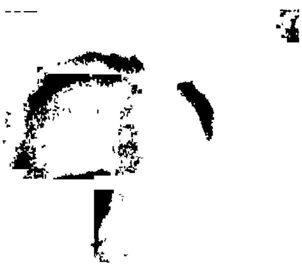


علامہ اقبال رح

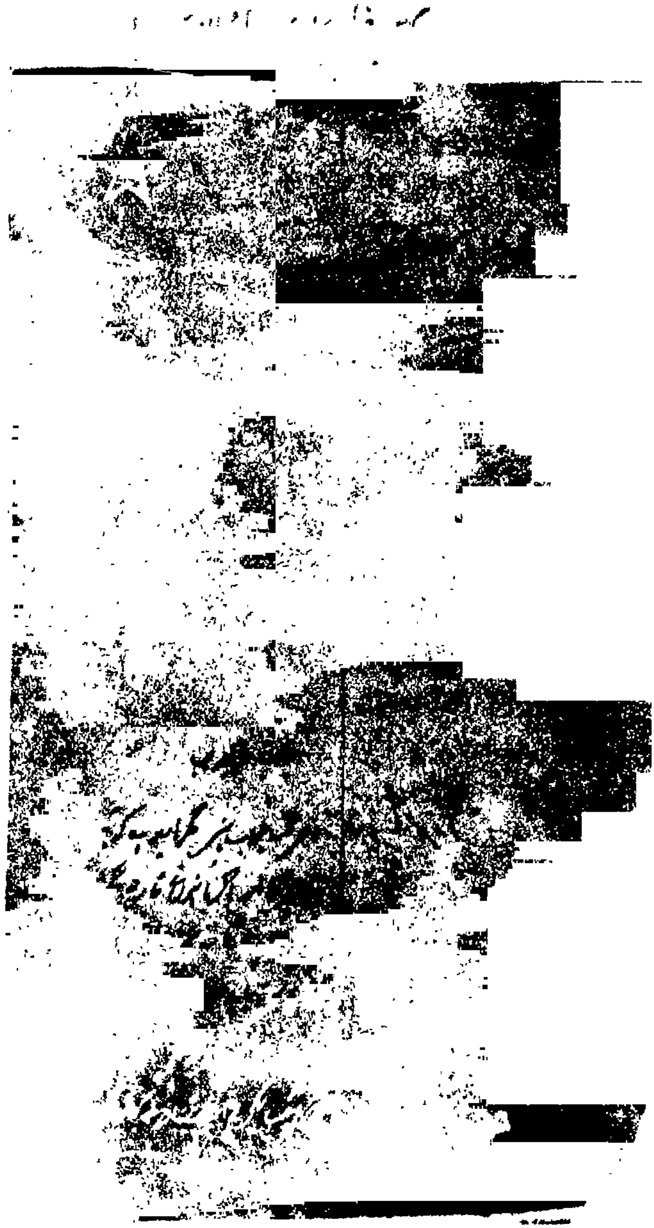
عمل : چغتائی



اٹلی کا نامور مستشرق : الیساندرو بوز



پروفیسر ایم ایم شریف
جنہوں نے دوسری پاکستان فلسفہ کانگرس
[illegible]



عکس خط علامہ اقبال رح

دیدہ ام تدبیر ہائے غرب و شرق
وا نما تقدیر ہائے غرب و شرق

چنانچہ تجلیِ جلال آشکار ہوتی ہے اور اس نوائے سوزناک پر خاتمۂ کلام کرتی ہے:

بگذر از خاور و افسونیِ افرنگ مشو
کہ نیرزد بجوے ایں ہمہ دیرینہ و نو

یہ وہی مشرق کی دیرینہ آواز ہے جس میں وجود عدم، قدیم و جدید سے استغنا ظاہر کیا جاتا ہے۔ اس طرح شاعر کے ہم مذہبوں کی وہ صوفیانہ کنارہ کشی جس پر اس نے بارہا اس قدر نکتہ چینی کی تھی، پھر واپس آتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ مگر یہ کنارہ کشی سرگرمیِ عمل کی طرف لے جاتی ہے۔ نہ کہ دنیا و مافیہا سے چشم پوشی کی طرف جس سے کچھ بھی حاصل نہیں ہو سکتا۔

زندگی انجمن آرا و نگہدار خود است
اے کہ در قافلہ بے ہمہ شو با ہمہ رو
تو فروزندہ تر از مہرِ منیر آمدۂ
آنچناں زی کہ بہر ذرہ رسانی پرتو!

دانتے اور اقبال کا فن کاروں کی حیثیت سے موازنہ بلا سُود اور لاحاصل ہے۔ کیونکہ فن کا موازنہ ممکن ہی نہیں۔ مگر ہماری اس دنیا میں جو اس قدر افراتفری کا شکار ہے۔ ان عظیم ہستیوں کا تبادلۂ خیالات جو محض اپنی موجودگی ہی سے ہماری پست زندگیوں میں تسکین و تشفی کا باعث ہوتی ہیں۔ اور ہم خواہ چاہیں یا نہ چاہیں وہ ہمیں کسی ایسے نظام یا حقیقی وحدتِ فکر سے ہموار اور ہم آہنگ کرتی ہیں جو تمام ادنیٰ عقائد کی حد بندیوں سے بالاتر ہے۔ خاص اہمیت رکھتا ہے۔ بالفاظ دیگر یہ تبادلۂ خیالات اس حقیقی قرب پر روشنی ڈالتا ہے جو اقبال کے پیش کردہ روایات اور قصص و حکایات سے پاک اسلام اور نصرانیت کی اصلی تعلیم یا قرونِ وسطیٰ میں یورپ کے مضبوط و توانا نصرانی نظامِ تمدن۔ وہی جس کا نمائندہ دانتے تھا۔ میں پایا جاتا ہے۔

اس کے باوجود دونوں شاعروں میں کتنے ہی فرق باقی رہ جاتے ہیں۔ دیگر امور سے قطع نظر اقبال کا زمانہ فلورنس کے جلاوطن شاعر سے چھ سات سو سال بعد کا زمانہ ہے اور اس کا دامن ایک مختلف مذہبی روایت کے ساتھ وابستہ ہے۔ ارسطو کی پُر قرار متوازن دنیا اقبال کی دنیا نہیں۔

بلکہ اقبال نے تو یونانی فلسفہ و حکمت پر نہایت کڑی تنقید کی ہے جس نے ان کی رائے میں قدیم نصرانی فلسفہ کی خالص اہمیت کو اپنے عقلیاتی دینیات اور کافرانہ رسوم و شعائر سے تباہ و برباد کر دیا جن کو اسلام نے اشاعرہ کے روایتی دینیات کے منافی نظریات سے بہ آسانی مغلوب کر لیا۔ گو اس مہم میں وہ خود بھی ارسطو کے افکار سے دامن نہ بچا سکا۔ یہ اشاعرہ وہی ہیں جنہوں نے تخلیق کی مطلق آزادی کے شوق میں تمام ثانوی اسباب کو منسوخ کر دیا۔

مگر ایک ایسی دنیا میں جس نے اپنے مذہبی احساسات کو بالکل خیرباد کہہ دی ہے اور جس نے خدا کو غیر شخصی بنا کر حالات اور زمانے کو کم و بیش رومانوی قسم کے اوتار بنا دیا ہے۔ اقبال ایک بار پھر ایک نوائے لاہوتی بلند کرتا ہے جس میں انجیل مقدس کی آواز سنائی دیتی ہے۔ یہ آواز دنیائے مغرب کی بعض آوازوں کی بہ نسبت دانتے کی آواز سے یقیناً زیادہ مشابہت رکھتی ہے۔ واقعۂ معراج کے بارے میں ایک مسلمان صوفی عبدالقدوس گنگوہیؒ کا قول ہے: "محمد عربی عرش بریں پر پہنچ کر واپس آ گئے۔ اگر میں اس مقام پر پہنچ جاتا تو کبھی واپس نہ آتا!" اس سے پیغمبر اور عارف کا فرق ظاہر ہوتا ہے۔ کیونکہ پیغمبر وصالِ حق سے اپنے اندر ایک نیا تخلیقی ولولہ محسوس کرتا ہے۔ اور عارف یہی پسند کرتا ہے کہ وہ اپنے اور دوسرے پیغمبروں موسیٰؑ اور الیاسؑ کے لئے دریائے سرمدی کے کنارے ایک خیمہ گاڑ کر بیٹھا رہے! اقبالؒ جمالِ حق سے تحریکِ عمل پاتے ہیں۔ اور ان کا پیغام پیغمبرانہ ہے نہ کہ عارفانہ۔

جیسا کہ اقبال نے اپنے خطبات دربارۂ تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ میں کہا ہے، اپنے مذہبی واردات سے دنیا کی کایا پلٹ دینا۔ یہ خصوصیت ہے جو ایک پیغمبر کو عارف سے ممیز کرتی ہے۔ اقبالؒ کا شمار مشرق کے ان تھکے ماندے عارفوں میں نہیں جن کے اکثر اہلِ مغرب اس قدر مداح ہیں۔ لیکن وہ ایک بے دین پرستارِ عمل بھی نہیں۔ ایک ایسا انسان جو محض عمل برائے عمل کا دلدادہ ہو۔

مانا کہ اقبال عمل کے قائل ہیں۔ لیکن ہمیں یہ جاننا چاہئے کہ کسی اقدام سے پہلے انہوں نے افلاک کا سفر کیا۔ یہ درست ہے کہ انہوں نے 'خودی' کو نئے معنی عطا کئے ہیں۔ مگر ہمیں احتیاط برتنی

(باقی صفحہ ۵۸ پر)

اقبال کی شاعری کا انسانی پہلو

عبادت بریلوی

اقبالؒ جدید دور کے ایک بڑے شاعر اور ایک بلند پایہ مفکر تھے۔ ان کے بارے میں بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ مختلف زاویوں سے ان پر روشنی ڈالی گئی ہے لیکن ان کے فکر و فن کی تہہ تک بہت کم لوگ پہونچ سکے ہیں۔ بات یہ ہے کہ اقبالؒ کی شخصیت میں ایسی ہمہ گیری ہے کہ ہر شخص اس آئینے میں اپنے آپ کو دیکھتا ہے، اور اپنے مطلب کی باتیں نکال کر اس بات کا دعویٰ کرتا ہے کہ اس نے فکر اقبال کے صحیح خط و خال کو سمجھ لیا ہے۔ یہ اقبال کی بڑائی کی دلیل ضرور ہے لیکن اس صورت حال نے انہیں نقصان بھی پہنچایا ہے۔ ان کے فکر و فن کا جیسا تجزیہ ہونا چاہیئے تھا نہیں ہو سکا ہے۔ ہر شخص اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنائے بیٹھا ہے اور بزعم خود یہ سمجھتا ہے، کہ وہ اقبال کے فکر و فن کا ماہر ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اقبال کے فکر و فن میں اتنی گہرائی، اس قدر وسعت اور اس درجہ ہمہ گیری ہے کہ اس کا سمجھنا کسی غیر متوازن اور جذباتی انسان کے بس کی بات نہیں۔ اقبال کو سمجھنے کے لئے فلسفی کے دماغ اور شاعر کے دل کے ساتھ ساتھ ایک انسانی شعور کی بھی ضرورت ہے۔ اس انسانی شعور کی روشنی میں ایک تجزیاتی اور تخلیقی زاویۂ نظر کے بغیر ان کو نہیں سمجھا جا سکتا۔ انسانیت اور انسان دوستی کے صحیح شعور کے بغیر ان کو سمجھنا ناممکن ہے۔ بلکہ انسانیت اور انسان دوستی کا یہ شعور تو ان کے سمجھنے میں بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ کیونکہ یہی محور ہے جس کے گرد ان کے تمام افکار و خیالات گھومتے ہیں ـــــ یہی بنیاد ہے جس پر انہوں نے اپنے فکر و فن کی بنیاد استوار کی ہے۔ اسی لئے تو ان کے یہاں انسان دوستی کا خیال اتنی شدت سے کارفرما نظر آتا ہے۔ ان کی ہر بات میں اس جذبے کی ایک لہر سی دوڑتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ اقبال نے اسی انسان دوستی کے شدید جذبے کے ماتحت اپنے فکر و فن میں انسانی پہلو کو مختلف زاویوں سے نمایاں کیا ہے۔ اور یہ پہلو اس حد تک ان کے یہاں نمایاں ہوتا ہے کہ اس کے سامنے دوسرے پہلو بڑی حد تک پس منظر میں جا پڑتے ہیں۔

اقبال کے افکار و خیالات سے اس حقیقت کا اندازہ ہوتا ہے کہ وہ بنیادی طور پر ایک فلسفی تھے۔ انہوں نے مغرب و مشرق کے بہت سے فلسفوں سے استفادہ کیا ہے۔ لیکن وہ ان میں سے کسی ایک فلسفے کے ساتھ بہہ نہیں گئے ہیں۔ انہوں نے ان فلسفوں سے وہ خیالات لے لئے ہیں، جو ان کے انسان دوستی کے نظریئے کو تقویت پہنچاتے ہیں۔ ان خیالات کے امتزاج سے انہوں نے انسان دوستی کے نظریئے کی تعمیر و تشکیل کی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ کوئی ایک فلسفیانہ خیال بھی ان کے یہاں ایسا نہیں ملتا جو ان کی انسان دوستی کو سہارا نہ دیتا ہو۔ ان کا فلسفہ صرف فلسفہ ہی نہیں ہے، حیات انسانی کا ایک نظام فکر ہے جس میں انسان دوستی کا خیال بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ ان کے یہاں مختلف فلسفیوں کے گہرے اثرات ہیں لیکن ان میں سے ہر ایک کی بات انہوں نے مانی نہیں ہے۔ ہر ایک کے خیالات کو تسلیم نہیں کر لیا ہے بلکہ ہر ایک کے خیالات میں سے ایسی باتیں۔ منتخب کی ہیں جن سے ان کا مقصد پورا ہوتا ہے جو ان کے بنیادی نظریات کی تشکیل و تعمیر میں ممد و معاون ہوتے ہیں۔ اسی طرح ان کے فلسفے کی بنیاد پڑی ہے۔ اس فلسفے کے جو عناصر ہیں وہ سب انسانیت کے گرد گھومتے ہیں۔ ان سب کی تان انسان دوستی پر جا کر ٹوٹتی ہے۔ بڑی بات یہ ہے کہ اقبال نے اس فلسفے کو صرف خیالی نہیں ہونے دیا ہے۔ اس سے متعلق ہر فلسفیانہ خیال کو عمل سے ہم آہنگ کیا ہے۔ انسانیت کی بلندی کا خیال اس عمل کی جولانگاہ ہے۔

فلسفیوں میں انہوں نے نٹشے سے استفادہ کیا ہے۔ حالانکہ وہ اسے "مجذوب فرنگی" کہتے ہیں اور اسے خود یہ سمجھانا چاہتے ہیں کہ "مقام کبریا" کیا ہے۔ برگساں سے بھی وہ کسی حد تک متاثر ہیں۔ کانٹ، ہیگل، اور مارکس سے بھی انہوں نے

بعض خیالات لئے ہیں۔ اسلامی مفکرین میں رومیؒ کو تو خیر انہوں نے اپنا مرشد اور رہنما ہی مانا ہے۔ لیکن ابن سینا، ابن العربی اور جمال الدین افغانیؒ کے اثرات بھی ان پر کچھ کم نہیں ہیں۔ ان تمام خیالات کو انہوں نے ایک مرکز پر جمع کیا ہے۔ یہ مرکز انسان وحدتی کا مرکز ہے یہیں سے ان کی انفرادیت وجود اختیار کرتی ہے۔ اسی لئے ان کا فلسفہ صرف فلسفہ ہی نہیں رہ گیا ہے انسانی زندگی کے لئے ایک لائحۂ عمل بن گیا ہے۔ وہ زندگی کے مسائل کو حل کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔ وہ ایک پیغام ہے اس زخمی انسانیت کے لئے جو زخموں سے چور ہے جو سر سے پاؤں تک لہولہان ہے جو صدیوں سے جبر و استبداد کے پیروں تلے پڑی تلملا رہی ہے۔

یہ خیالات ان لوگوں کے لئے کسی قدر عجیب اور نامانوس ضرور ہیں۔ جو اقبالؒ کو اسلامی طرزِ فکر اور اسلامی نظامِ حیات کی طرف جھکتے ہوئے دیکھ کر یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ وہ صرف مسلمانوں کے شاعر ہیں۔ ان کے پیشِ نظر صرف مسلمانوں کی زندگی ہے، صرف انہیں کے مسائل ہیں۔ وہ صرف مسلمانوں ہی کو اس دنیا میں سرخرو اور سربلند دیکھنا چاہتے ہیں — لیکن اقبالؒ کے فن کو اس طرح دیکھنا، اس کی روح کا خون کرنا ہے۔ اس میں تنگ نظری بھی ہے اور کم ظرفی بھی!

ویسے یہ بات ٹھیک ہے، اور اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ اقبالؒ نے اپنے فکر و فن کی بنیادیں اسلامی نظریات اور اسلامی نظامِ حیات پر رکھی ہیں۔ لیکن ان اسلامی نظریات نے انہیں محدود نہیں کیا ہے۔ ان کے یہاں تنگ نظری نہیں پیدا کی ہے۔ برخلاف اس کے ان کے شعور کو بیدار کیا ہے۔ اس کو وسعت دی ہے۔ کیونکہ اسلام ان کے نزدیک تنگ نظری سے کوئی سروکار نہیں رکھتا۔ اس میں ایک ہمہ گیری ہے ایک وسعت ہے، ایک بلندی ہے۔ انسانی مساوات اور اخوت، انسانی ہمدردی اور محبت، انسانی بلندی اور برتری کو اس نظامِ حیات میں بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ اسلام ایک مکمل نظامِ حیات بھی رکھتا ہے روحانی اور مادی دونوں اعتبار سے وہ انسانیت کو منتہائے کمال پر پہنچانے کا خواہشمند ہے۔ معاشی، معاشرتی، تہذیبی اور تمدنی اقدار میں ہم آہنگی کا خیال ہمیشہ اس کے پیشِ نظر رہا ہے۔ اسی لئے اس نے انسانیت کو ہر دور میں، ہر اعتبار سے آگے بڑھانے اور سربلند کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اقبالؒ انسانی نظریات کو انسانی فکر کی تاریخ میں نمایاں حیثیت دیتے ہیں، ان کا خیال ہے کہ اسلام نے انسانیت کو آدابِ محبت سکھائے ہیں۔ اور اس کو تہذیب سے ہمکنار کیا ہے۔ اسلام نے طبقاتی تفریق کو بڑی حد تک ختم کیا ہے مساوات کی اہمیت ذہن نشین کرائی ہے اور بے لوث انسانی خدمت کا جذبہ افراد کے دلوں میں بیدار کیا ہے اور ایثار اور قربانی کو فرد اور جماعت دونوں کے لئے لازمی قرار دیا ہے۔ اقبالؒ اسی لئے تو اس نظامِ حیات کے بنیادی اصول اور نظریات کے پرستار ہیں — حقیقت یہ ہے کہ ان کی اس پرستش اور وابستگی میں ایک انسانی بلندی کا احساس شامل ہے۔ انسانیت کو ارتقا کے راستے پر گامزن کرنے کی خواہش پوشیدہ ہے۔ زندگی کو اقدارِ شر سے پاک کرنے اور اقدارِ خیر سے ہمکنار کرنے کی آرزو کارفرما ہے۔

یوں دوسرے نظریاتِ حیات بھی انسانی زندگی میں موجود ہیں لیکن اقبالؒ کے خیال میں وہ مجموعی اعتبار سے مکمل نہیں ہیں۔ کوئی مادی اعتبار سے مکمل ہے تو کوئی روحانی اعتبار سے۔ مادیت اور روحانیت کا سنگم اگر کہیں ملتا ہے تو وہ اسلامی نظامِ حیات ہے۔ اور یہ دونوں انسانیت کی تکمیل کے لئے لازمی ہیں۔ ان میں سے کسی ایک کی تکمیل کے بغیر انسانیت کی تکمیل اور بلندی ناممکن اور محال ہے۔ اس روحانیت اور مادیت کے صحیح امتزاج اور ہم آہنگی کی خصوصیتیں صرف اسلامی نظامِ حیات میں مل سکتی ہیں۔ اسلام روحانی اور مادی دونوں اعتبار سے زندگی بسر کرنے کا ایک مکمل تخیل پیش کرتا ہے۔ وہ ایک ایسی عالمگیر برادری کا نام ہے جس میں امتیازِ رنگ و خون نہیں ہوتا جس میں نسل اور قوم کی قید نہیں ہوتی۔ بلکہ اس لڑی میں منسلک ہونے کے بعد ہر فردِ جہان رنگ و خون کو توڑ کر ملت میں گم ہو جاتا ہے۔ اس طرح کہ نہ کوئی تورانی باقی رہتا ہے نہ ایرانی! اور ظاہر ہے۔ ایسا کرنے سے اسلام کا مقصد صرف انسانیت کی بلندی اور سرفرازی ہے۔ وہ زندگی بسر کرنے کا ایک لائحۂ عمل بھی صرف اسی انسان اور انسانیت کے خیال سے پیش کرتا ہے۔ اس نے ہر اعتبار سے زندگی کو برتنے اور بسر کرنے کی تاکید کی ہے۔ لیکن صرف مادیت اس کا نصب العین نہیں ہے وہ اس کے ساتھ ساتھ روحانیت کی فضا میں پرواز کرنا بھی سکھاتا ہے یہ دونوں پہلو اسلامی نظام میں گلے ملتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ دوسرے نظریاتِ حیات میں یہ بات نہیں۔ کیونکہ ان میں سے اکثر میں یا تو تمام تر روحانیت ہی روحانیت ہے یا مادیت ہی مادیت!

دورِ جدید کے نظامِ زندگی میں نظریۂ اشتراکیت اقبالؒ کو اہم معلوم ہوتا ہے۔ وہ اس سے متفق نہیں ہیں۔ انہیں اس نظریے سے بنیادی

اختلافات ہیں۔ لیکن ان اختلافات کے باوجود وہ اس کی بڑائی کے قائل ہیں۔ زندگی کے متعلق اشتراکیت کے تمام تر مادی نقطۂ نظر کو وہ انسانیت کے لئے خطرناک سمجھتے ہیں۔ انہیں اشتراکیت کے بانی کارل مارکس سے بنیادی طور پر نظریاتی اختلافات ہیں۔ لیکن اس کے باوجود وہ اس کی عظمت کے قائل ہیں۔ ان کے خیال میں وہ "کلیم بے تجلی" اور "مسیح بے صلیب" ہے اور ہر چند کہ اُسے پیغمبر نہیں کہا جا سکتا لیکن اس کی بغل میں کتاب ضرور موجود ہے ؎:۔

آں کلیم بے تجلی آں مسیح بے صلیب
نیست پیغمبر ولیکن در بغل دارد کتاب

اور روس میں لینن کے ہاتھوں اس کے نقطۂ نظر کو جو عملی جامہ پہنایا گیا ہے، ارتقائے انسانی کی تاریخ میں وہ اس کی اہمیت کے معترف ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ان کے خیال میں روحانیت کو خیرباد کہہ دینے کی وجہ سے روس کے یہ تمام تجربات بے معنی ہو کر رہ گئے ہیں۔ ان کے خیال میں روس نے ایسا کر کے اپنے آپ کو ایک دلدل میں پھنسا لیا ہے۔ اور اسی لئے اس نے ترقی کے بہت سے دروازے اپنے اوپر بند کر لئے ہیں۔ زندگی کی راہ میں جس طرح اُسے آگے بڑھنا چاہیئے تھا، نہیں بڑھ سکا ہے۔ لیکن وہ اس سے مایوس نہیں ہیں۔ بلکہ اس کے متعلق ایک رجائی نقطۂ نظر رکھتے ہیں اور انہیں یقین ہے کہ وہ ایک نہ ایک دن اپنے آپ کو اس دلدل سے ضرور باہر نکال لے گا۔ کیونکہ آئینِ زندگی سے صحیح مطابقت کے بغیر کوئی انسانی نظام زندہ نہیں رہ سکتا ؎

کردہ ام اندر مقاماتش نگاہ
لا سلاطین، لا کلیسا، لا الٰہ
فکرِ او در تندبادِ لا بماند
مرکبِ خود را سوئے الّا نراند
آیدش روزے کہ از زورِ جنوں
خویش را زیں تندباد آرد بروں
در مقامِ لا نیاساید حیات
سوئے الّا می خرامد کائنات

اقبالؒ کے خیال میں اشتراکیت ایک ایسا نظام ضرور ہے جو رنگ و خون اور نسل و قوم کے سطحی امتیازات کو مٹانا چاہتا ہے جس کے نزدیک طبقاتی تفریق کو مٹا کر ایک ایسے نظام کی تشکیل لازمی اور ضروری ہے جس میں نفرت نہ ہو، بغض و عناد نہ ہو، ہوسِ ملک گیری نہ ہو، غربت و امارت کا فرق نہ ہو اور دولت کی تقسیم غیر مساوی نہ ہو۔ اقبالؒ اشتراکی نظام کے ان پہلوؤں کی اہمیت کے تو قائل ہیں لیکن اس نظام نے روحانیت سے جو چشم پوشی کی ہے، اس کے وہ دشمن ہیں۔ کیونکہ ان کے خیال میں روحانیت کے بغیر انسانیت کی تکمیل ناممکن ہے، اور انسانیت انہیں بہت عزیز ہے۔ اس لئے اشتراکیت کی یہ کمی ان کی آنکھوں میں کانٹے کی طرح کھٹکتی ہے۔ روحانیت کے بغیر انسان میں اخلاقی اقدار کی پاسداری اور خلوص و صدق دلی ہمیشہ باقی نہیں رہ سکتی۔ جو نظامِ حیات بیک وقت ان تمام باتوں کو پورا کرتا ہے، وہ ان کے خیال میں اسلامی نظامِ حیات ہے اور اسلامی نظامِ حیات ان کے خیال انسان دوستی اور انسانیت پرستی کا دوسرا نام ہے۔

اقبالؒ اسلام کو اشتراکیت کی طرح ایک تحریک سمجھتے ہیں۔ یہ تحریک ان کے خیال میں انسان دوستی کا سبق دیتی ہے۔ ملک و ملت کے تفرقے مٹانا چاہتی ہے۔ طبقاتی تفریق کو ختم کرنا چاہتی ہے۔ انسان کو صحیح معنوں میں انسان بنانا چاہتی ہے۔ اقبالؒ اسی تحریک کے مفکر ہیں، اسی کے ترجمان ہیں، اسی کے علمبردار ہیں۔ انہوں نے اس سلسلے میں نئی باتیں بھی کہی ہیں اور پرانی باتوں کو نئے حالات سے مطابق کر کے نئے انداز میں پیش بھی کیا ہے۔ وقت نے جن رگوں کو خون سے خالی کر دیا تھا، اقبالؒ نے ان کے اندر ایک نیا خونِ زندگی دوڑا دیا ہے۔ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اقبالؒ نے اسلامی تحریک سے اپنے آپ کو وابستہ کر کے ایسی قومی برتری کا خواب دیکھا ہے جس کی تہہ میں فسطائی رجحان کی جھلک ہے، وہ اس حقیقت کو فراموش کر دیتے ہیں کہ اس قوم کے دروازے کسی پر بند نہیں ہیں۔ اقبالؒ ان دروازوں کو ہر ایک کے لئے کھلا رکھنا چاہتے ہیں۔ اس لئے ان کا یہ پیام انسان دوستی اُن افراد کے لئے بھی ہے جو اس تحریک کے مخالف ہیں، ان کے لئے بھی ہے جو انسانی برادری کے اس رشتے میں منسلک ہونا نہیں چاہتے۔ اقبالؒ انہیں دعوت دیتے ہیں۔ اسلام اور مسلمانوں کے جلال و جمال دونوں کی آب و تاب دکھا کر انہیں اپنی جانب کھینچتے ہیں تاکہ انسانیت کی تعمیر صحیح اقدار پر ہو سکے۔ اقبالؒ کی نظریں یہ دیکھتی ہیں کہ انسانیت گھائل ہے۔ قومی، قبیلی اور ملکی تفریق نے اُسے زخموں سے چور کر دیا ہے۔ ان کی تعلیم ان زخموں پر مرہم رکھنے اور اس طرح ان کو مندمل کرنے کی تعلیم ہے۔ ان کا پیام ان زخموں کو بھرنے کا پیام ہے ؎

ہوس نے کر دیا ہے ٹکڑے ٹکڑے نوعِ انساں کو
اخوت کا بیاں ہو جا، محبت کی زباں ہو جا
یہ ہندی وہ خراسانی، یہ افغانی وہ تورانی
تو اے شرمندۂ ساحل اچھل کر بیکراں ہو جا
غبار آلودۂ رنگ و نسب ہیں بال و پر تیرے
تو اے مرغِ حرم اڑنے سے پہلے پرفشاں ہو جا

یہ اخوت کا بیاں ہونا، یہ محبت کی زباں ہو جانا، یہ اچھل کر بیکراں ہو جانا، اپنے اندر بڑی معنویت رکھتا ہے۔ اقبالؒ کی تعلیم اور ان کے فلسفے کی بنیادی باتیں اس کے اندر موجود ہیں۔ وہ انسانی زندگی میں اخوت اور محبت کے چراغوں کو روشن رکھنا چاہتے ہیں۔ انسان کو بیکراں بنانا ان کی زندگی کا سب سے بڑا مقصد ہے اور یہی اسلام بھی چاہتا ہے۔ اقبالؒ نے اس بنیادی خیال کو زیادہ گہرائی اور رعنائی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ خرد نے انہیں حکیمانہ نظر عطا کی ہے اور عشق نے انہیں حدیثِ دلبرانہ سکھائی ہے۔ وہ رازِ درونِ میخانہ کے محرم ہیں۔ ان کی نظر اصلیت و حقیقت تک پہونچی ہے۔ اسی لئے ان کے یہاں اس سلسلے میں خلوص اور صدقِ دلی کا احساس ہوتا ہے۔ عقل و شعور کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔

یہ خیال یہاں پیدا ہو سکتا ہے کہ اقبالؒ نے اتحاد و اتفاق، اخوت و محبت کا یہ پیام صرف مسلمانوں کو دیا ہے لیکن یہ بات صحیح نہیں۔ مسلمانوں کا اتحاد، اس میں شک نہیں کہ ان کے پیشِ نظر ہے۔ لیکن یہ اتحاد ہی انہیں قدروں کو عام کرنے کے لئے ان کے پیشِ نظر رہا ہے۔ اور ان قدروں کو وہ ساری انسانیت میں عام کرنا چاہتے ہیں۔ انسانیت کا خیال کبھی بھی ان کی نظروں سے اوجھل نہیں ہوتا۔ وہ اس خیال کو بڑی اہمیت دیتے ہیں۔ انہوں نے واضح طور پر اس خیال کا اظہار کیا ہے۔ کہ "دراصل انسانیت کی بقا کا راز اس کے احترام میں ہے۔ جب تک تمام دنیا کی تعلیمی قوتیں اپنی توجہ کو محض احترامِ انسانیت کے درس پر مرکوز نہ کر دیں، یہ دنیا بدستور درندوں کی بستی بنی رہے گی۔" اور اس دنیا کو درندگی اور بہیمیت سے پاک کرنا، اور اس طرح اس کو تہذیب سے ہمکنار کرنا ان کا سب سے بڑا نصب العین ہے۔ یہ بات صحیح نہیں ہے کہ وہ اپنے فکر و عمل کو صرف مسلمانوں ہی تک محدود رکھتے ہیں۔ وہ مسلمانوں کے ساتھ ساتھ دوسروں کو بھی دیکھتے ہیں۔ مسلمانوں کا خیال بے شک ان کے یہاں زیادہ ہے۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ اور اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ

اقبال خود مسلمانوں کی اس جمعیت سے تعلق رکھتے تھے، جس کو صدیوں کے مسلسل انحطاط و زوال نے کہیں کا نہیں رکھا تھا، جس کی انفرادیت ختم ہو چکی تھی، جو اس زندگی میں بے یار و مددگار رہ گئے تھے، اور جن کا کوئی پوچھنے والا نہیں رہا تھا۔ اس لئے اقبال کا ایک ایسی قوم کی فلاح و بہبود کی طرف متوجہ ہونا، انسان دوستی کے بنیادی خیال سے علیحدہ کوئی بات نہیں ہے۔ یہ اسی کا ایک حصہ ہے۔ مسلمانوں کے ساتھ ساتھ سارے مشرق کا خیال ان کے پیشِ نظر رہا ہے۔ کیونکہ یہ دونوں زمانے کے ہاتھوں بری طرح پامال کئے گئے ہیں۔ ان اشعار میں سارے مشرق کی حالت کو بہتر بنانے کا احساس کتنا شدید ہے ؎

تیرہ خاکم را سراپا نور کن — در تجلی ہائے خود مستور کن
تا بروز آرم شبِ افکارِ شرق — بر فروزم سینۂ احرارِ شرق
از نوائے پختہ سازم خام را — گردشِ دیگر دہم ایام را
فکرِ شرق آزاد گردد از فرنگ
از سرودِ من بگیرد آب و رنگ

اور ایک جگہ ہمالیہ، اٹک اور رودِ گنگ کو مخاطب کر کے ان خیالات کا اظہار کیا ہے ؎

اے ہمالہ، اے اٹک، اے رودِ گنگ
زیستن تا کے چناں بے آب و رنگ
پیر مرداں از فراست بے نصیب
نوجواناں از محبت بے نصیب
شرق و غرب آزاد و ما نخچیرِ غیر
خشتِ ما سرمایۂ تعمیرِ غیر

ایک اور جگہ ہندوستانیوں کی باہمی کشمکش اور اس کے نتیجے میں فرنگی قوم کی کامیابی پر اس طرح خون کے آنسو بہاتے ہیں ؎

ہندیاں با یک دگر آویختند
فتنہ ہائے کہنہ باز انگیختند
تا فرنگی قومے از مغرب زمیں
ثالث آمد در نزاعِ کفر و دیں
کس نداند جلوۂ آب از سراب
انقلاب اے انقلاب اے انقلاب

فکرِ شرق کو دستِ فرنگ سے آزاد کرنے کی خواہش اور انقلاب کا یہ نعرہ

انسان دوستی کے شدید جذبے کا نتیجہ ہے۔ اقبال کو مسلمان، ہندوستان اور مشرق سب کی پائمالی کا شدید احساس ہے۔ اور تاریخ کے مختلف ادوار میں اس پر جو دست درازیاں ہوتی رہی ہیں، وہ ان سے خوش نہیں ہیں۔ کیونکہ وہ ان دست درازیوں کو انسانیت سے اور انسان دوستی کے بنیادی اصول کے خلاف سمجھتے ہیں۔

اس ساری بحث سے صرف یہ دکھانا مقصود ہے کہ اقبالؒ نے اپنے آپ کو صرف مسلمانوں ہی تک محدود نہیں کیا ہے۔ اُن کے دل میں ہر پیش پا افتادہ قوم اور پائمال فرد کا درد ہے۔ وہ ان افراد اور اقوام کو بلند کرنا چاہتے ہیں لیکن ان کے خیال میں یہ بلندی انہیں اسی وقت حاصل ہوسکتی ہے جب وہ اسلام کے بنیادی اصولوں کو اپنالیں۔ کیونکہ ان کے خیال میں اسلامی اصول ہی انسان دوستی اور انسانیت کے اصول سے ہم آہنگ ہیں۔ اسلام کی ہر بات میں وہ انسانیت کی بہتری دیکھتے ہیں۔ اس کی پیش کی ہوئی تمام اقدار میں انہیں انسانیت پرستی کا خیال کارفرما نظر آتا ہے اور اس کی پیش کی ہوئی تمام اقدار میں انہیں بنی نوع انسان کی فلاح و بہبود دکھائی دیتی ہے۔ لیکن ان کے یہ خیالات کسی جذباتیت پر مبنی نہیں ہیں۔ انہوں نے اس حقیقت کو محسوس کیا ہے کہ اسلام نے انسانی زندگی کے بنیادی مسائل کو حل کیا ہے۔ اور صحیح اسلامی نظام اقدار میں وہ طبقاتی کشمکش اور آویزش نظر نہیں آتی جس نے آج ساری دنیا کو ہنگاموں کی آماجگاہ بنا دیا ہے۔ ساری انسانی زندگی جن کی وجہ سے ایک اچھا خاصا میدان کارزار بن گئی ہے۔

اقبالؒ نے اسی کشمکش اور آویزش کو شدت سے محسوس کیا ہے۔ اس آویزش اور کشمکش سے پیدا ہونے والے بنیادی مسائل کا وہ گہرا شعور رکھتے ہیں اسی لئے انہوں نے ان بنیادی مسائل کی طرف پوری طرح توجہ کی ہے۔ انسانی زندگی میں سرمایہ و محنت کی جو کشمکش جاری ہے، اس کا انہیں علم ہے۔ وہ اس کے سارے نشیب و فراز کو سمجھتے ہیں۔ اسکا سارا مدوجزر ان کے پیش نظر رہا ہے —— اس کو بنیاد بنا کر انہوں نے انسانی تاریخ کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ اس سلسلے میں انسانی زندگی کو جن حالات سے دوچار ہونا پڑا ہے۔ اس کا اقبال کو بڑا دکھ ہے۔ وہ اس پر خون کے آنسو روتے ہیں اسی لئے تو اپنی شاعری کے ذریعے سے انہوں نے بندۂ مزدور کو بیداری کا پیام دیا ہے۔ وہ مشرق و مغرب میں اس کے دور کا آغاز دیکھتے ہیں۔ "خضر راہ" اور "شمع و شاعر" ان کی مشہور نظمیں ہیں۔ ان نظموں میں انہوں نے انسانی زندگی کے انہیں بنیادی مسائل کی طرف توجہ دلائی ہے۔ بڑی بات یہ ہے کہ انہوں نے ان مسائل کو خالص انسانی زاویۂ نظر سے دیکھا ہے۔ جس زمانہ میں یہ نظمیں لکھی گئی ہیں، اس زمانہ میں ان معاملات و مسائل کو اس زاویۂ نظر سے دیکھنے کا کسی کو خیال بھی نہیں آتا تھا۔ اقبالؒ کو اس سلسلے میں اولیت کا شرف حاصل ہے۔ انسان دوستی کے شدید جذبہ ہی نے اقبالؒ سے ان اشعار کی تخلیق کرائی ہے ۔

اپنی اصلیت سے ہو آگاہ اے دہقاں ذرا
دانہ تو، کھیتی بھی تو، باراں بھی تو، حاصل بھی تو
کیوں کسی کی جستجو آوارہ رکھتی ہے تجھے
راہ تو، رہرو بھی تو، رہبر بھی تو، منزل بھی تو

(شمع و شاعر)

بندۂ مزدور کو جا کر مرا پیغام دے
خضر کا پیغام کیا، یہ ہے پیام کائنات
اے کہ تجھ کو کھا گیا سرمایہ دار حیلہ گر
شاخِ آہو پر رہی صدیوں تلک تیری برات

("خضر راہ")

ان اشعار میں انسان کی اہمیت کا صحیح احساس ہے۔ انسانی زندگی کے تاریخی ارتقاء کا واضح شعور ہے۔ اقبال نے یہاں اس حقیقت کو محسوس کیا ہے کہ انسان اس زندگی میں ایک بہت بڑی طاقت ہے جن لوگوں نے زندگی کے غلط نظام اقدار کا سہارا لے کر اسے شکنجوں میں کسنے کی کوشش کی ہے، وہ ہمیشہ باقی رہنے والے نہیں۔ ان کے جبر و استبداد کے پائمال افراد کا احساس خودی بڑی آسانی سے موت کے گھاٹ اتار سکتا ہے۔ چنانچہ انسان کے لئے اپنی اہمیت کا صحیح احساس ضروری ہے کہ اسی احساس سے فکر و عمل کی صلاحیتیں بیدار ہوسکتی ہیں اور انسانی زندگی کو ارتقا پر گامزن کرنے کے لئے راستے ہموار ہوسکتے ہیں۔ اور جب یہ صورت حال پیدا ہو جائے تو سرمایہ دار حیلہ گر کو موت کے گھاٹ اتارا جاسکتا ہے۔ نسل، قومیت، کلیسا، تہذیب اور رنگ کے بت توڑے جاسکتے ہیں۔ بزم جہاں کا یہ انداز ہو تو مشرق و مغرب میں نئے دور کا آغاز ہوسکتا ہے۔ اقبالؒ کے خیال میں یہ صورت حال انسانی زندگی کی ارتقائی کیفیت کے لئے ازبس ضروری ہے! اسی لئے تو وہ

انسان کی تمام صلاحیتوں کو اس کام کے لئے وقف کر دینا چاہتے ہیں۔ چنانچہ دنیا کے غریبوں کو جگانا، کاخ امرا کے در و دیوار ہلا دینا، غلاموں کا لہو سوز یقیں سے گرمانا، کنجشک فرومایہ کو شاہیں سے لڑا دینا ان کا پیام بن جاتا ہے۔ ان کی نگاہیں سلطانی جمہور کو آتے ہوئے دیکھتی ہیں۔ وہ ہر نقش کہن کو مٹانا، اور جس کھیت سے دہقاں کو روزی میسر نہ ہو۔ اس کے ہر خوشۂ گندم کو جلانا چاہتے ہیں۔ اقبالؒ کے یہ خیالات تمام تر انقلابی ہیں ان میں ایک جارحانہ انداز ملتا ہے۔ اور اس جارحانہ انداز کے پیدا ہونے کا بنیادی سبب یہ ہے کہ وہ انسانی زندگی اور اس کے نظام اقدار کو بدلنے کا گہرا احساس اور شدید جذبہ رکھتے ہیں۔ اقبال کے نزدیک یہ انقلاب اور تبدیلی انسان اور انسانیت کی تکمیل کے لئے ضروری ہے اسی لئے انہوں نے اپنی انقلاب پسندی کو انسان دوستی سے ہم آہنگ کر لیا ہے

یہ خیالات و نظریات اقبالؒ نے غور و فکر کے ساتھ پیش کئے ہیں ایسا کرنے کے لئے انہیں مختلف راہوں سے گزرنا پڑا ہے۔ انہوں نے اس سلسلے میں تاریخ کے میدانوں کی خاک بھی چھانی ہے۔ مذہبیات کی کوچہ گردی بھی کی ہے۔ تہذیب و تمدن کی ارتقائی کیفیت کا گہرا مطالعہ بھی کیا ہے۔ فلسفہ و نفسیات کی گتھیاں بھی سلجھائی ہیں۔ عمرانیات و معاشیات کے اسرار و رموز بھی کھولے ہیں۔ غرض یہ کہ انہیں دور دور پہنچنا پڑا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے اس پیام میں بڑی ہمہ گیری ہے، بڑی وسعت ہے، بڑی گہرائی ہے۔ اس کی بنیادیں زندگی کے حقائق پر استوار ہیں۔ تنگ نظری اس میں نام کو نہیں ملتی، اس کا آب و رنگ اسلامی ضرور ہے لیکن وہ محدود نہیں ہے۔ اس میں کشادہ دلی اور روشن دماغی ہے، دقت نظری اور بلند خیالی ہے، بے باکی اور صاف گوئی ہے۔ اس میں ایک عمل کا پیام ہے۔ اور اس عمل کے پیام کی بنیاد ایک انسانی نقطۂ نظر ہے، اقبالؒ نے بڑی خوبی سے اس کی وضاحت کی ہے ؎

کریں گے اہل نظر تازہ بستیاں آباد
مری نگاہ نہیں سوئے کوفہ و بغداد
نہ فلسفی سے، نہ ملا سے ہے غرض مجھ کو
یہ دل کی موت وہ اندیشہ و نظر کا فساد

درویش خدامست نہ شرقی ہے نہ غربی
گھر میرا نہ دلی نہ صفاہاں نہ سمرقند

کہتا ہوں وہی بات سمجھتا ہوں جسے حق
نے ابلۂ مسجد ہوں نہ تہذیب کا فرزند

ان اشعار سے صاف ظاہر ہے کہ اقبالؒ اپنے آپ کو محدود کرنا نہیں چاہتے۔ ان کے پیش نظر تو ساری دنیا ہے، ساری انسانیت ہے۔ ساری کائنات ہے۔ اقبال کی تعلیم فروعی باتوں میں الجھ جانے کا نام نہیں ہے۔ وہ تو بنیادی انسانی معاملات پر نظر رکھتے ہیں، ان کے پیش نظر تو صرف ایک ہی مقصد ہوتا ہے، اور وہ مقصد ہے انسانیت کی بلندی، اس کے مسائل کو حل کرنے کی آرزو، نظام اقدار میں ہمواری کی تمنا اور حالات کو ہر اعتبار سے بہتر بنانے کی خواہش، کہ اسی طرح انسان صحیح معنوں میں انسان بن سکتا ہے۔

اقبال کی انسان دوستی کا یہ فلسفہ، جس کو ان کے پیام سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں، کئی عناصر سے مل کر تشکیل پاتا ہے۔ اقبال انسانی زندگی میں فرد کی اہمیت کے قائل ہیں۔ انسان ہونے کی حیثیت سے انہیں اپنی بلندی کا احساس ہے۔ احساس کی اس شمع کو وہ فرد کے دل میں فروزاں کرنا چاہتے ہیں، اپنے فلسفے میں جس چیز کو انہوں نے خودی سے تعبیر کیا ہے وہ یہی انسان کی بلندی کا احساس اور عظمت کا خیال ہے۔ لیکن یہ خودی صرف فرد تک محدود نہیں رہتی۔ کیونکہ فرد انسانی زندگی کے اجتماعی نظام کا ایک جزو ہوتا ہے۔ اس لئے آگے چل کر یہ خودی اجتماعی خودی کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ فرد کو اجتماعی زندگی سے علیحدہ کر لیا جائے تو بذات خود اس کی کوئی حیثیت باقی نہیں رہتی ؎

فرد قائم ربط ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرون دریا کچھ نہیں

خودی کا عمل ساری انسانی زندگی میں جاری ہے اسی سے زندگی میں ایک حرکت ہے، ایک جولانی ہے، ایک سوز ہے، ایک ساز ہے۔ وہ محبت کو پیدا کرتی ہے اور محبت سے اس کا رشتہ استوار ہوتا ہے ؎

نقطۂ نورے کہ نام او خودی است
زیر خاک ما شرار زندگی است
از محبت می شود پاینده تر
زنده تر، سوزنده تر تابنده تر

فرد اور جماعت میں خودی کی تکمیل کے لئے اطاعت ضبط نفس

اور نیابتِ الٰہی کے خیال کا ہونا لازمی ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ توحید و رسالت اور قرآن پر ایمان بھی ضروری ہے۔ اقبالؒ کے یہاں یہ باتیں، محض رسمی اور روایتی انداز میں بیان نہیں ہوئی ہیں۔ انہوں نے ان میں نئے پہلو بھی نکالے ہیں۔ نئے گوشوں کو بھی تلاش کیا ہے۔ مثلاً توحید اقبالؒ کے خیال میں ایک خدا پر ایمان رکھنے کا نام ضرور ہے لیکن اس سے وہ انسانی وحدت کا کام بھی لینا چاہتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ انہوں نے توحید سے یہ کام لیا بھی ہے۔ طاقت بھی اسی توحید کے خیال سے پیدا ہوتی ہے۔ اور اقبالؒ طاقت کے پرستار ہیں۔ طاقت میں انہیں حسن بھی نظر آتا ہے، اس جلال میں وہ زندگی کا جمال بھی دیکھتے ہیں ؎

ملّتے چوں میشود توحید مست
قوت و جبروت می آید بدست
فرد از توحید لاہوتی شود
ملت از توحید جبروتی شود
ہر دو از توحید می گیرد کمال
زندگی ایں را جلال، آں را جمال

اقبالؒ طاقت کے ساتھ ساتھ فرد اور جماعت کے لئے محبت اور عشق کو بھی ضروری قرار دیتے ہیں۔ اور محبت اور عشق کا مفہوم ان کے یہاں محدود نہیں ہے۔ وہ تمام انسانی خصوصیات پر حاوی ہے ؎

طبعِ مسلم از محبت قاہر است
مسلم ار عاشق نباشد کافر است

لیکن ان کے دوسرے تصورات کی طرح ان کے اس تصورِ عشق کی نوعیت بھی اجتماعی اور انسانی ہے۔ انسان اور انسانیت کی تکمیل ان کے خیال میں اس کے بغیر ممکن نہیں۔

یہ تمام خصوصیات جب کہیں یکجا ہوتی ہیں تو ایک انسانِ کامل وجود میں آتا ہے جس کو اقبالؒ 'مردِ مومن' کہتے ہیں۔ اس مردِ مومن کی تمام صلاحیتیں انسانی زندگی کو عظمت اور بلندی سے ہمکنار کرنے کے لئے وقف ہوتی ہیں۔ وہ اپنے ارادوں میں خاطر خواہ کامیابی حاصل کرتا ہے۔ کیونکہ اس کی ہستی میں ایمان کی روشنی ہوتی ہے، عمل کی قوت ہوتی ہے وہ اپنی دنیا آپ پیدا کرتا ہے، زندگی کو ذوقِ پرواز سمجھتا ہے، سفر کو منزل سے بڑھ کر پسند کرتا ہے۔ محبت کو اپنا مسلک جانتا ہے، کبھی ناامید نہیں ہوتا۔ بلکہ نومیدی کو زوالِ علم و عرفان سمجھتا ہے، اس کی امیدیں خدا کے راز دانوں میں ہوتی ہیں، اس کی نظر میں تلوار کی تیزی کا جادو ہوتا ہے! اور اس کی نگاہ سے تقدیریں بدل جاتی ہیں ؎

کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے دست و بازو کا
نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

اقبالؒ کے فکر و فن میں اسی مردِ مومن اور انسانِ کامل کی آواز سنائی دیتی ہے!

○

غزل

جگرؔ مرادآبادی

صد آرزوئے خوشگوار و سرگراں لئے ہوئے
پھرا کرے گی زندگی کہاں کہاں لئے ہوئے

ہوا نہ دل ہی ملتفت اگرچہ مدّتوں کے بعد
شمیمِ دوست آئی تھی، قرارِ جاں لئے ہوئے

برس رہی ہے زندگی، ترس رہی ہے زندگی
نفس نفس سے تشنگی کی داستاں لئے ہوئے

خوشا حیاتِ عاشقاں کہ موت بھی جب آئی ہے
تو ساتھ ایک حلقۂ پری وشاں لئے ہوئے

اب اس مقامِ عشق سے گذر رہا ہوں میں جگرؔ
کہ ظلمتیں بھی ہیں جہاں تجلّیاں لئے ہوئے

اجتماعی نشوونما کے اسباب[1]

ایم - ایم شریف

ارتقا کے معنی ہیں ایک حالت سے بہتر حالت کی طرف اقدام - اسلئے اس کی پہلی شرط حرکت ہے کسی عالمگیر اصول کا تخصیصی اطلاق ہونا چاہئے۔ وہ عالمگیر اصول یہ ہے کہ ہر حرکت، حول کے مطالبات کا جواب ہوتی ہے۔ توانائی کے تمام مراکز خواہ وہ برقے ہوں خواہ جوہر، پتھر، پودے، حیوان، انسان یا معاشرے، اپنے ماحول سے زندہ تعلق رکھتے اور اس کی طرف اعتنا کرتے ہیں۔ وہ دوچار ہونے اور تصادم ہونے کی صورت میں اپنا اپنا جداگانہ اثر ڈالتے اور ایک دوسرے کا اثر قبول کرتے ہیں۔ جب یہ لوگ اپنی سرگرمیوں کے دوران میں ایک دوسرے سے ٹکراتے ہیں یا تو ہر ایک دوسروں کے راستے میں رکاوٹ بن جاتا ہے۔ ان رکاوٹوں سے ان کی حرکت رک جاتی ہے، ان کی قوت ٹوٹتی، جمع ہوتی اور پھر وہی دوچار ہونے، ٹوٹنے، قوت جمع کرنے اور زیادہ زور سے پلٹنے کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ اس طرح ہر حرکت درحقیقت موج کی حرکت سے ملتی جلتی ہے۔ یعنی پے در پے تقاضوں کا سامنا کرتے چلے جانا۔

ارتقا محض تقاضوں کا پورا کرنا ہی نہیں بلکہ کامیاب تقاضوں کے کامیاب جواب کا ایک طویل سلسلہ ہے۔ جہاں تک انسانی سوسائٹی کے ارتقا کا تعلق ہے۔ ٹائن بی کے الفاظ میں کامیابی اسی وقت حاصل ہو سکتی ہے۔ جب کوئی اقلیت یا ساری کی ساری جماعت کسی مطالبے کا جواب اس طرح دیتی ہے کہ صرف وہی ایک تقاضا ہی پورا نہیں ہوتا بلکہ اسے ایک اور مطالبے سے بھی دوچار ہونا پڑتا ہے۔ جس کے لئے ایک علیحدہ حل درکار ہوتا ہے۔

یہ ضروری نہیں کہ جن مطالبوں کا کامیابی سے جواب دیا جائے اور اس کے نتیجہ میں مختلف تہذیبیں اور تمدن بروئے کار آئیں وہ تمام لوگوں کے لئے ایک ہی ہوں۔ یہ مطالبے جغرافی بھی ہو سکتے ہیں اور انسانی یا ملے جلے بھی۔ آئیے ہم پہلے جغرافی حالات پر نظر ڈالیں۔ ممکن ہے تہذیب کی نشوونما کا سبب زمین کا پانی سے محروم ہو جانا ہو جیسا کہ مصر اور سمیریا کے سلسلہ میں نظر آتا ہے۔ چین میں دلدلوں اور سیلابوں کی کثرت اس کا باعث ہوئی۔ جنوبی امریکہ کی آنڈیائی تہذیب کے سلسلہ میں خشک آب و ہوا، خراب زمین اور گرم سیر علاقوں کی شدید گرمی کو دخل تھا۔ قریطش اور یونان کی تہذیبیں سمندر کے چیلنج کا نتیجہ تھیں۔ مایا اور ہندوستان والوں کے لئے گھنے جنگلات اور شدید گرمی، شامیوں اور عربوں کے لئے صحرا اور حرارت اور روسیوں کے لئے جنگلات، بارش، برف اور کہرا تہذیبی نشوونما کا باعث ہوئے۔ ایسے ہی مطالبوں کو پورا کرنا ایک حد تک برطانیہ، شمالی امریکہ، ہالینڈ، سوویٹ روس اور جاپان جیسی جدا جدا قومیتوں کی عظمت کا باعث ہوا۔

باایں ہمہ ممکن ہے کہ جغرافی حالات کسی قوم کے ایک خاص حد سے زیادہ ترقی کرنے کے لئے ناسازگار ہوں۔ چنانچہ پالی نیشیوں کے لئے سمندر اسکیموؤں کے لئے بحر منجمد کی شدید برودت اور خانہ بدوشوں کے لئے کاہستان کا مقابلہ ایسا تھا کہ اس سے کما حقہٗ عہدہ برآ ہونا انسانوں کی قوت سے ماوراء تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پہلی تو جانبر ہی نہ ہو سکی اور دوسری دونوں کا ارتقا رک گیا ہے۔ اس طرح بڑی بڑی تہذیبوں اور قوموں کی تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ جغرافی مطالبے جن کا میاب سعی و کوشش کے لئے حد سے زیادہ شدید ہوں انہیں مسخر کرنے کی تحریک دلاتے ہیں۔

---

[1] یہ مضمون اس خطبۂ صدارت کی تلخیص ہے جو دوسری پاکستان فلسفہ کانگریس میں پیش کیا گیا تھا۔ (مدیر)

حد سے زیادہ سردی، گرمی، سیلاب، لوہے اور کوئلے کی کمی، سیل زمین کی ٹوٹ پھوٹ اور بعض علاقوں کی خراب زمین پاکستان کے لئے تکلیف کی شکل میں رحمت ہیں۔ ان سے یہ حقیقت ظاہر ہوتی ہے کہ جو بات بظاہر بری ہو۔ وہ بالآخر انسان کے لئے اچھی ہی ثابت ہوتی ہے۔ ہماری قوم کا احیاء ثانیہ اور دوبارہ مضبوط و توانا ہونا بڑی حد تک ان امور پر موقوف ہوگا جو بظاہر دشواریاں ہیں لیکن درحقیقت تندرست نشوونما کے لئے نہایت مؤثر ذرائع ہیں۔ ان کے بغیر زندگی بہت جلد کاہلی اکتاہٹ کا باعث ہوگی اور ہمیں ایک میٹھی نیند سلا دے گی۔ زندگی میں شادکامی اور تمدنی نشوونما دشواریوں کے خلاف مردانہ وار سینہ سپر ہونے اور ان پر فتح حاصل کرنے ہی میں مضمر ہے۔

لیکن قوموں اور ملتوں کو نہ صرف جغرافی مطالبات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ بلکہ انسانی ماحول کے تقاضوں سے بھی نبٹنا پڑتا ہے۔ یہاں بھی وہی اصول کارفرما ہے۔ بیرونی طاقتوں سے ناگہانی حملے تاوقتیکہ یہ بار بار نہ ہوں کسی قوم کو شکست دینے کے باوجود متحد کرتے ہیں۔ اور اسے زیادہ سرگرمی پر آمادہ کرتے ہیں۔ جیسا کہ روما میں اٹلی کی شکست تمام اسلامی ممالک میں صلیبی جنگوں، دنیائے مغرب میں موروں کے ہسپانیہ میں برابر دباؤ، ترکوں میں بلقان، تمام ترکی سلطنت میں تیمور کے حملہ، جرمنی میں نپولین کے محاربات اور جرمنی اور ترکی میں پہلی جنگ عظیم کے بعد ہوا۔ سمیریوں کو اہل مصر کے مقابلہ میں زیادہ شدید جغرافی ماحول اور بیرونی خطرات کا سامنا کرنا پڑا۔ اسلئے انہوں نے مصریوں سے کہیں زیادہ تہذیب و تمدن میں اضافہ کیا۔

یہی بات سوسائٹی کے اندرونی دباؤ پر بھی صادق آتی ہے۔ ایک پارٹی کے نعرۂ ہل من مبارز کو ضرور کوئی دوسری پارٹی قبول کرلیتی ہے۔ اور اس طرح اس میں نئی روح پھونک دیتی ہے۔ کسی جمہوری مملکت کی پارٹیاں ایک دوسرے کو برابر چیلنج دیتی رہتی ہیں۔ اور ترقی پر ابھارتی ہیں۔ اس لئے مختلف جماعتوں میں توانائی پیدا کرنے کے لئے اس کشاکش باہمی کو مہمیز دینا ضروری ہے۔ صرف ایک ہی پارٹی کی حکومت ارتقا کے خلاف ہے، اندرونی چیلنج اگر یہ قابل برداشت حد سے زیادہ ہو۔ تو اس سے اتحاد و یکجہتی کے دائم برہم ہونے کا اندیشہ ہے۔ اس سلسلہ میں مستقل بیرونی خطرہ کسی قوم کے لئے نعمت عظمیٰ ہے۔ چنانچہ طاقتور ہندوستان پاکستان کے لئے خطرہ نہیں اور نہ مضبوط پاکستان ہندوستان کے لئے خطرہ ہے۔ ان دونوں مملکتوں کی توانائی باہمی ردِ عمل کا ایک سلسلہ پیدا کردے گی جو برابر ان میں نئی روح پھونکتا رہے گا، انہیں اندرونی طور پر متحد رکھے گا اور مسلسل ارتقا کرنے میں مدد دے گا۔ ہندوستانی چیلنج پاکستان اور پاکستان کا چیلنج ہندوستان کو مضبوط بنائے گا۔ اس لئے ہمیں طاقتور ہمسایوں کو ایک جنس گرانمایہ سمجھنا چاہئے نہ کہ ہماری ترقی کے راستے میں سدِ گراں۔

اس طرح ظاہر ہے کہ طبعی، موسمی اور سیاسی (اندرونی و بیرونی) داعیات کے بغیر کوئی قوم تہذیب تمدن میں نمایاں ترقی نہیں کرسکتی۔ تہذیبیں اور تمدن اسی لئے بروئے کار آئے ہیں کہ انسانوں نے داعیات کا کامیابی سے مقابلہ کیا ہے۔ اور اہم نتائج پیدا کئے ہیں۔ ان کے بغیر وہ کبھی پر عظمت نہیں بن سکتے تھے۔ ان داعیات کی عدم موجودگی پیغام موت ہے۔ اور ان کی موجودگی پیغام امید بشرطیکہ وہ موثر جواب کے لئے حد سے زیادہ شدید نہ ہو۔

یہ درست ہے کہ تقاضے جواب پیدا کرتے ہیں۔ لیکن کمزور سوسائٹی میں ان سے کوئی ہلچل پیدا نہیں ہوتی۔ ایسی سوسائٹی آخرکار جواب سے معذور ہونے کے باعث فنا ہوجاتی ہے۔ اگر اس پر مصیبت نازل ہوتی ہے تو یہ تمام تر اس کا اپنا قصور ہوتا ہے۔ نہ کہ بیرونی طاقتوں کا۔ خواہ وہ قدرتی ہوں یا آسمانی۔

کسی قوم کے ارتقا کی دوسری شرط اس کے جوہر قابل اور تخلیقی اہلیت رکھنے والے انسان ہیں۔ برگساں اہل معرفت کی تعریف یوں کرتا ہے کہ "یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے تمام ارواح کے ساتھ رشتہ اور تمام انسانوں کے ساتھ ایک جذبۂ بے اختیار شوق، محسوس کیا ہے اور جن کی تمنا یہ ہے کہ وہ محبت کا پَر تو تمام نوع انسان پر محسوس کریں۔"

ہر پیغمبر یا عارف کے دل میں ایک جبلّی آہنگ مضمر ہوتا ہے۔ پہلے وہ ایک عام انسان کی طرح زندگی بسر کرتا ہے۔ پھر وہ کنارہ کش ہوجاتا ہے اور تربیت نفس سے بصیرت افروز باطنی جلا پیدا کرتا ہے۔ یہاں تک کہ ایک گھڑی ایسی آتی ہے —— وہ گھڑی جو ابن خلدون کے الفاظ میں پل جھپکنے میں آتی اور گذر جاتی ہے۔ جب اسے کچھ القایا فیضان ہوتا ہے، ایک پیغام سوجھتا ہے۔ روحانی ارتقا کے تیسرے مرحلے میں وہ پھر اپنے آپ میں آکر ایک اور ہی طرح کی زندگی بسر کرنے لگتا ہے۔ اسی طرح سوسائٹی کے ساتھ بھی اس کا تعلق بدل جاتا ہے۔ پہلے وہ اپنے

اپنے ہم جنس میں عادی زندگی بسر کرتا ہے۔ پھر ایک ایسا دور آتا ہے جب وہ سوسائٹی سے علیحدہ ہو جاتا ہے۔ اس کی شخصیت تخلیقی اہلیت پیدا کرتی ہے اور اس طرح قلب ماہیت کے بعد وہ معاشرہ کی طرف زیادہ روحانی قوت کے ساتھ واپس آتا ہے۔ اس فلسفی بادشاہ کی زندگی بھی جس کا نقشہ حکیم افلاطون نے غار کی تمثیل میں پیش کی ہے اسی آہنگ کی حامل ہے اور یہی زندگی کے ہر شعبہ میں تمام بڑے بڑے لیڈروں کی ذاتی اور اجتماعی زندگی کا خاصہ ہے۔ کوئی خلاق فرد یا اقلیت زندگی سے کچھ دیر تھوڑا بہت کنارہ کش ہو کر شدید باطنی تربیت کے بغیر تخلیق نہیں کر سکتی۔ خواہ یہ کنارہ کشی غار میں ہو یا سائنسدان کی لیباریٹری، کاریگر کے ورکشاپ، فن کار کے اسٹوڈیو یا عالم کی کوٹھری میں۔ اور اس طرح تازہ قوتیں حاصل کر کے اسے پھر زندگی کی طرف بازگشت کرنا لازم ہے۔

اسی قسم کا آہنگ ایسے انسانوں کی روزانہ زندگی میں بھی نظر آتا ہے۔ یہی کنارہ کشی کا زمانہ ہے۔ جب رات کے آسودہ لمحات میں فرشتے اتر اتر کر عرفان و بصیرت کی تلاش کرنے والوں کو پیغامات پہنچاتے ہیں۔ جہاں انسانوں کا جمگھٹا ہو وہاں کوئی روشنی نہیں آتی اور نہ دفتری کاغذات کی ورق گردانی کرنے والوں کو روشنی نصیب ہوتی ہے جو اپنا وقت عزیز نا و نوش، ناچنے، برج کھیلنے اور میٹھی نیند سونے میں بسر کرتے ہیں۔

انسانوں کی رہنمائی کے لئے خدا کی طرف سے ہدایت یا فیضان انہی لوگوں کو حاصل ہوتا ہے جو اپنے مخصوص دائرۂ عمل ہی میں مشق و مزاولت بہم پہنچاتے ہیں اور بس۔ کوئی لیڈر قوم کو جادۂ ترقی پر گامزن نہیں کرا سکتے، جب تک ان میں تخلیقی جوہر نہ ہو اور وہ اس تربیت کے بغیر کچھ بھی تخلیق نہیں کر سکتے۔ الغرض تخلیق کاروں ہی کا کام ہے۔ اور یہ صرف ان کی تخلیقی سرگرمیوں ہی سے ممکن ہے۔ یہ تخلیقی عمل ایک فرد یا کئی افراد انجام دے سکتے ہیں۔ چنانچہ کئی پیغمبروں نے تن تنہا قوموں کو خواب غفلت سے جگا کر تیز رفتار ترقی کی شاہراہ پر ڈال دیا ہے۔

لیکن سوسائٹی میں تخلیقی عنصر خواہ یہ ایک فرد پر مشتمل ہو یا کئی افراد پر، ہمیشہ ایک اقلیت ہی ہوتا ہے اور اسی اقلیت ہی سے تہذیب و تمدن کے تمام دھارے موجزن ہوتے ہیں۔ سوسائٹی کا بیشتر حصہ غیر خلاق ہوتا ہے۔ اور پیچھے ہی رہتا ہے۔ لیکن اقلیت خواہ کتنی ہی خلاق کیوں نہ ہو۔ اکثریت کو ساتھ لئے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتی جیسا کہ ٹائن بی نے کہا ہے۔ ایسا کرنے کے لئے انہیں اپنے ساتھیوں کو اپنا پیرو بنانا پڑتا ہے۔ یہ کرتب وہ دو ہی طرح کر سکتے ہیں۔ یا وہ انہیں اپنے کارناموں سے تحریک دلا کر ان کے سینوں میں اپنی تخلیقی صلاحیت کی آگ روشن کریں۔ یا دوسرے انسان کی جبلی خوئے تقلید کو اکسا کر اپنی تقلید پر آمادہ کریں۔ چنانچہ اسلام کے قرون اولیٰ میں قرآن ہی کے پیغام نے لوگوں کو گرمایا اور پیغمبر اسلام کے نقش قدم پر چلنے سے نئی عادات ان کی طبیعتوں میں راسخ ہو گئیں۔ کوئی لیڈر جبر و تحکم، تربیت، تعلیم و تلقین اور پروپیگنڈے سے لوگوں کو اپنے ساتھ چلنے پر مجبور نہیں کر سکتا۔ جبر و تحکم سے تو الٹا اثر مرتب ہوتا ہے۔ مگر تلقین و ہدایت اور پروپیگنڈا بے کیف ہو تو ناگوار گزرتا ہے۔ اگر یہ ولولہ پیدا کرے تو خوب ہے لیکن کافی نہیں۔ یہ چیزیں عوام کے دل و دماغ میں صرف اسی صورت میں پہنچ سکتی ہیں جب ان کے ساتھ بڑے انسانوں کے اسوۂ حسنہ پر عمل بھی شامل ہو۔ بہر کیف بڑا سیاست دان سلسلۂ حوادث میں ایک مرکزی قوت ہے۔ اس کی آنکھ کسی افتاد کے ہر پہلو کو دیکھ سکتی ہے۔ اور بہترین امکانات کو منتخب کرتی ہے۔ وہ ایک معلم ہے اور اپنی مثال سے تعلیم دیتا ہے۔ جیسا کہ اشپنگلر نے کہا ہے۔ ناموس، فرض، نظم و ضبط اور ارادہ یہ باتیں کتابوں سے نہیں سیکھی جاتیں، بلکہ زندگی کے بہتے پانی میں زندہ مثال ہی سے ابھرتی ہیں۔ حقیقی لیڈروں کے جذبات عوام کے سینوں میں دوڑ جاتے ہیں۔ ان کے دل دماغ کی کایا پلٹ دیتے ہیں اور ان کو ایسے کارناموں کے قابل بنا دیتے ہیں جن سے وہ عام حالات میں کبھی عہدہ برآ نہیں ہو سکتے۔ ایسی اقلیت کے کارفرما ہونے سے عوام میں اعتماد کی ایک روایت پیدا ہو جاتی ہے۔ تنقید و تحقیق کے جبلی شوق کے باوجود اقلیت پر اعتماد کی روایت کی بہترین مثال انگریز ہیں۔ اس اعتماد سے اطاعت پیدا ہوتی ہے اور اطاعت سے یہ یقین کہ حکومت انہی کی رضا و منشا پر مبنی ہے۔

خلاق رہنماؤں کی تقلید کا شرف ان کے کامیاب کارناموں کی کشش سے پیدا ہوتا ہے۔ اگر لوگ ایک دفعہ ان کی تقلید شروع کر دیں تو ان سے غیر شعوری طور پر خود بخود نشو و ارتقا کا آغاز ہو جاتا ہے۔ قائد اور مقلدین کا مطمح نظر ایک ہی ہو جاتا ہے۔ ساری کی ساری جماعت ایک ہی تمدنی منزل کی طرف گامزن ہو جاتی ہے اور تہذیب [illegible]

لگتی ہے یہاں تک کہ اس کا اثر باہر کے لوگوں پر بھی طاری ہونے لگتا ہے۔ اس کشش، اس جاذبیت کی موجودگی ارتقا کی بین علامت ہے۔ اس کی عدم موجودگی ظاہر کرتی ہے کہ یا تو ارتقا کا سلسلہ سرے سے شروع ہی نہیں ہوا یا رک گیا ہے۔

تمدنی نشوونما اجتماعی ارتقا کی روح رواں ہے۔ لیکن اس کے علاوہ زندگی کے دو عنصر ترقی پذیر اور اختلاط پذیر سوسائٹی کے مابین مشترک ہیں یعنی اقتصادی اور سیاسی عنصر جس سوسائٹی کا ثقافتی مرکز مجروح ہو چکا ہو۔ اس کا اقتصادی و سیاسی خول پھر بھی قوت پیدا کئے جا سکتا ہے لیکن ثقافتی عنصر کے بغیر اس کا ارتقا حقیقی نشوونما کے رک جانے کی علامت ہوگا۔ اقتصادی و سیاسی ترقی پر زندہ دینا اچھا ہے لیکن صرف یہی ایک چیز ارتقا کی ضامن نہیں ہے۔

جن اقلیتوں کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے۔ اجتماعی شکل میں دو فریقوں پر مشتمل ہوتی ہیں۔ ایک ارباب فکر یعنی مذہب، فلسفہ، سائنس، ادب، فنون لطیفہ اور ٹکنالوجی کے مجتہد اور دوسرے ارباب عمل جن کا دائرہ نظم و نسق، قانون سازی، عدل و انصاف اور مسلح افواج ہیں۔ یہ دوسرا فریق حاکم اقلیت پر مشتمل ہوتا ہے۔ اگر پہلا فریق غیر خالق ہو تو یہ باقی ہی نہیں رہتا۔ کیونکہ غیر خالق ہوتا اور ذہنی قیادت دونوں میں منافات ہے۔ اگر دوسرا فریق غیر خالق ہو تو یہ محض ایک برسر اقتدار اقلیت بن جاتا ہے۔ کیونکہ جہاں لیاقت یا عدم لیاقت سے حکمرانی نہیں ہو سکتی۔ وہاں کم از کم طاقت کچھ عرصہ حکومت چلا سکتی ہے لیکن کسی نہ کسی وقت رشک و حسد کے باعث مناقشات پیدا ہو جاتے ہیں جس سے برسر اقتدار اقلیت کی جڑیں کھوکھلی ہو جاتی ہیں، عوام اسے زبردستی نیچے اتار دیتے ہیں اور یہ ان کے ساتھ ہی ملیامیٹ ہو جاتی ہے۔ اگر اقلیتیں خالق ہوں تو وہ عوام کو نچلی سطح سے بلند کر کے تمدنی ترقی کے راستے پر ڈال دیتی ہیں۔ تخلیقی اقلیت اور غیر خالق اکثریت کے مابین قومی مقاصد، طریقِ عمل اور زبان کے بارہ میں کوئی اختلاف نہیں ہونا چاہیئے۔ یہ تخلیقی اقلیت کا کام ہے کہ وہ اس خلیج کو پاٹنے کے ذریعے اور طریقے دریافت کرے جو اس کے اور عوام کے مابین حائل ہے۔

اس اقلیت کے اوصاف کیا ہیں؟ یہ تو ظاہر ہے کہ اور تمام امور سے بڑھ کر اسے ایک جماعت مفکرین ہونا چاہیئے۔ ان لوگوں کی ذہنی سطح عوام سے بلند تر ہونی چاہیئے۔ ہکسلی اور لیسٹر وارڈ نے سائنس کو ارتقاء کا واحد ذریعہ قرار دے کر فکر کے منصب کو زیادہ مبالغہ سے پیش کیا ہے۔ مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ علم و حکمت۔ الہامی یا مادی کے بغیر کوئی ارتقا ممکن نہیں۔ انبیاء و اولیا نے ایک ہی ضرب کاری سے انسانی شعور اور موجدین و محققین نے انسان کی مادی قوتوں کو کہیں کا کہیں پہنچا دیا ہے۔ دراصل یہ غیر معمولی انسانوں کی وجدانی یا عقلی قوتیں ہی ہیں جن سے دنیا از سر نو تشکیل پاتی ہے۔ جو قومیں تاریخ میں کوئی اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ ان کے لئے علم و عرفان کا ارتقا لازمی ہے۔ یہ اجتماعی ترقی کے لئے بالکل ناگزیر ہے۔ لیکن علم و حکمت کی ترقی صرف تخلیقی اقلیت ہی تک محدود رہتی ہے۔ اس کو عوام تک پہنچانے کے لئے اس کی نشر و اشاعت بھی اتنی ہی ضروری ہے۔ تمام پسماندہ قوموں کو پہلے عام خواندگی اور پھر عمومی تعلیم کے لئے فوری تدابیر تلاش کرنی چاہیئیں، تاکہ وہ دوسری ترقی یافتہ قوموں کی سطح پر پہنچ جائیں۔ آج کل علم و حکمت اس قدر تیزی سے ترقی کر رہے ہیں۔ کہ جب تک پسماندہ قومیں غیر معمولی تدابیر اختیار نہ کریں وہ ہمیشہ ہی دوسری قوموں سے پیچھے رہیں گی۔

اجتماعی ترقی کے لئے علم و حکمت تو ضروری ہیں ہی۔ لیکن قومیں صرف علم ہی سے نہیں بنتیں کسی قوم کی تخلیقی اقلیت کو صاحب کردار بھی ہونا چاہیئے کیونکہ جب تک وہ صاحب کردار نہ ہو، قوم بھی کوئی کردار نہیں پیدا کر سکتی علم و حکمت کی ترقی کے ساتھ انسان کو قدرت اور معاشرتی نظاموں پر بھی غلبہ کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ اس سے ایک اجتماعی رویہ بھی پیدا ہو سکتا ہے۔ جو ممکن ہے حد اعتدال سے آگے نکل جائے۔ یہ خطرہ ہمیشہ باقی رہتا ہے کہ قدرت پر استیلا کہیں قوموں کو باقی تمام مقاصد عالیہ اور اقدار سے بیگانہ نہ کر دے۔ وہ اپنی بے قید و بند خواہشات ہی کو مطمح نظر نہ گردانیں، دوسرے انسانوں کو اپنا مطیع و منقاد و دست نگر بنا کر من مانی خواہشوں کا بازیچہ نہ بنالیں اور اپنی قوتوں کو محدود طبقاتی مفادات کے لئے استعمال میں نہ لائیں جو تمام نوع انسان کے لئے خطرناک ثابت ہوں۔ لہٰذا کسی سوسائٹی کے ارتقا کے لئے اخلاقی کردار کی ترقی بھی ضروری ہے۔ یہی اخلاقی وجاہت ہے جس کے فقدان کے باعث تمام بڑی تہذیبیں انحطاط پذیر ہوئیں۔ اور جس کی موجودگی سے وہ روبہ ترقی ہوئیں۔ جب یونانی تہذیب زوال پذیر ہو رہی تھی تو بھی یونانی ذہانت تمام دنیا سے ارفع و اعلیٰ تھی۔ اخلاقی کردار کے معنی تو ہیں ارادہ کا محکم ہونا اور کام کا اچھا ہونا۔ اس کے لئے دو باتیں ضروری

ہیں۔ ایک افراد کا بلند مقاصد کی طرف رجوع اور دوسرے اپنے آپ پر ضبط۔ تاوقتیکہ حاکم اقلیت یہ اوصاف نہ پیدا کرے۔ قوموں کے ذہنی اور ایجادی کارنامے بالآخر ان کے لئے تباہ کن ثابت ہوتے ہیں۔ اجتماعی پسندیدگی یا ناپسندیدگی کا اظہار صحیح کردار پیدا کرنے کا بہترین ذریعہ ہے۔ ہمارے دیگر ابنائے جنس کی تعریف یا مذمت جو رائے عامہ کے طور پر ظاہر کی جائے۔ اخلاقی کردار کی نشو و نما کے لئے نہایت موثر محرک ہے۔ مثال کے طور پر انگلستان میں جہاں رائے عامہ سب سے زیادہ آزاد ہے۔ حاکم اقلیت کا اخلاقی کردار بہت بلند ہے۔ اجتماعی پسندیا ناپسندیدگی کا احترام اخلاق کے ایک بلند تر درجہ کے لئے اور بھی ضروری ہے۔ جہاں صحیح رویہ محض خوبی ہی نہیں بلکہ فرض خیال کیا جاتا ہے۔

وہ اخلاقی خوبی جس کی ہر قوم بڑی شدت سے تعریف کرتی ہے۔ ایثار ہے۔ ان لوگوں کی بڑی شد و مد سے تعریف کی جاتی ہے جو اپنے مفاد کو قوم کے مفاد پر قربان کر دیں۔ الزام کا خوف انسانوں کو مفاد عامہ کے منافی رویہ اختیار کرنے سے باز رکھتا ہے۔ اور فرد کے مفاد کو جماعت کے مفاد سے شیر و شکر کرکے قانون کا ہاتھ بٹاتا ہے۔ حاکم اقلیت میں بے نفسی، راست کرداری، دیانت داری اور خلوص جیسے اوصاف بھی جن کو مجموعی طور پر وجاہت قرار دیا جاتا ہے۔ کچھ کم اہم نہیں۔ جن قوموں میں اخلاقی وجاہت اور جذبۂ ایثار پایا جاتا ہے۔ وہ کبھی کسی مصیبت کا شکار نہیں ہو سکتی۔

ہر جماعت میں بعض ایسے لوگ ہوتے ہیں جن کے لئے محض تعریف ہی کافی نہیں ہوتی۔ اس لئے جزا و سزا کی ضرورت پیش آتی ہے۔ بعض اوقات خاص قسم کے جرائم مثلاً چور بازاری، خویش نوازی اور رشوت ستانی کسی قوم میں عام ہو جاتے ہیں۔ ایسے جرائم کی عام قوانین سے روک تھام ممکن نہیں۔ اگر انہیں زیادہ ڈھیل دی جائے تو اندیشہ لاحق ہوتا ہے کہ کہیں یہ مستقل قومی عادات یا عیوب کی شکل نہ اختیار کر لیں۔ اگر ایسا ہو جائے تو یہ قومی تباہی کا باعث ہوتے ہیں۔ لہٰذا خاص قوانین وضع کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ ایسی برائیوں کے لئے سزائے موت ناگزیر ہے۔ اگرچہ یہ بجائے خود ایک اچھی چیز نہیں۔ غرض رائے عامہ کو تعریف و مذمت کے اظہار میں آزادی دینے اور معاشری برائیوں کو پیدا ہوتے ہی کچل دینے کے لئے ہنگامی قوانین وضع کرنا اور قانون اور انتخاب کے نظام کو لوث و غرض سے بالاتر رکھنا ذاتی اور جماعتی بلندی کردار اور اس لئے خود ارتقا کے لوازمات میں شامل ہے۔

اتحاد، جمعیت، استقامت، حریت، مساوات اور آزاد اقدام یہ ہیں اعلیٰ قوم یا جماعتی کردار کے اوصاف۔ اتحاد یا سطحی ہو سکتا ہے یا حقیقی۔ سطحی اتحاد تحکم سے پیدا ہوتا ہے جیسا کہ ہم تمام آمرانہ حکومتوں میں دیکھتے ہیں۔ یہ صرف اتنی ہی دیر قائم رہ سکتا ہے جتنی دیر تحکم رہے۔ لیکن اس کی تہ میں افتراق کے جراثیم پرورش پاتے ہیں۔ اس لئے اس کا اثر بھی بالکل الٹ ہوتا ہے۔ حقیقی اتحاد یا مثبت ہو سکتا ہے یا منفی، اتحاد اس شدید تناؤ کے عالم میں پایا جاتا ہے جب قوم کو کسی زبردست مخالفت کا سامنا ہو۔ ایسے اتحاد سے حقیقی مقاصد حاصل نہیں ہوتے بلکہ جونہی تناؤ دور ہو جاتا ہے۔ یہ بھی دور ہو جاتا ہے۔ اور عین اس وقت جب ہمیں کوئی مثبت تعمیری کام کرنا چاہیئے۔ مختلف فرقیوں کے مفادات میں کھینچا تانی شروع ہو جاتی ہے۔ اور قوم بری طرح کشمکش و افتراق کا شکار ہو جاتی ہے۔ اس لئے حقیقی اتحاد ارتقا کی صحیح علامت ہے۔

مثبت اتحاد پُرامن تعمیری کام میں ظاہر ہوتا ہے۔ اسلام کے سب سے بڑے کارناموں میں سے ایک یہ تھا کہ اس نے عرب کو مثبت اتحاد کی نعمت عطا کی۔ خدائے واحد پر عالمگیر اعتقاد نے ایک شدید مذہبی احساس پیدا کیا جس نے باہم گردست و گریباں قبائل کو متحد کرکے ایسی تحریک دلائی کہ انہوں نے ایک عظیم الشان تہذیب کی بنیاد ڈالی۔ اس اتحاد کے بغیر عربوں کے لئے کوئی خاص کارگزاری دکھانا ممکن نہ تھا۔ ضروری نہیں کہ یہ جذبہ مذہبی ہو۔ یہ بھی ہو سکتا ہے۔ جیسا کہ جرمنی، انگلستان اور ہندوستان میں وطنیت، سوویٹ روس میں اشتراکیت اور ایران میں ارض وطن کے تصور سے ظاہر ہے۔ پاکستان میں مذہبی اور وطنی احساس دونوں باہم مل کر ایک شدید جذبہ پیدا کر سکتے ہیں جس سے ایک پائدار اتحاد کی بنیاد قائم ہو سکتی ہے۔

اس قسم کا جذبہ گو بنیادی ہے۔ پھر بھی یہ اتحاد کی مختلف اقسام میں سے صرف ایک ہے۔ تمام جذبات و احساسات امتداد وقت کے ساتھ محو ہو جاتے ہیں۔ تاوقتیکہ ایسے مواقع نہ پیدا کئے جائیں جن سے وہ وقتاً فوقتاً

(باقی صفحہ ۱۰۱ پر)

ستارہ بہ ستارہ

(مغربی پاکستان کے صوفی شعرا کے فن پارے)

سوزِ دروں

بولوں جھوٹ تو کچھ بچ جائے　　　سچ بولوں تو آگ جلائے
ان دونوں سے جی گھبرائے　　　ڈرتے ڈرتے لب پر آئے
منہ آئی بات نہیں رہتی!

لازم ہے اک بات ادب کی　　　ہے معلوم حقیقت ساری
ہر شے میں ہے جلوۂ باری　　　کیوں ہے ظاہر کیوں ہے مخفی؟
منہ آئی بات نہیں رہتی!

جب ظاہر ہوئی برقِ تجلی　　　طور کا پربت جل گیا سارا
دار پہ جب منصور بھی پہنچا　　　میرا تیرا پوچھنا ہی کیا
منہ آئی بات نہیں رہتی!

گر اسرار کو ظاہر کر دیں　　　دنیا بھولے سب تکراریں
بُلھے یار کو سارے ماریں　　　اچھی ہیں یاں مخفی باتیں
منہ آئی بات نہیں رہتی!

ہم سے الگ نہیں بُلھا ماہی　　　اس کے بغیر نہیں یاں کوئی
آنکھ نہیں پر دیکھنے والی　　　اسی لئے ہے جاں دکھ سہتی
منہ آئی بات نہیں رہتی!

بُلھا شاہ (۱۶۸۰-۱۷۸۵ء)

دردِ عشق

کس نے پایا ہے درویشاں　　　جذبۂ عشق کی لذت کو؟
کل شے میں اس کل کو دیکھا　　　'وہی سب کچھ' کا درس دیا
کیا ہے مبارک صحبتِ پیراں　　　پئیں جو بادۂ وحدت کو
مدہوشی نے ناز دکھایا　　　عریانی نے رنگ جمایا
خرقہ پھاڑ کے پہنوں اے جاں!　　　میں رندی کے خلعت کو
اہلِ درد کو درد سلامت　　　بارِ محبت طعن و ملامت
کیا کیا درد اٹھتے ہیں یاراں　　　میں قرباں کروں راحت کو
حسن نے کتنے ہی گھر لوٹے　　　روتی پھر تیں جنگل بیلے
سینکڑوں ہیریں اور سسیاں　　　دیکھو عشق کی شدت کو!

(شہاب رفعت)　　　خواجہ غلام فرید (۱۸۴۵-۱۹۰۱ء)

چارہ گری

جب درد نہ دل میں سر اٹھائے
کیا کرنے کو چارہ ساز آئے
دل تو غمِ عشق سے تہی ہے
پھر بھی تجھے آرزو لگی ہے
آکر کوئی سحر آزمائے
چارہ گرِ درد آشنائے

لینا اسے جان پر مری جان
جو کچھ بھی ہو چارہ گر کا فرماں
ہمت کبھی ہاتھ سے نہ جائے
شکوہ نہ یہ تیرے لب پہ آئے
"ان لوگوں نے جانے کیا کیا ہے
یاروں کو بہم جدا کیا ہے"
کہنا کہ بھلا کیا انہوں نے
یاروں کو ملا دیا انہوں نے"

میرے کہے صبر آزما کے
فرصت ہو تو سوچ سر جھکا کے
یہ غیظ و غضب بری بلا ہے
ہاں صبر و رضا میں اک مزا ہے
جن لوگوں کا کیش ہے صبوری
ہوتی ہے انہی کی بات پوری
نخوت کو ہمیشہ خوار دیکھا
سرکش کو بحالِ زار دیکھا

جو لوگ ہیں عاجل و رمیدہ
ہیں بارِ شکیب ناچشیدہ
اپنے پہ جو پا سکا نہ قابو
اس کا یہ مآل جان لے تو
ہوتا ہے وہ ایک دن پشیماں
پاتا ہے سزائے نا سزایاں
رکھے وہ دماغ کتنا عالی
جھولی رہے کینہ ور کی خالی

(ابنِ انشا)

انا الحق

جب تک رہی دل میں خودی حق کا بھرم ہوگا تو کیا
سجدے سبھی بے کار ہیں ہم پہ کرم ہوگا تو کیا

جب جز و کل ہو جائے گا اور من کہیں کھو جائے گا
تب فیض کی امید ہے
شانِ انا الحق ہے تبھی اور کبریائی ذات کی
جب ذرہ بھی خورشید ہے!

وحدت و کثرت

وحدت سے کثرت نکلی
کثرت عینِ وحدت ہے کل جگ ایک حقیقت ہے
پھر الجھن کی بات ہی کیا

کیا رکھا ہے ماؤ من میں دیکھو! نہ پھنسنا اس الجھن میں
راہ وہی ہے راہِ وحدت
اس رستے پر چلتے جاؤ طالب ہو، مطلوب کو پاؤ

ابیات!

یہ نغمے، یہ گیت رسیلے میٹھے میٹھے بول سُریلے
شعر کہیں یا گیت انہیں!
شعر کہاں، سنگیت کہاں یہ ہیں حقیقت کے وہ نشاں
پاس پیا کے لے جائیں
راہ کسی کی دکھلائیں

یہ نغمے ابیات نہیں
یہ ہیں حقیقت کی آیات شمع تجلّی کے لمعات
شاہدِ حق کی راہ دکھائیں
پاس سجن کے پہنچائیں

شمع اور پروانے

آگ جلی اور پروانے گھر گھر آئے دیوانے
وہ چنگاریاں، اڑتے دیپ بھسم ہوئے ان سے مستانے
شعلے دیکھے پھر بھی نہ چوکے دل میں کیا تھی کیا جانیں
حق کی جوت پہ مٹ گئے سارے رہ گئے دنیا میں افسانے!

یادِ حق

جو جاگ کے ساری رات
اللہ کو یاد کریں
وہ ہوں اور حق کی ذات
نت اس میں محو رہیں
کیوں اوج نصیب نہ ہوں
ان کے اقبال بڑھیں
جھک جھک کے انہیں لاکھوں
کیونکر نہ سلام کریں

(رفیق خاور) (شاہ عبداللطیف بھٹائی)
(۱۶۸۹ء-۱۷۵۲ء)



روضہ حضرت رکن عالم شاہ رح (ملتان)



روضہ حضرت داتا گنج بخش رح (لاہور)

مغربی پاکستان کے صوفیائے کرام

مقبرہ حضرت شمس تبریز رح (ملتان)







دوسری پاکستان فلسفہ کانگریس منعقدہ کراچی کا افتتاح : فضیلت مآب مسٹر غلام محمد گورنر جنرل پاکستان کی افتتاحی تقریر

کراچی میں پاکستان اور امریکہ کے فن عکاسی کی نمائش جس کا افتتاح آنریبل مسٹر محمد علی
وزیر اعظم پاکستان نے فرمایا



افسانہ

چند خطوط

غلام عباس

۲۵ ستمبر ۱۹۳۴ء

میرے پیارے افضل

مجھے تم سے جدا ہوئے آج دوسرا روز ہے یقین رکھو اب میں تمہیں کبھی نہیں مل سکوں گی۔ ہر چند تم اپنے خاندان والوں کی ناخوشی اور اپنے والد صاحب کی اس دھمکی کے باوجود کہ اگر تم ان کی مرضی کے خلاف کسی عورت سے (پھر وہ بھی مجھ ایسی عورت سے!) شادی کرو گے تو وہ تمہیں جائیداد کی وراثت سے محروم کر دیں گے، تم میرے ہی طلب گار رہو، میری ہی محبت کا دم بھرتے ہو۔ لیکن میں تمہاری اتنی بڑی قربانی کو قبول نہیں کر سکتی۔ میں نہیں دیکھ سکتی۔ کہ تم میری خاطر برباد اور بدنام ہو جاؤ۔ چنانچہ میں نے یہی مناسب سمجھا ہے کہ تم سے علیحدہ ہو کر کسی دور دراز نامعلوم مقام کو نکل جاؤں۔

کل جب میں نے تمہیں اپنے اس ارادے سے آگاہ کیا تو تم بھونچکے سے رہ گئے۔ تمہیں یقین نہ آیا۔ کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ تم حیرت سے میرے چہرے کو تکنے لگے رفتہ رفتہ میرے اس ارادے کے معنی تم پر آشکار ہونے لگے۔ ہمیشہ کی جدائی کے خیال سے تمہاری آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اور تم اپنی التجاؤں سے اپنی سہمی ہوئی نظروں سے مجھے روکنے کی کوشش کرنے لگے۔ لیکن میں نہایت استقلال سے اپنی بات پر قائم رہی۔ شاید تمہیں تعجب ہوا ہو کہ میں یک لخت ایسی سنگدل کیسے بن گئی ہوں۔ لیکن افضل، تمہیں کیا خبر کہ اس وقت اندر ہی اندر مجھ پر کیا بیت رہی تھی۔ میرے دل میں جذبات اس شدت سے کھول رہے تھے۔ کہ معلوم ہوتا تھا ابھی باہر پھوٹ پڑیں گے۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ میں اس آزمائش میں پوری اتری۔ میں نے اپنے پر قابو رکھا۔ آہ یہ نہ پوچھو کہ اس کے لئے مجھے کس قدر دکھ سہنا پڑا۔ مگر اب اس ذکر سے کیا فائدہ .....

جیسا کہ میں نے تم سے وعدہ کیا ہے۔ اب میرے اور تمہارے درمیان صرف ایک بندھن رہ جائے گا۔ وہ یہ کہ میں تمہیں کبھی کبھی خط لکھا کروں گی۔ لیکن میں تمہیں اپنا پتہ کبھی نہیں بتاؤں گی۔ تاکہ تم مجھ سے ملنے کی بے فائدہ کوشش نہ کرو۔ فقط

تمہاری شمیم

(۲)

۲۵ ستمبر ۱۹۳۵ء

پیارے افضل

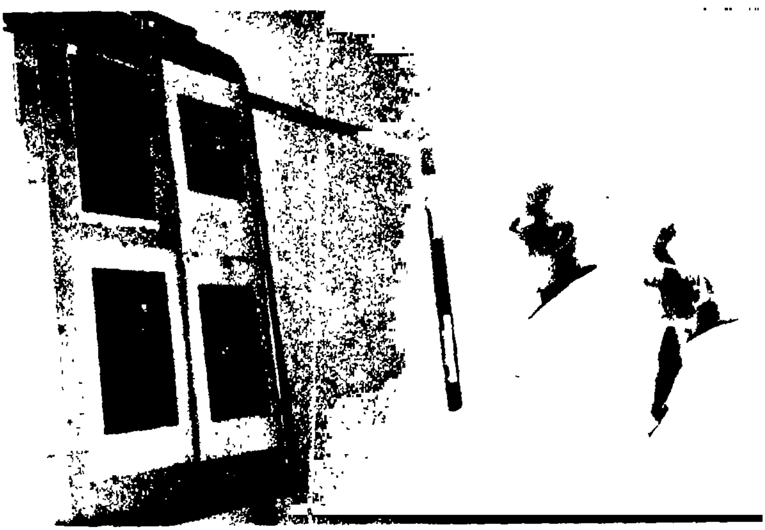
پورے ایک برس کے بعد تمہیں دوسرا خط لکھ رہی ہوں۔ مجھے یقین ہے ابھی تم مجھے بھولے تو نہ ہو گے۔ میں محسوس کر رہی ہوں کہ ان بارہ مہینوں میں ہماری محبت میں سرِ مو فرق نہیں آیا۔ تاہم کبھی کبھی ایسا گماں ہوتا ہے جیسے ان مہینوں نے ماضی پر سوگ کا ایک باریک پردہ ڈال دیا ہے۔

ایک دن میں نے چاہا کہ تصور ہی تصور میں تمہیں ایک نظر دیکھ لوں۔ چنانچہ میں نے اپنے ذہن میں تمہارے



دوسری پاکستان فلسفہ کانگریس منعقدہ کراچی کا افتتاح: عزت مآب مسٹر غلام محمد گورنر جنرل پاکستان کی افتتاحی تقریر

کراچی میں پاکستان اور امریکہ کے فن عکاسی کی نمائش جس کا افتتاح آنریبل مسٹر محمد علی
وزیر اعظم پاکستان نے فرمایا



افسانہ

چند خطوط

غلام عباس

۲۵ ستمبر ۱۹۳۴ء

میرے پیارے افضل

مجھے تم سے جدا ہوئے آج دوسرا روز ہے یقین رکھو اب میں تمہیں کبھی نہیں مل سکوں گی۔ ہر چند تم اپنے خاندان والوں کی ناخوشی اور اپنے والد صاحب کی اس دھمکی کے باوجود کہ اگر تم ان کی مرضی کے خلاف کسی عورت سے (پھر وہ بھی مجھ ایسی عورت سے!) شادی کروگے تو وہ تمہیں جائیداد کی وراثت سے محروم کردیں گے، تم میرے ہی طلب گار رہو، میری ہی محبت کا دم بھرتے ہو۔ لیکن میں تمہاری اتنی بڑی قربانی کو قبول نہیں کر سکتی۔ میں نہیں دیکھ سکتی۔ کہ تم میری خاطر برباد اور بدنام ہو جاؤ۔ چنانچہ میں نے یہی مناسب سمجھا ہے کہ تم سے علیحدہ ہو کر کسی دور دراز نامعلوم مقام کو نکل جاؤں۔

کل جب میں نے تمہیں اپنے اس ارادے سے آگاہ کیا تو تم بھونچکے سے رہ گئے۔ تمہیں یقین نہ آیا۔ کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ تم حیرت سے میرے چہرے کو تکنے لگے رفتہ رفتہ میرے اس ارادے کے معنی تم پر آشکار ہونے لگے۔ ہمیشہ کی جدائی کے خیال سے تمہاری آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اور تم اپنی التجاؤں سے اپنی سہمی ہوئی نظروں سے مجھے روکنے کی کوشش کرنے لگے۔ لیکن میں نہایت استقلال سے اپنی بات پر قائم رہی۔ شاید تمہیں تعجب ہوا ہو کہ میں یک لخت ایسی سنگدل کیسے بن گئی ہوں۔ لیکن افضل تمہیں کیا خبر کہ اس وقت اندر ہی اندر مجھ پر کیا بیت رہی تھی۔ میرے دل میں جذبات اس شدّت سے کھول رہے تھے۔ کہ معلوم ہوتا تھا ابھی باہر پھوٹ پڑیں گے۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ میں اس آزمائش میں پوری اُتری۔ میں نے اپنے پر قابو رکھا۔ آہ یہ نہ پوچھو کہ اس کے لئے مجھے کس قدر دُکھ سہنا پڑا۔ مگر اب اس ذکر سے کیا فائدہ .....

جیسا کہ میں نے تم سے وعدہ کیا ہے۔ اب میرے اور تمہارے درمیان صرف ایک بندھن رہ جائے گا۔ وہ یہ کہ میں تمہیں کبھی کبھی خط لکھا کروں گی۔ لیکن میں تمہیں اپنا پتہ کبھی نہیں بتاؤں گی۔ تاکہ تم مجھ سے ملنے کی بے فائدہ کوشش نہ کرو۔ فقط

تمہاری شمیم

(۲)

۲۵ ستمبر ۱۹۳۵ء

پیارے افضل

پورے ایک برس کے بعد تمہیں دوسرا خط لکھ رہی ہوں۔ مجھے یقین ہے ابھی تم مجھے بھولے تو نہ ہوگے۔ میں محسوس کر رہی ہوں کہ ان بارہ مہینوں میں ہماری محبت میں سرِ مو فرق نہیں آیا۔ تاہم کبھی کبھی ایسا گماں ہوتا ہے جیسے ان مہینوں نے ماضی پر سوگ کا ایک باریک پردہ ڈال دیا ہے۔

ایک دن میں نے چاہا کہ تصور ہی تصور میں تمہیں ایک نظر دیکھ لوں۔ چنانچہ میں نے اپنے ذہن میں تمہارے

خود خلل جانے کی کوشش کی۔ لیکن مجھے تمہاری صورت دھندلی دھندلی سی نظر آئی۔ اگر کبھی تم بھی میری صورت کو یاد کرنے کی کوشش کرو۔ تو تمہیں معلوم ہوگا کہ وقت عزیز سے عزیز چیز کو بھی محو کر دیتا ہے۔

کل جب ایک باغ میں گئی۔ وہاں میں نے دیکھا کہ سورج کی ایک مسکراتی ہوئی کرن گلاب کے ایک سوکھے ہوئے پھول پر پڑی۔ مجھے ایسا معلوم ہوا۔ جیسے وہ مرجھایا ہوا پھول مسکرانے لگ گیا۔ اسی طرح سورج کی ایک مسکراتی ہوئی کرن میرے ہونٹوں پر بھی پڑی۔ اور مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں بھی مسکرا رہی ہوں۔ اس وقت سے مجھے ایسا معلوم ہو رہا ہے جیسے میری کوئی کھوئی ہوئی چیز مجھے مل گئی ہو۔ جب سے میں تم سے جدا ہوئی ہوں یہ میرا پہلا تبسم ہے۔ لیکن اب میں اکثر مسکراتی رہتی ہوں۔ میں تم سے التجا کرتی ہوں۔ کہ تم بھی مسکرایا کرو۔

تمہاری
شمیم

(۳)

۱۰ دسمبر ۱۹۴۲ء

میرے پیارے افضل

لو میں پھر تم سے مخاطب ہو رہی ہوں۔ کیا میں ایک خواب کی مانند نہیں ہوں۔ کہ جب چاہوں آجاتی ہوں۔ مگر تم مجھے چھو نہیں سکتے؟

اب میں رنجیدہ نہیں ہوں۔ زمانے کی گردش نے میرے پژمردہ دل کو پھر شگفتہ کر دیا ہے۔ اور وہ دنیا جو پہلے تیرہ و تار معلوم ہوتی تھی، رفتہ رفتہ اس میں شعاعیں پیدا ہونے لگی ہیں۔

کچھ دن ہوئے میں ایک محفل نشاط میں شریک ہوئی تھی۔ ہر شخص شاداں و فرحاں نظر آتا تھا۔ ان کے چہرے زندگی کی بہار سے تابناک تھے۔ ان لوگوں میں میں نے خود کو بھی شاد خیال کیا۔ یہ میں تمہیں اسلئے لکھ رہی ہوں کہ تم بھی پچھلی باتوں کو بھلا دو۔ اور شاد شاد رہا کرو۔!

تمہاری
شمیم

(۴)

۶۔ جولائی ۱۹۴۶ء

میرے پیارے افضل

سال پر سال گزرتے جا رہے ہیں۔ تو گیارہواں سال گزر گیا، اور اب بارہواں شروع ہے۔ لیکن مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کل کی بات ہے۔

عجب نہیں کہ اب تم گھر والے کہلا رہے ہو گے۔ اور عجب نہیں کہ اب تمہارا ایک چھوٹا سا قبیلہ بھی ہو۔ کہو اچھے تو رہے! میں تصور کر رہی ہوں۔ کہ تمہارا خوبصورت چہرہ پہلے سے کچھ بھرا بھرا سا ہو گیا ہوگا۔ شانے اور بھی فراخ ہو گئے ہوں گے۔ اور شاید تمہارے سر میں کوئی کوئی سفید بال بھی آ گیا ہو۔ مگر مجھے یقین ہے کہ تمہارا چہرہ مسکرانے سے پہلے درخشانی کا اب بھی وہی انداز رکھتا ہوگا۔

اور میں! نہیں میں تمہیں نہیں بتاؤں گی۔ کہ میں کیسی بڑھیا سی ہو گئی ہوں۔ ہاں بڑھیا سی۔ تم نہیں جانتے عورتیں مردوں کی نسبت کس قدر جلد عمر رسیدہ ہو جاتی ہیں۔

میں ایک دور دراز سفر پر گئی تھی۔ ابھی ابھی لوٹی ہوں۔ شاید عنقریب پھر جانا پڑے۔ فقط

تمہاری
شمیم

(۵)

۲۵ ستمبر ۱۹۴۷ء

میرے پیارے افضل

آج ہمیں جدا ہوئے پورے بیس برس ہو چکے ہیں۔ اور پیارے آج بیس ہی برس کا عرصہ ہو گیا ہے کہ میرا وجود صفحۂ ہستی سے مٹ چکا ہے۔ اگر اتنی مدت تک زندہ رہو کہ اس خط کو پڑھ سکو۔ جو تمہیں اسی معتبر ادر

ایماندار شخص نے سمجھا ہے۔ جس نے اس سے پہلے تمہیں میرے چار خط لمبے لمبے وقفے کے بعد اور مقررہ تاریخوں پر ارسال کئے تھے۔ تو میں تم سے اس فریب دہی کی معافی چاہتی ہوں کہ میں نے تم سے جدا ہونے کے دوسرے ہی روز خودکشی کر لی تھی۔

بھلا افضل یہ کیسے ممکن تھا کہ میں تمہارے بغیر ایک پل بھی زندہ رہ سکوں۔

کیوں افضل کل ہی ہم جدا ہوئے تھے نا؟
ذرا اس خط کے سرنامے پر تاریخ کو غور سے پڑھو۔ ہاں کل ہی کی بات ہے جب تم بچوں کی طرح بلک بلک کر رو رہے تھے۔ مجھے روکنے کے لئے التجائیں کر رہے تھے۔ تمہارا ننھا سا چہرہ جدائی کے صدمے سے اتر گیا تھا۔ آدھی کھلی ہوئی کھڑکی کے پاس رات کے اندھیرے میں تمہارے آنسو میرے ہاتھوں پر ٹپ ٹپ گر رہے تھے۔ لیکن میں پوری مستقل مزاجی کے ساتھ چپ سادھے کھڑی تھی۔

اور اب میں، اس وقت میں اپنے اسی چھوٹے سے بالا خانہ میں تمہارے نام چار خط لکھ کر ختم کر چکی ہوں۔ جو تمہیں اپنی تاریخ پر پہنچ چکے ہیں۔ اور اب یہ آخری خط لکھ رہی ہوں۔ جو ۲۵ ستمبر ۱۹۵۴ء کو تمہیں ملے گا۔ اس کے بعد میری اور کوئی تحریر تمہیں نہیں ملے گی۔

بس اب میرے ذمہ دو کام رہ گئے ہیں۔ ایک تو ان خطوں کے یکے بعد دیگرے مقررہ تاریخوں پر تمہیں بھجوانے کا انتظام۔ دوسرے چپکے سے اپنی زندگی کا خاتمہ۔ میں یہ ہولناک تفصیل بیان نہیں کروں گی کہ شاید تمہارے دل کو ٹھیس لگے۔

اگر اسی وقت تمہیں میری خودکشی کی خبر ہو جاتی تو تم یہ صدمہ برداشت نہ کر سکتے، اور خدا جانے کیا کر بیٹھتے۔ اسی لئے میں نے یہ ترکیب سوچی کہ میں گاہے گاہے اپنے خطوں کے ذریعے تمہیں اپنی زندگی کا یقین دلاتی رہوں۔ اور تم مجھے زندہ تصور کرتے رہو جب بیس برس کی طویل مدت کے بعد اس آخری خط کے ذریعے تم پر میری خودکشی کا راز افشا ہوگا تو یقین ہے کہ اس وقت تک تم مجھے بالکل بھول چکے ہوگے، تمہارے دل پر دھکا سا تو لگے گا، لیکن اس کا اثر زیادہ دیر تک نہیں رہے گا۔

آہ میرے پیارے افضل آج کی ملاقات بھی کیسی عجیب و غریب ہے، ہم کیسے سکون کے ساتھ باتیں کر رہے ہیں، بعد زمین ہی کا نہیں وقت کا بھی ہے۔ اور لفظ "آج" میں کتنا عظیم فرق ہے اس کے لئے جو اسے ادا کر رہا ہے اور اس کے لئے جو اسے سن رہا ہے!

تمہاری
شمیم

(ماخوذ)

افسانہ

فراموش

انتظار حسین

سڑک سے اک ذرا ہٹ کر اور پیچھے اور پیچھے، دودھیا کھمبے، سیمنٹ کا اجلا چبوترہ اور وہ حوض جس میں شفاف چمکیلا پانی ایک متوازن رفتار اور آواز کے ساتھ نالیوں کے ذریعہ بہتا اور نکلتا رہتا، وہ مقفل کوٹھری جس پہ سرخ لفظوں میں لکھا ہوا تھا "خطرہ ہے"۔ اور ان سب سے ہٹ کر بیس تیس قدم پرے ایک سبک سفید مختصر سی کوٹھی جیسے کبوتری نے ابھی ابھی انڈا دیا ہو۔ ان سب سے مل جل کر کچھ ایک ہی قسم کی فضا پیدا ہوتی تھی۔ یا وہ سب ایک ہی قسم کی فضا سے پیدا ہوئی تھیں ـــ نرم نرم اجلی اجلی فضا، لیکن سڑک نہ تو یہاں سے شروع ہوتی تھی اور نہ یہاں ختم ہوتی تھی۔ اپنے محلے کی گلیاں طے ہو چکتیں تو آبادی ختم ہوتی نظر آتی اور وہ سڑک شروع ہو جاتی جو آبادی سے باہر بھی تھی اور آبادی کی نشانیاں بھی رکھتی تھی۔ کچے میں اتر کر کسی نیچے نیم سے ایک ٹہنی توڑ کر مسواک بنانا اور دانتوں سے چباتے ہوئے پھر اسی لمبی سڑک پہ ہو لینا۔ چنگی کی چوکی جہاں کبھی پیلے اجلے زرد خربوزے، کبھی ہری ہری ککڑیوں کی چھابڑی، کبھی گھرے ہرے کریلوں سے لدے گدھے کھڑے نظر آتے، پھر وہ رواں دواں کرتا ہوا بہت بس کا اڈہ، جنگل جانے والوں کی لیٹوں اور گڑویوں کے شور سے بے خبر اسی بے کیف سے انداز میں چکر کاٹتا رہتا۔ پھر ٹیوب ویل کا سیمنٹ والا حوض اور وہ کھمبے اور وہ کوٹھی، کوٹھی سے آگے بہت دور تک دونوں طرف کھلا میدان جہاں کہیں کہیں بہت دور بہت سی بھینسیں خواب میں چلتی اور چرتی نظر آتیں، اور اس کے بعد اچانک سڑک موڑ کھاتی اور مشن اسکول کی سرخ عمارت سامنے آ جاتی اور اس سے خاصی دور بھٹے کی خاموش کالی چمنیاں دکھائی دیتیں جو قریب آتی جاتیں قریب آتی جاتیں اور پھر سامنے سے پیچھے کی طرف ہو جاتیں، اور اس کے بعد اکیلا ریل کی پٹری سڑک کو کاٹ جاتی۔ یہ اپنی آخری حد تھی۔ پیسے کا وہ سیف کہ ہرا کھلا ہوا یا بند

میں نے کبھی پٹری کو عبور کرنے کی خواہش ہی محسوس نہیں کی۔ فوراً پلٹ پڑتا۔ نیم کے کڑوے سفید ریشوں سے دانتوں کو ملتا دلتا، آموں کے گھنے درختوں کے نیچے سے ہوتا ہوا کہ شاید کوئی کچی امبیا ہاتھ پڑ جائے، بھٹے کی چپ چاپ چمنیوں اور مشن اسکول کی سرخ عمارت اور خواب میں چلتی ہوئی اور چرتی ہوئی بھینسوں کی معین نشانیوں سے گزرتا ہوا سیمنٹ والے حوض پر پہنچ کر دم لیتا، دانت صاف کر کے کلی کرتا، منہ ہاتھ دھوتا اور چپل اتار، مٹی میں اٹے ہوئے پیر ٹھنڈے ٹھنڈے پانی میں ڈال دیتا۔ عجب فرحت ہوتی۔ فرحت اور آسودگی تو اس فضا میں رچی ہوئی تھی۔ جانے دن بھر یہی عالم رہتا تھا یا یہ فضا اس وقت سے مخصوص تھی۔ کبھی رات کو بہت حبس ہوا تو بے شک اس وقت کالے کلوٹے ننگ دھڑنگ لڑکے حوض میں چھلانگیں لگاتے پانی اڑاتے دکھائی دیتے تھے، ویسے تو خاموشی ہی رہتی تھی۔ بس سیمنٹ کی نالیوں میں رکتا بہتا اجلا پانی بچوں کی دھم دھم کلکاریوں جیسا شور پیدا کرتا رہتا۔ یا کبھی کبھی کوٹھی کے سامنے سے گزرتے ہوئے ربڑ کی ایک سفید گیند گٹے کھاتے لڑکھتی ٹھٹھک جاتا۔ اس خاموش فضا میں یہ ننھی سی بات بھی ایک شور، ایک واقعہ بن جاتی۔ کم از کم ایک دفعہ کو تو میں چونک ہی پڑتا تھا۔ گیند کے پیچھے پیچھے ایک جوان سا لڑکا کہ حلئے سے نوکر لگتا تھا دوڑتا آتا اور بغیر کسی طرف دھیان دئیے گیند اٹھا کر اسی یکسوئی سے واپس دوڑتا اندر کوٹھی میں داخل ہو کر نظروں سے اوجھل ہو جاتا۔ کبھی کبھی کے اس واقعہ سے ہی مجھے اندازہ ہوا تھا کہ کوٹھی غیر آباد نہیں ہے اور انجینئر صاحب کے نام کی جو تختی دروازے پر آویزاں ہے وہ معنی اور مطلب رکھتی ہے۔ سامنے سڑک پر گٹے کھاتی گیند کو دیکھ کر کبھی تو میں یوں چونکا کہ اس سفید ننگی پھلکی کوٹھی کا کوئی حصہ اچھل کر سڑک پہ آ پڑا ہے کھلی

فضا میں گول گول خطوں اور خموں والی سفید عمارت، سچ مچ یوں لگتا کہ ربڑ کی بہت سی گیندوں کو اوپر تلے رکھ کے کوٹھی بنائی گئی ہے۔

پھر ایک اور واقعہ ہوا، ننھا مگر نیا۔ کوٹھی کے عین سامنے سڑک پہ چلتے ہوئے میرے قدم رک گئے۔ جیسے ایک ساتھ سامنے دیوار آگئی ہو یا جیسے سامنے ریل کی پٹڑی رستہ کاٹ رہی ہو اور چوکیدار نے اچانک کٹہرا بند کر دیا ہو۔ چکنی کالی سڑک پر سفید چاک سے بڑے بڑے حرفوں میں لکھا ہوا تھا: 'فراموش'۔ چاہے پھر میں چل پڑا لیکن ایک مرتبہ تو میں ٹھٹھک ہی گیا اور وسوسے میں پڑ گیا کہ اس رستہ کاٹتی ہوئی لکیر کو پھلانگوں یا نہ پھلانگوں۔ 'فراموش' کے لفظ سے باتیں اور یادیں بھی تو وابستہ ہیں۔ شاید ان کا یہ کرشمہ ہو۔ آموں کے موسم میں یہ لفظ اچھے خاصے ایک دھماکے کا کام کرتا ہے۔ کسی نے بےخبری میں ہاتھ میں دوگاڑا آم تھما دیا اور کھٹ سے کہہ دیا 'فراموش' اور ہاتھوں میں ایک زنجیر سی بندھ گئی، یا جیسے اچانک کسی نے سارا جسم رسی سے کس دیا ہے۔ چینی کے پلیٹ پہ بڑے تکلف سے سرپوش ڈھکا ہوا، خیال ہوتا کہ کوئی تقریب ہوئی ہے اور کوئی بہت بڑھیا لذیذ شے اس تقریب سے بھیجی گئی ہے، اور اتنے میں ہاتھ سرپوش کی طرف بڑھتا اور اچانک ایک للکار 'فراموش' جیسے کسی نے جادو کی چھڑی چھوا دی ہو، یا کوئی دعا پڑھ کے پھونک دی ہو، یا کنکریاں پڑھ کر مار دی ہوں، ہاتھ دوگاڑا آم پہ جما کا جما رہ جاتا۔ وہ سو آم نذر کیجئے اور اس قید بے زنجیر سے، اس جکڑی ہوئی رسی سے جان چھڑائیے۔

دوسرے دن جب میں پھر وہاں سے گزرا تو وہ لکیر باقی تھی مگر ادھ مٹی ہو گئی تھی، اور اس سے مجھ پر کھلا کہ اپنے اس خاص وقت پر موقوف نہیں۔ سارے دن ہی اس سڑک پہ آمد و رفت کا سلسلہ برائے نام رہتا ہے۔

چھوٹے حرفی ادھ مٹی لکیر مٹی میں اٹی گئی، مٹتی گئی، مٹتے مٹتے بالکل ہی مٹ گئی۔ بات آئی گئی ہوئی۔ اپنا ورد اسی طرح جاری رہا۔ سڑک کے موڑ سے گزر کر مشن اسکول کی سرخ عمارت سے پرے، بھٹے کی خاموش کالی چمنیوں سے ادھر ریل کی پٹڑی کو چھونا، چھو کر پلٹنا، اور سیمنٹ والے حوض میں مٹی میں اٹے ہوئے پیر ڈالنا، منہ ہاتھ دھونا، اور واپس گھر کو ہو لینا۔

فراموش ——— اپنے ورد میں ایک گرہ پھر پڑی لیکن اتنی ہلکی کہ نہ تو زمین نے قدم پکڑے اور نہ یہ کرید ہوئی کہ سفید انڈا سی دیوار کو کس نے کوئلے سے کالا کیا ہے۔ وہی کچا کچا خط، ٹیڑھے میڑھے خم اور دائرے۔ الٹا ایک اطمینان سا ہو گیا کہ کسی راہ چلتے نکھٹو لڑکے کی وہ شرارت نہیں تھی۔ یہیں کہیں کوئی بچہ رہتا ہے۔ شاید اسی کوٹھی والا گیند کھیلنے والا بچہ ہو، جسے موسم کے بہانے اس لفظ کا چسکا پڑ گیا ہے۔

واپسی میں میں نے دیکھا کہ ایک شخص کہ اس کی پیٹھ میری طرف تھی اور شب خوابی کے لباس اور ادھیڑ عمری کے باوصف تیور سے افسری کی چغلی کھاتا تھا، ہاتھ میں چھڑی لئے دیوار کی طرف اشارہ کرتا ہے اور مالی سر نیوڑھائے دیوار یوں صاف کر رہا ہے جیسے اس میں ساری خطا اسی کی ہے۔

دوسرے تیسرے دن کا ذکر ہے کہ اسی مقام پر اسی خط میں وہ لفظ پھر لکھا نظر آیا، اور میرے واپس ہوتے ہوتے وہ پھر صاف کر دیا گیا تھا۔ اس کے بعد ایک مرتبہ نہیں کئی مرتبہ میں نے جاتے ہوئے وہ لفظ لکھا دیکھا اور واپسی میں وہ مٹایا جا چکا ہوتا یا مٹایا جا رہا ہوتا۔

انہیں دنوں باہر جانا نکل آیا۔ باہر جانا تو ہوتا ہی رہتا تھا، کبھی محصول وصول کرنے گاؤں کو کبھی مقدمے کے چکر میں شہر کو۔ آج تھانے میں کھڑے ہیں تو کل تحصیل میں اور پرسوں ضلع کچہری میں۔ زیادہ سے زیادہ تین دن چار دن۔ کسی اہلکار نے بہت ستایا تو ہفتہ عشرہ ہو گیا۔ پر اب کے تو پورے پندرہ دن لگ گئے۔ یہ الگ بات ہے کہ اتنے دن کی واپسی پر بھی موسم ویسا ہی تھا۔

دوسرے دن جب میں نے اپنا ورد پھر شروع کیا ہے تو کیا دیکھتا ہوں کہ وہ لفظ اسی مقام پر اسی خط میں پھر لکھا ہوا ہے۔ مگر حیرانی کی اب کونسی بات رہ گئی تھی۔ بلکہ اب تو اس لفظ کے مٹنے اور نقش ہونے کی تکرار بھی اپنے ورد کا جزو بن چلی تھی۔ ہاں حیرانی اس پہ ہوئی کہ تکرار کی یہ زنجیر ٹوٹ گئی۔ واپسی میں لفظ کو جوں کا توں دیکھ کر گمان ہوا کہ آج انجینئر صاحب اور انجینئر صاحب کے ملازم دونوں کی نگاہ چوک گئی مگر حد ہو گئی کہ دوسرے دن بھی وہ لفظ اسی خط میں اسی مقام پر اسی طرح لکھا ہوا تھا۔ اب ماتھا ٹھنکا کہ یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے۔ سو سو طرح کا شک پڑا کہ انجینئر صاحب کیا لمبے دورے پر نکل گئے یا ان کا تبادلہ تو نہیں ہو گیا۔ کیا خبر ہے کہ بیمار پڑے ہوں۔ گمانوں کی ڈوری لمبی ہوتی گئی مگر گتھی گتھی ہوتی رہی۔

برسات اب کی بار دیر سے لگی تھی۔ دوپہریوں کا سلسلہ ٹوٹنے ہی میں

آتا تھا۔ دن کو لُو اور رات کو حبس۔ اور آندھی کا کوئی وقت مقرر نہ تھا کہ کبھی دن ڈھلنے سے پہلے اندھیرا ہو جاتا اور کبھی رات کی اندھیری میں آندھیاں چلنے لگتی۔ اٹوں اور کوٹھوں اور منڈیروں پہ کتنی مٹی اَٹ گئی تھی، اس کا اندازہ تو پہلا چھینٹا پڑنے پہ ہوا۔ ایک روز صبح ہی صبح آنکھ کھلی تو ہر چیز دُھلی دُھلی اور ٹھنڈی ٹھنڈی نظر آئی۔ جس نیم سے روزانہ ٹہنی توڑ کے مسواک بناتا تھا وہ نہا دھو کر کیسا ہرا ابھرا ہو گیا تھا۔ درخت اور کھمبے اور دیواریں سب ہی میں ایک شادابی کی رَو دوڑ رہی تھی۔ ہاں سیمنٹ والے حوض میں آج پانی نہیں چل رہا تھا بس بارش کا مٹیالا پانی رکا کھڑا تھا۔ انجنیئر صاحب کی کوٹھی بھی جو لوؤں اور آندھیوں کی گرد سے زرد پڑ چلی تھی۔ پھر سفید اجلی سی نظر آنے لگی اور وہ لفظ، کالے کوئلے سے لکھے ہوئے حرف دھل کر روشن روشن ہو گئے تھے۔

برسات کیا آئی کہ مینہ کی جھڑی لگ گئی۔ دن بارش، رات بارش۔ سوکھے تالاب منھا منھ بھر گئے اور ادھ گھتی سوتی بھینسوں کی آنکھیں کہیں اور رواں جاگا۔ خستہ چھجوں کی کڑی بیک بیک کے کالی پڑ گئی اور گلنے لگی اور اس میں سے سفید سفید سانپ کی چھتریاں ابھرنے لگیں۔ چولائی کی ننھی پتیاں پھیلتی گئیں، چوڑی ہوتی گئیں۔ پتھریلی منڈیروں پہ سبز دبیز کائی اور کوی کے گیلے کنواڑوں پر سفید پھپھوندی جمنے لگی۔ انجنیئر صاحب کی کوٹھی کی سفید دیواروں پر بوسیدگی کے ایسے آثار نمایاں نہیں تھے۔ ہاں وہ لفظ دھندلاتا جا رہا تھا۔ خون کی پھیلی ہوئی سیاہی کو دیکھ کر یوں لگتا کہ رسی کے بل کھل رہے ہیں۔ ف کا نقطہ تو بالکل ہی مٹ گیا۔ ش کے تین نقطے ہلکے پڑتے گئے۔ پھیلتے گئے اور مدغم ہو کر لیکے بن گئے جیسے چکی پھرا رہی ہو۔ مجھے فکر ہوئی کہ کہیں یہ لفظ بالکل ہی نہ مٹ جائے۔ دراصل اپنا اس لفظ سے ایک رابطہ سا قائم ہو گیا تھا۔ اس سڑک کی یوں کس چیز سے اپنا رابطہ نہیں۔ لیکن بعض خاص خاص چیزیں اپنے لئے نشانیوں کا بلکہ سنگِ میل کا مرتبہ رکھتی ہیں۔ اپنے اس روزانہ کے چھوٹے سے سفر کی نوعیت خالصتاً نجی ہے۔ منزل ہی نہیں، میل اور سنگِ میل بھی اپنے مقرر کئے ہوئے ہیں۔ چنگی کی چوکی، رہٹ، مشن اسکول کی سرخ عمارت، بھٹے کی خاموش چمنیاں۔ یہ سنگِ میل ہی تو ہیں۔ اب یہ لفظ بھی ایک سنگِ میل بن گیا تھا۔ اس سنگِ میل کو چھوتے ہی لگتا کہ باقی میل یوں طے ہوئے اور ریل کی پٹڑی اب آئی۔ کبھی کبھی یہ سنگِ میل منزل بن جاتا۔ گویا اسے چھونے کے لئے ہی گھر سے نکلے تھے اور اگر ریل کی پٹڑی تک جا رہے ہیں تو محض وضعداری کی خاطر۔

برسات ڈھلنے لگی۔ مینہ کا زور ٹوٹ چلا۔ گھٹا ایسی گھر کے آتی، جیسے ٹوٹ کے پانی پڑے گا۔ مگر دم بھر پانی پڑتا اور آن کی آن میں مطلع صاف۔ بڑی بڑی ساونی جامنوں کی جگہ چھوٹی بدرنگ بھدیاں جامنیں آئیں۔ پھر بھدیاں جامنیں بھی غائب ہونے لگیں۔ چولائی کے پتے ہرے سے سرخ اور سرخ سے پیلے ہوئے۔ سانپ کی چھتریاں جس تیزی سے پھولی تھیں اسی تیزی سے مرجھائیں۔ طوطوں کے بچے نیم کی کھوکھل سے نکل کر شاخوں پر آ گئے تھے۔ اور ٹہنی ٹہنی پھدکتے پھرتے تھے۔ منھا منھ تالاب گھٹتے گئے گھٹتے گئے یہاں تک کہ پانی بھینسوں کے گھٹنوں تک رہ گیا۔ گری ہوئی چھتوں، جھکی ہوئی کڑیوں اور چھجوں اور ڈھتی اترتی دیواروں کی مرمت شروع ہو گئی تھی اور احاطوں میں سے ڈھئی ہوئی دیواروں کا ملبہ اٹھنے لگا تھا۔ انجنیئر صاحب کی کوٹھی کے احاطے میں چونے کی بوری رکھی نظر آئی تو کچھ عجیب سا احساس ہوا۔ سفید بدرنگ دیواروں کا جائزہ لیتے ہوئے نظریں اپنے ٹھکانے پر جا کر ٹک گئیں۔ ف کا نقطہ پہلے ہی معدوم ہو چکا تھا۔ اب میم کی گھنڈی بھی کھل چلی تھی۔ شین کی پتلی کمر اور بھرا گئی تھی۔ رسی کے بل کھل رہے تھے، بکھر رہے تھے۔ مگر اب تو کوچی کے ایک اشارے پہ پورا کا پورا چھ حرفی افسانہ حرفِ غلط بن جائے گا۔ اس خیال سے جی اک ذرا اداس سا ہو گیا۔ پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ یہ لفظ سنگِ میل نہیں، رستے کا ساتھی تھا جو اپنی جگہ پہ کھڑا دور سے اشارہ کرتا رہتا تھا اور دور تک اشارہ دیتا رہتا تھا۔

چونے کی بوری احاطے میں ڈیڑھ دو دن جوں کی توں رکھی رہی۔ پھر بڑے بڑے دو ڈھول رکھے نظر آئے جن میں قلعی گھل رہی تھی، اور دو تین کوچیاں، اور ایک سیڑھی۔ دوسرے دن کوٹھی کو میں نے ادھوری حالت میں دیکھا۔ اندر کے بڑے حصے میں قلعی ہو چکی تھی مگر باہر کی دیواروں کو ابھی نہیں چھوا گیا تھا۔ دوسرے دن دیکھا کہ ساری کوٹھی پہ سفیدی ہو گئی ہے..... مگر میں دنگ رہ گیا..... باہر کی دیوار پر اس اہتمام سے سفیدی کی گئی تھی کہ 'فراموش' اپنی جگہ پہ قائم تھا اور اس سلیقے سے کہ چونے کی ایک بوند کسی حرف پہ نہیں پڑی تھی۔ میں کھڑا کا کھڑا رہ گیا اور ایک بل کھلی ادھ سڑی رسی نے میرے ہاتھ پیروں کو اس طرح جکڑ لیا کہ میں نہ آگے بڑھ سکتا تھا نہ پیچھے ہٹ سکتا تھا۔

ٹہلنے کا ورد نہیں بدلا، رستہ نہیں بدلا، رستے کی شکل بدل گئی

نشانوں کی ترتیب بدل گئی۔ آگے جو ایک لمبی لکیر تھی اب گول چکر بن گئی۔ اول و آخر کا قصہ ہی پاک ہو گیا، سارے نشان ایک گھوم میں گم ہوتے چلے جاتے اور گھوم پھر کر وہ نشان پھر آ جاتا، دیوار بن کر سامنے کھڑا ہو جاتا پھر یہ سارے نشان زائل ہو گئے اور وہ ایک نشان پھیلنے لگا۔ پھیلتے پھیلتے نقطہ محیط بن گیا۔ مرکز بھی وہی، محیط بھی وہی، منزل بھی وہی سنگ منزل بھی وہی۔ بس ورد کے مطابق پیرایہ سلسلے کرتا پھر اپنی جگہ پہ کھڑا نظر آتا۔ چلتے چلتے ریل کی پٹڑی کو پھلانگتا اور دور نکل جاتا، اور پھر بھی وہیں کا وہیں رہتا۔ کبھی کوٹھی کے بالکل برابر سے نکلتا اور اس بھید بھرے لفظ کی تہ میں اترنے کی کوشش کرتا لیکن ادھ مٹے حروف کا ایک خم بھی لمس سے مس نہ ہوتا اور پھر سڑک پیچ دار رہتی اسی طرح گرمڑی مارے پڑی رہتی۔ پھر میں آپ ہی اپنی اس روش پہ لعنت ملامت کرتا اور دوسرے دن اس عزم سے سڑک کے دوسرے کنارے چلتا کہ ادھر آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھوں گا۔ لیکن کوٹھی کے مقابل پہنچنے سے پہلے ہی عزم ڈگمگانے لگتا اور پہلے کنکھیوں سے اور پھر ہار کر براہ راست اس مقناطیسی گرہ کو دیکھتا۔ کئی مرتبہ خیال آیا کہ مالی سے کیوں نہ پوچھ لیا جائے۔ ہاتھ میں ڈیڑھ ہاتھ لمبی قینچی یا کوئی کھرپا، بظاہر بہت مصروف بنا ہوا کوٹھی کے پھاٹک سے اچانک نکلتا اور اچانک گم ہو جاتا گویا سایہ تھا کہ دکھائی دیا اور اوجھل ہو گیا۔ ایک مرتبہ تو میں بالکل اس کے برابر پہنچ گیا مگر عین موقعہ پر جھجک گیا۔ سمجھ ہی میں نہ آیا کہ کیا پوچھوں اور کیسے بات شروع کروں پھر مالی پہ شک پڑنے لگا کہ یہ یوں سائے کی طرح کیوں دکھائی دیتا اور اوجھل ہوتا ہے اور انجنیئر صاحب؟ یہاں واقعی کوئی انجنیئر رہتا ہے؟ نام اور عہدے کی یہ تختی کسی گزرے بسرے زمانے کی تو یادگار نہیں ہے؟ پھر وہ شب خوابی کے کپڑوں میں ملبوس ادھیڑ عمر شخص کہ بس ایک صبح دم بھر کے لئے نظر آیا تھا کون تھا؟ کہاں گیا؟ اور وہ سفید گیندیں؟ اب وہ گیند لڑھکاتی ہوئی اپنا رستہ نہیں روکتی؟ موسو شاک شتے، وہ طرح طرح کا وہم گزرا۔ بچپن میں دیکھے ہوئے وہ زنگ لگے تالوں اور گرد میں اٹے کنواڑوں والے مکان یاد آئے جن میں اپنا یقین تھا کہ جن رہتے ہیں۔ کہانیوں کی وہ بھید بھری حویلیاں یاد آئیں جن میں داخل ہو کر نکلنے کا رستہ نہیں ملتا تھا اور جادوگرنیوں کی کوشش تھی کہ گلے میں آشنائی کا پٹہ ڈالتیں یا ہرن بنا کے رکھتیں۔ فراموش ــــ یہ سیدھا سادا مگر مبہم لفظ کس حال کا عمل نہ ہو، کیا خبر ہے کہ جادو ہو۔ جادو لفظ ہی سے تو پیدا ہوتا ہے۔ سمجھ نہ آنے والے لفظ سے۔ عام حروف سے بٹی ہوئی یہ غیبی رسی جادو کا پھندا بن کر گلے پڑ گئی۔

دنوں تو زنجیر اچھلتا گیا اور جادو کا پھندا آپ ہی آپ ڈھیلا پڑنے لگا۔ جاڑے نے آ کے جاڑے کے ساتھ پالا، ٹھٹھرن اور دھند آئی۔ صبح کو اوورکوٹ لادے اور مفلر کانوں سے لپیٹے ٹہلنے نکلتا۔ درخت ٹیلیفون کے تار، ٹیوب ویل کے دودھیا کھمبے، بھٹے کی کالی چمنیاں۔ سب کی سب چیزیں دھند میں لپٹی ہوئی اور سوئی ہوئی نظر آتیں۔ واپسی میں کہ اس وقت دھند ذرا چھنٹ جاتی تھی۔ یہ سب چیزیں سیلی ہوئی دکھائی دیتیں۔ وہ سفید دیوار بھیگی بھیگی سی لگتی تھی۔ اور وہ لفظ، اب وہ پھر گیلا ہو کر میلا ہونے لگا تھا۔ نقطے سے محروم ف کی اس گھنڈی کے بھی بل کھل رہے تھے جو اس کی انفرادیت کا نشان ہے۔ اور الف کے نام تو بس ایک ہلکا سا عکس باقی رہ گیا تھا۔ بارش کے تھمتے ہوئے جو ڈال نقطے تو پہلے ہی دھل گئے تھے۔ اب اس کا خم کھاتا ہوا لمبا پیٹ بھی نرم پڑ چلا تھا۔ رسی کے سارے ہی بل نکل گئے تھے۔ کبھی میں اسے بے دھیانی میں دیکھتا چلا جاتا، کبھی بغیر دیکھے گزرا چلا جاتا۔ کئی کئی دن گزر جاتے اور دیوار پہ نظر بھی نہ اٹھتی۔ یہ خیال بھی نہ آتا کہ اب یہ لفظ کس گردش میں ہے۔ دائرہ ٹوٹ کر پھر لمبی لکیر بن چلا تھا۔ سڑک اپنی پہلی والی شکل پہ آتی جا رہی تھی اور مٹی ہوئی نشانیاں اور گمشدہ سنگ میل پھر نمودار ہو رہے تھے۔

بسنت آنے پہ پالا پلے کے ساتھ جاڑا گیا۔ گلابی جاڑا چمکا، ماند پڑ گیا۔ ہولی آئی تو بستروں سے لحاف رخصت ہو گئے۔ اور رضائیاں آئیں، اور چارپائیاں کچھ بند کمروں سے دالانوں میں اور کچھ آنگنوں میں آ گئیں۔ گیہوں کی فصل کٹ رہی تھی۔ مجھے بار بار گاؤں جانا پڑا اور کئی کئی دن واپسی نہ ہوئی۔

واپسی پہ ٹہلنے کا وظیفہ پھر شروع ہو گیا۔ اب خیال بھی نہ آتا تھا کہ انجنیئر صاحب کی کوٹھی کی طرف دیکھوں۔ نظر آپ ہی اس طرف اٹھ گئی تو اٹھ گئی ورنہ اب تو اس طرف دھیان بھی کم جاتا تھا۔ دراصل یہ کوٹھی اور اس کی وہ کوئلے سے لکھے ہوئے لفظ والی دیوار بھی بچپن والے زنگ لگے تالوں اور مٹی سے اٹے کنواڑوں والے مکانوں میں شامل ہو کر یادوں کی فضا کے لپیٹے میں پرے سرکتی جا رہی تھی۔ لیکن ایک مدت بعد ادھر نگاہ جو پڑی تو اک تبدیلی سی نظر آئی۔ احاطے میں چند کرسیاں بے ترتیبی سے پڑی تھیں اور برآمدے میں کئی بند پیٹیاں اور کچھ کھلا سامان بکھرا سا دکھائی دیتا تھا۔ دل میں ایک کرید سی ہوئی کہ آخر بات کیا ہے۔ شک سا پڑا کہ انجنیئر صاحب کا تبادلہ تو نہیں ہو گیا

یہ ان کے جانے کی تیاریاں ہوں۔ واپسی میں میں مخالف سمت کو چھوڑ کر کوٹھی کے برابر سے نکلا۔ دیکھا کہ برآمدے میں تین چار بچے بے طرح دھما چوکڑی مچا رہے ہیں۔ اندر کے کمرے سے اس کے خلاف نسوانی احتجاج کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں، پھر ایک مردانہ ڈانٹ۔ مجھے بڑا اچنبھا ہوا۔ بچے، بڑے، عورتیں، مہین اور موٹی اور نرم رسیلی اور درشت آوازوں کے یہ رنگ برنگے تار کہ ایک بناوٹ بن کر پھیل رہے تھے۔ آخر یہ نئی زندگی اچانک کیسے اور کہاں سے پھوٹ پڑی۔ خاموش برآمدے اور احاطے، سنسان والے بند دروازوں اور گنگناتے کمروں کی ہوا اتنا ایکی کیسے پلٹی۔ سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ بس یہ سوچ لیا کہ کہیں سے مہمان آئے ہوں گے۔

دوسرے دن کوٹھی کا حلیہ بدلا نظر آیا۔ دور سے پتہ چل رہا تھا کہ سفیدی ہوئی ہے۔ پھاٹک کے باہر گلی کے ادھر بھی سرے ڈھول بھی رکھے تھے۔ کہ جیسے راج کام لیتے کرتے انہیں چھوڑ گئے ہیں اور آ کے پھر کام سے لگ جائیں گے۔ میرے قدم نادانستہ تیز تیز اٹھنے لگے۔ کوٹھی کے قریب پہنچتے ہی میری نگاہ نے اسی باہر والی دیوار کو ٹٹولا۔ دل دھک سے رہ گیا۔ ساری دیوار پہ سفیدی ہو چکی تھی اور سفیدی پہ لقلقوں شوشوں اور نمروں سے پیدا ہوا وہ جالا سفیدی میں ڈوب چکا تھا۔ اچانک پھر کسی نے میرا رستہ کاٹ دیا اور ایک ان دیکھی رسی مجھے جکڑے لے رہی تھی۔

ہاتھیں دبی مالی کی قینچی۔ باہر کی روش پہ دور و یہ جھاڑیوں کی ہری ہری لمبی شاخوں اور ٹہنیوں کو تیزی سے کاٹتا چلا جا رہا تھا۔ اب تو واقعی مجھ سے ضبط نہ ہو سکا۔ یوں بھی اب وہ مالی ہی لگتا تھا۔ کوئی پراسرار مخلوق نظر نہیں آتا تھا کہ مجھے جھجک ہوتی۔ اس کے قریب سے گزرتے ہوئے سادگی سے رکا اور اسی سادگی سے پوچھا "انجنیئر صاحب کے ہاں بہت مہمان آئے معلوم ہوتے ہیں!"

"مہمان تو کوئی نہیں" مالی کی قینچی اسی طرح چلتی رہی۔ "نئے انجنیئر صاحب کے گھر والے ہیں۔"

"نئے انجنیئر صاحب" میں چونکا اور نگاہ فوراً نام کی تختی پہ گئی۔ تختی واقعی بدلی ہوئی تھی۔

مالی اسی طرح ہاتھ روکے بغیر سادگی سے بولا "ہاں جی اب نئے انجنیئر صاحب آ گئے ہیں پہلے انجنیئر صاحب تو گئے۔"

"کہاں؟"

"انہوں نے پنشن لے لی۔"

"پنشن؟ اچھا؟" مجھے یہ بات نہ جانے کیوں اتنی عجیب معلوم دے رہی تھی۔

چند لمحے خاموشی رہی، بس ہری شاخوں میں قینچی کے ہر دو کرنے کی آواز آتی رہی۔ پھر مالی آپ ہی بولا، اور اس مرتبہ اس کی آواز میں افسوس کی سی ایک کیفیت تھی۔ "اجی اچھا ہی ہوا کہ ان کی پنشن ہو گئی۔ جب سے ان کا بیٹا مرا تھا ان کا دماغ چل بے چل ہو گیا تھا۔"

"بیٹا؟ اچھا بیٹا مر گیا تھا انجنیئر صاحب کا؟" یک بیک الجھی ہوئی ڈور کا سرا ملتا دکھائی دیا۔

"نہیں جی وہ بیٹا نہیں تھا۔" مالی نے قینچی روکی، قینچی زمین پہ ٹکا کر سیدھی کی، میری طرف رخ کر کے کھڑا ہو گیا۔ "انجنیئر صاحب بچارے تو اکیلے تھے۔ وہ ان کا لے پالک تھا۔ بہت لاڈ کرتے تھے اس کا۔ بس وہ دم تھے۔ انجنیئر صاحب اور لے پالک اور کیا دیکھ نہ رہ گیا تھا انہیں بس اسے دیکھ دیکھ کے جیتے تھے۔ نہ کسی سے ملنا، نہ کسی کے پاس جانا، نہ کوئی میل ملاقات۔ دفتر یا دورہ، وہاں سے سیدھے گھر۔ نہ کوئی اور نہ بکھیڑا، اسی کے ساتھ مگن رہتے تھے..... پچھلے برس اسے یوں لگ گئی کلی کی کلیاں مرجھا گئیں...." مالی کسی سوچ میں ڈوب گیا پھر آپ ہی آپ بڑبڑایا۔ "انجنیئر صاحب پھر اکیلے رہ گئے۔ بہت دکھی رہتے تھے بچارے بالکل کھوئے کھوئے رہنے لگے تھے۔ نوکری سے بھی جی اچٹ گیا تھا۔ اب دورے پہ بھی ایسے ویسے ہی جاتے تھے۔ بس اسی کا خیال ہر وقت رہتا تھا۔ اس کی ایک ایک چیز کو گیند کو بلے کو سینت کے رکھ چھوڑا تھا..... اچھا ہی ہوا پنشن لے لی۔ بالکل چل بے چل ہو گئے تھے۔" اس نے آہستہ سے جھک کر قینچی اٹھائی۔ اور میری طرف دیکھے بغیر دوسری روش کی طرف ہو لیا۔

کھلے میدان میں کہیں کہیں بہت دور اتنا دکھ خواب میں چلتی اور چرتی ہوئی بھینسیں، پھر دو رویہ آموں کے بے ثمر درخت کہ ختم ہونے میں نہ آتے تھے۔ مشن اسکول کی سرخ عمارت، عمارت سے کہیں بہت آگے نکل کر ریلوے کی کالی چپ چاپ چمنیاں جو قریب ہونے کی بجائے دور ہوتی نظر آ رہی تھیں، اس روز وہ لمبی اونچی نیچی گرد آلود سڑک کہ کبھی سیدھی چلتی اور کبھی ٹیڑھ کھاتی دکھائی دیتی۔ اتنی لمبی لگی اتنی لمبی لگی کہ میں بیزار ہو کر ریل کی پٹری کو چھوئے بغیر واپس ہو لیا۔

سرِ آدم

روش صدیقی

تو نے سمجھا اس جہاں کو کارگاہِ بے ثبات
خواب ہے تیری نگاہوں میں شبستانِ حیات
یہ تری سادہ دلی اے موجِ بحرِ کائنات!

زندگی بھر جادہ پیمائے دُعا رہنا ترا
اور مفہومِ مشیت سے جدا رہنا ترا
نذرِ فردا کر دیا تو نے جہانِ ممکنات

سوچتا ہوں کیا نویدِ خُلدِ فردا ہے یہی؟
کیا فروغِ صبحِ جنت کا تقاضا ہے یہی؟
اور بھی تاریک ہو جائے غمِ دوراں کی رات

تو سدا الفاظ کے گلشن کھلاتا ہی رہا
آتشِ کردار سے دامن بچاتا ہی رہا
یوں تو ٹوٹا ہے نہ ٹوٹے گا طلسمِ خواہشات

کیا یہی ہے ترکِ دنیا اور ترکِ ما سوا؟
تو رہے نا آشنائے دردِ مخلوقِ خدا
تیرے دامن تک نہ پہونچے گردِ راہِ حادثات

تال پر نازاں ہے تو اے نغمہ خوانِ کن فکاں
اور دنیا ہے سراسر کارگاہِ امتحاں
امتحاں ہے شرط، اے دانندۂ راہِ نجات!

دل میں خاک اُڑتی ہے سوزِ زندگانی کے لئے
فکر ہے شمعِ حرم کی پاسبانی کے لئے
اور بجھتی جا رہی ہے مشعلِ راہِ حیات

آگ ہو دل میں تو ہے اک آہ لرزیدہ بہت
ایک آنسو درپئِ مژگانِ نم دیدہ بہت
ورنہ بے ہنگام شورِ دجلہ و نیل و فرات

زندگی کی تیغِ نادیدہ سے بسمل ہو کے دیکھ
بندگانِ خلق کے دُکھ سکھ میں شامل ہو کے دیکھ
سرِّ آدم تجھ پہ کھل جائے گا اے قدسی صفات!

یہ لمحے

ضمیر اظہر

یہ غم کے لمحے ہیں کتنے پیارے
کہ زندہ جن کے وصال سے ہیں یہاں کئی حسرتوں کے مارے
یہ غم کے لمحے ہیں کتنے پیارے

طویل تنہائیوں میں اکثر
مری نگاہوں کی کھڑکیوں سے ہیں گذری ایسی سیاہ راتیں
کہ جیسے صحرائے بے صدا میں
فسردہ بے بال و پر فضا میں
رواں گناہوں کا کارواں ہو
مگر یہ لمحے، یہ غم کے لمحے!
نجوم کا روپ دھار کر دل کو دل سے کرتے رہے اشارے
یہ غم کے لمحے ہیں کتنے پیارے!

جہاں کہ اک حادثوں کا گھر ہے
الجھتا رہتا ہے نت نئے حادثوں سے جس میں غریب انساں
اگر نہ ہوتے یہ غم کے لمحے
تو کس سہارے عبور کرتا حیات کے تلخ و تیز دھارے؟
یہ غم کے لمحے ہیں کتنے پیارے!

وادیٔ شفق سے

صفیہ شمیم

پُر کیف ہو جب دنیائے چمن اور ہر سو ہو آغازِ سحر
انگڑائیاں لیں نازک شاخیں اور جھوم رہے ہوں مست شجر
جب نہروں اور تالابوں پر ہوں عکس فگن انوارِ سحر
ہر قطرۂ شبنم موتی ہو، ہر ذرۂ خاکی لعل و گہر
جب غرقِ تبسم عالم ہو، گُل صحرا کو مہکاتے ہوں
جب کھیت ہوا کے جھونکوں سے میدانوں میں لہراتے ہوں
جب مست فضائیں نکھری ہوں جیسے ہوں دھلی آبِ زر سے
چاندی سے جھلکتے دریا پر جب کرنوں کا سونا برسے
آراستہ ہو سلمائے سحر انوار کے ترشے زیور سے
انگڑائیاں لے خوابیدہ فضا مہتاب کے سیمیں منظر سے
کوئل کی صدائیں آتی ہوں جب رہ رہ کے گلزاروں سے
اک نغمۂ شیریں پھوٹ پڑے جب دل کے نازک تاروں سے
اس وقت شفق کی وادی سے تو کاش چمن میں بھی آئے!
ہستی کا مری ذرہ ذرہ تصویرِ مسرت بن جائے!

غزل

حفیظ ہوشیارپوری

سحر قریب ہے تاروں کو نیند آئی ہے
شبِ فراق کے ماروں کو نیند آئی ہے

شعاعِ مہرِ جہاں تاب سے یہ کون کہے
ابھی ستارہ شماروں کو نیند آئی ہے

جفا کا بھیس بدل اے نسیمِ مہر و وفا
نگارِ لطف کے ماروں کو نیند آئی ہے

خروشِ حشر میں بھی سر نہ آستاں سے اُٹھے
یہ کس کے سجدہ گذاروں کو نیند آئی ہے

جگانے آئے گا پھر کوئی نے نواز نہیں
خزاں نہیں، یہ بہاروں کو نیند آئی ہے

تھپک تھپک کے یہ کہتی ہے موجِ بیتاب
تھکے تھکے سے کناروں کو نیند آئی ہے

سکونِ خواب سے محروم ایک میں ہی نہیں
مری طرح سے ہزاروں کو نیند آئی ہے

ہوائے گورِ غریباں خیال ان کا رہے
یہاں یہاں مرے پیاروں کو نیند آئی ہے

سُنائے جائیں گے ہم داستانِ ہجر و فراق
یہ اور بات ہے یاروں کو نیند آئی ہے

حفیظ تم بھی چلو اب تو گھر خدا کے لئے
طویل راہگذاروں کو نیند آئی ہے

غزل

یوسف ظفر

تیرا جلوہ بھی اگر صورتِ ہجراں ہوتا
تجھ سے کیا، میں ترے سائے سے گریزاں ہوتا

راہیں منزل نہیں، منزل سے مگر کم بھی نہیں
تو کبھی ہوتا، تو مرے ساتھ پریشاں ہوتا

میرا ہونا تری فرقت کا اثر ہے اے دوست!
میں نہ ہوتا تو ترا حُسن نمایاں ہوتا

دل نے پھر گردشِ دوراں کا فسانہ چھیڑا
کاش اس دَور میں ملنا ترا آساں ہوتا

سانس لینے ہی کو جینا تو نہیں کہتے ہیں
زندگی تھی، جو ترے وصل کا امکاں ہوتا

تجھ کو اُلفت نہ سہی، کوئی طلب تو ہوتی
دل ترا غنچہ بھی ہوتا، تو گلستاں ہوتا

میں ہی وہ کشتۂ اُمیدِ وفا ہوں کہ ظفر
گر مجھے موت بھی ملتی تو غزلخواں ہوتا

غزل

ریاض قادر

درد کی شوخیٔ خرام خموش
ہے لبوں پر بھی اس کا نام خموش

اب وہ افسانۂ بہار کہاں
سو رہا قلبِ تشنہ کام خموش

طائرِ نغمہ خواں سے ہے آباد
وہی اُجڑا سا گھر، وہ بام خموش

اے مسافر ٹھہر پرانے دیار
تجھ سے کرتے ہیں کچھ کلام خموش

یہ کبھی زندگی کا مرکز تھے
یہ جو اوندھے دھرے ہیں جام خموش!

زندگی آپ اپنا محور تھی
مر رہا سوزِ ناتمام خموش

شوق سے کچھ نکل گئے آگے
ہو گئیں منزلیں تمام خموش

یوں چلے ہر دیارِ رعنا سے
آنکھ بھرپور اور گام خموش

نگاہیں..

ہم لوگ

ضمیر جعفری

ہمارے گروپ میں زیادہ تر ادیب، شعرا، فن کار اور دانشور شامل تھے جو دن بھر ایک باقاعدہ بے قاعدگی کے ساتھ کسبِ معاش کا دھندا کرتے، رات کو بڑے خلوص کے ساتھ شہر کے مختلف قہوہ خانوں میں گپ لڑاتے اور اس کے بعد جو وقت بچ رہتا اس میں ادب، آرٹ، دانش وغیرہ کی تخلیق کرتے۔ بعض فن کار، فن کو زندگی سے اتنا مقدم سمجھتے تھے کہ زندگی خود ان کی گرفت سے نکل گئی تھی۔ چند بڑے افسر بھی گروپ میں شامل تھے جو اگر بڑے افسر نہ ہوتے تو بہت چھوٹے آدمی ہوتے۔ ان کے علاوہ کچھ ایسے لوگ تھے جو بظاہر زندگی کے ایسے شعبوں سے تعلق رکھتے تھے جن کا ادب اور آرٹ سے کوئی تعلق نہ تھا مگر وہ ادب اور آرٹ کے سرپرست سمجھے جاتے تھے۔ پھر بعض متفرق قسم کے افراد، جو نہ معلوم کیوں، کب اور کس طرح مجتمع ہو کر گروپ میں در آئے تھے مگر اب اس کا جزو بن چکے تھے۔

آزادی سے پہلے ہم لوگ عموماً مختلف ہوٹلوں اور قہوہ خانوں میں بیٹھتے تھے۔ آزادی کے بعد جب پرانی قدریں بدلنے لگیں تو شہر کے بڑے کلب کے دروازے بھی ہم پر کھل گئے۔ جب یہ دروازے کھلے تھے تو یوں محسوس ہوا تھا جیسے ہم پر جنت کے دروازے کھل گئے ہوں۔ ہم میں سے بعض کو آزادیٔ وطن کی تمنا ہی محض اس لئے تھی کہ بڑے کلب میں داخل ہونے کی آزادی مل سکے گی مگر جب وہاں داخل ہوئے تو بہت جلد باہر نکلنے کی آرزو نے بے چین کر دیا۔ کلب کے خلاف ہمارے گروپ میں ہزاروں اعتراضات پیدا ہو گئے۔ ہزاروں تو خیر میں نے یونہی اجمالاً کہدیا۔ تفصیل میں موٹے موٹے اختلافات چار پانچ سے زیادہ نہ تھے مگر ہاں غم و غصہ ہزار ہا اختلافات سے بھی زیادہ تھا۔ اس پر گروپ کا "قومی مزاج" کچھ اس قسم کا کہ ہم کسی ایک اختلاف پر بھی کلب کو توڑ کر پھر اسی دیوار پر جا بیٹھتے جہاں سے کچھ پہلے کلب کے جگمگاتے ہوئے چھری کانٹوں کو دیکھا کرتے تھے۔

ہمارے نقطۂ نگاہ سے بڑے کلب میں بعض بہت بڑی قباحتیں اصلاح طلب تھیں۔ بنیادی قباحت کلب کا معیار تھا جو اتنا اونچا نکل گیا تھا کہ زندگی کلب سے باہر چلی گئی تھی۔ کم از کم قومی سانچے میں ڈھلی ہوئی جس بھرپور مخلصانہ زندگی کو ہم سینے سے لگائے پھرتے تھے وہاں اس کے تصور کی بھی گنجائش نہ تھی۔ فرنگی تو فرنگی، خاص اپنے لوگوں کا یہ عالم تھا کہ ابھی تک یورپ سے واپس نہیں آئے تھے۔ جو یورپ نہیں جا سکے تھے وہ پانہ رجہاز بیٹھے تھے۔ یہ لوگ عموماً موسم اور کلچر پر بحث کرتے تھے جو ہوتے ہوتے اسقدر آسان ہو چکی تھی کہ صاحب لوگوں کے اٹھ جانے کے بعد بیرا لوگ بھی موسم اور کلچر پر بحث کر لیتے تھے۔ یہ لوگ ایران کے قالین و سموور سے واقف تھے مگر ایران کے حافظ و سعدی سے بے خبر۔ وہ ہم میں سے ضرور تھے مگر ہماری طرح کے ہرگز نہیں تھے۔

کلب کے مشروبات و ماکولات میں سے بیشتر چیزیں عقیدہ و توفیق کی مجبوریوں کے باعث ہماری دلچسپی سے خارج تھیں۔ ایک سے ایک بڑھیا اور مفرح دیسی شربت بازار میں موجود تھا مگر بوتلوں کی صورت ایسی واہیات تھی کہ ان کے بار پانے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ مشکل مشکل سے اجنبی ناموں والے درجنوں قسم کے کھانے وہاں ضرور مل جاتے تھے اور ان میں سے بعض یقیناً مزیدار بھی تھے مگر ان لاطینی کھانوں کے ساتھ جب تک پیرس کے "الجزائر کلب" کی چہل پہل پر تبصرہ نہ کیا جائے یوں محسوس ہوتا گیا ہم کھانے کو نہیں۔ کھانا ہمیں کھا رہا ہے۔ ادھر اپنا یہ عالم کہ پاس کچھ اپنے بجز نعرۂ تکبیر نہیں لے کچھ ترنم کے ساتھ۔ اشعار پڑھ سکتے تھے، سو اس میں یہ بجوگ آپڑا تھا کہ چھری کے

کاٹ لینے کے بعد نوابی کا پرزہ کانٹے کی نوک پر اتنی مدت تک ٹک ہی نہ سکتا کہ آدمی اطمینان سے شعر سنا سکے یا جھوم سکے۔

شربت کے تذکرے سے یہ نہ سمجھئے کہ ہیئت و صورت کی قید بوتلوں تک ہی محدود تھی۔ ممبروں پر لازم تھا کہ وہ اچھی وضع قطع کے ساتھ کلب میں آئیں۔ انسان اندر چاہے جیسا کچھ بھی ہو، لباس ضرور عمدہ ہو۔ بوتل شربت سے زیادہ اہم تھی۔ آزادی کے بعد اگرچہ کلب کے قوانین شیروانی پاجامے پر بھی اتر آئے تھے مگر ہم پر یہ پابندی بھی سخت گراں تھی۔ گروپ کے اصحاب الرائے کے نزدیک تفریح کو اگر لباس میں جکڑ دیا جائے تو چہرا چمک اٹھتا ہے، روح مرجاتی ہے۔ اختلاف فروعی نہیں اصولی تھا۔ جہاں عام لوگ لباس کو زینت سمجھتے تھے وہاں ہمارے "مردانِ حُر" اس کو زحمت و مشقت گردانتے تھے ؎

کہ فطرت خود بخود کرتی ہے لالہ کی حنا بندی

انتظامیہ کو ایک مرتبہ خیال آیا شاید یہ لوگ گھر سے آئینہ دیکھ کر نہیں نکلتے۔ اس پر کلب کے برآمدے میں دو تین قدِ آدم آئینے نصب کر دیئے گئے مگر فن کار ممبر جب آئینے میں اپنی ہیئت دیکھ کر اس پر الٹا اظہارِ اطمینان کرنے لگے تو دوسرے ممبر مارے حیرت کے آئینہ بن گئے۔

مغربی رقص و موسیقی کا معاملہ بھی عجیب تھا۔ جب تک ہم کلب کی بیرونی دیواروں پر سے دیکھتے، سنتے تھے، یہی رقص یہی موسیقی ایک آسمانی نعمت معلوم ہوتی تھی۔ قریب پہنچے تو اس رقص و موسیقی سے جان چھڑانا مشکل ہو گیا۔ رقص میں تو خیر پھر بھی ایک کیفیت تھی لیکن موسیقی نہایت وحشت آفریں ثابت ہوئی۔ رقص کے کسی نقطہ پر جب ذرا محظوظ ہونے لگتے تو گروپ کے بعض ممبر جو انتظامِ حکومت میں تو کوئی آواز نہیں رکھتے تھے مگر اپنی جگہ نظامِ حکومت کا پورا فلسفہ منضبط کئے بیٹھے تھے، اس سُرور کو فسق و فجور کی تعریف میں لے آتے۔

ایک مرتبہ ہم نے کلب میں اردو ڈرامہ کھیلنے کی تجویز پیش کی تو دوسرے ممبروں نے تجویز کے ساتھ ہمیں بھی حقارت کی نظر سے دیکھنا شروع کر دیا۔ بہت زور دینے پر اس شرط کے ساتھ اجازت ملی کہ اولاً پروگرام دو گھنٹے سے زیادہ نہ ہو اور ثانیاً پروڈکشن کی نگرانی بوڑھی مس شیپ شینک کے سپرد ہو گی تاکہ کلب کی شہرت پر حرف نہ آنے پائے۔ اپنے کلچر کی خدمت کے خیال سے ہم نے یہ شرط بھی قبول کر لی مگر کلب کے ہموار و ناہموار، متضاد و متصادم رجحانات کے طفیل تجویز کا بقول شخصے وہی حشر ہوا کہ ؎

حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے!

ہوا یہ کہ پہلے تو سرے سے کوئی ایسا ڈرامہ ہی ملنے میں نہ آیا جو ڈرامہ بھی رہے اور دو گھنٹے یعنی چار گھنٹے میں بھی ختم ہو سکے۔ ناچار گروپ کے ایک تمثیل نگار نے جو مقامی آغا حشر کے لقب سے مشہور تھے، جہانگیر اور نور جہاں کے تاریخی معاشقے کے تار و پود پھیلا کر خود ہی ایک ڈرامہ تصنیف کر ڈالا۔ "شانِ جہانگیر عرف کابلی معشوقہ"

مصنف آخر ڈرامہ نگار ہی تھا مورخ نہ تھا اس لئے ڈرامہ میں بعض تاریخی غلطیاں رہ گئی تھیں تاہم بحیثیت مجموعی ڈرامہ ایسا برا بھی نہ تھا۔ البتہ پرجوش مصنف نے مغلوں کی عظمت و شوکت اور رنگینی پر جو دریا دلی صرف کی تھی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سات آٹھ قلعوں، پندرہ بیس جرنیلوں اور تیس چالیس پری جمال کنیزوں کے بغیر جہانگیر ٹہلنے پر بھی آمادہ نہ ہوتا تھا۔ مزید برآں اکبر کو تو خیر وہاں ہونا ہی چاہیے تھا مگر تمہید کے طور پر بابر اور ہمایوں، بیرم خاں اور کوئی میرزا کوکا بھی اسٹیج پر چلے آئے تھے۔ جہانگیر کے دربار میں استاد عرفی اور طالب آملی کا مشاعرہ بھی دکھایا گیا تھا کہ ؎

بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر!

شیپ شینک بڑی ذہین خاتون تھیں۔ مدتوں لندن کے ایک ممتاز تھیٹر میں کام کر چکی تھیں۔ ہم نے اپنے ڈرامے کا پس منظر، کاسٹ اور مطالبات ان کے سامنے رکھے تو بھونچکا سی رہ گئیں۔ دانتوں میں انگلی دباتے ہوئے بولیں۔ یہ ڈرامہ تو شہنشاہ جہانگیر کی ذاتی سرپرستی ہی میں کھیلا جا سکتا ہے۔ کاسٹ کی وضع قطع متعین کرنے کے لئے ہم نے مغلوں کی جو تصویریں پرانے کیلنڈروں میں سے کاٹ کر جمع کی تھیں ان سے بیچاری شیپ شینک کو یہی سمجھ میں نہ آتا کہ ان میں بابر کون ہے اور جہانگیر کون؟ کاسٹ کے لئے ملے جلے کردار اکھٹے کئے گئے تو ہر خاتون نور جہاں بننے پر مصر تھی۔ ریہرسل شروع ہوئی تو معلوم ہوا کہ کانونٹ سکولوں میں پڑھی ہوئی یہ بیبیاں ڈرامے کے پرشکوہ مکالمے ادا کرنے تو درکنار ٹھیک سے پڑھ بھی نہیں سکتیں۔ ماحصل یہ کہ ایک دن ہم جس نور جہاں کو گھیر گھار کر لاتے مکالموں کے خوف سے وہ دوسرے دن بھاگ جاتی۔ جہانگیر موجود، نور جہاں غائب۔ ایک نسبتاً قدامت پسند کہنے کی قدرے روشن خیال لڑکی درمیان میں ایسی بھی مل گئی تھی جو

اردو بے تکلف پڑھ بول سکتی تھی مگر اسے جہانگیر کا والہانہ انداز میں لپک لپک کر نور جہاں کی طرف پیش قدمی کرنا سخت ناگوار تھا۔ وہ صرف کسی ایسے مرنجاں مرنج جہانگیر کو برداشت کر سکتی تھی جو دربار لگانے کے بجائے بازار میں خوانچہ لگاتا ہو۔

خارجی موانع کے علاوہ رفتہ رفتہ داخلی شاخسانوں نے بھی سر اٹھانا شروع کیا۔ ایک ریسرچ سکالر نے اعتراض کیا کہ یہ جو لمبے چھ فٹ کا جہانگیر ٹہلنے کو چھوڑ دیا گیا ہے، فنی اعتبار سے لغو چیز ہے۔ فرشتہ کے بیان کے مطابق جہانگیر کا قد پانچ فٹ سے زیادہ نہ تھا ہمارے لئے یہ مشورہ بوجوہ ناقابلِ عمل تھا۔ پانچ فٹ کا جہانگیر دیکھ کر پوری قوم کے احساسات مجروح ہوتے تھے۔ پانچ فٹ کے جہانگیر کی عظمت بحال رکھنے کے لئے پونے پانچ پانچ فٹ کے مان سنگھ اور شائستہ خاں اور رخانی خاں کہاں سے پیدا کرتے؟

پورے میک اپ کے ساتھ ریہرسل ہو رہا تھا کہ اتفاقاً اس روز کرنل فردوسی تشریف لے آئے۔ کرنل صاحب کا نام تو کچھ اور تھا مگر ایران میں مدت تک رہنے نیز فارسی ادبیات سے گہرے شغف کے باعث دوستوں کے حلقے میں وہ کرنل فردوسی کے نام سے مشہور تھے۔ ریہرسل میں جب عرفی اور طالب آملی عصا ٹیکتے ہوئے اسٹیج پر نمودار ہوئے تو کرنل صاحب نے پوچھا:

"دوہری کمر والے یہ سفید ریش بزرگوار کون ہیں؟"

"ملک الشعرا استاد عرفی"

"ہائیں!" کرنل صاحب بیتاب ہو کر اچھل پڑے "یہ عرفی ہے؟ کیسا عرفی! ارے کونسا عرفی ہے یہ؟"

"جی! وہی طالب آملی والا عرفی" مصنف نے جواب دیا۔ "وہی۔ آمانِ سگاں کہ نہ کند رزق گدا را۔ والا عرفی۔"

"غالباً کرنل صاحب کو عرفی کی لمبی رومی کلاہ پسند نہیں آئی۔"

"فکر کا بات نہیں" مس شیپ شینک خرابی کا اندازہ کرتے ہوئے بولیں۔ "ہم اس کا ڈاڑھی اور لمبا کر دے گا۔"

"نہیں سمجھے!" کرنل فردوسی بڑے کرب کے ساتھ بولے۔ "ظالمو! یہ کیسا لبِ گور قسم کا عرفی گھڑ لائے ہو۔ ارے میاں! عرفی تو ایک روایت کے مطابق اڑتیس اور دوسری کے مطابق انتالیس برس کی عمر میں مر بھی چکا تھا!"

"مگر حضور سنئے تو" مصنف اپنی صفائی پیش کرنے لگا "غمِ جاناں و غمِ دوراں میں سے کسی چیز نے بیس ہی برس میں عرفی کی کمر دوہری اور بال سفید کر دیئے تھے۔"

"جی ہاں" ایک شاعر صاحب بولے۔ "خیال رہے کہ عرفی شاعر تھا فوج کا حوالدار میجر کالا خان نہ تھا کہ ستر برس کی عمر میں بھی تیر کی طرح سیدھا رہتا" "پھر یہ بھی ہے۔ ایک دوسرے ممبر نے مصرع اٹھایا "کہ شاعر جتنا غلط بنے اتنا ہی صحیح بنتا ہے؟" "فکر کا بات نہیں"۔ مس شیپ شینک کرنل فردوسی کے اعتراض کو سمجھتے ہوئے بولیں۔ "عرفی کا ڈاڑھی ہم شائستہ خاں کو لگا دیگا۔"

"ہاں! یہ ٹھیک رہے گا" کرنل صاحب نے اطمینان کا سانس لیا۔ "شائستہ خاں کا اس میں بگڑتا ہی کیا ہے۔ مگر عرفی کے معاملہ میں تاریخ کی صداقت مسخ ہوتی ہے۔ بھئی میں طہران کی نیشنل گیلری میں عرفی کی تصویر دیکھ چکا ہوں" کرنل صاحب بات کرتے کرتے اسٹیج پر چلے گئے اور عرفی بنے ہوئے کیپٹن خواجہ امین کو غالباً پہچان کر افسرانہ تحکم کے ساتھ بولے "عرفی ڈاڑھی کے بغیر ہوگا اور آدمیوں کی طرح سیدھا چلے گا — اٹن شن!" — اور بیچارہ عرفی ایڑی سے ایڑی ملا کر اٹن شن کھڑا ہو گیا۔

مس شیپ شینک عرفی کی لمبی سفید ڈاڑھی نوچ کر شائستہ خاں کے لگا رہی تھیں کہ گرد و پیش کے "ابن بطوطہ" شیخ مصباح الدین، مولوی عبدالحلیم شرر کا کوئی ناول بغل میں دبائے اندر داخل ہوئے اور بوڑھے شائستہ خاں کو دیکھتے ہی تڑپ اٹھے۔ پہلے رو رو کے ایک نعرۂ تکبیر بلند کیا، پھر گرج کر بولے:

"خبردار! شائستہ خاں کے ساتھ یہ ناشائستگی؟ فاتح گولکنڈہ کے ساتھ یہ مذاق؟ غازی شائستہ خاں وہ بطلِ جلیل اور مجاہدِ کبیر تھا کہ مغلِ اعظم محی الدین اورنگ زیب عالمگیر بھی اس کی تلوار کی قسم کھاتا تھا۔"

اس بھبک پر سہم کر جب لوگ قدرے سنبھلے تو کسی نے ڈرتے ڈرتے کہا:

"مگر میاں صاحب! شائستہ خاں بوڑھا بھی تو ہو سکتا ہے"

"نہیں۔ ہرگز نہیں" میاں مصباح الدین کڑک کر بولے۔ "مردانِ غازی مر سکتے ہیں، بوڑھے نہیں ہو سکتے۔"

"کیوں نہیں ہو سکتے؟"

"بس نہیں ہو سکتے، کہہ تو دیا"

اس پر مس شیپ شینک نے شائستہ خاں کی ڈاڑھی جڑ سے اکھاڑ کر

جہانگیر کے خزانچی لالہ لوبت رائے کی ٹھوڑی پر جما دی۔ یہ جھگڑا پوری طرح طے نہیں ہوا تھا کہ کرنل فردوسی نے پائپ سلگاتے ہوئے ایک نیا شگوفہ یہ چھوڑ دیا کہ عرفی اور طالب آملی دونوں بیک وقت جہانگیر کے دربار میں کبھی یکجا نہیں رہے۔ ان کے علم کے مطابق دونوں شاعروں میں سے کوئی ایک جہانگیر کے عالم شہزادگی ہی میں مرچکا تھا۔ اب یہاں عرفی و طالب کو یکجا دیکھ کر کرنل صاحب کی خفگی کا یہ عالم تھا کہ اگر انہیں اجازت دی جاتی تو وہ عرفی و طالب میں سے کسی ایک کو اسی وقت گولی سے اڑا دیتے۔ بذات خود یہ کوئی ناقابل حل دشواری نہ تھی۔ مس شیپ شینک نے نہایت ٹھیک کہا تھا کہ عرفی یا طالب یا دونوں کے نہ ہونے سے جہانگیر کی حکومت پر کوئی اثر نہیں پڑتا لیکن اگر شاعر دربار کے بغیر دربار سجتا ہی نہیں، تو قرعہ اندازی کر لو۔ مگر اتنے میں ادھر عرفی اور طالب کے حامیوں کے جذبات اس قدر مشتعل ہو چکے تھے کہ اب یہ سوال عرفی و طالب میں سے کسی ایک شاعر کے انتخاب کا سوال یا ڈرامے کی کسی انتظامی سہولت یا ضرورت کا معاملہ نہیں رہ گیا تھا بلکہ مغلوں کی پوری تہذیب و ثقافت کا مسئلہ بن چکا تھا۔ رفتہ رفتہ فریقین کے جذبات اتنے کھول اٹھے کہ خود ظل ہمایونی عالم پناہ شہنشاہ جہانگیر یعنی مسٹر الطاف لودھی تاج سلطانی اور چغہ خسروی کو ایک طرف ٹیک کر اس بحث میں کود گئے جس کا خلاصہ یہ نکلا کہ اس صحبت میں ڈرامہ کھیلنے کا فیصلہ ہی ترک کر دیا گیا۔

ڈرامہ کی ناکامی کا ہمارے گروپ پر نہایت گہرا اثر پڑا۔ ناکامی کی تمام تر ذمہ داری اگرچہ خود ہمیں پر عائد ہوتی تھی مگر چونکہ اپنے آپ کو مطعون کرنے کی بہ نسبت دوسروں کو الزام دینا ہمیشہ آسان ہوتا ہے لہذا ہم لوگ کلب سے بیزار ہو گئے۔ اس واقعہ کے بعد ہم اس قطعی نتیجہ پر پہنچ گئے کہ غلامی کے زمانہ میں اندر ہی اندر ہماری قوم کے صاف دو ٹکڑے ہو چکے ہیں۔ ایک یہ لوگ جو کلبوں اور جمخانوں میں پروان چڑھتے رہے۔ ایک ہم لوگ جو گلیوں اور کوچوں میں گھومتے پھرے، صدیوں کے بعد دونوں ٹکڑے اب اس کلب میں جوڑے جا رہے تھے مگر اے کاش ذہنوں کی مسافت میلوں میں ناپی جا سکتی! استاد عرفی اور طالب آملی میں سے کوئی ایک یقیناً بہت پہلے مرچکا تھا۔

بڑے کلب سے نکل کر گروپ نے ایک نئے کلب کی بنیاد رکھی "آزاد کلب"۔ آرزو یہ تھی کہ نئے کلب میں اپنے قومی و تہذیبی نقوش کو زیادہ سے زیادہ اجاگر کیا جائے۔ مساوات و آزادی اس کلب کے بنیادی پتھر تھے۔ مگر چونکہ اس سے پہلے گروپ کو کسی چیز کی بنیاد رکھنے کا کوئی تجربہ نہ تھا لہذا آزاد کلب کی بنیاد آزادی سے زیادہ بے قاعدگی پر جا پڑی۔ آزاد کلب کی رکنیت اور یتیم خانہ ترجمان الاسلام کی رکنیت میں کوئی فرق نہ تھا۔ ظاہر ہے اس قسم کا کلب یا چلنے میں نہیں آتا یا سمجھنے میں نہیں آتا۔

کلب کا پورا ڈھانچہ امداد باہمی کے اصولوں پر کھڑا کیا گیا تھا۔ ممبروں کو چندہ ادا کرنے سے پہلے اپنے حصہ کی کرسی "ادا" کرنا پڑتی تھی بلکہ ایک مدت تک تو کرسی کے علاوہ کسی نوع کا کوئی چندہ تھا ہی نہیں۔ کلب کی اپنی عمارت ہونے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ ہم اس سے پہلے کئی کلبوں کا حشر دیکھ چکے تھے کہ جب ان کی اپنی عمارت بن گئی تو خود کلب ٹوٹ گئے۔ یوں بھی آزاد کلب کو کسی مقام کا پابند کر دینا چہ معنی دارد۔ چنانچہ ابتدا میں کلب کو کبھی شہر کے ایک اسکول میں رکھا گیا کبھی دوسرے میں۔ جب تقریباً تمام اساتذہ اور طلباء سے کلب کے شاعروں، فن کاروں کے تعلقات کشیدہ ہو گئے تو آزاد کلب کو ایک افغان ہوٹل سے ملحق سفید زمین کے ایک کشادہ قطعہ میں لاکر اس طرح چھوڑ دیا گیا کہ

پڑیئے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیماردار
اور اگر مر جایئے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

اتفاق دیکھئے کہ کلب کی جڑیں اسی زمین میں سرسبز ہوئیں۔ قبولیت کا وہ دور نہیں آگر شروع ہوا جو شروع ہو کر پھر تھمنے میں نہیں آتا۔ چائے، قہوہ، شربت وغیرہ طلب کرنے پر افغان ہوٹل سے نقد و ادھار آجاتے تھے۔ کرسیاں افغان ہوٹل کا زندہ دل اور شاعر مزاج مالک راتھا خان رانجھا رات کو سمیٹ کر ہوٹل میں رکھ دیتا تھا۔ کھیل کود سے ممبروں کو کوئی خاص رغبت نہ تھی۔ وہ یہاں محض بیٹھنے اور خالص گپ لڑانے کے لئے آتے تھے۔ تاہم بیٹھ کر کھیلے جا سکنے والے بعض معروف کھیلوں کا اہتمام بھی موجود تھا۔ افغان ہوٹل کا مستعد ریڈیو ہوٹل کے گاہکوں، سڑک کے راہگیروں اور آزاد کلب کے ممبروں کی خدمت میں ہمہ وقت مصروف تھا اور کیا چاہتا ہے دیوانے!

رکنیت پر کوئی خاص قید نہ تھی۔ صلائے عام تھی یارانِ نکتہ داں کیلئے۔ چند ہی دنوں میں آزاد کلب کی جغرافیائی اور معنوی سرحدیں افغان ہوٹل سے جا ملیں۔ بندہ و صاحب و محتاج و غنی ایک ہو گئے۔ بذاتِ خود

یہ بری بات نہ تھی مگر مرزا ایسے بُرے طریقے سے ہوئی کہ دیکھنے والے تو دیکھنے والے خود ممبروں کو معلوم نہ ہو سکتا تھا کہ یہ آزاد کلب چل رہا ہے یا افغان ہوٹل۔ "بندہ و صاحب و محتاج و غنی ایک ہوئے" ہو سکتے تھے، باہم گتھم گتھا ہو گئے تھے۔ شاعروں کی منڈلی کسی میز پر میر تقی میر کو لیئے بیٹھی ہے کہ کبھی کے کسی موٹے تازے بیوپاری نے اپنی کا کنستر لا کر عین میر تقی میر کے سر پہ رکھ دیا۔ شعرا کو گھی سے، گھی والے کو میر تقی میر سے کوئی واسطہ نہیں مگر کلب سے دونوں کا واسطہ ہے۔ شامت کا مارا کوئی افسر اپنے ادب و تمدن کے عشق میں گرفتار آزاد کلب میں آ نکلتا تو راشن کے ڈپو ہولڈروں، عام دکانداروں اور شہر کے پیشہ ور خوش آمدیوں کا ایک ہجوم اس غریب کو یوں گھیر لیتا جیسے بچوں کی کسی بستی میں کوئی ریچھ والا آ نکلا ہو۔

یہ بات نہ تھی کہ آزاد کلب شہر کے معززین کی سرپرستی سے یکسر محروم تھا۔ ہاں یہ بات ضرور تھی کہ جو شرفا ہمارے حصے میں آئے تھے۔ ان میں سے بیشتر کچھ اس موڑ پر کھڑے تھے جہاں دولت و شرافت کے راستے الگ ہو جاتے ہیں اور ذہن و فکر کی بالیدگی راستہ ہی چھوڑ دیتی ہے۔ ان میں سے بعض رئیس زادوں کی قسمت پہ دل اول ہمیں رشک آتا کہ دیکھو منہ میں چاندی کا چمچہ لے کر پیدا ہو گئے ہیں اور بیٹھے کیا مزے کر رہے ہیں۔ قریب سے دیکھا تو محسوس ہوا کہ ان سے زیادہ قابلِ رحم حالت شاید کسی کی نہ ہو۔ انہیں سرے سے یہی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ زندگی کے بے معنی خلا کو پورا کیونکر کیا جائے؟ جو قدرے ہوشمند تھے انہوں نے سیاست کا چسکا پال رکھا تھا۔ بعض عالی ظرف انتخابات کے معرکے جیتنے کے لیئے نہیں ہارنے کے لیئے لڑتے تھے۔ وزارت بڑے کلب میں تھی، جمہوریت آزاد کلب میں۔ جلسہ کہیں بھی ہو نعرے کی گونج یہیں سے پھوٹتی تھی۔

ہمارا گروپ اس صورت حال پر سخت پریشان تھا۔ ہم جس مقام کو ایک مجلسی و تہذیبی مرکز بنانے کے خواب دیکھ رہے تھے وہ کہیں چونڈی کھسیٹے کی بیٹھک بن گیا تھا اور کہیں اوبہ بازار۔ ذرا سا بیٹھے دیکھتے رہیے چمڑے ہڈی وغیرہ کے تاجر مول تول کر رہے ہیں، نمک ہلدی کے بیوپاری نمک ہلدی کے نمونے بھی ساتھ اٹھا لائے تھے۔ لباس، وضع قطع، تہذیب وغیرہ سب کا دامن تار تار ہو کر کلب میں بکھرا پڑا تھا۔ اردو شاعری میں جس چاک گریباں کا ذکر آیا ہے اس کی بھی ایک صورت ہوتی ہے۔ یہاں وہ صورت بھی نہ تھی۔ آزاد کلب میں لیڈری کی جا سکتی تھی، بازار سے سودا سلف خریدا جا سکتا تھا، لیکن نکھری ہوئی مجلس زندگی کے ملنے کا کوئی امکان نہ تھا۔ زندگی خود زندگی میں گھٹ کر رہ گئی تھی۔

سب سے برا حال شعرائے کرام کا تھا۔ شعر سے زیادہ ان کا اپنا قافیہ تنگ تھا۔ غزل پہ غزل ہو رہی ہے مگر کلب میں سننے والا کوئی نہیں، سن کر سمجھنے والا کوئی نہیں، سمجھ کر داد دینے والا کوئی نہیں۔ الگ تھلگ ہو کر شعر بازی کرتے ہیں تو دوسرے لوگ کلب کے اس بیجا و غلط استعمال پر معترض ہوتے ہیں، بعض برملا ہنستے بھی ہیں۔ ادھر یہ آرزو کہ شام کو "مطلع" شروع ہو تو "مقطع" صبح کی خبر لائے۔ ادھر یہ قصد کہ غزل کا سانس مطلع ہی میں گھونٹ دیا جائے۔ وہاں نمونہ کلام سے زیادہ نمونۂ اجناس کی مانگ تھی۔

لپٹن کمپنی والے ایک زمانہ میں اپنے برانڈ کے فروغ کے لیئے لوگوں کو مفت چائے پلایا کرتے تھے۔ آزاد کلب میں ذوقِ سخن کا راستہ صاف کرنے کی غرض سے ہم نے ایک مشاعرے کا بندوبست کیا جو بدقسمتی سے بڑے کلب کے ڈرامے سے بھی زیادہ ناکام رہا۔ جوش و خروش کی کمی نہ تھی۔ جوش و خروش اگر کم ہوتا تو مشاعرہ شاید کامیاب ہو جاتا۔ کلب کے عام ممبروں نے مشاعرہ کو کسی میلے پر ہونے والا مجرا یا اس کے لگ بھگ کوئی تماشہ سمجھ لیا۔ وہ نہ صرف خود جوق در جوق تشریف لائے بلکہ محلے میں سے دوستوں، رشتہ داروں کو بھی فوج در فوج پکڑ لائے۔ یہ بظاہر حوصلہ افزا علامت تھی مگر دراصل یہ اس قسم کی تعمیر تھی جس میں خرابی کی صورت مضمر ہوتی ہے جمہوریت کی طرح مشاعرہ بھی ان پڑھ لوگوں کے بس کی چیز نہیں۔ آپ مبالغہ سمجھیں گے مگر میں واقعہ بیان کر رہا ہوں کہ جس وقت سیکریٹری نے مشاعرہ کی کارروائی شروع کرنے کی غرض سے مشاعرہ گاہ پر جائزہ لینے والی ایک نظر ڈالی تو سرسری اندازے کے مطابق سامعین اور سامعین کے حقوں کی تعداد تقریباً برابر تھی۔ شعرا کی گنتی بھی اگرچہ بہت کافی تھی لیکن ان بٹیروں سے کم ہی تھی جنکو بٹیر بازی کے دلدادہ معززین مٹھی میں دبائے ہوئے مشاعرہ سننے چلے آئے تھے۔ شعرا ان سامعین کو دیکھ کر ہی لرز اٹھے لیکن حضرتِ داغ کی پیروی میں جہاں بیٹھ گئے بیٹھ گئے۔ یہاں تک پھر بھی غنیمت تھا۔ زیادہ سے زیادہ یہی احتمال تھا کہ سامعین ڈھنگ کی داد نہیں دیں گے مگر کم از کم یہ اطمینان تو تھا کہ وہ کلام پہ سے نشتر گربہ وغیرہ بھی نہیں پکڑ سکیں گے۔ لیکن مشاعرہ شروع ہوتے پر پتہ چلا معلوم سامعین

(باقی صفحہ ۵۸ پر)

انسانی نشو و نما کے اسباب ۔ بقیہ صفحہ ۳۰

بقیہ صفحہ ۳۰

تازہ ہوتے رہیں۔ ان کی تقویت ایک اور بُعد سے ہوسکتی ہے۔ اور وہ ہے نصب العین قائم کرنا اور ان کے حصول کی کوشش کرنا۔ یہ نصب العین زیادہ غیر محدود نہیں ہونے چاہئیں۔ مثلاً ملی ارتقاء، اسلامی احیاء یا عالمگیر برادری۔ یہ سب اسقدر غیر محدود اور تجریدی قسم کے ہیں کہ ان سے شدید جذبات نہیں پیدا ہوسکتے۔ ان پر نہ زیادہ فلسفہ آرائی کارآمد ہے نہ ان کی تلقین نہ ہدایت، کیونکہ یہ روح کو ابھا نہیں سکتے۔ قومی ضروریات ہی وقتاً فوقتاً مقاصد کو جنم دیتی رہتی ہیں۔ اور سب سے زیادہ شدید ضرورتیں وہ بہترین مقاصد پیدا کرتی ہیں جو کسی قوم کو اتحاد کی ترغیب دلا سکتے ہیں۔

مقاصد اس وقت تک کچھ نہیں جب تک وہ روح پر حاوی ہو کر عمل کی تحریک نہ دلائیں۔ علامات، نعرے، بول "بے اندازہ قوت کے مالک ہیں اور خون کی حرارت سے بھی زیادہ قوی ہیں" اگر غالب اقلیت انہیں احتیاط اور سوجھ بوجھ سے استعمال کرے اور یہ اس کے ہاتھ سے نکل کر دوسرے فرقوں اور پارٹیوں کا آلۂ کار نہ بن جائیں تو یہ عمل کے قوی محرکات ثابت ہوں گے۔ اور قومی مقاصد کے حصول میں مدد دینگے۔

اتحاد کی تیسری بُعد پاکیزگی دل ہے یعنی طبقاتی اور قبائلی امتیازات کے زہریلے عناصر سے آزادی۔ اسلامی تمدن پہلا تمدن ہے جسے یہ شرف حاصل ہے کہ اس نے اس بُعد کا ادراک کرکے رنگ و خون اور نام و نسب کے امتیازات کو ملیا میٹ کر دیا۔ اتحاد کی ایک اور بُعد افراد اور قوم کے چھوٹے چھوٹے گروہوں کے مابین رضامندانہ تعاون ہے۔ ڈارون کا یہ خیال غلط تھا کہ صرف کشمکش حیات ہی ارتقا کا واحد باعث ہے۔ یہ عمل ارتقا کا ایک عنصر ضرور ہے۔ لیکن ایک اور اتنا ہی اہم عنصر تعاون ہے جس کے معنی ہیں ذاتی مفاد کو دوسروں کے مفاد سے وابستہ کرنا اور برضا و رغبت ایک مشترکہ جد و جہد میں شریک ہونا۔ صرف وہی قومیں برقرار رہ سکتی ہیں جو سب سے زیادہ شہری اطاعت سے کام لیں اور بہترین ادارے قائم کریں جن میں باہمی تعاون سے کام کیا جا سکے اور ان کے اراکین میں زیادہ سے زیادہ جذبۂ ایثار پیدا ہو۔ شہروں میں رضامندانہ تعاون نسبتاً آسان ہے۔ تجارت اور صنعت کے ساتھ یہ بھی ترقی کرتی ہے۔ لیکن صرف یہی کافی نہیں۔ دیہات کو بھی اس کے دائرہ میں شامل کرنا چاہیئے۔ اجتماعی ارتقا کی موجودہ حالت میں دیہات کے سلسلہ میں جد و جہد بھی ارتقا کے لئے اتنی ہی ضروری ہے۔ اجارہ داروں کا مقابلہ کرنے کے لئے صنعت کاروں، صارفین اور بیوپاریوں میں تعاون لازمی ہے۔

جہاں اتحاد کا تعلق قومی وحدت سے ہے وہاں جمعیت کا تعلق کثرت سے ہے لیکن ایک خاص رنگ میں۔ اس کے معنی ہیں کسی جماعت کے اراکین میں مفادات، ہمدردی، مقاصد اور تعلقات کی ہم آہنگی اور جماعت کے ساتھ وفاداری کا جذبہ جو مختلف مشترکہ احساسات کی شکل میں ظاہر ہو جس جماعت میں جمعیت نہ ہو اس کے جنگ میں ہار جانے کا سب سے زیادہ اندیشہ ہوتا ہے گر جنگ میں یگانگت بھی پوری یگانگت نہیں۔ کیونکہ جہاں جنگ ساری جماعت میں اطاعت، ضبط، خدمت اور ایثار کو ترقی دیتی ہے وہاں یہ بالاکثر دوسرے لوگوں کے حقوق اور جماعت میں افراد کی حیات اور شخصیت کو نظر انداز کرنے کا باعث بھی ہوتی ہے۔ اس قسم کی مکمل یگانگت جو اسلام کے ابتدائی زمانہ میں ظہور پذیر ہوئی تھی۔ ان حقوق کو نہ امن کے زمانہ میں نظرانداز کرتی ہے، نہ جنگ کے زمانہ میں۔

استقلال کے معنی ہیں ایک جماعت اور ارد گرد کی دوسری جماعتوں کے مابین قوتوں کا توازن جو کئی شرائط پر موقوف ہے۔ یونانی تہذیب، رومن سلطنت اور اسلامی خلافت کے زوال سے جو سبق حاصل ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ کسی قوم کو مختلف اکائیوں میں نہیں بٹ جانا چاہئے۔ نہیں ایک کمزور مرکز نے ڈھیلے ڈھالے طور پر آپس میں جوڑ رکھا ہو۔ اور موجودہ فرانس سے یہ سبق حاصل ہوتا ہے کہ جس ملک میں حد سے زیادہ مرکز بیت ہو اُسے کبھی استقلال نہیں ہوسکتا۔ زیادہ تغیرات استقلال کے منافی ہیں۔ ایسی مملکت جو ایک جمہوریہ بن سکے لیکن اتنی خوش قسمت نہ ہو کہ وہ برطانیہ کی طرح ایک جمہوری روایت قائم کر لے۔ اس کے لئے امریکی وضع کا دستور یہ غالباً سب سے زیادہ استقلال کا باعث ہوگا۔ جس میں غیر سیاسی عدلیہ کا اہتمام کیا گیا ہو۔

استقلال کی دوسری شرط عام خوشحالی پیدا کرنا ہے تاکہ قوم کے مختلف طبقوں میں مناقشت نہ رہے یعنی نہ امیر زیادہ امیر ہوں نہ غریب زیادہ غریب، اہل امریکہ پر اشتراکیت کا کوئی اثر نہیں جس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ وہاں کم سے کم اور زیادہ سے زیادہ تنخواہوں کا فرق تمام ملکوں سے کم ہے۔ غالباً

۱۱ اور ۸ کا فرق۔ حالانکہ روس میں بھی، اگر ہماری معلومات درست ہیں، ۱۱ اور ۲۰ کا فرق ہے۔

تیسری شرط یہ ہے کہ آبادی قابو میں رہے تاکہ آبادی اور غذائی پیداوار میں توازن قائم رہے۔ آخری شرط یہ ہے کہ صحت، کام، کھیل کود اور آزادانہ اقدام کا مناسب اہتمام ہو۔ سچ پوچھیئے تو استقلال اسی ملک کو نصیب ہوتا ہے جس میں کوئی بھوکا نہ رہے، جہاں بیمار کم ہوں، کام خوشگوار مگر زیادہ نہ ہو، ہمدردی عام ہو اور انسانی خوف سے آزاد ہوکر آنکھوں کا نور اور دل کا سکون حاصل کریں۔

مساوات، حریت اور کاروبار میں آزادی تمام تین اعلیٰ درجے کے اجتماعی عوامل ہیں۔ جو ارتقا کا باعث ہیں۔ لیکن ان میں مساوات سے ٹکرا جانے کا میلان پایا جاتا ہے۔ اسلئے انہیں مناسب حدود میں رکھنا ضروری ہے۔ کاروبار میں آزادی وسیع پیمانہ پر صنعت و تجارت کا باعث ہوتی ہے۔ اور ترقی کرتے کرتے اجارہ داری اور نیم اجارہ داری کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ جس کے سبب چھوٹے پیمانہ کی کاروباری کوششیں محو ہو جاتی ہیں۔ اور امیروں غریبوں کے مابین خلیج زیادہ فراخ ہو جاتی ہے۔ جیسا کہ امریکہ میں ہیئت جدیدہ (NEW DEAL) سے پہلے تھا۔ اس خلیج کو صرف اس طرح پاٹا جا سکتا ہے کہ کاروبار کی آزادی کو مناسب حدود میں رکھا جائے۔

آزادی بھی مساوات کے ساتھ متصادم ہوتی ہے جب یہ جرائم مثلاً چوری، قتل اور چور بازاری وغیرہ کی طرف میلان پیدا کرتی ہے۔ اس لئے اس کو بھی مناسب اخلاقی حدود میں رکھنے کی ضرورت ہے۔

اجتماعی ارتقا کی آخری شرط جسے افلاطون نے سب سے پہلے محسوس کیا تھا منصوبہ بندی ہے۔ خود افلاطون نے جو منصوبہ پیش کیا تھا وہ ناقابل عمل ہونے کی وجہ سے کامیاب نہ ہو سکا۔ جامع منصوبہ بندی ہمارے سائنسی زمانہ ہی کی دریافت ہے۔ اٹھارویں صدی عیسوی میں سائنس نے بڑی تیزی سے ترقی کی۔ اس کی دریافتوں کے استعمال نے انسان کے مادی لوازمات میں بے حد تبدیلی پیدا کر دی۔ اس سے یہ خیال پیدا ہوا کہ انسانی ترقی کی کوئی انتہا نہیں۔ ڈارون کے نظریۂ ارتقا نے اس عقیدہ کو بہت تقویت پہنچائی۔ چنانچہ یہ فرض کر لیا گیا کہ حیات برابر فوائد حاصل کرتے ہوئے ترقی پاتی اور زیادہ پیچیدگی اور اکملیت کی طرف بڑھتی ہے۔ لیکن حال میں زندگی کی پیچیدگیوں کے باعث اقتصادی دوروں، قوموں میں بڑھتی ہوئی کشمکش اور اسلئے عالمگیر جنگوں کے ظہور اور ایٹم اور ہیڈروجن بموں کی تباہی و بربادی کے امکانات نے جو سائنس کی گرجیہ با ترقی کے باعث رونما ہوئے ہیں۔ نوعِ انسان کے برابر بلند سے بلند تر مدارج ارتقا کرنے کے عقیدہ کو پاش پاش کر دیا ہے۔ اسلئے اب یہ عقیدہ زیادہ قوت پکڑتا جا رہا ہے کہ اجتماعی ارتقا صرف جانی بوجھی منصوبہ بندی ہی سے ممکن ہے۔ اور اس کی عدم موجودگی سے ممکن ہے تمام نوعِ انسان تباہ و برباد ہو جائے۔

واضح رہے کہ محض مادی و اجتماعی بہتری کے لئے منصوبہ بندی کافی نہیں کیونکہ اس کا تعلق صرف خارجی ذرائع سے ہے۔ اس سے بھی زیادہ جو بات ضروری ہے وہ روحانی ارتقا کے لئے منصوبہ بندی ہے۔ کیونکہ اس کا تعلق مقاصد سے ہے۔ کوئی ارتقا بھی اس وقت تک صحیح معنوں میں عظیم نہیں ہو سکتا جب تک یہ انسانوں کو ذرائع سے مقاصد تک نہ لے جائے۔ اور وہ مقاصد برابر بلند سے بلند تر نہ ہوتے چلے جائیں۔

○

ر۔ خ

نقد و نظر

نقدِ اقبال

از جناب میکش اکبر آبادی
صفحات ۲۱۶، قیمت تین روپے
ملنے کے پتے:
۱۔ مصنف، میوہ کٹرہ۔ آگرہ
۲۔ حکیم مرزا احسان علی بیگ۔ نرنکاری بازار ۱۴۱ راولپنڈی

علامہ اقبال کے فلسفہ اور نظریات کے بارہ میں بہت کچھ کہا گیا ہے۔ جہاں تک ان کے کلام اور افکار کی تشریح کا تعلق ہے۔ اس کا حق تو کافی حد تک ادا ہو چکا ہے۔ مگر ابھی تحقیق اور تنقید کا حق ادا ہونا باقی ہے۔ ظاہر ہے کہ اقبال کا فلسفہ صدہا سال پر پھیلے ہوئے طویل سلسلۂ فکر کی ایک کڑی ہے۔ جو مشرق و مغرب کے بیشمار مفکروں کے نظریات، گوناگوں تحریکات اور مکاتب فکر پر مشتمل ہے۔ اسلئے خواہ اقبال کے کسی نظریہ یا نکتہ پر نظر ڈالی جائے۔ اس تمام سرمایۂ فکر کی طرف رجوع ناگزیر ہے۔ اور صرف اس جامع و ہمہ گیر مطالعہ اور محققانہ چھان بین ہی سے ہم زیادہ صحیح اور معقول نتائج تک پہنچ سکتے ہیں۔

زیر نظر کتاب میں یہی روش اختیار کی گئی ہے۔ اور اس لحاظ سے یہ یقیناً مستثنیٰ حیثیت رکھتی ہے۔ مصنف نے اقبال کی خودی کا جائزہ لیتے ہوئے اپنی خودی کو فراموش نہیں کیا۔ اور ان کے نظریات اور اقوال کو اس وسیع ذخیرۂ علم و حکمت کی روشنی میں پرکھا ہے جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے۔ یہ ایک بڑی کٹھن مہم تھی جسے مصنف نے بڑی کامیابی سے سر کیا ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ اقبال کے ارشادات پر مدلل بحث بھی کی ہے۔ ان کے نتائج بالعموم صحیح ہیں۔ مثلاً انکے تحقیق پر ابتدا سے صوفیوں نے بالاتفاق زور دیا ہے۔ بقا باللہ کے معنی بھی دراصل تحقیق خودی کے ہیں۔ خودی کا سارا فلسفہ "من عرف نفسہ فقد عرف ربہ" میں جمع ہے۔ اور ایلیاندرو بوزانی نے تو مثنوی مولانا روم سے متعدد مثالیں پیش کر کے اس حقیقت کی توضیح کی ہے کہ صوفیائے کرام کی فنا محض اصطلاحی حد تک فنا ہے۔ اور عدم کا مفہوم بھی اس کے عام مفہوم سے بالکل مختلف ہے۔ ہماری رائے میں اقبال کے فکر و فلسفہ کی اکثر پیچیدگیوں کا بنیادی سبب ان کی اصطلاحات۔ خودی، زندگی، عمل وغیرہ کی دوروئی ہے۔ اگر ان کا مفہوم ٹھیک ٹھیک متعین کر دیا جائے۔ تو الجھنیں یکلخت دور ہو جائیں گی۔ چنانچہ خودی کی بجائے مسلمان خودی یعنی روح، زندگی کی بجائے روحانی زندگی اور عمل کی بجائے عرفان ملکہ یا ان سے عقائد کی نوعیت بالکل واضح ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد دوسری گتھیاں جن کا دارومدار ان اصطلاحات پر ہے خود بخود سلجھ جاتی ہیں مثلاً تصوف، اشتراکیت، نطشے، مسولینی، تاتاری کا خواب وغیرہ کے سلسلہ میں اقتباسات۔ اگر اقبال تمام تر روح، ایمان اور دین کے قائل ہیں۔ تو ظاہر ہے کہ وہ رومی کو اپنا مرشد کیوں قرار دیتے ہیں، ان دونوں کی فعالیت اور حرکیت نقطۂ ایمان ہی کی تفسیر ہے، ان کا مقصود منزل کبریا ہے اور جس طاقت کے وہ قائل ہیں حق یا جلال یعنی روح کی طاقت ہے۔ الیساندرو بوزانی نے درست کہا ہے کہ اقبال حیات برائے حیات اور عمل برائے عمل کے قائل نہیں۔ وہ روح اور صرف روح کے لئے ہیں۔

غرض زیر تبصرہ کتاب اقبال کے افکار و پیام کے سلسلہ میں خاص اہمیت رکھتی ہے، بر بعض نہایت دشوار مرحلوں میں ہمارے لئے مشعل راہ اور عام معلومات کا ایک بیش بہا ذخیرہ ہے۔

نام و ننگ

از عبدالمجید بھٹی۔ صفحات ۱۴۰۔
ناشر: مکتبۂ جدید لمیٹڈ، لاہور۔

یہ شاعر، فارسی کی شیرینی اور ہندی رس کا دھنی اپنے سینے میں ایک لطیف سند دل اور زبان میں ایک عجیب مٹھاس رکھتا ہے۔ تعجب ہوتا ہے کہ وہ بیک وقت ان دونوں کی لطافتوں کو کیسے اپنا لیتا ہے۔ کیونکہ اگر شاعر فارسی کی پُرکاری میں کھو جائے تو وہ ہندی کی سادگی کو بہت کم پا سکتا ہے۔ عبدالمجید بھٹی ایک کے سہانے سندر بول بھی اسی نرمی و درد سے بول سکتا ہے جتنے دوسری کے شگفتہ و رنگین الفاظ۔ ہندی کے درد بیلے، سُریلے بولوں کے ساتھ اس نے ہندی دھنوں، ہندی سموں اور ہندی رسموں، ریتوں کو بھی بڑے سبھاؤ سے اپنایا ہے۔ مثلاً:

جیون پگ پر پہلے ڈگ میں دیکھ کے اپنی ٹھور
ہاتھ تھام کے چلی باوری ہاتھ پرائے ڈور

کیا اس میں ہندی دوہوں کا وہ کومل رس نہیں ہے جس نے سکڑوں ہی دلوں کو لبھایا ہے؟ بھٹی نے چھوٹی چھوٹی، لمبی لمبی بحروں، ان کے نت نئے گٹھ بندھن سے کہیں کہیں آزاد ایک عجیب گنگا جمنی بلکہ رت رنگا لہراؤ پیدا کیا ہے جس میں فن کی پکار رہ رہ کر بولوں کے انوکھے جادو سے مل کر نس نس کو جگاتی اور روم روم کو سہلاتی نظر آتی ہے۔

بھٹی کا موقلم نت نئی تصویریں بنانے میں ماہر ہے اور اس کے چھوٹے چھوٹے مصرعے ایک عجیب ترتیل کے ساتھ ایک چلتی پھرتی تصویر بنا دیتے ہیں جن میں حواس کا چنچل پن اور نکھار بہت نمایاں ہوتا ہے ان خصوصیات کے پیش نظر ان کا کلام خصوصی توجہ اور مطالعہ کا مستحق ہے۔ ابتدا میں ابوالاثر حفیظ کا نہایت دلچسپ اور چلبلا مقدمہ اس نئی گھرنت کے شاعر کو بہت پیارے اور کرارے انداز میں پیش کرتا ہے جس کی نظمیں ہمارے لئے سوچ اور حظ کے کتنے ہی پُر کیف لمحے مہیا کرتی ہیں۔

○

لہو اور قالین

از میرزا ادیب — صفحات ۲۱۸
قیمت: تین روپے
ناشر: مکتبۂ اردو۔ لاہور۔

ایک انسان اور فن کار دونوں کی حیثیت سے میرزا ادیب کی نمایاں خصوصیت میانہ روی ہے۔ انہیں "صحرا نورد کے خطوط" کی رومانوی دنیا سے نکلے ہوئے کتنا ہی عرصہ گذر چکا ہے۔ دوسری طرف ان کی متانت زندگی کے ہنگامہ آفریں اور گھناؤنے پہلوؤں سے بھی گریز کرتی ہے۔ یہی اعتدال پسندی ان کے افسانوں کی بھی روح رواں ہے۔ وہ جو واقعات یا کردار پیش کرتے ہیں۔ تمام تر اسی سانچے میں ڈھلے ہوئے ہیں۔ ان میں ایک سکون پرور ٹھہراؤ، ایک دل خوش کن وضعداری اور کلاسیکل توازن ہے۔ جو بعض جدید سنسنی خیز افسانوں کے برعکس طبیعت پر ایک خوشگوار اثر چھوڑتا ہے۔ مصنف نے ان ڈراموں کو "تمثیل" قرار دیا ہے۔ اور ان میں واقعی تفریحی قصوں کا انداز نمایاں ہے

○

کلیاتِ ولی

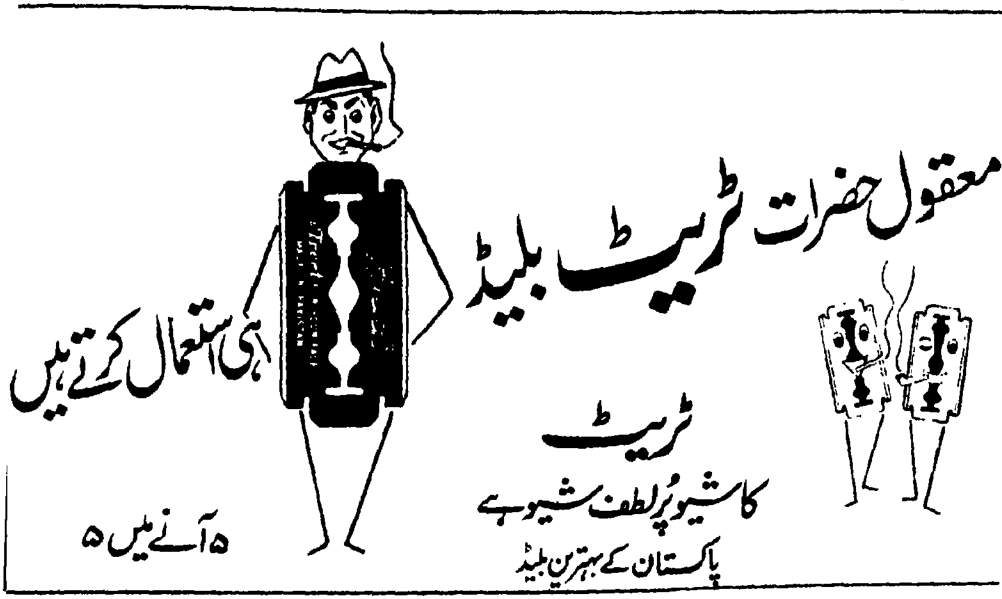
(تیسرا اڈیشن)

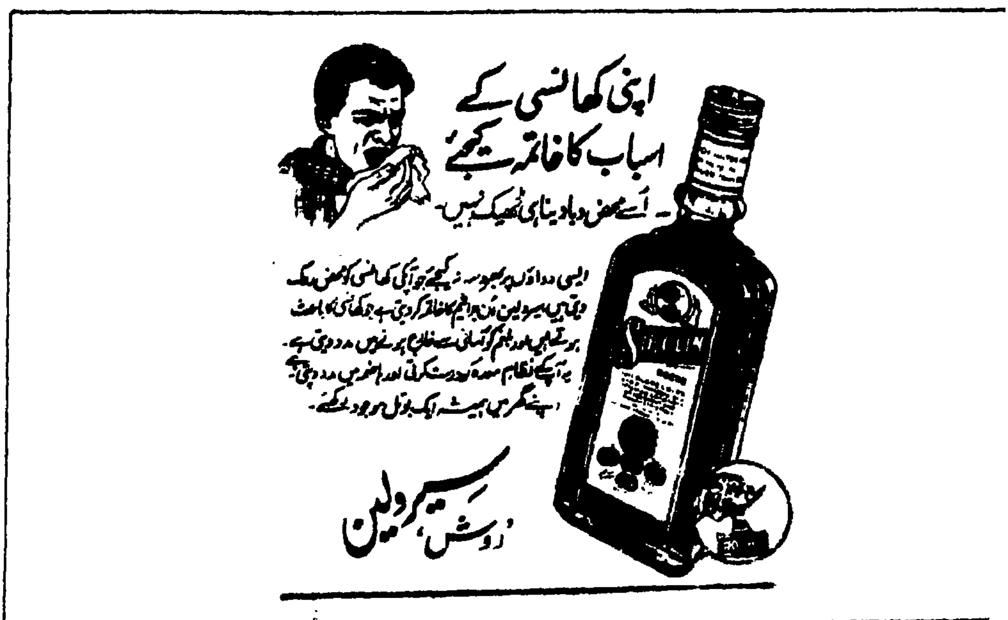
مرتبہ: سید نورالحسن ہاشمی ایم اے (علیگ) ایم اے، پی ایچ ڈی (علیگ)
صفحات ۴۲۰ مع ضمیمہ و فرہنگ مشتمل بر ۱۰۵ صفحات
قیمت پانچ روپے

یہ کتاب انجمن ترقی اردو پاکستان کے سلسلۂ مطبوعات کی ایک اہم کڑی ہے۔ جس میں ولی دکنی کا کلام مناسب تحقیق اور چھان بین کے بعد پیش کیا گیا ہے۔ "مقدمہ" کے زیرِ عنوان ولی کے حالات، کلام اور زبان پر سرسری بحث کی گئی ہے۔ ولی کے کلام کے متن اور اس کے تعارف کی حد تک یہ کتاب تدوین و ترتیب کے جملہ تقاضوں کو پورا کرتی ہے۔ مگر اب جب ذوق سخن کلام یا تعارف سے بلند تر مقاصد کا جویا ہے تمام کے کلام اور فن کے مختلف پہلوؤں کو جدید علم تنقید کی روشنی میں اجاگر کرنا زیادہ اہمیت رکھتا ہے چنانچہ ہمارے بعض بالغ نظر ناقدانِ فن نے قدیم و جدید شعراء کا از سر نو نئی نگاہوں اور نئے زاویوں سے مطالعہ کرنا شروع کیا ہے۔ کچھ عرصہ ہوا اردو کالج۔ کراچی کے رسالہ "برگِ گل" کے پہلے شمارہ میں ڈاکٹر سید عبداللہ کا ایک نہایت سیر حاصل مضمون شائع ہوا تھا جس میں ہم ولی کی شاعری اور مزاج کو ایک اور ہی رنگ میں دیکھتے ہیں۔ اس میں شاعر کے ذوق اور طبیعت کی بہت صحیح اور دلچسپ نباضی کی گئی ہے۔ اسی انداز میں ولی بلکہ ہر اردو شاعر کا مطالعہ کرنے کی اور بھی ضرورت ہے۔ مثال کے طور پر ولی کی شاعری میں یہ خصوصیت کس قدر نمایاں ہے کہ وہ نہایت شگفتہ مسلسل تراکیب کثرت سے استعمال کرتا ہے۔ ولی کا مزاج اور کلام ایک مستقل دعوتِ فکر و نظر ہے اور ہماری کیف اندوزی بھی اسی نسبت سے افزوں ہوگی جتنا کہ ہم اپنی ذوقی صلاحیتوں کو کام میں لائیں گے۔

رسید کتب

کتاب	مصنف	ناشر
ادبی تنقید	ڈاکٹر محمد حسن	ادارۂ فروغ اردو، لکھنؤ
چند نظمیں	برجموہن دتاتریا کیفی	رحمت قتلی، احاطہ کالے صاحب، دہلی
اردو میں تنقید	ڈاکٹر محمد احسن فاروقی	ادارۂ فروغ اردو، لکھنؤ
مشرق	سلیم اللہ فہمی	مشرق کوآپریٹیو پبلیکیشنز لمیٹڈ، ۱۹۷ آغا صادق روڈ، ڈھاکہ
جواہر القرآن	قاضی عبدالرزاق	مدینہ دارالاشاعت۔ آؤٹ رام روڈ، کراچی
تحفۂ حرم	اسد ملتانی	ادارۂ روزنامہ شمس ملتان شہر


معقول حضرات ٹریٹ بلیڈ
ہی استعمال کرتے ہیں
ٹریٹ
کا شیو پُر لطف شیو ہے
پاکستان کے بہترین بلیڈ
۵ آنے میں ۵


اپنی کھانسی کے
اسباب کا خاتمہ کیجئے
اُسے محض دبا دینا ہی ٹھیک نہیں۔
ایسی دواؤں پر بھروسہ نہ کیجئے جو آپ کی کھانسی کو محض روک
دیتی ہیں۔ سیرولین تو ان جراثیم کا خاتمہ کر دیتی ہے جو کھانسی کا باعث
ہوتے ہیں اور بلغم کو آسانی سے خارج ہونے میں مدد دیتی ہے۔
یہ آپ کے نظام معدہ کو درست کرتی اور ہاضمہ میں مدد دیتی ہے۔
اپنے گھر میں ہمیشہ ایک بوتل موجود رکھئے۔
سیرولین
روش،

دانتے اور اقبال ——— بقیہ صفحہ ۱۷

چاہئے کہ کہیں اس کے بالکل ظاہری معنی ہی مراد نہ لے لیں۔ وہی جس کے ہم اہلِ مغرب اس قدر عادی ہیں۔ اقبال اشتراکی ہیں کیونکہ وہ بالکل مذہبی ہیں۔ ان معنوں میں جو اسلام یا قرآن سے مخصوص ہیں، اور جنہیں سامی بھی کہا جا سکتا ہے۔ یعنی وہ ایک بہت ہی سیدھی سادی مگر ہمارے نزدیک بڑی ہی الٹی نسلی و اثرگونی فکر کے حامل ہیں۔ جس کے لئے وہ معین اور متوازن نظامِ کائنات جس کا تصور اہلِ یونان اور خود دانتے کے ذہن میں جاگزیں تھا۔ سرے سے موجود ہی نہیں۔

یولے سز جو دانتے کی نظم میں یونہی برائے نام یونانی ہے یقیناً "ڈیوائن کومیڈی" کا وہ کردار ہے جسے اقبال نے سب سے زیادہ پسند کیا ہے۔ اور جو دونوں شاعروں کے مابین ربط پیدا کرتا ہے۔ یولے سز جو غالباً دانتے کا سب سے زیادہ غیر کلاسیکی کردار ہے کیونکہ وہ نصرانی سے زیادہ کافر ہے۔ حالات میں ایک عجیب پیچیدگی کے باعث جہنم میں جگہ پاتا ہے۔ یعنی اس کو نصرانی، ارسطاطالیت کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھایا گیا کیونکہ اس نے اس سکونی کائنات کے راستے میں ناقابلِ عبور رکاوٹیں پیدا کر دی تھیں۔ جسے ابتدائی نصرانی شہداء نے ذاتی قربانی کے بے پناہ شوق میں پارہ پارہ کر دیا تھا۔

"وَاِلٰی رَبِّکَ مُنْتَھٰھَا"۔ قرآن کی یہ عمیق آیت اقبال کو ایک لامحدود بصیرت عطا کر دیتی ہے جو مادی کثافتوں کے خلاف ایک زبردست ہتھیار ہے۔ قدرت اقبال کے نزدیک "فطرت اللّٰہ" ہے۔ اسلام کا یہ بنیادی طور پر الٰہیاتی تصور کہ تمام کائنات ہر لمحہ فنا ہو کر برابر از سرِ نو تخلیق ہوتی رہتی ہے۔ ان کے لئے بے حد دلچسپی کا باعث ہے۔ اور اسی میں انہیں ہر قسم کے جبر اور مادہ کی غلامی سے نجات دکھائی دیتی ہے۔ دانتے کا یولے سز ایک لحاظ سے اقبال کا پیشرو ہے۔ اور مجھے یقین ہے کہ اقبال میرے ساتھ پورا پورا اتفاق کریں گے۔ اگر میں یہ کہوں کہ یورپ میں یولے سز کے قائلین نے دہریت کے پردہ میں نشوونما پائی ہے۔ اور وہ اسلئے کہ ہماری مذہبی روایت کا دامن یونان کے نصرانیت سے ماقبل ڈھانچ سے وابستہ رہا ہے۔ جس نے یولے سز کو مردود قرار دیا تھا۔

اب اقبال ——— وہ یولے سز جس کو اقبال کے الفاظ میں قرآن کے کلاسیکیت کے منافی تصور نے نجات دلا دی ہے۔ دوبارہ سفرِ افلاک پر روانہ ہونے کو تیار ہے۔ اب کی بار وہ سفر یونان کے قدیم شیطانیوں۔ عظیم الشان طاغوتی باغیوں کی طرح نہیں بلکہ خدا کی منظوری اور حوصلہ افزائی کے ساتھ کرتا ہے، یہ پرواز دانتے کی پرواز سے مختلف ہے کیونکہ اس میں انسان کا حصہ زیادہ ہے۔ مگر یہ انسان وہ مکمل انسان ہے جس کے پیچھے وہ تزکیۂ باطنی بھی ہے جو دانتے کے سفر کا ماحصل تھا۔ اور فاؤسٹ کے مردود ہونے کی تنبیہ بھی۔

اور یہ نیا انسان جسے اقبال نے پیش کیا ہے۔ ہمیں کافی کچھ سکھا سکتا ہے۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ دانتے اور اقبال جیسے عظیم سیاحانِ فلک کے تجربے ہمیں تین باتیں سکھاتے ہیں،

اوّل، یہ کہ رواداری اور جدید انسان کے نام نہاد اوصاف مادراء میں ایک سیدھے سادے ایمان محکم سے دست و گریباں نہیں ہیں۔ "وعینما تولوا فثمّ وجہ اللّٰہ" اور وہ شخص جو خدا کے نزدیک سب سے غالباً دوسرے تمام لوگوں سے زیادہ تر اجنبی، حلاج اور طاہرہ کو بہشت میں جگہ دے سکتا ہے۔ دوسرے۔ انسان جو محض بندۂ ناچار ہے۔ اس ہستیٔ کامل سے تکمیل پا کر "نَحْنُ اَقْرَبُ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْد" ہے۔ قدرتِ کاملہ پیدا کرتا ہے اور نئی نئی روحانی دنیاؤں کا خالق بن جاتا ہے۔

تیسرے، اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے اطاعت لازم ہے۔ یعنی دانتے کا انفعال اور اقبال کا اعلان بندگی حق۔ وہ حق جس کا جلال تمام کائنات میں دائر و سائر ہے۔ "خواہ وہ نور جو اکیلا ایک گوشے میں منزوی ہے اور تمام ابدی قوت کا ناقابلِ رسا سرچشمہ ہے۔ ایک چیز میں زیادہ ہو اور دوسری میں کم۔"

اور اب اُن آسمانوں سے پرے جو عقائد و آئین کے گوناگوں حجابات ہیں۔ اور شاید اس دنیائے حادث میں دانتے اور اقبال کو ایک دوسرے سے الگ رکھتے۔ بلکہ بعض تنگ نظر لوگوں کی رائے میں آج بھی انہیں الگ رکھتے ہیں۔ دونوں شاعروں کی روحیں پوری

ہم آہنگی کے ساتھ (جو امید ہے اس دُنیا میں اور بھی زیادہ واضح اور رنگین ہم آہنگی کی علامت اور بشارت ہوگی) اس خدائے واحد کی تمجید میں رطب اللساں ہوں گی جس کے متعلق قرآن کے بلیغ الفاظ میں کہا گیا ہے:

اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط مَثَلُ نُوْرِہٖ کَمِشْکٰوۃٍ فِیْھَا مِصْبَاحٌ ط اَلْمِصْبَاحُ فِیْ زُجَاجَۃٍ ط اَلزُّجَاجَۃُ کَاَنَّھَا کَوْکَبٌ دُرِّیٌّ یُّوْقَدُ مِنْ شَجَرَۃٍ مُّبٰرَکَۃٍ زَیْتُوْنَۃٍ لَّا شَرْقِیَّۃٍ وَّلَا غَرْبِیَّۃٍ لا یَّکَادُ زَیْتُھَا یُضِیْٓءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْہُ نَارٌ ط نُوْرٌ عَلٰی نُوْرٍ ط

ہم لوگ :	ـــــــــــــــــــــــــ	بقیہ صفحہ ۵۰

پہلے شاعر کے کلام یا اس کی صورت پر ہی اس طرح بھڑک اٹھے کہ آزاد کلب کا سارا میدان قہقہوں کے شور سے گونج اٹھا۔ ان قہقہوں میں تمسخر یا استہزا یا تذلیل کا جذبہ یا ارادہ شامل نہ تھا۔ ان کی خصوصیت وہ بے ساختہ و بے قابو مسرت تھی جو ناگہانی و بے اندازہ حیرت سے پیدا ہوتی ہے۔ انہیں یہ سمجھ ہی نہیں آ رہا تھا کہ شعر سننے کے بعد وہ کریں تو کیا کریں۔ شعر سن کر اگر وہ قہقہہ بھی نہ لگاتے تو میرے اندازے کے مطابق وہ اپنے دل میں سخت شرمندہ یا پشیمان ہوتے۔ چنانچہ تین چار شعر گزر جانے کے بعد جب لوگ سمجھ گئے کہ مشاعرہ یہی کچھ ہوتا ہے تو اکثر معززین شاعر سے زیادہ ویٹر کی طرف متوجہ ہو گئے۔

مشاعرہ تو خیر شعرا کی سخت جانی کے طفیل جوں توں کر کے ختم ہو گیا لیکن اس دن سے ہم لوگ برابر اس فکر میں غلطاں ہیں کہ اس کلب کو اب توڑا کیسے جائے۔ آزاد کلب کچھ اس وارفتگی سے چل پڑا ہے کہ تھمنے میں نہیں آتا۔


اعلیٰ ترین
اور
فرحت بخش
"صمد"
سپیشل
سگریٹ
آنہ
۳/۹
دس سگرٹوں کے
SAMAD
10 CIGARETTES
CIGARETTES
KAYS
پریمیئر ٹوبیکو کمپنی (پاکستان) کراچی

RPM

آر - پی - ایم

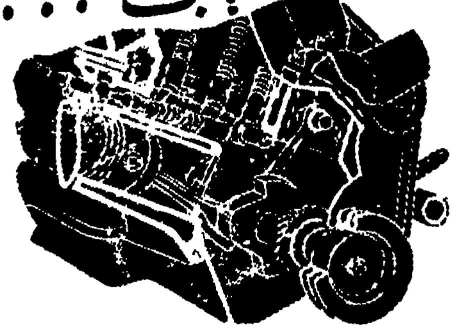
کالٹیکس کی بابت . . .

موٹر کا وہ واحد تیل جو انجن کو

"لبریکیشن" مہیا کرتا ہے

(رجسٹرڈ ٹریڈ مارک)

موٹر کے انجنوں کی ساخت بڑی تیزی سے ترقی کر رہی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ موٹروں کے لئے نئے نئے عمدہ تیل بھی تیار کئے جا رہے ہیں۔ اب جو انجن بن رہے ہیں وہ "اندرونی کمبسچن" قسم کے ہیں۔ یہ انجن بہت طاقتور ہیں اور ان میں زیادہ دباؤ سے گاڑی کی رفتار بھی تیز ہوتی ہے اور وہ کام بھی بہتر دیتی ہے۔ ان ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے بڑھیا قسم کے تیل کی ضرورت ہے۔ کالٹیکس نے چار سالہ وسیع تجربات کے بعد "آر - پی - ایم" تیار کیا ہے جس کے معنی ہیں "بھاری ڈیوٹی دینے والے انجنوں کا بہترین تیل"۔



جو آجکل کے اندرونی کمبسچن والے انجنوں کی ضرورتوں سے بڑھ چڑھ کر کام کرتا ہے چونکہ اس کے تیار کرنے میں اس کڑے سے کڑے کام کو پیش نظر رکھا گیا ہے جو کل کو کہیں زیادہ ترقی یافتہ موٹر انجنوں سے لیا جائے گا۔ اس لئے

"آر - پی - ایم" ــــــــ "کل کا تیل آج" ہے

صرف یہی ایک تیل ایسا ہے جو انجن کو چکنا اور محفوظ کرتا ہے۔

موٹر کے اس حیرت انگیز تیل کی بابت اپنے دوست کالٹیکس ڈیلر سے دریافت کریں۔ وہ خوب جانتا ہے کہ یہ تیل کس طرح انجن کو

چکنا بھی کرتا ہے اور محفوظ بھی۔



CALTEX

PETROLEUM PRODUCTS


بچوں کو ہر روز گندگی کے جراثیم سے بیماری کا خطرہ رہتا ہے۔
لائف بوائے سے ان جراثیم کو ان کے جسم سے دھو کر ہر روز ان کی حفاظت کیجئے۔
لائف بوائے کا "محافظ جھاگ" ان کی تندرستی کی حفاظت کرتا ہے۔
لائف بوائے صابن
ہر روز کی گندگی کے جراثیم سے آپ کی حفاظت کرتا ہے۔
LIFEBUOY
SOAP

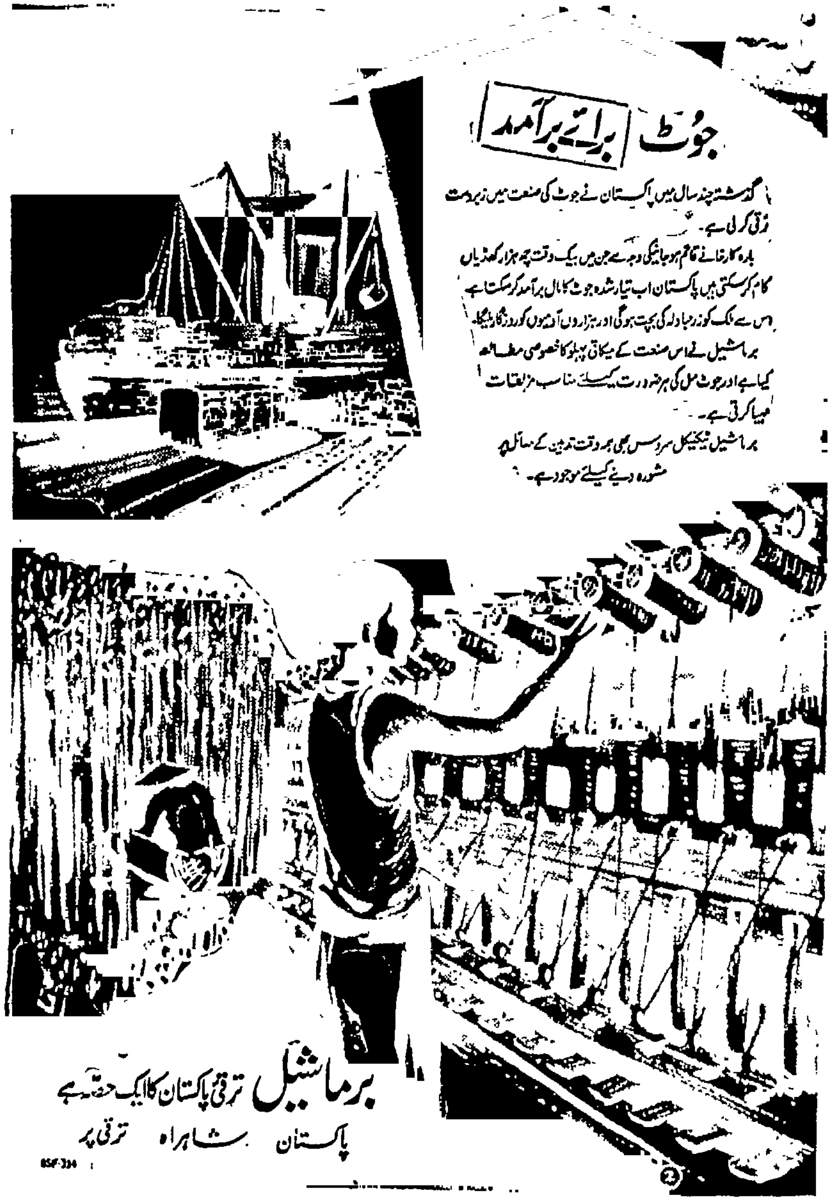

"میں جانتی ہوں
لکس ٹائلیٹ صابن آپ کی جلد
زیادہ دلکش بنائے گا"
— ثریا
ثریا کہتی ہیں: "اس خالص و سفید صابن کی دلفریب خوشبو میری جلد میں بس جاتی ہے۔
آپ بھی اپنی جلد نہایت ملائم اور خوبصورت بنانے کیلئے لکس ٹائلیٹ صابن استعمال کیجئے۔"
LUX
TOILET SOAP
لکس
ٹائلیٹ صابن
فلمی ستاروں کا
حسن بخش صابن
کتنا سفید، کتنا خالص، کتنا خوشبودار
A.S.286 X20UD



ادارہ مطبوعات پاکستان پوسٹ بکس نمبر ۱۸۳ کراچی نے شائع کیا
مطبوعہ ناظر پرنٹنگ پریس کراچی
مدیر رفیق خاور


ڈالڈا سے عید منایئے
DALDA
VANASPATI
ڈالڈا
وناسپتی
ہر تقریب کا لطف اپنے شباب پر ہوتا ہے اگر دعوت کا کھانا ڈالڈا وناسپتی میں پکا ہو۔ یہ عید کی مٹھائیوں اور دوسرے خصوصی پکوان میں لذت اور تازگی پیدا کرتا ہے۔ ڈالڈا خالص اور نفیس ہونے کی وجہ سے کھانے کو ذائقہ دار بناتا ہے۔ عید کے لئے ایک ڈبہ خرید کر محفوظ کر لیجئے۔
ڈالڈا سے بڑھیا کھانے نہایت عمدہ ہو جاتے ہیں


فوراً جھاگ دینے والا سنلائٹ صابن
کپڑے پٹکے بغیر سفید اور اُجلے دھوتا ہے
اپنے آپکو روز مرہ کے کپڑے پیٹنے کی دردسری سے بچائیے
اور انکو زیادہ پائیدار بنائیے۔ انکو سنلائٹ کے فوری
کارگر جھاگ میں دھوئیے کپڑوں کو خوب بھگوئیے۔
رگڑنے اور دھونے سے آپ کے سفید کپڑے روئی کے گالوں کی طرح
ستھرے اور رنگین کپڑے پھولوں کی طرح نکھرے ہوئے ملیں گے
SUNLIGHT SOAP
سن لائٹ صابن


جوٹ برائے برآمد
گذشتہ چند سال میں پاکستان نے جوٹ کی صنعت میں زبردست ترقی کرلی ہے۔
بارہ کارخانے قائم ہوجانیکی وجہ سے جن میں بیک وقت چھ ہزار کھڈیاں کام کرسکتی ہیں پاکستان اب تیار شدہ جوٹ کا مال برآمد کرسکتا ہے اس سے ملک کو زرمبادلہ کی بچت ہوگی اور ہزاروں آدمیوں کو روزگار ملیگا۔
برماشیل نے اس صنعت کے میکانی پہلو کا خصوصی مطالعہ کیا ہے اور جوٹ مل کی ہر ضرورت کیلئے مناسب مزلقات مہیا کرتی ہے۔
برماشیل ٹیکنیکل سروس بھی بروقت تدہین کے مسائل پر مشورہ دینے کیلئے موجود ہے۔
برماشیل ترقی پاکستان کا ایک حصہ ہے
پاکستان بشاہراہ ترقی پر
BSF-334



"آزما کر دیکھئے...
...آپ بھی لکس ٹائلیٹ صابن سے
زیادہ حسین بن سکیں گی"
— ریحانہ
ریحانہ کہتی ہیں "ذیل کا طریقہ حسن افزا ہے۔ لکس ٹائلیٹ صابن کا بالائی دار جھاگ اچھی طرح سے جلد پر ملئے اور پھر دھو ڈالئے۔ لکس ٹائلیٹ صابن کا باقاعدہ استعمال کرتے رہنے سے آپکی جلد بھی زیادہ ملایم اور نکھری رہیگی"
LUX
TOILET SOAP
کتنا سفید، کتنا خالص، کتنا خوشبودار
لکس ٹائلیٹ صابن
فلمی ستاروں کا
حسن بخش صابن
LTS. 397-X52UD

ماہِ نو

جلد ۸ شمارہ ۳ | جون ۱۹۵۵ء

مدیر: رفیق خاور
نائب مدیر: ظفر قریشی

چندہ سالانہ: پانچ روپے آٹھ آنے (پاکستان میں) سات روپے (ہندوستان میں) فی کاپی آٹھ آنے (پاکستان میں) دس آنے (ہندوستان میں)

اپس کی باتیں

می گذرد خیال من از مہ و مہر و مشتری
تو بہ کمیں چہ خفتۂ صید کن ایں غزالہ را (اقبالؒ)

اقبالؒ کی شاعری میں ایک جہانِ معنی ہے جس کا مطالعہ دلچسپ بھی ہے اور بصیرت افروز بھی — اور ابھی تک بہت کچھ توجہ کا محتاج ہے۔ اس سلسلہ میں انفرادی کوششیں ہی کافی نہیں۔ اس کے لئے ایک مستقل ادارہ کی ضرورت تھی جو اس کام کو منظم طور پر سرانجام دے سکے: "اقبال اکیڈمی" اسی احساس کا نتیجہ ہے جس کے قیام کی تجویز پاکستان کی مجلسِ قانون ساز نے ایک ایکٹ کے ذریعے ۱۹۵۱ء میں منظور کی تھی۔ لیکن یہ ادارہ دراصل پچھلے سال جنوری میں وجود پذیر ہوا۔

اکیڈمی کا مقصد اولیٰ اقبالؒ کی تعلیمات کی تفہیم اور ان میں دلچسپی پیدا کرنا ہے۔ ہمارے اس مایۂ ناز شاعر او مفکر کے ارشادات اور کارناموں کو تمام دنیا سے روشناس کرانا ضروری ہے۔ یہ ایسا کام ہے جو اہلِ پاکستان پر ایک اخلاقی فرض کے طور پر عائد ہوتا ہے اور اس سے کماحقہٗ عہدہ برآ ہونے کے لئے اکیڈمی کا قیام عمل میں آیا ہے۔

ایک سال کے عرصہ میں اکیڈمی نے اپنے لائحۂ عمل کے علاوہ اقبال کے متعلق منصوبوں کا ایک خاکہ بھی مرتب کر لیا ہے اور ان کو عملی جامہ پہنانے کے لئے بڑی تیزی سے آگے قدم بڑھا رہی ہے۔ پچھلے مہینے اس نے یومِ اقبال کے سلسلہ میں اپنا پہلا جلسہ منعقد کیا۔ جو اکیڈمی کے مقاصد و آئندہ تجاویز کے پیشِ نظر خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اس اجتماع میں اقبال کے افکار و خیالات کے متعلق چند بہت اچھے محققانہ مقالے پڑھے گئے جنہیں اکیڈمی ایک کتاب کی شکل میں شائع کر رہی ہے۔ ساتھ ہی "اقبالیات کا تنقیدی جائزہ" کے عنوان سے ایک ضخیم کتاب بھی پیش کی گئی جو ایک اچھے کام کا اچھا آغاز ہے۔ ظاہر ہے کہ اکیڈمی کی کامیابی ذہین افراد کے پُرخلوص تعاون ہی پر موقوف ہے جن کی اعلیٰ صلاحیتیں ایک ہی مقصد کے لئے وقف ہو جائیں۔ خواہ یہ صلاحیتیں اہلِ مشرق کی ہوں یا اہلِ مغرب کی۔

ڈھاکہ میں بھی یومِ اقبال کی تقریب کچھ کم دلچسپ اور بارونق نہیں رہی۔ اور یہ اقبال کے مشرقی و مغربی پاکستان میں یکساں طور پر مقبول ہونے کی بین علامت ہے۔ اس کا ایک جاذبِ نظر پہلو ایک تمثیلی مشاعرہ تھا۔ جو یونیورسٹی کے طلبا نے بڑے اہتمام سے منعقد کیا اور جس میں اردو کے نامور اساتذہ مع علامہ اقبالؒ ہم صحبت و ہم مجلس نظر آئے۔ اس کے علاوہ چند اور جلسے اور مشاعرے بھی ہوئے جن میں اہلِ شہر اور دور سے آئے ہوئے مقرروں اور شاعروں نے شرکت کی۔ علامہ اقبال کی نظموں کے بنگالی تراجم، کلام خوانی اور اہلِ قرب کی سامعہ نوازی نہایت مقبول رہی۔ ہم ان تقریبات کی چند تصاویر اس شمارہ میں پیش کر رہے ہیں۔

بعض اوقات ادبی کارنامے جو اچھی خاصی فنی اہمیت رکھتے ہیں، وہ شہرت حاصل نہیں کرنے پاتے جن کے وہ مستحق تھے۔ اس کے بہت سے اسباب ہو سکتے ہیں۔ یوں بھی اہلِ ادب کو ہمیشہ ابنائے زمانہ کی بے توجہی کی شکایت رہی ہے۔ ایسے ادبی شاہکاروں کو ڈھونڈ نکالنا اور منظرِ عام پر لانا بڑی اچھی ادبی خدمت ہے۔ اردو میں کئی ناول ایسے ہیں جن کو اس زمرہ میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ ہمارے نامور افسانہ نگار غلام عباس صاحب نے ان مٹے ہوئے نقوش کو اجاگر کرنے کا بیڑا اٹھایا ہے۔ اس شمارہ میں انہوں نے حکیم سید علی حسین کے ناول "افتادِ جوانی" پر روشنی ڈالی ہے۔ اور آئندہ وقتاً فوقتاً دوسرے ناولوں کو بھی اسی طرح اندھیرے سے اجالے میں لاتے رہیں گے۔ امید ہے "ماہِ نو" کے پڑھنے والے اس سلسلے کو پسند کریں گے۔

جواں سال مقامس جبل چودھری آناً فاناً نمودار بھی ہوئے اور رخصت بھی ہو گئے! لیکن اس تھوڑی سی مدت میں بھی انہوں نے اپنے کمالِ فن سے سب کے دلوں میں جگہ پیدا کر لی۔ اور اب ان کی یادگار کے طور پر ڈھاکہ میں "جیل کیمٹی آف فائن آرٹس" کا وجود عمل میں آیا ہے جس سے بڑی بڑی امیدیں وابستہ ہیں۔ امید ہے اکیڈمی فنون میں روح پیدا کرے گی جو اس یادگار کو حقیقی معنوں میں کامیاب بنا دے۔

اردو کا ایک غیر معروف ناول — "اقتادِ جوانی"

غلام عباس

اردو ناول کی ابتدا انیسویں صدی کی آخری چوتھائی میں ہوئی۔ اس سے پہلے کے اردو ادب میں قصے کہانیاں اور داستانیں تو ملتی ہیں۔ مگر ناول نہیں۔ ناول بلاشبہ مغربی چیز ہے، اور انگریزی کی وساطت سے اردو میں آیا ہے۔ خوش قسمتی سے پہلے پہل جن مصنفین نے اس صنفِ ادب پر طبع آزمائی کی وہ انگریزی جاننے کے ساتھ ساتھ اپنی زبان اور طرزِ بیان پر بھی پوری پوری قدرت رکھتے تھے۔ میری مراد پنڈت رتن ناتھ سرشار، مولوی عبدالحلیم شرر، منشی سجاد حسین اور نواب سید محمد آزاد مصنف "نوابی دربار" سے ہے۔ ان لوگوں نے انگریزی طرزِ فکر ہی کا تتبع نہیں کیا۔ بلکہ انگریزی انشا پردازی کے اسلوب کو بھی اردو میں نبھایا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک نئی قسم کی نثر کی بنیاد پڑی، اور اردو میں ناول نگاری نے جلد ہی ایک اہم صنفِ ادب کا درجہ حاصل کر لیا۔

اردو میں ناول کا دور دورہ بڑے ڈرامائی انداز میں ہوا، یعنی نہ تو ان ناول نگاروں کے لئے ناشرانِ کتب کی جستجو کا مسئلہ درپیش رہا جس کے اس زمانے کے مصنفین شاکی تھے، اور نہ پڑھنے والے خریداروں ہی کو ڈھونڈنے کی ضرورت پڑی جن کی اس زمانے میں سخت قلت تھی۔ اور تو اور خود ناول نگار کے لئے اشاعت سے پہلے ناول کی تکمیل بھی ضروری نہیں سمجھی گئی، اس کے باوجود دو تین برس ہی کی قلیل مدت میں سارے ملک میں اس نئی صنفِ ادب کی دھوم مچ گئی۔

بات یہ تھی کہ شروع شروع میں یہ ناول کتابی صورت میں نہیں بلکہ اخباروں میں بطور ضمیمہ قسط وار چھپا کرتے تھے۔ لوگوں کو انہیں خریدنا نہیں پڑتا تھا بلکہ اخبار کے ساتھ یہ ایک طرح سے مفت ہی دستیاب ہو جاتے تھے۔ چنانچہ جن کو نہ پڑھنا تھا انہوں نے بھی انہیں پڑھا۔ اور ایسے محظوظ ہوئے کہ ہر ہفتے بے تابی کے ساتھ اگلی قسط کے منتظر رہنے لگے۔ ان لوگوں کی دلچسپی کا باعث یہ تھا کہ ان نئی طرز کے قصوں میں انہیں جنوں، پریوں اور شہزادوں کی محیر العقول داستانوں کے بجائے اصلی زندگی کی جھلک دکھائی دی۔ اپنے ہی جیسے انسان چلتے پھرتے نظر آئے۔ جھوٹ، سچ معلوم ہونے لگا، اور وہ بے اختیار ان کے گرویدہ ہو گئے۔

یہاں سے اردو میں ناول کی ترقی کا دور شروع ہوتا ہے۔ دلی میں مولوی نذیر احمد اپنے اصلاحی ناولوں سے اس صنفِ ادب کو پہلے ہی فروغ دے چکے تھے۔ ادھر لکھنؤ میں ان ناول نویسوں نے جن کا اوپر تذکرہ ہو چکا ہے تھوڑے ہی عرصے میں متعدد ناول لکھ ڈالے۔ رفتہ رفتہ ناول نے اس قدر قبولِ عام حاصل کر لیا کہ ملک میں ہر طرف ان کی مانگ بڑھ گئی۔ بیسیوں نئے پبلشر پیدا ہو گئے اور روپے لے لے کر ناولوں کے مسودوں کے لئے مصنفوں کے پیچھے پیچھے دوڑتے پھرنے لگے۔ ہر مہینے درجنوں نئے ناول شائع ہوتے جنہیں لوگ ہاتھوں ہاتھ خرید لیتے۔ بعض مصنفوں نے خود اپنے رسالے جاری کر دیئے۔ اور ان میں سلسلے وار ناول شائع کرنے لگے۔ رفتہ رفتہ ناولوں نے اس قدر مقبولیت حاصل کر لی کہ ناول لکھنا ایک طرح کا فیشن ہو گیا۔ لوگ طبعزاد بھی لکھتے تھے اور انگریزی کی وساطت سے دوسری زبانوں کے ناولوں کا ترجمہ بھی کرتے تھے۔ اور تو اور ناول کی یہ روز افزوں ترقی اردو کے بعض ممتاز شعرا کو بھی، جنہوں نے غزل گوئی کے دائرے سے باہر قدم نہیں رکھا تھا اس کوچے میں کھینچ لائی، اور انہیں اس صنفِ ادب پر طبع آزمائی کرنے پر مجبور کر دیا۔ اس زمرے میں شاد عظیم آبادی اور ریاض خیرآبادی کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

اردو ناول کی ترقی کا یہ دور پہلی جنگ عظیم تک برابر جاری رہا، تیس چالیس سال کے اس عرصے میں خدا جھوٹ نہ بلوائے تو ہزاروں ہی ناول چھپے بکے اور پڑھے گئے ہونگے۔ مگر ذرا اس دور کی تاریخ ادب پہ نظر ڈالئے تو آپ کو پچھلے ناول نویسوں میں صرف دو تین ناموں ہی کا اضافہ نظر آئے گا۔ ان میں ایک تو "امراؤ جان ادا" کے مصنف مرزا رسوا ہیں۔ دوسرے مرزا محمد سعید دہلوی جنہوں نے بزمانہ طالب علمی "خواب ہستی" اور "یاسمین" کے نام سے دو قابل قدر ناول لکھے، اور تیسرا نام اگر آپ چاہیں تو ہردوئی والے حکیم محمد علی المتخلص بہ طبیب کا شامل کر لیجئے اور بس۔ کیا اس سے یہ سمجھ لیا جائے کہ ان دو تین مصنفوں کی کتابوں کو چھوڑ کر باقی جو کچھ لکھا گیا وہ محض رطب و یابس تھا؟ یہ کہنا بہت مشکل ہے۔ کیونکہ ناولوں کے یہ ذخیرے اب قریب قریب ناپید ہو چکے ہیں، اور ان کی اچھائی برائی کا فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔ بدقسمتی سے جس زمانے میں یہ شائع ہوئے تھے نہ تو رسالوں کی وہ کثرت تھی جو آج ہے۔ اور نہ لکھنے اور پڑھنے والوں میں تنقید کا وہ شعور ہی تھا جو موجودہ زمانے میں نظر آتا ہے۔ ناول بعض اچھے اچھے بھی لکھے گئے ہونگے مگر کسی نے نوٹس ہی نہیں لیا۔ اور وہ وقتی طور پر مقبولیت حاصل کر کے رفتہ رفتہ یاد سے محو ہو گئے۔ ایسا ہی ایک ناول "افتادِ جوانی" ہے جس کا میں اس مضمون میں تذکرہ کرنا چاہتا ہوں۔

"افتادِ جوانی" کے مصنف کوئی حکیم سید علی حسین خاں عرف بنّن صاحب ہیں۔ ان کے حالات باوجود کوشش کے مجھے معلوم نہ ہو سکے۔ کتاب کے ناشر سید علی محسن خاں آبر لکھنوی ہیں۔ جو لکھنؤ سے "گلدستہ معیار" نکالا کرتے تھے۔ بنّن صاحب کا یہ مختصر ناول پہلے اسی رسالے کی جلد دوم و سوم میں بالاقساط شائع ہوتا رہا تھا، بعد میں اسے کتابی صورت میں چھاپا گیا۔ اور یہی کتاب اس وقت میرے سامنے ہے یہ ۲۲×۱۸ کے ایک سو دس (۱۱۰) صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ کتاب میں سنہ نہیں دیا گیا اور نہ کوئی ایسی تحریر موجود ہے جس سے معلوم ہو کہ یہ ناول کب لکھا گیا اور کب چھپا۔ البتہ ٹائیٹل کے چوتھے ورق پر "گلدستہ معیار" کا جو اشتہار دیا گیا ہے۔ اس سے رسالے کے اغراض و مقاصد کے ساتھ ساتھ اس زمانے کے لکھنؤ کی ادبی سرگرمیوں کا بھی پتہ چلتا ہے۔

یہ گلدستہ ہر انگریزی مہینے لکھنؤ سے شائع ہوتا ہے طرح کے ساتھ چند قوافی مختص کر دیے جاتے ہیں۔ انہیں قوافی میں شعرا کا کلام منتخب ہو کر بحساب حروف تہجی ہر قافیہ کے تحت میں درج ہوتا ہے، جس سے بخوبی ظاہر ہو جاتا ہے۔ کہ اس قافیہ میں میدان کس شاعر نازک خیال کے ہاتھ رہا۔ ابھی صرف تیسرا ہی سال ہوا ہے اس گلدستے کو نکلتے ہوئے مگر کہاں ہیں وہ حضرات الارض شعرا۔ اب ہم اُس طوفان بے تمیزی کی چہل پہل شاعری کی دنیا میں نہیں دیکھتے جو اس کے پہلے تھی۔ نہ اب گلی گلی مشاعروں کا طفلانہ ہنگامہ سنائی دیتا ہے۔۔۔۔۔

"یہ پرچہ دو جزو پر نکلتا ہے۔ کم بیش ۱۶ صفحہ میں خاص خاص شعرائے لکھنؤ کا بہ تقابل قوافی ہم طرح کلام درج ہوتا ہے۔ ۸ صفحہ میں آج کل کے تعلیم کے موافق کوئی علمی مضمون نثر کا ہوتا ہے۔ اور ۸ صفحہ میں لکھنؤ کی ٹکسالی زبان کا اخلاقی نتیجہ خیز دلچسپ ناول ہوتا ہے۔"

بنّن صاحب نے کتاب کے خاتمے پر چند سطور بطور عرض حال بھی لکھی ہیں جن میں وہ فرماتے ہیں:-

"میرا پہلا ناول اگرچہ ناول کجا اور میں کجا میں ایک طبیب پیشہ آدمی۔ میرے مشاغل کے دون مرتبہ ہے ناول نگاری مگر بعض احباب کی فرمائش سے لکھنؤ کے شاہی زمانے کے سوشل حالات جو وقتاً فوقتاً میری نظر سے گزرے یا قابل اطمینان دوستوں سے سنے ہوئے تھا اس کو اسی وقت کی زبان اور محاورات کو ملحوظ کر کے ایک سلسلہ میں ایک ضخیم کتاب کے طور پر لکھا تھا۔ مگر یہ سب کچھ عالم بیکاری میں ہوا تھا۔ ملازم ہو جانے کی وجہ سے اس کا کچھ بھی عمل بیڑا نہ ہوا۔ اسی کتاب کا یہ ایک ادنیٰ نمونہ سجاد کا قصہ بطور کے ایک ناول کے پبلک میں پیش کیا گیا ہے۔ اگر ملک قدر کرے گا تو اور اسی قسم کے بہت سے ٹکڑے اسی دلچسپ کتاب سے نکال کے شائع کئے جائیں گے۔"

قیاس چاہتا ہے کہ ملک نے اس کی قدر نہیں کی ہوگی اُدھر حکیم صاحب نے بھی جو ناول نگاری کے پیشے کو طبابت کے پیشے سے گھٹیا سمجھتے تھے، اس کی کچھ زیادہ پروا نہ کی ہوگی، اور انہوں نے اپنے طبیبانہ مشاغل میں مگن رہ کر اس کوچے میں دوبارہ قدم نہیں

دھرا ہوگا۔ کیونکہ ان کی کوئی اور کتاب باوجود تلاش کے میری نظر سے نہیں گزری۔

"افتادِ جوانی" کئی وجوہ کی بنا پر اردو کے بہترین ناولوں میں شمار کئے جانے کے قابل ہے۔ اوّل تو یہ کہ پچاس ساٹھ یا شاید اس سے بھی زیادہ برس اسے لکھے ہوئے ہو چکے ہیں مگر اس کی تازگی میں فرق نہیں آیا۔ دوسرے مصنف نے جس ڈھب سے اسے لکھا ہے، وہ ناول نگاری کی جدید ٹیکنیک کے قریب ہے اور اگر اس کے بعض غیر ضروری حصوں کو نکال دیا جائے تو اسے موجودہ دور کے کامیاب ترین افسانوں کے مقابلے میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ مصنف قصے کے مقامی رنگ، ماحول اور کرداروں سے گہری واقفیت رکھتا ہے۔ اس میں ایک سماجی مسئلے پر ترقی پسندانہ انداز سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ مقصد اصلاحِ معاشرت ہے۔ مگر پند و نصائح کی خشکی قصے کی شگفتگی پر اثر انداز نہیں ہوتی۔ اس میں ایک نوجوان عورت کا نفسیاتی مطالعہ پیش کیا گیا ہے اور ایک ایسے زمانہ میں جبکہ لوگ نفسیات کے معنی بھی پورے طور پر نہیں سمجھتے تھے۔ مصنف کا طرزِ نگارش دلچسپ اور شگفتہ ہے اور اس میں شروع سے لے کر آخر تک ایک دبا دبا سا طنز پایا جاتا ہے جس سے کتاب کا مجموعی تاثر بڑھ گیا ہے۔ قصے کا مرکزی خیال شروع سے آخر تک ایک ہی رہتا ہے۔ اور جوں جوں قصہ آگے بڑھتا جاتا ہے پڑھنے والے کی دلچسپی بھی بڑھتی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ مصنف بڑی چابک دستی سے دھیرے دھیرے قصے کو نقطۂ عروج پر پہنچا دیتا ہے۔ اور خاتمہ ایک ایسے ڈرامائی انداز میں ہوتا ہے کہ پڑھنے والا کتاب ختم کر کے ایک استہزا آمیز تحیّر محسوس کرتا ہے۔

ناول میں ان خوبیوں کے ساتھ کچھ عیوب بھی ہیں۔ اس میں اکثر غیر ضروری عبارتیں ہیں جنہیں اگر نکال دیا جائے تو قصہ زیادہ دلچسپ بن سکتا ہے۔ مصنف نے کرداروں کے اوصاف بیان کرنے میں اکثر شاعرانہ مبالغے سے کام لیا ہے۔ اس نے بار بار اصرار کیا ہے کہ یہ واقعہ سچا ہے چنانچہ اسی جوش میں اس نے ایسی باتیں بتا دی ہیں جو نہیں بتانی چاہئیں۔ یعنی قصے کے بیان میں جس رازدارانہ ضبط و تحمل کی توقع مصنف سے کی جاتی ہے وہ اسے پورا نہیں کرتا۔ لیکن اس کے باوجود یہ ناول مجموعی اعتبار سے اسقدر کامیاب ہے کہ یہ خامیاں آسانی سے نظر انداز کی جا سکتی ہیں۔

ناول کے شروع میں کسی قدر طویل تمہید درج کی گئی ہے، جو اس وقت کی مروجہ انشا پردازی کا بہت اچھا نمونہ پیش کرتی ہے۔ علاوہ ازیں اس سے مصنف کے طرزِ نگارش کا بھی بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔ یہ تمہید اس طرح شروع ہوتی ہے:۔

"ہر انسان کی عمر کے تین حصے ہوتے ہیں۔ بچپنا، جوانی، بڑھاپا۔ اور ان ہی تین حصوں میں سے دو حالتیں اور نکلتی ہیں یعنی بچپنے اور جوانی کے درمیان جو حالت ہوتی ہے۔ اس حالت والے کو کم سن کہتے ہیں۔ اسی طرح جوانی و پیری کے زمانۂ وسط والے عمر کے شخص کو ادھیڑ کہتے ہیں۔ یہ وہ زمانہ ہوتا ہے کہ شمعِ جوانی کی روشنی ضیائے صبحِ پیری سے ماند ہوتی جاتی ہے۔ پیشانی کا فرش پُرشکن ہوا۔ رخسار کے آئینوں کی قلعی جاتی رہی۔ زلف کی لٹ زمانہ کی پیچیدگیاں دیکھ دیکھ کے بل کی نہیں لیتی، بالکل سیدھی ہو گئی۔ اب نہ وہ چتونیں ہیں نہ وہ دُزدیدہ نظریں جیسے نظروں کے ترکش تیروں سے خالی ہو گئے ابرو کی کمان کا چلّہ اتر گیا۔ دونوں حلقہ کانس پر بیکار پڑے ہیں۔ دانتوں کے موتیوں کی آب جواب دے گئی۔ ناک کی خود بینی تشریف لے گئی۔ اب نہ وہ گل شبو رہی، رہ نہ بو۔ چندروز میں دولت آباد کے قلعے کی مُہری معلوم ہو گی۔ ہاتھ پاؤں کی نزاکت بھاری بھر کم ہو گئی۔ کلائیوں اور بازوؤں کی گولائی ہارسنگھار کی شاخ کی طرح چپل ہو کے رہ گئی، کمر جو لچکتی اور دوہری ہوئی جاتی تھی کہ ہر دفعہ ٹوٹ جانے کا گمان ہوتا تھا، اب وہ لچک تو در کنار نقطِ چک کے تصور پر پائل کی لاتیں کھانے میں ثابت رہنے کی امید دلاتی ہے۔"[9]

ناول میں صرف تین بڑے کردار ہیں۔ سجاد حسین ہیرو، افتخار بہو سجاد کی بیوی ہیروئن اور مرزا فدا حسین ہیرو کا باپ۔ ان کے علاوہ اور بھی کئی افراد اس قصے میں نظر آتے ہیں مگر ان کی حیثیت ضمنی رہتی ہے۔ اور قصے کے محور مندرجہ بالا تینوں بڑے کردار ہی رہتے ہیں۔

اس تمہید کے بعد اب میں ناول "افتادِ جوانی" کو قریب قریب اس کے مصنف کے الفاظ ہی میں پیش کرتا ہوں:۔

قصہ آخر آخر عہدِ امجد علی شاہ سے تعلق رکھتا ہے۔ گنگنی سے کل کا تالاب یہ محلہ اس زمانے میں بہت کچھ آباد تھا۔ رؤسا شرفا بلکہ اکثر خاندانِ شاہی کے لوگ یہاں رہتے تھے۔ اسی محلے میں میر فدا حسین کا بھی مکان تھا میر صاحب اپنے وقت کے بہت بڑے نامی شریف خصلت بانکے تھے۔ ہمیشہ

تلوار ہی کی روٹی کھائی۔ اور تلوار ہی کے ذریعے سے شہر میں عزت آبرو حاصل کی۔ روپیہ اس قدر کمایا کہ جائیدادیں مول لیں۔ ساری عمر میں جناب باری نے خاندان بھر کا چشم و چراغ ایک ہی بیٹا عنایت کیا تھا جو عصائے پیری اور حاصل زندگی تھا۔ سولہ ہی برس کی عمر میں اس نے خانہ جنگیاں لڑ لڑ کے اپنے کو میر فدا حسین سے شیر دل بہادر باپ کا بیٹا ثابت کر دکھایا تھا۔ جہاں چار پانچ لکھنؤ کے بے فکرے جمع ہو جاتے تھے وہاں ممکن نہ تھا کہ اس کی کسی لڑائی کا تذکرہ نہ نکل آئے۔ جو لوگ خود بہادر اور بہادر دوست تھے وہ اس کے نام پر جان دیتے تھے۔ جو لوگ بزدل تھے یا کبھی اس کے ہاتھ سے صدمہ اٹھا چکے تھے اور نمدہ ماندہ ہو کر جان بچاتے تھے وہ خار کھاتے تھے ہمیشہ اسی فکر میں رہا کرتے تھے کہ کسی طرح اسے نیچا دکھائیں۔

حسن کے اس کے یہ حال تھا کہ جس طرف نکل جاتا تھا ہزاروں نظریں اور سینکڑوں دل اس کے ساتھ نکل جاتے تھے۔ بڑے بڑے اونچے کمروں والی رنڈیاں مکانوں کے دالانوں اور کھڑکیوں کے کونوں میں بیٹھنے کی آرزو کرتی تھیں۔ سب کی سب حسرتِ پاکدامنی رکھتی تھیں۔ ہرجائی پن بھول کے ایک ہی سفاک کو اپنا قاتل قرار دے کر خود گنہگار ہوا چاہتی تھیں۔ اگر یہ کسی کی خوبی قسمت اور بلند طالعی سے کمرے پر چڑھ جاتا تھا تو وہ شاہد بازاری اپنی آنکھیں فرشِ قدم کرتی، خاطر مدارات کا کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھتا تھا۔

اس کا نام اس کے باپ مرزا فدا حسین صاحب نے مرزا سجاد حسین رکھا تھا۔ اور عین اٹھتی جوانی میں جبکہ وہ جملہ فنون سپہ گری سے ماہر و باہر ہو گیا تو برسوں سے ڈھونڈی ہوئی اور بچپن کی تجویز کی ہوئی ایک غنچۂ دلستانِ چمنِ حسن و نزاکت سے جو مرزا صاحب کی عزیز بھی ہوتی تھی، اس کا عقد کر دیا۔ مرزا فدا حسین نے اپنی بہو کو افتخار بہو خطاب دیا۔ جب سے انکی زوجہ کا انتقال ہوا ان کے گھر میں کوئی صاحب خانہ عورت نہ ہونے کی وجہ سے امورات خانہ داری میں ایک بدانتظامی واقع تھی۔ بہو کے آتے ہی انہوں نے سب گھرداری اس کے حوالے کی سجاد اور افتخار بہو دونوں عاشق و معشوق الفت و محبت کے ساتھ زندگی بسر کرنے لگے۔

جب کبھی سجاد حسین گھر سے کہیں باہر جاتا تھا اس کی نازک مزاجی اور چھچھلے پن سے افتخار بہو کو اس بات کا یقین رہتا تھا کہ کسی نہ کسی سے ضرور جھگڑا بکھیڑا پیدا ہو جائے گا۔ وہ سمجھتی تھی کہ خدا ہی ہے جو یہ زندہ گھر پھر آیا۔ سب دنیا کے کام چھوڑ چھاڑ دعا تسبیح و نماز سے کام رکھتی تھی۔

"خداوندا۔ تو ہی اس سڑی سودائی کو گھر میں اصل خیر سے پھیر کے لائے گا۔ وہ جنونی تو زخمی ہونے پر بھی گھر نہیں پلٹا۔ باؤلوں کی طرح دشمن کو ڈھونڈتا ہی پڑا پھرتا ہے۔ مالک میرے تو ہی ہر وقت بچانے والا اور مجھ بے بس لاچار کا راج سہاگ قائم رکھنے والا ہے۔"

افتخار بہو کے زمانۂ الحاح و زاری ہی میں اکثر سجاد حسین گھر آ جاتا تھا بس صورت دیکھتے ہی اس کی جان میں جان آ جاتی تھی۔ پھر گھر کے کاروبار میں مصروف ہو جاتی۔ جب تک سجاد اپنی بی بی کی اس حرکت دیوانگی سے واقف نہ تھا دل میں کہتا تھا یہ کیا بات ہے کہ یہ ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھی رہتی ہیں۔ اکثر جس ضروری کام کے سرانجام کو کہہ جاتا ہوں، تاکید کر جاتا ہوں وہ اسی طرح پڑا رہ جاتا ہے۔ ایک آدھ دفعہ اس نے تہدید بھی کی اور سبب تو ہزاروں دفعہ پوچھا ہو گا۔ مگر اس نے اصلی سبب اس تصدیق و تعطل کا نہ بتلایا۔ البتہ جب اور عورتوں سے یہ واقعہ کھلا تو سجاد حسین نے بڑی خفت اٹھائی اور اپنے ہر دفعہ کے غصے سے دل میں پشیمان ہوا:۔

"یہ کون حرکت ہے جو تم سے واقع ہوتی ہے۔ اب میں کیا ایسا موم کا ہوں کہ راستے میں کہیں پگھل جاؤں گا۔ حلوا ہوں جو پائے گا وہ مجھکو کھا جائے گا۔"

افتخار بہو کیا جواب دیتی۔ دبی زبان سے یہ اظہار کیا۔

"میں خود اپنی اس بات کو بیجا سمجھتی ہوں اور شرماتی ہوں۔ زیادہ کر کے اس دن سے جب سے تم نے سن پایا ہے۔"

افتخار بہو سجاد سے اپنی حالت کو اب کچھ پہلے سے زیادہ چھپانے لگی مگر وہ حالت کسی طرح نہ بدلی۔ ہزار کوششیں، سینکڑوں تدبیریں دل کو دیوانہ اور اس خیال کو وہم سمجھنے کی جاتیں، بلکہ دل سے ہر وقت برسر مقابلہ و مجادلہ رہتی، مگر نہ تو دل ہی نے مانا اور نہ وہ وہم ہی کم ہوا۔ آخرکار اس کے توہمات کی یہ حد پہنچی کہ کوئی رات ایسی نہ ہوتی تھی کہ سوتے سوتے چیخ مار کے اچھل نہ پڑتی ہو حتیٰ کہ سونے سے بھی ڈرنے لگی۔

جس وقت سجاد ہتھیار لگا کے باہر جاتا۔ بس یہ دیکھتی رہ جاتی حتی المقدور پہلے سے ایسی تدبیریں کرتی۔ کہ وہ گھر میں الجھا رہے۔ ڈھونڈ ڈھونڈ کے وہ کام نکال دیتی۔ کہ جس کے الجھاؤ میں گھر سے باہر نکلنے اور سیر و تفریح کے لئے کہیں جانے کا وقت گزر جائے یا تنگ رہ جائے۔ اکثر وہ اپنی

کوششوں میں کامیاب بھی ہو جاتی۔ مگر ہر روز کی بات کوئی کہاں تک روک سکے۔ ہمیشہ کی عادت کس طرح مٹ سکے۔ اور سجاد سے زندہ دل اور آشنا پرست آدمی کو یوں بھلا کوئی کیا روک سکتا تھا۔ کہ وہ گھر ہی میں رہے کسی وقت باہر نہ نکلے۔ دو گھڑی دن بھی دوستوں کے ساتھ دل نہ بہلائے چوک میں خراماں خراماں ادھر سے اُدھر اُدھر سے اِدھر دو ایک پھیرے نہ کرے۔ خصوصاً بیچ کی سرا والے پھاٹک کے سامنے یارانِ ہم مذاق کے ساتھ ہنس بول نہ لے۔

اس زمانے میں سارے شہر کے بانکوں کا گویا یا نا تھا۔ کہ اِدھر اُدھر سے پھر پھرا کر بیچ کی سرا والے تنبولی کی دکان پر ٹھیکہ کھاتے تھے۔ ایک آدھ بیڑا پان کا کھایا اور رساتی کا حقہ پیا۔ دو گھڑی دن سے چار گھڑی رات تک اس تنبولی کی دکان پر بانکوں کا مجمع اس طرح رہتا تھا۔ کہ دو چلے گئے چار اور آ گئے۔ جو فساد اٹھتا تھا اکثر یہیں سے اٹھتا تھا مگر ایسا ویسا یعنی کرکٹ بانکا ذرا وہاں جانے میں کنیاتا تھا۔ بھلا سجاد سے یہ کہاں ممکن کہ وہ گھر میں یوں بند ہو کے بیٹھے کہ اس کی بانکپن کو زنگ لگ جائے۔

ایک دن افتخار بہو کا دل معمول سے کچھ زیادہ ہی دھڑکتا رہا تھا۔ یوں تو کوئی رات ایسی نہ ہوتی تھی کہ اس کا خیال اس کو ایک نہ ایک خواب دکھا دیتا ہو۔ مگر پچھلی رات اُس نے جو خواب دیکھا تھا اس کے واقعے اس غضب کے تھے کہ سارا دن اس کی ہیبت رہی۔ تمام اعضا میں ایک نئی طرح کا تلاطم برپا تھا۔ کہ جس کی وجہ سے اس کے ہوش اڑے جاتے تھے۔ بار بار ایک عجب نظرِ حسرت سے میاں کی صورت دیکھتی تھی۔ ہزار حیلوں سے چاہتی تھی۔ کہ آج وہ گھر سے باہر نہ جائے۔ لیکن کوئی فقرہ پیش نہ جاتا تھا۔ آخر اپنی جان پر کھیل جانے پر آمادہ ہو گئی۔ اور سجاد ایسے شیر کے سامنے بے خوف ہاتھ باندھ کے قدموں پر سر رکھ دیا۔

سجاد نے اس کے سر کو اپنے قدموں سے اٹھا کر سیدھا کر دیا۔ اور اس کے چہرے کو بہ حیثیت مجموعی ایک نئی قسم سے اداس ہی نہیں پایا بلکہ اس جسارت کو بھی اس کی پیشانی پر چمکتے پایا جو کسی نوجوان بانکے کی عالی خاندان زوجہ کو اپنے شوہر کے سامنے کم ہوتی ہے۔

سجاد: (ذرا مسکرا کے) یہ آج کیا تم بالکل اپنے آپے سے گزر گئی ہو۔ آخر ہے کیا، کچھ کہو تو سہی۔

افتخار بہو: للہ مجھ پہ رحم کرو۔ آج میرے قلب کی پھڑک کچھ نرالی ہے۔ کبھی جو بات نہ ہوئی تھی وہ آج مجھ پر گزر رہی ہے۔ خدا کے واسطے آج گھر سے باہر نہ نکلو۔ کہیں نہ جاؤ۔

سجاد حسین سے عصمت دوست بہادر کا دل بھی بھر آیا۔ اس نے اپنی بی بی کی طرف سے ایک دوسرے انداز سے منہ پھیر لیا۔ اور بہت جلد اپنی چشمہائے نمناک کو صاف کر کے پھر مخاطب ہوا۔ اور نہایت پُراثر تشفی و تسلی کے کلمات سے اس کے دکھتے ہوئے دل کو سنبھالا۔ اور اقرار کر لیا کہ میں نہ جاؤں گا۔ دیر تک اسی کی تیمارداری میں مصروف رہا۔ یہاں تک کہ طبیعت اس غریب کی سنبھل گئی۔ اسی میں شام ہو گئی چونکہ سیر سپاٹے کا وقت بھی اب نکل گیا تھا اس وجہ سے اور بھی بیوی کو اطمینان ہو گیا۔ کہ اب واقعی یہ نہ جائیں گے۔ گرمیوں کے دن تھے آٹھ بجتے بجتے بیوی نے کھانے کا تقاضا شروع کر دیا اور خواستہ و ناخواستہ دسترخوان بچھا ہی دیا۔ چلئے اب اور بھی اطمینان ہو گیا۔ کیونکہ جب کھانا کھا لیا تو اب ان کو کوئی مار کے نکالے تب بھی یہ گھر سے قدم نہ نکالیں بلکہ پلنگ سے نیچے قدم نہ اتاریں چہ جائیکہ سیر سپاٹا اور دوستوں کی ملاقات!

آج سویرے سے دونوں میاں بیوی پلنگ پر لیٹے ہوئے ہیں۔ پیاری پیاری اخلاص و محبت کی باتیں ہو رہی ہیں۔ میاں کا دہنا ہاتھ بیوی کے سر کے نیچے ہے جس پر سر کے ساتھ وہ مشکیں و عطر آگیں چوٹی بھی مثلِ مارِ سیاہ کے چمکتی ہوئی پڑی ہے۔ دلی جذبات طرفین کے ہجوم کئے ہوئے ہیں۔ اس قدر کثرت ہے کہ جو نکلتا ہے لڑکھڑاتا ہوا نکلتا ہے۔ نہ بیوی کو اس وقت اپنے وہم و خفقان کا کچھ خیال ہے اور نہ میاں کو کسی دوست آشنا کا یا کسی جلسہ و صحبت کا ہوش ہے۔ کہ یکایک ڈیوڑھی پر سے کوئی شخص میرزا سجاد حسین پکارتا ہوا سنائی دیا۔

(باقی پھر)

اندر سبھا کی غزلیں اور گیت

وقار عظیم

اندر سبھا کا مطالعہ کرتے وقت اور اس کے مطالعہ کے بعد جس چیز سے پڑھنے والا سب سے زیادہ متاثر ہوتا ہے وہ اس کے گانے ہیں۔ اندر سبھا کی مشکل سے ۲۷، ۲۸ صفحوں کی ضخامت میں ۳۱ گانے ہیں۔ ۱۷ غزلیں اور ۴ گیت۔ ان کے علاوہ سبز پری اور گلفام کے وہ ۴۹ شعر الگ ہیں جو انہوں نے مختلف حصوں میں گائے ہیں۔ اور اس طرح قصے کے اشعار کی مجموعی تعداد میں سے راوی، راجا اندر، کالے دیو اور لال دیو کی زبان سے نکلے ہوئے اشعار الگ کر لئے جائیں تو پتہ چلتا ہے کہ اندر سبھا کے تقریباً ۹۰ فی صدی شعر صرف گانے کے لئے ہیں۔ اور مصنف نے اندر سبھا میں دوستوں کی خوشنودی اور سامعین کی تفریح طبع کا سامان گانوں ہی سے مہیا کیا ہے۔

اندر سبھا کے مطالعہ کے بعد جب یہ بدیہی بات نظر کے سامنے آجاتی ہے تو پڑھنے والا ان گانوں کے مختلف پہلوؤں کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور وہ جو واضح اور صریح نتیجے نکالتا ہے ان کا انداز کچھ اس طرح کا ہوتا ہے:

(۱) ان گانوں میں مصنف نے غزلوں کو دوسری طرح کے گانوں کے مقابلہ میں بہت زیادہ اہمیت دی ہے۔

(۲) غزلوں کا انداز مجموعی حیثیت سے اس عہد کے لکھنوی مذاقِ شعری سے مطابقت رکھتا ہے۔

(۳) غزلوں کے لئے بحروں کا انتخاب کرتے وقت مصنف نے ان کے غنائی پہلو کو پیش نظر رکھا ہے۔

(۴) غزلوں کے ساتھ اکثر جگہ دھنوں کے اشارے موجود ہیں۔

(۵) غزلوں اور گیتوں کے مضامین عموماً اس محل کے مطابق ہیں جس پر وہ گائے گئے ہیں اور اکثر اوقات گانے والے کی ذہنی اور جذباتی کیفیت کی ترجمانی کرتے ہیں۔

(۶) گیتوں میں غزلوں کے مقابلہ میں زیادہ رس اور مٹھاس ہے اور وہ غزلوں کے مصنوعی اندازِ اظہار سے متاثر نہیں ہوئے۔

ان بدیہی نتائج میں سے بعض تو اتنے واضح ہیں کہ وہ کسی طرح کی تشریح و تبصرے کے محتاج نہیں۔ مثلاً یہ بات کہ ان گانوں میں غزلوں کو دوسرے گیتوں سے زیادہ اہمیت دی ہے یا غزلوں کے ساتھ اکثر جگہ دھنوں کے اشارے موجود ہیں لیکن بعض نتائج تشریح طلب بھی ہیں اور ان کی تشریح و توضیح لطف سے بھی خالی نہیں۔ اس لئے میں نے انہیں بیان کا موضوع بنایا ہے۔

جن مختلف باتوں کی طرف میں نے ابھی اشارہ کیا ان میں سب سے زیادہ اہم یہ ہے کہ اندر سبھا کی غزلیں ایک خاص عہد، یعنی واجد علی شاہی دور کے مذاقِ شعری کی ترجمان ہیں۔ اس اجمال کی تفصیل اندر سبھا کی سب غزلوں میں موجود ہے۔ سب غزلیں پڑھ لیجئے، ان میں کم و بیش ایک ہی طرح کی شاعرانہ خصوصیات ملیں گی۔ اس نظر سے دو مکمل غزلوں کا مطالعہ کر کے دیکھئے۔ ایک غزل پکھراج پری نے گائی ہے اور اس کا مطلع ہے ؎

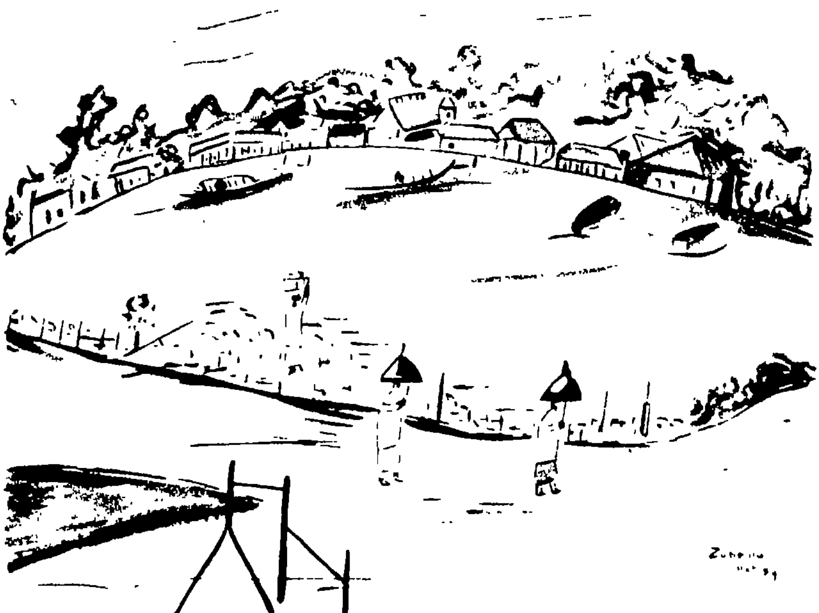
رفتار کی چلن سے غضب دل لبھائیے
چھوٹے سے سن میں یار بڑے تم ہو چالئے

دوسری غزل لال پری کی زبانی ہے۔ اس کا مطلع ہے ؎

انساں کا کام حسن پہ میرے تمام ہے
جوڑا ہے سرخ، لال پری میرا نام ہے

پہلی غزل میں مطلع سے مقطع تک نو شعر ہیں۔ اور دوسری میں سات۔ اب ذرا ان دونوں غزلوں پر نظر ڈال کر ان کا تجزیہ

مشرقی پاکستان :



،، ساد آباد کنارے ،،

مصور : زبیدہ آغا

کرنے کی کوشش کیجئے۔ پہلے پکھراج پری والی غزل لیجئے ؎

رفتار کی چلن سے غضب دِل لبھا لئے
چھوٹے سے سِن میں یار بڑے تم ہو چالئے
بوسہ جو مانگا چشم کا کیا قہر ہوگیا
مجھ پر نہ عین بزم میں آنکھیں نکالئے
جانے نہ دوں گا آپ کو سننے کا میں نہیں
باتیں بنا کے وصل کا وعدہ نہ ٹالئے
اک بوسہ پہ یہ گالیاں، اللہ کی پناہ
کچھ میں بھی اب کہوں گا زباں کو سنبھالئے
درگزرا میں ملاپ سے ہٹئے کہاں کا پیار
پھیلا کے ہاتھ پاؤں گلے میں نہ ڈالئے
نظارہ روئے صاف کا منظور ہے ہمیں
دکھلا کے زلف کو نہ بلا سر کی ٹالئے
عاشق کو زہر غیر کو مصری کی ہو ڈلی
اس طرح کی نہ بات زباں سے نکالئے
نامحرموں کی آنکھ نہ لگ جائے پہ جا پڑے
سینہ کھلا ہوا ہے دوپٹہ سنبھالئے
خوش چشم سب جہاں کے امانتؔ ہیں بے وفا
جی چاہتا ہے آنکھ کسی پر نہ ڈالئے

غزل مضمون اور اسلوب کے اعتبار سے پوری طرح لکھنوی مذاق کی حامل ہے۔ غزل میں شروع سے آخر تک لفظی رعایتوں کا التزام عاشق کا محبوب سے ایک ایسے انداز میں تخاطب جس سے محبوب کے بازاری ہونے کا احتمال پیدا ہوتا ہے، غزل میں وصل، بوسہ اور انگیا اور سینۂ صاف جیسی چیزوں کا بے باکانہ ذکر، محبت کے رشتہ میں جسم کا غلبہ، عشق میں قدم قدم پہ رقیب، غیر اور نامحرم کے وجود کا نمایاں احساس اس طرح کی چیزیں ہیں جو اس دور کے شاعروں کی نمایاں خصوصیات سمجھی جاتی ہیں۔ امانتؔ کی غزلوں پر اس مذاق عام کا جو گہرا اثر تھا اس میں رعایت لفظی کی حیثیت سب سے نمایاں ہے، مضمون اس طرح کا بھی ہو کہنے والا اسے تجنیس و ایہام کے دام کا اسیر بنا دیتا ہے۔

اب دوسری غزل دیکھئے:

انساں کا کام حسن پہ میرے تمام ہے
جوڑا ہے سُرخ، لال پری میرا نام ہے
یاقوت زرخرید ہے سرکار کا مری
نوکر عقیق، لعلِ بدخشاں غلام ہے
عاشق کو قتل کرتی ہوں ابرو کی تیغ سے
دن رات مجھ کو خون بہانے سے کام ہے
پوشاک میری سُرخ ہے مکھڑا ہے چاند سا
دیکھو شفق میں رات کو ماہِ تمام ہے
شوخی پہ میری ہوتے ہیں مرغِ چمن حلال
ہر گل کو زیست باغِ جہاں میں حرام ہے
مریخ مجھ سے ہوتا ہے ہر دم جو دو بدو
کرتا ہو گا کے شہیدوں میں نام ہے
استادؔ انجمن میں رہیں سُرخرو سدا
اللہ سے دعا یہ مری صبح و شام ہے

یہ غزل لال پری کی زبانی ہے اور اس لئے غزل کے ساتوں شعروں میں شاعر نے کسی نہ کسی طرح سُرخ رنگ کا التزام پیدا کیا ہے اور ہر جگہ اس میں ایک طرح کا تصنع ہے۔ اس غزل میں خیالات کا اظہار عاشق کے بجائے لال پری کی زبان سے ہوا ہے، جسے شاعرانہ اصطلاح میں محبوب کا نمائندہ سمجھنا چاہیئے۔ اس اہم تبدیلی کا نتیجہ یہ ہے کہ غزل میں وصل، ہجر اور رقیب کے مضامین نظم نہیں ہوئے۔ لیکن لال پری نے اپنے ناز و انداز اور کاروبارِ عاشقی میں اپنے "حسنِ عمل" کا ذکر جس طرزِ خاص سے کیا ہے اس سے اسی طرح کے محبوب کا تصور قائم ہوتا ہے، جس کا ذکر عاشق نے "نکالئے" "سنبھالئے" اور جو سچ پوچھئے تو اندرسبھا کی سب غزلوں کی زینت ہے۔

مثال کے طور پر میں نے اندرسبھا کی جو دو غزلیں پیش کی ہیں ان کے مجموعی انداز کو دیکھ کر یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ان غزلوں میں جس محبت کا ذکر کیا گیا ہے وہ بازاریت اور سوقیت کی حامل ہے چنانچہ اس کے سارے رشتے اور سارے عناصر اسی رنگ میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ حتیٰ کہ ان غزلوں کا محبوب بھی ایک ایسا محبوب ہے جس میں ظاہری حسن و زیبائی اور کشش کی تو کمی نہیں لیکن وہ ہر طرح کی عظمت سے خالی ہے۔ اس محبوب کی پوری شخصیت پر اس کا جسم اور اس

جسم کے دل رُبا انداز چھائے ہوئے ہیں۔ شاعر کا تخیل ہر طرح کے خلوص سے محروم ہے۔ اس میں عموماً تکلف اور تصنع کو دخل ہے۔ اس کی تشبیہوں، استعاروں اور اسلوب اظہار میں بھی آمد کی جگہ آورد کا غلبہ ہے۔ رعایت لفظی اس پُر تصنع اور پُر تکلف اسلوب کا سب سے نمایاں پہلو ہے۔

ان چیزوں کی وضاحت کے لئے اندر سبھا کی باقی غزلوں پر بھی ایک نظر ڈال لیجئے۔

'جائے' 'دُھائے' والی غزل میں محبوب سے عاشق کے تخاطب کا جو انداز ہے اسے دیکھ کر پڑھنے والے نہ عاشق کے متعلق کوئی اچھی رائے قائم کرتے ہیں نہ محبوب کے متعلق۔ یہی صورت اندر سبھا کی باقی غزلوں میں بھی ہے۔ ان غزلوں کے چند ایسے شعر سنئے، جن میں عاشق محبوب سے مخاطب ہے۔

منہ زرد دوپٹے کے نہ آنچل سے چھپاؤ
ہو جائے نہ رنگِ گلِ رخسار بسنتی

بیداد مجھے یاد ہے واللہ تمہاری
یوسف کی قسم اب نہ کروں چاہ تمہاری
للہ قدم شرم کے کوچے سے نکالو
بازار میں ہم دیکھتے ہیں راہ تمہاری
عاشق کی مراد آئے، رقیبوں کو الم ہو
جائے جو سواری کبھی درگاہ تمہاری
بُت بن گئے محفل میں رقیبوں سے نہ بولے
کیا بات ہے، خالق کی قسم۔ واہ تمہاری

بھولی بھالی شکل پر یہ دل تڑپتا ہے صنم
کیا ہی صورت ہو گئی ہے پیاری پیاری ان دنوں

زندہ جب تک ہیں ہم اے جان جفائیں کر لو
یوں سہے گا نہ تمہاری کوئی بیداد کبھی
ستم ایجاد تمہیں ہم نے بنایا جانی
اس طرح دل سے ستم ہوتے تھے ایجاد کبھی

ہوئے ہو تیز ہم پر سنگدل تم گالیاں دے کر
زباں کی تیغ کو خوب آپ نے پتھر چٹایا ہے

ان اشعار میں عاشق و محبوب میں جس بے تکلفی اور بے ساختگی ہے اس میں نہ کسی قسم کی پردہ داری ملحوظ ہے، نہ احترام۔ عاشق کو اچھی طرح معلوم ہے کہ اس کی محبت لین دین کی کاروباری محبت کے سوا کچھ بھی نہیں۔ وہ یہ بھی جانتا ہے کہ محبوب کے ساتھ اس کا رشتۂ محبت کسی ابدی تعلق کی بنا پر استوار نہیں۔ ایک عارضی لذت اور دل لگی اس کا مقصود ہے۔ اور اس لئے وہ ہمیشہ اس سے اس طرح مخاطب ہوتا ہے جیسے محبوب سے محبت کر کے اس نے اس پر کوئی احسان کیا ہے۔ اس کے لہجہ میں طنز اور تمسخر بھی اسی بنا پر ہے۔ وہ محبوب سے کوئی مذاق کی بات بھی کرتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ اسے محبوب کی کمتری کا پورا پورا احساس ہے۔ محبوب سے یہ کہنا کہ واللہ اب میں تم سے چاہ نہ کروں گا یا یہ کہ جب تک ہم زندہ ہیں ہم پر جفائیں کر لو، پھر تمہیں ہم جیسا عاشق نصیب نہ ہو گا اور یا یہ کہ اے جان! تمہیں ستم ایجاد بنانے کا سہرا ہمارے سر ہے کسی ایسے ہی عاشق کا شیوہ ہو سکتا ہے جو عشق کو زندگی کی پست سطح کی ایک چیز سمجھتا ہے، ایسا ہی عشق ہے جو عاشق سے یہ کہلواتا ہے کہ اے جان! شرم کے کوچے سے قدم نکالو، ہم بازار میں بیٹھے تمہاری راہ دیکھ رہے ہیں یا ہم اس دن کے منتظر ہیں جب تمہاری سواری حضرت عباس کی درگاہ جائے۔ اس دن ہماری مراد برآئے گی اور رقیبوں کو الم ہو گا۔

محبوب سے عاشق کے اس انداز تخاطب سے محبوب کی شخصیت کا جو پست معیار نظر کے سامنے آتا ہے اسے اندر سبھا کی غزلوں کے دوسرے اشعار سے اور زیادہ تقویت پہنچتی ہے۔ مثلاً یہ شعر دیکھئے:

کل گھر سے جو وہ نکلا اک حشر ہوا برپا
دل پس گئے عالم کے رفتار اسے کہتے ہیں

میں مر گیا تو رو کے یہ کہنے لگا وہ شوخ
کس کو سناؤں گالیاں، کس پر جفا کروں

ہیں قیامت مُبتنبہ شرم و حیا کی باتیں
کبھی کہتا ہے امانت کبھی استاد مجھے

ان تین شعروں میں سے پہلے سے تو ہمارے سامنے ایک ایسے منظر کا تصور آتا ہے جس میں محبوب باندازِ دل ربائی گلی کوچوں اور بازاروں میں مصروفِ خرام ہے اور ہر دیکھنے والا رفتار کی شوخی پہ جان نثار کر رہا ہے۔ دوسرے شعر میں محبوب کی یہ حسرت ہمارے سامنے آتی ہے کہ اب وہ اپنے شیوۂ جفا کی آزمائش کس پر کرے گا اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ گالیاں کسے سنائے گا کتنی عجیب و غریب حسرت ہے! اور آخری شعر تو گویا خود شاعر کی (یا عاشق کی) زبان سے محبوب کی شخصیت اور کردار کا خلاصہ ہے ؏

ہیں قیامت بُتِ بے شرم و حیا کی باتیں

محبوب خود اپنی گفتار و رفتار سے "بے شرمی و بے حیائی" کا جو مجسمہ پیش کرتا ہے اس پر شاعر (یا عاشق) نے "بتِ بے شرم و حیا" کی مہر ثبت کر کے اسے نقشِ دوام عطا کیا ہے۔

محبوب کی بازاریت، اور عشق کی پستی کا یہ انداز غزلوں کے ان شعروں میں بھی جھلکتا ہے جن میں عاشق نے بات کہنے کا ایک ایسا لہجہ اختیار کیا ہے جو تخیل اور اظہار دونوں حیثیتوں سے پستی کا مظہر ہے مثلاً ان شعروں میں ؎

پلکیں جھپکانے کا قاتل کو ہوا ہے تا زہ شوق
چل رہی ہے دل پہ عاشق کے کٹاری ان دنوں

لہو بہتا ہے غیروں کا ہمارا دم نکلتا ہے
گلے پر پھیرتا خنجر نہیں، جلاد کیا کیجیے

مدتوں ہم نے نکالا وصل میں دل کا بخار
فرقتِ دلدار میں ہے تپ کی باری ان دنوں

یہ حیثیت ان شعروں میں خاص کر نمایاں ہے جن میں شاعر نے بوسہ کے مضامین بڑی بے تکلفی، بے باکی اور بے حجابی سے نظم کئے ہیں ؎

بوسے جو طلب میں نے کئے ہنس کے وہ بولے
سرکار سے موقوف ہے تنخواہ تمہاری

بوسے جو طلب میں نے کئے ہنس کے وہ بولے
کیا ہم کو جھنکاتی ہے کنویں جاہ تمہاری

لوں بوسہ زلف کا تو دبائے گلا اجل
پھانسی ملے مجھے جو ختن میں خطا کروں

اک بوسہ پہ یہ گالیاں اللہ کی پناہ
کچھ میں بھی اب کہوں گا زباں کو سنبھالئے

شب گزری، سحر آئی، بک بک کے تھکا عاشق
بوسہ نہ دیا اس نے تکرار اسے کہتے ہیں

لیا ہے ابروئے قاتل کا بوسہ عین غصہ میں
جگر دیکھو ہمارا منہ پہ کیا تلوار کھائی ہے

مکرر بوسہ لینے سے مزا ملتا ہے دنیا کا
لبِ شیرینِ جاناں قند کی گویا مٹھائی ہے

رُخِ رنگیں کے بوسے غیر کی غیبت میں لیتا ہوں
اڑا ہے باغ سے صیاد، بلبل کی بن آئی ہے

بوسہ کے ان مضامین میں محبت کے اس رشتۂ خاص کی جس کے مصوّر امانت (اور ان کے دوسرے ہم عصر) ہیں پوری داستان منظوم و مرقوم ہے۔ اس داستان کے کرداروں کی شخصیتیں بھی ان اشعار کے آئینہ میں صاف اپنا جلوہ دکھاتی ہیں۔ بوسہ اس داستانِ محبت اور حیاتِ معاشقہ کا ایسا معمول ہے جس کی طلب و حصول کے راستے میں شخصی یا اجتماعی اخلاق کی کوئی قدر حائل نہیں ہوتی۔ عاشق اور رقیب اس قندِ مکرر کی حلاوت میں برابر شریک اور حقدار ہیں۔ یہاں تک کہ عاشق انتہائی رواداری اور فراخ دلی سے رقیب کے اس حق کو مسلّم جان کر اس کے ذکر میں کسی طرح کے تکلف سے کام لینے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ اس معمول میں محبوب کی شرکت بھی بکمال فیاضی ہے۔ وہ عاشقوں کو یہ جنسِ گراں مایہ بے طلب دیتا ہے اور اس طرح دیتا ہے جیسے کسی سرکار دربار کے حلقہ بگوشوں کو وظیفے دیے جاتے ہیں۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ہزار بار طلب کر لینے پر بھی کام و دہن اس چشمۂ حیات کی حلاوت سے محروم رہتے ہیں، اور کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ عاشق کی جرأتِ رندانہ محبوب کی مرضی

کے خلاف اس کے خشمِ ناز کی پروا کئے بغیر اپنی طلب پوری کر لیتا ہے۔

ان اشعار میں سے بعض تو اپنے مفہوم کے اعتبار سے بالکل واضح ہیں اس لئے کہ شاعر نے اپنی بات پر کسی طرح کا پردہ ڈالنے کی کوشش نہیں کی لیکن بعض جگہ الفاظ کا انداز ایسا ہے کہ ان کی دلچسپ اور معنی خیز تاویلیں ممکن ہو جاتی ہیں۔ مثلاً یہ شعر ؎

اک بوسہ پہ یہ گالیاں اللہ کی پناہ
کچھ میں بھی اب کہوں گا زباں کو سنبھالئے

"کچھ میں بھی اب کہوں گا زباں کو سنبھالئے" میں معنی کے نہ جانے کتنے دفتر پوشیدہ ہیں۔ اس مصرعہ میں دل جلے عاشق نے "کچھ میں بھی اب کہوں گا" کے ٹکڑے سے محبوب کے دل میں ان ناگفتہ بہ واقعات کی یاد تازہ کرنے کی کوشش کی ہے، جو محبوب کی زندگی کا معمول ہیں اور جن میں خود عاشق کے علاوہ رقیب اور بیگانے بھی شریک ہیں یعنی "آج یہ عالم ہے کہ اک بوسہ پہ گالیاں دی جا رہی ہیں شاید تم بھول گئے کہ اس سے پہلے بارہا میرے، اور دوسروں کے ساتھ کیا بے تکلفیاں پیش آ چکی ہیں"

اندر سبھا کی غزلوں کی یہ محبت اس کا محبوب، اس کا عاشق ساری کی ساری چیزیں ایک ہی سطح کی ہیں، اور یہ بات بالکل واضح ہے کہ یہ سطح پستی اور سوقیت کی سطح ہے۔ اس محبت میں محبت کا وہ خلوص اور وہ صداقت ناپید ہے جس میں عاشق محبوب کی خوشنودی کی خاطر اور اس کی محبت کی پردہ داری کے لئے طرح طرح کی سختیاں جھیلتا ہے۔ خود رسوا ہوتا ہے، لیکن محبوب کی رسوائی گوارا نہیں کرتا۔ جان پر آ بنتی ہے لیکن دل کی بات زباں پہ نہیں آتی کہ "اپنی نسبت سے [illegible] شان ہے۔"

جس طرح اندر سبھا کی غزلیں موضوع اور مضمون کے اعتبار سے ہر طرح کے جذباتی خلوص اور پاکیزگی سے عاری ہیں اسی طرح ان کا اسلوب اظہار بھی سرتاسر تصنع کی خصوصیات کا حامل ہے۔ شاعر نے روداد محبت کے مختلف مراحل اور عشق کی بے شمار واردات کے بیان میں اپنے تخیل اور تصور کی جس کاوش سے کام لیا ہے اس میں خلوص کی شدید کمی ہے۔ واردات عشق کے مختلف اشعار میں جو جو تجربات پیش کئے گئے ہیں وہ شروع سے آخر تک ذہنی اور تخیلی ہیں انہیں دل کی لگن سے کوئی تعلق نہیں۔ کچھ شعر سنئے۔

چڑھ گیا جب کہ فلک پر مری آہوں کا دھواں
گر گئی خلق کی نظروں سے گھٹا ساون کی
کیوں دم گریہ تصور نہ مجھے زلف کا ہو
رات ہوتی ہے سیاہی میں بلا ساون کی

نئی ہے روشنی اپنی لحد پہ تنگ دستی سے
چراغوں کے عوض اس شمع رو نے دل جلایا ہے

شب تاریک فرقت میں کرے کون اپنا دل روشن
چراغ اندھا ہے چربی شمع کی آنکھوں پہ چھائی ہے
و فور خط سے ہے یہ رنگ جلد مصحف عارض
کلام اللہ کی کافر نے کیا صورت بنائی ہے
بلاتا ہوں فلک کو بعد مردن اپنے ہاتھوں سے
لحد سے پاؤں پھیلا کر زمیں سر پر اٹھائی ہے

سایہ کی طرح خط بڑھا چہرۂ صاف اتر گیا
آیا زوال یار پہ، حسن کی دوپہر ڈھلی
تار کشی نہ و بیٹھ تو اوڑھے کرن جوڑا نک کر
ہو شب ماہتاب میں کیا ہی صنم جھلا جھلی
زندگی سے تنگ ہوں بے یار باغ دہر میں
بے کلی ہے دل کو وہ غنچہ دہن ملتا نہیں
جس کی خاطر جھانکتی ہیں بحر الفت کے کنوئیں
وہ غریق قلزم رنج و محن ملتا نہیں

ان شعروں میں کسی ایک میں بھی خلوص کی سادگی نہیں تخیل نے جھوٹے جذبات کے اظہار کے لئے جو جولانیاں دکھائی ہیں ان میں بھی سننے اور پڑھنے والوں کے لئے کوئی دلکشی نہیں یہی صورت ان تشبیہوں کے ساتھ ہے جو شاعر نے غزلوں میں جابجا اپنے خیالات اور جذبات کی ترجمانی کے لئے استعمال کی ہیں۔ چند شعر اس طرح کے بھی ملاحظہ کیجیے۔

زلف جاناں کے قریں یوں ہے دوپٹہ اوڑھنا
شب تاریک میں جس طرح گھٹا ساون کی

موتی کانوں میں پہن، یار کی زلفوں کے قریں
چھائے بھادوں کے ہیں وہ اور یہ گھٹا ساون کی

رُخِ رنگیں کو ہنس کر زلف میں اس نے چھپایا ہے
طپاں ہے ابر میں بجلی، چمن میں ابر چھایا ہے

نہیں ماتھے سے افشاں اس کے رُخ پر چھٹ کے آئی ہے
جبینِ شربتِ دیدار پر چھڑکی ہوائی ہے

سبز جوڑے میں ہے کیا چہرۂ روشن کی ضیا
صبح کو چاندنی نے کھیت کیا دھان کے بیچ

عیاں سیندور کا ٹیکا نہیں محرابِ ابرو میں
چراغ اس شمع رو نے عین کعبہ میں جلایا ہے

سچ پوچھیے تو تخیل اور تصور کا یہ سارا تصنع اور جذبات کے اظہار میں ان دور از کار اور بے تاثیر تشبیہات کا صرف ایک خاص عہد کے اسلوبِ نگارش کا پرتو ہے۔ تخیل، تصور اور احساس میں تصنع کا یہ رنگ اس عہد کے بیان کی ایسی خصوصیت ہے جو امانت کے دوسرے ہم عصروں کے کلام میں بھی نمایاں ہے۔ لیکن اس تصنع کی پوری بہار اور چہلکی ان شعروں سے بھی کہیں زیادہ ان شعروں اور مصرعوں میں ہے جن میں شاعر نے لفظی رعایتیں پیدا کرنے اور انہیں ایک خاص التزام کے ساتھ صرف کرنے میں اپنے فکر اور تخئیل کی پوری قوت سے کام لیا ہے۔ اندرسبھا کی غزلوں میں یہ لفظی رعایتیں اتنی کثرت سے ہیں کہ غزلوں کے مضامین اور اسلوب کے دوسرے پہلو اس کے نیچے دب کر رہ گئے ہیں۔ اس لئے غزلوں کی اصلی بہار دیکھنی ہو تو ایسے چند شعروں کی سیر کیجئے جو اس شاعرانہ خصوصیت کے حامل ہیں ؎

بیدار مجھے یاد ہے واللہ تمہاری
یوسف کی قسم اب نہ کروں چاہ تمہاری
للہ قدم شرم کے کوچے سے نکالو
بازار میں ہم دیکھتے ہیں راہ تمہاری

اندھیرے ہے لگاؤں میں اس شمع رو سے لو
پروانۂ غیر پردہ رہے میں جلا کروں

عاشق کو زہر غیر کو مصری کی ہو ڈلی
اس طرح کی نہ بات زباں سے نکالیئے

زہرہ مرے خیال میں ڈھنتی ہے سر سدا
مرتے ہیں تانسین تمہارے کی تان پر

راگ لا کر بزم میں عاشق بڑا کرتے ہیں حال
چھیڑیئے للہ پردے میں ستاری ان دنوں

توڑتا بیڑیاں دوہری نہ اگر وحشت میں
مانتا کاہے کو لوہا مرا حدادِ کبھی

مقابل سرو کو پا کر گلستاں میں وہ گل بولا
غلام اپنا جو ہو دل سے اسے آزاد کیا کیجے

ہوئے ہو تیز ہم پر سنگدل تم گالیاں دے کر
زباں کی تیغ کو خوب آپ نے پتھر چٹایا ہے

بازارِ وفا گرم ہے اے یوسفِ ثانی
دل بیچتا ہے تیرا خریدار خبر لے

تجھ سا نہ شکریں دہن ہو گا حسین کوئی کن
شاخِ نبات ہونٹ ہیں، لب ہیں نبات کی ڈلی
یار سا نازنیں کوئی کب ہے ریاضِ دہر میں
بوجھتے وہ دو سر ہوا، جوڑا جو پہنا صندلی

پان لے کے کیا کروں کسی سبز رنگ کا دھیان ہے
ہڈیاں چونا ہیں مری، جسم دھان پان ہے

عشق لہو بن کے رنگ لایا ہے
فراق نے قتل کا بیڑا اٹھایا ہے

گلوری لیے مجھے کیا تکتا ہے
فقیروں کا منہ کون کیل سکتا ہے

باؤلی ہوں بحرِ الفت میں زلیخا کی طرح
یوسفِ گم گشتہ کا چاہِ ذقن ملتا نہیں

شکل طاؤسِ گلستاں ہوں سراپا داغ دار
گل بدن پر کھائے ہیں وہ گل بدن ملتا نہیں
صورتِ فرہاد میں نے چھان مارے سب پہاڑ
پر کوئی استاد سا شیریں سخن ملتا نہیں

ان چند اشعار میں خط کشیدہ الفاظ پر نظر ڈال کر یہ اندازہ لگانا آسان ہے کہ ان سب اشعار میں خیال اور بیان دونوں پر تصنع کا غلبہ ہے اور اس لیے ان میں نہ کوئی شاعرانہ لطف ہے نہ جذباتی کشش کہیں کہیں رعایت لفظی میں محاوروں کا صرف البتہ اتنی بے تکلفی سے ہوا ہے کہ پڑھنے والا شاعر کی قدرتِ بیان کی داد دیے بغیر نہیں رہتا۔

اندر سبھا میں خیال اور اظہار کا عام انداز یہی ہے۔ کہیں کہیں البتہ ایسے شعر بھی آجاتے ہیں جن میں بیان کی سادگی، بے تکلفی اور شوخی نے لطف پیدا کیا ہے۔ اس طرح کے چند شعر سن لیجیے ؎

اے بت ترے سوا نہیں کونین کی ہوس
اللہ سے کروں تو تری التجا کروں

جی چاہتا ہے صنعتِ صانع پہ ہوں نثار
تجھ کو بٹھا کے سامنے یادِ خدا کروں

ہر چند چاہتا ہوں میں لوں لوں نہ یار سے
قابو میں اپنے دل کو نہ پاؤں تو کیا کروں

ایسے مزے اٹھائے ہیں آزارِ عشق میں
آئیں مسیح بھی تو نہ اپنی دوا کروں

بے عشق کچھ جہاں میں نہیں زیست کا مزا
دل یار کو نہ دوں میں امانت تو کیا کروں

خوش چشم سب جہاں کے امانت ہیں بے وفا
جی چاہتا ہے آنکھ کسی پر نہ ڈالیے

بلبلو کس کو دکھاتی ہو عروجِ پرواز
ہم بھی اس باغ میں تھے قید سے آزاد کبھی

کسی کی زلف کی جانب جو کھنچ رہا ہے دل
بلائے تازہ مرے سر پہ لائے گا پھر کیا

ابر بھاگا ہوا جاتا ہے خدا خیر کرے
آج بدلی نظر آتی ہے ہوا ساون کی

نہیں بے وجہ پیہم ہچکیاں آتی ہیں فرقت میں
کسی محبوب کو تو اے امانت یاد آیا ہے

اتنا بھی نہیں چاہیے عاشق سے تغافل
سو بار اگر ٹال دے، اک بار خبر لے
آغازِ محبت میں نہیں زیست کی امید
مرتا ہے ترا تازہ گرفتار خبر لے

اوپر کے اشعار میں کہیں کہیں خلوص اور سچائی کی جو جھلک ہے اس نے اشعار کے اسلوب کو متاثر کیا ہے اور مجموعی حیثیت سے پڑھنے والے کے لیے ان میں ایک جذباتی کشش اور شاعرانہ لطف پیدا ہو گیا ہے اس طرح کی کشش اور یہ لطف غزل کے شعروں میں کم ہونے کی سب سے بڑی وجہ بظاہر یہی ہے کہ لکھنوی انداز شاعری میں لفظی رعایتوں کی جو طرف خاص توجہ ہے، اس نے شاعری کو تصنع اور آورد کا مرقع بنا دیا ہے۔ یہ بات کہ جہاں یہ تصنع اور آورد نہ ہو وہاں شاعری مختلف حیثیتوں سے پرکشش اور جاذب ہوتی ہے ان گیتوں کو دیکھ کر اور زیادہ واضح ہوتی ہے جو اندر سبھا میں راجا اندر کی محفلوں میں گائے گئے ہیں۔ ان گیتوں میں ہندی شاعری کی روایات کا گہرا اثر ہے اور ان روایات میں سب سے اہم یہ ہے کہ اظہارِ محبت ہر جگہ عورت کی طرف

سے چھا ہے، جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ جذبات و احساسات میں ایک طرح کی نزاکت اور نرمی پیدا ہو گئی ہے۔ اور جذبہ اور احساس کی نزاکت اور نرمی نے بیان میں نرمی اور رگھلاوٹ پیدا کی ہے۔ پھر شاعر کو ان گیتوں میں الفاظ کے حرف اور تشبیہوں کے استعمال میں بھی بھاشا کی اس روایت کی پابندی کرنی پڑی ہے، جو تصنع سے زیادہ سادگی کی طرف مائل ہے۔ غزلوں کے مقابلہ میں گیتوں میں یہ نزاکت، نرمی اور رگھلاوٹ کس کس طرح جاگزیں ہے، اس کا اندازہ کچھ مثالوں سے کیجئے۔ پہلے پکھراج پری کی گائی ہوئی ایک ٹھمری سنئے:

آئی ہوں سبھا میں چھانڈ کے گھر
کاہو کی نہیں مجھے آج کھٹبر
تیری ہوں تیری راجا اندر
رکھنا دن رین دیا کی نجر
سونے کا براجے سیس مکٹ
روپے کے تکھت پر بیٹھ نڈر
چاروں کونوں پر لال لٹیں
داتا کا کرم رہے آٹھ پہر
سایہ رہے پیر پیمبر کا
مولا کی سدا رہے نیک نجر

ٹھمری کے ان بولوں میں کتنی سادگی اور کتنی سچائی ہے۔ سیدھے سادے خیالات ہیں اور سیدھے سادے لفظوں میں ادا ہوئے ہیں اور سننے والے کے دل میں گھر کرتے ہیں۔

پکھراج پری اس دعائیہ ٹھمری کے بعد بہار کی دُھن میں ایک بسنت گاتی ہے ؎

رُت آئی بسنت عجب بہار
کھلے جرد پھول برچھن کی ڈار
چٹکی کسم، کھلنے لاگی سرسوں
پھیلت چلت گیندن کے ہار
ہر کے دوارے مالی کا چھورا
گر ڈارت گیندن کے ہار

ٹیسو پھولے، انبا بورائے
چنپا کے رُوکھ کلین کی بہار
گرو والے استاد کے دوارے
چلو سب سکھین کر کر سنگار

بسنت رت کی کتنی سچی، سادہ لیکن رنگین اور دلکش تصویر ہے۔ درختوں پر ہر طرف زرد پھول کھلے ہوئے ہیں۔ کسم چٹک رہی ہے سرسوں کے پھول کھلنے لگے۔ گیندے کے ہار ہر طرف بکھرے پڑے ہیں۔ مالی کا لڑکا مندر کے دروازے پر گلوں میں گیندے کے ہار ڈال رہا ہے۔ ٹیسو پھول رہا ہے اور آم میں بور نکل رہے ہیں۔ چنپا کے پودوں پر کلیاں بہار دکھا رہی ہیں۔ ایسے میں سب سکھیوں کا جی چاہتا ہے کہ سنگار کر کے استاد کے دروازے پر جا پہنچیں۔ اس بے لوث تصویر میں کتنی رنگینی کتنی بہار اور سادہ جذبات میں کتنی سچائی اور کتنا خلوص ہے۔ اب ذرا ساون اور جھولں کی بہاریں بھی دیکھ لیجئے۔ پہلے لال پری کی زبان سے ایک ساون سنئے:

بن پیا گھٹا نہیں بھاوے
رہ رہ دل روند صوآوے　　بجری کی چمک چمکاوے ڈراوے
بن پیا گھٹا نہیں بھاوے
رُت برکھا کی آئی ری گئیاں　　آج جیا کو کل نہیں آوے
موری اور سے یا بن سجنی　　کوئی جائے اس کو سمجھاوے
بن پیا گھٹا نہیں بھاوے
امنڈ گھمنڈ کاری بدریا　　موہے ناحک ستاوے
کوئی پون پر وائی سے جا کہہ　　اور ملک بر ساوے جاوے
بن پیا گھٹا نہیں بھاوے
کا سے کہوں اس مینہ بوندیاں ما　　لکھ پتیاں جو پٹھاوے
پیتم کو کوڈ پھری برکھا میں　　دئی مارسے سے ملا دے لاوے
بن پیا گھٹا نہیں بھاوے
بھیجت ہوں آنسوؤں کی بوندن کا　　میگھا جھڑ نہ لگاوے
پیر استاد کو مان کے اپنے　　بن پربت پر جاوے جاوے
بن پیا گھٹا نہیں بھاوے

---

۱ پیوڑے کے ۲ خبر ۳ نظر ۴ پہنچ ۵ سر ۶ تاج ۷ زرد ۸ درختوں کی شاخیں ۹ کھلنے لگی ۱۰ چمیلی چلتی ہے ۱۱ گردن ۱۲ ڈالتا ہے ۱۳ آموں میں بور پھولا ہے ۱۴ درخت

ساون کا موسم ہے۔ اس موسم میں پیا سے بچھڑی ہوئی ایک سہاگن کے دل کا جو حال ہے اسے شاعر نے اسی کی زبان سے بیان کیا ہے اور اس طرح بیان کیا ہے کہ جی کی بات سیدھے سیدھے لفظوں میں ادا ہو جائے۔ گھٹا چھائی ہوئی ہے، لیکن پیا کے بغیر اس گھٹا میں کوئی لطف نہیں۔ گھٹا آسمان پہ آتی ہے تو وہ رہ کر دل روندھا جاتا ہے، بجری چمکتی ہے اور جی دہل جاتا ہے تو پیا کی یاد اور بھی ستاتی ہے، اور دکھ کی ماری اپنی سکھی سے کہتی ہے کہ "اے گیّاں، آج میرے جی کو ذرا بھی چین نہیں۔ آج کوئی میری طرف جا کر پیا کو سمجھائے اور اسے میرے پاس لائے ——— کہ میرے جی کو اس کے بغیر کل نہیں پڑتی — کالے بادل امنڈ گھمنڈ کر کیوں آتے ہیں، اور کیوں ناحق مجھے ستاتے ہیں۔ کوئی جا کر پروائی ہوا سے کہہ دو کہ ان بادلوں کو کسی اور دیس میں جا کر برسا دے اس لئے کہ مجھے یہ بادل پیا کے بغیر ذرا بھی اچھے نہیں لگتے۔ میں اس بوندا باندی میں کس سے کہوں کہ خط لکھ کر پیا کے پاس بھیجا اور اس بھری برسات میں مجھ برہ کی ماری سے اسے لا کر ملا دے — میں آنسوؤں کی بوندوں میں بھیگ رہی ہوں۔ بادل سے کہہ دو کہ وہ جھڑی نہ لگائے اور اپنا ڈیرہ بن اور پربت میں جا کر جمائے — مجھے پیا کے بغیر گھٹا ذرا بھی نہیں بھاتی۔

اس پورے جذباتی تجزیہ کا مقابلہ اندرسبھا کی غزلوں سے کیجئے تو زمین آسمان کا فرق معلوم ہوتا ہے — سچ اور جھوٹ، سادگی اور تکلف، خلوص اور تصنع میں جو فرق ہے وہی فرق اس ساون اور اندرسبھا کی غزل میں ہے۔ صداقت، سادگی اور خلوص کی یہ صفات جن سے اندرسبھا کی غزلیں قطعی ناآشنا ہیں، ان سب گیتوں کی جان ہیں، خواہ وہ ٹھمری ہو، خواہ بسنت، خواہ ساون، خواہ ہولی۔ لال پری نے دیس کی دھن میں سندھی کانی کے طرز پر ایک ہولی گائی ہے اس میں جذبات کا یہ خلوص اور سچائی ایک دوسرے انداز سے ظاہر ہوئی ہے۔ ہولی کے بول یہ ہیں:

لاج رکھو بے شیاؔ ہماری — میں چیری ہوں تمہاری
جبراؔ دے سمجھ کے گاری

عبیر گلال نہ مکھ پہ ڈارو — نہ مارو پچکاری
آدمی دیکھیں سب دیکھیں گی — ساڑی بھیجے نہ ساری

کہیں سگے لوگ منواری
تم چاتر ہولی کھیلیا — ہم ڈرپوک اناری
تاک جھانک لگامت موہن — جاؤں تورے بلہاری
نہ کر موسے جان سے عاری
لاکھ کہی تم ایک نہ مانی — بنتی کر کے ہاری
یا ہی گھڑی ستادے جا کر — کہیو حقیقت ساری
کہاں جاؤگے گردھاری

عورت کے جذبات ہیں۔ اسے اپنی کمتری اور مرد کی (خصوصاً شیام یا گردھاری جیسے مرد کی) برتری کا پورا اندازہ اور احساس ہے۔ یہی اندازہ اور احساس اس کے دل میں جو جذبات پیدا کرتا ہے انہیں وہ بڑے بے لوث انداز سے بیان کر دیتی ہے۔ ہولی کے الفاظ شروع سے آخر تک عاجزی، خوشامد اور لجاجت کے جس لہجہ میں ڈوبے ہوئے ہیں ان سے پوری ہولی میں ایک دلکش فضا پیدا ہو گئی ہے اور پڑھنے والا اپنے تصور کی مدد سے اس پورے واقعہ کی جیتی جاگتی تصویر بنا لیتا ہے اس میں پُرخلوص رومان کی کسک بھی ہے اور رس اور مٹھاس بھی یہی کسک اور یہی رس اور مٹھاس ہے جس کی تلاش پڑھنے والا غزلوں میں (یعنی اندرسبھا کی غزلوں میں) ناحق کرتا ہے۔

غزلیں اور دوسرے گیت شاعرانہ مذاق اور اسلوب اظہار کے اعتبار سے ایک دوسرے سے اتنے مختلف ہیں کہ پڑھنے اور سننے والے کو اس فرق پہ حیرت ہو سکتی ہے۔ حالانکہ غور کیا جائے تو یہ فرق لازمی طور پر اس لئے پیدا ہوتا ہے کہ غزل اور ٹھمری یا ہولی کے مزاج میں ایک بنیادی فرق ہے۔ دونوں مختلف ماحولوں اور فضاؤں کی چیزیں ہیں اور ماحول اور فضا کے اس اختلاف نے دونوں کے مجموعی انداز پر اثر ڈالا ہے۔ اور دونوں کی جذباتی سطح اور فنی ساخت ایک دوسرے سے اتنی الگ دکھائی دیتی ہے۔ حقیقت میں دونوں کا یہی بنیادی فرق ہے جس کی بنا پر امانت نے اندرسبھا کی تشکیل و ترتیب میں دونوں کو برابر کی جگہ دی ہے۔ اندرسبھا میں شہزادہ گلفام کے علاوہ چار گانے والے کردار ہیں۔ یہ چاروں اسٹیج پر آتے ہیں تو ان کے گانوں میں غزلوں اور دوسرے گیتوں کا توازن تقریباً ایک سا رہتا ہے، مثلاً پکھراج پری نے جو چھ گانے

۱؎ ذرا ۲؎ گالی ۳؎ جسم ۴؎ دکھائی دے گی ۵؎ مت بھگونا ۶؎ ہوشیار ۷؎ کھیلنے والے ۸؎ قربان ۹؎ خوشامد۔

گاتے ہیں ان میں تین غزلیں ہیں، ایک ٹھمری، ایک بسنت اور ایک ہولی۔ نیلم پری کے پانچ گانوں میں تین غزلیں ہیں، ایک ٹھمری اور ایک ہولی۔ لال پری کے چھ گانوں میں ۳ غزلیں ہیں اور تین دوسرے گیت۔ اسی طرح سبز پری کے بارہ گانوں میں سے ۶ غزلیں ہیں اور چھ دوسرے گانے — پانچ ٹھمریاں اور ایک ہولی۔ یہ برابر کی تقسیم ظاہر ہے کہ ارادی ہے اور اس کا مقصد یہ ہے کہ جب اندر سبھا اسٹیج پر پیش کی جائے تو مختلف مذاق کے دیکھنے والوں کے لئے دلچسپی اور تفریح کا سامان مہیا ہو سکے۔

اندر سبھا کی پوری ساخت میں یہی جذبہ کام کر رہا ہے کہ دیکھنے والوں کو مختلف مذاق کے گیت سنا کر اور ان کی پسندیدہ دھنوں اور طرزوں میں سنا کر محظوظ کیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ امانت نے غزلوں اور گیتوں کے ساتھ عموماً دھنوں اور کبھی کبھی راگ راگنیوں کے اشارے کئے ہیں۔ غزلوں میں برابر یہ بات پیش نظر رکھی ہے کہ ان کی بحریں ایسی ہوں جنہیں آسانی سے ترنم کے پسندیدہ سانچوں میں ڈھالا جا سکے۔ یہی صورت دوسرے گیتوں کے معاملہ میں بھی ہے۔ چاروں پریوں نے مل کر جو گیت گائے ہیں ان میں ٹھمری، ہولی، بسنت اور ساون جیسی چیزیں شامل ہیں، لیکن ان چودہ گیتوں میں سے آٹھ ٹھمریاں ہیں، اس لئے کہ ٹھمری ان سب طرح کے گیتوں میں ہر لحاظ سے سب سے زیادہ پسندیدہ سمجھی جاتی ہے۔ یہ بات ایک اور طرح بھی ہمارے سامنے آتی ہے۔ جن چار پریوں نے اندر کی محفل میں آکر دادِ نغمہ دسرائی دی ہے ان میں سب سے نمایاں حیثیت سبز پری کی ہے۔ وہ قصہ کی ہیروئن بھی ہے اور یقین ہے کہ اس پارٹ کے لئے جس گانے والی کو چنا جائے گا وہ ہر لحاظ سے دوسری گانے والیوں میں ممتاز ہوگی۔ اس امتیاز کی ایک واضح دلیل تو یہ ہے کہ سبز پری نے محفل میں آکر ۱۲ گانے گائے ہیں، دوسری پریوں نے اس کے مقابلہ میں ۶، ۵، اور ۵۔ ان بارہ گانوں میں سے چھ غزلیں ہیں اور چھ گیت اور چھ گیتوں میں پانچ ٹھمریاں ہیں۔ یوں گویا امانت کے سامنے جہاں ایک طرف یہ بات ہے کہ انہوں نے رقص و موسیقی کو اندر سبھا کی دلچسپی کی بنیاد بنایا ہے وہاں دوسری طرف یہ بات بھی برابر پیش نظر رکھی ہے کہ اندر سبھا کے گانوں کی ترتیب شروع سے آخر تک ایسی ہو کہ ہر طرح کے دیکھنے اور سننے والے ان سے محظوظ اور لطف اندوز ہو سکیں۔ غزلوں اور گیتوں کے باہمی توازن اور ان کی جذباتی اور ذہنی سطح کے نمایاں فرق اور دونوں کے مزاج کی فنی خصوصیتوں کے اختلاف نے امانت کے اس مقصد کو کامیاب بننے میں مدد دی ہے۔ اس لئے اندر سبھا کی موسیقی کا تجزیہ کرتے وقت اس واضح حقیقت کو کسی طرح بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ یہ واضح حقیقت اندر سبھا کے فن کا ایک نمایاں پہلو ہے۔ اور اس سے ہمارا ذہن خود بخود اس مقبول عام قصے کے دوسرے فنی پہلوؤں کی طرف منتقل ہوتا ہے۔

غزل

فراق گورکھپوری

اے وائے وہ بانیٔ جفا ہو
جو ٹوٹے دلوں کا آسرا ہو

ہوتا ہے یہاں وہی جو چاہو
معلوم ہوا کہ تم خدا ہو

جو دل میں خوشی کی انتہا ہے
غم کی شاید وہ ابتدا ہو

کیا کیا نہ سنا تمہاری خاطر
شاید تم نے بھی کچھ سنا ہو

بھر پایا تیری چاہ کر کے
اب دل میں جو کوئی مدعا ہو

یہ رنگِ عشق ابتدا میں
کیا جانیے کچھ دنوں میں کیا ہو

ایسا بھی ہے کوئی فتنۂ دور
چالوں سے نہ تیری جو اٹھا ہو

دامن میں غبارِ عشق رکھ لے
شاید کہ یہ خاک کیمیا ہو

لذت جو گناہِ عشق میں ہے
کیا جانو تم اس کو بیگنا ہو

جمہور کا دور آرہا ہے
سن لو دنیا کے بادشاہو

اچھا ہوا عشق تھا اکیلا
کیا کیا نہ جنوں میں کہہ گیا ہو

وہ غم دل پر گراں ہے کتنا
جس غم کو سہار بھی لیا ہو

آتے ہیں گناہگارِ الفت
اب اے درِ خلد تو بھی وا ہو

ہاں ہم بھی دوسرے کو چاہیں
دنیا میں جو کوئی دوسرا ہو

بدلے نظر آئے تیور اس کے
اب اے دل بیقرار کیا ہو

تجھکو رسوا کیا ہے میں نے؟
تیرا جو نام بھی لیا ہو

ہم لوگ فقیرِ عشق ٹھہرے
اس نے جو کچھ بھی دے دیا ہو

باتوں سے مری وہ بدگماں ہے
دل نے بھی نہ کچھ کہا سنا ہو

گنتا نہیں عشق آج تارے
جیسے سرِ شام سو گیا ہو

جس کو انکار ہو وہ کافر
اے حضرتِ عشق تم خدا ہو

اک بات کہیں فراق تم سے
اب عشق کیا ہے تو نبا ہو

افسانہ

یادِ ایّامے

(۱)

ابوالفضل صدیقی

تایا، پرانے باپ اور چچا قسم کے شکاریوں کے بھی تایا تھے۔

کرکٹ، ہاکی، فٹ بال وغیرہ کھیل کے میدان میں جس طرح بھانت بھانت کی آواز گونجتی ہے اور عام طور پر انگریزی میں "ویل ڈن"، "ویری گڈ"، "ویل شاٹ"، "فائن" اور "بیوٹی فل" وغیرہ الفاظ سے نوازا جاتا ہے اور کسی وقت "بہت اچھے! کیا کہنے" کے نعرہ ہائے تحسین گونجتے ہیں، اسی طرح شکار میں بھی ہوتا ہے، اور خاص طور پر مرغابی، چہے اور تیتر کے شکار میں جس میں ایک حد تک ٹیم جیسے کھیل کا نظم و نسق سامنے رہتا ہے، بالعموم ہر شکاری کا ایک دوسرے کو چیئر اپ کرنے کا نعرہ اپنا مخصوص ہوتا ہے، اور تایا نہایت "وسیع الصوتی" کے ساتھ اپنی شیریں لہجہ والی آواز کو جوشیلا سا بنا کر اپنے ہر ساتھی کو "اے واہ میری جان!" کے پیارے خلوص بھرے نعرہ سے تحسین و آفرین کرتے۔ اور نہایت دریا دلی کے ساتھ سچی اسپورٹنگ اسپرٹ میں نوازا کرتے۔ "مری جان!" کی ترکیب روہیلکھنڈ سے باہر کچھ نامانوس ہے اور ممکن ہے کہ بعض مواقع پر چونکا دینے والی اور کچھ سوقیانہ سی معلوم ہوتی ہو لیکن روہیلکھنڈ کے قصباتی اور شہری آدابِ تکلم میں پرانے لوگ "مری جان"، "پیارے"، "پیارے صاحب"، "جانی"، "میاں میرے"، "بھیئے"، "چاند"، "منشو" وغیرہ شیریں الفاظ سے تخاطب کرتے ہیں اور کچھ شکار پر ہی منحصر نہ تھا تایا یوں بھی روزمرہ کی بول چال میں "اے واہ مری جان!" تکیہ کلام کی طرح استعمال کرتے تھے۔ ممکن ہے کہ شروع سے اپنے تربیتی ماحول کے اثر سے تخاطب میں "مری جان" استعمال کرتے ہوں اور شکار کے میدان میں یہ "اے واہ" لگ کر "اے واہ مری جان!" بن گیا ہو، اور پھر شکار سے "اے واہ مری جان" روزمرہ کی گفتگو میں تکیہ کلام بن کر پلٹ آیا ہو اور تایا کی روزمرہ کی گفتگو بھی تو بجز شکار کے اور کسی موضوع پر شاذ و نادر ہی ہوا کرتی تھی اور تایا نے ساری عمر بجز شکار کے اور کچھ کیا بھی نہ تھا حتیٰ کہ شادی بھی، لہٰذا ان کے تمام تر معمولات کو صرف شکار ہی سے ایسی مناسبت تھی جیسے ہماری اپنی مجلسی زندگی سے ہوتی ہے۔ مگر عجیب بات یہ تھی جس طرح تایا ایک ایک لفظ چن چن کر اور توڑ توڑ کر بولنے کے عادی تھے اسی لہجہ میں نہایت واضح طور پر اپنا تکیہ کلام بھی ادا کرتے تھے۔ "اے واہ" ذرا جھٹکے کے ساتھ ایک جانب کو گردن آہستہ سے ہلا کر "مری جان" ذرا ترچھے ترچھے انداز میں چہرہ کو اثبات میں حرکت دے کر ورنہ عام طور پر تکیہ کلام کے عادی لوگ بولتے وقت ہلکی سی آواز کی صورت ذرا تیزی کے ساتھ گفتگو کی روانی میں اپنا تکیہ کلام ادا کرتے ہیں۔

اگرچہ پوری صدی کے پیٹے میں پہنچ چکے تھے مگر تایا کے بڑھاپے پر اب بھی سو جوانیاں نثار تھیں، اور ہم جیسے نوجوانوں کو ان کی پیرانہ سالی پر رشک سا آجاتا جس پر کسی پہلو ضعیف العمری کا اطلاق نہ تھا، لمبی چوڑی ہڈیوں کا ڈھانچہ جیسے پرانے قلعے کے کھنڈر، چوڑے چکلے بازوؤں پر اب بھی سرخ سپید کھال کی چنٹوں میں پیچ در پیچ آہنی اعصاب کی ڈھیلی ڈھالی رسیوں کی پونیں سی بھری تھیں۔ جو شکار کے وقت فولادی سلاخوں کی طرح تن کر بدن پر لپٹ سی جاتیں۔ سفید براق ریشمیں داڑھی جس کو نہایت اہتمام کے ساتھ چڑھایا کرتے اور چڑھا کر نکلتے تو رکھ رکھاؤ کا اتنا خیال رکھتے کہ اگر ہوا سامنے سے ذرا تیز چلتی ہوتی تو لاگ بچاتے ہوئے چہرہ ترچھا ترچھا کر کے چلتے کہ کہیں بال منتشر ہو کر داڑھی اتر نہ جائے اور اس طرح اکڑی ہوئی سیم گردن کے ساتھ چلتے ہوئے چال میں عجیب بانکپن سا نظر آتا۔ پیشانی پر نوے سال کی پیہم رگڑ کا نمازی گٹا جو تایا کے جھری دار نورانی چہرہ پر صبح کے ستارے کی طرح چمکتا۔ سفید بھوؤں کے سایہ میں آسودہ آسودہ سی متجسس آنکھیں جن میں شکار کے وقت عقاب کی سی چمک تڑپ اٹھتی، گھٹے سر پر کڑی بندش کا خاکی صافہ، بدن پر بند کا لمبا نیچا خاکی کوٹ اور چست برجس کاٹ خاکی پاجامہ، شکار میں کمر پر پٹکے کی طرح خاکی تہمد کسے رہتے جس کو شکار کے بعد پاجامہ اتار کر باندھ

لیتے، پنڈلیوں پر پٹیاں کسی ہوتیں، اور پاؤں میں دیسی چمڑے کا دیہاتی ساخت والا ہندوستانی جوتا جو پتھر سے زیادہ سخت ہوتا مگر سال کے سال خریدنے کے بعد چالیس دن مٹھا اور کڑوا تیل بھر کر بھیگتے اور چالیس دن میں پاؤں اور جوتے میں تیل کی چکناہٹ اور مٹھے کی نمی کی مدد سے دھینگا مشتی کرا کر صلح کرا ہی دیتے اور منزل مارنے کے قابل رواں ہوجاتا اور جنگل میں اپنی چودہ پندرہ پونڈ وزنی بندوق ہلکے پھلکے کھلونے کی طرح اٹھائے تندگام نظر آتے۔

اللہ جانے تایا کی جوانی میں جوش اور جفاکشی کا کیا عالم رہا ہوگا۔ اور رنگ روپ کس غضب کا ہوگا۔ اسّی نوّے برس کے شکاروں کی سخت کوشیوں اور شدید موسموں کے جھیلنے بگاڑنے کے باوجود اب بھی یہ کیفیت تھی کہ ساتھیوں کے اچھے فیر پر جس وقت بے ساختگی اور جوش کے ساتھ مونہہ سے "اے واہ میری جان!" نکلتا تو چہرہ گل انار ہوجاتا، کنپٹیاں بھر کر کھنچ گئیں، سینہ دمک اٹھتا، اور کسی ساتھی کے اچھے ہاتھ پر آنکھیں تراشے ہوئے ہیرے کی طرح چھوٹ پھینکنے لگتیں اور جھریاں برابر ہو کر چہرہ آئینہ کی طرح دمک اٹھتا اور اپنے مخصوص پیار بھرے انداز میں شیریں آواز بلند کرتے رہتے "اے واہ مری جان! — اے واہ مری جان!!" اپنے بھرے فیر سے زیادہ ساتھیوں کے اچھے ہاتھ پر خوش نظر آتے، اور اپنے آپ تو ایک استادانہ ہاتھ مار کر جیسے یکدم دو مٹھی بلند ہو جاتے، دو چار قدم اٹھارہ سالہ لڑکے کی طرح جھومتے اِدھر سے اُدھر ڈالتے، بار بار تمام جسم پر ایک لپک سی لہرا جاتی، یوں بھی شکار کے علاوہ چال ڈھال میں تایا بوڑھے کم اور جوان زیادہ نظر آتے، صرف نماز کے وقت ذرا اپنی اصلی عمر میں دکھائی پڑتے، داڑھی بھی وضو کے بعد نم اور اتری ہوئی ہوتی اور جسم بھی بوڑھا بوڑھا ڈھیلا ڈھیلا۔ شکار کے شوق کا یہ عالم کہ کہتے ہیں آج جبکہ تایا ننانوے کے قریب تھے، وہی بالیدگی اور جوش موجود تھا جو نو کی عمر میں پہلی مرتبہ بندوق پکڑتے وقت پیدا ہوا تھا۔ اور شکار کے میدان میں پہنچ کر تو تایا دس جوانوں کے ایک کنگڑ جوان دکھائی پڑتے، سج دھج اور تیوروں میں شیر ببر والے انداز جھانکنے لگتے۔ اور اتنے شدید قسم کے شکاری ہونے کے باوجود انتہائی نرم مزاج اور نستعلیق، اندازِ تکلم ایسا کہ مونہہ سے پھول سے جھڑیں، اور یک گونہ نسائیت کی حد تک شیریں، اور اندازِ تکلم سے زیادہ طرزِ تخاطب پیارا پیارا موہ لینے والا حالانکہ مانی ہوئی بات ہے کہ تایا نے ان کی گود چھوٹنے کے بعد صنفِ نازک کا مَس تو درکنار کبھی دیکھی نہ سونگھی تھی، اور تندرستی کا یہ عالم کہ نجانے آتا تو در کنار تایا کو اپنے ہوش میں کبھی زکام ہوتا بھی یاد نہ تھا۔ اور مزاج تو مزاج بڑھاپے کی خشکی کا اثر آواز پر بھی نہ ہوا تھا۔ ساری عمر شکار جیسے ارفع اسپورٹ میں کٹی تھی اور شکار کے اپنے مخصوص نعرۂ تحسین "اے واہ مری جان!" کو روزمرہ کی بول چال میں تکیہ کلام کی طرح استعمال کرتے وقت بڑے پُرلطف معلوم ہوتے۔

تایا غریب شکاری تھے، اور اپنے زمانہ میں تو نہ معلوم کیا حال رہا ہوگا ہمارے زمانہ میں بھی جبکہ آلاتِ ہلاکت ہائیڈروجن بم تک پہنچ گئے ہیں اپنی بھر تو بندوق سے بلا کے مارتے خاص قسم کے شکاری، اور اپنے استاد کے تجربوں اور روایتوں کی پوری کتاب تھے، ایسے کامیاب اسپورٹ مین کہ اچھے اچھے سائنٹیفک اصولوں سے بہترین ہتھیاروں کے ساتھ شکار کھیلنے والے شکاری تایا کی مارکا ریکارڈ دیکھ کر دنگ رہ جاتے، اور استاد ماننا ہی پڑتا۔ تایا کو اپنی علم سینہ والے بابری نسخہ کی بارود پر بڑا ناز تھا، اور اپنی رام پوری ساخت کی بھر تو بندوق پر بڑا بھروسہ، اور بحث و تمحیص کے وقت تایا نہایت دلیری کے ساتھ ساری لانگ رینج بندوقوں اور ہائی ولاسٹی رائفلوں کے ذکر میں اپنی بندوق کا ذکر کر دیتے، اور بہرحال ہمیں ان کی کامیابی کے سبب ان کی بارود کی طاقت اور بندوق کا لوہا ماننا ہی پڑتا۔ کیونکہ پارٹی میں بالعموم آدھا شکار تایا کی رام پوری بھر تو بندوق اور بابری نسخہ والی خانہ ساز بارود کا مارا ہوا ہوتا اور بقیہ نصف کل پارٹی کا جس میں پانچ چھ چابک دست اور نقاد و انداز شکاری شامل تھے۔ تایا کی بارود خانہ ساز ہوتی۔ اور ہماری کارڈ انٹ اور ڈائمنڈ پاؤڈر کے تذکرہ کے ساتھ تایا اپنی بارود کے ذکر میں "خانہ ساز" کچھ ایسے پُراعتماد لہجہ میں لگاتے جیسے کوئی حکیم کسی معجون کے متعلق خانہ ساز کہہ کر اس کے خواص کو دو چند ظاہر کرتا ہے، اور بارود تو بارود تایا کی گولیاں گراپ اور چھرہ تک خانہ ساز ہی کا سند یافتہ ہوتا تھا۔ برسات ختم ہونے پر تایا سال تمام کے خرچ کے قابل سامان طیار کر کے رکھ لیتے جبکہ ہم لوگ عین اسی زمانہ میں اپنے امونیشن کے آرڈر دیا کرتے۔

بابری نسخۂ بارود کے اکثر اجزاء تو تایا قصبہ کے ارد گرد ہی جمع کر لیتے، بسونٹے کی جڑ کا کوئلہ، لہسن کا عرق، وغیرہ تو معمولی چیزیں تھیں تایا تو پرانے کھنڈروں اور ٹیلوں پر سے نونی مٹی کھرچوا کر اور پکا پکا کر دھڑیوں شورہ قلمی تک طیار کر لیتے اور انہیں اپنی میگزین کی طیاری میں بارود کے نسخہ کے لئے صرف گندھک اور گولی چھرہ کے لئے سیسہ خریدنے بازار جانا

اور ناموراسے اقبال [illegible] مقالہ پڑھ رہے ہیں





یوم اقبال رح

(... مجلس اقبال و [illegible] دو شاعر ہیں)



ڈھاکہ میں [illegible] اقبال کے [illegible] اور شاعر
[illegible] آبادی [illegible] ہیں۔



ڈھاکہ میں تمثیلی مشاعرہ
مرزا غالب اپنا کلام پیش کر رہے ہیں
ان کے بائیں جانب علامہ اقبال فروکش ہیں



حکیم آئن سٹائن

(۱۸۷۹—۱۹۵۵ء)

پڑتا۔ تایا اپنی بارود کا نسخہ جو انہیں ان کے استاد سے پہنچا تھا، اس کی آجکل
کے شکاریوں میں ناقدرشناسی دیکھکر قبر میں ساتھ لے گئے۔ کہتے ہیں کہ یہ
چند بیش بہا تاریخی نسخے ان کے دادا استاد کو شہنشاہ بابر کے مشہور
توپچی کے خاندان سے ہاتھ آئے تھے۔ البتہ گولیاں چھرے نہایت
سیدھے سادے عام فہم طریقہ سے بنا لیتے، دھڑیوں سیسہ بازار سے
خریدتے۔ اور پگھلا کر مختلف سائز کے سوراخوں کی چھلنیوں میں چھان
چھان کر قاز مرغابی، تیتر وغیرہ کے چھوٹے بڑے چھرے بنا لیتے، ارنڈ کی
شاخوں کے نلوں میں پگھلا ہوا سیسہ بھر بھر مختلف موٹائی کی سلاخیں ڈھالتے
سروتے سے ایک برابر ٹکڑے کاٹتے، پھر چکی میں ان ٹکڑیوں کو آہستہ آہستہ
دل کر گول کرتے، اور اس کے بعد تھوڑے تھوڑے کڑھائی میں ڈال
ڈال کر جوتے کے تلے سے ہاتھ گھما گھما کر رگڑ لیتے اور اس طرح فنش
کر کے تین چار مختلف سائز کا گراپ بنا لیتے، جن میں بعض سائز، جو ان کی
چکی کے پاٹوں اور کڑھائی اور جوتے کے تلے کے درمیان اچھا فٹ ہوا
ہوتا ایسا سڈول بنتا کہ ولایتی ساخت کے گراپ کا مقابلہ کر جاتا۔ بہت
بڑے گراپ اور گولیاں بنانے کے لئے چکنی مٹی کی گھریاں بنالیتے اور
ڈھال لیتے انہیں اپنی بندوق کے "بھرت" یعنی لوڈ پر بڑا ناز تھا۔
وہ سیسے کے وزن اور بارود کی طاقت کے پورے محرم تھے، اور
"بھرت" میں بارود کی قوت اور گولی کے وزن کو اعتدال پر رکھنے میں
بڑے ماہر تھے۔ تایا آٹھ بور کی ایک اٹھارہویں صدی والی بندوق
کے مالک تھے، جسے کسی دیسی کاریگر نے بندوق اور قرابین کے درمیان
کی کوئی چیز بنایا تھا۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے تو چھٹانک بھر بابری نسخہ
والی خانہ ساز بارود اور ڈیڑھ پاؤ "گمر گنٹو" چھرے کی خوراک پڑا کرتی۔
سنتے ہیں کہ تایا کی بندوق اپنے "پچھلے جنم" میں توڑے دار تھی، اور جب
"پتھر کلے" کا رواج ہوا تو اس میں چقماق دار گھوڑا لگوایا۔ مگر کبھی کبھی
ایسا ہوتا کہ چقماق صحیح چنگاری نہ پھینکتا اور بارود آگ نہ لیتی اور بندوق
چلنے سے قاصر رہ جاتی۔ تو تایا بیان کرتے ہیں کہ جب ایک روز شکار
میں ایسا ہوا تو وہ غصے کے مارے جنگل سے سیدھے فولاد خاں کاریگر
کے یہاں پہنچے کہ چقماق کا گھوڑا اکھیڑ کر وہی پرانی توڑے دار والی کٹوری
پھر سے فٹ کر دے، دو قازیں اور پانچ مرغابیاں کاریگر کے لئے تحفہ
میں لیتے گئے تھے جنہیں کھا کر فولاد خاں کاریگر ایسے خوش ہوئے کہ تایا
کی بندوق کو بجائے سو برس پیچھے ہٹانے کے پچاس برس آگے بڑھا دیا۔

اور دوسرے روز جب تایا بندوق لینے پہنچے تو انہوں نے نہایت کاریگری
کے ساتھ ٹوپی دار نپل لگی ہوئی بندوق فخریہ انداز میں پیش کی، اس امید پر
کہ تایا یہ تجدید دیکھ کر خوش ہوں گے، لیکن تایا اپنی بندوق کو ترقی یافتہ چولے
میں دیکھ کر بدمزہ سے ہو گئے کیونکہ اس میں بازار سے ٹوپیاں خریدنے کی
مزید بیخ لگ گئی تھی۔ لیکن خیر تھوڑی سہولت بھی ہو گئی۔ ہاں، توڑے
اور فلیتے کے کھڑاگ سے نجات ہو گئی تھی۔ کندھے پر جما کر بس لبلبی پر ایک
انگلی کے اشارہ کا کام رہ جاتا تھا۔

یوں تو تایا کی بندوق کی پشت پر تاریخی روایات کا پورا ایک جنگل
کھڑا تھا لیکن اس میں شک نہیں کہ ہمیشہ اس کی چوٹ ہماری کلدار توسی
بندوقوں کے فیروں کے مقابلہ پر "ایک لوہار کی" ہوا کرتی تھی۔ تایا شکار
کے صبح سے شام تک کے پروگرام میں بالعموم ایک اور کبھی دو چوٹیں چلایا کرتے،
بارود کی پوری خوراک ڈال کر اوپر سے نال میں آہنی گز سے اپلے کی مضبوط
ڈاٹ ٹھونکتے، اس کے بعد چھرہ ڈال کر چیتھڑے کی ڈاٹ لگاتے اور
بندوق طیار کر کے "زیر لب" یا پیر جنگلی! "بڑبڑاتے۔ یوں تو تایا شکار کو شیر
کی طرح اکیلے جانے کے قائل تھے اور روزمرہ کے شکاریوں کی پارٹی نصیب
بھی کہاں ہو سکتی ہے۔ اور اصولی طور پر بھی شکار میں پارٹی کے ساتھ جانے
میں انہیں گریز تھا، لیکن ہماری مخصوص پارٹی میں کبھی کبھار جب پھنس جاتے
تو بخوشی حصہ لیتے، یوں بھی نہ ہر شکاری کا تایا کے ساتھ اور تایا کا ہر شکاری
کے ساتھ گذر ہو سکتا تھا اس لئے کہ تایا بارہ ماسی اور سدابہار قسم کے
پیدائشی شکاری تھے۔ آدم کم شکاری زیادہ، کسی شکار پر بند نہ تھے، مگر
اپنے مخصوص طریقہ سے پانی کی چڑیا کے زیادہ شوقین تھے، بٹیر کے شکار
میں جال سے کام لیتے، چوپایوں کے شکار میں بھی بندوق سے زیادہ جال
کے قائل تھے، باریک دھاگے سے لیکر موٹی موٹی رسیوں تک کے جال
اپنے ہاتھ سے بُنتے، اور رہٹیرے لے کر ہرن چیتل نیل گائے تک پھانستے،
اور شکار میں گوشت کے لالچ میں درجنوں دیہاتی تایا کے ساتھ ہو لیتے
اور ہانکے میں مدد معاون ہوتے۔ شکار کے مخصوص سیزن میں جب
ستمبر غایتہ مارچ ہزاروں قسم کی مائیگریٹ کر کے آئی ہوئی مرغابی اور قاز
سے جھیلیں اور تالاب پُر ہوتے ہیں تایا بڑی سرگرمی دکھاتے، یہ شکار کا
سیزن کہلاتا ہے بڑی بڑی جھیلوں سے لے کر چھوٹے چھوٹے تالاب تک
مرغابیوں سے پٹے ہوتے ہیں، کہیں پر چپہ بھر پانی نظر نہیں آتا جھیل
کی سطح پر تا حد نظر مرغابیوں کے سر ہی سر دکھائی دیتے ہیں، فضا میں مسلسل

ایسی آواز گونجتی ہے جیسے فیکٹری چل رہی ہے اور درمیانی طول و عرض کی جھیل پر شکاری ٹیم لگ جاتی ہے، ذرا ترتیب اور ضابطہ کی صورت پیدا ہو جاتی ہے، ہر شکاری اپنی اپنی ڈیوٹی لیتا ہے اور ہر ایک کی کمانڈ کا تعین ہوتا ہے۔ کسی کی پوسٹ خشکی میں کنارے پر ہوتی ہے، کوئی کمر کمر پانی میں اور کوئی منجلا گھاس اور دلدل میں جس کے اندر جونکیں بجیجا بجیجا کر پاؤں سے لیکر پنڈلیوں تک کا خون چوستی جاتی ہیں، اور ہم ایسی پارٹی میں تایا کو ہمیشہ پہلے فیر پر متعین کرتے، تایا کو اپنی ڈیوٹی معلوم تھی، اور تایا بڑے شرتے شکاری تھے، جب تک پوری پارٹی موقع کے مطابق پروگرام سیٹ کر کے اپنی ڈیوٹیوں پر پہنچتی اور سب سے اخیر والا شکاری اپنی پوسٹ پر پہنچ کر اشارہ دیتا اتنی دیر میں تایا اپنا موقع ٹٹول کر کبھی کنارے کنارے لمبی گھاس میں سے سانپ کی طرح سرکتے اور کبھی اونچی اونچی نالیوں اور چھوٹے بڑے گڑھوں میں پیٹ اور سینہ کے بل لڑھک کر یا رانوں اور گھٹنوں سے گھسٹ کر کسی مرغابی کے آسودہ اور بے خبر تنگ کے قریب جا پہنچتے۔ اور تایا کی گھات بہترین قسم کی مرغابی کے تنگ پر ہوتی، نہایت چالاک اور بلند پرواز جو اور اقسام کے مقابلہ پر کمیاب بھی ہوتی ہیں، اور جب ہر پہلو ٹھونک بجا کر اطمینان کر لیتے تو نہایت سہولت کے ساتھ شست لے کر بندوق داغ دیتے۔

اور تایا کی بندوق کی آواز پر جھیل کی سطح سے اوپر کو گڑگڑاتا ہوا طوفان سا اٹھتا۔ ہزارہا مرغابیاں ٹڈی دل کی طرح فضا پر چھا جاتیں، پہلی پرواز پر دھوپ چھپ جاتی اور ایسی سنسناہٹ ہوتی جیسے یکدم دس بارہ ریلیں چل رہی ہوں۔ اور ہم سب اپنی اپنی ٹھائیں، ٹھوئیں، ٹھس میں دیوانے ہو جاتے، ہر شکاری اپنے اپنے "فلائنگ شاٹ" کے جوہر دکھاتا۔ اور نہایت ہی ضابطہ کے انداز میں ٹیم کے کھیل کا سماں پیدا ہو جاتا۔ فضا میں اڑتی ہوئی مرغابیاں پر کٹ کٹ کر قلابازیاں کھاتی، ناچتی، پتاتی اور کبھی پتھر کی طرح چوٹ کھا کھا کر گرتیں، اور "برڈ پکر" مزدور پکڑنے اور جمع کرنے میں مشین کی طرح مصروف ہو جاتے، اور جب تایا کی خانہ ساز کالی بارود کا بدبودار دھواں پانی کی سطح سے ذرا صاف ہوتا تو تایا کے ایک ہی فیر میں تیس چالیس اعلیٰ قسم کی مرغابیاں کھیت رہی ہوتیں۔ کچھ بے حس و حرکت پڑی ہوتیں، کچھ چت پڑی ٹانگیں چلاتی ہوئیں۔ بعض بعض نہایت خوبصورتی کے ساتھ ناچتی ہوئیں، اور کوئی کوئی جہاں کی تہاں پھڑکتی ہوئیں، اور کچھ مرغابیاں جو ذرا کم زخمی ہوتیں نہایت تیزی کے ساتھ گھنی گھاس اور پانی کی سطح پر لوٹتی ہوئی پیچ در پیچ بیلوں میں کو رینگتی ہوئیں، تایا مرغابی کے شکار میں اپنے لئے "برڈ پکر" کے قائل نہ تھے، جھیل کے کنارے پہنچ کر بدن پر کڑوا تیل اچھی طرح مالش کر لیتے تھے۔ تاکہ جھیل کی خارش زا گھاسیں اور دلدل کی جونکیں جلد پر اثر انداز نہ ہو سکیں۔ اپنے فیر کا دھواں صاف ہوتے ہی تایا ایک نظر اپنا زخمی شکار پر ڈالتے اور بندوق پیٹھ پر لاد کر اور تھیلا اونچا کر کے اسپینیل کتے سے زیادہ جوش اور تیزی کے ساتھ تلوار کی دھار کی طرح کاٹتے ہوئے ٹھنڈے پانی میں جست لگا دیتے۔ اور پکڑ دھکڑ میں مصروف ہو جاتے، ہم لوگ تایا کو ایک مرتبہ "ایکسیلنٹ" "کیا کہنے! واہ استاد!" پکار کر ایک دوسرے کے فیروں پر "ویل شاٹ - گڈ، بہت اچھے! بہت اچھے" کے نعروں سے آپس میں تحسین و مرحبا پکارتے جاتے، اور تایا اس وقت اپنا شکار بٹورنے میں سرگرم کار ہوتے۔ پہلے تو تایا اپنا فیر ہی خوب دیکھ بھال کر ایسے تنگ پر کرتے جو اچھے موقع پر بیٹھا ہو اور شکار کے بعد نکالنے پکڑنے میں دقت نہ ہو، پھر اپنے زخمی شکار پر جا پہنچنے میں غضب کی پھرتی اور مستعدی دکھاتے، پہلے تو جلدی جلدی ان مرغابیوں کو پکڑ کر دونوں بازوؤں کو ایک دوسرے کے ساتھ بل دیکر گڈی چڑھا دیتے، جو کم زخمی ہوتیں اور گھنی گھاس اور پیچ در پیچ بیل میں کو پناہ کے لئے تیزی کے ساتھ تیرتی ہوتیں۔ اور خطرہ کا احساس کرتے غوطہ مار مار کر بھاگ نکلنے کی کوشش کرتی ہوتیں۔ انہیں باندھنے کے بعد تایا بڑی تیزی سے پیش قبض (مخصوص پرانی ساخت کا شکاری چاقو) کھول کر ذبح کرنے پر پلتے۔ اور اس کار خیر میں بڑی پھرتی دکھلاتے کیونکہ اپنے عقیدہ میں ہر جانور جو ذبح کرتے وہ خود حضرت ابراہیم خلیل اللہ کی سنت کا ثواب پاتے اور جانور جنت کی خاک ہو جاتا لہٰذا اگر کوئی شکار ذبح ہونے سے پہلے بندوق کی چوٹ کے صدمہ سے مر جاتا تو وہ غریب تو جنت کی خاک بننے کی سعادت سے اور تایا سنتِ ابراہیمی کے ثواب سے محروم ہو جاتے اور پھر حرام ہو کر کھانے کا بھی تو نہ رہتا۔ لہٰذا کم زخمی مرغابیوں کی گڈی چڑھا کر زندہ بندھا چھوڑ کے تایا تیزی کے ساتھ ساکت پڑی ہوئی شدید زخمی مرغابیوں کی جانب رجوع ہوتے۔ ہر ایک کی گردن جلدی سے پیچھے کو الٹ کر چاقو کی ایک رگڑ دیتے اور پھر دیکھتے کہ چاقو کی دھار خون میں شرعی مسئلہ کے مطابق ایک چہارم کے بقدر رنگی یا نہیں، اگر دھار نہ رنگتی تو اس مرغابی کا ایک ناخن کاٹ دیتے تاکہ پہچان رہے کہ حرام ہو گئی ہے۔ کم زخمیوں کو زندہ گڈی چڑھی چھوڑ کر اور زیادہ زخمیوں کو جنت کی خاک بنا کر سنتِ ابراہیمی کا ثواب لینے

کے بعد تایا خدا اطمینان کے ساتھ قلابازیاں کھاتی، تڑپتی اور خوبصورتی کے ساتھ ناچتی مرغابیوں کی جانب بڑھتے ۔ اور ذبح کرتے، اور شروع سے آخر تک زبان پر بسم اللہ، اللہ اکبر ورد جاری رہتا۔ ذبح کرتے وقت تایا کے انہماک اور شوق سے اندازہ ہوتا کہ شاید بندوق چلانے سے کم لطف انہیں چاقو چلانے میں بھی نہیں آ رہا ہے، ذبح کرنے کے بعد یک گونہ سکون کے انداز میں اپنا چاروں طرف بکھرا ہوا شکار ایک نظر پر ناپتے، پھر گدی چڑھی ہوئی مرغابیوں کی بڑی احتیاط کے ساتھ گویا نبض دیکھتے، ایک ایک کو اٹھا اٹھا کر آنکھوں کی کیفیت اور چونچ پنجوں کی رنگت کا معائنہ کرتے کہ کہیں مر تو نہیں رہی ہے، اور اگر کسی کے متعلق ذرا سا بھی شبہ ہوتا تو فوراً ذبح کر لیتے۔

لیکن اس شدید اور اہم مصروفیت میں بھی تایا کی اسپورٹنگ اسپرٹ قائم رہتی، اپنا شکار ڈھونڈتے بھی جاتے، ذبح بھی کرتے جاتے اور تسمیہ کا ورد زبان پر رکھتے ہوئے نہایت فراخدلی کے ساتھ ساتھیوں کو اچھا ہاتھ پڑا "اے واہ مری جان!" کے نعرۂ تحسین سے نوازتے بھی جاتے اور سب کچھ کرتے ہوئے بھی دور اور قریب کے ساتھیوں کا کھیل دیکھتے جاتے، مجال کیا جو کسی ساتھی کا اچھا فیر پڑے اور تایا کی نگاہ سے چوک سکے اور پھر وہ ساتھی تایا کے "اے واہ مری جان" سے محروم رہ سکے۔ اور جب فارغ ہو کر اور اپنا شکار لٹکا کر تایا اطمینان کے ساتھ کنارے پر آ بیٹھتے تو تایا کو بجز "اے واہ مری جان!" کے اور کوئی کام ہی نہ رہ جاتا اور کسی کسی دو "اے واہ مری جان!" کے درمیان ایک استادانہ قسم کی ہدایت بھی سنائی پڑتی، جس سے اندازہ ہوتا کہ تایا ہمارے شکار کے قواعد و ضوابط اور حسن و قبح کے بھی پورے محرم ہیں، اور اگر ہمارے طریقہ سے بھی شکار کھیلیں تو بھی ہم سے زیادہ کامیاب رہیں۔

پارٹی کے سب اراکین کے مؤثر نعروں، بندوق کے پیہم دھماکوں اور پروں کی مسلسل سنسناہٹ کے درمیان تایا کی "اے واہ مری جان!" اپنی علیحدہ انفرادی شان کے ساتھ گونجتی۔ پارٹی مرغابی کے شکار کے تمام و کمال جدید آداب برت کر شکار کھیلتی ۔۔۔ اڑان کی رفتار کا اندازہ، ہوا کا رخ، پرواز کا صحیح زاویہ اور اس کے مطابق نشانہ لیتے ہوئے بندوق کا زاویہ، بلندی پرواز کے لحاظ سے شست لیتے وقت مارجن وغیرہ وغیرہ قواعد کے مطابق سائنٹیفک شکار ہوتا، جیسے ہوائی جہاز کے قواعد پر عمل ہو رہا ہے۔ حسب معمول دھماکوں اور سناٹوں کے درمیان تایا کی "اے واہ مری جان!" سب سے زیادہ ہمت بندھاتی آواز میں گونجتی رہتی۔ لیکن انہیں اصولی طور پر ہمارے اس پیہم دھماکوں والے کھیل سے اختلاف تھا۔ ویسے تایا کسی نہ کسی وقت اپنے "فلائی انگ شاٹ" کا بھی نرالا کمال دکھا دیتے، جب کسی اچھی قسم کی مرغابی کا ٹھاٹ ایک خاص انداز کے ساتھ ترچھی ترچھی پرواز میں "کونہی" سی بناتا ان کے موقع پر اڑتا ہوا پلٹتا ہوتا تو تایا ایک خاص زاویہ پر بندوق لگاتے، جس کے نتیجے میں ایسا معلوم ہوتا کہ تایا نے اپنے فیر کے ایک ایک چھرّے کی قیمت وصول کرلی ہے ۔۔ اڑتی ہوئی مرغابیاں آندھی کے آموں کی طرح جھڑ پڑتیں، ہمارے مونہہ حیرت سے کھلے رہ جاتے، یہاں تو قاعدہ میں ایک فیر میں ایک اڑتی ہوئی مرغابی ماری جاتی ہے اور کسی کا بڑا سنہرا ریکارڈ دو تین تک کا ہو جاتا ہے اور تایا کے ایک "فلائی انگ شاٹ" میں پندرہ بیس گر پڑتیں۔

"فلائی انگ شاٹ" کے قاعدہ میں ایک فیر میں ایک اڑتی ہوئی مرغابی مارنا آیا ہے اور خیر کسی خوش نصیب چابکدست کے فیر میں دو تین لپٹ جائیں اور چار پانچ سے زیادہ تو کسی کا ریکارڈ ہی نہیں ہوتا مگر تایا کی اینٹی ایرکرافٹ گن کی چوٹ میں تو جیسے پورا تنگ درہم برہم ہو جاتا اور مرغابیوں کی بارش ہونے لگتی۔ یہاں تک کہ لنچ ٹائم آجاتا، صبح کی پلٹی مرغابی بہت چوکتی ہو جاتی ۔ زد سے بچ کر اڑنے کی جبلت اختیار کرنے لگتی، اور مرتے رہنے کے باوجود جھیل پر وہ دسترخوان کی مکھی کی طرح ٹوٹنے کا انداز بدل دیتی، موروثی قسم کی مرغابیاں تنگ بنا کر بہت بلند پرواز کرنے لگتیں، کچھ جھیل چھوڑ کر کوچ کا رخ بنانے لگتیں ۔۔۔ غرض شکار اور شکاری دونوں کو سکون کی ضرورت ہوتی۔ ہم سب اپنی اپنی پوسٹ چھوڑ کر کنارے کے قریب کسی مناسب جگہ کھانے کے لئے جمع ہوتے۔ کھانے سے پہلے ایک ایک کے شکار کی گنتی ہوتی، مرغابیوں کی قسم پر بحث ہوتی۔ پھر ہر ایک کے فیروں کی تعداد گنی جاتی اور اوسط لگا کر ہر ایک کا ریکارڈ قائم کیا جاتا، اول تو بالعموم گنتی کے اعتبار سے ہی تایا کا تھیلا سب سے زیادہ بھاری ہوتا اور ان کی بندوق کے نامۂ اعمال میں فیر تو ایک یا دو ہی ہوتے لہٰذا ریکارڈ اور اوسط میں ان کا مقابلہ کون کر سکتا تھا۔

اور جس وقت پوری ٹیم کھانے میں منہمک ہوتی تایا اس وقت کھاتے بھی جاتے اور چاروں سمت فضا میں نظر کی کمندیں پھینک پھینک کر سکون کے بعد نئی مرغابی کی آمد پر بھی غور کرتے جاتے، اور

ان کے بیٹھنے کی جگہ بھی بھانپتے جاتے اور اسی وقت اپنے لئے گھات بھی دل ہی دل میں طے کر لیتے۔ تقریباً دو ڈھائی گھنٹے جھیل پر سکون رہتا، مرغابی صبح سے دوپہر تک کی بے بھاؤ مار بھول چکی ہوتی۔ شہد کی مکھیوں جیسے چھتے کے انداز میں جھیل کی سطح پر جمع ہو جاتی اور تایا اپنی عقاب ساں آنکھوں سے جھیل پر بیٹھے ہوئے شکار کے چپہ چپہ کا اندازہ کر کے قطعی طور پر ہر پہلو سے اپنے لئے بہترین موقع تلاش کر چکے ہوتے صبح سے دوپہر تک کی مار دھاڑ کی گپ شپ ختم ہو چکی ہوتی اور کھانا کھا کر کہیں گھاس یا مٹی پر ہم لوگ ایک آدھ لوٹ لگا کر اور کئی کئی سگرٹ جلا کر "سہ پہر کے شکار" کے لئے چل پڑتے، تھوڑے بہت رد و بدل کے ساتھ اپنی اپنی صبح والی جگہوں پر جا لگتے۔ اور تایا پیٹ اور سینہ کے بل رینگ کر، یا گھٹنوں اور کوہنیوں کے سہارے گھسٹ کر یا بیٹھ اور سر اور کہنیوں کے بل لڑھکتے اپنے داؤ پر جا لگتے اور پھر ایک لہار والی چوٹ چلاتے اور صبح والے حادثہ کی پھر تکرار ہوتی۔ اور پھر شام تک کے لئے تایا کو "اے واہ مری جان! اے واہ مری جان!" پکارنے اور کسی کسی وقت زریں ہدایت دینے کے سوا اور کوئی کام نہ رہ جاتا۔ البتہ اپنے "فلائی انگ شارٹ" کے موقع پر تاک میں رہتے اور شام تک کسی نہ کسی وقت وہ بھی ان کے ہاتھ آ ہی جاتا۔ اور تایا اپنا "فلائی انگ شاٹ" کر کے اپنے دو فیروں کو ایک اور ایک گیارہ بنا ہی لیتے اور اپنے ریکارڈ کو گیارہ سو گنا زیادہ۔

ہرن، نیل گائے، جیتل وغیرہ کے شکار میں اور سب ساتھی "میڈیم بور رائفل" اور طرح طرح کی چھٹنے والی گولیوں کے کارتوس لے کر جاتے، اور تایا کی تو وہی بھرتو قرابین ہوتی اور وہی "رابے"۔ تایا چڑیوں کی جبلت سے زیادہ چوپایوں کی جبلت کے محرم تھے۔ یہاں اور سب ساتھیوں کو پہلے چانس ملتا اور تایا کو بعد کو۔ پارٹی اپنی اسکیم کے مطابق شکار کی تنظیم کر لیتی تو تایا نہایت ہی مسکین انداز میں خاموشی کے ساتھ کسی عجیب جگہ پر جھاڑی یا گڑھے میں دبک جاتے، اور ہم لوگ کہتے کہ تایا شگون ڈال لیتے ہیں یا عزرائیل سے تایا کا یارانہ ہے جو انہیں پہلے سے قضا کا مقام معلوم ہو جاتا ہے اور تایا کی گھات کے قریب سے ساتھیوں کے فیروں سے بھڑکی ہوئی ڈار ضرور گذرتی اور تایا "کلوز رینج" سے گراپ کا فیر مارتے اور بالعموم ایسا "بھرپور" "کنپٹی سہلاؤ" رسید کرتے کہ ایک ہی فیر میں پانچ سات جانور لوٹ پوٹ ہو جاتے۔ اور اکثر ایسا ہوتا کہ تایا کے فیر کی آواز پر جو جانوروں کو ہمیشہ غیر متوقع سمت سے سنائی پڑا کرتی تھی ایسے بدحواس ہوتے کہ بعض خوش نصیب ساتھیوں کی سمت آنکھیں بند ہی کئے بے تحاشا بھاگتے چلے جاتے اور انہیں بہترین چانس پر چانس خلاف امید مہیا ہو جاتے اور اس وقت تایا "اے واہ میری جان اے واہ میری جان!!" کے نعرۂ تحسین سے نواز کر گویا اپنے فیر کی داد خود ہی دیتے۔

غرض عمر بھر چوپایوں کے شکار میں بھی تایا کا ریکارڈ بہت بڑھا ہوا رہا، اور رننگ کا یہ عالم رہا کہ ایک پلے میں سب پارٹی کا شکار اور دوسرے میں اکیلے تایا کا رکھا گیا تو بھی بالعموم تایا کا پلہ بھاری ہی رہا۔ اور اعداد و شمار کے وقت تایا نہایت سینہ نکال کر اور گردن اکڑا کر اپنا شکار پیش کرتے، اور فیروں کی گنتی کے وقت تمسخرانہ عجز کے انداز میں اپنی بارہ نسخہ والی بارود کی پڑیا کا ایک خالی کاغذ دکھا کر چپکے کھڑے ہو جاتے اور یاروں کی بندوقوں کے ریکارڈ میٹر سیکڑوں فیر بولتے ہوتے۔ اور خالی کارتوسوں سے تھیلیوں کی جھولیاں بھری ہوتیں۔

سہرا تو ہر ایک کو پہلے ہی معلوم ہوتا کہ تایا ہی کے سفید سر پر بندھے گا مگر تایا اتنی بڑی کامیابی کے باوجود اپنے شکار کے بعد اپنا تذکرہ بہت کم کرتے، البتہ بقیہ ساتھیوں کے اچھے فیروں کا فرداً فرداً حوالہ دے دے کر "اے واہ مری جان" کے تکیہ کلام کے ساتھ تعریف کرتے جاتے۔

(باقی آئندہ)

بادِ مغرب

شیلے

مترجمہ: رفیق خاور

تند مغرب کی ہُوا، اے نفسِ فصلِ خزاں
جس کی پیدائی نادیدہ سے مردہ پتے
جھلسے زرد لائے ہوئے پیلے، بھبوکا تپ سے
اس طرح بھاگے چلے جاتے ہیں افتاں خیزاں
جس طرح ساحرِ مشاق کے آگے روحیں!
ایک بیماری کا مارا ہوا انبوہِ عظیم
اے کہ تو بال کشا بیجوں کے سیار ہجوم
ہانک کر زور تموج سے لئے جاتی ہے

تیرہ و تار زمستانی شبستانوں میں
جن میں سُن ہو کے وہ چت لیٹے رہینگے مدہوش
جس طرح گوشۂ مرقد میں فسردہ لاشیں
جب تلک تیری بہاراں کی بہن سبز قبا
آن کر صورِ نہ پھونکے گی سرافیل نما
بہ سرِ خاکِ فرو رفتۂ خوابِ سنگیں
اور بھر دے گی کہستانوں کو، میدانوں کو
(ہانک کر رس بھری کلیوں کے مچلتے گلّے

لہلہاتے چمنوں میں کہ یہ نوزاد وہاں
کیف و رنگینی کے گہوارے میں پروان چڑھیں)
تازہ خوشبوؤں، نئے رنگوں کی نیرنگی سے
روحِ آشفتہ جو ہر سمت جنوں جولاں ہے
ہمہ تن ذوقِ خرابی، ہمہ ذوقِ تعمیر
سُن مری روحِ نواسنج کی گفتار کو سن!
اے کہ در غلغلۂ گنبدِ گردانِ سپہر
تیرے دھارے پہ گرا نڈیل، پریشاں بادل
خاک کے مردہ سسکتے ہوئے پتوں کی طرح
عرش اور فرش کی آپسمیں گتھی شاخوں سے
جھڑ کے گرتے ہیں۔ گرجتے ہوئے طوفانوں کے
رعد اور برق کی آمد کے دھنواں دھار نقیب
سطحِ نیلی پہ تری سیلِ ہوائی کی وہ دیکھ
گڑگڑاتے ہوئے طوفان کی گھنگھور جٹا
دھندلے دھندلے سے کنارۂ افقی سے لے کر
تا بہ معراجِ سراپردۂ علیائے سپہر

ہو بہو رندِ سیہ مست کی بدمست لٹوں
تند، شوریدہ و براق لٹوں کی مانند
بے تحاشا، ہمہ تن تف، غلطاں پیچاں ہے
سر بسر نوحۂ سالِ گذراں جس کے لئے
آج کی ڈھلتی ہوئی رات کا پہنائے عظیم
گنبدِ مقبرۂ حشر بدامن ہوگا
ایک تعمیر بپا کردۂ مجموعِ بخور
جس کی سنگین، کڑی ہیئتِ بے پایاں سے
قیرگوں دھار، اگن، ژالے برس جائیں گے
سن، سماعِ ابدی سن، مری للکار کو سن!

نیلگوں زوم کے ساگر کو جگانے والی
دفعتہً خوابِ بہاراں سے جھنجھوڑے کر
وہ جو تھا نیند میں گم باثیا کے ٹاپو میں
ایک چقماق سے معمور جزیرے کے قریب[1]
اپنی سیماب نما ندیوں سے پانی کی پری
لوریاں دیتی، تھپکتی ہوئی جل بانہوں کی
جھومتی کیف درآغوش فسوں کاری سے،
اور موجوں کے اُجالے میں جو دن کو شرمائے
جھومتے دیکھتی تھی طرفہ ہیولوں کے طلسم[2]
محلِ پارینہ، پراچین کلس اور مینار
جن پہ چھائے تھے دھنواں دھار گھٹاؤں کی طرح
ڈال پہ ڈال کائی کے، سرشار مہکتے ہوئے پھول
اتنے بھینے کہ سر دردان کا بیاں کرتے ہوئے
ایک دم مبد، فیضان کو غش آجائے،
اے کہ تیرے لئے امواجِ زبردست کوہ
ان کے ہموار قویٰ کی متبحر شوکت
ٹوٹ کر کرتی ہے پیدا کئی گمبھیر دراڑ
اور نیچے کہیں اس عالمِ سیمابی سے
تہ میں روئیدہ شگوفوں کا پرن دار ہجوم
بن کے بن، سبز نگر پھیلے ہوئے گڈگدے پھول
کھاری پانی کے کنول جن میں نہ رشتہ[3] ہے نہ نبات
جب تری صاعقہ کردار صدا سنتے ہیں
ہوش اڑ جاتے ہیں یوں خوف کے مارے ان کے
بید وش لرزہ براندام ہوئے جاتے ہیں
چہروں پر اڑتے ہیں مہتاب ہی مہتاب ان کے
ٹوٹ کر گرتے ہیں اشجارِ عظیم الشان سے
ڈھیر کے ڈھیر بردبار، لچکتی شاخیں
سن مرے نطق کے آہنگِ شرربار کو سن!

گر میں اک برگِ شجر ہوتا تو اے بادِ مہیب!
تو اچک کر مجھے پنجے میں اڑا لے جاتی

---

[1] سمندر کی تہ میں غیر معمولی روشنی دکھائی دیتی ہے۔
[2] سمندر کی تہ میں عجیب و غریب اشکال بھی دکھائی دیتی ہیں
[3] کھاری پانی کے پودے میں آیوڈین پائی جاتی ہے جس سے وہ فوراً ٹوٹ جاتے ہیں۔

لکۂ ابرِ رواں ہوتا تو اُڑتا ترے ساتھ
موج ہوتا ترے پُر ہول طمانچے سہتا
تجھ سے کچھ کم ہی سہی شیوۂ آزادی میں
پھر بھی کس بل کا ترے شائبہ پیدا کرتا
اے کہ سطوت تری پابستۂ زنجیر نہیں
ضبط تیرے دلِ آزاد سے مقہورِ دوام
مجھ میں گر ہوتی لڑکپن کی سی برنائی بھی
اور میں تیری تگ و دو میں برو ئے افلاک
عہدِ طفلی کی طرح سازِ شراکت کرتا
جب تری تیزیٔ رفتار کو پیغامِ شکست
ایک بازیچۂ اطفال نظر آتا تھا
اک تصور کہ تھا یک لمحۂ سیمابی میں
فرصتِ چشم زدن ہی میں پذیرائے حصول
پھر میں یوں اپنی زمیں گیر زبوں حالی میں
سامنے تیرے نہ پھیلاتا کبھی دستِ نیاز
تجھ سے کرتا نہ گدایانہ کبھی عرضِ سوال
آ اٹھا لے مجھے اک موجِ رواں، برگِ خزاں
روئے افلاک پہ اک ابرِ رواں کی صورت
خارزاروں سے مری زیست کا دامن الجھا
زخم ہی زخم ہے دل، خون ہی خوں ہائے وائے!
پابہ زنجیر ہوا، خستہ و مجبور ہوا
موج بر موج حوادث کی گراں باری سے

وہ جواں روح، دلِ آشفتہ کہ تھا تیری طرح
تند، شوریدہ، سبک، سرکش و خودبیں، بےباک

ہاں بنا لے مجھے تو بن کی طرح اپنا رباب
اس کے مانند مرے برگ بھی ریزاں ہیں تو کیا
تیرے آہنگِ جلالی کا گرجتا ہیجان
دونوں سازوں سے نیا کیف و نمو پائے گا
وہ نوا درد میں ڈوبی ہوئی گمبھیر اتھاہ
دل سے نکلی ہوئی پُرسوز خزاں کی آواز
غم کی تلخی میں بھی اک طرفہ حلاوت کی امین
روحِ آشفتہ و کرار مری روح ہو تو
تندخو، تندمنش تو ہمہ تن میں بن جا
مردہ پتوں کی طرح خفتہ خیالات مرے
شش جہت عالمِ امکاں میں پریشاں کر دے
کہ نئے رنگ سے ہو عالمِ ہستی کی نمود
اور ان نغموں کے ہنگامۂ طوفانی سے
نوعِ انساں میں مرے بول پریشاں ہو جائیں
جس طرح گلخنِ افسردہ سے برجستہ شرار
میرے ہونٹوں سے کہ ہیں مضطر و بےتاب دوام
تو جہاں کے لئے شہنائے بشارت بن جا
غم نہیں گر ہے زمانے میں زمستاں کا عمل
گر خزاں آئی تو کیا موسمِ گل دور نہیں

اجنبی سرزمین میں

(فاتح لشکر کے ایک سپاہی کے محسوسات)

ضمیر جعفری

نگارانِ عجم کے گیسوئے شاداب بھی دیکھے
غزالانِ ختن، نادیدہ و نایاب بھی دیکھے
مرے رستوں میں کتنے شعلہ ہائے رنگ بھی تڑپے
مری آنکھوں نے کتنے اجنبی مہتاب بھی دیکھے
طلب نے اپنے آئینوں سے جو پیکر تراشے تھے
ہوس نے چاندنی کے وہ مجسم خواب بھی دیکھے

طلسمی ساحلوں نے اجنبی رنگوں کو لہرایا
مدھر گیتوں نے اپنا دل مرے سینے میں دھڑکایا
جواں راتوں کی روشن فرصتوں کے سامنے اکثر
شگفتہ جنتوں نے اپنا دامن آپ پھیلایا
زمیں کی ناچشیدہ لذتوں کے ارمغاں لیکر
مسافر کو کشادہ منزلوں نے یاد فرمایا

ہزاروں پھول خوابوں میں پرو لینے کو جی چاہا
کئی کانٹے رگِ جاں میں چبھو لینے کو جی چاہا
کبھی نغموں کی شیرینی میں کھو جانے کو دل تڑپا
کبھی ابریشمی سایوں میں سو لینے کو جی چاہا
کسی "وابستگی" سے مسکرا دینے کو لب ترسے
کسی "آسودگی" کے ساتھ رو لینے کو جی چاہا

مگر وہ شب: "وداعِ یار" کی شب ساتھ ہے میرے
تری چشمِ ستارہ بار کی شب ساتھ ہے میرے
مری یادوں کے دامن پر فروزاں ہیں ترے آنسو
ترے اندیشۂ بیدار کی شب ساتھ ہے میرے
بہا جس کا یہ میری زندگی بھی ہو نہیں سکتی
وہ تیرے غم، وہ تیرے پیار کی شب ساتھ ہے میرے

یہاں بھی تیری زلفوں کی صبا آتی رہی مجھکو
یہاں بھی تیری خوشبوئے وفا آتی رہی مجھکو
یہاں بھی میری راتیں تیرے رخساروں سے روشن تھیں
یہاں بھی ان ستاروں کی ضیا آتی رہی مجھکو
یہاں بھی تیری دھڑکن کی صدا سنتا رہا ہوں میں
یہاں بھی تیرے دامن کی ہوا آتی رہی مجھکو

(۱۹۵۱ء)

تہمت

قیوم نظر

تونے ہی دکھایا تھا
الفاظِ ستم زا کا جلتا ہوا اک بجرا
دوری کے سمندر میں بہتا ہوا آیا تھا
اور درمیاں پہ چھایا تھا

اب کس لئے حیراں ہے
میں دردِ نہایت سے تو حسن حکایت سے
پہنچے ہیں جہاں جینا مر رہنے کا ارماں ہے
ہر رنگ ہیں عریاں ہے

محرومیٔ حاصل نے
ہر شے کو حسیں دیکھا چاہت کا نگیں دیکھا
روکا نہ کسی عنواں ویرانیٔ منزل نے
افسردگیٔ دل نے

شہر سے دور

ضمیر اظہر

جانے کیا دل میں خلش تھی کہ سکوں کی خاطر
شہر سے دور، بہت دور نکل آیا ہوں
کوئی خواہش، نہ تمنا، نہ ارادہ، نہ خیال
غم کے ہاتھوں یونہی مجبور نکل آیا ہوں
رہبر اک جادۂ گمنام ہے، خاموش و طویل
سبز کھیتوں سے جو دامن کو ہے سرکائے ہوئے
شام کے سائے میں نادار حسینہ کی طرح
پیشِ ایوانِ اُفق ہاتھ ہے پھیلائے ہوئے
دُھندلی دُھندلی سی فضاؤں کے حسیں حلقے میں
مثلِ شبہ کار مقید ہے سہانی بستی
بڑھتے جاتے ہیں قدم وقت کی رفتار کے ساتھ
کھلتی جاتی ہے دل و جاں میں نرالی بستی
دودھیا بھیڑوں کے ہمراہ سجیلے دہقاں
گاؤں کی سمت چلے آتے ہیں اِٹھلاتے ہوئے
نے کی پُر سوز و سبک نے سے کنہیا کی طرح
سحر ہی سحر ہر اک گام پہ چھلکاتے ہوئے
چھم چھما چھم کے بہاؤ میں خراماں، رقصاں
گوریاں گاؤں کی پنگھٹ کو رواں ہیں ایسے
محوِ گلگشت ہیں کچھ پریاں برائے تفریح
الف لیلیٰ کے فسانوں سے نکل کر جیسے
ہائے پُر کیف ہے کیا گاؤں کی بے لوث فضا!
زندگی اپنے حسیں روپ میں ہے رقص کناں
پھول کھلتے ہیں مسرت کے جو اس بستی میں!
ایسی خوشبو ہے بھلا شہر کے پھولوں میں کہاں!

غزل

حفیظ ہوشیارپوری

گرچہ ہر ہر گام پہ ماہ و سال گذرتے جاتے ہیں
راہِ طلب سے تیرے پریشاں حال گذرتے جاتے ہیں

راہیں اُن کی منزل اُن کی میخانے کی راہ سے جو
رگ رگ میں بھر کے برقِ سیال گذرتے جاتے ہیں

راہبری اب راہزنی ہے اور منزل کے دیوانے
راہ سے بے پروائے جان و مال گذرتے جاتے ہیں

جن سے ملاقاتوں کی راتیں بھولے بسرے خواب ہوئیں
اُن کی جدائی کے دن بھی ہر حال گذرتے جاتے ہیں

دُھندلی سی کچھ تصویریں ہیں دل کے آئینہ خانے میں
نظروں سے موہوم سے خد و خال گذرتے جاتے ہیں

کون کسی کا پُرساں ہے اس گونگی بہری دُنیا میں
دل میں لئے سب حسرتِ عرضِ حال گذرتے جاتے ہیں

عشق ہے ایسی راہ کہ جس میں کوئی کسی کا ساتھ نہ دے
ہم بھی دیکھ کے ہم سفروں کی چال گذرتے جاتے ہیں

اپنے نقشِ پا سے حفیظؔ اپنی اک راہ نکالیں گے
چھوڑ کے پیچھے ہر راہِ پامال گذرتے جاتے ہیں

غزل

جعفر طاہر

غمِ دوراں، غمِ جاناں، غمِ جاں ہے کہ نہیں
دلستاں سلسلۂ غم زدگاں ہے کہ نہیں

ہر نفس بزمِ گلستاں میں غزل خواں تھا کبھی
ہر نفس نالہ کشاں، نوحہ کناں ہے کہ نہیں

ہر نظر نغمہ سرا، انجمن آرا تھی کبھی
ہر نظر حیرتیٔ رنگِ جہاں ہے کہ نہیں

ہر زباں پر تھا کبھی تذکرۂ لطفِ بہار
ہر زباں شکوہ گرِ جورِ خزاں ہے کہ نہیں

مے چکاں، بادہ فشاں تھے لبِ گلرنگ کبھی
لبِ گلرنگ پہ زخموں کا گماں ہے کہ نہیں

ہر قدم جانبِ گلزار کبھی اٹھتا تھا
ہر قدم دشت نوردی میں گراں ہے کہ نہیں

قافلے جانے گھٹاؤں کے کہاں اتریںگے
ہر خمِ زلف بحسرت نگراں ہے کہ نہیں

شرمۂ چشمِ عنایت کی حکایت چھوڑو
آج ہر آنکھ میں آہوں کا دھواں ہے کہ نہیں

دشتِ وحشت سے نہیں کم یہ جہانِ گل ولو
صورتِ ریگِ رواں، عمرِ رواں ہے کہ نہیں

یوں اسے بادِ بہاری کا ترانہ کہہ لو
ورنہ یہ قافلۂ گل کی فغاں ہے کہ نہیں

یہ بہاریں بھی نئی ہیں، یہ نظارے بھی نئے
صحنِ گلشن پہ بیاباں کا گماں ہے کہ نہیں

نہ تو بلبل کی نوا ہے نہ صدائے طاؤس
صحنِ گلزار میں اب امن واماں ہے کہ نہیں

پارۂ سنگ سہی تیغِ ستمگر نہ سہی
کچھ علاجِ غمِ آشفتہ سراں ہے کہ نہیں

مجھ سے کیا پوچھتے ہو کون یہاں تک پہنچا
سرخیٔ خارِ بیاباں سے عیاں ہے کہ نہیں

یہ لہو تشنہ لبوں کا ہے لہو اے ساقی
چشمۂ آبِ بقا بن کے رواں ہے کہ نہیں

کوئی تاریک نہیں تیرہ شبوں کی راتیں
دل کے داغوں سے چراغاں کا سماں ہے کہ نہیں

زندگی کچھ بھی سہی پھر بھی بڑی دولت ہے
موت سی شئے بھی یہاں جنسِ گراں ہے کہ نہیں

صورتِ لطف وکرم یہ ہو تو دل کیوں نہ جلے
آگ پتھر کے بھی سینے میں نہاں ہے کہ نہیں

غمِ یاداں میں بظاہر تو یہ اک آنسو ہے
دوستو تم ہی کہو لعلِ گراں ہے کہ نہیں

کعبۂ دل بھی لٹا شہرِ وفا کی صورت
دشمنِ امن واماں حسنِ بتاں ہے کہ نہیں

ظلم چپ چاپ سہے جاؤگے آخر کب تک
اے اسیرانِ قفس منہ میں زباں ہے کہ نہیں

یہ ادب گاہِ محبت ہے جو چپ ہوں طاہر
ورنہ یاں کون سا اندازِ بیاں ہے کہ نہیں

غزل

ناصر کاظمی

کس کے جلووں کی دھوپ برسی ہے
آج تو شام بھی سحر سی ہے

دیکھیں اب کے کسے ڈبوئیں گی
ہیئت آنکھوں کی ابر تر سی ہے

ہم بھی جی بھر کے آج روئے ہیں
اور گھٹا بھی تو کھل کے برسی ہے

دل میں اب کیا رہا ہے تیرے بعد
ایک سنسان رہگذر سی ہے

اہلِ غم ہیں کہ صبح کی تصویر
دل بجھا سا ہے آنکھ ترسی ہے

آنکھیں ہر وقت کیوں نہ بند رہیں
دل کی حالت ہی اب دگر سی ہے

کیا کہیں کتنے زخم کھائے ہیں
جیبِ دل ہم نے عمر بھر سی ہے

بے ثمر ہی رہی ہے شاخِ مراد
برف پگھلی تو آگ برسی ہے

کہہ رہی ہیں جلی ہوئیں شاخیں
پھول کی زندگی شرر سی ہے

بڑھتی جاتی ہے شوق کی روداد
آپ سن لیں تو مختصر سی ہے

کیوں نہ کھینچے دلوں کو ویرانہ
اس کی صورت بھی اپنے گھر سی ہے

صبح تک ہم نہ سو سکے ناصرؔ
رات بھر کتنی اوس برسی ہے

غزل

محشر بدایونی

پھر جاگ اٹھی نیم شب کی فریاد
پھر آئی وہ زلف تا کمر یاد

اک رنگ میں شب گزر رہی ہے
اب کس کو ہے فتنۂ سحر یاد

اے لمحۂ عشرتِ گریزاں
ہم تجھ کو کریں گے عمر بھر یاد

مسکن میں افق کے چاند ڈوبا
اور آیا ہمیں سفر میں گھر یاد

ہم نے تو بہت بہت بھلایا
آئے وہ گھڑی گھڑی مگر یاد

اک جنبشِ لب نے کچھ کہا تھا
کچھ تجھ کو ہے عشقِ معتبر یاد!

یہ شوقِ سفر کی انتہا ہے
منزل ہی رہی نہ رہگذر یاد

عرصہ ہوا لیکن آج تک ہے
اک رنجشِ دو دِ مختصر یاد

سو بار ملے گا بڑھ کے محشرؔ
تو پیار سے ایک بار کر یاد

رپورتاژ

کاف تا کاف

(۱)

ابوسعید قریشی

"کاف تا کاف"۔ یہ عنوان مجھے "ماہِ نو" کی طرف سے ملا ہے۔ اس کے تحت مجھے کشمیر سے کراچی تک پاکستان کے فنِ تعمیر کا جائزہ لینا ہے۔ اس کام کے لئے تو کسی آرل سٹائین، کزنز، براؤن یا مارشل کی ضرورت تھی جو بنیادوں، ستونوں، محرابوں ...... اور گنبدوں کے مقابلے اور موازنے کرتا۔ پتھروں کی ساخت اور تراش خراش، بت تراشوں کے تیشوں، خطوط کے خم و پیچ، پچی کاری کے نقوش اور روغنی اینٹوں کے رنگوں کے امتزاج کی خبر دیتا ـــ مگر بیس پچیس منٹ میں پچاس صدیوں کی سیاحت کے تصور سے شاید فنِ تعمیر کا بڑے سے بڑا ماہر بھی کسی پرانے مقبرے کی بھول بھلیوں میں چھپ جاتا۔ غالباً اسی لئے اس مہم پر ایک افسانہ نگار کو مامور کیا گیا ہے کہ خیالات کے تانے بانے سے کچھ تو بنائے گا۔ ماہرین کو اس تذکرے میں جو سقم نظر آئیں گے ان کا ذمہ دار "ماہِ نو" کا ادارہ ہے ـــ میں نہ ماہرِ آثارِ قدیمہ ہوں۔ نہ مورخ نہ معمار!

تو صاحبو! پشاور چھاؤنی کے ریلوے سٹیشن کے قریب، ریس خانہ کے پیچھے۔ گورنمنٹ ہاؤس کی جنوب مشرقی دیوار کے سامنے برجیوں والی ایک عمارت ہے۔ ان چھتریوں کے مینار۔ اگر اونچے ہو جاتے تو دور سے شاید کسی مسجد کا شبہ ہوتا۔ لیکن پشاور کے زائرین کو اس دھوکے سے بچانے کے لئے عمارت کے بیرونی دروازے پر "عجائب خانہ" کا بورڈ لگا دیا گیا ہے۔ یہ عمارت کسی زمانے میں انگریزوں کی رقص گاہ تھی۔

پشاور کا عجائب خانہ اس صنعت صنم تراشی کا مندر ہے جسے "گندھارا آرٹ" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہاں سینکڑوں چھوٹے بڑے بت پناہ گزیں ہیں۔ پاکستان میں جہاں سکھوں اور ہندوؤں کے گوردوارے اور مندر محفوظ ہیں وہاں ان اقلیتوں کا بھی احترام کیا جاتا ہے۔ چنانچہ حکومت کی طرف سے ایک تنخواہ دار افسران کی دیکھ بھال کے لئے مقرر ہے جو کیوریٹر کے نام سے مشہور ہے۔

کیوریٹر کی فولادی الماری میں تانبے وغیرہ کی بنی ہوئی ایک ڈبیہ ہے جو تاریخی نوادر کی دنیا میں کنشک کی ڈبیہ کے نام سے مشہور ہے۔ ڈھکنے کے اوپر مہاتما بدھ کی مورتی ہے۔ اس کے دائیں بائیں بدھ بھکشو ہیں۔ ڈھکنے کے بالائی حصے پر باہر کی طرف ابھری ہوئی مرغابیاں اڑ رہی ہیں، ڈھکنے کے اوپر خروشتی رسم الخط میں مہاراجہ کنشک کا نام آتا ہے۔ اس ڈبیہ کے اندر بلور کی ایک ہشت پہلو ڈبیہ یا شیشی تھی۔ اس پر مہاراجہ کنشک کی مہر لگی ہوئی تھی۔ بلور کی اس ڈبیہ میں مہاتما بدھ کی ہڈیوں کے تین چھوٹے چھوٹے ٹکڑے موجود تھے جنہیں بطور تحفہ خیر سگالی انگریزوں نے غالباً برما بھیج دیا تھا۔

یہ مقدس ڈبیہ گنج دروازہ پشاور کے باہر ایک پرانی عمارت سے برآمد ہوئی تھی جو کنشک کے بدھ مت کے حلقہ بگوش ہونے کی تقریب پر بطور یادگار تعمیر کی گئی۔ اور "شاہ جی کی ڈھیری" کہلاتی ہے۔ پاکستان میں بدھوں کی ایسی بہت سی یادگاریں ہیں، انہیں اصطلاحاً ٹوپ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ لیکن ٹھہریے۔ شاہ جی کی ڈھیری ـــ توبہ! اس یادگار کے سامنے یہ اجنبی کون کھڑا ہے؟ ـــ یہ ہیون سیانگ ہے حکیم کنفیوشس کا ہم وطن ـــ سال ۶۳۰ء ہے۔ ہیون سیانگ کچھ کہہ رہا ہے:-

"اس یادگار کی بلندی ۵۵۰ فٹ ہے۔ کلس اس کے علاوہ ہے۔ یہ تانبے کے پچیس تھالوں کا بنا ہوا ہے۔ دیکھئے کیسے لس لس کر رہے ہیں۔ آنکھ نہیں ٹھہرتی"۔ یہی طرزِ تعمیر بدھوں کی خانقاہوں عبادت گاہوں اور یادگاروں کا پیش رو ہے۔ آئندہ جہاں بھی اس شکل و صورت کی

عمارت نظر نہ آئے گی اسے بلا سوچے سمجھے بدھ مت کی تاریخ سے منسوب کر دیا جائے گا۔

بدھ مت کی اکثر یادگاریں اسی قسم کی ہیں۔ ہمارا چینی دوست کہتا ہے کہ گنج دروازے کے باہر کنشک کی یادگار، پانچ چبوتروں پر مبنی ہے۔ سب سے نیچے ایک بڑا چبوترا ہے۔ اس کے اوپر اس سے چھوٹا۔ حتیٰ کہ پانچویں چبوترے تک پہنچ جائیے۔ یہاں سے اصل ٹوپ شروع ہوتا ہے۔ اس کا سب سے زیریں چبوترہ ۱۸۲ فٹ کا ہے۔ عمارت کی دیواریں پتھر کی ہیں۔ یہاں روغنی اینٹیں بھی لگی ہیں جن میں ایک پر خروشتی رسم الخط میں کچھ لکھا ہے۔ شاید سنگ بنیاد ہو۔ ممکن ہے مہاتما بدھ کے احکام میں سے کوئی حکم ہو۔ نجات، نروان یا مکتی کا کوئی اصول ہو — کون جانے کب ہو گی آدمی کی نجات؟ — ممکن ہے ایٹم کا سینہ اور ہائیڈروجن کا دل چیرنے والے اس کا جواب دے سکیں —— مگر یہ اشلوکوں کی آواز کہاں سے آ رہی ہے۔ ہاں یہ بدھ بھکشو ہیں جن کے حجرے کہیں قریب ہی ہونے چاہئیں۔ یہ ناممکن ہے کہ صدر عمارت کے اندر تو مہاتما بدھ کے باقیات پڑے ہوں اور کنشک کے راج میں ان کی حفاظت کا کوئی انتظام نہ ہو —— وہ دیکھئے نجات کے متلاشی پانچ چبوتروں کی سیڑھیاں چڑھتے اوپر آ رہے ہیں۔ مرکزی عمارت میں جگہ جگہ ستونوں پر مہاتما بدھ کے مجسمے ان کا استقبال کر رہے ہیں۔ یہ مجسمے چونے سے بنائے گئے ہیں۔ ان کے ہونٹوں پر سکون آمیز مسکراہٹ کھیل رہی ہے۔ وہ کہہ رہے ہیں کہ جس طرح میں نے اپنے آپ کو پا لیا ہے، اسی طرح تم بھی وہ روشنی حاصل کر سکتے ہو، جو آدمی کا نصب العین ہے — کنشک کی یہ یادگار آج اینٹ پتھر کا ایک ڈھیر ہے جس کے باقیات عجائب خانے کی زینت ہیں۔

پشاور کے عجائب خانے کے مرکزی دروازے کے سامنے شیشے کی الماری میں تخت بائی کے کھنڈروں کا ایک ماڈل پڑا ہے — مردان سے دس میل شمال مشرق کی طرف۔ تخت بائی کی خانقاہ بدھ مذہب کے عروج کی کہانی کہہ رہی ہے —— یہ عمارتیں میدان کی سطح سے کوئی پانچ سو فٹ بلند ایک پہاڑی پر واقع ہیں۔ نجات کے ان متلاشیوں کو شاید دنیا کے ہنگاموں سے دور کسی گوشۂ عافیت کی ضرورت ہے۔ صدر ٹوپ ایک بڑے سے صحن میں واقع ہے۔ آئیے پتھر کی ان سیڑھیوں کے ذریعے ہم دوسرے صحن میں چلیں، یہاں اسی قسم کی اور چھوٹی چھوٹی عمارتیں دیکھ رہے ہیں آپ؟ اور یہ زینہ جو آپ کے سامنے ہے اس مستطیل صحن کو جاتا ہے۔ جہاں بھکشوؤں کے حجرے ہیں، جن میں دیوں اور کتابوں کے لئے دو دو طاقچے بھی موجود ہیں۔

اور اس مستطیل کے مغرب میں یہ جو مربع نما ایوان ہے نا، بھکشوؤں اور مہاتما بدھ کے دوسرے پیروؤں کی جلسہ گاہ ہے۔ شاید اس وقت کوئی اہم مسئلہ درپیش ہے۔ بہت ممکن ہے ان لوگوں کے بارے میں غور ہو رہا ہے جن سے دنیا کے امن کو خطرہ لاحق ہے —— مگر صحن در صحن اور قطار اندر قطار یہ کون لوگ ہیں؟ کچھ کھڑے ہیں، کچھ آلتی پالتی مارے ان کے ملبوسات کے خطوط دریا کی لہروں کی طرح بہتے چلے جا رہے ہیں۔ اور بعض بعض خطوط کو دیکھ کر تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ یہاں نہیں کسی اور دنیا میں جا کر ملیں گے۔ وجود و عدم کے دو رلے پر جہاں صرف نور ہوتا ہے، وہ نور جو انسانوں کے گرد ہالہ بن جاتا ہے —— یہ مہاتما بدھ کے مجسمے ہیں۔ کالے پتھر میں بدھ کے عقیدت مندوں کی محبت کا ثبوت —— اور ان مجسموں کو دیکھئے۔ پیدائش سے لے کر نروان تک مہاتما بدھ کی زندگی کی پوری کہانی کہہ رہے ہیں۔ باندیوں اور مہارانیوں، سیوکوں اور راجاؤں کے لباس اور زیورات دیکھئے —— اور ان مورتیوں کو دیکھ رہے ہیں آپ؟ یہ محلوں اور مندروں کے بوجھ کو اپنے کندھوں پر اٹھائے ہوئے ہیں۔ یہ دروازوں اور شہ نشینوں کے جزو ہیں۔ یہاں وہ قوسیں اب تک نہیں آئیں جنہیں مسلمانوں نے رواج دیا۔ چنانچہ یہ دہلیز اور چوکھٹے زیادہ دیر تک عمارت کا وزن نہیں اٹھا سکیں گے۔ عمارتیں ڈھے جائیں گی، چھتیں زمین پر آ رہیں گی۔ اور یہ مجسمے ہواؤں کو اپنی کہانیاں سنائیں گے۔

بدھ کی یہ یادگاریں صوبہ سرحد کے کونے کونے میں بکھری پڑی ہیں — یہ سحری بہلول ہے۔ ہم تخت بائی سے کوئی تین میل جنوب مغرب کی طرف پہونچ چکے ہیں۔ تیس فٹ اونچی سی ڈھیری۔ شاید دوسری یا تیسری صدی عیسوی میں یہاں خوب چہل پہل ہو گی۔ بہت ممکن ہے کہ یہاں بھی مذہب کے بال کی کھال اتاری جاتی ہو۔ اور لوگ بدھ مت کی روح کو بھول کر اس کے خول کے نقش و نگار پر سر دھن رہے ہوں۔ یہ کشان خاندان کے زمانے کا کوئی قصبہ ہے۔ شہر پناہ کے ٹکڑے اب بھی موجود ہیں۔ اس ڈھیری کو کھدوا جائے تو شاید اس کی تاریخ کے بارے میں بھی کچھ پتہ چل جائے۔ لیکن ہمارے بڑے بڑے شہروں میں ہمارے اپنے رہنے بسنے کی عمارتیں بھی تو تیزی سے آثارِ قدیمہ کی صورت اختیار کر رہی ہیں۔ ایسے

میں ہمیں دوسری تہذیبوں کے آثارِ قدیمہ کی طرف رجوع کرنے کی کیا ضرورت ہے۔

تخت بہلول کے میدان میں اور بھی ایسی بہت سی ڈھیریاں اور بدھ مذہب کی خانقاہیں ملیں گی۔ ان پر کیا گذری ہوگی، اس کا تصور کرنے کے لئے ادھر جنوب کی طرف چلئے۔ یہی کوئی ہزار ایک گز چلنا ہوگا ۔ (میل سترہ سو ساٹھ گز کا ہوتا ہے) ۔ یہاں بھی بودھوں کی ایک خانقاہ تھی۔ کچھ کچھ ایسی ہی جیسی کہ آپ تخت بائی میں دیکھ چکے ہیں۔ مرکز میں ٹوپ آس پاس بھکشوؤں کے حجرے جن کے اوپر گنبد نظر آرہے ہیں۔ اور برستوں کے ساڑھے چار چار فٹ اونچے مجسمے۔ خیال ہے کہ شاید اس خانقاہ کو تاتاریوں نے تاخت و تاراج کر کے نذرِ آتش کر دیا تھا۔ خانقاہ کی مرکزی عمارت کا بنیادی چبوترا چونے اور پتھر کا تھا اور آگ سے بچ گیا۔ اس ڈھیری کا وجود اس حقیقت کا اعلان کر رہا ہے کہ نیکی کو بدی کی طاقتوں سے بچانے کے لئے طاقت ضروری ہے۔ یہ جملہ معترضہ تاریخ کا ایک سبق تھا جسے کبھی کبھی دوہرا لینا چاہئے!

صوبہ سرحد کا چپہ چپہ اس سبق کو دوہرا رہا ہے۔ پشاور سے شمال مشرق کی طرف چلئے۔ یہاں راستے میں قدم قدم پر ندیاں نظر آئیں گی۔ مغربی پاکستان کی ساری ہریاول یہاں جمع ہوگئی ہے۔ خیبر کی برہنہ و بے برگ چٹانیں دیکھنے والوں کے وہم و گمان میں بھی نہیں آسکتا کہ صوبہ سرحد کا کوئی حصہ اتنا زرخیز ہو سکتا ہے۔ کہ پاکستانی ادیب ان کا تصور ہی کر سکتا ہے۔ یہ چارسدہ کا علاقہ ہے۔ پشاور سے ۱۸ میل کے فاصلے پر یہ قصبہ گندھارا راجیہ کی راجدھانی تھا اور "پُسکلاوتی" کے نام سے مشہور تھا۔ سر آرل شٹائین نے جب سکندرِ اعظم کے قدموں کا کھوج نکالا تو معلوم ہوا کہ یہ یونانی ڈاکو اس راستے سے مار دھاڑ کرتا آیا تھا اور تیس دن کے محاصرے کے بعد اس شہر کو ہار ماننا پڑی۔ اس کے بعد یہاں کیا گذری، اس کا راز ان ڈھیریوں میں دفن ہے۔ کھیتوں میں ہل چلاتے وقت "چارسدہ" کے علاقے سے اکثر نوادر دستیاب ہوتے رہتے ہیں۔ پتھر کے چھوٹے بڑے بت، کانچ کے منکے۔ آئینوں کے ٹکڑے پرانے سکے۔ ایک خان زادے نے مجھے بھی ایک چھوٹا سا مجسمہ بطور تحفہ دیا ہے۔ اس میں کوئی راجہ گھوڑے پر سوار ہے۔ ان ڈھیریوں کے اکثر نوادر، خاص طور پر مجسمے کسانوں کی دستبرد کی نذر ہو جاتے ہیں۔

بڑی ستم ظریفی ہے کہ یہ علاقہ جہاں بدھ مت اپنے عروج کو پہونچا، جہاں چپہ چپہ پر گوتم کی یادگاریں اور نشانیاں موجود ہیں، خونریزی کے لئے اپنی مثال آپ ہو!

خیر! خانقاہوں کا سلسلہ اتنا طویل ہے کہ اس کا صحیح جائزہ لینے کے لئے مدتیں درکار ہیں۔ سو آیئے یزدان کی ان یادگاروں کو چھوڑ کر ان لوگوں کا فنِ تعمیر دیکھیں جو یزدان کے بجائے صرف دو وقت کی روٹی چاہتے ہیں۔ اس علاقے کے دیہات اور قصبوں کے لوگ عام طور پر کچے مکانوں میں رہتے ہیں۔ یہاں بھٹہ کی پکی ہوئی اینٹوں اور سمنٹ وغیرہ کا استعمال بہت کم ہے۔ درۂ کوہاٹ میں مکان پتھر کے ہوتے ہیں۔ دوسری جگہوں پر بالعموم ان گھڑے چھوٹے بڑے پتھروں اور گارے کی مدد سے دیوار کھڑی کر دی جاتی ہے۔ چھتیں لکڑی کے شہتیروں سے بنتی ہیں۔ غریب گھرانوں میں انہیں چوکور کرنے کی استطاعت بھی نہیں ہوتی۔ شہتیروں کے اوپر سرکنڈے ڈال دئے جاتے ہیں اور چھت کو مٹی سے لیپ دیا جاتا ہے۔ گھروں میں غسلخانے، باورچی خانے اور بیت الخلا نہیں ہوتے۔ البتہ شہری طرز پر جو مکان کہیں کہیں بن رہے ہیں وہاں ان ضروریات کا خیال رکھا جاتا ہے۔ اس علاقے کے طرزِ تعمیر کی سب سے بڑی خصوصیت یہاں کے دیہاتی مکانوں اور محلوں کی مورچہ بندی ہے۔ مکان کے اندر چاہے کچھ بھی ہو، فصیل ضروری ہے۔ ورنہ دشمنوں کو انتقام کا موقع مل سکتا ہے۔ یہاں ہر شخص رائفل یا ریوالور سے مسلح ہے۔ چنانچہ فصیل یہاں کے فنِ تعمیر کا جزوِ اعظم ہے۔ فصیل کی طرح مورچہ بندی کے لئے گاؤں کے ملک کے گھر میں ایک برج بھی ضروری ہے جہاں سے اڑوس پڑوس کے علاقے کا جائزہ لیا جا سکے اور حملہ آوروں پر گولیوں کی بوچھاڑ کی جا سکے۔

حجرے کو پٹھانوں کے دیہات اور سماجی زندگی میں بڑی اہمیت حاصل ہے۔ بھکشوؤں کے حجروں میں روشن دان تھے، کتابوں اور دیویوں کے لئے طاقچے تھے، اکثر چھتوں پر گنبد تھے۔ اندر حجرے کچے تھے لیکن پٹھانوں کے حجروں کی چھتیں سپاٹ ہیں۔ اکثر و بیشتر کچے ہیں، ہر بڑے خاندان کے لئے ایک حجرہ ضروری ہے۔ ہر ملک کے گھر کے ساتھ حجرہ لازمی ہے۔ یہاں مرد شام کو گپ ہانکتے ہیں، اپنے مسائل پر گفت و شنید کرتے ہیں، رباب پر اپنے قبیلے کی شجاعت کی داستانیں سناتے ہیں۔ جہاں جہاں بجلی پہونچ گئی ہے وہاں ریڈیو پاکستان کے پروگرام اور فلمی گانے سنتے ہیں، خبروں پر تبصرہ کرتے ہیں اور پشاور ریڈیو کے جواب رساں کو پروگراموں کے بارے میں اپنے خیالات سے آگاہ کرتے ہیں۔ حجرہ دیہات کی زندگی میں

کلب، سینما، تھیٹر اور کانفرنس ہال، ہیک وقت سبھی کچھ ہے۔ مگر اس کی چھت اس قدر سیاہ کیوں ہے اور دیواروں پر سفیدی کیوں نہیں؟ خالی مٹی کا لیپ کیوں ہے؟ کمرے کے وسط میں یہ جو ایک چپٹا چبوترہ ہے اسی پر میں یہاں آگ جلائی جاتی ہے۔ لکڑی یا پیال، لیکن سوائے ایک آدھ چھوٹے سے روشن دان کے جو دیوار کے کسی کونے میں سوراخ کی طرح نظر آتا ہے، یہاں کوئی چمنی یا دودکش موجود نہیں۔ چنانچہ سارا دھواں چھت سے چمٹ جاتا ہے۔ سردیوں کی لمبی راتوں میں یہاں دیر گئے تک محفلیں جمتی ہیں۔ خاندان کے غیر شادی شدہ لڑکے یہیں سوتے ہیں۔ سردی سے بچنے کے لئے فرش پر چٹائیوں کے نیچے پیال بچھائی جاتی ہیں۔ کھاتے پیتے گھروں میں چٹائیوں کے اوپر قالینوں کا فرش ہوتا ہے۔ پیال کے دھوئیں کے علاوہ خشک کڑوے تمباکو کا دھواں حجرے کی خاص خوشبو میں ہے ——— اف دم گھٹنے لگا، آئیے باہر چلیں۔

ہمارا سفر پشاور سے شروع ہوا تھا۔ اب ہم پھر وہیں پہونچ گئے ہیں۔ مہابت خاں کی مسجد کے مینار سارے شہر پر چھائے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ اور نمازیوں کو دعوت دے رہے ہیں۔ ان میناروں کے سامنے قلعہ بالاحصار کی بلندی بھی پست معلوم ہوتی ہے۔ مہابت خاں کی مسجد مغل طرز تعمیر کا ایک معمولی نمونہ ہے۔ اس میں ہیبت تو ہے لیکن وہ نفاست اور بانکپن نہیں جو مغل صنعت تعمیر کی خصوصیت ہے۔ غیر ماہرانہ مرمت کی کوشش میں اس کی رہی سہی نفاست کو بھی غرق کر رہے ہیں۔ آرٹ کی یہ مرمت ہوتی آپ سے نہیں دیکھی جائے گی۔ تو آئیے شہر کی سیر کریں۔

پشاور کے بیشتر مکان "بس گرا چاہتے ہیں" کا تاثر پیدا کرتے ہیں لیکن اس کے باوجود یہ بڑے سخت جان ہیں۔ لکڑی کے فریم انہیں سنبھالے ہوئے ہیں۔ ان چوکھٹوں میں اکثر کچی اینٹیں جڑ دی جاتی ہیں اور گھروں کی دیواریں بن جاتی ہیں۔ بعض مکانوں کی بالائی منزلوں پر اب صرف لکڑی کے ڈھانچے باقی رہ گئے ہیں۔ اینٹیں ایک ایک کرکے گر چکی ہیں۔ بعض لوگ اس طرز تعمیر کی ایجاد کو زلزلے کے جھٹکوں سے منسوب کرتے ہیں۔ بھونچال کے ہلکے ہلکے جھکولے یہاں صدیوں سے آرہے ہیں۔ اس کا ذکر آپ نے دربار اکبری میں بھی پڑھا ہوگا۔ کچھ لوگ کچی اینٹوں کے بکثرت استعمال کو (یہاں پرانی کوٹھیاں بھی کچی اینٹوں کی بنی ہیں) یہاں کی شدید گرمی کا توڑ بتاتے ہیں۔ لیکن یہ دیکھئے یہاں پکی اینٹوں کی حویلیاں بھی موجود ہیں۔ مگر ان میں بھی اکثر وبیشتر وہی چوکھٹوں کے اصول سے کام لیا گیا ہے۔ قریب قریب ہر بڑی حویلی میں تہ خانہ بھی ہے۔ باہر سے یہ پرانی دو منزلہ اور سہ منزلہ حویلیاں بالکل آسیب زدہ معلوم ہوتی ہیں، لیکن صدر دروازے سے اندر جائیے تو کشادہ صحن ملیں گے۔ کہیں کہیں حوض اور فوارے بھی نظر آجائیں گے۔ یہاں بھی مردانے زنانے کا الگ الگ انتظام ہے۔ دیوان خانوں کی چھتوں پر یہ نقش ونگار کیسے ہیں؟ یہ نقوش، یہ سنہرے نیلے پیلے، دھانی، گلابی رنگوں کا عجیب وغریب امتزاج، پھول پتیوں کی شکل میں قوس قزح کے یہ ٹکڑے آپ نے کاغذ سے بنی ہوئی کشمیری ڈبیوں، قلمدانوں اور کتابوں کی جلدوں وغیرہ پر دیکھے ہوں گے ؎

"کشمیر" کا جو ذکر کیا تو نے ہم نشیں
اک تیر میرے سینے پہ مارا کہ ہائے ہائے

مرزا غالب کشمیر نہ گئے ورنہ کلکتے کو بھول جاتے اور اقبال کی آواز سے آواز ملاتے :۔

ع رخت بہ کاشمر کشا، کوہ وتل ودمن نگر۔

پشاور سے کشمیر کے راستے اور بھی ہیں لیکن دشوار گذار۔ تو آئیے راولپنڈی چلیں۔ لیکن اٹک میں یہ ستون کیسے نظر آرہے ہیں؟ کوئی کہہ رہا ہے کہ مغلوں کے عہد میں یہاں پل ہوا کرتا تھا۔ اور یہ تعمیر کیسے ہیں؟ یہ قلعہ؟ مگر ہمیں رکنے کی مہلت نہیں۔ ہمارے سامنے کئی صدیوں کی مسافت پڑی ہے۔ اور ہم سے پہلے گذرنے والے سیاحوں کا بیان ہے کہ راستے میں ایسے ایسے پڑاؤ آتے ہیں کہ آگے بڑھنے کو جی نہیں چاہتا۔ وقت کبھی رک جاتا ہے اور کبھی ماضی کی طرف لوٹ جاتا ہے ــــ ایک ایسی ہی منزل ہمارا راستہ روکے کھڑی ہے ــــ ٹیکسلا!

سال ۳۲۶ ق.م ہے یونانی قزاق جسے دنیا سکندر اعظم کے نام سے پکارتی ہے، ایران کے سینکڑوں ستونوں والے دارالسلطنت کو جلا کر اپنی بربریت کا خراج وصول کرتا ہوا، اب دریائے سندھ کے اس طرف پہونچ چکا ہے اور ٹیکسلا کے راجہ کے ایلچی کو شرف باریابی بخش رہا ہے۔ ایلچی کوئی سو من چاندی اور جانے کتنے گھوڑے، ہاتھی بطور نذرانہ اور اپنے آقا کی التجائے اطاعت لے کر آیا ہے ــــ سکندر سوچ رہا ہے کہ دیکھا جائیں راجہ کی راجدھانی کتنی عظیم الشان ہوگی لیکن راجاؤں اور بادشاہوں کی دولت اور شان وشوکت سے تھوڑا ہی رعیت کی حالت کا اندازہ غلط بھی تو ہو سکتا ہے۔ بہت ممکن ہے بلکہ اغلب یہی ہے کہ جلد



قلعہ لاہور ۔ صدر دروازہ



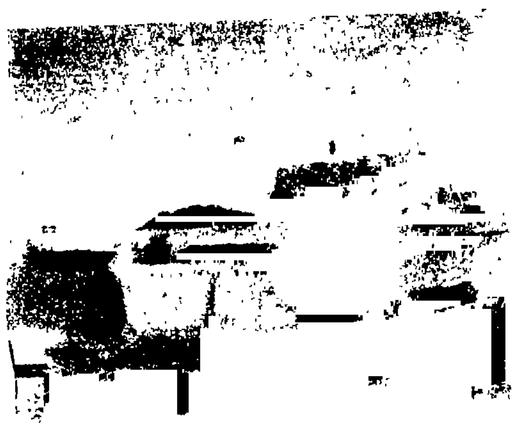
مقبرہ آصف جاہ ۔ لاہور



قلعہ خیر پور

آثار کہن (مغربی پاکستان)

قلعہ بالا حصار ۔ پشاور (سرحد)



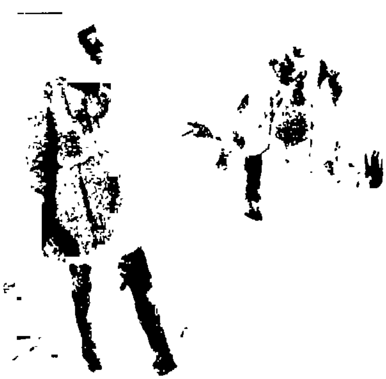
مقبرہ شاہ تراب، نزد ٹھٹھہ (سندھ)





اسٹیج کے چند مناظر

(مشرقی پاکستان)







ادھیراج کے ماتھے کا ٹیکا اور ان کی انگشتری کا لعل رعایا کے خون کی مرہونِ منت ہو۔ سکندر کے جلوس میں چلے آیئے یہیں شاید وہ کچھ نہیں کہے گا۔ بلکہ بہت ممکن ہے اپنے تبسم سے بھی نواز دے۔ کیونکہ ہم سکندر کے استاد کے اساتذہ کے گن گا رہے ہیں اور فلسفہ یونان کو اپنے لئے مشعل راہ بنا رہے ہیں۔ مگر شعلوں کی روشنی میں یہ ڈربے کیسے دکھائی دے رہے ہیں؟ —— جی یہی ٹیکسلا ہے —— ٹیکسلا کا پہلا شہر۔ یہ دوسرے اور تیسرے بلکہ چوتھے ٹیکسلا کے نیچے دفن ہو جائے گا۔ ان بستیوں کی سیر کے لئے آپ کو انتظار کرنا ہوگا۔ تو سکندر کے جلوس کے پیچھے پیچھے چلے آیئے۔ توبہ کتنی تنگ گلیاں ہیں! کچی، اتنی بھی توفیق نہیں کہ راستے میں پتھروں کا فرش بچھا دیں۔ فاتح اعظم کے استقبال کے لئے۔ خاک اڑ رہی ہے گھوڑوں کے سموں سے صبر کیجئے۔ ابھی تو اس پوری تہذیب کی خاک اڑے گی جو ٹیکسلا کے نام سے منسوب ہے۔ مگر ان مکانوں کو دیکھ رہے ہیں اب کم از کم سفیدی کی کوچی ہی پھیر دی ہوتی کہ بادشاہوں کے بادشاہ سکندرِ اعظم کو آنا ہے۔ گھروں کے اندر اندھیرا پڑا ہے تو کیا ہوا چھتوں میں "مگھ" موجود ہیں۔ دن کو سورج اور رات کو چاند تاروں کی روشنی اندر آ سکتی ہے —— ہوں! یہ دیوار مٹی کی بنی ہے! اور یہ پتھر جو نظر آ رہے ہیں مٹی کے اندر؟ اور یہ تو کسی امیر آدمی کا مکان ہے مگر شاید یہاں کے معمار پتھروں کو گھڑنا اور چوکور بنانا نہیں جانتے۔ یہ مکان دوسروں کی بہ نسبت کچھ بہتر دکھائی دے رہا ہے۔ یہ صحن ملاحظہ فرمایئے اور یہ ادھر تو اچھا خاصا ہال ہے۔ شاید کسی منتری کا مکان ہے جہاں اس کی پارٹی کے اجلاس منعقد ہوتے ہیں۔ اس کی چھت کو سنبھالنے کے لئے یہ تین کھمبے سے بھی کھڑے کر رکھے ہیں۔ ان کا نیچے کا حصہ پتھروں اور مٹی چونے کا بنا ہوا معلوم ہوتا ہے..... اور اس دوسرے مکان کے باہر یہ گیروا رنگ نظر آ رہا ہے۔

مگر ٹیکسلا کے اس پہلے شہر کو سکندر کے جلوس کے سوا سوا سو سال بعد دیکھئے —— یہ تیسرا ٹیکسلا ہے۔ اس کے گرد سات گز چوڑی پتھر کی فصیل پہرہ دے رہی ہے۔ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر مستطیل کونوں پر پہل دار برج بنے ہیں۔ زیریں شہر کا نقشہ پہلے ٹیکسلا سے مختلف ہے۔ یہاں سڑکیں اور گلیاں پہلے کی طرح بے ڈھنگی نہیں بلکہ مستطیل کی ترتیب نظر آ رہی ہے۔ بازاروں کے دوریہ نیچی نیچی دوکانیں نظر آ رہی ہیں دوکانوں کے پیچھے مکان ہیں جن کی دیواریں سانجھی ہیں۔ بعض بعض مکانوں میں صحن بھی موجود ہیں —— ذرا دیکھ کر چلئے گا۔ آپ کے قدموں کے نیچے تہ خانے کا زینہ ہے۔ گویا گرمی سے بچنے کا پورا انتظام ہے۔ مگر زمانہ آگے بڑھ رہا ہے۔

مسیح کی وفات کو نصف صدی گذر چکی ہے۔ ٹیکسلا میں وہی ٹوپ نما عمارتیں نظر آ رہی ہیں۔ مہاتما بدھ کی وہی یادگاریں، بھکشوؤں کے حجرے ہیں جنہیں آپ دیکھتے ہی پہچان جائیں گے۔ یہاں مورتیاں چونے کی ہیں یہاں مہاتما بدھ کا چونے کا حسین ترین بت موجود ہے۔ یہ بودھوں کے مندر ہیں یہیں ایک کمرے میں بے شمار سونا چاندی اور جواہرات ہیں جو مندر کی ملکیت ہیں۔

ٹیکسلا کا چوتھا شہر سرسکھ کے نام سے مشہور ہے۔ تیسرے ٹیکسلا سے ذرا دور کنشک کے عہد کے کچھ ہی عرصہ بعد ہارو کے میدان پر ابھرا۔ اس کی فصیل تغلق آباد کی فصیل کی یاد دلاتی ہے۔ اس کی چوڑائی کوئی ساڑھے چھ گز کے قریب ہے۔ اس کو پانی کے کٹاؤ سے بچانے کے لئے بنیادیں گول کر دی گئی ہیں۔ اس کے برج ساسانی طرز تعمیر کی یاد دلاتے ہیں۔ بودھوں کی خانقاہوں اور مندروں کے علاوہ یہاں یونان کے کلاسیکی طرز کا ایک معبد بھی موجود ہے۔ اس کے سامنے دو ستون ہیں۔ اس میں اور یونانی طرز تعمیر میں فرق ہے تو صرف اتنا کہ جہاں یونانی عمارتوں میں یہ ستون چاروں طرف قطار اندر قطار نظر آتے ہیں یہاں ان کی بجائے دیواریں ہیں اور دریچہ نما سوراخ دکھائی دے رہے ہیں۔ لیکن یہاں یونان کے کسی دیوتا کا بت موجود نہیں۔ دیوتاؤں کی مورتیوں کے بجائے ایک چبوترہ ہے۔ ماہرین کا خیال ہے کہ یہ عمارت غالباً زرتشت کے پیروؤں کا معبد تھا۔ یہاں کوئی آتشکدہ بھی ضرور ہوگا۔ اس کی آگ ملبے کے ڈھیروں کے نیچے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے سو گئی۔ اور اب ان کے دیوتا، چاند اور سورج اس پر ہر وقت چمکتے رہتے ہیں۔

(باقی آئندہ)

"ماہِ نو" اشاعت مئی ۱۹۵۵ء میں صفحہ ۳۵ اور ۳۶ پر "خیاباں خیاباں ارم" کے زیر عنوان جو تراجم شائع ہوئے ہیں ان میں پشتو تراجم رضا ہمدانی صاحب نے کئے ہیں۔ سہواً ان کا نام درج ہونے سے رہ گیا ہے۔ قارئین تصحیح فرمالیں۔ (ادارہ)

عوامی ناٹک

(مشرقی پاکستان)

سجّاد حسین

بنگال کے عوامی ناٹکوں کو بالعموم "جاترا" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس لفظ کے ٹھیک ٹھیک معنی بیان کرنا تو شاید دشوار ہو کیونکہ اس کا من و عن ترجمہ ممکن نہیں۔ اور سچ پوچھئے تو ایسی اصطلاح کا کوئی مترادف ہوتا بھی نہیں۔ اس کی تعریف تو کچھ اس طرح کی جاسکتی ہے کہ "جاترا" بنگلہ دیس کا ایک بڑا چہیتا اور مقبول عام ڈرامائی کھیل ہے۔ ویسے اس کے لفظی معنی ہیں "سفر" یا پھر اس کے پرانے معنی لئے جائیں تو اس کو "رتھا" کہہ سکتے ہیں۔ اس کے باوجود جہاں تک "جاترا" کے حقیقی معنوں کا تعلق ہے ہم اس سے کوسوں دور رہیں گے۔

"جاترا" بنگال کی اپنی خود رو اور بڑی من بھاتی پیداوار ہے اور اس نے ایک ایسی روایت سے جنم لیا ہے جو یہاں کے عوام الناس میں صدہا سال سے قائم ہے۔ اگر ہم یہاں سے بہت دور انگلستان کے ڈرامے پر نظر ڈالیں تو ہمیں اس کے نمونے وہاں کے کراماتی اور دھارمک ناٹکوں اور "انٹرلوڈ" یا پھر یونانی ڈرامے کے ابتدائی نمونوں میں دکھائی دیں گے۔ میرا مطلب اُن ڈرامائی کھیلوں سے ہے جو "ایسکلس" اور "سوفاکلیز" سے پہلے کھیلے جاتے تھے۔ ہم ان بنگلہ ناٹکوں کو نہ تو پوری طرح واضح اور کٹی سدھی ٹریجڈی کہہ سکتے ہیں نہ کومیڈی۔ ان کھیلوں میں کوئی مشہور کہانی اسٹیج پر پیش کی جاتی ہے۔ بالعموم کھلی فضا میں۔ اور کہانی بھی ایسی جس میں کوئی نصیحت کی بات ہو۔ عام طور پر یہ کہانیاں مقبول عام داستانوں یا خیالی قصے کہانیوں سے ماخوذ ہوتی ہیں۔ ان کا سب سے بڑا مقصد تو ظاہر ا کھیل تماشہ ہی ہوتا ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ کوئی تعلیم یا اخلاقی سبق بھی دیا جاتا ہے۔ بات چیت عموماً صاف سیدھی نثر ہی میں ہوتی ہے۔ اگرچہ کبھی کبھی نظم بھی برتی جاتی ہے۔ وہ گانے بجانے سے بھی کام لیا جاتا ہے۔ ناٹک میں کئی ایسے موقعے آتے ہیں جہاں مختلف مقاصد کے لئے کافی کچھ گایا بجایا بھی جاتا ہے۔

جیسے یہ عوامی ناٹک سیدھے سادے ہیں اسی طرح ان کا ساز و سامان بھی ہے۔ لیکن کوشش یہ کی جاتی ہے کہ مناظر سے خوب دھوم دھام پیدا ہو۔ چنانچہ جب کبھی ضرورت پیش آتی ہے بھڑکدار پوشاکیں اور رنگین پردے بھی کام میں لائے جاتے ہیں۔

جاترا دو باتوں میں یونانی ڈراموں سے بہت ملتا جلتا ہے۔ اور یہ ایسی چیزیں ہیں جن کا خاص طور پر مطالعہ لازم ہے۔ ایک تو یہ کہ ان ناٹکوں میں کورس بھی حصہ لیتا ہے۔ دوسرے شروع سے لیکر آخر تک ایک ہی واقعہ لگاتار پیش کیا جاتا ہے۔ اسٹیج کسی وقت بھی خالی نہیں رہتا اور بالعموم کوئی پردہ بھی استعمال نہیں کیا جاتا۔

اگر جاترا میں الگ الگ منظر قائم نہیں کئے جاتے تو اس کے یہ معنی نہیں کہ ان ناٹکوں میں تینوں وحدتوں کو پیش نظر رکھا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان وحدتوں کا بری طرح ستیاناس کیا جاتا ہے اور دیکھنے والے اس بے پروائی کو قبول بھی کر لیتے ہیں۔ ناظرین ایسے مسئلوں کی ذرا بھی پروا نہیں کرتے، انہیں تو صرف اس بات سے غرض ہوتی ہے کہ کوئی ایسی کہانی جس میں تھوڑا بہت ربط ہو ڈرامائی طور پر پیش کر دی جائے۔ تاوقتیکہ کہانی کا سلسلہ ٹھیک ہو آپ جو منظر چاہیں ڈرامہ میں لا سکتے ہیں۔

آپ پوچھیں گے ایسے ناٹک لکھتا کون ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ان کے لکھنے والے کوئی جانے پہچانے آدمی نہیں ہوتے، یہ تو عوامی ناٹک ہیں اور انہیں کوئی ایک شخص نہیں لکھتا۔ یہ تو خود بخود بنتے چلے جاتے ہیں یعنی جہاں تہاں سے تھوڑی تھوڑی باتیں مل جل کر ناٹک کا روپ دھار لیتی ہیں۔ یہ کیسے ہوتا ہے، اس کو سمجھنے کے لئے قدیم

داستانوں پر غور کرنا چاہیے جن سے باقاعدہ رزمیہ داستانیں ابھرتی ہیں۔ انہی کی طرح جاترا بھی ان جانے ہر دلعزیز گیتوں اور "باروں" ہی سے ابھرے ہیں۔ یوں تصور کر لیجئے کہ گیتوں کی ایک لڑی سی ہوتی ہے جس کو "پال" کہتے ہیں۔ یہ پال درحقیقت "باروں" کا مجموعہ ہوتے ہیں۔ جب یہ "بارے" حرکات و سکنات کی شکل اختیار کر لیتی ہیں تو یہ "جاترا" بن جاتی ہیں۔

یہاں اس بات پر زور دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم جاترا کا تصور اسٹیج کے بغیر کر ہی نہیں سکتے۔ "پال" گویا مکالمے ہوتے ہیں جو اسٹیج پر پہنچ کر "جاترا" بن جاتے ہیں۔ لہٰذا ہمیں پہلے جس چیز کا تصور کرنا پڑتا ہے وہ یہی "پال" ہیں۔ یہ "آلہا اودل" قسم کی باروں کے سلسلے سے ترتیب پاتے ہیں۔ یہ سلسلہ برابر زبانی طور پر جاری رہتا ہے یہاں تک کہ اس کی تمام ڈرامائی صلاحیتیں اجاگر ہو جاتی ہیں۔ پھر کوئی بڑا زمیندار یا دیہاتی منڈلی اس کو اسٹیج پر پیش کرنے کا اہتمام کرتی ہے، ضروری سامان بہم پہنچایا جاتا ہے، اسٹیج کھڑا ہوتا ہے اور پارٹ ادا کرنے والے چنے جاتے ہیں۔

جب یہ مرحلے ہو جاتے ہیں تو جاترا بڑی تیزی سے روپ دھارنے لگتا ہے۔ اداکار اپنا اپنا مکالمہ تیار کر لیتے ہیں اور یہ طے پاتا ہے کہ وہ اسٹیج پر کونسا پارٹ ادا کریں گے۔ ان باتوں کے لئے بہت منجھے ہوئے ذوق، قوتِ فیصلہ اور سلیقہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ کیونکہ جن باروں پر ناٹک کی بنیاد ہو اُن سے غیر ضروری باتوں کی کاٹ چھانٹ بہت ٹیڑھا معاملہ ہے۔ یہ بھی دھیان رکھنا پڑتا ہے کہ کوئی ایسا گیت نہ سمو لیا جائے جو دیکھنے والوں کے جذبات کو ٹھیس پہنچائے۔

آپ پوچھیں گے کہ کوئی جاترا جو کسی ہر دلعزیز داستان پر مبنی ہو کیسے جذبات کو ٹھیس پہنچا سکتا ہے؟ اس کی دو صورتیں ہیں: ایک یہ کہ سیدھے سادے دیہاتی داستانوں کو بڑی سنجیدہ چیز خیال کرتے ہیں اور یہ پسند نہیں کرتے کہ کسی ہیرو کو غلط پیرائے میں پیش کیا جائے۔ دوسرے بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ ہمارے اپنے عہد کے واقعات اور مقامی باتیں بھی گیتوں میں شامل کر لی جاتی ہیں۔ اگر کسی ایسے واقعہ پر تبصرہ یا چوٹ کی جائے مثلاً گاؤں کی کسی لڑکی کا فرار، تو قدرتی طور پر جذبات فی الفور برانگیختہ ہو جاتے ہیں۔ ایسی چوٹوں یا چمیگوئیوں [?] کو حذف کر دینا ہی مناسب ہے۔ کیونکہ گاؤں کا سماج اپنی لاج کی بڑی شدت سے حفاظت کرتا ہے۔ اور اس پر کسی حملہ کو برداشت نہیں کرتا۔

جب کھیل مکمل ہو جاتا ہے تو ایک طرح کا یہ ریہرسل ہوتا ہے۔

پھر کھیل دکھانے کی تاریخ مقرر ہو جاتی ہے۔ بزرگ آدمی ایسے کھیلوں پر بہت ناک بھوں چڑھاتے ہیں۔ لیکن نوجوان اور زندہ دل لوگ ان پر جان دیتے ہیں اور ساری ساری رات انٹ شنٹ اسٹیج بنانے ہی میں گذار دیتے ہیں اور ایسا ہونا لازمی بھی ہے کیونکہ جاترا بڑی آہستہ آہستہ تیار ہونے والی چیز ہے جس پر بےحد وقت صرف ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کا اہتمام بھی تو یونہی سرسری سا ہوتا ہے۔ تماشائی گھنٹوں گپیں ہانکتے اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اسٹیج کی طرف دیکھتے رہتے ہیں۔ پھر کہیں جا کر کھیل شروع ہوتا ہے۔ کھیل شروع ہوتے ہی سناٹا چھا جاتا ہے۔ کوئی اداکار یا اداکارہ سامنے آتی ہے (اداکارہ ہمیشہ مرد ہی ہوتا ہے جو عورت کا پارٹ ادا کرتا ہے)۔ ابتدائی گیت گایا جاتا ہے اور کوئی پارٹ ادا ہوتا ہے۔ پھر یہ اداکار یا اداکارہ پرے ہٹ جاتی ہے یا دوسرے اداکاروں کا انتظار ہوتا ہے تاکہ وہ اسکے ساتھ آکر شامل ہو جائیں۔

کھیل میں یہ پروا نہیں کی جاتی کہ جو کچھ ہو اصلیت کے مطابق ہو۔ بعض اداکار اثر بڑھانے کے لئے خول بھی پہن لیتے ہیں۔ زبان خواہ نظم ہو یا نثر بڑی اونچی آواز میں ادا کی جاتی ہے تاکہ اس سے ہنگامہ پیدا ہو۔ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ ایسی بناوٹی زبان برتنے کی دانستہ کوشش کی جاتی ہے۔ اسی طرح الفاظ اور حرکات و سکنات سے بھی جان بوجھ کر اثر پیدا کیا جاتا ہے۔ تماشائی تھوڑی دیر کے لئے ایک غیر حقیقی شاعرانہ فضا ہی میں کھو جانا چاہتے ہیں۔ جہاں بڑے بڑے عظیم الشان واقعات رونما ہوتے ہیں۔ ایسے واقعات جو عام زندگی کی روکھی پھیکی وضع سے بہت دور ہوں۔

کھیل کے دوران سنجیدہ یا جذباتی موقعوں پر گیت بھی گائے جاتے ہیں۔ گانا عموماً سنگت ہی میں ہوتا ہے جس میں اداکار بھی حصہ لے سکتے ہیں۔ اگر کوئی گاؤں یا وہ شخص جس نے کھیل کا بندوبست کیا ہے۔ ناچ وغیرہ کا شوقین ہو تو کھیل میں یہ عنصر بھی شامل کر لیا جاتا ہے۔

کھیل عموماً رات کے دو تین بجے ختم ہوتا ہے۔ تماشائی خوشی خوشی گھر واپس آتے ہیں کہ انہوں نے اپنی زندگی کے کچھ لمحے ہنسی خوشی میں گذار دئے۔

اسلامی دور سے پہلے بنگال کے بیشتر جاترا ہندو اتہاسوں یعنی رامائن اور مہابھارت کے بہادروں سے وابستہ تھے۔ جب سے

مسلمان یہاں آئے ہیں اسلامی موضوعات پر بھی مقبول عام ناٹکوں کا اچھا خاصا ذخیرہ فراہم ہوگیا ہے۔ ان میں سے ایک نہایت ہی مقبول ناٹک کسی ولی نظام الدین سے متعلق ہے۔ اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ کس طرح گناہ میں مستغرق رہنے کے بعد انہوں نے توبہ کی اور ساری عمر عبادت الٰہی میں گذار دی۔ ایک اور ایسے ہی مقبول ناٹک میں دو بھائیوں کالو اور رفاذی کا ذکر ہے جو بعد میں اولیا بن گئے۔ حال میں گیتوں کا ایک "پال" بہت دلچسپی کا باعث ہوا جس میں ایک مسلمان لڑکی "گن بنی" کی دردناک داستان پیش کی گئی ہے۔ اور یہ بتایا گیا ہے کہ کس طرح اس کے چچا نے اس کی جائیداد چھین لی۔

ان ناٹکوں میں جو دلکشی پائی جاتی ہے اس کی طرف ادبی حلقوں نے بھی توجہ دی ہے۔ اور کوشش کی ہے کہ کبھی کبھار ان کے انداز میں کوئی ادبی ڈرامہ تیار کیا جائے چنانچہ انیسویں صدی کے شروع میں کچھ عرصہ جاترا ناٹکوں کو کلکتہ میں کافی فروغ حاصل ہوا۔ اب مشرقی پاکستان کے شہری علاقوں میں بھی اس صنف کے ڈرامائی امکانات نے اہل نظر کی توجہ اپنی طرف منعطف کی ہے۔

(ترجمہ: شجاع احمد زیبا)





فکاہیہ

"دوستی ناداں کی ہے......"

اشرف صبوحی

نتھو بہشتی کہنے کو سقہ تھا اور اصل نسل سے سقہ مگر نہایت خوش چلن بڑا میاں آدمی۔ شہر میں جب نل جاری ہوئے، گلی گلی محلے محلے جن کے پانی کی سوتیں جاری ہو گئیں تو سقوں کی روزی میں فرق آیا اور ان غریبوں نے مشکیں چھوڑ دوسرے روزگار تلاش کئے۔ کوئی کنجڑا بن گیا کسی نے نوکری اٹھائی کسی نے نوکری کر لی۔ نتھو کچھ روز تک ادھر اُدھر مارا مارا پھرتا رہا۔ گزر کا کوئی ڈھنگ نہ نکلا۔ پڑوس میں شبو رنگریز کا مکان تھا۔ شبو کی اپنی تو وہی رنگائی کی دکان تھی لیکن بچے چاروں بیٹے لکھ پڑھ کر بابو بن گئے تھے۔ کوئی کسی دفتر میں کوئی کمپنی میں۔ چنانچہ منجھلا کچہری میں اہلمد تھا۔

میاں نتھو اور شبو ساتھ کے کھیلے ہوئے بچپن کے یار تھے۔ شبو نے نتھو کو جو پریشان دیکھا تو ایک دن کہا یار تم تو ہمت ہی ہار بیٹھے۔ آخر تمہاری برادری کے اور لوگ بھی تو ہیں۔ نل لگ گئے تو کیا ہوا۔ بیسیوں گھروں میں اب بھی سقے ہی پانی بھر رہے ہیں۔ نتھو بولا "ہاں بھر رہے ہیں" پر وہ عزت کہاں۔ پہلے ہمیں بڑے بڑے "میاں بھشتا" کہتے تھے اور اب ذرا ذرا سے لڑکے 'ابے سقے!' "ابے پنجابی" کہہ کر پکارتے ہیں۔"

"تو پھر پان چھالیہ کی دوکان ہی کر بیٹھو۔"

"اتنی عمر جو دھراہٹ کی۔ دوکانداری میں محلے بھر کی جوروین کرنا نہیں جانے گا۔"

"اچھا نوکری تو کرو گے؟"

"ایرے غیرے کی ٹہل تو مجھ سے ہوگی نہیں۔ ہاں کسی دفتر میں مل جائے تو کیا ڈر ہے۔"

"کہو تو جمن سے ذکر کروں۔ وہ صاحب کا بہت منہ چڑھا ہے۔ شاید خدا کر دے اور وہ چپراسیوں میں کہیں لگوا دے۔"

رات کو شبو نے اپنے بیٹے جمال خاں عرف جمن سے کہا اور آٹھویں روز نتھو گلے میں چپراس ڈالے عدالت خفیفہ کے دروازے پر "نتھو لعل جیا رام حاضر ہے" آواز لگا رہے تھے۔ اب کیا تھا، سارے دلدر دور ہو گئے۔ دو چار ہی مہینے سارے گھر پر رونق آگئی۔ بیٹا تو کوئی تھا نہیں۔ چار بیٹیوں میں ایک نواسہ تھا۔ پہلے کا طور طریق ہوتا تو شاید اس کی محبت کچھ رنگ لاتی لیکن اب بڑے ٹھکوں میں اٹھنا بیٹھنا تھا، اسے مدرسے میں داخل کر دیا۔ زمانے کی یہی عادت ہے کہ بنے ہوئے بگڑتے ہیں اور بگڑے ہوئے بنتے ہیں۔ پلک جھپکتے دس برس گزر گئے اور نتھو بہشتی کے نواسے نے میٹرک پاس کر لیا۔ نتھو کی رسائی اور میاں کمو کی پیر دوڑی نے کمال خاں بنا کر کرسی پر بٹھا دیا۔ بیٹھتے ہی چالیس روپے کی نوکری مل گئی۔

کچہری کا چپراسی اور پھر جس کا نواسہ سل خواں ہو اس کا پوچھنا ہی کیا۔ صورت بدلی، حالت بدلی۔ اور تھوڑے دن میں ذات بھی بدل گئی۔ روپے کے زور میں چاہا کہ کسی اچھے گھرانے میں کمو کی ناخن بندی کر کے کھرے کھرے نجیب اور شریف بھی بن جائیں۔ اور یہ کوئی نئی بات بھی نہ تھی۔ غدر کے بعد شہر والوں کی شرافت کا معیار ہی دولت ہو گیا تھا۔ ہڈیوں کے پرکھنے والے رہے نہیں۔ چنانچہ نتھو کی یہ آرزو پوری ہو گئی۔ شیخ بہاؤ الدین نقشبندیؒ کے مشہور خاندان میں کمو کی شادی بڑی دھوم سے ہوئی۔ پیرزادوں کا خاندان تھا اور ٹوٹا ہوا۔ شرافت تھی گھسی ہوئی۔ چلن تھے بگڑے ہوئے۔ عورتیں پھوڑ، بدسلیقہ ساتھ ہی مشیخت پر نازاں۔ اس لئے میاں کمو کچھ خوش نہ تھے۔ سیرت نہ ہو تو صورت کو لے کے کیا چاٹئے۔

میاں کمو اب کمال خاں تھے۔ انہیں دنیا میں ترقی کرنی تھی اور آجکل ترقی بیوی کی اندرونی یا بیرونی امداد کے بغیر بہت دشوار ہے۔ گو گھونگھٹ اٹھنے تک تو وہ دلہن کی حقیقت کو ایک معمہ سمجھتے رہے۔ ادھر خاطر داریاں اور ادھر شرم، کچھ نہیں کھل سکا کہ عورت کے لباس میں گھر کی برکت ہے یا ڈرگت لیکن

چند روز کے بعد اور خاص کر جب دوسرے ہی سال انفلوئنزا کی بیماری میں بڑے بوڑھوں سے گھر خالی ہو گیا تو دلہن کے جوہر کھلنے لگے۔ بات بات پہ جھگڑے، کھانے پینے میں بے لطفی۔ بالو بی کا ناک میں دم آ گیا۔ وہ تو خیر یہی کہ باوجود بدسلیقہ اور غیر منتظم ہونے کے مسز کمال انتہا درجہ کی اطاعت شعار، جنس مکھ اور خاوند کا منہ دیکھ کر جینے والی تھی۔ علاوہ ازیں اس کا پیرا کچھ ایسا بھاگوان ہوا تھا کہ میاں کمو کا طوطی بولنے لگا۔ شادی کے آٹھویں دن ہیڈ کلرک ہو گئے اور ابھی ایک سال نہیں گزرا تھا کہ منصفی میں نام منظور ہو گیا۔ کیا داؤں ہوا، کیا واقعات تھے، اس سے بحث نہیں، بہر حال ادھر پہلوٹھی کا بچہ ہوا اور ادھر میاں کمو نے جس عدالت میں مسل خوانی شروع کی تھی وہیں منصف بن کر کرسی پر جا بیٹھے۔

ان حالات میں آپ ہی فرمائیے کہ میاں کمو دلہن بی کی نااہلیت کے زہر کو شہد کی طرح کیوں نہ پیتے۔ تاہم یہ خیال انہیں ضرور تھا کہ اب میں بڑا آدمی ہو گیا ہوں۔ بڑے لوگوں سے میل جول ہو گا۔ اگر تحصیلدار صاحب یا کسی دوسرے جج کی بیوی بہن بیٹی ہمارے ہاں آئی اور اس نے بیگم صاحبہ سے ملنا چاہا یا اپنے ہاں بلایا تو کیا ہو گا۔ وہ لوگ اپ ٹو ڈیٹ اور یہ دقیانوس کے وقت کی سڑبلی عورت۔ جس کے نہ ہاتھ پاؤں قابو میں نہ زبان۔ ہنسنے، بکری کی طرح جان چبانے اور نوکروں پر جھنجھلانے کے سوا کسی کام میں بھد رک نہیں۔ چنانچہ اس جذبے کے ماتحت میاں کمو نے ان کی تعلیم و تربیت شروع کی۔ کچہری سے آکر سارا وقت ان کے ساتھ مغز پچی کرتے، امور خانہ داری کے متعلق اچھی اچھی کتابیں منگا کر پڑھائیں، معاشرت کے قانون بتلائے، ساڑھی باندھنا، بال بنانا، پوڈر ملنا سکھایا۔

اسی اثنا میں اتفاق کی بات کہ ان کا ایک ہم جماعت تحصیلدار ہو کر آیا۔ ڈپٹی کمشنر کی کوٹھی پر دونوں کی ملاقات ہوئی۔ مدت کے بچھڑے ہوئے ملے تھے۔ تعلقات کو مضبوط کرنے کے خیال سے تحصیلدار صاحب نے خواہش ظاہر کی کہ اگر آپ کو کوئی اعتراض نہ ہو تو کل اتوار کو میں اپنے گھر کے لوگوں سمیت دولت خانے پر حاضر ہوں۔ میری بیوی یہاں بالکل اجنبی ہیں۔ ان کی بڑی آرزو ہے کہ کسی شریف گھرانے سے راہ و رسم ہو سکا۔ کمال خاں کو یہ کہنے کے سوا چارہ کیا تھا کہ "بسر و چشم! میں اور میری بیوی آپ کی اس کرم فرمائی کے بے حد ممنون ہوں گے۔"

بات طے ہو گئی مگر منصف صاحب سوچ میں پڑ گئے۔ صاحب کی ملاقات دوپہر ہو گئی۔ چاہتے تھے کہ کسی طرح جلد گھر پہنچیں اور بیگم صاحبہ کو کل کے لئے سبق پڑھائیں۔

جلدی جلدی گھر پہنچے اور صحن میں قدم رکھتے ہی "اے بی کہاں ہو؟ ادھر تو آؤ۔" کوٹھڑی میں سے آواز آئی: "یہاں ہوں، ننھے کو سلا کر آتی ہوں۔"

"ہائیں! کوٹھڑی میں سلانے کے کیا معنی؟"

"تمہارے لالو نے ستا مارا ہے۔ جہاں میں بچے کو لے کر باہر بیٹھی اور یہ آیا۔"

"بی تم بھی تماشے کی ہو۔ باندھ دیا کرو۔ کتے کا کھلا ہوا پھرنا ویسے بھی اچھا نہیں۔"

"کل تم کہو گے کہ گھر کی ماماؤں کو بھی باندھ دو۔ کوئی زردہ مانگنے آ جاتی تو کوئی اپنا دکھڑا رونے بیٹھ جاتی ہے۔"

"خیر یہ تو ہو رہے گا۔ اب تم جلدی باہر آؤ۔ نہایت ضروری باتیں کرنی ہیں۔"

بچہ ابھی سویا نہ تھا، اسے کندھے سے لگائے لگائے دلہن بیگم باہر آئیں: "مجھے تم نے صدا کا بیوقوف سمجھ رکھا ہے۔ آج کیا جاتی دنیا دیکھی کہ مجھ سے صلاح کرنے آئے ہو؟"

"بات یہ ہے کہ کل تحصیلدار صاحب اور ان کی بیوی ہمارے ہاں مہمان آئیں گے۔ باہر کا تو خیر میں انتظام کر لوں گا مگر اندر کا فکر ہے۔"

"فکر کا ہے کا۔ تم نے مجھے سمجھا کیا ہے؟ اور یہ کیا کہا کہ باہر کا میں انتظام کر لوں گا؟"

منصف صاحب سمجھے کہ شاید اتنے دنوں کی تربیت سے دلہن میں سلیقہ پیدا ہو گیا ہے۔ کیونکہ دو چار مہینے سے وہ دیکھ رہے تھے کہ گھر کی ہر چیز میں سگھڑاپا نظر آتا ہے اور یہ بھول گئے تھے کہ جس دو پہلے مہینے کی جو مغلانی رکھی ہے یہ سارا ظہورا اس کا ہے۔ بولے "تو کیا تم سب بندوبست کر لوگی؟"

"تم نے مجھ سے کبھی کام بھی لیا۔ تم نے تو ہمیشہ مجھے پیر کی جوتی سمجھا۔ کچھ کہتے اور وہ نہ ہوتا تو بات بھی تھی۔"

"بیگم تم تو لڑنے لگتی ہو۔ تم اگر بیگموں کی طرح گھر کو سنبھالو تو مجھے اور چاہئے کیا؟"

"بیگم! تو گویا اب میں لونڈیوں کی طرح گھر کر رہی ہوں۔ واہ صاحب واہ! خوب قدر دانی کی!!"

"اچھا تو بی پھر جھگڑا کیا ہے؟ میں نے تو ایک بات کہی تھی۔"

"کیوں کہی؟ سر کا وارث ہی جب ہمیں پھوڑ کہے تو اور رہا ہی کیا؟"

"یونہی منہ سے نکل گیا، خطا ہوئی قصور ہوا، دوسرے یہ بھی خیال تھا کہ تم اکیلی دو دو جگہ کا دھیان کیوں کر رکھ سکو گی۔"

"بڑی بڑائیں ٹانتی ہیں ناکہ مجھ بندی پر مصیبت آجائے گی۔ چار مہمان ہوں گے، ان کی دیکھ بھال کیا۔"

"بس تو میں اطمینان رکھوں۔ باہر کا انتظام بھی تمہارے ذمہ ہے۔"

"میں کہتی ہوں تمہیں میرے چڑانے سے کوئی تمغہ مل جائے گا، ایک دفعہ کہہ دیا کہ ہاں ہاں تم خاطر جمع رکھو۔ کہو تو اسٹامپ لکھ دوں۔"

"صبح کو غالباً وہ اوّل وقت آئیں گے۔ پہلے چائے پانی ہوگی۔ آج ہی سے سب سامان ٹھیک ٹھاک کر لو۔"

"جی چاہتا ہے سر پھوڑ لوں۔ مجھے بدنام کرنا ہے تو ویسے کہہ دو۔ خدا کے لئے اب تم جاؤ۔"

منصف صاحب مسکراتے ہوئے جانے لگے کہ بیگم صاحبہ بولیں "سنو تو، تحصیلدار صاحب تمہارے دفتر کے کمرے میں بیٹھیں گے نا؟"

"اور کیا، وہی ایک کمرہ بیٹھنے کے قابل ہے۔"

"تو پھر اس کی صفائی ستھرائی نوکروں کے ہاتھوں میں نہ دینا، میں خود اپنے ہاتھ سے ٹھیک ٹھاک کر دوں گی۔"

"نہیں، تمہیں اتنی تکلیف کی ضرورت نہیں، وہ تقریباً درست ہے۔"

"اگر کوئی کسر رہ گئی تو ناک میری کٹے گی یا تمہاری؟ سب یہی کہیں گے کہ گھر والی بے سلیقہ ہے۔"

"خیر بی تمہاری مرضی" کہتے ہوئے منصف صاحب تو تشریف لے گئے اور بیگم صاحب نے انتظام شروع کیا۔

"امانی! امانی! کیا کان پھوٹ گئے؟ باورچی خانہ کیا ہے شہر خموشاں ہے۔ میں کہتی ہوں روٹی چھوڑ دے پہلے ادھر آ۔ تجبن کو دیکھو، کیسی ڈھیٹ بنی ہوئی پوتڑے دھوتی جاتی ہے، مجھے کتیا سمجھ لیا ہے۔ کب سے بھونک رہی ہوں اور مردار سنتی نہیں۔ یہ مچھیا کہاں غارت ہوئی اور رکھو کہ مرغا سب ہے۔ تو بہ ہے مغلانی دھوبن کو کپڑے دینے کا بھی یہی وقت ہے۔ یہاں تو تحصیلدار صاحب کی بیوی کل آنے والی ہیں اور تم نے میرے ستانے کے لئے ایکا کر لیا ہے۔"

اتنے میں سب ماما ئیں چھوکرے جمع ہو گئے۔ "میرا منہ کیا دیکھ رہے ہو؟ ارے کل تحصیلدار کی بیوی آئیں گی۔ سارا گھر بھاڑ سا پڑا ہے۔ تمہارا کیا بگڑے گا، سب مجھے نام دھریں گے۔" مغلانی بولیں "بیگم آپ اتنی پریشان کیوں ہوتی ہیں؟ مکان تو ماشاءاللہ سجا سجایا ہے۔ صبح کو قالین اور بچھا لیں گے۔" دلہن بیگم کو یہ تاب کہاں تھی کہ کوئی ان کی حرکات کو بے معنی بتاتا یا ان کے خیال کی تردید کرتا، بگڑ گئیں اور کہنے لگیں "لو، مینڈکی کو بھی زکام ہوا۔ تم ٹکے ٹکے کی نوکری کرنے والی مہمانوں کی قدر کیا جانو؟ میں جو کبھی کسی کام میں عیب نہیں نکالتی تو اپنے تئیں سلیقے والی سمجھنے لگیں۔ اب دیکھنا سلیقہ کسے کہتے ہیں۔ آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جائیں گی۔"

"ہاں امانی! شاباش، نکال توڑالو سارا سامان۔ تجبن! دیکھوں تو کیسی پھرتی دکھاتی ہے۔ جیا بوا! تو ہمت کر کے رحیمن سے چاروں مسہریاں باہر پکڑوا لے۔ دیکھنا اندر باہر کا سب فرش بدلا جائے گا۔"

گھر میں سامان کی انتہا نہ تھی۔ بڑی بڑی مسہریاں، قدِ آدم آئینے، کوچیں، میزیں، اٹرم سٹرم ہزاروں چیزیں تھیں۔ اٹھاتے اٹھاتے آندھ آ گئی۔ جاڑے کے چھوٹے دن، شام ہو چلی۔ صحن کباڑخانہ بن گیا اور نئے سرے سے سامان کو آراستہ کرنا تو کجا پورا اکھڑ کھنگر ابھی نکلا بھی نہ تھا۔ بیگم صاحبہ کو گھبراہٹ، کبھی کمرے میں کبھی دالان میں تو کبھی انگنائی میں۔ "ارے کمبختو! ہاتھ کیوں نہیں چلتے۔ پیروں میں بیڑیاں پڑ گئیں؟ رات ہونے کو آئی۔ ہے ہے مردار نے الماری کا شیشہ توڑ دیا! ہا بدنصیب! یہ میز کو کیا ہو گیا؟ لاؤ میں ہاتھ لگا دوں، جوانا مرگ کھڑا دیکھ رہا ہے۔ میرا پاؤں کچل دیا۔ اے ہے میرے دوپٹے کے بیرے لگ گئے! یہ مغلانی تو دیکھنے کی ہیں، آتا نہ آتا کہ کونچ سے میرا لیا ہی نکال دیتیں!"

اتنے میں منصف صاحب آ گئے۔ دیکھتے کیا ہیں کہ مکان میں نیلام گھر کا سا سماں ہے اور دلہن بیگم ہانپ ہانپ کر رنگ برنگ کی بولیاں بول رہی ہیں۔ ششدر کہ یہ کیا تماشہ ہے۔ اس صورت میں تو آج روٹی نصیب ہوتی نظر نہیں آتی۔ نہ رات کو سونے کا ٹھکانا ہے۔ آخر صبر نہ آیا۔ بولے "بیگم یہ تم نے کیا کیا؟ ایسا ہی تھا تو صدر دالان کو اپنے مذاق کے مطابق درست کر لیا ہوتا۔"

"اور جو وہ باہر کے دالان میں نہ بیٹھتیں اندر کے دالان میں بیٹھتیں یا کمرے میں بیٹھنا چاہیں پھر کیا ہوگا؟ میں تمہاری طرح بیوقوف تھوڑی ہوں۔"

"مگر یہ سامان اب اپنی اپنی جگہ کس طرح لگے گا؟"

"دیکھتے رہو۔ جب تک ساری درستی نہ ہو جائے گی سونا حرام ہے۔"

"بیگم! ہماری سمجھ میں تو تمہاری یہ کارستانی آتی نہیں۔ اللہ ہی ہے جو صبح تک ایک دالان بھی مہمانداری کے قابل ہو۔"

"تمہاری سمجھ میں تو آج تک میں ہی نہیں آئی۔ میرا کوئی کام کیا سمجھ میں آئیگا۔ سدا بُرا ہی کہتے رہے۔ کوئی اور ہوتی تو مزہ آجاتا۔"

"یہ میں کب کہتا ہوں کہ تم کچھ کرتی نہیں لیکن تمہارے کاموں میں ڈھنگ نہیں۔ اسی لئے مغلانی رکھی ہے۔ گھر کی درستی کا کام اس سے تم نے کیوں نہ لیا؟"

"خوب! وہ چار ٹکے کی عورت کیا جانے، کیسے مہمانوں کے لئے بیٹھنے اُٹھنے کی جگہ کھانے پینے کا سامان کیسا ہوتا ہے۔"

"اچھا بی۔ تم تو ہر وقت بحث پر تیار رہتی ہو۔ لیکن اب تم باہر کا خیال نہ کرنا۔ وہاں کی دیکھ بھال میں کر لوں گا۔"

"یہ کیوں؟ اب رہا ہی کیا ہے؟ بس یہ سامان لگوایا اور باہر آئی۔ دیکھو، خبردار، جو تم نے کسی نوکر کو ہاتھ لگانے دیا۔ آج اپنی بیوی کا بھی تو سلیقہ دیکھ لو۔"

منصف صاحب عجب کشمکش و پیچ میں پڑ گئے۔ صبح کو تحصیلدار اور تحصیلدارنی آنے والی تھیں۔ ڈر تھا کہ اگر زیادہ حجت کرتے ہیں تو ضد ہی بیوی کچھ اور رنگ نہ لائے۔ منہ بنا کر چپ ہو گئے اور بات ٹالنے کے طور پر کہنے لگے: "آج خلاف معمول بھوک معلوم ہوتی ہے۔ کھانا تیار ہو تو آؤ پہلے کھا لیں۔"

"اے لو میں تو سامان کی دیکھ بھال میں رہی کھانا کس نے پکوایا ہوگا؟ اماں تمہارا نوکری کرنے کو جی نہیں چاہتا ہے تو نہ کرو۔ ایک ذرا سا نیا کام نکل آیا کہ ہنڈیا ڈوئی کو ہی استعفا دے دیا۔ میاں کھانا مانگ رہے ہیں، اب کیا تمہاری بوٹیاں کاٹ کر دوں؟ غضب خدا کا جس کے ہاں چار چار مسٹنڈیاں نوکر ہوں وہ جب تک خود چولھے میں نہ جھونکے روٹی میسر نہ آئے۔ ارے یہ باورچیخانے میں کون ہے؟ کس کے پیٹ میں آگ لگی؟ مغلانی بی اب بغیر میرے پوچھے جو جی چاہتا ہے کرنے لگتی ہیں۔ گھر کی بیگم ہی کیوں نہیں بن جاتیں؟"

منصف صاحب نے کہا "بی پھر حرج کیا ہوا؟ آخر وہ نوکر کس بات کی ہے؟ اس نے دیکھا بیگم صاحبہ ادھر مصروف ہیں، پکانے والی کو خدا جانے کب فرصت ملے، آخر بیچاری خود چولھا جھونکنے بیٹھ گئی۔"

"مجھ کو نوکروں کی ایسی طرفداری اچھی نہیں لگتی۔ وہ ہوتی کون تھی بنا میری اجازت کے کچھ کرنے والی؟"

"بیگم! یہ تو کوئی خفا ہونے کی بات ہے نہیں۔ ایسی ہٹ دھرمی بھی کس کام کی؟ اگر وہ کھانا نہ پکاتی تو انصاف سے کہو رات کو کیا کھایا جاتا؟"

"اچھن میاں، ذرا دیکھنا تو مغلانی کیا پکا رہی ہے؟"

"انڈے تلے ہیں اور پراٹھے پکا رہی ہیں۔"

"بس، ماں مفت دلِ بے رحم۔ ڈلیا بھری ہوئی انڈوں کی اور آدھا کنستر گھی کا آپ کی سگھڑ نے ختم کر دیا ہوگا۔"

"پھر کیا ہوا؟ آج گھر والوں کی دعوت سہی۔ خوب پراٹھے اور انڈے اڑاؤ۔"

"کھاؤ گے تو مزہ آئے گا۔ ہمارے ہاں کی اصل مغلانیوں کو دیکھتے تو آنکھیں کھلتیں۔ اس غریب کو تو نہ سینا آتا ہے نہ ٹانکنا۔ ایک ایک ٹانکے پر ٹوکتی رہتی ہوں۔ پکانا ریندھنا وہ کیا جانے۔ جیسے نمک مرچ کی ڈاکل نہ ہو پراٹھے پکائے گی۔ انڈے تلے گی۔"

بیگم صاحبہ اپنی شیخی بگھارتی رہیں اور منصف صاحب نے حکم دیا اور تو کہیں بیٹھنے کو جگہ نہیں، باورچیخانے ہی میں میز لگا دی جائے۔ چنانچہ وہیں کھانا کھایا۔ جب تک کھانا ختم نہیں ہوا، مغلانی پر آفت تھی، پراٹھوں میں نقص نکالے، انڈوں کے تلنے کی ترکیب غلط بتائی۔ اور کہا "تم نے تو میرے ہاتھ کے کھانے کئی دفعہ کھائے ہیں۔ بھول گئے؟ آج تک زبان چٹخارے لیتی ہو گی مگر تم تو جلانے والے ٹھہرے۔ منہ سے کب کہو گے کل پھر کھا لینا۔ اللہ چاہے تو ایسی چیزیں کھلاؤں کہ عمر بھر یاد کرو۔ تحصیلدار کی تو سات پشتوں میں بھی وہ کھانے نہ کھائے ہوں گے جن کا نام کھانا ہے۔" کھانا کھا کر چلنے لگے تو فرمایا "اب تم چھوٹے کمرے میں بیٹھنا، میں دو ایک پان کھا لوں تو آتی ہوں۔"

"اور کیا یہ گھر کی چیزیں یونہی تتر بتر رہیں گی؟ باہر آنے کی آپ تکلیف نہ کریں۔ وہاں کی میں بھگت لوں گا۔ آپ تو اس کاٹ کباڑ کو ٹھکانے سے لگانے کی کوشش کیجئے۔"

"میرا تو کتے کا مغز نہیں ہے کہ تمہارے ساتھ بھونکے جاؤں۔ ایک دفعہ کہہ دیا، لاکھ دفعہ کہہ دیا اس معاملہ میں تم دخل نہ دو۔"

تھوڑی دیر تک بیگم صاحبہ نے اوپر تلے کئی پان کھا کے خوب پیکیں تھوکیں۔ اتنے میں نوکریں چاکریں بھی کھانے دانے سے نچنت ہو گئیں۔ چھوکرے سے کہا "جا میاں سے کہہ دے بیگم صاحبہ آ رہی ہیں۔ آپ چھوٹے کمرے میں تشریف لے جائیں۔" ساتھ ہی ماماؤں کو حکم دیا "لو! دیکھو، شاباش۔ اب تو تن تازہ ہو گیا ہے۔ ذرا پھرتی سے سب چیزوں کو سنگوا لو۔ کہنے کو میاں منصف ہیں لیکن نوکر سارے بدتمیز۔ میرے آنے تک ان چیزوں کو جھاڑ پونچھ تو ڈالو۔ پھر میں چٹکی بجاتے سب کا ٹھکانہ کر دوں گی۔" مردانے کے دونوں کمرے بیگم صاحبہ کے

دیکھے ہوئے تھے مگر جب سے میاں کو منصفی ملی تھی انہیں اس میں جانے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ اب جو چلمن اٹھا کر اندر قدم رکھا تو طاقوں پہ کتابیں، الماریوں میں کاغذوں کے مٹھے ہی مٹھے نظر آئے۔ میز پر نگاہ پڑی تو کونے کونے کاغذوں کا ڈھیر۔ ایک بڑے گھنٹے اور دو چار انگریزی تصویروں کے علاوہ آرائش سے بالکل خالی، میز اور کرسیوں کے نیچے چھوٹے چھوٹے قالین بچھے ہوئے " تو صاحب اس کمرہ کو کہتے تھے کہ ٹھیک ہے۔ اور ان مردوں کی مَتیں ہی اوندھی ہیں۔ یہ دروازے پر پردہ کیوں ڈال رکھا ہے؟ کیا یہاں عورتیں بیٹھتی ہیں؟ واہ واہ! پاٹ بھی دونوں الگ۔ جوڑنا بھی نصیب نہیں ہوا۔ خدا کے دیئے اگالدان، سلفچیاں سب ہی گھر میں موجود ہیں۔ پھر یہ نگوڑی ٹوکریاں کیسی رکھی ہیں؟ ان میں کوئی کیوں کر پیک تھوکتا ہوگا؟ گلاس پیالے اچھے سے اچھے آجاتے۔ پانی پینے کو میسر بھی آیا ہے تو کیسا بدصورت برتن جو نہ گلاس معلوم ہوتا ہے نہ پیالہ۔ اور موئی یہ طرح طرح کرسی ہے۔ اس پہ وہ بیٹھتے کیوں کر ہوں گے؟ کیا کریں، انہیں تو یہی ناچتی ہوئی کرسی میراث میں ملی ہے۔ آج میں نے اس کو آگ نہ لگائی ہو تو بات کیا! ردّی چیز پھینکنے کی تو عادت ہی نہیں کوڑے کو سینتے چلے جاتے ہیں۔ لکھ لکھ کر کاغذوں کا ڈھیر لگا دیا ہے، نہ کارے نہ سکے۔ کوئی پوچھے کہ یہ مکانوں کے قبالے ہیں یا نوٹ۔ مجھے تو دیکھ کر ہی خفقان ہوتا ہے۔ خیر اب میں یہاں آئی ہوں تو اس کوڑے کرکٹ کو بھی ہٹا نا ہی پڑے گا۔"

بیگم صاحبہ نے اب کمرے کی ایک ایک چیز کا جائزہ لینا شروع کیا۔ دروازے کا پردہ نوچا اور ایسے پھوڑ پنے سے اس کو کھینچا کہ بریکٹ سمیت نیچے آرہا۔ قالین اٹھائے کہ "موئے کیسے ٹیڑھے ترچھے بچھے ہوئے ہیں۔" ردّی کاغذوں کی ٹوکریاں اور چاروں طرف پھرتی ہوئی کرسی برآمدے میں پٹخیں۔ کوڑے کاغذ چھوڑ کر جتنی میز پہ مسلیں وغیرہ تھیں سب اٹھا کر باہر ڈال دیں۔ الماری میں سے پرانی پرانی نقلیں کئی اہم دستاویزیں اور بہت سی قانونی تحریریں چھانٹ چھانٹ کر نکالیں۔ ایک جگہ اکٹھا کر کے آگ لگا دیں تاکہ اس کوڑے سے ہمیشہ کے لئے نجات مل جائے۔ لیکن اتفاق سے دیا سلائی کا بکس نہیں ملا۔ دوسرے سارے دن کی تھکی ہوئی، رات کا ایک بجنے کو آیا۔ جماہیاں اور انگڑائیاں برابر آرہی تھیں۔ ذرا کمر سیدھی کرنے کو آرام کرسی پر لیٹ گئیں۔ ٹھنڈ جو معلوم ہوئی، پردہ اوڑھ لیا

گرمائی پہنچنے کی دیر تھی کہ نیند آگئی اور خدا نے بڑی خیر کی ورنہ بیگم صاحبہ کی حماقت کے ساتھ منصف صاحب کی قسمت کا افسانہ بھی ختم ہو جاتا۔ غنیمت ہوا کہ تکی دیے بی مغلانی کو بیگم صاحبہ کے مردانے میں آتے ہی وہ کمر باندھ کر کھڑی ہوگئی اور دو گھنٹے میں مکان کو فرش فروش سے آراستہ کر دیا۔ صبح کو منصف صاحب نے جو کمرے کو دیکھا تو سر پکڑ لیا۔ جلدی جلدی مسلیں اور سرکاری کاغذات سمیٹ کر میز پر رکھے۔ نوکروں سے تاکید کی کہ میں اندر جاتا ہوں۔ واپس آکر ہر چیز اپنے قرینے پر دیکھوں۔ گھر میں گئے تو بیوی کو مصلے پر دیکھا، بیٹھی ہوں ہوں کر رہی ہیں لیکن حیرت یہ تھی کہ مکان پوری ترتیب کے ساتھ آراستہ تھا۔ کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ رات بھر میں کیا جادو ہوا۔ بیگم کے قبضے میں کوئی موکل تو نہیں جس نے یہ سارے کام کر دیئے۔ اتنے میں بیگم صاحبہ بھی مناجاتوں سے فارغ ہو کر مسکراتی ہوئی کھڑی ہوئیں اور کہنے لگیں "دیکھئے کیا ہو، ابھی میں نے ناشتے کا سارا سامان کیا۔ وہ تو رات کو ایسی کچھ غنودگی آئی کہ کیا بتاؤں نہیں تو اندھیرے سے سب چیزیں میز پر لگی ہوئی پاتے۔ یہ نگوڑا تم نے میز پر کیا کھانا پینا نکالا ہے۔ میں تو نیچے دسترخوان بچھاؤں گی۔ دسترخوان بھی وہ بچھاؤں کہ تحصیلداری کے فرشتوں نے نہ دیکھا ہو۔"

"نہیں، عورتوں کے لئے میز کی کیا ضرورت ہے؟"

"ضرورت کی تو نہ کہو۔ آج کل کا فیشن ہے۔ چاہے میز کی آرائش کراؤ۔ مگر نہیں میں تو فرش کا سلیقہ دکھانا چاہتی ہوں۔"

"تمہیں اختیار ہے، چاء ذرا اچھی بنانا۔ اور کیا کیا چیزیں ہوں گی؟"

"دو تین قسم کے انڈے، میٹھے ٹکڑے، گاجر کا حلوا، حلوا سوہن اب اور کیا کیا بتاؤں۔ میں جب کرنے بیٹھوں گی تو دسترخوان بھر دوں گی۔"

"گاجر کا حلوا اور حلوا سوہن تو بازار سے منگا لیا ہوگا۔ حلوا سوہن سب طرح کا ہونا چاہئے۔"

"پھر تم نے میرے چڑانے کی باتیں کیں۔ بازار سے کیوں منگاتی! کیا مجھے یہ چیزیں بنانی نہیں آتیں؟"

"بے فائدہ اتنا جھگڑا مول لیتی ہو۔ بازار میں اچھے سے اچھا ملتا ہے۔"

"صدقے کئے تھے موئے بازار کے حلوے گندے آخور۔"

اچھا تو میں باہر جاتا ہوں۔ شاید نو بجے تک مہمان آجائیں۔ اب

تم تیاری کرو۔"

منصف صاحب کا باہر جانا تھا کہ بیگم صاحب نے للکارنا شروع کیا۔ "امانی! اری کہاں مرگئی؟۔ او مجبن! بدذات! چاء کے برتن بھی نکالے۔ چھو ٹو دوڑ کے جا دیکھو، کلن خاں ابھی تک دودھ نہیں لایا۔ اچھا لو! تم میرا منہ تکے جاؤ۔ تمہاری خطا نہیں، میرا نمک ہی ایسا ہے۔ تم لوگ نوکر تھوڑی ہو۔ کام کی نہ کاج کی ڈھائی من اناج کی۔ شاباش ہے تمہارے نگوڑے پن کو! خیر کوئی کام نہ کرو قسم ہے تم کو اب اگر تم نے کسی کام کو ہاتھ لگایا۔ میں خود سارے کام کر لوں گی۔ تم نے مجھے آٹے کی آپا سمجھ لیا ہے۔" یہ کہتی ہوئی بیگم باورچیخانے میں پہنچیں۔ چولھے پہ گرم پانی کی گھڑیا رکھی تھی۔ چھپکے سے جو اتارنے لگیں تو سارا پانی اوندھ گیا۔ آگ بجھ کر رہ گئی۔ "بدذاتوں کی شرارت دیکھی، گھڑیا کو ایسا رکھا کہ ہاتھ لگتے ہی نیچے آرہی۔" چولھے کا پانی سونت کر پھر آگ جلانی چاہی، لکڑیاں بھیگ گئی تھیں، جلتیں کیوں کر۔ دوسری لکڑیاں رکھیں۔ ردی کی ٹوکری توڑ مروڑ کر رکھ دی۔ دیا سلائی کا پورا بکس پھونک دیا۔ آخر خدا خدا کر کے آگ سلگی۔ "اری مردار! گنجینے میں سے ڈبل روٹیاں تو نکال دے۔ موا آنکھوں کا اندھا کیسی بری لایا ہے۔ چھری تو دے۔" بسم اللہ کر کے جو چھری پھیرتی ہیں تو انگلی پہ چرکا بیٹھا۔ دَھل دَھل خون جانے لگا۔ ساری روٹی لال ہوگئی۔ "اُف! مُنتے تو غارت ہی نہ ہو۔ ارے نامراد چھری کے بدلے میاں کا استرا اٹھا لایا۔ ہے ہے! کیسے بے درد لوگ ہیں، اتنا نہیں ہوتا کہ کوئی دھجی ہی بھگو کر باندھ دیں۔ لڑکی شاباش! ایسا بھی خون سفید کیا۔ پان چبا کر تو لا۔" پان چبا کر انگلی پہ باندھا گیا گھاؤ گہرا تھا اور اتفاق سے مسالے کی صافی کو پھاڑ کر باندھا تھا، مرچیں جو لگیں تو بیگم صاحبہ کے رہے سہے حواس بھی جاتے رہے۔ "ارے اب بھی کسی کو ترس آئے گا یا نہیں؟ کم بختو! تمہیں کچھ نہیں آتا بلا سے نہ آئے۔ جیسا میں کہوں ویسا تو کرتی جاؤ۔ میرا ہاتھ تو اپنڈ ہوگیا۔ دیکھو چاء کا پانی کھول گیا۔ خوب کود رہا ہے۔ چاء کا ڈبہ اور چاء دانی میرے پاس لا۔ توبہ! ایسے پاگلوں سے واسطہ پڑے۔ ارے دوسری بھی تو لا۔"

"بیگم صاحبہ چاء کا ڈبہ کہاں ہے؟"

"میری گود میں یا میاں کی جیب میں۔ موئی دیدے پھٹم، چاء کا ڈبہ بھی نہیں ملتا۔"

"بیگم خدا کی قسم! مجھے تو نہیں ملتا۔"

"اگر میں لے آئی تو بتا تیرا کیا علاج؟۔ دیکھو یہ کیا ہے؟ کس نے سگھڑاپا دکھانے کو میری الماری میں رکھ دیا تھا؟"

مغلانی جو بیٹھی بیٹھی دل میں کڑھ رہی تھیں بولیں بیگم صاحب! یہ چاء کا ڈبہ نہیں ہے، اس میں تو لکھنؤ سے آیا ہوا پتی کا تمباکو ہے" بیگم صاحب آئیں تو جائیں کہاں۔ ان کی حماقت کے شیشے کو ٹھیس لگے اور وہ خاموش رہیں۔ بیچاری مغلانی کے لتے لے ڈالے۔ "لو اس بڑھیل کی باتیں دیکھو، مجھے اندھا بناتی ہے، میں تو کچھ جانتی ہی نہیں۔ ننھی چھنو ہوں! میں نے نہ کبھی چاء دیکھی ہے نہ زردہ کھایا ہے۔ میاں کہیں جنگل سے پکڑ لائے ہیں۔ ان کے ابا تو لکھنؤ میں زردہ بنایا کرتے تھے۔ پہچان تو ان کو ہے۔ آئیں کہیں سے مغلانی بن کر۔"

مغلانی غریب کو آج یہ نئی صلواتیں نہیں سنائی گئی تھیں۔ چوتھے پانچویں دن ضرور اس پر زبان صاف ہوتی رہتی تھی مگر وہ بھی کچھ ایسے ٹھنڈے خمیر اور شریف مٹی کی بنی ہوئی تھی کہ خدا کی بندی نے برا مان کر کبھی جواب نہیں دیا۔ بلکہ ان کی ہر بیوقوفی چھپاتی رہتی۔ میاں سے کبھی شکایت نہیں کی، اپنے کام سے کام رکھا۔ غرضیکہ بیگم صاحب نے چنکے بھر بھر کے تمباکو چاء دانیوں میں ڈالا اور چاء پوشیاں چڑھا دیں۔ "لو چاء سے تو فرصت ملی۔ اب لاؤ انڈے دو۔ اچھا پہلے نان پاؤ دودھ میں پکا لوں۔ پھر شیرے میں ڈال کر تلے جائیں گے۔ اماں جان تو اسی ترکیب سے پکاتی تھیں۔ نانی اماں نے دوسری ترکیب سکھائی تھی۔ نگوڑی انگلی کو بھی آج ہی کٹنا تھا۔ ٹیسوں کے مارے جی بے چین ہوا جاتا ہے۔"

یہاں ابھی صرف چاء ہی تھی۔ وہ بھی لکھنؤ کے خوشبودار تمباکو کا جوشاندہ۔ نہ انڈوں کے اقسام تیار ہوئے تھے نہ گاجر کی تری۔ اور حلوا سوہن کا گھان چڑھا تھا کہ نو بج گئے۔ باہر سے اطلاع آئی کہ تحصیلدار صاحب تو آگئے ہیں۔ آدھ گھنٹے کے اندر اندر زنانی سواریاں بھی آجائیں گی۔

"لو صاحب وہ تو جیسے ادھار ہی کھائے بیٹھی تھیں۔ اور مردوں کو دیکھو کچہری کا چپراسی بن کر ان سے بھی پہلے آدھمکے۔ رات سے ہی نہ آگئے۔ کوئی ایسے ویسے ہی معلوم ہوتے ہیں۔ انہوں نے کہا چلو آج سارا ٹبر منصف صاحب کے ہاں تھیا دے۔ ایسی بھی کیا کھانے کی

آپ نے سنا ہوگا کہ منصف صاحب کی بیوی پرانے خاندان کی خوب کھانے کھلانے والی ہیں، بس پھر کیا تھا۔ اندھیرے سے آموجود ہوئے۔ عجب نہیں کہ کل سے بھوکے ہوں۔ تو بجے ہیں! پھر کیا ہوا! لو اگر سورج نکلنے سے پہلے ہی نہ آجائیں۔ ان کو اتنا تو سمجھنا چاہیئے۔ پرائے گھر جانا، جاڑے کے دن ہیں، دعوت کا سامان ہوتے ہی ہوتے ہوگا۔ اب بھلا بتاؤ میں کیا کروں؟ میرے تو ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ مغلانی! ارے بی مغلانی، کہاں ہو؟ کبھی تو کوئی کام کر دیا کرو۔ چاء میں نے تیار کر دی ہے، دودھ ابل رہا ہے، رہ کیا گیا؟ مجھے کپڑے بدلنے دو۔"

یہ کہتی ہوئی بیگم صاحب تو غسلخانے میں گھس گئیں۔ مغلانی نے آکر سارا کام سمیٹا اور بڑے اطمینان کے ساتھ کشتیوں میں ناشتہ لگا خوان پوش ڈھانک رکھ دیا۔ مہمان آئے تو بیگم صاحب ندارد! ایک ماما غسلخانے کے پاس جاکر کہتی ہے "بیگم صاحب مہمان اکیلے بیٹھے ہیں۔" دوسری جاتی ہے "بیگم صاحب مہمان یاد کر رہے ہیں۔" بیگم صاحب ہیں کہ ان کا نہانا ہی ختم نہیں ہو چکتا۔ آخر مغلانی آئیں۔ "بیگم صاحب آنیوالی بیویاں بیٹھے بیٹھے اکتا گئیں۔ وہ تو آپ سے ملنے آئی ہیں۔ ایسا بھی کیا ہے۔ بس نکل آیئے۔" بیگم صاحب جھلا کر بولیں۔ "جدا ہی وہ کہیں بازار میں بیٹھی ہیں۔ آپ تو بن ٹھن کر آگئیں اور منصف صاحب کی بیوی یونہی فقیرنی بنی ہے۔ توبہ بوا! میں ایسے میل جول سے باز آئی۔ کھلی مل چکی ہوں صابن سارے بدن پر تھترا ہوا ہے، آ جاؤں گی۔ کہہ دو ذرا چھپری کے نیچے دالیں۔"

بڑی منت خوشامد کے بعد بیگم صاحب غسلخانے سے نکلیں تو عجب شان سے۔ گلے میں الٹا جمپر، ساڑھی ایک طرف سے نیچی ایک طرف سے اونچی، گردن اور کان میں صابن کے دھبے، جلدی میں آڑی مانگ نکال تو لی لیکن سیدھی جانب وہ بھی لہراتی ہوئی۔ گھبراہٹ میں ذرا تیزی سے قدم اٹھائے تو پاؤں سے ایک سلیپر نکل گیا۔ "بجبن! تیرا ستیاناس ہو! یہ کون سا سلیپر دے دیا؟ اری ولایت سے جو منصف صاحب نے منگایا ہے وہ کیا اپنی کسی ہوتی سوتی کے لئے رکھا ہے؟" مہمان حیران کہ منصف صاحب کی بیوی اور یہ زبان! دو نوجوان بیویاں مسکرائیں بھی لیکن تحصیلدارنی نے اشارے سے منع کیا اور بیگم سے مخاطب ہو کر بولیں "بہن آپ کا پانچہ تو ماشاءاللہ بہت بھاری ہے!"

"ہاں بوا! کیا بتاؤں، ایک انار اور سو بیمار، ایک میں اکیلی اور سارے گھر کا دھندا۔ آپ کو انتظار کی تکلیف تو ضرور ہوئی ہوگی مگر میں کیا کرتی کہ

واسطے اپنا نہانا دھونا چھوڑ دیتی؟ بی مغلانی! توبہ ہے۔ صریحاً دیکھ رہی ہو کہ میرا ہاتھ گلا سب ننگا ہے۔ کبھی تو اپنی نمک حلالی دکھائی ہوتی۔ خدا کا دیا اتنا زیور اور میرے کانوں میں صرف ایک ہیرے کے بندے میرا صندوقچہ تو دوڑ کر لے آؤ۔" تحصیلدار کی بیوی مسکرا کر بولیں "بہن تمہاری تو سادگی میں لاکھ بناؤ ہیں۔ یہ پیاری صورت ایمان کی پوچھو تو یونہی اچھی معلوم ہوتی ہے۔ تمہیں میری جان کی قسم گہنا نہ پہننا۔ کسی نے خوب کہا ہے ؎

نہیں محتاج زیور کا جسے خوبی خدا نے دی
کہ دیکھو خوشنما لگتا ہے کیسا چاند بے گہنے"

"یہی شعر منصف صاحب بھی پڑھا کرتے ہیں اور اسی لئے مجھے بھی گہنے سے کچھ نفرت سی ہو گئی ہے۔ اماں، او اماں! نگوڑی ناشتہ لا۔ ادھر ادھر کیا مکان کے جالے لیتی پھرتی ہے، دستر خوان بچھا، ہاں چاندنی پر سفید جیتمڑا کدھر سے اٹھا لائی! وہ اطلس کا پلنگ پوش کہاں ہے جس پر کرن ٹکی ہوئی ہے، مغلانی سے پوچھ۔"

"بہن ناشتے کی تکلیف نہ کیجئے، ہم تو ناشتہ کرکے آئے ہیں۔ صرف آپ سے نیاز حاصل کرنا تھا۔ خدا جانتا ہے آپ سے مل کر بہت جی خوش ہوا۔ ایسی خاندانی اور سلیقے کی بیویاں اب کہاں؟"

"ناشتہ تو کرنا ہوگا۔ میرے ہاں سے تو کوئی فقیر بھی خالی نہیں جاتا۔ مغلانی منہ کیا دیکھ رہی ہو؟ اچھا بہن میں ضد نہیں کرتی، کھاؤ نہیں ذرا سا چکھ ہی لو۔ دیکھنے میں تو کچھ حرج نہیں۔ میں نے ہر چیز اپنے ہاتھ سے تیار کی ہے۔ یہ مامائیں تو دیکھنے ہی دیکھنے کی ہیں اور یہ مغلانی بالکل مٹی کا تھوا۔"

"ہاں بہن کیوں نہیں۔ آپ بڑے گھر کی بیٹی ہیں۔ (چپکے سے) میں تو کہتی ہوں کہ منصف صاحب کے بھاگ کھل گئے۔"

"اے وہ منصف ہے کس کے صدقے میں ہیں؟"

"ماشاءاللہ، تو پھر بہن رخصت دیجئے۔ دل تو یہی چاہتا ہے کہ آپ کی صورت دیکھا کروں لیکن گھر یونہی چھوڑ کر چلی آئی تھی۔ زندگی ہے تو پھر حاضر ہوں گی۔ آپ بھی کبھی ہمارے ہاں آیئے۔"

"میں کیوں نہ آؤں گی؟ آپ بلائیں اور میں نہ آؤں؟"

مہمانوں کے رخصت ہوتے ہی منصف صاحب اندر آئے۔ "کہو بی کیسی بیتی؟ باہر تو کسی نے ناشتہ وغیرہ کیا نہیں۔ تحصیلدار صاحب کو

زبردستی ایک پیالی پلائی۔ ان کی بیوی سے ملیں نہیں بھی تو ساتھ تھیں۔ سنا ہے بڑی فیشن ایبل تعلیم یافتہ عورتیں ہیں؟" "خاک! ویسے تو خیر کوئی برائی نہیں۔ صورتیں بھی نہ بہت اچھی ہیں نہ کڑکھائی، پَو ڈر لپ اسٹک کر کے آئی تھیں مگر مجھے تو ذرا پھیکی پھیکی سی نظر آئیں۔ میری ایک ایک چیز کو دیکھ کر تحصیلدارنی کے تو دیدے پھٹے جاتے تھے، مارے تعریف کے منہ خشک ہوا جاتا تھا، ندیدوں کی طرح سے مجھے برابر گھورے جاتی تھیں۔"

"کچھ کھلایا پلایا بھی؟"

"وہ بیچاری چھوٹے گھر کی عورتیں ہمارے دسترخوان پر کیا منہ لے کر بیٹھتیں؟ میں نے جو ناشتہ چنوایا، ان کے ہوش اُڑ گئے۔ ڈر گئیں کہ کہیں بھرم نہ کھل جائے۔ اس لئے انہوں نے کھا کر آنے کا بہانہ کر دیا۔ بھلا کسی کے ہاں آتے ہیں تو کھا کر آتے ہیں۔ بات بنا دی۔"

"بیگم آج تو تم نے کمال کر دیا۔ اور تو میں نے کوئی چیز کھائی نہیں صرف گاجر کی تری چکھی تھی۔ میں تو جانتا ہوں کہ حبش خاں کے پھاٹک سے منگائی ہوگی۔ بڑی ہی نفیس اور لذیذ تھی۔"

"پھر تم نے میرے جلانے کی باتیں کیں۔ گویا میں کچھ جانتی ہی نہیں۔ بازار سے بازاری عورتیں منگایا کرتی ہیں۔ میرے نانا جان ایسی چیزوں کے استاد تھے، سارے شہر میں ان کی دھوم تھی، بڑے بڑے امیر رئیس ان سے فرمائشیں کر کے کھانے پکواتے تھے۔ انہوں نے اپنی ساری املاک چولہے میں جھونک دی۔ ان کا سا دسترخوان کسی کا ہو تو لے۔ فقیری میں امیری کر گئے۔"

"میرا مطلب یہ ہے کہ اگر تمہاری رائے ہو تو سب چیزوں میں سے تھوڑا تھوڑا صاحب کی میم کو بھیج دوں۔ وہ بھی تو سمجھیں کہ یہاں کی بیگمات کیا کھاتی ہیں۔"

"ایسا غضب بھی نہ کرنا۔ تم تو سرخ رو ہو جاؤ گے اور مجھ پہ عذاب آ جائے گا۔"

"یہ کیوں کر؟"

"یہ اس طرح کہ پھر ان کی رات دن فرمائشیں ہوا کریں گی اور میں بس اسی کی ہو رہی۔ ایک آج ہی کی تو ائی میں میری انگلی کٹ گئی۔ اللہ! اور وں خون نکل گیا۔"

"اوہ! انگلی کٹ گئی۔ دیکھوں بی تم بھی بڑی وہ ہو۔ ڈاکٹر کو کیوں نہ بلا لیا؟ کچھ زیادہ گہرا تو زخم نہیں؟"

"تمہارے تو ٹھنڈک پڑ گئی۔ تمہارا کام تو ہو گیا۔ انگلی کٹی یا ہاتھ کٹ جاتا۔ تمہاری آبرو پہ تو کوئی حرف نہ آنے دیا۔"

منصف صاحب واقعات سے بے خبر کہ کیا ہوا کیوں کر ہوا اور کس نے کیا۔ خوش خوش بیگم کی شیخیوں سے متاثر باہر چلے گئے۔ اور مدتوں اس مغالطے میں رہے کہ جیسا میں لائق منصف ہوں ایسی ہی گھر کے معاملات میں میری بیوی قابل ہے۔

آئین سٹائن

رضی الدین صدیقی

آئین سٹائین ایک نہایت مذہبی شخص ہے۔ ان معنوں میں نہیں کہ وہ بہت عبادت گذار اور مذہب کے ظاہری شعائر کا پابند ہے بلکہ ان عمیق معنوں میں کہ وہ اس ذات کبریائی کا قائل ہے جسے انائے مطلق کہتے ہیں اور ایک ایسے نفسِ کل کا جو تمام کائنات کا مسبب الاسباب ہے۔ اس نے اپنی زندگی میں جو کام سرانجام دیا ہے اس سے بڑی حد تک یہی بات پایۂ ثبوت کو پہنچتی ہے کہ ۱۹ ویں صدی کے ملحدانہ اور مادی عقائد جو نیوٹن کے کلاسیکی نظریوں پر مبنی تھے اب قابلِ اعتبار نہیں رہے بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ آئین سٹائن ہی تھا، جس نے بے دینی کی بے پناہ یلغار کو روک دیا اور مادیت کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو پیچھے ہٹا دیا۔

قبل اس کے کہ ہم آئین سٹائن کے اس نظریہ کا بسیط جائزہ لیں جس نے سرے سے کائنات کا تصور ہی بدل ڈالا، یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس شخص کی زندگی کا ایک سرسری خاکہ پیش کر دیا جائے جو بلاشبہ ہمارے عہد کا سب سے بڑا سائنسدان اور نہایت محترم اور ہر دلعزیز انسان ہے۔

آئین سٹائن ۱۸۷۹ء میں جنوبی جرمنی کی ریاست بویریا کے پایۂ تخت میں پیدا ہوا۔ وہ دیکھنے میں بڑا سنجیدہ معلوم ہوتا تھا لیکن کچھ ایسا ذہین نہ تھا اور اس میں غیر معمولی قابلیت کے کوئی آثار دکھائی نہیں دیتے تھے۔ وہ سوئٹزرلینڈ کے شہر زیورچ کے دفتر اندراج ایجادات میں ملازم ہو گیا اور وہیں اس کو جدید طبعیات سے لگاؤ پیدا ہوا۔ ۱۹۰۵ء میں جب وہ ۲۶ سال کا تھا اس نے نظریۂ کوانٹم اور نظریۂ اضافیت میں تہلکہ خیز اضافے کئے۔ اس نے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی جس کی بنا پر وہ پراگ یونیورسٹی میں پروفیسری کے عہدہ پر فائز ہوا لیکن وہ زیادہ دیر وہاں نہیں رہا۔ اس کی شہرت اتنی تیزی سے پھیلی کہ اسے برلن آنے کی دعوت دی گئی اور یونیورسٹی میں سینیئر پروفیسر ہونے کے علاوہ پرشیا کی اکاڈیمی آف سائنسیز کا رکن مقرر ہوا، جو جرمنی میں کسی سائنسداں کے لئے سب سے بڑا اعزاز خیال کیا جاتا تھا۔ آئین سٹائن نے برلن میں ۲۰ سال زندگی بسر کی اور اپنے کام میں منہمک رہا۔ پھر جب نازیوں کو عروج حاصل ہوا تو وہ ۱۹۳۳ء میں ترک وطن کر کے امریکہ چلا گیا۔ کوئی پندرہ سال تک وہ پرنسٹن کی انسٹی ٹیوٹ آف ایڈوانسڈ سٹڈی کا ڈائرکٹر رہا اور ایٹم بم کے موجد ڈاکٹر رابرٹ اوپن ہیمر کے حق میں اس عہدہ سے سبکدوش ہوا۔ اس کے بعد وہ آخری وقت تک ایک عام پروفیسر کی حیثیت سے زندگی بسر کرتا رہا۔ یہاں یہ بیان کر دینا ضروری ہے کہ دوسری جنگ عظیم کے زمانہ میں آئین سٹائن نے پریذیڈنٹ روزویلٹ کی توجہ ایٹم بم کے ایجاد ہو سکنے کی طرف منعطف کی اور اسی سے وہ تمام سلسلہ شروع ہوا جو بالآخر اس خیال کے موجد کے لئے بھی سوہان روح ثابت ہوا۔ لیکن آئین سٹائن نے ایٹم بم کے ایجاد ہونے کے امکان پر اس لئے زور دیا کہ وہ جانتا تھا کہ جرمن بڑے زور شور سے اس سلسلہ میں تجربے کر رہے ہیں اور وہ ڈرتا تھا کہ اگر وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے تو تمام دنیا کو اپنا غلام بنا لیں گے۔ آئین سٹائن ایٹمی ہتھیاروں بلکہ جنگ وجدل کا سخت دشمن تھا اور فوجوں اور فوجی روح سے نفرت کرتا تھا، وہ اس شخص کو نہایت حقارت کی نظر سے دیکھتا تھا جو بینڈ کی گت پر دستے بنا کر چلنے میں بڑی لذت محسوس کرتا ہو۔

آئین سٹائن نے بار بار اپنے آپ سے زندگی کے معنی پوچھے ہیں اور وہ کہتا ہے کہ اس سوال کا جواب دینا ہی مذہبی شعور کا

آئینہ دار ہے۔ جو شخص اپنی اور اپنے ہم جنسوں کی زندگی کو بے معنی خیال کرتا ہے اس کی نظروں میں نہ صرف بدبخت ہے بلکہ زندگی بسر کرنے کے لائق ہی نہیں۔ اس کا عقیدہ ہے کہ ہر انسان نہ صرف بیرونی جبر کے تحت کام کرتا ہے بلکہ ایک اندرونی تقاضے کے مطابق بھی عمل کرتا ہے۔

شوپنہار کا یہ قول کہ "انسان جیسا چاہے کرسکتا ہے لیکن من مانی نہیں کرسکتا" اس کی جوانی ہی سے اس کے لئے ایک الہامی اثر کا حامل رہا۔ اس نے کبھی راحت و آرام کو مقصود بالذات نہیں سمجھا۔ وہ تصورات جنہوں نے اس کو راہ حیات میں روشنی بخشی ہے اور راسے زندگی کا بڑی خندہ پیشانی سے سامنا کرنے کی ہمت دلائی ہے وہ حق، نیکی اور حسن ہیں۔ وہ یہ صحیح خیال کرتا ہے کہ وہی لوگ انسانوں کو زیادہ محبوب ہونے چاہئیں جنہوں نے انسانی نسل اور زندگی کے ارتقاء میں سب سے زیادہ حصہ لیا ہے۔ وہ بڑی سنجیدگی سے خیال کرتا ہے کہ اگر کوئی شخص دوسرے انسانوں کو اعلیٰ کام دے کر انہیں بلندی کی طرف مائل کرتا ہے تو وہ ان کی بہترین خدمت سرانجام دیتا ہے۔ آئین سٹائن یہودی ہونے سے شرمندہ نہیں بلکہ جب جرمنی میں ان پر جبر و تشدد کا دور دورہ ہوا تو اس نے ان کی بڑی شد و مد سے حمایت کی۔ اگرچہ ایسی سرگرمیوں سے اسے کوئی واسطہ نہ تھا۔ اپنی شدید مصروفیتوں کے باوجود وہ فلسطین کی یہودی یونیورسٹی میں پہنچا اور مختلف موضوعات پر لیکچر دئے۔

اب میں سرسری طور پر یہ بیان کروں گا کہ آئین سٹائن نے کس طرح پہلے عظیم سائنسدانوں اور پھر ان کے ذریعے عام انسانوں میں مذہبی روح کے زندہ کرنے میں مدد دی ہے۔ اس کے لئے ہمیں تھوڑی دیر نیوٹن کی طرف رجوع کرنا پڑے گا جس کے افکار نے نظری و عملی سائنس پر بہت اثر ڈالا ہے۔ اس کے میکانیات کا لازمی و فوری نتیجہ جبر تھا جس نے مذہبی، فلسفیانہ اور معاشرتی افکار پر گہرا اثر ڈالا۔ اس میکانیات میں یہ فرض کر لیا گیا تھا کہ مادہ اور قوت ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔ لہٰذا اگر اس نظام کی موجودہ صورت معلوم ہو تو اس کی سابقہ و آئندہ تمام حالتیں پوری طرح متعین کی جاسکتی ہیں اس سے مادی فلسفہ کا آغاز ہوا اور اٹھارویں اور انیسویں صدی میں الحاد تیزی سے پھیل گیا۔ ملحدین اور مادئین کا سب سے بڑا دعویٰ یہ تھا کہ معلول اور علت میں ربط و تعلق لازمی ہے اس لئے یہ دنیائے آب و گل جو مادی ہے اس خدا کی تخلیق نہیں ہوسکتی جسے غیر مادی خیال کیا جاتا ہے۔

لیکن آئین سٹائن نے اس استدلال کو پارہ پارہ کردیا بحض فلسفیانہ دلائل سے نہیں بلکہ حقیقی مشاہدات اور ریاضیاتی استنتاج سے۔ اس نے نیوٹن کے اس بنیادی نظریہ کی تردید کی کہ مادہ اور قوت دو علیحدہ چیزیں ہیں اور اپنے نظریۂ اضافیت کی مدد سے واضح کیا کہ یہ دونوں ایک ہی چیز دو رخ ہیں جس طرح برف اور بھاپ ایک ہی عنصر کی دو شکلیں ہیں۔ اس نے ایک فارمولا ثابت کیا جس سے مادہ کی کمیت اور قوت کی مقدار میں تناسب ظاہر ہوتا ہے۔ جبکہ انہیں ایک دوسرے میں منتقل کیا جائے۔ آئین سٹائن کے اس دعوے کو تجربہ گاہوں میں پرکھا اور ثابت کیا گیا اور اس کے درست ہونے میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں رہی۔

اب اگر آپ مادئین کے اس دعوے کو پیش نظر رکھیں کہ ایک غیر مادی خدا مادی کائنات کا خالق نہیں ہوسکتا تو آپ صاف طور پر محسوس کریں گے کہ مادئین کا استدلال اپنا وزن کھو چکا ہے۔ اگر خدا زمینوں اور آسمانوں کا نور ہے جیسا کہ قرآن مجید میں کہا گیا ہے تو چونکہ نور قوت ہے اور قوت مادہ کی ایک شکل ہے تو خدا بلاشبہ اس کائنات کو تخلیق کرسکتا تھا۔ میں یہ نہیں کہتا کہ آئین سٹائن کے نظریہ نے خدا کا وجود ثابت کردیا ہے مگر میں اتنا ضرور کہوں گا کہ نفی ذات باری کے سلسلہ میں منکرین حق کا جو زیادہ وزن دار استدلال تھا اس کی ضرور تردید ہوگئی ہے۔ اس طرح مذہبی احیا کی راہ میں جو سب سے بڑی رکاوٹ تھی وہ دور ہوگئی ہے جو اب انسانوں کے لئے راستہ صاف ہوگیا ہے کہ وہ ایک نفس کل کی موجودگی کے لزوم کی طرف مائل ہوں، جو تمام واقعات دہر کا محرک اولی ہے۔

آئین سٹائن کا تصور مذہب عام انسانوں کے سیدھے سادے تصور سے بہت مختلف ہے۔ چونکہ بہت قدیم اور غیر ترقی یافتہ قومیں ایسے عقائد کی حامل ہیں جن کی بنیاد خوف پر ہے — وحشی جانوروں، بیماری اور موت کا خوف۔ عناصر کی طاقت اور قدرتی قوتیں ان پر اس بری طرح چھا جاتی ہیں کہ وہ ان مافوق قوتوں کو راضی کرنے کیلئے ان کی پرستش کرتی ہیں۔

مذہب کے وجود میں آنے کا ایک اور باعث ہدایت، محبت اور مدد حاصل کرنے کا جذبہ ہے۔ جو انسانوں کو خدا کا معاشرتی یا اخلاقی تصور قائم کرنے کی ترغیب دلاتا ہے۔ یہ تمام عقائد تجسیمی ہیں۔ صرف غیر معمولی

صلاحیتیں رکھنے والے افراد اور بالغ نظر قومیں ہیں جو اس سطح سے فی الحقیقت بلند ہو جاتی ہیں لیکن مذہبی احساس کی ایک اور صورت ہے جو ان سب میں مشترک ہے اور جسے کائناتی مذہبی احساس قرار دیا جا سکتا ہے۔ آئین شٹائن اس کا قائل ہے۔ وہ انسانی خواہشات اور مقاصد کی پستی کو محسوس کرتا ہے اور اس عظمت اور حیرت انگیز نظام کی بلندی کو جو دنیائے فطرت و خیال میں آشکار ہوتا ہے، وہ انفرادی زندگی کو ایک قسم کا زنداں خیال کرتے ہوئے کائنات کا بحیثیت ایک واحد پُر معنی کل کے احاطہ کرنا چاہتا ہے۔ اس کی رائے میں آرٹ اور سائنس کا سب سے بڑا مقصد یہ ہے کہ وہ کائناتی مذہبی احساس کو بیدار کرے اور اسے ان لوگوں کے سینوں میں زندہ رکھے جو اس کی صلاحیت رکھتے ہیں دوسری طرف اس کا دعویٰ ہے کہ کائناتی مذہبی احساس سائنسی تحقیقات کا قوی ترین اور اعلیٰ ترین محرک ہے۔ وہ اس کی تشریح آپ کرتا ہے کہ صرف وہی لوگ جو اس غیر معمولی جد و جہد اور اس سے بھی زیادہ اس جذبہ و شوق کو محسوس کرتے ہیں جس کی نظری سائنس متقاضی ہے۔ اس احساس کی قوت کو محسوس کر سکتے ہیں جس سے یہ کام انجام پاتا ہے۔ وہ کائنات کو ذہنی خیال کرنے کے یقین اور اس کو سمجھنے کی اس آرزو کی تعریف کرتا ہے جس سے کیپلر اور نیوٹن یقیناً بہرہ ور تھے اور جس نے انہیں سالہا سال تن تنہا معروف کار رہ کر اجرامِ فلکی کی میکانیات کے اصولوں کی تحقیق کی تحریک دلائی۔ وہ اس بات پر بہت زور دیتا ہے کہ جن لوگوں نے سائنسی تحقیقات کو اپنا مطمحِ نظر نہیں بنایا وہ کبھی سچے محققوں کی ذہنیت کو نہیں سمجھ سکتے۔ صرف وہی شخص جس نے اپنی زندگی ایسے ہی مقاصد کیلئے وقف کی ہو اس الہامی جذبہ کا اندازہ کر سکتا ہے جس سے یہ لوگ سرشار ہوتے ہیں اور جو انہیں بے شمار ناکامیوں کے باوجود اپنے مقاصد سے وفادار رہنے کی ہمت عطا کرتا ہے۔ اسے یقین ہے کہ یہ کائناتی مذہبی احساس ہی ہے جو انسان کو اس قسم کا حوصلہ عطا کرتا ہے اور ہمارے موجودہ مادی دور میں سنجیدہ سائنسی محقق ہی ہیں جو حقیقی معنوں میں اس والہانہ مذہبی احساس سے سرشار ہیں۔

(ترجمہ: جمیل نقوی)

(بہ شکریہ ریڈیو پاکستان، کراچی)

ر۔ رخ

نقد و نظر

اردو میں تنقید

از ڈاکٹر محمد احسن فاروقی
صفحات ۱۸۲، قیمت دو روپے چار آنے
ناشر:۔ ادارۂ فروغ اردو، ۱۳ امین آباد پارک لکھنؤ

ڈاکٹر فاروقی ان لوگوں میں ہیں جن کی عمر دشتِ تنقید کی سیاحی میں گذری ہے۔ اور وہ سیاح بھی کافی جہاں گرد قسم کے ہیں کیونکہ انہوں نے مشرقی ادبیات کے علاوہ مغربی ادبیات کا بھی کافی بسیط اور غائر مطالعہ کیا ہے۔ جس کے نتائج ان کی تنقیدات سے جابجا ظاہر ہوتے ہیں۔ ایسی تنقیدات جو بارہا علمی و ادبی رسائل و جرائد میں تنقیدی محاربات کا روپ دھار چکی ہیں۔

زیرِ تبصرہ کتاب میں ایک نہایت اہم موضوع پر قلم اٹھایا گیا ہے۔ جس پر تفصیلی نظر ڈالنے کی اشد ضرورت تھی اور ہے یعنی اردو کے سرمایۂ تنقید کا ناقدانہ جائزہ جس سے معلوم ہو سکے کہ یہ فن ہمارے یہاں کس حد تک ترقی کر چکا ہے اور اس میں ہنوز کن ترقیات کی گنجائش ہے۔ اس سلسلہ میں مصنف نے صرف عہد آفریں شخصیتوں اور ان کے تنقیدی کارناموں ہی کو پیشِ نظر رکھا ہے۔

صاحبِ موصوف کی اکثر آراء بہت پُر مغز اور خیال افروز ہیں۔ ان سے ہم نقد و ادب کے نئے نئے چراغ جلا سکتے ہیں اور ترقی کی نئی نئی راہیں تلاش کر سکتے ہیں مگر بعض جگہ دیگر اہلِ نظر (ان اہلِ نظر کے خلاف معلمی و طالبعلمی کا وہ الزام عائد کرنا دشوار ہوگا جس کا کتاب میں شدید ردِ عمل پیدا کرنے کی حد تک ذکر کیا گیا ہے) کا ان سے متصادم ہونا ناگزیر ہے مثلاً "آبِ حیات" کے سلسلہ میں مصنف کا بڑی کاوش سے یہ ثابت کرنا کہ اس کا 'ماڈل' تذکرے ہیں کیونکہ آزاد نے خود اس کو "تذکرۂ آبِ حیات" ہی قرار دیا ہے۔ پھر تمہید سے قطع نظر "آبِ حیات" کے نام ہی سے اس کا مقصد بھی ظاہر کر دیا گیا ہے یعنی قدیم شعرا اور ان کے عہد کو جو ہماری نظروں سے محو ہو چکے ہیں آبِ حیات کے جرعے پلا کر دوبارہ زندہ کرنا۔ آزاد دورِ جدید میں دورِ قدیم کے باسی تھے اور ان کا ذہنی وطن زیادہ تر عہدِ کہن ہی تھا۔ چنانچہ ان کی تصانیف "قصص ہند" "دربارِ اکبری" "سخندانِ پارس" یہاں تک کہ "اردو قاعدے" نے بھی یہی خصوصیت نمایاں ہے۔ وہ عہدِ کہن کے مصوّر تھے۔ اس لئے "آبِ حیات" میں انہوں نے اس عہد کو اپنے مخصوص انداز ہی میں بقائے دوام کا خلعت پہنایا ہے۔ تنقید تو وہ خود غالب کی طرح بہتے دریا تھے۔ اسی لئے ان کی تنقیدی ملامت پرشدت سے لے دے کرنا خود نقادی کی طرف عود کرآتا ہے۔

اتفاق سے وہ تمام خط و کتابت جو آبِ حیات کے سلسلہ میں آزاد اور ان کے معاصرین کے مابین ہوئی تھی دستیاب ہو چکی ہے اس سے اندازہ کیا جا سکے گا کہ انہوں نے فی الحقیقت حالات میں کس حد تک تصرف کیا۔ اس سلسلہ میں پروفیسر شیرانی مرحوم اور دیگر محققین کی توضیحات بھی ہمارے لئے شمعِ راہ ہیں۔

یہی کیفیت "مقدمہ شعر و شاعری" کی ہے۔ یہ حالی کے دیوان کا "مقدمہ" ہے۔ کیونکہ ان اضطراری حالات میں جو ۱۸۵۷ء کے انقلابِ عظیم سے رونما ہوئے تھے حالی نے بھی اضطراراً زندگی اور ادب میں بالکل ویسے ہی انقلاب کی ضرورت محسوس کی تھی۔ اور "مقدمہ" ایک ذاتی یا ادبی و تنقیدی ڈائری کے طور پر لکھا تھا تاکہ تمام سابق و موجودہ حالات کا سنجیدگی سے جائزہ لینے کے بعد کوئی نیا قدم اٹھایا جائے۔ اسی پر اس کی اہمیت موقوف ہے۔ ہمیں ڈاکٹر فاروقی کا ممنون ہونا چاہیئے کہ انہوں نے بعض نہایت اہم باتیں سجھائی ہیں۔

سرگذشت

از مولانا عبدالمجید سالک
صفحات ۵۳۵، قیمت چھ روپے
ناشر:۔ قومی کتب خانہ، ریلوے روڈ۔ لاہور

آپ بیتی اور جگ بیتی کا یہ مجموعہ بڑی دلچسپی سے پڑھا جائے گا۔ کیونکہ یہ ایک ایسے صحافی کی روداد ہے جس کی چشمِ جہاں بیں نے دنیا کے کتنے اتار چڑھاؤ دیکھے ہیں۔ اور جو "راہ و رسم منزلہا" سے پوری طرح باخبر ہے کیونکہ اس کی زندگی کا دائرہ اپنے عہد کی ساری زندگی سے ہمکنار رہا۔ وہ محض تماشائی ہی نہیں رہا بلکہ اپنے عہد کے ہنگاموں میں شد و مد سے حصہ بھی لیتا رہا ہے۔ اس کی سرگذشت کے وسیع پہنا کا تصور اسی طور میں کیا جا سکتا ہے جب ہم یاد رکھیں کہ اس کی ابتداء حالی و شبلی کے ز

سے ہوئی اور انتہا دورِ حاضر پر۔

ایک طرف کتاب کا موضوع فی نفسہ دلچسپ اور پھر وہ خوش بیانی جس سے دل کے کنول خود بخود کھل جائیں، وہ بذلہ سنجی جو دل میں بشاشت کی لہر دوڑا دے، سونے پر سہاگے کا کام دیتی ہے۔ جہاں جہاں زندہ دل مزاح نگار کی شوخیٔ طبع کی چھوٹ پڑتی ہے عبارت کا لطف دوبالا ہو جاتا ہے۔ یہی لطافتِ بیان ہے جو اس طویل سرگذشت کو بھی ایک رنگین داستان بنا دیتی ہے۔ اس دلچسپ مرقع میں کہیں بھی زیادہ شوخ رنگ نہیں برتے گئے۔ جن سے زیبِ داستاں کا احساس پیدا ہو۔ ایسی بے تکلفی اور سنجیدہ بیانی صرف ایک منجھے ہوئے صحافی ہی میں پیدا ہو سکتی تھی۔ جو ساتھ ہی با ذوق ادیب اور سلیم الطبع انسان بھی ہو۔

از سید امجد حسین

جملۂ معترضہ

صفحات ۲۲۳، قیمت تین روپے

ناشر۔ اردو بک اسٹال لوہاری دروازہ لاہور

دیکھنے میں نہ وہ شوخ ہے نہ شریر، بالکل خاموش اور اپنے آپ کو لئے دیئے ہوئے لیکن آپ اس کی سادگی پر نہ جائیے۔ وہ کھلا دلی اور پوشیدہ کافر ہے۔ اس کے خاموش ہونٹوں میں ایک دبی دبی مسکراہٹ ہے۔ بڑی شوخ اور تیکھی، گہری تہہ سے ابھرتی ہوئی اور ابوالہول کی پُراسرار مسکان کی سی گہرائی لئے ہوئے۔ اس کی مسکراہٹ کھلے طنز سے زیادہ گہری کاٹ کرتی ہے۔ اور اس کا وار قہقہوں سے زیادہ بھرپور اور تباہ کن ہے۔ اس نوجوان مزاح نگار کی بذلہ سنجی کا سرچشمہ ایک سنکی، چڑچڑی، جلی بھنی، بیمار، طبیعت نہیں۔ بلکہ ایک بشاش طبیعت سے ابھرنے والی خوش طبعی کی بے ساختہ لہر ہے۔ نہایت بے تکلف اور تندرست ایسے مزاح کو تھارن ٹو ائیک کے الفاظ میں "فیدر آف دی سول" یعنی طبیعت کی موج ہی کہنا مناسب ہے۔ جو ہر چیز سے سامانِ تفنن پیدا کر لیتی ہے۔ اور بڑے سلجھے، رچے ہوئے گمبھیر انداز میں یہ خوش طبعی "بار خاطر" "مُس پن" کے خلاف کھلی بغاوت ہے۔ جس کے ہم لوگ عادی ہو چکے ہیں۔ بلا شبہ اس قسم کی انشائے لطیف جو ادبی نہ ذوقی حیثیت کو ایک بلند سطح پر قرار رکھتی ہے۔ ہمارے فکاہی ادب میں ایک گراں قدر اضافہ ہے۔ یہ اس خاص قسم کی صحافیانہ طنز اور مزاحیہ شاعری اور فکاہی ادب سے مختلف ہے "جس میں ملک کے سیاسی، سماجی، اقتصادی، سرکاری غرضیکہ ہر قسم کی زندگی کے عام حالات کا خاکہ اڑایا گیا ہو"۔

از ڈاکٹر گیان چند جین

اردو کی نثری داستانیں

(انیسویں صدی تک)

صفحات ۶۰۹، قیمت نو روپے

ناشر:۔ انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی

اردو نظم و نثر میں داستانوں کا ایک وسیع سرمایہ ہے جس کا سلسلہ بہت دور پہنچتا ہے۔ اس وقت تک جب کہ اردو نے اپنی ابتدائی حالت سے ابھر کر دکھنی کی شکل اختیار کی تھی۔ ظاہر ہے کہ یہ سرمایہ کس قدر متنوع اور لخت لخت ہے۔ اور اس پر مجموعی حیثیت سے نظر ڈالنا کس قدر دشوار ہے تا وقتیکہ اس کی شیرازہ بندی نہ کی جائے۔ جہاں تک نثری داستانوں کا تعلق ہے، ڈاکٹر گیان چند جین نے ان کی شیرازہ بندی کا بیڑا اٹھایا۔ اور ایک تحقیقی مقالہ تحریر کیا جس کی بنا پر انہیں الٰہ آباد یونیورسٹی کی طرف سے پی۔ ایچ۔ ڈی کی سند حاصل ہوئی۔ انجمن ترقی اردو نے اس مقالہ کو مطبوعہ شکل میں پیش کر کے ایک اہم خدمت سر انجام دی ہے۔

یہ کتاب محض داستانوں کی فہرست ہی نہیں بلکہ ان کا پورا پورا تعارف بھی ہے۔ ابتدا میں فاضل مصنف نے فن قصہ گوئی کے آغاز پر روشنی ڈالی ہے اور پھر اردو کی نثری داستانوں کے ارتقا کا خاکہ کھینچا ہے۔ ابتدائی حصہ کی حیثیت ایک مقدمہ کی ہے جس میں قصہ گوئی کے محرکات اور اجزائے ترکیبی پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ جو ہمیں اردو کی نثری داستانوں پر ناقدانہ نظر ڈالنے میں مدد دیتی ہے۔ مصنف نے ۱۸۵۷ء تک جتنی داستانیں اردو میں لکھی گئی ہیں۔ (بہ استثنائے چند، جو بعد میں لکھی گئیں) نہ صرف ان کے محاسن و معائب پر بحث کی ہے بلکہ ان کے مآخذ (سنسکرت، عربی، فارسی وغیرہ) پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ کتاب کا سب سے اہم حصہ وہ ہے جس میں داستانوں کے مافوق الفطرت عناصر اور کردار نگاری وغیرہ پر تحقیق کی گئی ہے۔ علاوہ بریں مصنف نے کافی مقدار میں نیا مواد فراہم کر کے ہماری ادبی تاریخ کے متعدد گوشے بے نقاب کئے ہیں۔ اور بہت سی داستانوں کا سراغ لگایا ہے جن کے نام بہت کم سننے میں آتے ہیں مگر تاریخی اعتبار سے ان کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔

ڈاکٹر جین کا یہ مقالہ اردو ادب میں ایک گراں قدر اضافہ ہے۔ اور ایسا نقطۂ سفر مہیا کرتا ہے جس سے اردو داستانوں کے مطالعہ کو بہت آگے بڑھایا جا سکتا ہے۔

استقلال نمبر — **ماہِ نو** — اگست ۱۹۵۵ء

پاکستان کا قیام ایک تاریخی واقعہ ہے اسی طرح اس کے آٹھویں جشنِ استقلال پر یہ شمارۂ خاص

ادب، فن اور ثقافت کے مایۂ ناز شاہکار پیش کرنے میں

ایک تاریخی حیثیت کا مالک ہوگا

پاک و ہند کے مقبول اہلِ قلم کے تصورات و افکار کا یہ مجموعہ متعدد صوری و معنوی خوبیوں کا حامل ہوگا اور امید ہے کہ اس سال کی بہترین ادبی پیشکش تسلیم کیا جائے گا۔

ہمارے چند متوقع لکھنے والے

ڈاکٹر مولوی عبدالحق	ڈاکٹر ابواللیث صدیقی	انتظار حسین	شوکت صدیقی	رو ہتش صدیقی	تابش دہلوی
ڈاکٹر سید عبداللہ	الطاف گوہر	شفیق الرحمٰن	اشرف صبوحی	سید عبدالحمید عدم	صفیہ شمیم
محمد حسن عسکری	ضمیر جعفری	ابن سعید	•	ابن انشا	زہرہ نگاہ
ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری	•	ابوالفضل صدیقی	جگر مراد آبادی	قیوم نظر	احمد فراز
سید ہاشمی فرید آبادی	غلام عباس	اشفاق احمد	ابوالاثر حفیظ	ناصر کاظمی	حامد حسن قادری
عبدالرحمٰن چغتائی	حجاب امتیاز علی	آغا بابر	فراق گورکھپوری	شیر افضل جعفری	فضان الحق حقی
سید وقار عظیم	شکیلہ اختر	ابوسعید قریشی	حفیظ ہوشیارپوری	ضمیر اظہر	جمیل قدوائی
ڈاکٹر عبادت بریلوی	قدرت اللہ شہاب	یزدانی ملک	احسان دانش	سراج الدین ظفر	قتیل شفائی

ضخامت: عام اشاعتوں سے دوگنی

سرورق: نیا دیدہ زیب سرورق

رنگین تصاویر: ملک کے نامور مصوروں کے متعدد شاہکار

سادہ تصاویر: جدید حالات اور تاریخی و تہذیبی ورثہ کی آئینہ دار

مستقل خریداروں کو یہ سالنامہ بلا قیمت پیش کیا جائے گا۔ عام قیمت عہ فی کاپی (پاکستان میں) عبر (ہندوستان میں)

ایجنٹ حضرات: خاص نمبر کی مطلوبہ تعداد سے فوراً مطلع فرمائیں۔

ادارۂ مطبوعات پاکستان - پوسٹ بکس ۱۸۳ — کراچی


درد
کھیل کود کو ختم کر دیتا ہے
سیریڈون
درد سے نجات دیتی ہے
سیریڈون اب صاف ستھرے سیلوفین پیکنگ میں بھی ملتی ہے


آپ کو ہر روز
گندگی کے
جراثیم سے
بیماری کا خطرہ
رہتا ہے۔
لائف بوائے سے
ان جراثیم کو
اپنے جسم سے دھوکر
ہر روز
اپنی حفاظت کیجئے۔
لائف بوائے کا
”محافظ جھاگ“
آپکی تندرستی کی
حفاظت کرتا ہے۔
لائف بوائے
صابن
ہر روز کی گندگی کے جراثیم سے
آپکی حفاظت کرتا ہے
LIFEBUOY
SOAP

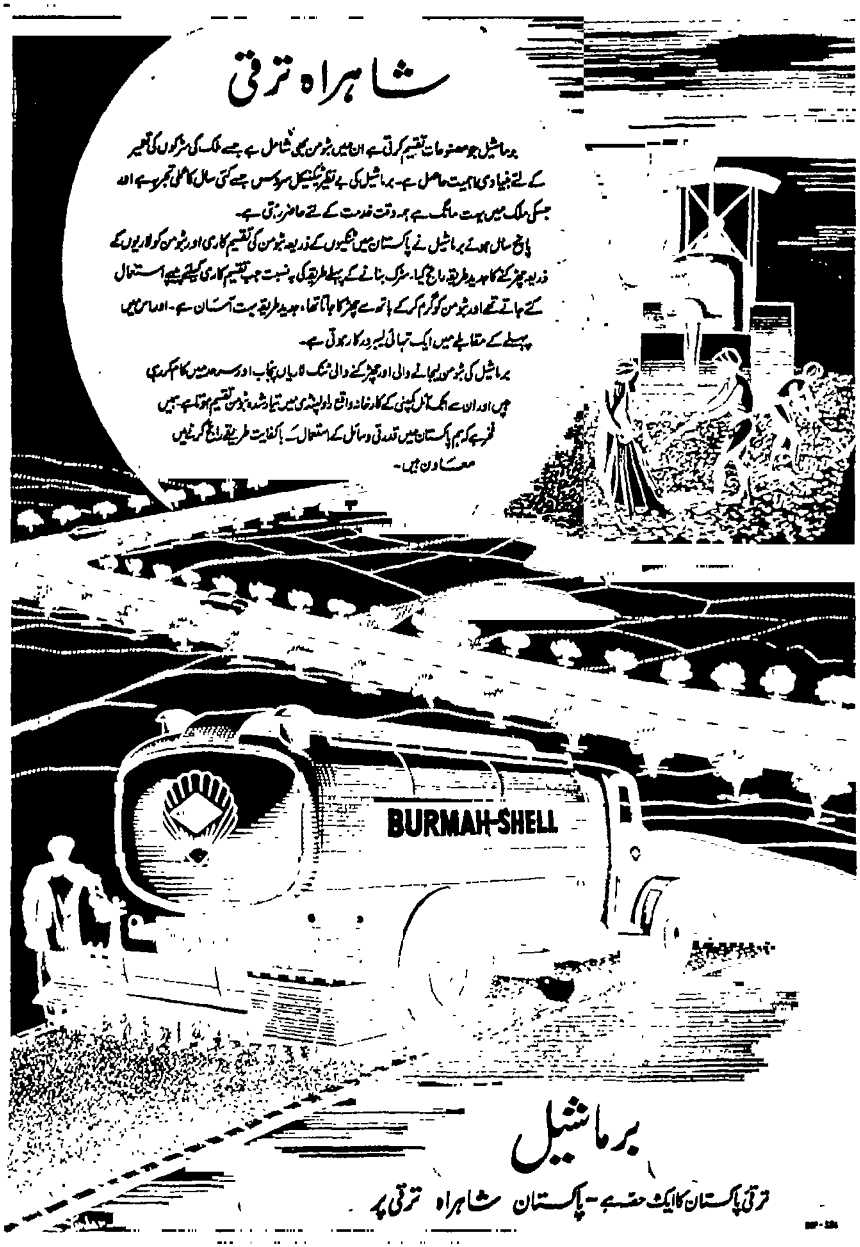

کس طرح تھوڑے ڈالڈا نے بہت کام کیا!
ماں! آپ کو کس بات کی پریشانی ہے؟
تمہاری شادی کے موقع پر مہمانوں کو کھلانے میں کتنا بیت نیچ ہوگا۔ اسی کی فکر ہے۔
فکر نہ کیجئے۔ ڈالڈا میں کھانا پکوا لیجئے اس سے آپکی مشکل حل ہو جائیگی
ڈالڈا ہر قسم کے پکوان کیلئے ہمیشہ استعمال کیا جا سکتا ہے
اور آپ اس کو تلنے بھوننے اور مٹھائی بنانے کے کام میں لا سکتی ہیں۔
اتنا اچھا کھانا تو برسوں سے چکھنے کو بھی نہ ملا تھا۔
ڈالڈا سب سے زیادہ قوت بخش اور خالص چکنائی ہے جو آپ بازار سے خرید سکتے ہیں
ڈالڈا کھانا پکانے کا مناسب داموں پر موزوں روغن ہے جو کہ ہر موقع پر سب طرح کے پکوان کیلئے اور تمام قسم کے کھانوں اور مٹھائیوں کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے خواہ انہیں آپ گرم گرم کھائیے یا ٹھنڈا ہونے پر۔
DALDA VANASPATI
ڈالڈا وناسپتی


دِن بدِن
صاف اور حسین جلد
آپ کے لئے بھی رکسونا کا
کیڈل
یہ جادو جگا سکتا ہے
رکسونا کے کیڈل سے مالامال جھاگ کو
اپنی جلد پر نرمی سے ملئے اور پھر دھو ڈالئے
پھر دیکھئے آپ کی جلد دن بدن نرم اور ملائم
ہوتی جائے گی جس سے آپ کا حسن
درخشاں ہو جائے گا۔
رکسونا
*کیڈل آمیز واحد صابن
* جلد کو قائم کرنے اور مقوی جلد
تیلوں کے ایک خاص مرکب کا ملکیتی نام ہے۔
Rexona
Rexona



ادارہ مطبوعات پاکستان پوسٹ بکس نمبر ۱۸۳ کراچی نے شائع کیا - مطبوعہ ناظر پرنٹنگ پریس کراچی
مدیر: رفیق خاور


دِن بدِن
صاف اور حسین جلد
آپ کے لئے بھی رکسونا کا
کیڈل
یہ جادو جگا سکتا ہے
رکسونا کے کیڈل سے مالا مال جھاگ کو
اپنی جلد پر نرمی سے ملئے اور پھر دھو ڈالئے پھر
دیکھئے آپ کی جلد دن بدن نرم اور ملائم ہوتی جائے گی
جس سے آپ کا حسن درخشاں
ہو جائے گا۔
رکسونا
* کیڈل آمیز واحد صابن
Rexona
Rexona


شاہراہ ترقی
برماشیل جو مصنوعات تقسیم کرتی ہے ان میں بٹومن بھی شامل ہے جسے ملک کی سڑکوں کی تعمیر
کے لئے بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ برماشیل کی بے نظیر ٹیکنیکل سروس جسے کئی سال کا کامل تجربہ ہے اور
جسکی ملک میں بہت مانگ ہے ہر وقت خدمت کے لئے حاضر رہتی ہے۔
پانچ سال ہوئے برماشیل نے پاکستان میں ٹنکیوں کے ذریعہ بٹومن کی تقسیم کاری اور بٹومن کو لاریوں کے
ذریعہ چھڑکنے کا جدید طریقہ رائج کیا۔ سڑک بنانے کے پہلے طریقہ کی بہ نسبت جب تقسیم کاری کیلئے پیپے استعمال
کئے جاتے تھے اور بٹومن کو گرم کرکے ہاتھ سے چھڑکا جاتا تھا، جدید طریقہ بہت آسان ہے۔ اور اس میں
پہلے کے مقابلے میں ایک تہائی لیبر درکار ہوتی ہے۔
برماشیل کی بٹومن لیجانے والی اور چھڑکنے والی ٹنک لاریاں پنجاب اور سرحد میں کام کر رہی
ہیں اور ان سے اٹک آئل کمپنی کے کارخانہ واقع راولپنڈی میں تیار شدہ بٹومن تقسیم ہوتا ہے۔ ہمیں
فخر ہے کہ ہم پاکستان میں قدرتی وسائل کے استعمال کے باکفایت طریقے رائج کرنے میں
معاون ہیں۔
BURMAH-SHELL
برماشیل
ترقی پاکستان کا ایک حصہ ہے۔ پاکستان شاہراہ ترقی پر

ماہِ نو

جلد ۸، شمارہ ۴ جولائی ۱۹۵۵ء

مدیر: رفیق خاور
نائب مدیر: ظفر قریشی

چندہ سالانہ: پانچ روپے آٹھ آنے (پاکستان میں) سات روپے (ہندوستان میں) فی کاپی آٹھ آنے (پاکستان میں) دس آنے (ہندوستان میں)

آپس کی باتیں

پچھلے دنوں کراچی اور ڈھاکہ دونوں جگہ یومِ نذرالاسلام بڑے اہتمام سے منایا گیا۔ قیامِ پاکستان کے بعد سے یہ تقریب ہر سال برابر ہو رہی ہے۔ نذرالاسلام بنگلا شاعری میں ایک نئی تحریک کے بانی ہوئے۔ جس میں اسلامی آہنگ برابر اُبھرتا ہوا نظر آتا ہے۔ اس میلان کو فروغ دینے میں تنہا اُن کی ذات کا بڑا حصہ ہے۔ اُن کی شاعری مشرقی پاکستان ہی کے ماحول میں پروان چڑھی اور اسی رنگ میں رنگی ہوئی ہے۔ لیکن اسکی آواز تمام پاکستان کی آواز ہے۔ "یومِ نذرل" کی تقریب رقص و موسیقی کے رنگا رنگ مظاہروں سے مزین ہوتی ہے۔ ہم اس شمارہ میں کراچی کی تقریب کے چند مناظر پیش کر رہے ہیں۔

اُردو ڈرامے کا پہلا نقش "اندر سبھا" ہمیشہ دلچسپی کا حامل رہیگا۔ کیونکہ یہ اردو ادب میں ایک نئے سلسلہ کی پہلی کڑی ہے۔ آج اس کا موضوع کتنا ہی فرسودہ اور تکنیک کتنی ہی پارینہ کیوں نہ معلوم ہو لیکن یہ باتیں اس کی دلچسپی اور اہمیت کو گھٹا نہیں سکتیں۔ اس کے کئی پہلو ناقدانِ فن کو غور و مطالعہ کی دعوت دیتے رہیں گے۔ ہمارے فاضل نقاد سید وقار عظیم نے اس کو خصوصی مطالعہ کا موضوع بنایا ہے۔ اور اس کے بعض وقیع پہلو اجاگر کئے ہیں۔ یہ سلسلۂ مضامین ایک اہم ضرورت کو پورا کرتا ہے۔ جس کی افادیت محتاجِ بیان نہیں۔

اردو کا یہ پہلا ناٹک ایسے زمانہ میں تصنیف ہوا جب نئے مادّی اسباب نے نقل و حرکت، میل جول اور زندگی میں ہنگامہ آرائی کے نئے مواقع پیدا کر دئے تھے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اس دور میں باطن کی بجائے خارج کی طرف توجہ بڑھ گئی تھی۔ ناٹک، مرثیہ، نظیر اکبرآبادی کی عوامی و مجلسی شاعری، غزل میں خارجیت کا غلبہ، ریختی کی ایجاد، ان سب چیزوں میں ایک مشترک رجحان ملتا ہے۔ اور پھر سید انشا کا مصحفی کا سوانگ بھرنا اور جلوس نکالنا کیا یہ سچ مچ ناٹک ہی جیسا کھیل نہیں تھا؟ بلاشبہ اس دور کی مجلسی زندگی ڈرامے کی متقاضی تھی۔ اس کے برخلاف ڈرامے کا فقدان کسی نہ کسی حد تک معاشرے میں انفرادیت کے رجحان کو ظاہر کرتا ہے۔ خصوصاً جبکہ لوگوں کی اجتماعی جبلت نے مجالست اور اشتراکِ عمل کی کوئی ایسی راہ نہ ڈھونڈی ہو جو ڈرامے کا جواب ہو سکے۔

مغربی پاکستان میں جہاں قدرتی وحدت نمایاں ہے وہاں تمدنی وحدت بھی کچھ کم نمایاں نہیں اس سے قبل ایک مضمون "وادیٔ سندھ کی میراث" میں اس مسلسل وحدت پر روشنی ڈالی گئی تھی جس کی شہادت تاریخ بہم پہنچاتی ہے۔ اسی شہادت کے آثار ان پرانی عمارات میں بھی دکھائی دیتے ہیں جو مغربی پاکستان کے ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک بکھری پڑی ہیں۔ کسی لطیف طبع شخص نے عمارات کو "منجمد موسیقی" بتایا ہے۔ یہ موسیقی کیا ہے؟ ہمارے افسانہ نگار ابوسعید قریشی نے اپنے رپورتاژ "کاف تا کاف" میں اسکی کیفیت بیان کی ہے۔ اس رپورتاژ کی دوسری قسط زیرِ نظر شمارہ میں پیش کی جا رہی ہے۔

"ماہِ نو" کا اگلا شمارہ "استقلال نمبر" یعنی ہمارا سالنامہ ہوگا۔ اس کی ترتیب شروع ہو چکی ہے اور اہلِ قلم کے تعاون سے نظم و نثر کے اتنے مضامین حاصل ہو گئے ہیں کہ اکثر صورتوں میں انتخاب دشوار ہے۔ اب تک بفضلہٖ "ماہِ نو" کا ہر شمارہ سابقہ شماروں پر فائق رہا ہے اور ہمیں امید ہے کہ ہم ترقی کی اس روایت کو قائم رکھ سکیں گے۔ تصاویر کا انتخاب بھی خاص توجہ سے کیا گیا ہے۔ ان میں قدیم و جدید نقاشی کے بعض نادر نمونے شامل ہیں۔

"ماہِ نو" ایک ادبی رسالہ ہے جس کا مقصد پاکستان کی ادبی و ثقافتی روایات کو تازہ رکھنا اور اہلِ ذوق کو ملک کے ادب و فن، تہذیب و آثار، مشاغل و افکار، مسائل اور جد و جہد سے آگاہ کرنا ہے۔ رسالہ کے مضامین نظم و نثر کی ترتیب و ہیئت کے بارے میں ہم اپنے پڑھنے والوں کے مشاہدات اور ان کی آراء کو قدر کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں ہمارے مدِ نظر ترقی و بہتری ہے۔ لہٰذا رسالہ کے مختلف پہلوؤں پر مخلصانہ اظہارِ خیال ہمیشہ موجبِ تشکر ہوگا ♦

اردو کے غیر معروف ناول — "اُفتادِ جوانی"

(۲)

غلام عباس

پچھلے مہینے کے "ماہِ نو" میں آپ حکیم سید علی حسین خاں عرف ببّن صاحب کے ناول "افتادِ جوانی" کا ابتدائی حصہ پڑھ چکے ہیں۔ اور مصنف ہی کے الفاظ میں ناول کے تین بڑے کرداروں یعنی سجاد (ہیرو) افتخار بہو (ہیروئن) اور سجاد کے باپ مرزا فدا حسین سے، جو اپنے زمانے میں نامی گرامی بانکے رہ چکے تھے، متعارف ہو چکے ہیں۔

اس زمانے میں آدمی کا مار ڈالنا کچھ بڑی بات نہ تھی۔ بڑے بڑے اُمرا، کتّے، بلّی کی طرح سر بازار مار ڈالے جاتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ یہ لوگ شہر کے عمدہ عمدہ بانکوں کو اپنے ہمراہ رکھتے تھے۔ ان کے ناز اُٹھاتے اور جا و بیجا ان کی سختیاں سہتے تھے۔ اس زمانے میں جہاں کوئی نوجوان اُنیس بیس برس کا ہو کر سپاہ گری کے فنون میں ماہر اور ڈنڈ مگدر کر کے تیار ہوتا بس اسی دن سے سینکڑوں اُمراء کے پیام آنے لگتے۔ یہاں تک کہ حسب قدر مشاہرہ بردہ یا اس کے والدین راضی ہوتے تھے، اپنا ملازم کر کے اپنے ساتھ رکھ لیتے تھے۔ ایک ایک جوان چار چار جگہ نوکر ہوتا تھا اور ہر جگہ اپنے وقتِ معین پر پہنچتا تھا۔ اور اظہار کر دیتا تھا کہ میں فلاں فلاں رئیس کا بھی ملازم ہوں۔ اگر ان اُمرا میں کوئی فساد اُٹھ کھڑا ہوتا تو حتی المقدور اصلاح میں کوشش کر کے رفع شر کرا دیتا۔ ورنہ اپنے معین وقت پر جس کسی کے ہمراہ ہوتا، یا جس کسی کا زیادہ زیر بار احسان و قدر دانی ہوتا، اصیل تلوار کی طرح اسی کا کام دیتا۔ اور جان دیکے یا جان لے کے حق نمک ادا کرتا تھا۔

سجاد بھی اسی طرح نواب مکرم الدولہ کے ہاں ملازم ہو گیا تھا۔ جس رات کا پہلے مذکور ہو چکا ہے۔ افتخار بہو نے اپنے ایک توہم کی وجہ سے بڑی منت خوشامد کر کے شوہر کو راضی کر لیا تھا کہ وہ اس رات گھر سے باہر نہ نکلے۔ مگر آدمی رات کو یکبارگی اس کی طلبی ہوتی ہے۔ نواب مکرم الدولہ اپنی سواری کا خاص بسزہ بھیج کر اسے بلواتا ہے۔ اور سجاد بیوی کو روتا دھوتا چھوڑ کر نواب کی ڈیوڑھی کی طرف چل دیتا ہے۔ ابھی وہاں پہونچنے نہیں پاتا کہ راستے میں اس کی مڈبھیڑ دو آدمیوں سے ہوتی ہے جو بدحواسی کے عالم میں اندھیرے میں چھپتے چھپاتے چلے جا رہے ہیں۔ سجاد للکار کر انہیں ٹھہراتا ہے۔ ان میں ایک تو شہر کا ایک اور نواب ہے جس کی سجاد سے بھی صاحب سلامت ہے اور دوسرا اس کا خدمت گار۔ وہ ایک دوسرے کو پہچان لیتے ہیں۔ نواب کو اس وقت جان کے لالے پڑے ہوئے ہیں کیونکہ دشمن اس کے تعاقب میں ہے۔

قصہ یوں ہے کہ یہ نواب جاوی نامی ایک رنڈی کے ہاں جو کسی دوسرے رئیس نثار علی خاں کی تنخواہ دار تھی، چھپ چھپ کے جایا کرتا تھا۔ ایک دن اس رئیس کو پتہ چل جاتا ہے اور وہ بیس، پچیس آدمیوں کو لا کر جاوی کے مکان کو گھیر لیتا ہے۔ نواب ایک سپاہی کو رشوت دیکے بمشکل تمام مکان سے نکل بھاگنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ مگر نثار علی خاں کے سپاہی برابر اس کے تعاقب میں لگے ہوتے ہیں۔

سجاد یہ واقعہ سن کر نواب کو ملامت کرتا ہے۔ کہ آخر انصاف بھی کوئی چیز ہے۔ ایک آدمی ہزاروں روپے دے، آئے دن کی فرمائشیں پوری کرے۔ اور رنڈی دوسرے پر مفت جان دے۔ خیر یہ تو اس کا فعل ہے مگر تم کو کیا ضرور تھا کہ تم وہاں جا کے پھنسو۔

نواب اپنا قصور تسلیم کرتا ہے، اور قسم کھاتا ہے کہ وہاں پھر کبھی نہیں جاؤں گا۔ اس پر سجاد اسے اپنی حفاظت میں لے کر اس کے گھر پہنچانے جاتا ہے۔ راستے میں اس کا مقابلہ نثار علی خاں کے بانکوں سے ہوتا ہے۔

دو تین نامی گرامی بلنگ کھیت رہتے ہیں اور باقی بھاگ جاتے ہیں۔

جس وقت سجاد نواب کو صحیح سلامت اس کے گھر پہنچا کر اکیلا واپس آرہا ہوتا ہے، تو نثار علی خاں بذاتِ خود ایک جمعیت لے کر اور تیغ و تفنگ سے لیس ہو اس پر دھاوا بول دیتا ہے۔ اس لڑائی میں نثار علی خاں اور اس کے کئی بہادر سجاد کے ہاتھ سے مارے جاتے ہیں سجاد خود بھی زخموں سے چور ہو جاتا ہے۔ مگر وہ دشمن کے باقی آدمیوں سے برابر لڑے جاتا ہے۔ یہاں تک ایک دفعہ پینترا بدلنے میں اس کا پاؤں تربوز کے ایک چھلکے پر پڑتا ہے اور وہ پھسل کر گر پڑتا ہے۔ اس پر دشمن کے سپاہی پے درپے تلواریں مار کر چشمِ زدن میں اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالتے ہیں۔

سجاد کی نعش گھر پہنچتی ہے تو محلے بھر میں ایک کہرام بپا ہو جاتا ہے بوڑھے مرزا کی کمر ٹوٹ جاتی ہے اور نوجوان افتخار بہو کی یہ حالت ہوتی ہے کہ:

"نہ تو اس کی آنکھیں روتی ہیں، اور نہ اس کی زبان کچھ بین کرتی ہے بس سینہ پتھر کی مورت ہے کہ جہاں ہے وہیں ہے۔ نہ کچھ سنتی ہے نہ کچھ دیکھتی ہے، نہ منہ سے کچھ کہتی ہے۔"

سجاد کی برسی کے بعد جب اس کا ماتم کسی قدر پرانا ہو گیا تو ایک روز مرزا فدا حسین نے بہو کو پاس بلا کے کہا:

مرزا: سنو بیٹا جو کچھ میں اس وقت تم سے کہتا ہوں اُسے غور سے سنو اور سوچ سمجھ کے جواب دو۔ تم جانتی ہو کہ سجاد کے مر جانے سے میں ایسا تنہا ہو گیا کہ کوئی بھی میرا وارث نہ رہا۔ لہٰذا میں چاہتا ہوں کہ تم کو اب بہو نہ سمجھوں بلکہ بیٹی بنا کے رکھوں۔

بہو: مجھ کو آپ کے حکم سے کیا انکار ہو سکتا ہے۔ مجھ کو تو ہر طرح آپ کی لونڈی گری کرنے سے فرض ہے خواہ بہو بن کے کروں خواہ بیٹی بن کے۔

مرزا: بس تم میری بیٹی ہو تو اب مجھ کو چاہیئے کہ میں تمہارا نکاح بھی دوسرا کروں۔ اسی طرح سے کہ جس طرح میری بیٹی ہوتی اور میں کرتا۔

بس یہ کلام سننا تھا کہ وہ تھر تھر کانپنے لگی۔ قریب تھا کہ مارے غم و غصہ کے غش آجائے۔ مرزا نے جو یہ حالت دیکھی تو یہ کہتے ہوئے ٹال کے اُٹھ گئے کہ دیکھو اس کا جواب بہت سمجھ بوجھ کے مجھ کو دینا۔

مرزا کے جانے کے بعد بہو کی یہ حالت ہوئی کہ وہ دن اور ساری رات اسے روتے ہی گزر گئی۔ اور تین دن تک نہ تو کچھ کھایا اور نہ کسی سے بات ہی کی۔ جب سے سجاد مارے گئے تھے وہ رانڈوں کی طرح کچھ روکھا سوکھا کھا لیا کرتی تھی۔ شب کو کھانا بالکل ترک کر دیا تھا۔ سادے سفید کپڑے پہنتی، پان کھانا بالکل چھوڑ دیا تھا۔ ایک گوشے میں رات اور دن بسر کرتی۔ نہ کہیں آنا نہ جانا۔ روزہ نماز، احادیث قرآن ہی میں اوقات گزارتی تھی۔ بس خسر کے اس پیغام دینے سے اس کو خیال گزرا کہ کونسی بات انہوں نے میری ایسی دیکھی جو ان کو میری جانب ایسا شک پیدا ہوا۔ مگر کوئی بات اس کے ذہن میں نہ آتی تھی۔ یہاں تک کہ پندرہ بیس دن اسی طرح رونے پیٹنے میں اس کو گزر گئے مگر کوئی فی وہ اپنے چال چلن میں نہ نکال سکی۔

جب مرزا صاحب نے دیکھا کہ اب اس فرمائش کے صدمے کا اثر اس کے دل سے جاتا رہا۔ تو پھر ایک دن اسی طرح اپنے قریب بلا کر وہی خواہش ظاہر کی۔ اب کی دفعہ اس پر پہلا سا اثر تو نہ ہوا۔ مگر اتنا اب بھی ہوا کہ غصے کے مارے منہ سرخ ہو گیا۔ اور کوئی جواب نہ دے سکی۔ مرزا پھر اس کے پاس سے اُٹھ گئے اور یہ اسی طرح غیظ و غضب میں آلودہ رہی جس کا اثر اب کی دفعہ سات آٹھ دن رہا۔

جب پھر مرزا نے دیکھا کہ یہ اپنی اصل حالت پر آگئی۔ پھر اسی طرح اسے بلا کر اسی امر کا اظہار کیا اور ابکی دفعہ بہت تیوریاں چڑھا کر کہا کہ:

"مجھ کو تم نے کچھ دیوانہ سمجھ لیا ہے جو میری بات کو اس کان سُن اس کان اُڑا دیتی ہو۔

کیا تم کو میری بیٹی بننا منظور نہیں؟

بہو: (غصہ کو دبا کر) بہت اچھا۔ میں اس کا جواب آپ کو دونگی لیکن ذرا سوچنے کے لئے مہلت کی خواستگار ہوں۔"

مرزا: "اچھا کیا مضائقہ ہے" کہتے ہوئے وہاں سے اُٹھ کر چلے ہوئے۔ افتخار بہو نے اپنے منصوبے پر کمر باندھنے کی فکر نہایت تنگی سے شروع کر دی۔ اور وہ منصوبہ یہ تھا کہ بڈھے میاں نے میری بڑی بلے ہوتی کی ہے بس اب یہی بہتر ہے کہ اپنی جان دیدوں اور سجاد سے جا ملوں۔

شام کو جب مرزا گھر میں آئے تو ایک کہرام مچا ہوا تھا۔ سجاد کی کھلائی بے تحاشا قدموں سے لپٹ گئی۔ چیخیں مار مار کے رونا شروع کر دیا۔

"مرزا: ارے کم بخت آخر کچھ منہ سے تو پھوٹ کر کیا غضب ٹوٹا ہے۔

ایک عورت: مرزا صاحب کیا کہا جائے۔ کچھ کہنے کی بات نہیں ہے۔
بہو صاحب نے افیم کھائی ہے۔

مرزا: ہائیں! افیم کھالی۔ سچ بتاؤ کیونکر کھائی، وہ کس بات پر کھائی۔

وہی عورت: میاں وہی جو آپ اُن پر خفا ہوئے تھے اُس پر کھالی۔

مرزا: ارے تو یہ افیم اس کو لا کے کس نے دی۔

وہی عورت: میاں آنکھوں کی دوا کے واسطے ایک آنے کی منگائی تھی اور منگایا ہی کرتی تھیں۔

مرزا: (زانو پیٹ کے) ہائے غضب ایک آنے کی کھالی جب بس خاتمہ ہے۔

یہ واقعہ سُن کر مرزا کے ہوش اُڑ گئے۔ اور اُلٹے پاؤں باہر بھاگے۔ اور تھوڑی دیر میں ایک حکیم صاحب کو لئے ہوئے آئے۔ پردہ کرا کے بہو کی نبض دکھائی۔ حکیم صاحب نے تشفی کی۔ کہ حالت زیادہ خراب نہیں ہے عجب نہیں جو یہ اچھی ہو جائیں۔

حکیم صاحب نے پے در پے قے اور دوائیں استعمال کرائیں جس کی وجہ سے صبح کے چار بجتے بجتے ہوش آ گیا۔ دوسرے دن شام کو بالکل صحت ہو گئی لیکن شرمندگی کی وجہ سے پندرہ بیس روز خسر کا سامنا نہیں کیا۔

بالآخر ایک دن مرزا صاحب نے خود ہی پھر اپنے سامنے بُلایا۔ اور کہا:-

مرزا- بیٹا میں جو اس معاملے میں زور دیتا ہوں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس وقت تک کئی پشتیں ہماری اس شہر میں گزریں لیکن بفضلہٖ شروع سے جو تلوار کی روٹی کھائی تو اب تک کھائی۔ اس وقت تک باپ دادا کی عزت میں فرق آنے نہیں دیا۔ آج تک کسی نے ہماری عورتوں کا سر اپا دیکھنا تو کیسا آواز تک نہیں سنی۔ دودھ پیتی لڑکی تک باہر نہیں نکلی بس اگر تمہاری وجہ سے ایک ایسے خاندان پر حرف آ جائے تو تم ہی کہو کہ پھر کیا کیا جائے؟

بہو: (ڈرتے ڈرتے) ابا جان کیا اس عورت کم بخت کی کچھ سزا بھی رکھی گئی ہے۔ جو ایسے پاک خاندان کی عزت مٹا دے؟ کیا وہ خاندان کسی کفارہ سے پاک بھی ہو سکتا ہے؟

مرزا- ہاں کیوں نہیں۔ اگر وہ قتل کروالی جائے تو اس خاندان کی عزت بچ سکتی ہے۔

بہو- (تھر تھر کانپتی ہوئی ہاتھوں کو جوڑ کے) تو بس ابا جان یہ آپ ہی کیجئے گا۔ اگر میرا قدم کبھی ڈگمگائے تو آپ اُسی وقت مجھ کو مار ڈالئے گا۔ اور اپنی عزت بچا لیجئے گا لیکن واسطہ خدا اور رسول کا یہ ظلم مجھ پر نہ کیجئے۔ ورنہ میں اپنی جان دے دوں گی یہ بے وفائی مجھ سے کبھی نہ ہوگی۔ کہ ان کے مقام پر کسی دوسرے کو قبول کروں۔

مرزا: خیر میں اپنی رائے بدلے لیتا ہوں۔ مگر یاد رکھو جس دن مجھ کو تمہارے چال چلن تمہاری وضع میں فرق ظاہر ہوا۔ اور کچھ رحم مجھے تم پر نہ آئے گا۔ اُسی دن تمہیں قتل کروا دوں گا۔

بس یہ سننا تھا کہ خسر کے قدموں سے لگ گئی۔ مرزا نے بھی بہو کے سر کو سینے سے لگا کے رونا شروع کیا۔ اس دن غم سجاد پھر تازہ ہو گیا۔

اب کسی قدر اطمینان سے افتخار بہو کی بسر ہونے لگی۔ مگر مرزا نے یہ انتظام کیا کہ رفتہ رفتہ سب گھر کی عورتوں کو نکال دیا۔ صرف ایک پکانے والی عورت کو رہنے دیا جس نے سجاد کے پوتڑے دھوئے تھے اور جو بہو کی نمک پروردہ نمک حلال عورت تھی۔ پھر اتنے بڑے مکان میں بہو کا نیچے رہنا مناسب نہیں تھا لہٰذا اسے کوٹھے پر اٹھا لے گئے۔ کوٹھے پر دو بُرج تھے، ایک میں خود رہا کرتے تھے۔ دوسرے میں بہو کا پلنگ بچھوا دیا تھا۔ اس بُرج کا وہ دروازہ جو سڑک کی طرف تھا اس پر لوہے کے سیخچے لگے ہوئے تھے۔ دن اور رات یہ دروازہ بند رہتا تھا۔ کبھی کبھی برسات میں جب برج ہی میں سونا ہوتا تھا، تو اُس کی وجہ سے رات کی رات وہ دروازہ کھول دیا جاتا تھا۔ کل ضروریات وہیں کوٹھے ہی پر موجود رہتی تھیں۔ بہو مہینوں نیچے نہیں اترتی تھی، بجز حوائج ضروری سے فارغ ہونے کے یا نہانے کے۔

اسی طرح پانچ برس گزر گئے۔ اس عرصے میں یہ ہوا۔ کہ محلے میں ایک شخص مسمّٰی میر عسکری حسین عرف میرن صاحب ایک امیر کی بیٹی پر عاشق ہوئے۔ اور اُن کے عشق نے یہاں تک سر کھینچا۔ کہ بالآخر ناکامی کے ساتھ جان دے دینا پڑی۔ اُن بیچارے کا امر ایسا طشت از بام ہوا۔ کہ شہر بھر میں شاید ہی کوئی مقام ایسا ہوگا۔ جہاں مہینوں صرف

افسوس کے ساتھ یہ حادثہ دہرایا نہ جاتا ہو۔ جو لوگ عاشق تن تھے اس واقعہ کو سُن کر آٹھ آٹھ آنسو روتے تھے۔ بیسیوں پردہ نشین باجا عورتیں جنہوں نے محبت کا مزہ تو کیسا ہنوز مفہوم تک نہیں سمجھا تھا۔ اُن کے دلوں میں اس کی وجہ سے مادہ عشق و عاشقی پیدا ہو گیا۔ صدہا پرانی محبتیں پھر تازہ ہو گئیں۔ بیسیوں مُردہ دل، مردہ مینڈکوں کی طرح پھر جی اٹھے۔

مرزا فدا حسین نے بہت کچھ اس بات کی کوشش کی تھی۔ کہ اس قسم کے تذکرے گھر میں نہ ہونے پائیں۔ وہ ہوتے ہی کیونکر اور کرتا ہی کون! اُن کی دُور اندیشیوں نے تمام گھر خالی کرا دیا تھا۔ ایک اِنی گِنی سجاد کی کھلائی گھر بھر میں رہ گئی تھی۔ اوّل تو وہ خود ہوشیار بڑھیا تھی۔ پھر مرزا کی سکھائی پڑھائی ہوئی۔ بھلا وہ کیا ایسے ذکر کرے گی۔ مگر اس کو کیا کیجئے کہ یہ واقعہ خاص ان ہی کے محلے میں ہوا تھا۔ میرن صاحب کی ماں کے بَین، اُن کی تڑپ، کنبہ بھر کا شور و ماتم آس پاس کے کوٹھوں کی آوازیں، اہلِ پہلو کے سوز و گداز، راہ چلتوں کی سرد آہیں، دن رات افتخار بہو کے کانوں تک پہنچتیں۔ سڑک پر لڑکے یہی کھیل کھیلتے اور ہر کسی سے بے پوچھے گچھے خود بخود بیان کرنے لگتے :-

"آپ نے سنا ایک میرن صاحب تھے۔ وہ جو اُن پر عاشق تھے جو ملیے میں آیا کرتی تھیں۔ جی ہاں اُنہیں پر عاشق تھے۔ ڈوب کے مر گئے۔ واللہ پوچھ لیجئے جس سے چاہے پوچھ لیجئے۔ میں جھوٹ تھوڑی کہتا ہوں۔ اچھا چلئے چلئے ہم اپنی اماں سے پچھوا دیں"

بھلا جہاں اس غضب کی تشہیر و تعمیم ہو۔ جس کو در و دیوار پکارتے ہوں وہ ایک متجسس طبیعت سے کیونکر چھپ سکتا ہے۔ یہ باتیں مہینوں اس کے کانوں میں پڑا کیں۔ اور اس کی وجہ سے اس کے امنگ بھرے نئی جوانی کے مالک دل میں چپکے چپکے ایک لاگ پیدا ہو گئی تھی لیکن وہ کچھ ایسے نرالے انداز کی تھی۔ جیسے وہ خود بھی نہ سمجھتی تھی۔ رفتہ رفتہ اس کی راتوں کی نیند اڑ گئی تھی۔ ہر وقت کا سوچ بڑھ گیا تھا۔ غذا ترک سی ہو گئی تھی۔

ایک رات کا ذکر ہے۔ کہ اپنے پلنگ پر پڑی ہوئی کچھ سوتی اور کچھ جاگتی تھی کہ یکایک اس غضب کی دل پکڑ لینے والی ایک آواز سڑک کی طرف سے آئی۔ کہ دل بے چین ہو گیا۔ از سر تا پا پسینہ آ گیا۔ سارے بدن کا خون گرم ہو گیا۔ تڑپ کے اٹھ بیٹھی۔ دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ لیا۔ حیران حیران ہر طرف دیکھنے لگی۔ کہ کس آسیب کی یہ جادو بھری آواز ہے جس نے میری یہ حالت کر دی۔ قریب تھا کہ دروازہ کھول کے دیکھے۔ مگر یکایک رک گئی۔ اور لاحول پڑھنے لگی۔ ادھر آواز بھی بند ہو گئی۔

تھوڑی دیر نہ گزری تھی۔ کہ وہی آواز پھر پیدا ہوئی۔ اور اب الفاظ بھی سُنائی دینے لگے۔ کوئی گا رہا تھا۔ پھر تو اس نے کان لگا دئے اور ساری دُنیا سے غافل ہو کے سننے لگی۔

صبح کے چار بج گئے تھے۔ سفیدی پھیلتی جاتی تھی۔ اس کو یہ بھی خیال نہ تھا کہ نماز کا وقت قریب آ گیا ہے۔ اٹھے اور وضو کا اہتمام کرے۔ یا یہ کہ بڑے میاں اب اٹھا چاہتے ہیں۔ مجھکو خلافِ عادت اس وقت تک پڑا ہوا دیکھیں گے تو ٹوکیں گے۔ اگرچہ معقول نہ ہوئی، تو شاید کچھ شک کریں۔ اس کی مطلق پروا نہیں۔ بس جہاں تک ہے اسی آواز کا خیال ہے۔ گانے والا گا رہا ہے :-

"تو سے آئے ہیں طلبگار چھوڑ دو نگری"۔

حضرات! کدو کی مردنگ اور نیبو کا مجیرا اور بالم کھیرے کا ناچ، اس بے سامانی کی محفل رقص پر اس کا دل ہے کہ پسا رہا ہے۔ دل ہے کہہ رہی ہے کہ کیا سچ مچ اس پکار پکار کے کہنے والے کو میں اپنا طلبگار ہی سمجھ لوں۔ اور چھوڑ دوں اس اُجڑی نگری کو۔ پھر کہتی ہے کہ ہائے نہیں معلوم وہ کس کے فراق میں اس وقت بے تاب ہو کے نکلا ہے۔ اور کس کو سنا رہا ہے۔ تو ہے کہ اپنی طرف لئے جاتی ہے۔ کاش یہ معلوم ہو جائے کہ اس کی نیت کیا ہے۔ وہ کس کو چاہتا ہے۔ کس کو بُلاتا ہے!

وہ تو اس سوچ بچار میں تھی اُدھر مرزا اٹھے۔ وضو کیا نماز پڑھی۔ مگر اس کو خاک خبر نہ ہوئی۔ نماز سے فارغ ہو چکے تو انہوں نے پلٹ کر بہو کو دیکھا۔ جو برج کے بند دروازے کی طرف کروٹ لئے بے خبر پڑی تھی۔

مرزا صاحب: ہائیں بیٹا۔ کیا آج نماز نہ پڑھو گی۔ اٹھو جلدی اٹھو۔ ابھی وقت ہے جلدی سے وضو کر ڈالو۔

بہو یہ الفاظ سنتے ہی اچھل پڑی۔ قریب بدحواسی کے حالت ہو گی، مگر اپنے کو سنبھالا۔ اور عذرِ بے خوابی خب کرتی ہوئی اٹھ بیٹھی۔ اور جلدی جلدی وضو کر کے کمرے کے اندر نماز پڑھنے کھڑی ہو گئی۔

اگرچہ نماز کی برکات نے کسی قدر اس کے دل کی کثافت کم کی۔ نیز اس کے بلک بلک کے رونے نے اور حفظِ آبرو کی دعا مانگنے نے بہت کچھ اس کو سنبھالا، مگر آنکھ پر وحشت سی آ گئی۔ سر پھر اس کے جو ایک بھوت سوار

ہو گیا تھا اس کی گرانی والم نے کسی طرح ساتھ نہ چھوڑا جس سے دن بھر یہ پریشان رہی۔ جملہ حرکات و سکنات میں فرق آگیا۔ نہ بھوک لگتی تھی نہ پیاس معلوم ہوتی تھی۔ نہ سینے پرونے میں جی لگتا تھا۔ نہ کسی کتاب سے مطلب نکلتا تھا۔ نہ قرآن پڑھے پڑھا جاتا تھا۔ وہ تو غنیمت ہوا کہ مرزا دن بھر گھر نہ رہے اور آئے بھی تو سرِ شام سے نہ آئے جیسا کہ معمول تھا ورنہ صورت دیکھتے ہی کھٹک جاتے۔

بہو چونکہ شب کو کھانا بہ سبب رانڈ ہونے کے نہیں کھاتی تھی، اس لئے نماز سے جوں توں فارغ ہو کے دیر سے اپنے پلنگ پر دراز تھی۔ سجاد کی کھلائی بڑے میاں کو کھانا کھلا کے اپنے مقام پہ جا کے پڑ رہی۔ مرزا صاحب کا حال معلوم نہیں کہ سو گئے یا ہنوز جاگتے ہیں لیکن یہاں یہ حال ہے کہ پلنگ پر پڑے پڑے دل سے باتیں ہو رہی ہیں کہ کیوں خداوندا۔ وہ کل کی آواز کون آواز تھی، کیا کسی بشر کی آواز تھی، نہیں ہرگز نہیں ضرور وہ کسی فرشتے کی آواز تھی جو ملک الموت سے اجازت لیکر میری جان لینے کو آئی تھی۔ ہائے پھروہ چلی کیوں گئی؟ مجھ کو لیتی کیوں نہ گئی؟ خداوندا کس آفت میں بیٹھے بٹھائے میں پڑ گئی۔ مجھے کیا ہو گیا؟

انتظار ہوا اسی ادھیڑ بن میں تھی کہ صبح کے چار بجے پھر وہی قیامت خیز وقت آگیا۔ اور وہی جادو بھری آواز دور سے سنائی دی کلیجہ دھک سے ہو گیا، گھبرا کے اٹھ بیٹھی۔ دل کی انجمن کا دورہ شروع ہو گیا۔ اور وہ دردناک آواز دور ہی سے لپک لپک کے موج ہوا پر اس کی طرف آنے لگی:

"آن پڑے ہم بیچ ساگر میں پت راکھو پت کے رکھوالو"

یہ ٹھمری رام کلی کی دھن میں تھی۔ اس نے خدا معلوم کس غضب کا سحر کیا۔ کہ وہ آپ سے باہر ہو گئی۔ بے تحاشا دروازہ کھول کے اس قیامت کی ملک سے سڑک کی طرف دیکھا کہ جس کو ہمارا قلم ہرگز آپ لوگوں پر حالی نہیں کر سکتا۔ اگر اس دروازے میں لوہے کی مضبوط سلاخیں نہ ہوتیں تو یقیناً وہ اپنے کو سڑک پر گرا دیتی لیکن ہائے افسوس دروازہ کھول کے اب جو دیکھتی ہے تو ایک حلال خور ہے جو سڑک پر جھاڑو دے رہا ہے۔ اور وہی ٹھمری اپنے نور کے گلے سے گا رہا ہے:

"آن پڑے ہم بیچ ساگر میں پت راکھو پت کے رکھوالو"

ناظرین آپ سمجھ سکتے ہوں گے کہ اس کے دل میں مہتر کو دیکھ کے کیا تغیر ہوا ہوگا۔ جو اس امر کا مقتضی تھا۔ کہ کیسی ہی وہ آواز نور کی آواز ہوتی لیکن اس کو نفرت ہو جاتی۔ پھر لوٹ کے نہ دیکھتی۔ دروازہ بند کر کے اپنے دل پر ہزار نفرینیں کرتی۔ اپنے عصمت کے تحفظ پر سو سو سجدے کرتی۔ مگر افسوس

اس کے حلال خور ہونے نے ایک ذرا بھی ضرر نہ کیا۔ پہلے جب اس کو یہ معلوم ہوا کہ ارے یہ تو حلال خور ہوا ہے تو ایک ذرا یونہی سی جھجکی اور لمحہ کے لمحہ سکوت ہوا۔ پھر فوراً ہی اس کے نفس نے تاویل کر دی۔ کہ اس کا حلال خور ہونا تو تیرے واسطے بہت ہی خوب ہے اس لئے کہ اگر کوئی شریف آدمی ہوتا تو شاید تیری اس طرح کی ہلوٹی کو پسند نہ کرتا۔ بلکہ نفرت کرتا۔ کبھی تیرا ساتھ نہ دیتا۔ بس اب دیکھتی کیا ہے۔ چل اور گھر سے نکل کے اس کے ساتھ ہو لے۔ ابھی میں کسی قدر سیاہی شب باقی ہے۔ جو تیری روسیاہی کو چھپا لے گی ورنہ بڈھا اب اٹھا ہی چاہتا ہے پھر کچھ نہ ہو سکے گا۔ یونہی کل کی طرح آج بھی تڑپ تڑپ کے رہ جائے گی۔ علاوہ اس کے یہی کب یقین ہو سکتا ہے کہ کل پھر یہ اس سڑک پر جھاڑو دینے آئے گا۔ ممکن ہے کسی دوسری طرف چلا جائے اس لئے کہ پہلے کبھی اس کی آواز نہیں سنی تھی۔

غرض دل سے یہ فیصلہ کر کے اس نے آہستہ سے برج کے دروازے کو بند کیا۔ اور چپکے سے گر گابی پہن کے اٹھی۔ اور دبے پاؤں ایک لوٹا لیتی ہوئی زینے کی طرف چلی۔ پیچھے مڑ مڑ کے دیکھتی جاتی تھی۔ کہ کہیں بڑے میاں تو نہیں اٹھ بیٹھے۔ آخر زینے تک پہنچ گئی۔ اور نیچے اتر گئی۔ صحن میں پہنچ کر چاہتی تھی کہ لوٹے کو وہیں پھینکے اور دروازہ کھول کے سڑک کا راستہ لے۔ کہ دفعتہً مرزا کی آنکھ کھل گئی۔ اور وہ اٹھ بیٹھے۔ اب جو سامنے آنکھ اٹھا کے دیکھتے ہیں۔ تو بہو کا پلنگ خالی۔ اور بہو ندارد۔ سمجھے کہ شاید نماز کو اٹھی ہوگی۔ یہ سوچ کے وضو کرنے کو اپنے برج سے نکلے۔ اور پانی لینے کی غرض سے گھڑوں اور ٹھلیوں کی طرف بڑھے۔ اب جو نظر پڑتی ہے تو کیا دیکھتے ہیں کہ بہو صحن میں لوٹا لئے ششدر کھڑی ہیں۔

مرزا: ہائیں اس وقت تم نیچے کیوں گئیں؟

بہو: ذرا رک کے) جی۔ دیر سے میں بے چین تھی۔ پیٹ میں درد تھا آخر نہ رہا گیا۔ گھبراہٹ میں جلدی کے مارے اکیلے ہی چلی آئی۔

مرزا: کیا کھلائی مر گئی تھی یا سانپ سونگھ گیا تھا جو تم نے آواز بھی نہ دی؟

بہو: کہتی تو ہوں کہ آواز میں نے دی تھی مگر جلدی کے مارے ان کا انتظار نہ کر سکی۔

مرزا: تو پھر تم وہاں کھڑی کیا کر رہی تھیں؟

بہو: جی کچھ نہیں۔ میں نے دیکھا کہ آپ وضو کے لئے اٹھے ہیں۔ اس وجہ سے میں یہیں کھڑی ہو رہی۔ کہ آپ نماز شروع کر لیں تو میں

بھی آکے وضو کر دوں۔

مرزا: خیر بہت اچھا اب اوپر جا کر وضو کرنا ہو تو کر لو۔

یہ کہہ کے مرزا صاحب تو وضو کر کے نماز کے لئے برج میں آگئے۔ اور نماز شروع کر دی۔ اب بہو کی سنئے۔ وہ اوپر آئی۔ لوٹے کو تو وہیں پھینکا۔ اور سسر کے برج میں آکر پلنگ کے سرہانے والے مونڈھے پر جو ہتھیار رکھے ہوئے تھے ان میں سے تلوار لیکر کھینچ لی۔ اور مرزا کی پشت پر چپکے کھڑی ہو رہی۔

مرزا نے سلام پھیرا۔ اب جو دیکھتے ہیں تو واہ واہ بہو صاحب تلوار بکف سر پر کھڑی ہیں۔

مرزا: (تلوار کی زد سے جست کر کے) او ناشدنی یہ کیا حرکت ہے؟ کیا تو مجھے مارا چاہتی ہے؟

بہو: استغفر اللہ۔ جل جائیں وہ ہاتھ جو آپ پر اٹھیں۔ یہ تلوار میں اپنی ہی سزایابی کے لئے کھینچے کھڑی ہوں۔

یہ سن کے مرزا صاحب کو ایک گونہ اطمینان ہوا اور بہو کے ہاتھ سے تلوار لے لی۔ بہو نے فوراً ہی سر جھکا دیا۔ کہ لیجئے بسم اللہ کیجئے میں خون اپنا معاف کرتی ہوں۔

مرزا: جب تک اصل واقعہ معلوم نہ ہوگا۔ مجھ سے تمہارا مارڈالنا ویسا ہی ناممکن ہے۔ جیسا کہ بعد تحقیق کسی فعل نا جائز کے تمہارا میرے ہاتھ سے بچ جانا۔ لہٰذا خاطر جمع رکھو اور پہلے سارا حال بیان کرو۔

بہو: یہ تو محال ہے کہ میں اصل واقعہ پورے طور سے آپ کے سامنے بیان کر دوں۔ لیکن اس قدر ضرور ظاہر کر دینا چاہتی ہوں کہ ابھی تک میں اپنے طریقہ خاندانی پر پوری پوری قائم ہوں۔ خدا کے فضل سے ابھی تک کوئی دھبا نہیں لگا ہے۔ مگر ساتھ ہی یہ بھی کہے دیتی ہوں کہ میرے خیالات ایک خاص وجہ سے کچھ ایسے پریشان اور فاسد ہو گئے ہیں کہ مجھے خوف ہے شاید میرے ثبات قدم میں فرق آجائے۔ لہٰذا آپ مجھے قتل کر کے اس دغدغے سے فراغت حاصل کیجئے۔ ورنہ آپ پچھتایئے گا پھر نہ کہئے گا کہ مجھے دھوکا دیا۔

مرزا: بے شک یہ بہت درست ہے۔ مگر وقوع واقعہ سے قبل صرف خیالِ جرم پر کسی کا خون کر ڈالنا یہ کون عمدہ بات ہے جو میں اس پر عمل کروں۔

بہو: دیکھئے ابا جان آپ نہیں مانتے۔ خیر اگر آپ مجھے نہیں مار ڈالتے تو للہ اس خدا کے مارے کو جو زہر دیوانگا رہا ہے ابھی ابھی جاکے مار دیجئے نہیں میں کہے دیتی ہوں کہ خدا کی قسم بہت پچھتایئے گا۔

یہ کلام سننا تھا کہ مرزا کے ہوش اڑ گئے۔ بہو کے تیور دیکھ کے سمجھ گئے کہ معلوم نہیں کیا آفت برپا ہونے والی ہے۔ چپ چاپ وہی تلوار لئے ہوئے نیچے اتر گئے۔ دروازہ کھول کے سڑک پر پہنچے اتنی دیر میں وہ سڑک ہی سڑک اسی طرح جھاڑتا بہارتا اور گاتا ہوا دو تین کھیت جا چکا تھا۔ یہ بھی اس کی آواز پر دوڑ پہنچے۔ اور پہنچتے ہی تلوار کے ایک ہاتھ میں اس کا سر اڑا دیا۔ پھر تلوار وہیں کی مٹی سے پونچھ میان میں کی۔ اور اپنے اس ظالمانہ بیجا اور وحشیانہ حرکت پر افسوس کرتے ہوئے گھر کو لوٹے۔

مرزا: لو بیٹا میں نے تمہاری فرمائش کے مطابق بے چارے بے دست و پا کو مار ڈالا یہی ایک ایسی حرکت مجھ سے ہوئی جو تمام عمر نہ ہوئی تھی۔ اب اگر مناسب ہو تو بتا دو کہ کیا مصلحت تھی۔

بہو: ابا جان کیا عرض کروں۔ بس کہہ تو چکی ہوں کہ اس کو کچھ نہ پوچھئے۔ باقی اس کو جو آپ نے قتل کیا۔ گویا مجھ کو زندہ کر لیا اب میں پھر آپ کو اپنی طرف سے ہر طرح کا اطمینان دلاتی ہوں۔ اور خدا سے امیدوار ہوں کہ وہ میری نیت اور ارادے میں برکت دے۔

اگر اس واقعہ کے تھوڑے ہی دن بعد مرزا کا انتقال نہ ہو جاتا تو اکی دفعہ بغیر نکاح کئے نہ چھوڑتے۔ ان کے مرتے ہی وہی بے چارے نواب جن کو بچا کے سجاد نے اپنی جان دی تھی، ان کو اپنے گھر اٹھا لے گئے۔ اور وہاں جا کے بڑے بڑے رشتے جوڑے گئے۔ کوئی خالہ کہنے لگا۔ کوئی پھوپھی کہہ کر پکارنے لگا کسی کی ماں بن گئیں۔ وہی مثل بکاؤلی والا فقرہ کہ ماموں جی جو بار۔ دلہن نے کہا۔ کہ اب تجھے کیا کھاؤں خاک کھاؤں بھلا کسی ماموں نے اپنے بھانجے کو کھایا ہو تو میں تجھے کھا لوں یہاں بھی یہی دلوار آڑے آگئی۔ زبردستی گھر بھر کی بزرگ بن گئیں۔ اور اس طرح بات رہ گئی۔

اس ناول کی ہیروئن ابھی تک اپنی کتاب زندگی کا ایک ایک ورق الٹ رہی ہے یہ ایک لمبے قد کی عورت ہیں۔ کتابی چہرہ۔ دبلے دبلے ہاتھ پاؤں ہیں آنکھوں میں نزول الماء ہو گیا ہے۔ جس سے کہ قدح کرانے پر بھی قطع نظر نہ ہو سکے۔ ہر وقت بے چاری آتشی شیشوں کی عینک لگائے رہتی ہیں۔ دانت بھی بے وفائی کر گئے۔ لیکن اوپر نیچے کی پانچ چار ڈاڑھیں ابھی تک ساتھ

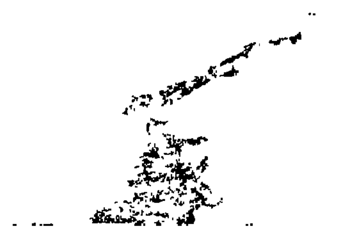
(باقی صفحہ ۲۵ پر)

رخت به کاشمر کشا کوه و تل و دمن نگر
سبزه جهان جهان ببین لاله چمن چمن نگر

تا نفتد به زینتش چشم سپهر فتنه باز
بسته به چهره زمین برقع نسترن نگر

لاله ز خاک بر دمید موج به آبجو تپید
خاک شرر شرر ببین آب شکن شکن نگر

اقبالؒ



وادیِ کشمیر
عمل: پروفیسر ایس، ایچ، عسکری

"اندر سبھا" کا فنّی پہلو

وقار عظیم

اندر سبھا بلاشبہ اردو کے ڈرامائی ادب کی سب سے اہم تصنیف ہے۔ ہمارے ڈرامے کی فنّی روایت کی ابتدا اسی اہم تصنیف سے ہوتی ہے اور اس روایت کے گوناگوں پہلو ڈرامے کی تاریخ کی تقریباً نصف صدی پر اس طرح چھائے ہوئے ہیں کہ ڈرامے کی ابتدا اور ارتقا کا کوئی جائزہ اندر سبھا کے جائزہ کے بغیر مکمل نہیں کہا جا سکتا۔ بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ اندر سبھا کو نظر انداز کر کے اردو ڈرامے کے متعلق کسی طرح کی گفتگو کی کوشش ایک طرح کی ناانصافی بھی ہے اور زبردستی بھی۔ لیکن جب اندر سبھا کو پڑھنے والا اس کتاب پر طالب علمانہ نظر ڈالتا اور اس کے فنّی پہلوؤں یا دوسرے الفاظ میں اس کی فنّی روایت کی جستجو کرنے لگتا ہے تو فن کے نقطۂ نظر سے اس کے سامنے بہت سی باتیں آتی اور اس کے ذہن میں طرح طرح کے سوال پیدا کرتی ہیں۔

اندر سبھا کے بالکل ابتدائی حصوں کا مطالعہ کرنے کے بعد ہی کم از کم یہ بات تو واضح ہو جاتی ہے کہ اندر سبھا ایک خاص طرح کی محفل میں پیش کرنے کے خیال سے لکھی گئی تھی اور اس محفل میں شریک ہونے والوں کی دلچسپی، تفریحِ طبع اور نشاطِ خاطر کا جو سامان فراہم کیا گیا تھا اس میں نمایاں اہمیت موسیقی کو دی گئی تھی۔ گانے اور ناچنے کے زیادہ سے زیادہ موقعے پیدا کرنے اور ان میں کسی نہ کسی طرح کا ربط و آہنگ پیدا کرنے کے لئے قصّہ کو بھی "سبھا" میں ایک جگہ دی گئی ہے، لیکن یہ جگہ محض ثانوی ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اندر سبھا کے مصنّف نے ناچ گانے کی جو محفل ترتیب دی ہے اس کا انداز کیا تھا۔ اسی انداز کا دوسرا نام "فن" ہے۔ فن کے نقطۂ نظر سے سب سے پہلا سوال یہی ہے کہ اندر سبھا کی محفل کا انداز و قرینہ کیا تھا۔ فن کے دوسرے پہلو اس سوال کے ساتھ منسلک اور وابستہ ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ اندر سبھا کے سرسری مطالعے سے اس سوال کا کوئی جواب ملتا ہے یا نہیں۔ یا یہ کہ اگر اس سوال کا جواب نہیں ملتا تو کیا یہ سرسری مطالعہ ہمیں کچھ ایسے نتائج اخذ کرنے میں مدد دیتا ہے جو فن کے مطالبات کی وضاحت و صراحت کرتے ہیں۔

"اندر سبھا" ایک مخصوص انداز کی بزم آرائی ہے جسے ہم اپنی آسانی کے لئے ایک خاص انداز کے اسٹیج کی ترتیب بھی کہہ سکتے ہیں۔ ہماری کوشش یہ ہے کہ اندر سبھا پر شروع سے آخر تک ایک نظر ڈال کر یہ نتیجہ نکالیں کہ اندر سبھا جیسی کچھ بھی ہمارے سامنے موجود ہے اس سے اسٹیج کی کیا شکل بنتی ہے اور اس شکل کو دیکھ کر ہم فنّی نقطۂ نظر سے کن کن الجھنوں میں مبتلا ہوتے ہیں۔

آیئے، اس "سبھا" کی سیر اس خاص نظر سے کریں۔

سبھا کا آغاز سات شعر کی اس غزل سے ہوتا ہے جس کا مطلع ہے ؎

سبھا میں دوستو اندر کی آمد آمد ہے
پری جمالوں کے افسر کی آمد آمد ہے

یہ الفاظ ظاہر ہے کہ راوی کے ہیں۔ جو محفل میں بیٹھے ہوئے لوگوں کو اندر کی آمد کی خبر دے رہا ہے۔ اس خبر میں آگے چل کر یہ نوید جاں فزا بھی سنائی گئی ہے کہ ؏

زمیں پہ آئیں گی راجہ کے ساتھ سب پریاں

اور یہ کہ ان پریوں کا گانا غضب کا اور ناچ قیامت کا ہے ؏

غضب کا گانا ہے اور ناچ ہے قیامت کا

اس ابتدائی تعارف کا ایک مصرع اہلِ بزم کے اندازِ نشست کی طرف بھی اشارہ کر رہا ہے۔ راوی راجہ کی مختصر سی مدح کے بعد سامعین سے کہتا ہے کہ ؏

دو زانو بیٹھو قرینے کے ساتھ محفل میں

اس ابتدائی غزل سے اسٹیج کی جو مبہم سی تصویر نظر کے سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ ایک فرشی نشست آراستہ ہے، جس میں اندر اور اس کی پریوں کے مشتاق ناچ دیکھنے اور گانا سننے کے منتظر بیٹھے ہیں۔ محفل میں نہ جانے کدھر سے ایک شخص آجاتا ہے اور انہیں راجا اندر اور اس کی پریوں کے آنے کی خوش خبری دیتا ہے۔ یہ شخص جسے ہم راوی کہہ سکتے ہیں محفل میں کدھر سے آیا، کدھر سے نہیں اس کا اندر سبھا پڑھنے والے کو کوئی علم نہیں ہوتا۔

جن لوگوں نے نوٹنکی اور رہس کے اسٹیج دیکھے ہیں اور جنہیں معلوم ہے کہ اندر سبھا اسی علاقہ کی ایک چیز ہے جہاں نوٹنکیاں اور رہس گاؤں اور شہر میں بہت عام اور خاصے مقبول تھے، اور محلہ ٹولے والے اپنے گھروں سے کچھ تخت اور چوکیاں لاکر اور ان کے نیچے اینٹیں اور روڑے لگا کر ایک ایسی ہموار سطح بنا لیتے تھے جس پر نوٹنکی اور رہس کے کردار اور سامعین و ناظرین ایک گھیرا سا بنا کر بیٹھ جاتے تھے اور راوی کے تعارف کے بعد جس کردار کی باری ہوتی تھی وہ وہیں سے کھڑا ہو کر اپنا پارٹ ادا کرتا تھا اور پھر وہیں بیٹھ جاتا تھا۔ اندر سبھا کی یہ ابتدائی غزل پڑھ کر بھی نوٹنکی اور رہس کے اسی ابتدائی اسٹیج کا نقشہ نظر کے سامنے آتا ہے، اس میں ایک طرح کے قرینے اور خوش سلیقگی کی جھلک البتہ دکھائی دیتی ہے۔

راوی اپنا کام ختم کر چکتا ہے تو راجا اندر سامعین کے سامنے آتا ہے اور اپنے حسب حال چند شعر پڑھتا ہے۔ راوی اپنی بات کہہ کر کدھر گیا اور اندر کدھر سے آیا، اس کا اندازہ اندر سبھا کے مطالعہ سے نہیں ہوتا۔ راجا اندر کے شعروں سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ وہ دیوؤں سے محفل سجانے کو کہتا ہے اور پھر اپنی اس خواہش کا اظہار کرتا ہے کہ میں آج یہاں جلسہ کردوں گا — جاؤ، پریوں کو جلدی سے بلا کر لاؤ۔

راجا اندر کے اس حکم پر دیو کیا کرتے ہیں، کیا نہیں کرتے، کہاں جاتے ہیں، کدھر سے جاتے ہیں — اس کا کوئی اشارہ اندر سبھا میں موجود نہیں — بس جو کچھ ہے وہ یہ ہے کہ راجا کے اس حکم کے ساتھ ہی پریاں آئیں اور محفل میں مجرا کریں، راوی پھر محفل میں آجاتا ہے اور پکھراج پری کی آمد کی خبر اس طرح سناتا ہے ؂

محفلِ راجہ میں پکھراج پری آتی ہے

جن چار شعروں میں پکھراج پری کی آمد کی خبر سنائی گئی ہے۔ ان میں اس کے حسن و ناز کی طرف بھی بعض اشارے ہیں۔ اس کے فوراً بعد پکھراج پری سامنے آجاتی ہے اور اپنی تعریف میں نو شعر پڑھتی ہے اور راجہ کو دعا دے کر گانا شروع کر دیتی ہے — پہلے ایک ٹھمری گاتی ہے، پھر ایک بسنت، پھر غزل بسنت اور اس کے بعد علی الترتیب ایک ہولی اور تین غزلیں۔ پکھراج پری یہ سات چیزیں گا چکتی ہے تو راجا اندر اس کی تعریف کرتا ہے، اور اس سے کہتا ہے کہ تو آکر میرے پہلو میں بیٹھ جا۔

اب نیلم پری کی باری ہے۔ ظاہر ہے کہ پکھراج پری نے اس حکم کی تعمیل کی ہوگی، لیکن اندر سبھا میں ایسا کوئی اشارہ نہیں جس سے اس قیاس پر یقین کی مہر ثبت کی جاسکے۔ محفل کا یہ انداز یوں ہی جاری رہتا ہے۔ پکھراج پری کے بعد نیلم پری آتی ہے، پھر لال پری اور پھر سبز پری۔ نیلم پری اور لال پری کا تعارف راوی اسی طرح کراتا ہے جس طرح پکھراج پری کا تعارف ہوا ہوتا ہے، دونوں پریاں محفل میں آتی ہیں تو خود اپنے حسب حال کچھ شعر پڑھ کر کئی کئی چیزیں گاتی ہیں اور اپنی اپنی باری پر ناچنے گانے کے بعد راجہ اندر کی خواہش پر اس کے پاس جا کر بیٹھ جاتی ہیں۔

لال پری کے بعد سبز پری محفل میں آتی ہے۔ اس کا تعارف ہوتا ہے، خود اپنے حسب حال وہ کچھ شعر پڑھتی ہے لیکن اس دوران میں راجا کو نیند آجاتی ہے، اس پر سبز پری کہتی ہے ؂

راجہ جی تو سو گئے دیا نہ کچھ انعام
جاتی ہوں میں باغ میں یاں میرا کیا کام

دوسرے مصرعے کے بعد کیا ہوا، کیا نہیں ہوا، سبز پری باغ میں گئی یا نہیں گئی۔ اس کا اندازہ کسی بات سے نہیں ہوتا، البتہ اس شعر کے فوراً بعد ہی قصہ کا آغاز ہو جاتا ہے۔

سبز پری کالے دیو سے کہتی ہے کہ میں جب راجہ کے پاس آرہی تھی تو میں نے ایک بام پر ایک شہزادے کو سوتے دیکھا۔ اس کا "میوہن" دیکھ کر میری جان نکل گئی۔ میں کلیجے پر تیر کھا کر نیچے اتری۔ اس کی صورت دیکھ کر میرا دل بے قرار ہو گیا اور میں نے اس کے منہ پر منہ رکھ کر خوب پیار کیا —————

اب میرا حال یہ ہے کہ میرا جی محفل میں بالکل نہیں لگتا، اس لئے تو اگر شہزادہ کو اٹھا لائے تو میں تیری لونڈی

ہو جاؤں [1]

اس پر کالا دیو سبز پری سے شہزادے کا اتا پتا پوچھتا ہے، وہ اُسے بتا سمجھاتی ہے۔

سبز پری اور کالے دیو کا یہ مکالمہ ادبی حیثیت سے بڑا معمولی ہے۔ مصرعوں میں نہ الفاظ کا انتخاب بہت اچھا ہے اور نہ ان کی ترتیب درست ہے لیکن جو چیز پڑھنے والے کو سب سے زیادہ کھٹکتی ہے یہ ہے کہ سبز پری کے کالے دیو کو شہزادہ کا پتا بتانے اور کالے دیو کے شہزادے کو لے کر آجانے میں ایک لمحہ کا وقفہ بھی نہیں —— یعنی ہماری داستانوں اور معمولی قصوں کی طرح اندر سبھا بھی زمان و مکان کے تصور سے قطعی عاری و ناآشنا ہے۔ اس اعتراف کے باوجود کہ دیو اور پریاں غیر معمولی فوق الفطرت قوتوں کے حامل ہیں اور زمان و مکان کا فعل ان کی اِن قوتوں کی بدولت بالکل بے حقیقت اور بے معنی بن کر رہ جاتا ہے، پڑھنے والا یہ کسی طرح بھی یقین نہیں کر سکتا کہ کالا دیو سبز پری کے منہ سے آخری بول سُنتے ہی پرستان سے سنگل دیپ (اختر نگر) پہنچ جاتا ہے اور شہزادہ کو تلاش کر کے آن کی آن میں سبز پری کے پاس لے آتا ہے۔ قیاس کہتا ہے کہ کالے دیو کو شہزادہ تک پہنچنے اور اُسے اٹھا کر لانے میں کچھ دیر ضرور لگی ہوگی —— سوال یہ ہے کہ اس وقفہ میں سبھا یا محفل میں (یا یوں کہیے کہ اسٹیج پر) کیا ہوتا رہا؟ یہ ایک معمہ ہے۔ بہرحال اب اور آگے چلئے۔

کالا دیو شہزادے کو سبز پری کے پاس پہنچا دیتا ہے اور سبز پری کہتی ہے کہ ہاں "میری جان اور میرا دلدار یہی ہے"۔

اس کے بعد سے اندر سبھا میں جتنے عنوان آتے ہیں اُن میں ہر جگہ ہلکے ہلکے اشارے ایسے موجود ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ مصنف نے حرکات و سکنات کے سلسلہ میں ان کی رہنمائی کی ہے اور وہ چاہتا ہے کہ [1] کردار جو کچھ کریں یا جو کچھ کہیں اس سے اُن کے جذبات کا بھی اندازہ ہو اور دیکھنے والوں کے لئے کسی نہ کسی تاثر کے حاصل کرنے کا موقع بھی فراہم ہو۔ اس مقام کے بعد جتنے عنوان آتے ہیں اُن پر ایک نظر ڈال لیجئے تو اس بات کی وضاحت ہو جائے جو میں کہہ رہا ہوں:——

۱- جگانا سبز پری کا، شہزادہ کو شانہ ہلا کر
۲- جاگنا شہزادہ کا، عالمِ حیرت میں بے تاب ہو کر
۳- گانا شہزادہ کا، عالمِ حیرت میں بے تاب ہو کر
۴- کہنا سبز پری کا لال دیو سے، عالمِ یاس میں
۵- پوچھنا راجہ اندر کا لال دیو سے غضب ناک ہو کر
۶- جانا لال دیو کا پاس گلفام کے اور پوچھنا طیش کھا کر
۷- لانا لال دیو کا گلفام کو کھینچ کر
۸- عرض کرنا گلفام کا راجہ اندر سے عالمِ ہراس میں
۹- عرض کرنا سبز پری کا راجہ اندر سے اور نادم کرنا گلفام کو اور رونا گلے لپٹا کر
۱۰- نکالنا سبز پری کو اکھاڑے سے پر نوچ کر
۱۱- جواب جوگن کا طرف کالے دیو کے اور طعن آمیز گانا دیٹ کرنا بعد اس کے۔

ان سب مثالوں سے یہ بات صاف طور پر سامنے آتی ہے کہ مصنف چاہتا ہے کہ محفل میں (یا اسٹیج پر) کردار جو کچھ کہیں یا کریں اس میں اُن کے جذبات و احساسات کی کیفیت نمایاں ہو اور اس کیفیت کا اظہار حرکات و سکنات سے ہوتا ہے۔ اسٹیج پر حرکات و سکنات کی جو اہمیت ہے، اگر مصنف کو اس کا احساس نہ ہوتا تو وہ عنوانات میں اس طرح

---

[1] اندر سبھا میں یہ سب باتیں اس طرح ادا ہوئی ہیں ؎

سن رے کالے دیو رے تو اک میری بات	آئی تھی راجہ کے گھر میں جو میں آج کی رات
شہزادہ اک بام پر سوتا تھا تا داں	جبیں اس کا دیکھ کر نکلی میری جان
اتری اپنے تخت سے تیر کلیجہ کھا	سوتا وہ بے خبر تھا ہاتھ پاؤں پھیلا
صورت اس کی دیکھ کر دل سے گیا قرار	منہ پہ منہ میں نے رکھا، خوب سا کیا پیار
دل میرا لگتا نہیں محفل کے درمیان	قالب میرا ہے یہاں، واں ہے میری جان
اُس کو گر تو لا اٹھا جلدی جا کر یار	لونڈی میں ہو جاؤں گی تیری بے تکرار

کے اشارے دینے کو ضروری نہ جانتا۔ اندر سبھا کے عنوانات میں ان اشاروں کی موجودگی کو اردو ڈرامے میں اسٹیج کی ایک ضروری اور ناگزیر روایت کا آغاز سمجھنا چاہیئے۔

اندر سبھا میں جس جگہ سے قصہ شروع ہوتا ہے بعض باتیں اور بھی ایسی آتی ہیں جنہیں ڈرامے کے فن کے ضروری اجزا سمجھا جاتا ہے ——— اور اندر سبھا کے مصنف نے ان باتوں کو اردو میں برت کر انہیں اردو ڈرامے کی روایت کا جزو بنایا۔

اس سلسلہ کی پہلی بات تو یہ ہے کہ کہانی کے کردار آپس میں جو باتیں کرتے ہیں ان سے کہانی سننے اور دیکھنے والے کو بعض ایسی چیزوں کا علم ہوتا رہتا ہے جن کی مدد سے کہانی ان کے لئے دلچسپ بھی بنتی ہے اور آہستہ آہستہ آگے بھی بڑھتی ہے۔ ان مکالموں میں کبھی کبھی ایسی چیزیں بھی آجاتی ہیں جن سے سامع اور ناظر کا اشتیاق بڑھتا ہے اور وہ سوچتا ہے کہ دیکھئے اب کیا ہو —— ۔ شہزادہ گلفام اور سبز پری کی گفتگو اور ان کے سوال جواب اسی انداز کے ہیں۔

دوسری بات جو ڈرامائی نقطۂ نظر سے کسی طرح پہلی بات سے کم اہم نہیں یہ ہے کہ کردار مختلف موقعوں پر جو گانے گاتے ہیں وہ مجموعی حیثیت سے کردار کے جذبات اور دلی کیفیات کے ترجمان بھی ہوتے ہیں اور ایک خاص طرح کے ماحول سے ذہنی و جذباتی ہم آہنگی پیدا کرنے میں سامع و ناظر کے لئے مد ثابت ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر شہزادہ گلفام کا وہ گانا پیش کیا جا سکتا ہے جو اس نے بقول مصنف "حالت اضطرار میں" گایا تھا۔

ایک تیسری بات جو پڑھنے والے کو واضح طور پر محسوس ہوتی ہے یہ ہے کہ اندر سبھا کا مصنف مثنوی کی عام مقبولیت سے متاثر ہے اور خصوصاً مثنوی میر حسن کے قبول عام نے اسے اس بات پر مجبور کیا ہے کہ وہ جب سبز پری کو جوگن کا بھیس دے تو اس کا رنگ روپ مثنوی میر حسن والی جوگن سے ملتا جلتا ہو۔ گلفام کو چاہِ قاف میں قید کرنے کا تصور بھی قیاس کہتا ہے کہ مثنوی گلزار نسیم کے اس حصہ سے لیا گیا ہے جس میں بکاؤلی کے قید ہونے کا مذکور ہے۔ اس طرح دل میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ اندر سبھا کی محفل آراستہ کرنے اور اس میں قصے کے اجزا شامل کرتے وقت امانت کے سامنے مثنوی کا فنی تصور موجود تھا۔ اور یوں گویا ایک طرف مثنوی اور دوسری طرف رہس اور نوٹنکی دو ایسی چیزیں ہیں جنہوں نے امانت کو ایک ایسی کہانی کا خاکہ مرتب کرنے میں مدد دی جو پڑھنے کے لئے نہیں بلکہ محفل میں (یا اسٹیج پر) پیش کرنے کے لئے ہو۔ اور جب ذہن میں یہ تصور قائم ہو گیا کہ جو لکھا جا رہا ہے وہ پڑھنے کے لئے نہیں بلکہ اسٹیج پر پیش کرنے کے لئے ہے تو اس سے وہ چند باتیں پیدا ہوئیں جنکی طرف ابھی اشارہ کیا گیا ہے اور جنہیں اردو کے اسٹیج ڈرامے کی روایت کے بنیادی عناصر سمجھنا چاہیئے ——— اگر ان کہی ہوئی باتوں کو دہرانے میں کوئی مضائقہ نہ ہو تو یوں سمجھیئے کہ مکالمے کے ذریعے جذبہ اور احساس کا اظہار، مکالمہ کی مدد سے قصہ کے بعض اجزا کی وضاحت قصہ کو آگے بڑھانا، دیکھنے والوں کے اشتیاق کا سامان پیدا کرنا اور عنوانات میں کرداروں کو یہ بتانا کہ وہ اپنی حرکات و سکنات سے اپنے جذبات و احساسات کا کس طرح اظہار کریں اور کس طرح داخلی کیفیت اور خارجی اظہار کو ہم آہنگ بنائیں اس روایت کی کڑیاں ہیں۔

اندر سبھا کا مطالعہ ہمیں فن کی حیثیت سے اس سے آگے نہیں لے جاتا۔ وہ اسٹیج کی ظاہری صورت کا کوئی واضح تصور قائم کرنے میں ہماری کوئی رہنمائی نہیں کرتا، زمان و مکان کے وقفوں کی پیچیدگیوں کو حل کرنے کے بجائے وہ انہیں اور زیادہ الجھا دیتا ہے۔ کرداروں کے لباس اور وضع قطع کے بارے میں بھی اس میں صرف چند مبہم اشارے ہیں اور اس لئے اندر سبھا کو اردو کے اسٹیج ڈرامے کی روایت کا پہلا غیر فانی نقش کہنے والا شاعرانہ مبالغہ کا مجرم ٹھیرتا ہے۔ لیکن یہ ساری مشکلیں خود امانت نے حل کر دی ہیں۔ اندر سبھا کی تصنیف کے ساتھ ساتھ انہوں نے "شرح اندر سبھا" کے نام سے ایک رسالہ بھی تصنیف کیا اور اندر سبھا کے پہلے ایڈیشن کے ساتھ سنہ ۱۲۷۰ھ میں یہ بھی شائع ہوا تھا۔ شرح اندر سبھا میں امانت نے اندر سبھا کی تصنیف اور اس کے اسٹیج کئے جانے کے سلسلہ میں اتنی تفصیلی بحث کی ہے کہ جو فنی سوالات اندر سبھا کے متعلق پڑھنے والے کے سامنے آتے ہیں، اور وہ الجھنیں جو اندر سبھا پڑھ چکنے کے بعد اس کے فن کے متعلق ذہن میں پیدا ہوتی ہیں، شرح اندر سبھا کے مطالعے سے ان سب کا جواب اور حل مل جاتا ہے۔

"شرح" کے ابتدائی حصہ میں حمد، نعت، منقبت اور بادشاہ وقت کی مدح کے بعد اندر سبھا کا سبب تالیف بیان کیا ہے اور ہمیں بتایا ہے کہ یہ کتاب انہوں نے اپنے ایک دوست مرزا عابد علی عبادت کے کہنے سے لکھی۔ شوال کی چودھویں تاریخ ۱۲۶۸ھ کو اندر سبھا کی تصنیف

شروع ہوئی اور اس کی تکمیل میں ڈیڑھ برس لگا۔[1]

اس تمہید کے بعد شرح اندر سبھا شروع ہوتی ہے۔ یوں تو اندر سبھا کے سمجھنے، اس کے فنی مرتبہ کا اندازہ لگانے اور اسے اسٹیج کرنے کے لئے شرح کا ایک ایک لفظ پڑھنا ضروری ہے اور اس کے مکمل مطالعہ کے بغیر اندر سبھا کی صحیح حیثیت کا اندازہ لگانا ناممکن ہے لیکن اس کا ابتدائی حصہ خاص طور پر اہم اور دلچسپ ہے۔ ابتدائی حصہ کی عبارت ملاحظہ کیجیے:

"جب ساری محفل لوگوں سے بھر جاتی ہے اور آدھی رات آتی ہے، ہر شخص قرینے سے پیچھے ہٹایا جاتا ہے۔ آگے کرسیاں رکھی جاتی ہیں، تخت بچھایا جاتا ہے .... سازندے محفل کی آ کر کھڑے ہوتے ہیں۔ ساز ملا کر دو رمینوں کے ہوش کھوتے ہیں۔ سُرخ پردۂ زرتار مثل لکۂ شفق گلنار محفل میں تانا جاتا ہے۔ راجا اندر پردے کے پیچھے آ کر ٹھہر ٹھہر کر گھنگھرو بجاتا ہے۔ سارنگی چکارے سے ملائی جاتی ہے۔ اور اس طرح گائی جاتی ہے ؎

سبھا میں دوستو اندر کی آمد آمد ہے
پری جمالوں کے افسر کی آمد آمد ہے

جب آمد تمام ہوتی ہے، پردہ اٹھتا ہے، مہتاب چھٹتی ہے۔ راجا اندر خلعت فاخرہ زیب بر، کلاہ زریں برسر، کمر میں دوپٹہ زرتار یا رومال آنچل دار باندھے ہوئے، دو دیو راس و چپ شکل عجیب، چہرے مہیب، دہانے کھلے ہوئے، دانت بڑے بڑے، چپٹی ناک، ہاتھوں میں گرز، بدن میں تنگ پوشاک، محفل پر ہیبت کی نگاہ، ایک کا رنگ سُرخ، ایک کا سیاہ، راجا ہمراہ لے کر محفل میں آتا ہے، چو بولا اپنے حسب حال گاتا ہے، ناچ کا انداز دکھاتا ہے، گھنگھرو تال پر بجاتا پھر صاحبِ محفل کو سلام کر کے تخت پر بیٹھ جاتا ہے۔ پکھراج پری کو یاد فرماتا ہے۔ ایک دیو پیچھے کھڑا رہتا ہے، دوسرا پری کے لینے کو جاتا ہے۔ پھر پردہ تنتا ہے، ساز ملائے جاتے ہیں آمد کے شعر اس طرح گائے جاتے ہیں ؎

محفل راجہ میں پکھراج پری آتی ہے

....

جب آمد گائی جا چکتی ہے، پردہ اٹھتا ہے، مہتاب چھٹتی ہے۔ پکھراج پری، ناز کی بھری اس انداز سے گت ناچتی ہوئی نکلتی ہے کہ عاشق مزاجوں کی بُری گت بنتی ہے .... چینی جوڑا بھاری بیل ٹکا گوکھرو کرن کی تیاری اس چمک دمک کی، اس کے پَر میں ہے کہ چکا چوند ستاروں کی نظر میں ہے۔ زردوزی پر اس طرح تیاری کے سانچے میں ڈھلے ہیں کہ بازو اُڑ چلے ہیں۔ گاتی کا دوپٹہ چمک میں برق ہے، کلاہ زریں بالائے فرق ہے .... جب سنہری پشواز کا دامن توڑوں کے چکر میں ہل جاتا ہے، گویا محفل میں گیندے کا تختہ کھل جاتا ہے۔ سازندوں میں کھڑے ہو کے، ایک پاؤں ناز سے آگے دھرتی ہے، اس طرح اپنے حسب حال شعر خوانی کرتی ہے ؎

گاتی ہوں میں اور ناچ سدا کام ہے میرا
آفاق میں پکھراج پری نام ہے میرا

شعر خوانی تمام کر کے چھند کہتی ہے، چھند کے بعد ٹھمری گاتی ہے، ٹھمری کے بعد ہولی کی فصل میں ہولی، نہیں تو غزلیں گاتی ہے۔

---

[1] جن الفاظ میں عابد علی عبادت نے امانت کو اندر سبھا لکھنے پر آمادہ کیا وہ یہ ہیں:

"بیکار بیٹھے بیٹھے گھبرانا عبث ہے۔ ایسا کوئی جلسہ کے طور پر طبع زاد نظم کیا چاہیے کہ دو چار گھڑی دل لگی کی صورت ہووے اور خلق میں مقبولیت ہووے۔"

اس عبارت میں جلسہ کا لفظ قابل توجہ ہے ۔۔ امانت نے اس جلسہ کی تالیف و تکمیل کے سلسلے میں شروع میں جو الفاظ لکھے ہیں وہ یہ ہیں:

"چودھویں تاریخ شوال کی ۱۲۶۸ھ میں اندر سبھا اس جلسہ کا نام رکھ کر بجائے چہار باب چار پریاں قرار دے کر شروع کیا۔ ڈیڑھ برس میں جلسہ تیار ہوا۔"

لفظ جلسہ بظاہر ناٹک کے مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔

ناچ کا رنگ دکھاتی ہے۔ محفل کو وجد میں لاتی ہے۔ راجہ اندر محظوظ ہو کر کچھ فقرے زبان پر لاتا ہے، پکھراج پری کو اپنے پاس بلا کے پہلو میں بٹھاتا ہے۔ نیلم پری کو یاد فرماتا ہے۔ دیو لینے کو جاتا ہے۔"

شرح اندر سبھا کے اس ابتدائی حصہ سے اندر سبھا کی اسٹیج کی ایک واضح تصویر بھی ہمارے سامنے آ جاتی ہے اور اس کا بھی اندازہ ہو جاتا ہے کہ اسٹیج کی جو ہدایات امانت نے اندر سبھا کے عنوانات میں اشاروں کی صورت میں دی ہیں ان کی تکمیل شرح کی تفصیلات کے ذریعہ ہوتی ہے۔ ابتدائی حصہ کے الفاظ پڑھ کر اسٹیج کی ظاہری ہیئت کے متعلق ہم آسانی سے مندرجہ ذیل نتیجے نکالتے ہیں:

(۱) اندر سبھا کا یہ جلسہ تھوڑے سے فرق کے ساتھ لکھنؤ کے امرا کی محفلِ رقص یا مجرے سے ملتا جلتا ہے کسی کشادہ جگہ میں (محل سرا کے اندر یا باہر) مکلف فرش بچھایا جاتا ہے۔ چاروں طرف گاؤ تکیے لگائے جاتے ہیں اور اہل محفل ان تکیوں سے ٹیک لگا کر بیٹھ جاتے ہیں۔ مجرا شروع ہونے سے پہلے سازندے محفل کے درمیان میں آتے ہیں۔ مجرا شروع ہونے سے پہلے ساز ملائے جاتے ہیں اور پھر رقاصہ اپنے اندازِ خاص سے رقص و سرود کا کمال دکھاتی ہے ـــــ بالکل یہی صورت اس جلسہ کی ہے۔ یہاں بھی اہل محفل کے بیٹھنے کا انداز اور قرینہ وہی ہے جو رقص و سرود کی محفلوں میں ہوتا ہے ـــــ امانت کے تخیل اور تصور نے اس میں بعض رنگ البتہ نئے شامل کئے ہیں محفل میں کرسیاں رکھی جاتی ہیں دو تخت بچھایا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ انتظام اندر اور اس کی پریوں کے لئے ہے۔ دوسری خاص چیز پردہ کا ذکر ہے۔ سُرخ پردہ تانا جاتا ہے اور آمد کے ختم ہوتے ہی اٹھتا ہے اور مہتاب چھٹتی ہے۔ یہ دونوں چیزیں اندر سبھا کے جلسہ کو محفل اور اسٹیج کے درمیان کی ایک چیز بنا دیتی ہیں۔

(۲) راجہ اندر اور پکھراج پری کے لباس کی جو تفصیلات شرح میں بیان کی گئی ہیں وہ اتنی واضح ہیں کہ انہیں اسٹیج پر لانے سے پہلے اس لباس میں ملبوس کرنا آسان ہے۔

(۳) دیووں کے متعلق اندر سبھا کے ابتدائی حصہ میں جو باتیں کہی گئی ہیں وہ اس قدر غیر واضح ہیں کہ انہیں اسٹیج پر لانے کے لئے ہدایت کار کو اپنی ذہانت تصور اور تخیل کے سوا اور کسی چیز سے مدد نہیں ملتی شرح میں ان کا حلیہ بھی اچھی طرح بیان کیا گیا ہے اور ان کی جگہیں بھی صحیح طریقہ پر متعین کی گئی ہیں۔ یہ بات بھی صاف کر دی گئی ہے کہ دیووں کی تقسیم کار کیا ہوگی، کون راجہ کی سبھا میں موجود رہے گا اور کون راجہ کے حکم پہنچانے کو بلانے جائے گا۔

(۴) امانت نے اپنے واضح اشاروں کی مدد سے محفل، سبھا یا جلسہ کا سماں پیش کرنے کو بھی خاص اہمیت دی ہے۔ رقص کرنے والی پری کے انداز سے جو ظاہری تصویر بنتی ہے اس کے علاوہ وہ نقش بھی نظر کے سامنے لائے ہیں جس میں سامعین اور ناظرین کے تاثرات کا رنگ شامل ہے۔ مثلاً ان چند سطروں میں بیّن طور پر یہ دونوں خصوصیتیں موجود ہیں۔

> "مشتاقوں کے دل میں درد ہے۔ غرض اپنے عالم میں فرد ہے جب سنہری پشواز کا دامن توڑوں کے چکر میں ہل جاتا ہے، گویا محفل میں گیندے کا تختہ کھل جاتا ہے۔ سازندوں میں کھڑے ہو کے ایک پاؤں تانسے آگے دھرتی ہے اور اس طرح اپنے حسب حال شعر خوانی کرتی ہے ـ
>
> گاتی ہوں میں ...."

اندر سبھا میں اسی انداز سے چار پریوں کا ناچ گانا ہوتا ہے۔ شرح اندر سبھا میں ہر پری کی آمد کا حال اسی تفصیل سے لکھا گیا ہے نیلم پری، لال پری اور سبز پری ہر ایک کی آمد سے پہلے سُرخ پردہ تانا جاتا ہے، اور آمد گائی جاتی ہے۔ آمد کے بعد پردہ اُٹھتا ہے، اور مہتاب چھٹتی ہے۔ اس کے بعد ہر پری کے لباس اور اس کے انداز کا ذکر اسی تفصیل سے کیا گیا ہے جیسے پکھراج پری کا۔ بالآخر سبز پری کے سبھا میں آتے ہی راجہ کو نیند آ جاتی ہے اور دیو پاؤں دبانے لگتا ہے۔

دیو کا پاؤں دبانا اندر سبھا میں نہیں ـــــ دیو کا یہ فعل اس خلا کو پورا کرتا ہے جو راجہ کے سو جانے کی وجہ سے پیدا ہو گیا تھا۔

اس کے بعد شرح میں ایک ایسے باب کی تفصیل ہے جو اندر سبھا میں قطعی ندارد ہے اور جس کا حال ہمیں صرف ان تین چار شعروں سے معلوم ہوتا ہے جو ہم سبز پری کی زبان سے سنتے ہیں۔ یہ بات سبز پری کے اپنے گھر سے روانہ ہونے اور راجا کی محفل میں پہنچنے کے درمیان کے واقعات سے متعلق ہے۔ اس کے بیان میں امانت نے ایسا کمال دکھایا ہے کہ پڑھنے والے کے سامنے واقعات کی تفصیل کچھ اس طرح آ جاتی ہے جیسے وہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے۔ شرح

اندرسبھا کا یہ حصہ خاصا طویل لیکن فنی حیثیت سے اور اپنی محاکاتی خوبیوں کے اعتبار سے بڑا اہم ہے اس لئے پورا نقل کئے بغیر چارہ نہیں۔ امانت اس باب کو اس طرح شروع کرتے ہیں کہ ادھر کا حال تو ادھر دیکھو۔ اُدھر کا ماجرا سنو۔ اب سنئے کہ اُدھر کا ماجرا کیا ہے :۔

"سبزپری...... سولہ سنگار کرکے جو اپنے باغ سے اڑی، تو چاندنی کی کیفیت دیکھتی ہوئی ہندوستان کی طرف مڑی۔ عجب چاندنی کا وفور تھا کہ زمانہ پُرنور تھا ؎

ہراک شے پہ تھا ماہ پرتو فگن
عجب رات تھی وہ بقولِ حسن
وہ چھٹکی ہوئی چاندنی جابجا
وہ جاڑے کی آمد وہ ٹھنڈی ہوا
وہ نکھرا فلک اور مہ کا ظہور
لگا شام سے صبح تک وقتِ نور[1]

سیر کرتی چلی جاتی تھی کہ پہرِ تیرہ سے روئے زمین پر ایک ستارہ سا چمکتا نظر آیا۔ دل اس کا آتشِ عشق نے جلایا۔ راہِ الفت میں سر دست قدم مارا۔ اپنے تئیں آہستہ آہستہ ہوا سے نیچے اُتارا۔ زمین کے قریب پہنچا کیا دیکھتی ہے کہ ایک باغ سرسبز ہے۔ اس کے بیچ میں ایسی ایک لال بارہ دری ہے کہ ہم سلک یاقوت ہے، مرجان سے کھری ہے اس کے کوٹھے پر تخت سے اتر کر کیا عالم نظر آیا کہ سب بہار دنیا فراموش

---

[1] اس جگہ ان اشعار کی موجودگی مثنوی میرحسن کے اثر کی شاہد ہے ۔۔۔ اسی داستان میں جب سبزپری شہزادے کی انگلی میں چھلا پہنا کر رخصت ہوتی ہے تو میرحسن کا یہ شعر پڑھتی ہے ؎

کرم مجھ پہ رکھیو سدا میری جاں
میں دل چھوڑے جاتی ہوں اپنا نشاں

شرح اندرسبھا میں آگے چل کر تین موقعے اور ایسے آتے ہیں جہاں مثنوی میرحسن کے شعر دہرائے جاتے ہیں۔ ایک موقع وہ ہے جب راجا شہزادہ کو غصے سے دیکھتا ہے اس کا ذکر امانت نے یوں کیا ہے :

"راجا نے غصے سے شہزادے کی طرف دیکھا اور بقولِ حسن ؎

اسے دیکھ غصہ میں وہ ڈر گیا
کہے تو کہ جیتے ہی جی مر گیا

دوسرا موقع وہ ہے جب سبزپری جوگن کا بھیس بھر کر شہزادہ کی یاد میں اِدھر اُدھر پھرتی ہے۔ اس جگہ امانت نے مثنوی میرحسن کے سات شعر نقل کئے ہیں ؎

خوش آیا اسے جوگ کا یہ مرن
کہ غش کر گئی وہ بقولِ حسن

....

اور آگے چل کر جوگن کے جسم پر بھبوت دیکھ کر امانت کو میرحسن کا یہ شعر یاد آتا ہے ؎

کرے حسن کو کس طرح کوئی ماند
چھپے ہے کہیں خاک ڈالے سے چاند

اور آخری موقع وہ ہے جب گلفام کو کنوئیں سے نکالا گیا ہے، اس جگہ شرح اندرسبھا میں یہ اشعار درج ہیں ؎

کنوئیں سے جو نکلا وہ گل پیرہن
کہوں حال کیا میں بقولِ حسن (وغیرہ)

ہیں، نیند کے نشے سے بے ہوش ہیں۔ پچھلا پہر، نورِ قمر، ہوا کی سنک سنک، جھاڑیوں کی کھنک، درختوں کی پتیوں کا موجِ نسیم سے آہستہ آہستہ کھڑکنا، جگنوؤں کا چاندنی میں ہوا پر چمکنا سکتے میں در و دیوار، سوئے سنسار، جاگے پاک پروردگار، چاندنی کہتی تھی کہ آج محل کے کبھی نہ نکلوں گی۔ یہ حال دیکھ کر حیران ہو گئی۔ آگے جو بڑھی تو سفید چاندنی کا فرش پایا کہ چشمِ انصاف نے چاند کی چاندنی کو داغ لگایا۔ ایسا فرش صاف بروئے زمیں ہے کہ خواب میں بھی نہیں ہے یہی جی چاہتا ہے کہ ہاتھ پاؤں پھیلا کے سو رہئے ——— ایک طرف کیا دیکھتی ہے کہ چاندی کی صراحیاں اور کوری کوری جھجریاں، سفید بہین بھیگے ہوئے کپڑے سے لپٹی ہوئی، ٹھنڈے پانی سے بھری ہوئی دھری ہیں۔ قریب اس کے چوکی پر لوٹا، لٹیا تھالی جوڑ چاندی کا دھرا ہوا ہے۔ ایک گلاس بلوری الماس تراش اس میں لگا ہوا رکھا ہے۔ آگے بڑھی تو کیا دیکھا کہ فرش کے کنارے پر پلنگڑی ایک چاندی کی بچھی ہوئی ہے، محمودی کی چادر کھنچی ہوئی ہے۔ پلنگڑی کے آگے ایک سفید قالیچہ لگا ہوا ہے تکئے بدستور رکھے ہوئے ہیں۔ پلنگ کے پاس ایک نازنین خواص سفید جوڑا پہنے ہوئے، چاندی کا پاندان کھول کے پان لگا رہی ہے نیند جو آئی تو ایک ہاتھ میں پان، پٹی پر سر رکھ کے سو گئی۔ یہ دیکھ کے پلنگ پر جو پاؤں رکھا تو ہکا بکا ہو گئی۔ دیکھا کہ ایک شہزادہ، چاند سے نور میں زیادہ، تیرہ چودہ برس کا سن، عروجِ حسن کے دن، اس طرح متوالا نیند میں سو رہا ہے کہ گردن تکیے سے گری ہوئی ہے، مچھلی بازو کی ابھری ہوئی ہے۔ پان دہن نازک میں پسے ہوئے ہیں۔ ہاتھ شانے کے تلے دبے ہوئے ہیں پھولوں کی ہر رنگ رخسارِ نازک میں گڑی ہوئی۔ لٹ زلفِ عنبریں کی چہرے پر پڑی ہوئی۔ ایک ہاتھ سینے پر، ایک ہاتھ تکیے کے نیچے رکھے بے خبر سو رہا ہے . . . . .

دونوں اسے یاد نہ ربیاں . . . . . ساقِ بلوریں پر ہاتھ رکھے ہوئے، ڈر دل سے نکلے ہوئے، سر گھٹنوں میں ڈالے ہوئے سو رہی ہیں . . . . . یہ حال دیکھ کے سبز پری کو تاب نہ رہی بے تاب ہو کر شہزادے کے منہ پر منہ رکھ دیا۔ چہرۂ صاف کا جلوہ دیکھ کر نشۂ عشق کا چڑھا۔ آسمان کی طرف مخاطب ہو کر یہ شعر امانت کا پڑھا ؎

فلک یہ تو ہی بتا دے کہ حسن و خوبی میں
زیادہ تر ہے ترا چاند یا ہمارا چاند

یہ کہہ کے شہزادے کے دونوں رخسارے دستِ نازک سے دبا کر، ہونٹوں کو سمٹا کر بوسہ لبِ دنداں کا لیا اور خوب سے گلے لپٹایا۔ جب شہزادہ نیند میں کسمسایا تو اس نے زمرد کا چھلا اپنے ہاتھ سے اتار آہستہ شہزادے کی انگلی میں پہنایا اور الگ ہٹ کر یہ شعر حسن کا سنایا ؎

کرم مجھ پہ رکھیو سدا میری جاں
میں دل چھوڑے جاتی ہوں اپنا نشاں

یہ کہہ کے سر سے پاؤں تک شہزادے کی بلائیں لے کے خدا کی پناہ میں دے کے، ہونٹ دانتوں میں دبائے ہوئے، صبح ہونے کے ڈر سے، خیال راجہ اندر سے تخت پر بیٹھ کر اکھاڑے کی طرف روانہ ہوئی۔"

شرح اندر سبھا کے اندر اقتباس کی ڈرامائی حیثیت اور اہمیت واضح ہے۔ امانت نے بڑی تفصیل سے واقعہ کی وہ ساری جزئیات بیان کی ہیں، جن سے مختلف کرداروں کو اپنی حرکات و سکنات کے متعلق واضح اشارے مل جاتے ہیں اور شہزادہ، کنیزیں، پری سب کو بغیر کسی شبہ کے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہر ایک کو اسٹیج پر کیا کیا کرنا ہے اور کس کس طرح کرنا ہے ———

اس ڈرامائی حیثیت کے علاوہ مندرجہ بالا اقتباس کی ایک نمایاں معاشرتی اہمیت بھی ہے۔ پورا منظر لکھنؤ کے نوابوں کی زندگی کے ایک خاص پہلو کی بڑی صحیح اور دلکش تصویر ہے۔

اندر سبھا میں فنی نقطۂ نظر سے ایسے اشاروں کی خاصی کمی ہے، جن سے کرداروں کے لباس، اس کی ظاہری قطع اور ان کے عمل اور حرکات و سکنات کی جزئیات کی وضاحت ہوتی ہو اور جس سے "جلسہ" یا "سبھا" کے ہدایت کار کو کوئی مدد ملے۔ شرح کی تفصیلات نے یہ فنی کمی بڑی خوبی سے پوری کی ہے۔ اندر سبھا کی دوسری کمی یعنی اس میں معاشرتی رنگ کا فقدان اس کی ایک اور نمایاں خرابی ہے۔ اندر سبھا کے آخر میں شرح کا اضافہ اس کی اس خرابی کو بدرجۂ اتم پورا کرتا ہے ——— پھر اندر سبھا میں زمان و مکان کے فنی تصورات کے اعتبار سے جابجا جو خلا محسوس

ہوتا ہے اور اندر سبھا پڑھنے والے کی سمجھ میں نہیں آتا کہ اسٹیج پر یا جلسہ میں یہ خلا کس طرح دور کیا جاتا ہوگا اور یہ وقفے کس طرح دور کئے جاتے ہوں گے، وہ بھی شرح کی موجودگی میں باقی نہیں رہتا۔

اندر سبھا میں کرداروں کی حرکات و سکنات کے متعلق بعض ہلکے ہلکے اشارے ہیں۔ شرح میں ان اشارات کو جزئیات کے بیان سے زیادہ مکمل کر دیا گیا ہے اور کرداروں کو یہ اندازہ کرنے میں ذرا بھی دقت پیش نہیں آتی کہ انہیں کسی خاص موقعے پر اسٹیج پر کیا کرنا ہے۔ مثلاً جب کالا دیو شہزادے کو سبز پری کے پاس لاتا ہے اور پری اسکا شانہ ہلا کر اُسے جگاتی ہے تو وہ بقول امانت "عالمِ حیرت میں بیتاب ہو کر جاگتا ہے"[۵]

اس حیرت اور بے تابی کی جزئیات شرح میں اس طرح بیان کی گئی ہیں؛

"شہزادہ جب نیند سے چونک کر ہوش میں آتا ہے۔ اُٹھتا ہے، گرتا ہے، چاروں طرف بھاگتا پھرتا ہے، ٹھوکریں کھاتا ہے، سر ٹکراتا ہے۔ کوٹھا اپنا ڈھونڈھتا ہے۔ لوگوں کو یاد کرتا ہے، عزیزوں کا دم بھرتا ہے۔ زیست سے تنگ آتا ہے۔ گھبراتا ہے پھر صدائے پُردرد سے بہاگ کی چیز زبان پر لاتا ہے۔"

ان تفصیلات کے علاوہ شہزادہ اور پری کی گفتگو کی جزئیات بیان کر کے امانت نے یہ داستان ان الفاظ پر ختم کی ہے "غرضکہ شعر خوانی میں باہم دیر تک رکاوٹ اور لگاوٹ کی باتیں ہوئیں معشوق کا انکار، عاشق کا اصرار، عجب لطف کی صحبت ہوئی۔"

اس کے بعد جوں جوں قصہ آگے بڑھتا ہے اندر سبھا کے عنوانات میں ایک نہ ایک لفظ ایسا مل جاتا ہے جس سے مختلف کرداروں کی جذباتی کیفیت کا اظہار ہوتا ہے اور انھیں (یا جلسے کے ہدایت کار کو) کرداروں کی ہر محل موزوں حرکات و سکنات کے لئے اشارے مل جاتے ہیں۔ شرح اندر سبھا کے بیان میں ان اشاروں میں موزوں جزئیات شامل کر کے امانت نے ان کی فنی حیثیت کو زیادہ واضح کر دیا ہے ــــــ مثلاً جب راجا اندر گلفام سے پرستان میں داخل ہونے کا سبب پوچھتا ہے اور گلفام اس کا جواب دیتا ہے تو اندر سبھا کا مصنف گلفام کے جواب کا عنوان اس طرح درج کرتا ہے:

"عرض کرنا گلفام کا راجہ اندر سے، عالمِ ہراس میں ہاتھ جوڑ کر"

شرح میں یہی بات ان الفاظ میں بیان کی گئی ہے:

"شہزادے نے نزاکت سے کانپ کر، بید کی طرح کانپ کر، جی چھوڑ کر، ہاتھ جوڑ کر راجہ کو جواب دیا۔"

ذرا آگے چل کر ایک عنوان ہے:

"عرض کرنا سبز پری کا راجہ اندر سے نادم ہو کر رونا گلفام کو گلے لپٹا کر۔"

شرح میں اس کی مزید وضاحت یوں ہوئی ہے:

"سبز پری نے خوف سے تھرّا کر، حیا سے سر جھکا کر، اشک سرخ آنکھوں سے بہا کر اس طرح راجہ سے عرض کی ؎

جفا و ستم کی سزادار ہوں
حقیقت میں تیری گنہگار ہوں

پھر شہزادے کی طرف مخاطب ہو کر کہنے لگی ؎

ارے کیوں! میں تجھ سے نہ کہتی تھی کیا
نہ مانا مرا ہائے تو نے کہا
بلا میں پڑا آپ بھی بے خطا
مجھے بھی اکھاڑے میں رسوا کیا
کہاں پھنسے اب دیکھے راجہ تجھے
خدا کو مری جان سونپا تجھے

پھر بھری سبھا میں شہزادہ سے لپٹ کر کہنے لگی ؎

جو جیتے ہیں تو پھر بھی مل جائیں گے
نہیں تو کئے کی سزا پائیں گے

یہاں عنوان کی وضاحت میں امانت نے مختلف شعروں کے بعد بتایا ہے کہ سبز پری کو کب کیا کرنا ہے ــــــ اسٹیج کی اتنی مکمل ہدایات کی موجودگی اندر سبھا کو ہدایات کے نقطۂ نظر سے فنی کمال کا مظہر بناتی ہے۔

اندر سبھا میں اور آگے چل کر ایک عنوان آتا ہے "آنا سبز پری کا جوگن بن کے پرستان میں، اور آمد کا"۔ لوگوں تماشا ــــــ یہ منظر اندر سبھا

---

[۵] اس جگہ اندر سبھا میں پورا عنوان ہے "جاگنا شہزادہ کا عالمِ حیرت میں بے تاب ہو کر"

میں بڑا دلکش منظر ہے لیکن محض عنوان ہدایت کار کو کچھ زیادہ مدد نہیں دیتا۔ شرح کی وضاحت البتہ اس کی اہمیت اور دلکشی کو نمایاں کرتی ہے۔ اس جگہ شرح کے الفاظ یہ ہیں:

جب شہزادہ کنوئیں میں بند ہوا، سبز پری کا عشق وہ چند ہوا۔ جنگل کی خاک اڑانے لگی، بن میں ٹھوکریں کھانے لگی۔ جب فراق گلفام سے تنگ آئی، طبیعت سے نیا سوانگ لائی۔ دل کو جوگ پر آمادہ کیا۔ فقیری کا ارادہ کیا۔ جب یہ صلاح دل سے سر دست ہوئی شہزادہ کی یاد میں بدمست ہوئی ؎

خوش آیا اسے جوگ کا یہ برن
کہ غش کر گئی وہ بقولِ حسن

. . . .

. . . .

نہ سدھ بدھ کی لی اور نہ منگل کی لی
نکل گھر سے بس راہ جنگل کی لی

. . .

اس تمہید کے بعد وہ دلکش منظر شروع ہوتا ہے جس کی طرف ابھی اشارہ کیا گیا:

. . . پھر سرخ چادر محفل میں لگائی جاتی ہے۔ جوگن کی آمد اس طرح گائی جاتی ہے ؎

جوگن آتی ہے پری بن کے پرستان کے بیچ
سمرنیں ہاتھوں میں، مندریں پڑیں کان کے بیچ

. . . .

. . . .

اس کے بعد دفعتاً پردے کا اٹھنا، جوگن کا فقیرانہ انداز سے محفل میں آنا جوگ کا جوبن دکھانا، تازہ قیامت ہے۔ یہ حال دیکھ کر مہتاب چرخ نے سوانگ لایا۔ ستاروں کی افشاں چن کر صبح کا سفیدہ منہ پر مل کے جوگی کا بھیس بدل کر جوگن کے مقابل میں آیا۔ مگر آپ کو اس کے ناخنِ پا کے برابر نہ پایا۔ خجالت سے خونِ جگر کھا کر دامنِ شفق میں منہ چھپایا۔ سبحان اللہ کیا لطف کا عالم ہے کہ وجد میں عالم ہے۔ صبح کا وقت ٹھنڈی ہوا۔ ستاروں کا جھلملانا، شفق کا رنگ کھلنا جانوروں کا درختوں پر چہچہانا، لوگوں کا چاروں طرف سے سمٹ کر محفل میں آنا۔ فرش میں پرسیں پڑیں، شمعیں خاموش کھڑیں، مشعلوں کا رخصت ہونا، خفتہ بختوں کا بیٹھے بیٹھے سونا۔ تماشائیوں کا جوگن پر جان دینا، حسینوں کا نیند سے جمائیاں لینا۔ گل رخوں کے حسن کی تازہ بہار، لوگوں کے ہاتھوں میں باسی ہار، اسی مجمع میں ایک کا ایک سے انگڑائی لے کر کہنا کہ اب تو لوگ اوپر گرے پڑتے ہیں، گھر چلو، طرف ثانی کا فوراً جواب دینا کہ ابھی بیٹھے رہو۔ جوگن کا سماں بھی دیکھ لو۔ جوبن کی بہار ہے، آنکھوں میں نیند کا خمار ہے یہ جلسہ بھی یادگار رہے۔ یہاں بیٹھو گے تو لطف اٹھاؤ گے، گھر جا کے کیا آگ لگاؤ گے ——— ادھر تو یہ گفتگو، یہ چھیڑ چھاڑ ہے، ادھر کا عالم سنو کہ سازوں کی بھینی بھینی آواز، بھیرویں کا شہانا انداز، تالی کی جھنکار، سروں کا خیال، طبلے کی گمک، جوڑی کی کھڑک، ہر لہرا انوکھا، ہر گت نرالی۔ چکاروں کی آواز مثردل کے نشے ہرن کرنے والی، جوگن کا سازندوں میں کھڑے ہونا، محفل کا ہوش کھونا، برانگ کی مورت، بھرتری کی صورت، آنکھیں الفت میں لال، شہزادہ گلفام کا خیال۔ آنسو آنکھوں میں ڈبڈبائے ہوئے، لٹیں چھٹکائے ہوئے، بھبوت رمائے ہوئے۔ جتنا چہرہ آپ کو راکھ میں چھپاتا ہے، اتنا جوبن اور جلوے دکھاتا ہے اس وقت شعرِ حسن کا یاد آتا ہے ؎

کرے حسن کو کس طرح کوئی ماند
چھپے ہے کہیں خاک ڈالے سے چاند

روپ کے ستارے مٹی ڈالے بھبوت کے تلے یوں نظر آتے ہیں جس طرح صبح کے وقت ابرِ سفید میں آسمان پر تارے چمک جاتے ہیں۔ زلفِ دراز خوش نما کھلی ہیں۔ اس طرح مکھڑے کے بالوں میں دکھلاتی ہیں جیسے کہ جٹا دھاری سانپ سنبلستان میں کنڈلی مارے بیٹھا ہے۔ حسن سیاہ ایک ہر رنگ میں مشتاقوں کا قتل کرنے والا ہے۔ پوشاک سبز ہے۔ دوپٹہ سرخ کفنی بنا کر گلے میں ڈالا ہے۔ گت تاچنے کو ہاتھ اٹھاتے ہیں۔ پاؤں تھا۔ ہیں۔ حرکتیں نئی ہیں، توڑے نرالے ہیں۔ وجد میں دیکھنے والے ہیں۔ سماں بندھی ہے، محفل کا دل لگتا ہے۔ دنیا کے مزے فراموش ہیں۔ کون رس بھرے تن گوش ہیں۔ جاہل باتیں کرتے ہیں۔ عاشق فدا ہو رہے ہیں۔ زندہ دل گھنگھرو کی آواز پر مرتے ہیں۔ شیریں دہن ہر تال پر سم کھانے کا ارادہ کرتے ہیں۔ جوگن جب یہ شعر گاتی ہے ؎

میں تو شہزادے کو ڈھونڈن چلیاں

محفل کو تڑپاتی ہے۔ بعد اس کے یہ غزل گاتی ہے ؎

"مرتا ہوں ترے ہجر میں اے یا جیلے"

یہ تصویر ہر لحاظ سے اتنی مکمل ہے کہ اس پر کسی تبصرہ کی گنجائش نہیں لیکن اشارتاً یہ کہنے میں کوئی ہرج بھی نہیں کہ اس بیان میں اسٹیج (یا محفل) کے ظاہری رنگ اور اس کی سجاوٹ کا جو تصور پیش کیا گیا ہے اُس کے علاوہ ایکٹروں اور ہدایت کاروں کے لئے بھی ڈھیرے واضح اشارے موجود ہیں۔ محفل میں جوگن کس طرح داخل ہوگی، اس کا رنگ روپ اور لباس کیسا ہوگا، وہ اسٹیج پر کہاں کھڑی ہوگی، اس کے گانے اور ناچنے کا انداز کیا ہوگا اور اس کے ساتھ کون کون سے ساز بجائے جائیں گے، جوگن کو اپنے چہرے اور اداؤں سے اپنی جذباتی کیفیتوں کا اظہار کس طرح کرنا ہوگا ——— یہ سب چیزیں اسٹیج کی ہدایات اور اس لحاظ سے اندرسبھا کے فنی پہلو کا ایک اہم عنصر ہیں۔ اور یہی چیزیں ہیں جن کی بنا پر ہم اندرسبھا کے فنی مرتبہ کا تعین کرتے وقت اس بدیہی نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اندرسبھا ہمارے ڈرامائی فن کی بنیاد اور اس کا ایک اہم سنگ میل ہے۔ اندرسبھا اور اس سے بھی زیادہ شرح اندرسبھا نے اسٹیج کی جن روایات اور ہدایات کو اردو کے ڈرامائی فن کا پیش خیمہ بنایا ہے وہ اس اہم کتاب کی تصنیف کے ایک صدی بعد بھی اردو ڈرامے کے ناگزیر اجزا ہیں۔ اندرسبھا اور شرح اندرسبھا کے بنائے ہوئے نقوش اردو ڈرامے کے فن کی پوری روایت پر چھائے ہوئے ہیں اور ہمارے مشہور ڈرامے میں کہیں نہ کہیں اس روایت کی جھلک ضرور نظر آتی ہے۔

———

○

ابریق مئے مرا شکستی ربی
بر من درِ عیش را ببستی ربی
بر خاک بریختی مئے ناب مرا
خاکم بدہن مگر تو مستی ربی

(خیام)

پیالہ مری مے نوشی کا توڑا یا رب
اک ٹھیکرا مٹی کا نہ چھوڑا یا رب
مٹی میں مے ناب، مرے منہ میں خاک
کچھ مست نہیں تو بھی تو تھوڑا یا رب

(ناداں دہلوی مرحوم)

کیوں مے کی صراحی مری توڑی تیغے!
کیوں عیش منغص کیا میرا تُو نے ؟
اب مجھ سے یہ بدمستیاں، توبہ توبہ
کیا تجھ کو نشا ہے، خاک منہ میں میرے

(آغا شاعر قزلباش مرحوم)

دل سرّ حیات را کماہی دانست
در موت ہم اسرار الٰہی دانست
امروز کہ با خودی ندانستی ہیچ
فردا کہ ز خود روی چہ خواہی دانست

(خیام)

دل راز ازل تو نے بھلا ہی جانا
مرنے میں بھی کچھ بھید چھپا ہی جانا
زندہ ہے تو اور آج نہیں جانا کچھ
کل مر کے فنا ہو کے تو کیا ہی جانا

(ناداں دہلوی مرحوم)

دل زیست کی لم سے بھی ہے واقف پورا
اور موت کے بھی بھید خدا کا سمجھا
پر آج جو ہے ہوش میں اتنا بے ہوش
کل ہوش نہیں ہوگا تو کیا جانے گا ؟

(آغا شاعر قزلباش مرحوم)

رات

عبدالحمید عدمؔ

رات بربطِ سکوں ۔۔۔ بنتِ غمزہ و فسوں
اے غزالِ نرم رو ۔۔۔ کاکلِ طرب کی غنو
کس لئے اداس ہے؟ ۔۔۔ کیوں سیہ لباس ہے؟

چاند اگر نہیں چڑھا ۔۔۔ اس سے فرق خاص کیا
چاند اگر غروب ہے ۔۔۔ یہ تو اور خوب ہے
یہ حسین تیرگی ۔۔۔ ہے سرشتِ زندگی
زندگی بھی رات ہے ۔۔۔ حادثے کی بات ہے
حادثہ شعور ہے ۔۔۔ اس میں اتنا نور ہے
جس کا انتساب کیا ۔۔۔ ماہ و آفتاب کیا

چاند عارضی ضیا ۔۔۔ تیرا حسن دیرپا
تو ہے ایک کیفیت ۔۔۔ لازوال تمکنت
چاند اک دروغ ہے ۔۔۔ موسمی فروغ ہے

یہ لباس ماتمی ۔۔۔ یہ اتھاہ تیرگی
ماہتاب کے لئے ۔۔۔ ایک خواب کے لئے
خواب بے اساس ہے ۔۔۔ وہم بے قیاس ہے
جانِ من نظر تو کر ۔۔۔ کتنے غمزدہ بشر

کتنے تپ زدہ جگر ۔۔۔ کتنے نامراد گھر
ڈھونڈتے ہیں رات کو ۔۔۔ راحتِ حیات کو

اے سیاہ نازنیں! ۔۔۔ اے نگارِ حسیں!
کس لئے ملول ہے ۔۔۔ تو تو ایک پھول ہے
نازنیں ترے لئے ۔۔۔ صد ہزار سلسلے
دیکھ یہ ترے نگیں ۔۔۔ نجمہائے مہ جبیں
نور کے امام ہیں ۔۔۔ باوفا غلام ہیں
چاند ہو نہ ہو مگر ۔۔۔ یہ ہیں تیرے ہم سفر

بس اسی طرح مری ۔۔۔ نامراد زندگی
ہے رواں سوئے ابد ۔۔۔ نعرہ ہائے "المدد!"
گونجتے ہیں دم بدم ۔۔۔ دشت دشت یم بیم
اور نجومِ خم نشیں ۔۔۔ مثلِ مہ وشانِ چیں
لے کے بادۂ طرب ۔۔۔ چشم چشم لب بہ لب
چومتے ہیں رات کو ۔۔۔ ظلمتِ حیات کو
رات ہی برات ہے ۔۔۔ محرمِ ثبات ہے
رات کے ضمیر میں ۔۔۔ جاگتی لکیر میں
پاک و مصر و روم ہیں ۔۔۔ مستقل نجوم ہیں!

نواساز

صفیہ شمیم

ہاں ساز اٹھا ساز خوش آواز مغنی

برسات کی بھیگی ہوئی یہ رات سحابی
آفاق طربناک ہے، عالم ہے شبابی
مانا کہ پسِ پردہ بھڑکتے ہیں شرارے
گل پھر بھی ہیں بدمست، ہوائیں ہیں شرابی
ہنستے ہوئے پھولوں پہ چھلکتی ہوئی شبنم
کلیوں کو ستاروں نے بنایا ہے شہابی
اس منظرِ رنگین کا ہو لطف دوبالا
بس دیر نہ کر تو بھی نوا زن ہو شتابی

ساحل پہ پپیہے کی صدا جھوم رہی ہے
کونین میں سرشار فضا جھوم رہی ہے
گلزار میں پھولوں نے نیا رنگ جمایا
اشجار کے سائے میں ہوا جھوم رہی ہے
یہ موجِ ترنم، یہ ترانے یہ ملاریں
ہر چیز بصد ناز و ادا جھوم رہی ہے
ہے رنگِ مسرت میں شرابور زمانہ
ساغر میں مئے ہوش ربا جھوم رہی ہے

ہر گام پہ مڑتا ہوا، گاتا ہوا پانی
موجوں کا مسلسل یہ ترنم، یہ روانی
گلشن پہ ہیں چھائی ہوئی گھنگھور گھٹائیں
ہر پھول فسانہ ہے تو ہر غنچہ کہانی
بیتاب ہیں قلب خس و خاشاک میں ارماں
پیغام چلے آتے ہیں کانٹوں کی زبانی
یہ محفلِ احباب، یہ اوقاتِ فراغت
آئے گی نہ پھر ایسی کوئی رات سہانی

یوں نغمہ سرا ہو کہ یہ عالم ہی بدل جائے
افسوں ترا بے دردِ حوادث پہ بھی چل جائے
گرتا ہوا انسان پھر اک بار سنبھل جائے
ہر اشک میں طوفان تبسم کا مچل جائے
پیشانیِ حسرت پہ بشاشت دمک اٹھے
کانٹا سا ہر اک روح کے سینے سے نکل جائے
مہتابِ مسرت ہو نمایاں شبِ غم سے
ہر ایک فغاں قالبِ نغمات میں ڈھل جائے

اے مطربِ گل بار فضاؤں کو ہنسا دے
نغموں سے بیاباں کی خوشی کو جگا دے
منہ دیکھ کے رہ جائے یہ بے مہریِ دوراں
اے صد رخِ طرب رنگ حوادث کا اڑا دے
ہر تان پہ لا راہ پہ بھٹکے ہوئے دل کو
وہ گیت سنا عظمتِ ہستی جو بڑھا دے
کونین کی افسردہ تمنائیں تڑپ جائیں
طوفانِ ترنم میں زمانے کو بہا دے

ہاں ساز اٹھا ....

رہائی

رِیاض قادر

محبت جہاں ڈس گئی تھی،
کبھی دل جہاں تھا،
جہاں حجرۂ سیمگوں روشنی کا
لرزتا ہوا رہ گیا تھا!
وہیں رہ گیا ہے
ہیولیٰ کسی سایۂ زرفشاں کا،
یہاں ایک احساس جاری رہا ہے
رگِ جاں میں خونِ مئے زندگی بن کے جاری رہا ہے
اک احساس عنوانِ نو کا،
زمانے کی رفتار، لمحوں کی رَو کا،
یہاں کھڑکھڑاتی ہوئی ہڈیوں سے
اجل کے محیطِ شبِ بے اماں سے
بہاروں کے رنگوں کو، پھولوں کو
ان کی چمک کو،
اماں مل گئی ہے!
فنا کی بھی آواز سنگیت میں ڈھل گئی ہے!!

غزل

روشؔ صدیقی

حرفِ آساں لب آشنا نہوا
میں زمانے کا ہم نوا نہوا

اس کے وعدے نے بات تو رکھ لی
لاکھ شرمندۂ وفا نہوا

ہائے مفہومِ اشتیاقِ نہاں
نگہِ شوق سے ادا نہوا

ہم تو امید و یاس سے گذرے
کیا ہوا عاشقی میں کیا نہوا

جامِ لبریز و چشمِ اشک آلود
رند کیا ہے جو پارسا نہوا

تجھ سے ہوکر جدا یہ دل اے دوست!
پھر کسی حال میں جدا نہوا

رہِ کعبہ کہاں کہ ہم سے روشؔ
دَیر کا بھی تو حق ادا نہوا

غزل

فضل احمد کریم فضلیؔ

اپنا کہیں جسے نہ پرایا کہیں جسے
دل ہے وہ طرفہ چیز تماشا کہیں جسے

ان کی اداؤں میں ہے عجب شوخیٔ حیا
وہ شوخیٔ حیا کہ تقاضا کہیں جسے

میری نظر نے ان کی نگاہوں میں دیکھ لی
درپردہ اک نگاہ اشارا کہیں جسے

دل کو کسی کی نیم نگاہی نے بخش دی
وہ بامزا خلش کہ تمنا کہیں جسے

میرا دلِ غریب بھی کیا خوب چیز ہے
اُمیدوارِ وعدۂ فردا کہیں جسے

اے عشق! تجھ پہ دولتِ ہوش و خرد نثار
وہ بن گئے ہیں ہم کہ تماشا کہیں جسے

دیوانگانِ شوق کا ہے کب سے منتظر
ویرانۂ حیات کہ صحرا کہیں جسے

ہے زندگی جو زہر تو ہاں زہر ہی سہی
لیکن یہ زہر وہ ہے گوارا کہیں جسے

اچھا بُرا ہزار کہے غیر ہم کو کیا
اچھا تو بس وہی ہے وہ اچھا کہیں جسے

یوں تو بھری ہوئی ہے خدا کی زمیں مگر
ایسا کوئی نہیں کہ ہم اپنا کہیں جسے

اپنے بھی اب تو مصلحت اندیش ہو گئے
فضلیؔ یہی وہ چیز ہے دنیا کہیں جسے

غزل

سراج الدین ظفر

سنبل کدۂ زلف کہ سرمایۂ کف تھا
کیا کیا نہ مرے شوقِ فراواں کا ہدف تھا

شب خلوتِ میخانہ میں ہر شاہدِ نوخیز
رخنہ زنِ اسباب تھا برہم زنِ صف تھا

جرأت نہ ہوئی گردشِ دوراں کو سرِ بزم
آتی جو مقابل تو میں پیمانہ بکف تھا

پہنچی نہ کسی تک مری خلوت کی کوئی بات
گُل تھا کہ سبو ہر کوئی پابندِ حلف تھا

کرتی تھی جو یارانِ شبانہ کی حکایت
روئے سخن بادِ سحر میری طرف تھا

کل صبح چلی بادِ صبا جب طرفِ گُل
پیغامِ سحر میں مرا پیغام بھی لف تھا

گو پردۂ اسرار میں تھا شاہدِ مقصود
لیکن مری آوارہ نگاہی کا ہدف تھا

کیا جستِ غزالاں میں تھا کل رات کو آہنگ
بسمل تہِ پا زمزمہ بربط و دف تھا

اب تک ہیں بہاریں مرے دامن میں کہ مجھکو
نوغنچگیٔ غنچہ فروشاں سے شغف تھا

درپے جو رہے سنبل و ریحاں کے قدح خوار
شاید یہ کنایہ ترے گیسو کی طرف تھا

کیا مجھکو زمانے سے ظفر کوئی سروکار
اس تنگ نظر کو مرا گوہر بھی خوف تھا

غزل

شان الحق حقی

ہم نے سینے میں رکھا غم کو دل وجاں کی طرح
پاسِ دشمن بھی کیا خاطرِ خوباں کی طرح

بزمِ دنیا ہے صنم خانۂ ویراں کی طرح
آدمی دہر میں نایاب ہے یزداں کی طرح

کوئی گردش ہے تو تقدیر سے میری ورنہ
سست ہے دورِ زماں بھی ترے پیماں کی طرح

شکوۂ دوست نہ کر شرطِ محبت یہ ہے
حوصلہ ہو تو اٹھا ناز بھی احساں کی طرح

تھی بس اک برقِ تبسم کہ تکلم نہ بنی
جنبشِ لب تھی مگر جنبشِ مژگاں کی طرح

پھونک دو خارِ نشیمن کہ یہ کانٹے دل میں
چبھ رہے ہیں کسی بھولے ہوئے ارماں کی طرح

کم نہیں اب بھی تمناؤں کا سینے میں ہجوم
خانۂ دل یونہی آباد ہے زنداں کی طرح

نالۂ غم بھی نہیں شورِ طرب کا کیا ذکر
شہر کے شہر ہیں سنسان بیاباں کی طرح

اک سہارا ہے جسے دامنِ حسرت کہئے
ہر قدم ساتھ مگر عمرِ گریزاں کی طرح

دوستو ڈھونڈئے کیا مشربِ باقی کا نشاں
ہے کوئی بزمِ خیالی دلِ ویراں کی طرح

مجھ کو تسلیم نہیں دل کے بھی دعوے حقی
میں نے رکھی ہے اسی کفر پہ ایماں کی طرح

غزل

جمیل واسطی

جو میری باتیں ہیں بہکی بہکی تو راز تحت الشعور کیا ہے
بیاں مرا کچھ بیاں نہیں ہے، بیانِ بین السطور کیا ہے
جوانیاں سر پہ چھا رہی ہیں۔ بہار قربان ہر قدم پر
نہیں اگر اُن کا حُسن صہبا تو میرے سر میں سُرور کیا ہے
نہ توڑ ڈالوں طلسمِ صد تمکنت کو تیرے کہیں جنوں میں
نہیں اگر خواہشِ محبت تو یہ ادائے غرور کیا ہے
زمانہ حاسد سہی محبت کا تجھ پہ ہی اعتبار ہوتا
بھلا تصور میں بھی یہ اخفائے راز تیرے حضور کیا ہے
بلند تہذیب کے نمونے ہیں یہ مزاروں کے بیل بوٹے
مگر فضا میں گریج ہے کیسی فغانِ زیرِ قبور کیا ہے
کراہتی آرزوئیں مدفونِ ضبط ہو کر جنوں بنی ہیں
جو اذنِ اظہار سے یہ لاشے اُٹھیں تو یوم النشور کیا ہے
مقدس اعجاز سے ہے آراستہ جہانِ ورائے دانش
یہ گلشنِ آتشِ خلیل اور برقِ بالائے طور کیا ہے
کنارِ مہتاب سے نگاہوں میں خواب رنگیں سا تیرتے ہیں
فرازِ افلاک سے تعلق ترا دلِ ناصبور کیا ہے
نہ مہرباں تم نہ دوست دنیا نہ نیک قسمت نہ دل پہ قابو
جو واسطی کا قصور بھی ہو تو واسطی کا قصور کیا ہے

غزل

احمد فراز

اس ادا سے کبھی آکر گذرو
دل کے صحرا کو بسا کر گذرو
سنگِ خارا ہے زمانے کی نظر
دل کے آئینے بچا کر گذرو
روشنی رہبر و رہزن بھی تو ہے
راہیو! شمعیں بجھا کر گذرو
کون جانے کہ یہ پتھر ہیں کہ لوگ
دشتِ غربت میں صدا کر گذرو
کوئی کانٹا ہو کہ شبنم ہو کہ پھول
سب کو آنکھوں سے لگا کر گذرو
چڑھتے سورج کے پجاری نہ بنو
اپنے سائے میں سما کر گذرو
وقت ہر آن بدل جاتا ہے
جی میں جو آئے سدا کر گذرو
سفرِ شوق ہو یا منزلِ غم
کوئی ہنگامہ اٹھا کر گذرو
ایک پل ٹھہرو بگولوں کی طرح
اور پھر خاک اڑا کر گذرو
توسنِ وقت کی رفتار کے ساتھ
برق کے پنکھ لگا کر گذرو
دل عجب شہر ہے ہنگاموں کا
کبھی اس سمت بھی آکر گذرو
یا تو موجوں کے شناسا نہ بنو
یا کناروں کو بہا کر گذرو
فکر و ادراک کے ویرانوں میں فرازؔ
مشعلِ طبع جلا کر گذرو

غزل

جلیل قدوائی

دل کو دزدیدہ نگاہوں سے لُبھاتے کیوں ہو
غیر ہوں میں تو مجھے اپنا بناتے کیوں ہو

مجھ کو معلوم ہے جو کچھ ہے تمہارے دل میں
شرمگیں آنکھ سے بیکار چھپاتے کیوں ہو

جو بھی کہنا ہے مرے حق میں اسے صاف کہو
بات کرتے ہو تو ہونٹوں کو چباتے کیوں ہو

ہمہ تن شرم نظر آتے ہو بے شک لیکن
دل میں آتے ہو تو اک دھوم مچاتے کیوں ہو

اک حسیں شعلۂ بیتاب نہ کیوں بن جاؤ
عشق کی آگ سے دامن کو بچاتے کیوں ہو

پاس رہنا ہے تو پھر مجھ سے یہ دوری کیسی؟
دور رہنا ہے تو آنکھوں میں سماتے کیوں ہو

جذبۂ دل کی تمہارے ہی کمی ہو نہ جلیل
اُن پہ غفلت کا تم الزام لگاتے کیوں ہو؟

غزل

مجازؔ دہلوی

تری محفل سے اُٹھ کر جو بھی آئے کامگار آئے
خمستاں در نظر آئے گلستاں در کنار آئے

رگ و پے میں تری نظروں نے ایسی بجلیاں بھر دیں
نہ اِس پہلو قرار آئے نہ اُس پہلو قرار آئے

حقیقت میں وہی سرمایۂ عمرِ گرامی ہیں
جو لمحات حسیں ہم ان کی محفل میں گزار آئے

جہاں اور جس طرف دیکھا ترا جلوہ نظر آیا
یہ ممکن ہی نہیں اہلِ بصیرت کو قرار آئے

نہ پہنچا کارواں کوئی سلامت اپنی منزل تک
دلیلِ راہ پر آئے تو کیوں کر اعتبار آئے

فریبِ حسن سے آگاہ ہو جائے نظر میری
کہیں ایسا نہ ہو یہ ساعتِ ناخوشگوار آئے

مجازؔ اس درجہ مستقبل سے مایوسی نہیں اچھی
یہ کیا کم ہے کہ تم حالات کے گیسو سنوار آئے

رپورتاژ

کاف تا کاف

(۲)

ابوسعید قریشی

برعظیم پاکستان و ہند میں یہ مندر اپنی وضع کا واحد مندر ہے۔ اس کے علاوہ "سرسکھ" کی سب سے اہم عمارت دھرم راجکا نام کا ٹوپ ہے۔ یہ عمارت ٹیکسلا کے تیسرے شہر سرکپ کے جنوب مشرق میں واقع ہے۔ اس کی مرکزی عمارت تین سے لے کر پانچ فٹ تک چوڑی دیواروں پر مشتمل ہے۔ مندر ٹوپ چوتھے چبوترے پر بنایا گیا ہے — اس کے اردگرد دور دور تک ٹوپ اور کئی خانقاہیں نظر آتی ہیں۔ ٹیکسلا کی یونیورسٹی کے مختلف کالج شاید انہی عمارتوں پر مشتمل ہیں۔ یہ حجرے شاید طلبا کے ہوسٹل ہیں اور یہ ایوان ان کے لیکچر ہال۔

آج ٹیکسلا پتھر، چونے، اینٹوں کے ٹکڑوں، ٹوپوں کے کھنڈروں اور بدھ تہذیب کا ایک ڈھیر ہے۔ —— ماہرین کا خیال ہے کہ غریب آدمی کے گھر اس زمانے میں کچے ہوتے تھے۔ غریب کا گھر آج بھی اسی روایت کا دل ہے۔ تہذیب کا تسلسل ٹوٹنا نہیں چاہئے۔

مگر اب ہم راولپنڈی آ پہونچے ہیں۔ یہاں سے کشمیر کو پکی سڑک جاتی ہے۔ مگر آپ کا ویزا کہاں ہے؟ جی ہاں اپنے وطن میں ویزا! کیوں؟ —— اس کا جواب آپ جانتے ہیں۔ میں تو محض آپ کا ہم سفر ہوں۔ چلئے گائیڈ کہہ لیجئے۔ مگر ذرا مجھے اپنے خیالات کے بکھرے ہوئے تانے بانے کو سمیٹ لینے دیجئے۔ کشمیر کے نام سے میرے ذہن میں بے شمار یادیں خلط ملط ہو گئی ہیں...... یہ سال ۱۹۳۶ء ہے میں، میرا چھوٹا بھائی اور میرا چچیرا بھائی۔ ہم تینوں کشمیر کے لئے رختِ سفر باندھے ہوئے ہیں۔ اب کے ہم جموں کے راستے جا رہے ہیں۔ راستے میں بجوت پڑتا ہے (منٹو مرحوم کی بیگو کی بستی) مگر ہمیں ابھی پیر پنجال کی سرنگ سے گذرنا ہے، اس کے اس طرف وہ حسین وادی ہے جس کی تعریف میں شاعر شعر کہتا نہیں تھکتا اور جس کی کشش جہانگیر کو لاہور چھوڑنے پر مجبور کرتی ہے۔ پیر پنجال سے اس طرف وہ منظر ہے کہ انسان بہک جاتا ہے اور اسے جنت سے نکالے جانے کا کوئی غم نہیں رہتا —— وہ دیکھئے ویری ناگ، دریائے جہلم کا منبع —— جہلم جس کے کنارے سری نگر آباد ہے۔ میں شکارے کی سیر کر رہا ہوں۔ سال ۱۹۳۲ء ہے۔ میں نے نیا نیا پائپ پینا سیکھا ہے۔ لیکن تمباکو تیز ہے چنانچہ کشتی در دریا دریا درون کشتی کی کیفیت ہے۔ شکارا بہے چلا جا رہا ہے دریا کے دونوں طرف لکڑی کے مکان میرے اوپر جھکے پڑتے ہیں۔ ہر چیز خلط ملط ہو رہی ہے۔ لیجئے یہ پل آ گیا۔ خدا معلوم کیا تھا اس تمباکو میں۔ یوں لگتا ہے جیسے یہ پل ابھی میرے اوپر آ رہے گا۔ ہم نے تو لوہے کے شہتیر دیکھے ہیں پلوں پر مگر یہاں سب لکڑی ہے —— سب لکڑی ہے۔ درختوں کے درخت کاٹ کر انہیں کچھ اس طرح رکھا گیا ہے کہ سارا بوجھ تقسیم ہو جاتا ہے۔ کشمیر میں صدیوں سے اس طرح پل بناتے جا رہے ہیں۔ شاید اس لئے کہ یہاں لکڑی کی کثرت سے ہوتی ہے۔ اور شاید اسی لئے مکان بھی لکڑی کے ہیں —— لکڑی کے چوکھٹوں پر تختے جڑ دیئے گئے ہیں۔ امرا کے مکانوں میں البتہ اینٹیں اور بعض اوقات روغنی اینٹیں بھی لگا دی جاتی ہیں۔ اس طرح مکان کے اندر خود بخود الماریاں سی بن جاتی ہیں۔ — لیکن شکارا رک گیا۔ مانجھی کہہ رہا ہے کہ شاہ ہمدان کی مسجد آ گئی۔ میرا پائپ بجھ چکا ہے۔ ماحول کے نقوش اب واضح ہو رہے ہیں۔ دریائے جہلم کے دائیں جانب شاہ ہمدان کی مسجد اپنا اہرام نما مینار اٹھائے فنِ تعمیر کے ماہروں کو دعوتِ نظارہ دے رہی ہے کچھ عجیب مندر نما مینار ہے۔ اس تصور کے ساتھ ساتھ میرے ذہن میں مشرق بعید کے معبدوں "پیگوڈاؤں" کے کلس بھی خلط ملط ہو رہے ہیں —— "اللہ اکبر اللہ اکبر..." موذن اپنے خالص کشمیری لہجہ میں مسجد کی مینار سے نمازِ عصر کا اعلان کر رہا ہے۔ یہ مینار سب سے اوپر سرما کی برف اور گرمیوں کی بارش کے بہاؤ کے لئے ڈھلواں مثلثیں سی

نظر آرہی ہیں۔ مسجد کے وسط میں واقع ہے۔ یہاں بھی چھتیں اسی قسم کی ہیں۔ برآمدوں کو چھوڑ کر مسجد کا چبوترہ (جو مربع ہے) ۹۰۰، ۴ مربع فٹ ہے۔ عمارت دو منزلہ ہے۔ اور فرش سے لے کر مینار کی نوک تک اس کی بلندی ۴۵ ، ۵ فٹ ہے۔ مسجد کا اندرونی ایوان ۶۳ × ۴۴ فٹ ہے۔ باقی جگہ میں حجرے سے بنا دئے گئے ہیں جن کی دیواریں لکڑی کے منقش تختوں سے بنی ہیں۔ امام کی محراب ہشت پہلو ہے۔ چھتوں پر پھول پتیوں کے رنگ چمک رہے ہیں۔ یہ نقوش نیچے قالینوں کے تانے بانے میں اپنے عکس ڈالتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں ——— یہ مسجد کشمیری فن کا اہم نمونہ ہے۔ لیکن کشمیر کے چوبی فن تعمیر کی سب سے نادر مثال، سری نگر کی جامع مسجد ہے۔ اس کی بنا ۱۴۰۰ء میں سکندر بت شکن نے رکھی۔ سکندر کے فرزند شاہ زین العابدین نے اس کی توسیع کی۔ تین صدیاں بعد مغل شہنشاہ اورنگ زیب اس کی مرمت کی طرف متوجہ ہوا۔ (عالمگیر کے وقت میں اس کا بہت سا حصہ نذر آتش ہو چکا تھا) لیکن اس نے اس کے بنیادی نقشے میں کوئی ایسی تبدیلی نہیں کی جس سے اس کی شکل بدل جاتی۔

جامع مسجد میں لکڑی کے استعمال کے وہی اصول نظر آتے ہیں جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ مگر نقشے کے اعتبار سے یہ مسجد ایک لحاظ سے میدانی علاقے کی مسجدوں سے ملتی جلتی ہے۔ اس کا مربع نما صحن جس میں درخت بھی لگے ہیں اوپر سے کھلا ہے اور اس کا حاشیہ ۲۴۰ فٹ بنتا ہے۔ صحن چاروں طرف بے شمار ستون نمازیوں کی طرح کھڑے ہیں۔ بیرونی حاشیہ ۲۸۵ فٹ ہے۔ بیرونی دیوار تیس فٹ اونچی سادہ گلکاری پر مبنی ہے۔ اس مسجد کے ستونوں کی تعداد بڑے بڑے ریاضی دانوں کا محاسبہ کرتی ہے۔ ہمت والے لوگوں نے ان کی تعداد ۳۷۰ بتائی ہے۔ یہ ستون درختوں کے پورے تنے ہیں کیپیس سے پچاس فٹ کے دیودار وں کو جنگلوں سے اکھاڑ کر تراش خراش کر سیدھا یہاں گاڑ دیا گیا ہے۔ یہ "درخت" ہشت پہلو معلوم ہو رہے ہیں۔ ان ستونوں کو دیکھ کر جو پورے پورے درختوں پر مشتمل ہیں مجھے یہ احساس ہوتا ہے جیسے "منگل میں جنگل" ہو گیا ہے۔ انسان کی طباعی پر شاید قدرت کو بھی رشک آتا ہوگا ——— ... جامع مسجد کے تین دروازے ہیں ——— ڈیوڑھیاں۔ ہم اب جنوبی دروازے کے باہر کھڑے ہیں۔ نمازیوں کی ٹولیاں آرہی ہیں۔ ان کے ماتھے کے گٹے ان کی دعاؤں، ان کے صبر کا اعلان کر رہے ہیں۔ وہ ابھی مایوس نہیں ہوئے۔ انہیں اب بھی امید ہے کہ ان کا نصیب ایک دن ضرور جاگے گا جب وہ ڈوگرے اور اس کے سرپرستوں کی غلامی کا جوا اپنے کندھوں سے اتار پھینکے گے اور اسے ڈل اور وولر کی تہوں میں غرق کر دیں گے۔ دیکھیں ہمالہ کے چشمے کب ابلتے ہیں۔ اتنے آئیے۔ ڈل گہر سے شکارا لے کر شالامار اور نسیم باغ بھی دیکھتے آئیں۔

شالامار کے تختے ہمارے سامنے بہشت کی منزلوں کی طرح پھیلتے چلے جا رہے ہیں۔ گھاس کا سبز مخملی فرش جس کے بیچوں بیچ چاندی سی نہر بہہ رہی ہے اور فوارے موتی اچھال رہے ہیں۔ عقب میں سنگ سیاہ کی بارہ دری ان موتیوں کو جلا بخش رہی ہے۔ نور و ظلمت کا یہ حسین امتزاج مغلوں کے ہی ذہن سوجھ سکتا ہے۔ اور یہ ستون اور چھت تو ملاحظہ فرمائیے ——— ٹھہریئے ذرا تصویر اتارتے ہیں۔ آج سے اٹھارہ بیس سال بعد، جب یہاں آنے کے لئے "ویزا" کا سوال ہوگا اور "ویزا" نہیں ملے گا تو اس تصویر کو گھر اپنی حسرتوں کا دل بہلا لیا کریں گے ——— مگر میں جذباتی ہو گیا۔ ہاں تو کشمیر کے فن تعمیر کی بات ہو رہی تھی۔ مغلوں نے پری محل کی نشاط گاہ اور پتھر کی ملا شاہ کی مسجد اور اس نوع کی کچھ اور عمارتیں بھی کشمیر میں بنائیں۔ لیکن ان کے لئے کاریگر میدانوں سے ہی منگوانے پڑے۔ لکڑی کی عمارتوں کے عادی پتھر سے سمجھوتہ نہ کر سکے۔ آج پری محل ویران پڑا ہے اور یہاں بھوتوں کا مسکن ہے اور کشمیر کا گھریلو فن تعمیر اس کی ان گنت نیا رتیں ہیں۔ یا جھونپڑے جن میں چالیس لاکھ بندگانِ خدا اپنی زندگی کے دن تیر کر رہے ہیں ———

اب ہم پھر جرنیلی سڑک پر پہنچ چکے ہیں۔ یہ ہرے بھرے کھیت جہلم اور چناب کا عطیہ ہیں۔ یہاں گاؤں کے گرد چار دیواری دکھائی نہیں دیتی زندگی محفوظ ہے۔ مٹی کے مکان، کھلے کھلے صحن، جوہڑ، رہٹ، نہریں.... بھیڑ بکریاں، گائے بھینس، بیلوں کی جوڑیاں سرد سی بانکی عورتیں، شیشم جیسے تناور مرد ——— مگر سامنے یہ مینار کیسے ہیں؟ یہ شاہدرہ ہے۔ ہم لاہور کے مضافات میں پہنچ گئے۔ یہ جہانگیر کا مقبرہ ہے۔ لاہور کے لوگ اسے مقبرہ کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ مقبرے کا باغ ۱۵۰۰ مربع فٹ جگہ گھیرے ہوئے ہے۔ مورخوں کا کہنا ہے کہ یہ ملکہ نورجہاں کا باغ تھا۔ جہانگیر نے وصیت کی تھی اسے یہیں دفن کیا جائے۔ اور بعض مورخین کا کہنا ہے کہ نورجہاں نے اپنے محبوب کا مزار اپنی نگرانی میں بنوایا۔ باغ کے گرد چار دیواری کا پردہ ہے۔ سامنے پھولوں کے سولہ تختے ہیں اور ہر تختے میں الگ رنگ کے پھول ہیں۔ تختوں کے درمیان فوارے اچھل رہے ہیں۔ مقبرے کی صدر عمارت کے باہر، جن میں میناروں کا زیریں حصہ بھی شامل ہے، سنگ سرخ نظر آرہا ہے جس کی برہنگی کو چھپانے کے لئے جگہ جگہ مرمر کے مختلف اینٹ کتبے لگا دیئے گئے ہیں۔ سنگ مرمر کی زمین پر کہیں گلدانوں کے نقوش چمک رہے ہیں



ربی پاکستان میں

یم طرز تعمیر کے

چند نمونے

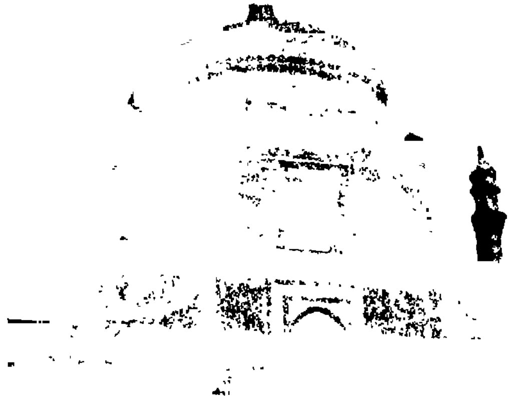
لاہور:

مسجد وزیر خان کا صدر دروازہ



شالامار باغ

۱



مقبرہ حضرت شمس تبریز رح (ملتان)



سندھ کے تالپور حکمرانوں کے مقبرے (حیدر آباد)



قلعہ حیدر آباد

اور کہیں خطوط کا تناؤ اور حسین امتزاج صناعوں کے کمال کی داد طلب کر رہا ہے۔ مقبرے کے مینار پانچ منزلہ ہیں۔ تیسری منزل تک ان میں بھی سفید اور کالے پتھر کی لہراتی ہوئی دھاریوں سے آراستہ کر دیا گیا ہے۔ مقبرے کی چھت پہ سنگِ مرمر لگا تھا لیکن سکھا شاہی کی بھینٹ چڑھ گیا۔ مرکز میں ایک چھتر اور اس کے گرد سنگِ مرمر کا جالی دار کٹہرا تھا۔ اس کا بھی وہی حشر ہوا۔ چھتر کے سائے میں، نیچے لوحِ مزار کو روشن کرنے کے لئے ایک روشندان ہے ۔۔۔ مگر نیچے کیوں نہ چلیں۔ مزار کے اردگرد بہت سی غلام گردشیں یا جو کچھ بھی انہیں کہہ لیجئے قدم قدم پر آپ سے داد طلب کر رہی ہیں۔ ان کے گنبدوں کی شہد کے چھتوں کی شکل و صورت کی ساخت، دیواروں کے سنگِ مرمر میں کندے ہوئے نقش و نگار، جن میں نگوار پتھروں کو کاٹ کاٹ کر جوڑ جوڑ کر ایسے ایسے گل بوٹے بنائے گئے ہیں کہ جوہری رشک کریں۔ اور ذرا اپنے قدموں کی طرف بھی نگاہ ڈالئے۔ یہ پانی نہیں پتھر ہے۔ بلور سا چمکتا جس کے سینے میں سنگتراشی کے کمالات منعکس ہو رہے ہیں ۔۔۔ مگر یہ تلاوت کی آواز کہاں سے آ رہی ہے؟ آیئے دیکھیں ۔۔۔ سنگِ مرمر کی جالی کے پیچھے مزار کے سرہانے (جس کے مرمریں تعویذ پر اللہ کی ننانوے صفات اب بھی پتھروں میں کھدی ہوئی ہیں، ممکن ہے کسی زمانے میں ان کی جگہ جواہرات ہونگے) جہانگیر کی تربت کے سرہانے یہ سیاہ پوش کون ہے! اس کے چہرے پر نقاب ہے۔ ہونٹ ہل رہے ہیں، اب اس نے فاتحہ کے لئے ہاتھ اٹھائے ۔۔۔ یہ وہی نورجہاں ہے جو جہانگیر کے پردے میں مغلِ اعظم کی سلطنت پر حکومت کرتی تھی۔ مگر اب گوشہ نشین ہے۔ اور میت کی دعائیں مانگ رہی ہے۔ ایک طرف ہو جایئے اس غلام گردش کی اوٹ میں ہرچند کہ اس کے عروج کا زمانہ ختم ہو چکا لیکن آخر وہ نورجہاں ہے۔ سیاہ لباس نے اسے اور بھی حسین بنا دیا ہے اور آنکھیں رکھنے والوں کی نظر میں اس کا وقار اب پہلے سے بھی دوچند ہے ۔۔۔ ملکہ کہاں جا رہی ہے! کہاں چلی گئی؟ آنکھ جھپکنے میں کہاں غائب ہو گئی؟ ۔۔۔ نہیں وہ ملکہ نہیں تھی۔ اس کا تصور تھا ۔۔۔ وہ تو اپنے شوہر کے مقبرے کے مغرب میں اپنی آخری آرام گاہ میں ابدی نیند سو رہی ہے۔

نورجہاں کا مقبرہ ریلوے لائن کے اس طرف واقع ہے۔ اینٹوں کا برہنہ ڈھانچہ۔ اس کا سنگِ مرمر سکھوں کی تعمیرات کی نذر ہو گیا۔ اب صرف دو تعویذ باقی ہیں۔ ایک ملکہ کی قبر کا نشان ہے اور دوسری اس کی بیٹی لاڈلی بیگم کا سنگِ مزار۔ مقبرے کے تہہ خانے میں ان تعویذوں کے عین نیچے، ماں بیٹی کے تابوت اس زمانے تک معلق تھے جو پنجاب کی تاریخ میں "سکھا شاہی" کے نام سے مشہور ہے۔ ان لوگوں نے مقبروں تک کو برہنہ کر دیا... جب میں ان تابوتوں کی بے حرمتی کا تصور کرتا ہوں تو مجھے منٹو کے "ٹھنڈا گوشت" کے ہیرو ایشر سنگھ کے کردار پر بھی شک گذرنے لگتا ہے کہ آیا اس کی انسانیت واقعی زندہ تھی۔ لیکن پانچوں انگلیاں ایک سی نہیں ہوتیں جذبات کی رو میں بہ کر ہمیں تعصب سے کام نہیں لینا چاہیئے۔ مگر طبیعت اداس ہو گئی تو آیئے چلیں۔ تاریخ کی کس قدر ستم ظریفی ہے کہ اپنے عہد کی حسین ترین عورت کی آخری آرامگاہ اسقدر اجاڑ ہو۔

اب ہم راوی کے اس پار پہونچ چکے ہیں۔ زمانے کے ساتھ ساتھ دریا بھی بدلتے رہتے ہیں۔ مغلوں کو دریا کا قرب ہمیشہ پسند رہا ہے۔ لاہور کا قلعہ بھی دریا کے کنارے واقع تھا۔ اسی راوی کے کنارے۔ اب قلعہ تو وہیں ہے دریا اس کا پہلو چھوڑ چکا ہے۔ اس کے بجائے اب بوڑھے راوی کا گندا نالا باقی رہ گیا ہے لیجئے ٹکسالی دروازہ آگیا۔ ظاہر ہے یہاں کبھی ٹکسال ہوگی مگر دریاؤں اور حکومتوں کے ساتھ ساتھ سکے بھی تو بدلتے رہتے ہیں۔ جو سکہ کل کھرا تھا آج کھوٹا ہے جو آج کھرا ہے کل کھوٹا ہوگا۔ ان کی قیمتیں بدلتی رہتی ہیں۔ مسجد عالمگیری پر اس زمانے میں پانچ لاکھ روپے خرچ ہوئے تھے آجکل کے حساب سے شاید یہ کام ایک کروڑ میں ہو جائے۔ بہت ممکن ہے دس بیس تیس لاکھ روپے اوپر ہی ہو جائیں آخر ٹھیکہ داروں اور متعلقہ لوگوں کو بھی تو کچھ فائدہ ہونا چاہیئے۔ مگر جہاں تک دیکھیے مسجد ہی مسجد دکھائی دیتی ہے۔ سنگِ سرخ کی دیواروں پر سنگِ مرمر کے گنبد۔ اور یہ مینار تو دیکھئے۔ یہ بھی غنیمت ہے کہ دستاروں کا زمانہ نہیں رہا ورنہ عمامہ گر جاتی ۔۔۔ سامنے صدر دروازہ مثمنی شکل کا ہے جس کے چاروں کونوں پہ چھوٹے چھوٹے مینار ہیں۔ سامنے ۵۴۰ مربع فٹ کا صحن ہے۔ بیچ میں حوض۔ سامنے مسجد کی صدر عمارت میں بارہ در ہیں۔ مسجد کے صدر مینار جن کی تعداد چار ہے کوئی ۱۴۵ فٹ بلند ہیں صحن کے گرد دیوار ہے جس کے ساتھ حجرے بنے ہوئے ہیں۔ آیئے اب واپس چلیں۔ لیجئے پھر صدر دروازہ آگیا۔ لاہور کے کچھ خاندان اسے خونی دروازہ بھی کہتے ہیں قیامِ پاکستان کے بعد جب پہلی عید آئی تو نماز کے بعد جلدی سے گھر پہنچنے کی کوشش میں ہجوم کا ریلا جو آیا تو کئی بندگانِ خدا کچلے گئے۔

عالمگیری مسجد کے صدر دروازے سے باہر نکلئے تو دائیں ہاتھ اس مردِ قلندر کی بارگاہ ہے جس نے ہمیں خودی کا سبق دیا اور سب سے پہلے

پاکستان کا خواب دیکھا۔ سنگِ سرخ کی یہ مختصر سی خانقاہ یوں تو اپنے ماحول سے خاصی ہم آہنگ معلوم ہوتی ہے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے قلندر کی خانقاہ کسی کھلے میدان میں کسی اونچے بہت ہی اونچے چبوترے پر واقع ہونی چاہئے تھی مجھے اقبال کی قبر کا تعویذ بھی یاد آ گیا۔ اتنے بڑے تعویذ کے لئے اس سے چوگنی جگہ درکار تھی۔ اب کے یوم اقبال پر آپ اگر فاتحہ خوانی کو جائیں تو میری اس رائے پر غور کیجئے گا ——

جی ہاں یہ حضوری باغ ہے۔ اور یہ بارہ دری رنجیت سنگھ نے مسلمانوں کے مقبرے کے اینٹ پتھر سے بنوائی تھی۔ اور یہ سامنے ہے عالمگیری۔ قلعۂ لاہور کا دروازہ۔ یہاں یہ بتانا شاید بے محل نہ ہوگا کہ چند سال ہوئے کچھ بزرگوں نے مل کر اس کا نام بدلنے کی کوشش کی تھی لیکن خوش قسمتی سے رائے عامہ نے ان کے ارادوں کو کامیاب نہ ہونے دیا، ورنہ تاریخ کے بہت سے اندراجات غلط ہو جاتے۔ ہمیں پرانی تاریخیں بھی بدلنا پڑتیں جو ہمیں قلعہ لاہور کی کہانی بتاتی ہیں —— خیر ...... مے بخیر گذشت!

تو صاحب یہ ہے قلعۂ لاہور —— قلعے، حرم سرائیں، خوابگاہیں حمام، مسجدیں اور مقبرے —— مغلوں کا سارا فن تعمیر انہی عمارتوں پر ختم ہو جاتا ہے۔ انہی سے ان کی جدت و اختراع کا پتہ چلتا ہے۔

شاہجہاں کی مسجد دیکھنے والوں کو اس کے پوتے کی مسجد دیکھ کر ممکن ہے مایوسی ہوئی ہوگی۔ اگلے وقتوں کے مطلق العنان بادشاہ فنون لطیفہ کے سرپرست ہی نہیں مقنن بھی تھے۔ فتح پور سیکری میں اکبر کی ایجادیں اور روضۂ تاج اور لال قلعہ میں شاہجہاں کی سحر طرازیاں آپ نے دیکھی ہوں گی۔ جلال الدین اکبر مذہب کے معاملے میں آزاد خیال آدمی تھا۔ اس کے حرم میں راجپوت سرداروں کی لڑکیاں تھیں۔ اس کی رانیوں نے ہندوؤں کے طرز تعمیر کو معمولی تبدیلیوں کے ساتھ ایران کے فن میں شامل کر دیا۔ جودھا بائی کے محل اور سیکری کی دوسری عمارتوں میں دالانوں اور ستونوں کو دیکھئے۔ پھندنے سے لٹکتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں ستونوں کی بالائی شاخیں جو چھتوں کو سنبھالے ہوئے۔ وزنی ہیں اور گرانی کا احساس ہوتا ہے جیسے یہ عمارت آپ کو کچل دے گی۔ اس کے برعکس شاہجہاں کو دیکھئے۔ اس کے مذہبی خیالات اکبر سے مختلف ہیں، اس کے مزاج میں اپنے دادا کی بہ نسبت زیادہ نفاست موجود ہے۔ اکبر ہندوستان کے تخت پر تیسرا، بلکہ ایک لحاظ سے دوسرا بادشاہ تھا۔ شاہجہاں اس طویل

مریض سلطنت کا پانچواں شہنشاہ ہے۔ وہ آس پاس کی چکاچوند سے جلدی مرعوب نہیں ہوتا۔ اس کا جمالیاتی ذوق غیر ضروری چیزوں کو بلا تأسف رد کر دیتا ہے۔ چنانچہ اس کی تعمیرات میں بوجھل پن نہیں ملتا۔ اچھے شعر کی طرح ان میں کوئی لفظ زائد نہیں ملتا ——

—— اب اس کے بیٹے عالمگیر کو لیجئے۔ جہاں اُسکے پردادا نے اپنی آزادہ روی اور سیاسی مصلحتوں سے ایک نیا مذہب گھڑ مارا، وہاں عالمگیر مذہب کے معاملے میں دین اسلام کی پہلی سادگی کا قائل تھا۔ ایسے ہی اس سے اس آرائش کی توقع بھی نہیں کی جا سکتی جو شاہجہاں کی عمارتوں کی خبر دیتی ہے یہی وجہ ہے کہ لاہور کی مسجد عالمگیری میں جمال کی بجائے جلال کا رنگ نمایاں ہے: اس تاریخی پردے میں اب قلعہ لاہور کو دیکھتے چلئے۔ اس کی تعمیر میں اکبر سے لے کر عالمگیر تک سبھوں کا ہاتھ ہے —— آج قلعہ ہی کی حالت خاصی غیر ہے اور بیشتر عمارتیں کھنڈروں میں تبدیل ہو رہی ہیں۔

دیوانِ عام کے شمال مغربی کونے کا ایک صحن اکبر اور جہانگیر کے ہاتھ کا اعلان کر رہا ہے۔ یہ پہلا دور ہے۔ دوسرے دور کے "ہاتھی پول" محل کے خصوصی دروازے کی ایک تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ یہ شاہجہاں کا دور ہے۔ تیسرا دور مغربی دروازے اور حضوری باغ یعنی عالمگیر کا دورِ تعمیر ہے۔ پہلے دور میں متھرا کا پتھر اور اینٹیں استعمال کی گئی ہیں اور ہندو طرز تعمیر و آرائش کا پتہ چلتا ہے۔ اس میں دیواروں پر جانوروں کی تصویریں بھی نظر آتی ہیں —— جنوبی علاقے کی عمارتیں اب ڈھے چکی ہیں۔ یہاں شہنشاہ جھروکہ درشن دیتے تھے۔ تخت کے کمرے میں سنگ مرمر کا چھپر تھا۔ تخت کے عقبی علاقے میں جہانگیر کا برج ہے —— وہ دیکھئے۔ اس شہ نشین میں۔ رومانوں کا ماتا شہزادگی کے عالم میں راوی کا نظارہ کر رہا ہے۔ صحن میں باغ بھی ہے۔ اکبر کا بیٹا باغوں کا عاشق ہے۔ یہاں حوض کے گرد فوارے اچھل رہے ہیں۔ اپنی تزک میں وہ نئی عمارتوں کی تکمیل کا ذکر کرتا ہے "جو حسن و نزاکت کا نمونہ ہیں اور مصوری کے اساتذہ فن کے کمالات سے مزین ہیں" —— خیال رہے کہ انصاف اور محبت کے علاوہ تیسرا فن جو جہانگیر سے منسوب ہے مصوری ہے۔ "مغل سکول آف آرٹ" کا عروج اس کی سرپرستی کا مرہون منت ہے —— یہ عمارتیں استاد عبدالکریم کے فن کا نمونہ ہیں۔ شاہجہاں کے ہاتھی دروازے پر بھی استاد کا نام آتا ہے۔ معمور خاں (عبدالکریم)

شاہی معمار ہے۔ اُستاد احمد لاہوری (معمارِ تاج) پر ابھی کسی کی نظر نہیں پڑی۔ تخت کے آگے چالیس ستونوں والا دیوانِ عام بھی شاہجہاں کے حکم سے بنایا گیا۔ لیکن تباہ ہو گیا۔ اس کی جگہ اب جدید قسموں والی ایک بھونڈی اور بھدی عمارت کھڑی ہے۔ ستون البتہ وہی ہیں۔ لیکن اس عمارت کو دیکھ کر شاہجہاں یقیناً خودکشی کر لیتا۔ شاہ برج کی عمارتیں بھی شاہجہاں کی نگرانی میں مکمل ہوئیں —— یہ شاہجہاں کی جوانی کا زمانہ معلوم ہوتا ہے چنانچہ وہ فن میں روایت سے باغی ہے وہ معمول کے خلاف عجیب و غریب تصویریں بنوا رہا ہے۔ یہ تصویریں پتھر میں کھود دی گئی ہیں۔ اور ایشیا میں اپنی مثال آپ ہیں (یہ ماہرین کی رائے ہے)۔ یہ تصویریں ایرانی صنعت گری کا پتہ دے رہی ہیں۔

اب ہم قلعے کے شمالی مغربی کونے میں کھڑے ہیں —— یہ شیش محل ہے۔ اس کے سامنے دوہرے ستون چھت کو سنبھالے کھڑے ہیں۔ اور ذرا قوسیں تو دیکھئے۔ ہلال کی قوسیں ہیں۔ ابروؤں کی کمانیں جو ایک دوسرے کے ساتھ ملتی چلی گئی ہیں۔ ہر محراب ۱۴ کمانوں پر مشتمل ہے۔ ستون جو دوازدہ پہلو ہیں، ساتھ ساتھ نہیں بلکہ آگے پیچھے کھڑے ہیں۔ پائے منقش ہیں اور سر میں کنول کی پتیاں ہیں۔ دونوں ستونوں پر تین متوازی قوسیں نظر آ رہی ہیں۔ دیواروں کا زیریں حصہ سنگِ مرمر کا ہے۔ اوپر شیشوں کے ٹکڑے جڑے ہیں۔ گذشتہ صدی میں اس عمارت کا حلیہ بگاڑنے کی کافی کوشش کی گئی ہے۔ چنانچہ سکھوں اور انگریزوں نے ریشم میں جہاں جہاں ٹاٹ کے پیوند لگائے ہیں وہ صاف آنکھوں میں کھٹک رہے ہیں۔

شیش محل کے مغربی صحن میں یہ جو سنگِ مرمر کی کھلونا سی عمارت نظر آ رہی ہے نولکھا کے نام سے مشہور ہے۔ اس میں بھی سنگِ مرمر کو کھود کر اس میں رنگ رنگ کے پتھر نگینوں کی طرح جڑ دیئے گئے ہیں۔ اس کی چھتری تو دیکھئے جیسے نئے چاند آڑے کر کے چھجے کی جگہ لگا دئے ہوں۔ روشنی ان سے یوں پھسلتی ہے جیسے چاندی کا مینہ برسے۔

اور شاہ جہاں کی یہ چھوٹی خواب گاہ بھی دیکھتے چلئے۔ آج کوئی خواجہ سرا ہمیں نہیں روکے گا۔ کچھ لوگ اس عمارت کو دیوانِ خاص سے بھی منسوب کرتے ہیں۔ میری بھی یہی رائے ہے۔ خواب گاہ میں کچھ زیادہ تخلیہ کی ضرورت ہونی چاہئے اور خدا معلوم یہاں کتنی خوابگاہیں ہوں گی۔ لیکن جہاں ان خواب گاہوں کے اجالے خاک میں جا چھپے وہاں یہ خواب گاہیں کیوں باقی رہتیں۔ وہ لوگ جو تابوتوں تک کا احترام نہیں کر سکے تھے، انہوں نے ان خلوت کدوں کے پتھروں کو بھی اپنی زبانوں سے چاٹ لیا ہوگا ۔۔۔

مگر آئیے اب چلیں۔ کب تک ان کھنڈروں میں مُردوں سے باتیں کیجئے گا۔ لاہور، زندہ و پائندہ لاہور۔ آپ کو بلا رہا ہے۔ لاہور کے بے فکروں کے چہچہے۔ لاہور کی وزیر خاں کی مسجد جس میں ایرانی عنصر غالب ہے اور جس کی کاشی کاری دیکھ کر آدمی دنگ رہ جاتا ہے۔ لاہور کا شالامار جس کی نشستگاہیں اب ویران پڑی ہیں۔ مجھے وہ مغنیہ تصویر آج بھی یاد ہے جس میں جہانگیر شالامار کے حوض کے درمیانی چبوترے پر جلوہ فگن ہے۔ حوض میں فوارے اچھل رہے ہیں اور کنیزیں جل پریوں کی طرح تیر رہی ہیں۔ نیلے نیلے پانی کی شفاف لہروں کے نیچے ان کے کندن سے بدن ساون کی بدلیوں میں بجلی کی طرح لہرا رہے ہیں۔ عابد علی عابد نے اس تصویر سے متاثر ہو کر ایک نظم بھی کہی تھی۔ اس کا ایک مصرع مجھے یاد ہے۔ آپ بھی سن لیجے ؏ جہانگیر آج شالامار میں ساون مناتا ہے

—— کہتے ہیں اب وہ برساتیں ہی نہیں ہوتیں — تو چلئے ——

—— لیکن کہاں؟ لاہور کا ذرہ ذرہ ہوشربا ہے۔ یہاں ہزاروں کہانیاں دفن ہیں۔ تو قبل اس کے کہ آپ بھی لاہور زدہ ہو جائیں اس طلسم سے بچ کر نکل چلئے۔ ورنہ آپ یہیں کے ہو رہیں گے۔

روغنی اینٹیں آپ نے مقبروں اور محلوں میں دیکھی ہوں گی۔ ریلوے سٹیشنوں پر ان کا کیا کام؟ مگر یہ ملتان کا ریلوے سٹیشن ہے۔ یہ "گرد و گرما گدا و گورستاں" کے تحفوں کا شہر ہے۔ یہاں کی کاشی کاری مشہورِ زمانہ تھی۔ یہ نیلی روغنی اینٹیں جو آپ کو ریلوے سٹیشن کی پیشانی پر دکھائی دے رہی ہیں۔ مقامی صنعت کا نمونہ ہیں۔ اب یہ زوال پذیر ہے۔ یہ زوال پذیر ہونا بھی خوب چیز ہے۔ کس کا زوال کب اور کیوں شروع ہوا! یہ تاریخ کا ایک بہت بڑا سوال ہے۔ خیر یہ جملۂ معترضہ ہے۔ گرد و گرما کا اندازہ تو آپ کو ہو گیا ہوگا۔ شہر چلئے تو گداؤں سے بھی ملاقات ہو جائیگی۔ اس کے علاوہ شہر آئے ہیں تو مقبروں پر بھی نظر ڈالتے چلئے جن سے آپ کو یہاں کے فنِ تعمیر کا اندازہ ہو جائیگا جو ہماری سیاحت کا اصل مقصد ہے۔ مغلوں سے پہلے کے پانچ مقبروں میں سب سے پرانا شاہ یوسف گردیزی کا روغنی اینٹوں والا مقبرہ ہے۔ لمبوترا سا، چھت سپاٹ۔ سنہ ۱۱۵۲ء میں بھی لوگ بیسویں صدی کی طرح سپاٹ چیزوں کے قائل تھے۔ پسند

اپنی اپنی۔ اس کی ایک دیوار میں محراب بھی نظر آ رہی ہے —— اور یہ بہاء الحق کا مزار ہے۔ سال: ۷۲۶ھ۔ اس کی دیواریں ڈھلوان ہیں، روشنی کے لئے کھڑکیاں لگی ہیں۔ پاکستان و ہند میں ایرانی طرز کا سب سے پرانا نمونہ بھی یہیں ملتان میں واقع ہے۔ یہاں شیخ رکنِ عالم دفن ہیں جو اپنے زمانے کے مشہور بزرگ تھے۔ دلی کے سلطان غیاث الدین تغلق کو ان سے بہت عقیدت تھی۔ چنانچہ وہ مقبرہ جو اس نے اپنے لئے بنوایا تھا اس نے شیخ کے لاشے کی نذر کر دیا۔ اس مقبرے کی بلندی ۱۱۵ فٹ ہے۔ مینار آٹھ اور برجیاں نو (گنبد کی مرکزی برجی بھی اس میں شامل ہے)۔ باہر گہری نیلی، سفید اور آسمانی روغنی اینٹیں چمک رہی ہیں۔ مگر جون کے مہینے میں یہ ملتان کی سیر کی کیا سوجھی ہے۔ خدا را بھاگ چلیئے یہاں سے۔ کہتے ہیں اس شہر پر کسی مجذوب کی بد دعا معلق ہے۔ روایت ہے کہ مجذوب کے جسم کی کھال یا تو کسی حاکم نے اتار دی تھی یا شاید اس نے خود ہی کھینچ ڈالی تھی۔ اور وہ اسی حالت میں گھومتا پھرتا تھا۔ کوئی اسے مچھلی بھوننے کے لئے آگ کا انگارہ تک دینے کا روادار نہیں تھا۔ چنانچہ اس نے دعا کی اور سورج نیچے اتر آیا۔ جس کی آگ میں اس نے اپنی مچھلی بھون لی۔ سورج اپنا یہ کام آج تک نہیں بھولا اور گرمیوں میں نیچے اتر آتا ہے۔ یہ بھی غنیمت گذری کہ بد دعا دینے اور سورج کو نیچے اتارنے کی طاقت ہر ایک کو نہیں ملی ورنہ فضائے بسیط میں ہماری تہذیب کی راکھ بھی گم ہو چکی ہوتی اور دوسرے ستاروں کی مخلوق اس سے قیاس آرائیاں کرتی کہ یہ کرۂ ارض کی خاک ہے، انسانی تہذیب کی خاک جہاں نیک انسانوں کی کوششوں کے باوجود آدمیت کا لفظ کبھی شرمندۂ احسان نہ ہوا اور تعصب سے باز نہیں آیا۔

اب ہم سندھ کے ریگستان میں ہیں۔ مقام "ٹھٹھہ" ہے۔ کیفیت وہی ملتان کی۔ گداؤں کو چھوڑ کے۔ خیرات دینے اور لینے والے سبھی پیوند خاک ہو چکے ہیں۔ اندازہ ہے کہ یہاں کے گورستان کی آبادی دس لاکھ کے لگ بھگ تو ضرور ہوگی۔ حکمرانوں اور دنیوی جاہ و جلال سے بے نیاز بزرگوں کے مقبرے اور روضے عوام کی قبروں سے بلند اور حسین ہیں۔ گرمی سے بچنے کے لئے ان کے گرد اگرد دیواریں ہیں اور اوپر گنبد یا درخت چھتیں۔ لیکن دوسری قبریں ننگی ہیں۔ اگر وہ جیتے جی دھوپ اور لو برداشت کر سکتے ہیں تو اب بھی ان کے لئے موسم کی شدت معمولی بات ہے۔ بلکہ ایک لحاظ سے وہ مزے میں ہیں۔ نہ کسی دیوار کے بیٹھنے کا ڈر ہے نہ گنبد کے گرنے کا "دھڑکا"۔ "ٹھٹھہ" کے گورستان سے روغنی اینٹوں کے رواج کا پتہ چلتا ہے۔ حیدرآباد سے تیس میل کے فاصلے پر "ہالہ" ہے جہاں یہ صنعت جو کبھی خوب چمک رہی تھی، اب ہچکیاں لے رہی ہے —— روغنی اینٹوں کا کمال دیکھنا ہو تو ٹھٹھہ کی جامع مسجد دوں میں دیکھئے۔ یہ خالص ایرانی طرز تعمیر کا نمونہ ہے۔ اس کے اندر ایرانی کاشی کاری کو دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ چنگیز کے خاندان کے کسی نیک سیرت بزرگ نے ۱۵۸۸ء میں بنوائی تھی۔ دوسری جامع مسجد شاہجہاں کے حکم سے تعمیر ہوئی۔ یہ اس وقت کا ذکر ہے جب جہانگیر اس سے ناراض تھا۔ اس کی بنیادیں پتھر کی ہیں لیکن باقی عمارت پختہ اینٹوں کی ہے۔ اس کا حجم آدمی کو حیرت میں ڈال دیتا ہے۔ درمیانی صحن، جو کھلا ہے، ۱۶۴ × ۹۰ فٹ ہے۔ اسکے اردگرد گنبدوں والے حجرے ہیں۔ ان گنبدوں کے اوپر کلس یا مینار نہیں ہیں۔ چھوٹے بڑے گنبدوں کی تعداد ۹۳ ہوتی ہے —— انہیں دیکھ کر کیا آپ کو یہ نہیں محسوس ہو رہا جیسے صحرا کے سینے سے بلبلے اٹھ رہے ہوں۔ شاہجہاں کو جو سوجھتی تھی نئی سوجھتی تھی۔

اب کوئی ساڑھے چار ہزار سال پیچھے چلیئے۔ وقت کے لحاظ سے سفر لمبا ہے۔ لیکن فن تعمیر سے دلچسپی رکھنے والوں کی معلومات میں اضافہ ہوگا —— مقام موہنجوڈارو ہے۔ وادئی سندھ کی تہذیب کا سب سے پرانا مرکز۔ کچھ لوگ اسے تہذیب کا پہلا گہوارہ بھی گردانتے ہیں۔ لیکن تقدم و تاخر کے جھگڑوں سے ہمارا کیا علاقہ —— تو یہ ہے موہنجوڈارو! آپ کو سرحد کی ڈھیریاں یاد ہوں گی۔ شاہ جی کی ڈھیری۔ چارسدہ کی ڈھیریاں ..... سندھی زبان میں "ڈارو" اسی "ڈھیری" کا ہم معنی ہے۔ یعنی ٹیلہ۔ کبھی یہ ڈھیریاں اور ڈارو آبادیاں تھیں۔ موہنجوڈارو کا مطلب ہے مردوں کی ڈھیری۔ اس ڈھیری کی کھدائی تہذیب کی کہانی کو پانچ ہزار سال پیچھے لے گئی ہے۔ اس تہذیب کے وہ سب مظاہر اس وقت ہیں کوئی سروکار نہیں۔ ہمارا موضوع فن تعمیر ہے۔ اس زمانے میں یہ فن کس حالت میں تھا اس کا اندازہ بس اس سے لگا لیجئے کہ یہاں سے کروڑوں پکی اینٹیں دبی ہوئی نکلی ہیں۔ یہاں گھروں کی دیواریں سامنے بھی تھیں۔ حمام تھے۔ کنوئیں تھے۔ غسلخانے تھے۔ گندے پانی کی نکاسی کے لئے نالیاں، موریاں اور بدرروئیں موجود ہیں۔ سیلاب سے بچاؤ کے لئے بند بندھا ہے۔ مگر —— یہ "مگر" قابل غور ہے —— مگر یہاں کی حکومت یا اسے جو کچھ بھی کہہ لیجئے، کچھ ایسی زیادہ انفرادیت

(باقی صفحہ ۵۲ پر)

افسانہ

یادِ ایّامے
(۲)

ابوالفضل صدیقی

تایا کے خیال میں کارتوسی بندوق سے کچھ غدر سنہ ۵۷ء کے ہتھیاروں جیسی عصبیت تھی اور اپنی بگڑی ہوئی زبان میں "بریچ لوڈ" کو "بریچ لوٹ" کہتے تھے۔ خاص طور پر اس میں یہ عیب بتاتے تھے کہ یہ جلدی جلدی بھری جا سکتی ہے اور اس سے شکار میں بے تکے فیر اور فضول دھماکے زیادہ ہوتے ہیں، اور ان کے نزدیک جتنا شکار زیادہ دھماکوں سے خراب ہوتا ہے اتنا مارنے سے نہیں ہوتا۔ وہ کہا کرتے تھے کہ "بریچ لوٹ" کے دھماکے جتنا شکار مار نہیں سکتے اس سے کہیں زیادہ خراب کر دیتے ہیں اور اس حد تک انتشار پیدا کرتے ہیں کہ جانوروں کی نسل تک منقطع کرنے کے باعث ہیں۔ سنگھ بابو ہماری پارٹی کا سب سے زیادہ چلتا پرزہ، اور بے پناہ شکاری تھا اور تایا کی استادی کا ان کے سامنے تو خیر معترف تھے مگر پیچھے ان کے تذکرہ پر ان کی تعریف میں حصہ نہ لیتے تھے اور یوں تایا کا بہت احترام کرتے تھے۔ ایک روز تایا کی موجودگی میں بولے کہ تایا کا شکار کچھ "ان سپورٹنگ" قسم کا ہے۔ اور میں تایا کے حضور میں ذرا بیباک تھا۔ میں نے تایا سے کہا کہ "تایا ہمارے سنگھ بابو کا خیال ہے، کہ آپ کا شکار شکاری جیسا نہیں بلکہ کچھ قصائی پن سا ہے"۔ مشہور بات تھی کہ تایا کو کبھی غصہ نہ آتا تھا، اگر شکار میں فیر خالی چلا جاتا تو آزردگی کے مارے دو دو وقت کھانا چھوڑ دیتے تھے، مگر یہ تنقید سن کر تایا کا چہرہ سرخ ہو گیا اور براہِ راست سنگھ بابو سے مخاطب ہوئے اور نہایت طنزیہ تیوروں اور مدھم انداز میں بولے "اے واہ میری جان! کس معنی کر! ٹھاکر جی، یعنی اے واہ میری جان آپ منشلین بریچ لوٹ والوں کی کیا کسوٹی ہے، اے واہ میری جان بولو نا، یہی کہ کم سے کم فیروں میں زیادہ سے زیادہ شکار مار کر دکھاؤ۔ ہاں تو اے واہ میری جان اب رہا طریقۂ شکار کا سوال تو اس کے یہ معنی ہوئے کہ جس طریقہ میں کم سے کم دھماکوں میں زیادہ سے زیادہ شکار ہاتھ آسکے وہی طریقہ سب سے بہتر ہے اور آپ کے نئے طریقہ سے ہمارا پُرانا طریقہ اچھا ہے"۔

تایا نے مختصر سے جملوں میں بات نہایت مختتم قسم کی کہہ دی تھی لیکن سنگھ بابو نے کہا "مگر تایا جانور کو جب تک بچنے کا موقع نہ دیا جائے، اس وقت تک شکار کا کیا لطف اور ہمارے شکار کے اعلیٰ و ادنیٰ ہونے کا معیار یہی ہے کہ جو جانور سب سے کمیاب اور زیادہ سے زیادہ چوکنا ہو اسی کا شکار اونچی قسم کا مانا جاتا ہے"۔

"لیکن اے واہ میری جان! آپ شکار میں زیادہ سے زیادہ مارنے کو آتے ہو یا زیادہ سے زیادہ بھڑکا کر بھگانے کو، اے واہ میری جان، تم لوگ مارتے بہت کم ہو اور اے واہ میری جان بھڑکاتے زیادہ ہو، بس ٹھائیں ٹھائیں ٹھس ایک مارا اور ہزار خراب کئے۔ اور اس حد تک اے واہ میری جان کہ بھڑک کر بھاگتے بھاگتے اے واہ میری جان نسل ہی منقطع ہوئی جا رہی ہے اور شکار ناممکن ہوتا جاتا ہے"۔ لیکن تایا بھڑکے ہوئے شکار کے مارنے میں لطف ہی کچھ اور ہے"۔

"اے واہ میری جان! جس وقت جنگل کے ہانکے میں تمہاری اس ٹھائیں ٹھائیں سے بھڑک کر کوئی اڑنہ تایا کے داؤں سے گذرتی ہے، تو تایا کو بھی یہ مزہ آجاتا ہے جس کا تم ذکر کر رہے ہو۔ اور جس وقت تمہاری ٹیم کے بے تکے انگریزی فیروں سے کوئی کوئی اچھی قسم کی مرغابیوں کے بڑے بڑے تنگ بدحواس ہو کر اے واہ میری جان تایا کے سر پر کھنی دیتے آتے ہیں تو بھی تایا اپنا ہاتھ دکھا دیتے ہیں کہ اے واہ میری جان تمہاری آنکھیں پھٹی رہ جاتی ہیں، بس فرق اتنا ہے کہ تم دھماکوں سے بھڑکا کر بھگاتے زیادہ ہو اور تایا مارتے زیادہ ہیں۔ سمجھ لو کہ اے واہ میری جان زیادہ دھماکے کرنا کوئی کمال نہیں ہے، خالی دھما کا اے واہ میری جان گھر بیٹھے بھی کر سکتے ہو۔ زیادہ مارنا کمال ہے اے واہ میری جان، شکاری چڑیوں، چوپایوں کو قدرت نے یہ سبق دیا ہے اور اپنی اپنی داؤ گھات سب

کرتے ہیں اور سب خاموشی سے شکار کرتے ہیں، بیچ بیچ چنگھاڑ کر تو اے واہ میری جان شیر بھی نہیں مارتا اور لے واہ میری جان تمہارا شکار قانون قدرت کے خلاف ہے۔ اور اے واہ میری جان تایا جنگل میں دھماکے کرنے نہیں آتے شکار کھیلنے آتے ہیں اور اللہ نے تمہارے کانوں کو یہ توفیق دے دی ہے کہ دھماکے اچھے معلوم پڑتے ہیں۔ بے پیرے بے مُریدے اول تو کوئی تمہارا استاد ہی نہیں اور اگر کوئی استاد ہے تو غلط ہے۔ تایا تو تمہارے بلے تلے فیر دیکھتے ہیں اور ہنستے ہیں۔ لے واہ میری جان!" آتشبازی کا شوق ہے تو گھر بیٹھ کر پٹاخے چھوڑو، اے واہ میری جان بے زبان جانوروں کو کیوں ہلکان کرتے ہو، اے واہ میری جان!" اور تایا کی منطق کا ہمارے پاس جواب نہ تھا۔ اور ہم لوگوں کو تایا کے شکار سے زیادہ ان کے تکیہ کلام میں لطف آتا۔ تایا فصلی شکاری تو تھے نہیں، بارہ ماسی قسم کے شکاری، اور بندوق اور جالوں تک ہی ان کا شکار محدود نہ تھا۔ تایا کو غلیل چلانے میں ید طولیٰ حاصل تھا۔ موٹے موٹے بانسوں کو چھیل چھیل کر اور ریت ریت کر بڑی تگڑی غلیلیں بناتے، نیل گائے اور سانبھر کے مضبوط پٹھوں کی تانت بٹتے، چکنی مٹی میں پرانی روئی اور سنی سڑا سڑا کر بڑے سخت اور مہلک غلے بناتے۔ غلیل کے نشانہ کی پریکٹس کا یہ عالم تھا کہ فضا میں ایک غلہ چلا کر اس میں دوسرا مار دیتے اور پھر تیسرا چوتھا، نہ معلوم یکے بعد دیگرے کتنے غلے ٹکرا دیتے، اور پھر ستم بالائے ستم یہ تھا کہ ان کی غلیل بازی بچکانہ کھیل جیسی نہ تھی۔ اڑتے ہوئے تیتر جیسے اہم اسپورٹ میں وہ اپنی غلیل سے بالکل وہی کام لے کر دکھاتے جو اور سب پارٹی بندوقوں سے لیتی۔ اڑتے ہوئے تیتر پر ہم نمبر ۹ اور نمبر ۶ کے چھروں کے فیر کرتے جس کے ایک کارتوس میں سات سو اور پانچ سو دانے بھرے جاتے ہیں۔ اور تایا اپنے سامنے سے اڑتے تیتر پر غلہ رسید کرتے اور اوٹ میں ہمارے لگ بھگ رہتے اور سب شکاریوں کے پیچھے ایک ایک مزدور دوسری بندوق اور کارتوسوں کا بیگ لئے چلتا اور فیر ہونے کے بعد خالی بندوق ہاتھ سے لے لیتا اور بھری دے دیتا مگر تایا اپنے غلوں کا تھیلا گلے میں ڈالے اپنے چوڑے چکلے ہاتھ میں سات غلے لئے آٹومیٹک رائفل کی طرح تیزی سے غلے چلاتے جاتے اور ایک مرتبہ تو تایا کی غلیل بازی اور تکیہ کلام دونوں نے دھاک بٹھا دی۔ ہمارے ایک انگریز دوست اگزیکٹیو انجینئر اور ان کے کچھ مہمان تیتر کے شکار کو ہمارے یہاں مدعو ہوئے، تایا پہلے تو گریز کرتے رہے، کیونکہ شکار پارٹی میں انگریز اور تین چار میمیں تھیں مگر ہم نے تبرکاً انہیں ساتھ رکھ ہی لیا تو کسی صورت کارتوسی بندوق لے کر پارٹی کے ساتھ باقاعدہ شکار پر طیار نہ ہوئے اور اپنی غلیل ہی لے کر چلے۔ پہلے تو انگریز مہمان خاص طور پر لیڈیز نے بہت کان کھڑے کئے۔ تیتر کے شکار میں پارٹی ایک محاذ میں گھاس کے اندر چلتی ہے اور مخصوص طریقہ سے "بیٹ" کی جاتی ہے اور شکاریوں کے سامنے سے تیتر اپنی مخصوص توپ کے گولے جیسی تند اڑان اڑتا ہے اور جیسے پلک مارتے فیر کیا جاتا ہے سب پارٹی آٹھ اور چھ نمبر کے چھروں کے کارتوس استعمال کر رہی تھی اور تایا مٹھی میں غلے بھرے اپنی مخصوص تیزی کے ساتھ اپنا اکیلا غلہ، اور اس پارٹی میں تو ہر اعتبار سے تایا نے مہمانوں کو اپنی جانب متوجہ کر لیا، خاص طور پر ان کے تکیہ کلام نے جو شکار میں ان کا نعرۂ تحسین بن جاتا تھا سب پارٹی کو بہت محظوظ کیا اور مس صاحبہ جن کا نام "میری جون" تھا۔ شروع میں تایا کی آوازوں پہ یہ سمجھتی رہیں کہ خاص طور پر ان کا نام پکار کر انہیں "چیئر اپ" کر رہے ہیں۔ مگر جب انہوں نے اندازہ کیا کہ تایا ہر شکاری کو انہیں کا نام لے کر "چیئر اپ" کر رہے ہیں تو مس "میری جون" نے بہت کان کھڑے کئے، اور نگاہیں تو پہلے ہی سے سب پارٹی کی تایا کی برزخ دیکھ کر ہی تایا کی جانب اُٹھ گئی تھیں باوجودیکہ تعارف کے وقت مجملاً تایا کی خصوصیات بتائی گئی تھیں لیکن ایسی پارٹی میں اس ہیئت کذائی کے ساتھ جو شکاری تیتر کے شکار میں غلیل لے کر میدان میں اترے اسے کون سمجھے گا کہ وہ جوکر یا بھانڈ نہیں ہے، مگر جب اپنی انگریزی کارخانوں کی اسپیشل آرڈر کے ذریعہ وزن، قد اور ہاتھوں کے ناپ کے مطابق سائنٹفک اصولوں پر طیار کی ہوئی بندوقوں کے دوش بدوش تایا کی بانس کی غلیل اور مٹی کے شیر قسم کے غلے کے جوہر دیکھے تو حیرت سے آنکھیں پھٹی رہ گئیں اور تایا کی ہر نقل و حرکت بڑے غور سے دیکھنے لگے اور اپنے شکار سے زیادہ تایا کے شکار میں لطف لینے لگے۔

شروع میں ہمیں اندیشہ ہوا کہ ہماری غیر ملکی مہمان خاتون مس "میری جون" اس بے تکلفی اور دریدہ دہنی کے ساتھ تایا کے منہ سے اپنا نام سن کر کہیں برا نہ مان جائیں اور اگر ہمیں پہلے سے علم ہو جاتا کہ ایک خاتون ٹھیک تایا کے تکیہ کلام کے مطابق تشریف لا رہی ہیں تو ہم تایا کو مدعو ہی نہ کرتے اور وہ تو وقت کے وقت تعارف پر معلوم ہوا لیکن اب بے سود تھا ہر چہ بادا باد، جس قدر محال یہ چیز تھی کہ "میری جان" اپنا نام بدل بھی لیں اور فراموش بھی کر دیں، اس سے کم یہ بھی نہ تھی کہ تایا اپنا تکیہ کلام چھوڑ سکیں

ہم لوگوں میں رائے زنی ہوئی کہ بعد کے کسی ناخوشگوار نتیجہ کے ظہور سے پیشتر بہتر ہے کہ مس صاحبہ کو پہلے سے متنبہ کر دینا چاہئے کہ تایا کا یہ تکیہ کلام ہے آپ "مائنڈ" نہ کریں مگر استاد رضا خاں نے کہا اس لئے کہ اگر وہ نہ بھی سُن سکیں تو بھی ضرور نہیں۔ لہٰذا یہ طے رہا کہ یوں ہی چھوڑا جائے اور پہلے سے خواہ مخواہ انہیں متنبہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

مگر مس میری جون" جتنی ستھری شکل کی لڑکی تھی اتنی ہی شگفتہ اسپورٹنگ اسپرٹ والی ہنسوڑ اور ملنسار قسم کی۔ شروع میں تو تایا کے اس مخصوص کرم اور توجہ خاص پر بہت خوش ہوئیں۔ لیکن ذرا دیر بعد جب اندازہ کیا کہ پارٹی بھر میں کسی کا بھی اچھا فیر پڑے، بڑے میاں صرف انہیں کا نام لے کر ایک خاص انداز میں چیئر اپ کرتے ہیں تو وہ کچھ گو مگو میں پڑ گئیں اور تایا کی آوازوں پر کان زیادہ گہرے لگا دئیے۔ پہلی "بیٹ" کے بعد ناشتہ پر جمع ہوئے تو ہر مہمان ساتھی تایا کی غلیل بازی سے حد درجہ مرعوب تھا۔ اور سب تایا کو ایسی نظروں سے دیکھ رہے تھے جیسے وہ کوئی مافوق البشر مخلوق ہیں۔

مس میری جان نے نہایت ادب کے ساتھ تایا سے کچھ استفسار کی اجازت چاہی جس پر تایا نے جیسے اُچھل کر کہا "اے واہ میری جان! فرماؤ فرماؤ، کیا فرماتی ہو آپ، اے واہ میری جان"۔

جواب پر مس میری جان بیچاری کچھ حیرت کے ساتھ استفساریہ انداز میں تایا کو بڑے غور سے دیکھنے لگیں، پھر ذرا سنبھل کر آواز صاف کرتے ہوئے کہا "ہوں، دیکھئے تو آپ تمام شکاریں مجھ ہی کو کیوں بڑھاتے رہے اور ہر ایک کے اچھے فیر پر میرا ہی نام لے کر کیوں چیئر اپ کیا"۔

تایا نے نہایت معصومیت کے انداز میں جواب دیا "اے واہ میری جان بڑا خوبصورت ہاتھ ہے آپ کا۔ اے واہ میری جان۔ اور ایک آپ ہی پر کیا منحصر اے واہ میری جان آپ سب کے سب بڑے نفیس ہاتھ ڈالتے ہو، طبیعت خوش ہو گئی کیا کہنے صاحبِ فن ہو، اے واہ میری جان!"

جو نئے ساتھیوں کو تایا کے اس تکیہ کلام کا علم ہو گیا تھا وہ ہنس پڑے اور جب لیڈیز کے علم میں آیا کہ یہ تایا کا تکیہ کلام ہے اور اردو زبان میں رومانی اظہار کے طور پر بھی بولا جاتا ہے تو وہ بہت محظوظ ہوئیں اور خاص طور پر مس میری جان لیسے عجیب قسم کے شکاری کے تکیہ کلام کی معنویت پر بڑی خوش ہوئیں۔ اور تایا سے بہت عقیدت اور انسیت کا اظہار کیا۔ بار بار بات کر کے تکیہ کلام اور اس کی معنویت کے مزے لئے اور یوں تو سبھی بے حد محظوظ ہوئے مگر لیڈیز کا ہنستے ہنستے برا حال ہو گیا۔

تایا کے فوٹو اور آٹو گراف لئے، گروپ میں تایا کو بیچوں بیچ میں غلیل بلند کئے بٹھایا اور ان کے شکار کئے ہوئے تیتروں کا ڈھیر سامنے لگا دیا۔ یوں تو تایا اس پارٹی میں اپنی وضع قطع اور پھر شکار کے نادر طریقہ کے سبب سبھی ساتھیوں کے کھلونا سے بن گئے تھے، مگر خواتین بہت زیادہ محظوظ ہوئیں اور مس میری جان تو خوشی میں جھکی جھکی سی پڑتی تھیں اور اپنے نام اور تایا کے محبت بھرے مخصوص نعرۂ تحسین کی اتفاقیہ مناسبت پر جامہ میں پھولی نہ سماتی تھیں۔ سب نے آٹو گراف لئے۔ تایا بیچارے کو عمر میں اتنے دستخط یکدم کرنے کا موقع شاید اسی وقت ہوا تھا۔ مس میری جان نے صرف دستخطوں پر اکتفا نہ کیا اور اصرار کر کے تایا سے اپنی آٹو گراف بک پر لکھوایا:—

"اے واہ میری جان"

اور اس کے نیچے تایا نے خوب ہاتھ روک کر اپنے دستخط کئے:—

العبد

"تایا تلفنگ خاں شکاری ولد دادا اکمل خاں جولدار قوم روہیلہ پٹھان، بقلم خود"

اور تایا کبھی ڈینگ نہ مارتے تھے لیکن اس کے بعد کبھی کبھی فخریہ کہتے سنائی پڑنے لگے۔ "اے واہ میری جان ملکہ وکٹوریہ تک پہونچ چکا ہے "تایا تلفنگ خاں کی غلیل کا شہرہ اے میری جان!"

(۲)

یوں تو تایا "فنا فی الشکار" قسم کے ہمہ وقت شکاری ہی شکاری تھے شکاری پہلے اور آدمی پیچھے، لیکن پرانے توہمات کے مطابق جمعرات کے روز شکار کھیلنے سے محترز رہتے تھے مگر اس مرتبہ تایا ہماری "بے پیری بے مریدی" قسم کی چکڑی میں پھنس گئے تھے، اور جمعرات کے دن کا پروگرام بن چکا تھا۔ اگرچہ تایا نے ہر چند ہم کو بھی روکا اور اپنی گلو خلاصی کرنی چاہی اور بہتیرا ڈرایا کہ جمعرات کو شکار جاؤ تو بغیر "ان بٹ" ہوئے نہیں بچتی ہے پھر جمعرات کو ہزاروں بد روحیں اور بھوت پریت، چڑیل جانوروں کے روپ بھر لیتے ہیں لہٰذا ملتوی کر دیا جائے اور جب ہم نہ مانے تو اپنے استاد اور دادا اُستاد پر بیتی ہوئی کئی محیر العقول روایتیں سنائیں، مگر پھر چلنا ہی پڑا۔ آج کے شکار میں ہمیں ریل پر روہیلکھنڈ کی حدود سے باہر جہاں بلند شہر اور علی گڑھ کی سرحدیں بدایوں کی سرحد سے ملتی ہیں پہنچنا تھا۔ پچاس میل کے فاصلہ پر ایک جنگل کے اسٹیشن پر اترنا تھا جو بلند شہر کے ضلع میں واقع ہے۔

صبح کا وقت اور بہار کا موسم تھا، آسمان نیلا شفاف بے داغ تھا دھوپ کی تمازت بہاریں ہوا کی خنکی اور نرم روی کے سبب دبی ہوئی تھی۔ ہر پچاس قدم بعد جنگلی پھولوں کی ایک نئی خوشبو سے شامہ کو نوازتی چلتی تھی۔ گنگا کی نمناک سلونی وادی ننھے ننھے پھولوں سے اس حد تک پٹی تھی کہ کہیں پر چپہ بھر زمین نظر نہ آتی تھی، جدھر نگاہ اٹھتی ایک نئی رنگین مسکراہٹ سے آنکھیں دوچار ہوتی پلٹتیں، تیتر کے شکار کا پروگرام تھا اور یہ تیتر کی مستی کا زمانہ ہوتا ہے، جھاڑیوں، ٹیلوں، اور گھاس کے تختوں میں رومان لڑتے رہتے ہیں، سنہری تیتریاں صبح سے دوپہر تک اور سہ پہر سے شام تک اپنی سریلی آوازوں میں دعوت وصل دیتی ہیں اور مخمور تیتر پٹے تان تان کر گردن اٹھا اٹھا کر صدائے لبیک دیتے ہیں، جگہ جگہ میدانوں میں کسی مابہ النزاع تیتری کے قبضہ کا فیصلہ ڈیول لڑ لڑ کر تے نظر آتے ہیں اور گنگا کی نمناکیوں اور بہار کی حرارتوں کا پیارا امتزاج تیتر تو تیتر تیتر کے شکاریوں میں بھی نشہ مستی سی دوڑا دیتا ہے اور چال میں مستی تھی، آنکھوں میں سرور تھا اور خون میں بھرپور روانی —

گنگا کے کنارے کنارے دھار کے ساتھ ساتھ جھاڑیوں اور گھاس کے لا محدود قطعہ میں ہماری مختصر پارٹی سرگرم کار تھی کبھی ہم دھار کے خلاف چلنے لگتے کبھی اسی رخ کو کسی وقت دریا ہمارے داہنے ہاتھ پر ہوتا اور کسی وقت بائیں پر اور کبھی پشت ہو جاتی۔ تیتروں کی مست آوازیں کل ماحول پر محیط تھیں، اور ان کے ساتھ رود گنگ کے بربط کا شیریں نغمہ، بہاریں ہوا کی جانفزا خنکی جنگلی پھولوں کی روح پرور خوشبو بھرتے سورج کی رومانٹک تابناکی حیات کو عجیب فردوسی زندگی سے آشنا کر رہی تھیں، ایک جانب کمر کمر بلند جھاؤ کی سدا بہار جھاڑیوں اور مخملیں گھاس کا تا حد نظر فرش تھا، دوسری جانب گنگا کی شفاف آئینہ سی چھاتی تھرتھرا رہی تھی۔ بہار کے سورج کی کرنوں کے طفیل ہمالیہ کے نئے برف کی پگھلی ہوئی کوری چادر رواں دواں تھی، سلامت روی کی چال، جس کی رفتار میں سرعت کے باوجود سکون تھا اور آواز میں شیریں نغمہ، نہ ساون بھادوں والی دیوانگی بدوش تندی تھی اور نہ ماگھ پوس والی تلوار کی دھار کی طرح کاٹتی سی برودت۔ آئینہ تابناک اور مجلا تھا، ٹھنڈا، آنکھوں سے دیکھتے ہی میں دل کا داغ مٹانے والا جوں کا توں برف پگھلا چلا آرہا تھا، گھونٹ بھر پی لو تو رونگٹے رونگٹے میں سرور سا لبریز جائے۔ اور جس وقت ہم ریل سے اتر کر گنگا کنارے پہنچے تو زندگی کے

شیتل بہاٹ پر صبح کی شفق نے بڑی دریا دلی کے ساتھ اپنا سیندور اور سونا بکھیرا تھا جس کے انعکاس سے صبح کے ہلکے ہلکے دھندلکے بھی طلائی شہابی بگولوں کی طرح دھار کے خلاف سمت چلتے نظر آرہے تھے۔ تہہ سے اوپر تک گنگا کی لطیف فضا رنگین تابناکیوں سے متحرک تھی۔ دھار کی سطح پر جگہ جگہ بلوریں چکیاں سی گھمر گھمر کر رہی تھیں۔ دھار سے اوپر سونے اور گلال کے بغارے سے لوٹ رہے تھے۔ بہار کی مخصوص سنسناہٹ اور خوشبو زمین سے لے کر آسمان تک رچی ہوئی تھی، اور مسلسل شور کے باوجود ماحول پر پیارا پیارا سکون سا طاری تھا، جیسے نیند میں آنکھیں بوجھل سی ہوئی جا رہی ہوں۔

ہم لوگ صبح چھ بجے سے قبل جنگل میں پہونچ گئے تھے جو تیتر کے شکار کا خاص وقت، دوپہر تک مصروف رہے۔ شکار بہتیرا اٹھا، لیکن "بیٹ" کا انتظام نہ تھا۔ پارٹی اگرچہ مختصر تھی پھر بھی قاعدہ کے مطابق منسلک زنجیر جیسے انداز میں گھاس کے اندر نہ بڑھ سکے۔ غرض ٹیم والا نظم ونسق جو تیتر کے شکار میں ضروری ہوتا ہے قائم نہ رہ سکا، اور شکار خراب ہو گیا۔ کم ہاتھ آیا، جو ہارا اس میں لطف بہت کم آیا۔

گنگا کنارے کے شکار میں ناشتہ مقدار میں زیادہ رکھنا پڑتا ہے اور جتنا رکھوا تنا سب کھانے کے بعد بھی پیٹ خالی رہتے ہیں۔ یوں بھی شکار کے ناشتے بھاری اور ثقیل طیار کئے جاتے ہیں، اور گنگا جل کے مشتہی اور ہاضم اثرات کے تحت گنگا کنارے کے شکار کا ناشتہ ثقیل ترین ہوتا ہے۔

ہم سب صبح سے دوپہر تک چلتے رہے، اپنے اپنے تھیلوں میں پڑے، کیلے خستہ کچوریاں، اخروٹ، کشمش اور گڑ چنے ساتھ تھے، پاؤں بھی پیہم چلتے رہے، اور پر منہ مسلسل چلتا رہا۔ دو گھونٹ گنگا کا پانی پیٹ کے وزن کا ازالہ کرتا رہا اور دو جھونکے گنگا کی ہوا کے پاؤں کے بھاری پن دور کرتے رہے، کھاتے رہے، چلتے رہے، مارتے رہے اور دوپہر کو ریل کے پل کے نیچے سایہ میں ریت پر جمع ہو گئے۔ خوب ڈٹ کر کھانا کھایا۔ بار بار گنگا کی خاص بڑی دھار کا امرت جل پیا۔ ٹھنڈے ٹھنڈے ریت پر لیٹیں لگائیں، ہنگھ بابو اور سلیم ذرا زیادہ گرمی مان گئے تھے۔ لہٰذا ہم غرما دہم ثواب اور سنگھ بابو پاپ تو خیر کیا دھلتے، شاید گرمی دھونے کو گنگا اشنان کرنے لگے، سلیم نے غوطہ لگانے میں تائید کی۔ اور دونوں بیچ دھار میں گھس کر خوب نہائے گھنٹہ بھر بعد جب نہا کے نکلے تو بھوک تیز لگ گئی تھی ناشتہ وافر تھا، ان کی تحریک پر دوسری سروس ہونے لگی، اور سب بار بار گنگا جل پی چکے تھے، بھلا کب رہ جانے والے تھے اور جتنا ابھی دو گھنٹہ

پیشتر کھایا تھا اس سے سوا یا کھا کر پھر نرم نرم ٹھنڈے ٹھنڈے ریتے پر اینڈنے لگے۔ گنگا جل پیتے رہے، اور سہ پہر کے شکار کو جس وقت اٹھے تو ناشتہ کی اخیر قسط جھاڑ کر پیٹ میں ڈال لی۔ اور خوب مضبوط ہو کر مونچھوں کو تاؤ دئے شکار میں مصروف ہو گئے۔

اور آج تو صبح ہی سے "آن بیٹ" تھی شکار شام کا بھی اچھا نہ رہا گرچہ دوپہر میں باقاعدہ اسکیم بنا کر چلے تھے۔ ۵½ بجے شام کی ٹرین سے ہمیں پلٹنا تھا مگر اسٹیشن پہونچتے ہی ٹرین چھوٹ گئی اور ہم سوار نہ ہو سکے۔ میں نے کہا "اب رات والی گاڑی سے چلیں گے۔"

شکار کم اور خفت زیادہ ہوئی تھی۔ تایا کو غلیل بازی کے اپنے جوہر دکھانے کے موقع نہ ہوئے تھے۔ البتہ "انٹیں اور بیٹ" کرانے کی گھاتیں آج کے چکر میں اچھی طرح بھانپ لی تھیں۔ بھوک زور کی لگی ہوئی تھی اور یہ کچھ گنگا جل کے خواص کا اثر نہ تھا بلکہ پرانی بات ؟ شکار میں ناکامیابی کے بعد ٹھکانے پہ پہنچو تو بھوک بڑی زور کی لگتی ہے اور خالی ہاتھ گھر پہنچ کر شکاری بھنگ پئے ہوئے نشہ باز کی طرح سیروں کھا جاتا ہے۔ جیسے کھسیانپٹ میں کھانے سے چبا چبا کر انتقام لے رہا ہے۔ سب کی رائے ہوئی کہ آج کی شب اسٹیشن کی سرائے میں قیام کیا جائے اور کل صبح سے شام تک پھر معرکہ گرم رہے۔

میں چونک سا پڑا "ایں اس اسٹیشن پر سرائے ہے؟"

"اے واہ مری جان بڑی اچھی سرائے، شاہی زمانہ کی اے واہ میری جان، نہایت وسیع پرانی۔"

"مگر یہاں سرائے کی شانِ نزول کیا ہے جنگل میں؟"

اور سید نے کہا "قصبہ چپانڈی پرانی منڈی ہے جو یہاں سے بیس میل کچے راستہ پر واقع ہے اور یہاں ریل پر چڑھنے اترنے والے مسافر ٹھہرتے ہیں۔ مال لادنے والے ٹٹو خچر اور بیل گاڑیاں پڑاؤ کرتی ہیں، روزانہ شام کو سرائے بھر جاتی ہے، باہر اسٹیشن کے سہارے کئی دکانیں چمک اٹھتی ہیں۔ اور تمام دن دھول اڑتی ہے۔" "مگر یار ٹھہرو گے کیسے، بستر کہاں ہیں، اور کھانا؟ ——بھئی ہماری رائے میں رات کی ٹرین سے چلے چلو اور صبح تین والی سے کل پھر آدھمکو۔" میں نے کہا۔

اور تایا بول پڑے "اے واہ میری جان کیا کہنے، قربان جائیے آپ کی عقل پر یعنی بارہ بجے گھر پہنچو اور دو بجے پھر اسٹیشن کو چل دو۔ ساری رات ریل میں چڑھتے اترتے کاٹ دو، اے واہ میری جان۔"

"مگر تایا یہ تو بتاؤ کہ بستر کہاں ملیں گے اور کھانا کہاں ملے گا؟"

"اے واہ میری جان، ابھی تو ماشاء اللہ نوجوان ہو، ہماری عمر میں پہنچو گے تو کیا بنے گا، سپاہی بچہ ہو کر ایسی باتیں کرتے ہو، شکار کھیلنے نکلے ہو کہ بستر اور کھانا توسنے، اے واہ میری جان، مثل مشہور ہے اے واہ میری جان تن تکیہ من بسرام، چارپائیاں مل ہی جائیں گی، آج بستر نہ سہی اے واہ میری جان اور کھانا۔ یہ تمیز موجود ہی ہیں، سید اور استاد رضا خاں ذرا دیر میں قورمہ پکا لیں گے۔ اے واہ مری جان اور بس کل صبح وہ مار رہے گی کہ اللہ دے بندہ لے اے واہ مری جان۔ گھر والے سمجھ لیں گے کہ شکاری اور بھکاری کا کیا ٹھیک کہیں پڑ رہے ہوں گے۔ اے واہ مری جان۔"

اور ہم باتیں کرتے اسٹیشن کے ادھر جا پہونچے، سامنے سرائے کا بلند پھاٹک تھا جس کے ارد گرد چھپروں میں گرم چنے، نمک مرچ اور دودھ مٹھائی کی دکانیں تھیں۔ استاد رضا خاں نے عین پھاٹک کے بازو والی دکان سے ڈھائی پاؤ گھی اور مسالے وغیرہ خریدے، اندر پہنچے تو میں نے غور کیا کہ درحقیقت شاہی زمانہ ہی کی قدیم سرائے ہے، مگر عمارت میں کوئی حصہ پرانا باقی نہیں رہ گیا ہے، صرف پھاٹک اور جگہ جگہ چار دیواری کی ٹوٹی پھوٹی چھوٹی قسم کی اینٹیں دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ کبھی یہاں قدیم سرائے رہی ہوگی۔ اور اب تو چاروں رخ سے نیچی نیچی کوٹھریوں کی قطاریں بنی ہوئی تھیں، انتہائی میلی غلیظ جن میں بارہ بجے دن کے بھی شام ہی رہتی ہوگی۔ اور چاروں کونوں پر چار گوشہ محل اور درمیان میں لق و دق مربع صحن، جس میں اس وقت اودھم سا مچا ہوا تھا۔ بچے، بوڑھے، جوان، عورتیں، مرد، کتے، بلیاں، بکریاں، ٹٹو، خچر بیل سب گتھا ملی، جگہ جگہ کوڑے کے ڈھیر، اور دھوئیں کے بادلے اور بیک وقت بھانت بھانت کی صدائیں، اور میں نے بنظر غائر نگاہ سے پتا لگایا، جگہ جگہ بیلوں، ٹٹوؤں اور خچروں کے تھان تھے جن کے پیچھے ہوا کے رخ پر لید اور پیشاب میں ڈوبی ہوئی گھاس کے الاؤ سلگ رہے تھے جن سے ہر بار گاڑھا گاڑھا دھواں اٹھ اٹھ کر جانوروں سے پسوؤں اور ڈانسوں کو بھگانے میں ڈی۔ ڈی۔ ٹی اور فلٹ کا کام انجام دے رہا تھا اور میرا دم سا گھونٹ رہا تھا، ایک گوشہ میں ایک بھڑبھونجا اپنا بھاڑ گرم کئے ہوئے تھا اور چنیاں بھون بھون کر مسافروں کو دے رہا تھا۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد بھنتے چنے اور جو کی سوندھی سوندھی خوشبو نے بھیگتے لید اور پیشاب کے الاؤں سے سلگتے ہوئے دھوئیں کی بدبو کے ساتھ مل کر ایک عجیب مثبت منفی احساس سے شامہ کو آشنا کرتے تھے، صحن میں جس کو زیادہ صحیح لفظوں میں میدان یا

چوک کہا جائے جگہ جگہ نیم اور پیپل برگد کے دیو پیکر درخت ایستادہ تھے، جو بظاہر سرائے کی پہلی تعمیر سے بھی سو برس پرانے معلوم ہوتے تھے، جن کے تلے جہاں تہاں بنجاروں اور بیوپاریوں کی ٹولیاں حقوں کے دھوئیں اڑا رہی تھیں اور اپنی اپنی مخصوص زبان اور لہجے میں راس المال، اور سیاست مدن، اور تجارت و مالیات کے باریک نکات اور رازِ دنیا زچخ چخ کر حل کر رہی تھیں۔ ہمیں دیکھ کر چند کھجورے کتے استقبال کو بڑھے مگر جس طرح سرائے کے شریف النفس کتے معمول کے مطابق اندر آنے والے ہر چرند و اکو تک کا دُم ہلا کر استقبال کرتے ہیں اس طرح نہیں بلکہ ہماری نامانوس اور اجنبی وضع قطع دیکھ کر اپنی ہیئت کلبی جبلت کے مطابق ہم پر پہلی نظر میں بھونک پڑے، سرائے کی چند مالکاؤں نے کتوں کو ڈپٹا اور پھر ہماری جانب کچھ مشتبہ نگاہوں سے دیکھنے لگیں مگر غالباً ہمارے ہاتھوں میں شکار لٹکا ہوا دیکھ کر سمجھ گئیں کہ نہ نکالنے والے ٹھگ ہیں اور نہ تحصیل والے برق انداز بلکہ امن پسند شہری جنگل کے شکاری ہیں۔

ہم ایک جانب کو ایک نیم کے درخت کے نیچے جا کر اس گول چبوترے پر بیٹھ گئے جو کھردرے تنے کو حلقہ کئے ہوئے زمین سے گز بھر اونچا بنایا گیا تھا۔ اور بیک وقت میلی کچیلی، کالی کھتری دس بارہ بھٹیاریوں کی دو تین پارٹیوں نے ہمیں گھیر لیا، اور ہر پارٹی اپنی کوٹھریوں اور باورچی خانہ کی دعوت دینے لگی جیسے ہوٹلوں کے ایجنٹ بڑے بڑے شہروں کے اسٹیشنوں پر کنویسنگ کرتے ہیں، ساتھ ہی ساتھ اپنی مخصوص جبلت کے مطابق ایک پارٹی دوسری پارٹی کی کوٹھریوں کے کھٹملوں، اور پسوؤں اور جوؤں کی "مقدار" پر روشنی ڈالنے لگی۔ اور سب ایک ساتھ بولتی رہیں اور ایک دوسری کو فصیح کوسنے اور بلیغ گالیاں دیتی گئیں۔ جب ذرا زبانیں تھمیں تو اُستاد رضا خاں بولے "ارے شیطان کی خالاؤ چپ رہو ہمیں کوٹھری نہیں چاہئیں ...... ہمیں چھ چارپائیاں چاہئیں اور بس جس کی حد میں اس وقت آکر بیٹھ گئے، اسی کے یہاں ٹھہریں گے اور اسی نیم تلے چارپائیاں پڑیں گی یہیں پر خواہ مخواہ حرام زادیوں نے ...... غدر مچا دیا ہے۔"

"اور کوٹھری نہیں میاں؟" اس بھٹیارن نے کہا جس کے حدود میں اُستاد نے ابھی قیام کرنا پسند فرمایا تھا۔

"نہیں، بس چھ چارپائیاں" اُستاد نے گردن جھنجھلا کر جھٹکتے ہوئے کہا،

اور میں نے کہا "اور ہاں بی بھٹیارن یہ دیکھ لینا کہ چارپائیاں ذرا صاف ہوں، کھٹمل نہ ہوں۔"

"اے ہے میاں نگوڑی کھٹیوں اور موئے مرے کھٹملوں کا تو یہاں تھیں ہاں ہماری کوٹھریوں میں البتہ کھٹمل تو کھٹمل دیواروں پر مکڑی پدی تک نہ رینگتی نہ ملے گی، ابھی نئے پینڈول سے پتی ہیں، اور ان خصم پٹیوں کو ٹھریوں کی دیواروں میں تو کھٹملوں کے چھپنے اور کھٹیوں میں جوؤں کی کمیندیں ہیں۔"

"اچھا چل چل قطامہ باتیں نہ بنا، کان چاٹ گئی ...... کی یہاں کوٹھا نہیں چاہیئے، نہ ان حرام زادیوں کی اور نہ تیری، چارپائیاں لا خوب کسی ہوئی، ذرا لمبی والی۔" اُستاد رضا خاں نے شاید اپنے قد کی مناسبت کہا اور بھٹیارن ذرا درست ہو کر اپنائیت اور خلوص کے انداز میں بولی "اور ہاں میاں کھانا؟ کھانے کو کہو؟ چنے کی دال اور بڑیاں پکی ہیں، بڑی کرچٹ پٹی اپنے تیل میں، اور گیہوں کی روٹی ہے۔ ادھم ادھا کے گیہوں کی کٹے جو کی گھاٹ والی۔"

سید بولے "نہیں بی بھٹیاری، کچھ نہیں، سالن ہم خود اپنا پکا لیں گے بس تم ذرا ایک قلعی دار دیگچی دے دینا مانجھ کے، سمجھیں اور ہمیں پر ایک اٹھا چولہا بنا دینا۔ اور آٹا بھی ہم اپنا باہر دکان پر سے لا دیں گے، روٹی ڈال دینا۔"

"اے ہے میاں میرے، بڑی چٹ پٹی دال بڑیاں ہیں، دوپہر پیالا، ترتراتی، اور میاں پیسے چپاتی، گرم گرم لوٹ دوں گی، تم بھلا کہاں پاکھنڈ کرتے پھرو گے نگوڑی ہنڈیا چولہے کا۔"

"اچھا چل چل جلدی چل زبان دراز ...... واللہ تمام خدائی کی"— اُستاد رضا خاں نے درشت لہجے میں کہا اور پھر مسالہ کی پوٹ بڑھا کر بولے "یہ مسالہ تو پیس لا ذرا" اور وہ مسالہ لے کر چلنے لگی تو بولے اری سنتی ہے ہر چیز الگ الگ باریک پیس کر لے آنا کے مت پیسنا سمجھی۔" اور جب وہ مسالہ لے کر بڑھی تو بولے دیکھو ٹھیک ٹھیک لانا سب پیس کر ہو کہیں پھر سب دبیں رکھ آئے۔ اور دیگچی اور چولہا لیتی آنا۔" "اور ہاں تھوڑا ایندھن بھی۔ پیسے دے دیں گے بھی نیک بخت" سید نے لقمہ دیا۔

اور میں نے کہا "خیر وہ ہانڈی تو تیتروں کے تو دیسی ہو گئی اور اگر ان نیک بخت کے ملیغ کی پیسہ والی کھائی تو سمجھو کہ سب کو پیچش ہو جائے گی، گیہوں کی تو اپنی زبان سے تعریف کرتے ہوئے بتا رہی ہیں

کھڑے جڑ کی ہوگی۔"

"نہیں جی ہم آملے آئیں گے باہر دکان سے دیکھ کر پرانے گیہوں کا وہ پکا لائیگی"۔ سید نے کہا جو جلدی جلدی تیتروں کے پر نوچ کر صاف کر رہے تھے۔ اور سنگھ بابو نے کہا۔ "ارکیا ضرورت ہے باہر پھاٹک کے برابر ایک نان بائی کی دکان میں نان لگ رہے ہیں۔ خمیر والے، گرم گرم، چھ سات آجائینگے سالن تیار ہو جائے بس۔"

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے" سب نے کہا، اور اتنی دیر میں بھٹیارن کی لونڈیا چار پائیاں ڈال گئی اور دیگچی اور چولہا رکھ کر آگ جوڑ گئی۔ ہم سب چبوترے سے اتر کر چارپائیوں پر بیٹھ گئے۔ اور سید اور مسلم تیتر صاف کرتے رہے اور تایا بدستور چبوترے پر بیٹھے رہے، جب لونڈیا آخر چارپائی ڈال کر چلنے لگی تو تایا نے اس سے کہا "اے واہ مری جان، ذرا حقہ تو بھر لا۔ آگ دھر کر اے واہ مری جان"۔ پندرہ سولہ سال کی قصباتی بھٹیارن لونڈیا۔ کالا کالا، مٹیالا مٹیالا دھبے دار کہیں کہیں کھترا چہرہ، کڑوے تیل میں ذرا کھری تلی ہوئی کچوری سے گول، خوب ابھری ہوئی پیشانی، ننھی ننھی چمکدار آنکھیں، جیسے ریت میں کسی نے تھوک دیا ہے، پچکی ہوئی گول مٹول ناک اور موٹے ہونٹ جن میں باوجود مونہہ بند کر لینے کے بھی درمیان میں سوراخ رہ جاتا ہے۔ بنے کی چونچ کی طرح سخت اور چھوٹے بال، ذرا گداز جسم، گردن پشت، سینہ، پیٹ، رانیں اور کوہلے بلکہ پنڈلیوں تک ہر جگہ جیسے ایک برابر موٹائی یں قدم جیسے گیس کے سلنڈر پر میلا کپڑا لپیٹ دیا ہے، کثیف، ننگا، دوپٹہ اور اسی نسل کا موٹا کرتا، پاؤں میں چست آڑا پاجامہ جس میں پنڈلیوں پر خوب کے ڈوبے پڑے ہوئے اور گھٹنے سے لے کر ایڑی تک پنڈلی کی ایک برابر موٹائی ظاہر کرتے ہوئے۔ ذرا دیر میں مونجھ کے بان کا بنا ہوا کھڑیا حقہ بھر کر لے آئی، مگر نہ معلوم کیوں اپنا آپا ذرا سنبھالتی، اور سینہ اور سر کو دوپٹہ سے چھپاتی آئی اور نگاہیں بھی ذرا جھکی جھکی تھیں اور تایا حقہ لے کر بولے "اے واہ مری جان جیتی رہو، ذرا وضو کو پانی تو لا دو، ہوں، آں اور یہ حقہ اے واہ مری جان تازہ بھی کر لائیں اے واہ مری جان، تو پھر کیسی بات رہتی۔"

اور کسی نے غور نہ کیا مگر میں نے اندازہ کیا کہ لونڈیا تایا کے تکیہ کلام پر دونوں مرتبہ کٹ گئی اور کنکھیوں سے دیکھتی جیسے کچھ بڑبڑاتی سی پانی کے مٹکوں پر جھک کر ٹین کے لوٹے میں پانی بھرنے لگی۔ اتنے میں اس کی ماں مسالہ کے لئے پانی لینے باورچی خانہ سے نکلی تو اس کی جانب لوٹا بڑھا کر شاید یہ کہا کہ "تم پانی دے آؤ، بڈھا چپڑتا ہے" اور بس بھٹیارن کے تیور بگڑ گئے۔ ایک تو خیر کانی کچی سی تھی اور دوسری جو کینڑی کینڑی پون آنکھ باقی تھی خوب چمک کر ابھر گئی۔ سوکھا لکڑی سا قد پورا تن گیا، باچھوں پر دونوں جانب بہتی ہوئی پان کی پیک پونچھی، مونہہ کے اندر دبا ہوا تمام دن کے پان کا گلا بڑے زور سے چبایا اور میلا پھٹا دوپٹہ سنبھال کر اوڑھا، اور کڑے کمان کے تیر کی طرح پانی کا لوٹا لے کر بڑھی، ادھر لونڈیا دو ایک اور بھٹیارنوں سے بات کرنے لگی، اور میری نگاہ اتنی چوکی ہو کہ سید نے دیگچی میں گھمار کر کے چمن سے گوشت بھوننے کے لئے ڈالا ہے۔ اور مسلم نے دو تین ہاتھ کفگیر کے بھوننے کے لئے چلائے ہیں۔ کہ ادھر سے وضو شروع کرتے ہوئے تایا کی آواز کان میں پڑی۔ "اے واہ مری جان ذرا کعبہ تو بتاؤ کدھر کو ہے تمہارے یہاں۔ اے واہ مری جان!"

اور جیسے یکدم باورچی خانہ سے لے کر تایا کے جانماز تک سیکڑوں کتیاں یکدم بھونک پڑیں۔ اور ہماری لینڈ لیڈیاں اور ان کی تمام معزز معاصرین جو ابھی تک ذرا دیر پیشتر کمپیٹیشن کر رہی تھیں ایک آواز برس رہی تھیں۔ "جان ہوئے گی تیری میا! جان ہوئے گی تیری بھینا! جان ہوئے گی تیری لونڈیا! جان ہوئے گی تیری جوروا! جان ہوئے گی تیری دھریا بھوریا!"

اور میں نے جب نظر کی تو باورچی خانہ سے جانماز تک بھٹیارنوں کی قطار ایک آواز چلا رہی ہے اور تایا غریب پر بے بھاؤ پڑ رہی ہیں، ہم سب حیرت سے دیکھنے لگے کہ کیا ماجرا ہے۔ تایا وضو آدھا بھی نہ کر پائے تھے کہ بھونچال آگیا۔ تمام سرائے میں بھاگڑ سی پڑ گئی، چاروں طرف سے مسافر جمع ہو گئے اور سرائے کے سب کتے دوڑ کر بھونک پڑے، ہم سب متحیر، اور تایا غریب ہتھیار سے آدھا وضو کئے جانماز پر بیٹھے کہ یہ شیطانی حرکت ہو گئی۔ بھٹیارے جو دور ایک گوشہ میں برگد کے پیڑ کے تلے بیٹھے ہوئے ارہر کی لکڑیوں کی ڈلیاں بن رہے تھے زیادہ متوجہ نہ ہوئے کیونکہ سرائے کی بھٹیارنیں اور کتیاں دن رات ایک آواز بھونکتی ہی رہا کرتی تھیں، سمجھے کہ یا تو حسب معمول جیسا کہ شام کے وقت ہر مسافر کی آمد پر ہوا کرتا تھا کہ مالکاؤں کی مختلف پارٹیاں معاصرانہ چشمک اور بزنس کمپیٹیشن میں بات چیت کرتی ہی رہا کرتی ہیں، یا کسی مسافر سے کرایہ اور کھانے کے نرخ پر بات چیت طے ہوتی تھی، یا پھر مالکاؤں کے آپس کے راز و نیاز ہوا کرتے تھے یا دوسری مالکاؤں سے صحن کے حدود، پانی آگ اور کوڑے کے

ڈھیر وغیرہ کسی اہم مسئلہ پر گھنٹہ دو گھنٹہ بعد تبادلۂ خیال اور جد و جہد ہوتی ہی رہتی تھی۔ بھٹیاروں نے پہلے شور پر تو کام سے سر بھی اوپر نہ اٹھایا مگر جب اس قسم کی آوازیں کان میں پہنچیں کہ "اے ہے نگوڑے بڈھے تیرے زور کی، دن دہاڑے پکڑے لیتا تھا!"

"واہ رے کرارے بڈھے تیری جھپٹ! بڑا لمبری ہے سالا!" کوئی مسافر بول پڑا اور بھٹیارنیں پھر ایک آواز چیخنا پڑیں، "ہے ہے نگوڑے، یہ داڑھی یہ کرتوت، بٹا لچا، بدمعاش، جالی کار، خدائی خوار، گدھے سوار —— موئی سانا، جوان مرا!"

"دیکھ تو تیری پر پوتی نواسی برابر!!" اور یہ شستہ آوازیں سن کر بھٹیارے کام چھوڑ چھاڑ کر ادھر پلنگ کے بانس سنبھال سنبھال کر دوڑ پڑے، اور اب بات بھٹیارنوں اور تایا کے درمیان سے نکل کر اور تایا کی مرحومہ والدہ، اور ہمشیرہ اور خیالی جورو اور لونڈیا کی جان کے بجائے تایا کی جان پر آبنی اور بھٹیاروں کے پہنچتے ہی اک ذرا سکون ہوا اور صرف ایک منظم آواز بھٹیاریوں کے غول کی جانب سے ہی چڑ چڑاتی سنائی دیتی رہی تو تایا مصلے پر کھڑے بھٹیارنوں کی جانب ہاتھ اٹھا اٹھا کر کہتے سنائی دیتے۔ "اے واہ مری جان! کیوں اتنا بگڑتی ہے، ایسا میں نے کیا کہہ دیا ہے، اے واہ مری جان جو تم اتنا بگڑتی ہو!" تو بھٹیارنیں پھر ایک آواز "جان" کے ساتھ تایا کی والدہ، ہمشیرہ، بیوی اور بیٹی کے ساتھ پیار والے القاب لگا کر چیخ پڑیں۔ ایک نوجوان بھٹیارہ کو ذرا زیادہ تاؤ آگیا اور بانس تان کر تایا کی جانب بڑھا بڑبڑاتا ہوا: "آج تیری جان نکالونگا!" اور یکدم سنگھ بابو ڈپٹ کر بندوق تانے درمیان میں آگئے۔ "بس کمین نمک حرام! سالے ابھی چت کر دوں گا!" اور ٹھاکر کی ڈانٹ ہی بھٹیارے کو بہت کافی تھی، پھر تنی ہوئی بندوق کے ساتھ، اور معاملے کے نازک مقام پر پہونچ جانے کے احساس سے ہم نے بھی اپنی اپنی بندوقیں اور ڈھیلے سنبھال لیے۔ سنگھ بابو کے شدید دم خم اور بندوق ہاتھ میں لئے ترچھے ترچھے انداز دیکھ کر خدائی فوجدار اور ہوائی مجاہد قسم کے للّی محلہ —— تو تماشہ کے سین سے ہٹ گئے۔ زور دار نوجوان بھٹیارے بھی بغلیں ہی جھانکنے اور آنکھ پڑنے لگے۔ دو ایک بڈھے بھٹیارے عاجزی کے ساتھ گھگھیائے دانت نکالے ایک قدم بڑھے اور جانماز پر آدھے دھنویں ترکھڑے —— تایا کی جانب اشارہ کر کے سنگھ بابو سے بولے: "اور کنور جی، آپ تو خفا ہو گئے۔ میاں کو دھوکا ہو گیا، آپ کے شہروں کی سرایوں میں بھٹیارنیں پیشہ کرتی ہیں، اور یہ ہیں آپ کی دیہاتی بھٹیارنیں، بھلا یہ کیا جانیں، یہ بچاریاں تو دن رات محنت کر کے کھاتی ہیں۔ اور ہیں، ہاں۔ آں۔ او۔ وہ، میاں شہر کے دھوکے میں رہے، وہ بات یہاں نہیں ہوتی!"

اور پیشتر اس کے کہ سنگھ بابو کچھ جواب دیں، تایا پیشانی ٹھونک کر بول پڑے، "میرے اللہ! اے واہ مری جان! یعنی دھوکا ہم کو ہو گیا!"

اور پھر اپنے مخصوص انداز میں آستین چڑھے، ہاتھ لمبے کر کے بھٹیاریوں کے غول کی جانب اشارہ کرتے ہوئے سلسلہ کلام جاری کیا: "اے واہ مری جان تم کو؟ ایں؟!"

اور پھر اسی تخاطب کو اپنی جانب سن کر بھٹیارنیں گنگیوں کی طرح یکدم چڑ چڑا پڑیں۔ "چل چل، چل نپٹے، دور ہو مردوے!، جان ہوئے گی تیری میا، بارہ تالی، جان ہوئے گی تیری جورو!، رنڈیا، جان ہوئے گی تیری بہنیا بیسوا، جان ہوئے گی تیری دہریا رنڈی!"

اور بھٹیاریوں میں پھر کھلبلی مچ گئی۔ اور کئی نوجوان، دل چلے لونڈے و فور غیرت سے اچھل کر جا پڑے، سنگھ بابو نے اپنی بندوق پھر سیف چڑھا کر ترچھی ترچھی تان لی، ہم سب نے اپنی اپنی بندوقیں مضبوط پکڑ لیں، جہاں دیدہ استاد رضا خاں نے معاملہ کی نزاکت پھر ازقل پوائنٹ پر پہنچنے کا احساس کیا اور کہا "کیا ..... غدر مچایا ہے! بہت ہوئی بس چلو، چلو! اور بی بھٹیارن تم ہمیں تو معاف کرو اور بڑے میاں کی تو یہ عادت ہے، کوئی اور ناؤں، وہ بات نہیں جو تم سمجھیں!"

اور ہم سب چل دیئے۔ تایا کو دس بھری ہوئی نالوں کے زیر سایہ ناک، کان سلامت لئے، سرائے سے باہر آگئے۔ تیتروں کی چھن چھن کرتی ہانڈی چولہے کی توں چڑھی چڑھائی چھوڑ کر، اور بھانت بھانت کی آوازیں جہاں کی تہاں گونجتی چھوڑ کر چودھمیں ستدی ہے چودھمیں!"

"اور پھر ایسا نمازی!"

"بجے داڑھی جے کرتوت!"

"بُرا بخت تے گیا جیا بُرا بخت۔ وضو کرتا جائے ہے اور لونڈیا کو پٹیاتا جائے ہے!"

"بڑا لمبری ہے سالا، بڈھا کھرانٹ!"

"سوا دو سو برس تو نگل گیا گدھے کی طرح؟"

"عدہت تیرے بن کی، ماں بیٹی دونوں کو پٹاتا تھا، شیطان مصلے پہ بیٹھ کے دیکھو تو!"

(باقی صفحہ ۵۴ پر)

افسانہ

آدم، درخانئی

(رومانِ غم انجام)

رضا ہمدانی

سوات کی فراخ و جوان وادی، سرسبز و شاداب چراگاہیں، اور رنگ و بو سے معمور کھیت، آدم خاں کے ملکوتی نغموں میں ڈوبے ہوئے کھوئے ہوئے کسی جنت گم گشتہ کے حصے معلوم ہوتے جب آدم خاں کی راگ بھری انگلیاں رباب کے تاروں سے مس ہوتیں تو ساکت و خاموش تاروں میں جیسے ہزاروں حوریں گانے لگتیں، سینکڑوں کوئلیں اور پپیہے، ہجر و فراق کی داستانیں سنا سنا کر گستانوں میں آگ لگا دیتے جس سے سوات کی چراگاہیں افسردہ ہو جاتیں اور شاداب وادیوں کی جوانی جھلس کے رہ جاتی پنگھٹ پہ جاتی ہوئی الھڑ دوشیزائیں راستہ چلنا بھول جاتیں، ان کے قدم رک رک جاتے، اور اکثر کے سروں اور کولھوں پر رکھے ہوئے پانی کے گھڑے زمین پر گر کر ان کے ارمانوں کی طرح چور چور ہو جاتے۔ ان کی رگ رگ میں رومانی جذبوں کا الاپ گدگدی کرنے لگتا، ان کی امنگیں زخمی پنچھیوں کی طرح "رقصِ بسمل" میں مگن ہو جاتیں۔

آدم خاں کے رس بھرے نغموں کے ساتھ اس کی بھرپور جوانی اور صدف ایسی آنکھوں کی چمک دمک، کھلتا ہوا گندمی رنگ، کتابی چہرے کے دلکش نقوش اور شمشاد ایسے قد کی رعنائی کا شہرہ "بازدرۂ بالا" کی حدود سے نکل کر سارے سوات میں پھیل چکا تھا۔ سارا سوات اس گاؤں کی قسمت پر رشک کرنے لگا، لوگ کہتے :-

حسن خاں ملک کتنا خوش نصیب ہے کہ اللہ نے اسے مال و دولت کے ساتھ ساتھ، آدم خاں ایسا بیٹا بھی عطا کیا ہے۔ قبیلے کی آنکھ کا تارا!

آدم خاں گاؤں کی ہر لڑکی کا محبوب۔ سینکڑوں کنواریوں کے دل اس کے رباب کے تاروں میں الجھے رہتے لیکن آدم کو کسی سے بھی عشق نہ تھا وہ ان کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھتا۔ اسے اگر عشق تھا تو اپنے رباب سے وہ رباب کے تاروں کے ساتھ باتیں کرتا، نئی نئی باتیں، انوکھے انوکھے راز و نیاز، اس کی انگلیاں ہر لمحہ تاروں کے ساتھ کھیلتی رہتیں، اس کی آوازیں ہر وقت کسی ابدی نغمے کے سراغ میں بھٹکتی رہتیں۔ وہ آنکھیں بند کئے ہر وقت نغمے کے پُرشور سمندر میں بہے چلا جاتا، اپنی منزل متعین کئے بغیر کشتی، ساحل اور ناخدا سے بے نیاز، ایسی جل پری کی تلاش میں جو نغمے سے زیادہ دلکش اور زہرہ و مشتری سے زیادہ حسین و جمیل ہو۔ اس کے ذہن و تخیل پر ایک ایسی تصویر مرتسم ہو چکی تھی جسے وہ اپنے دل کی ملکہ بنانا چاہتا تھا۔ یہ راز اس کے دل کے حجلے میں پل رہا تھا، وہ اپنے دل کی بات کس سے کہتا؟ اسے کوئی راز دار نہیں ملتا تھا، وہ ہر لمحہ اس تخیلی پیکر کو نغموں کے خواب زاروں میں محوِ گلگشت دیکھتا، اسے خواب میں بھی اسی کا خیال آتا۔

ماں باپ، اپنے اکلوتے بیٹے کو دیکھ دیکھ کر جیتے۔ وہ اس کی شہرت اور تعریف سن کر اللہ کا شکر بجا لاتے، اب ان کے دل میں ایک آرزو تھی۔ آدم خاں کی شادی، لیکن آدم خاں کی شادی اس پیکرِ تخیل کے سوا کسی دوسرے کے ساتھ ناممکن تھی۔ اس نے صاف انکار کر دیا۔ ماں باپ کو سخت صدمہ ہوا، وہ آدم خاں کے انکار کے پس منظر سے بے خبر تھے، انہیں آدم کے خیالی عشق کی خبر نہ تھی، اور جب آدم کے دو راز دار دوستوں نے انہیں اس راز سے آگاہ کیا کہ وہ تو اپنے خوابوں کی ملکہ کے ساتھ ہی شادی کریگا تو انہوں نے اس کو بڑے تعجب سے سنا، وہ سمجھے شاید آدم کو رباب نوازی کے بے پناہ شوق نے پاگل بنا دیا ہے۔

ایک دن جب آدم خاں رباب کے ساتھ راز و نیاز میں مصروف تھا، کہ اس کے کانوں میں کچھ ایسی آوازیں پڑیں جیسے کسی نے رس گھول دیا ہو۔ جب وہ ہمہ تن متوجہ ہو گیا۔ پڑوس کے گاؤں "بازدرۂ پایاں" سے آئی ہوئی مہمان بڑھیا اپنے گاؤں کی ایک لڑکی

کا ذکر کر رہی تھی۔ وہ طاؤس خاں کی اکلوتی مہ جبین لڑکی "درخانئی" کے حسن و جمال کی تعریف میں محو تھی، آدم کو دیارِ محبوب سے آئی ہوئی ہستی سے ایک گونہ انس پیدا ہو گیا، اسے یقین ہو گیا کہ ہو نہ ہو یہ تمام باتیں اسی کی محبوبہ کی ہو سکتی ہیں۔ اور پھر آدم نے بڑھیا کے سامنے "درخانئی" کے خدوخال بیان کرنا شروع کئے۔ جب اس نے بائیں رخسار کے تل اور پیشانی کے دلکش نشان زخم کا پتہ دیا تو بڑھیا نے قسم کھا کر کہا: "آدم بیٹا! تم نے درخانئی کو ضرور دیکھا ہے" لیکن آدم نے کہا: "خالہ میرا خواب سچا ہے۔ میری محبت ازلی و ابدی ہے۔ میرا عشق پاکیزہ ہے"

بڑھیا نے آہ سرد کھینچ کر کہا: "لیکن بیٹا! یہ سب کچھ بے سود ہے۔ درخانئی کی منگنی تو ایک خان پایاؤ کے ساتھ ہو چکی ہے۔ بڑھیا کے ان الفاظ نے آدم کی دنیا تہ و بالا کر دی، اس پر دیوانگی نے اپنا سایہ ڈال دیا، رباب کے ساتھ اس کا انس بڑھ گیا، اب تو اس نے رباب کے تاروں کو زبان دے دی تھی!

کہتے ہیں عشق کی آگ دونوں طرف سلگتی ہے، بڑھیا واپس اپنے گاؤں گئی تو اس نے درخانئی سے آدم خاں کے خوابوں اور اس کی بے پناہ محبت و شیفتگی کا ذکر کیا۔ اور اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب درخانئی نے بھی جواباً بڑھیا کے سامنے اپنے خواب بیان کئے، آدم خاں کی شکل و صورت بتائی۔ اور اس کے رباب کے آتش ریز نغموں کا ذکر کیا۔

درخانئی ہر رات خوابوں کی سرسبز و شاداب وادی میں آدم کو کسی ندی کے کنارے رباب بدست دیکھتی۔ اور جب رباب کے نغمات اپنے عروج پر ہوتے تو درخانئی کسی اپسرا کی طرح آسمانی ناچ ناچتی ہوئی رباب کے ملکوتی نغموں میں گھل جاتی، اور جب آدم خاں رباب کے تاروں سے مضراب الگ کر لیتا۔ تو درخانئی اس میٹھے اور بہشتی خواب سے ایک دم بیدار ہو جاتی اور پھر اس کے کانوں میں آدم کے ٹپوں کا الاپ اور نغمے پہروں گونجتے رہتے۔

جب آدم کو درخانئی کی محبت کا علم ہوا تو اس کے سمندِ شوق پر تازیانہ لگا۔ وہ وارفتگی کے عالم میں ہر لحہ رباب بدست رہنے لگا۔ بڑھیا نے درخانئی کا پیغام محبت اور پھولوں کا تحفہ آدم خاں کو دیا، اور یہ خوشخبری بھی سنائی کہ وہ عنقریب ایک شادی کی تقریب پر یہاں آنے والی ہے۔

اور پھر شادی کی تقریب پر آدم نے اپنے فن نہیں بلکہ اپنے خلوص عشق، اپنے شوق و محبت اور سوز و گداز کا مظاہرہ کیا۔ ساری محفل پر جیسے کسی نے جادو کر دیا ہو۔ آدم نے درخانئی کے خلوص و محبت کا جادو ——— اور جب درخانئی پر آدم کی نظر پڑی تو اس کے خواب و خیال کی شہزادی عالم ہوش و بیداری میں اور بھی نکھری ہوئی معلوم ہوئی۔ آدم کے جذبات شوق نے رباب کے تاروں میں جان ڈال دی ——— اور اس نے محبوب کا گیت محبوب کے حضور بصد شوق و نیاز پیش کیا۔

درخانئی کو ایک نظر دیکھ لینے کے بعد آدم کی حالت روز بروز غیر ہوتی گئی، اب اس کا علاج درخانئی کے پاس ہی تھا۔ اس کے رازدار دوستوں میرو اور بالو سے اپنے دوست کی یہ حالت نہ دیکھی جا سکی۔ اور انہوں نے کسی نہ کسی طرح آدم کو دیارِ محبوب میں پہنچا دیا۔ پھر ایک رات۔ تاروں بھری رات میں۔ محبت کے یہ دو پیکر اکٹھے ہوئے، دونوں نے ایک دوسرے کا استقبال آنسوؤں کے موتیوں اور اشکوں کے ہاروں سے کیا، ٹھنڈی آہوں کے گیتوں سے ایک نے دوسرے کو خوش آمدید کہی اور ایک لمحے تک دونوں کی خاموشی نے ایک دوسرے کو خراجِ محبت پیش کیا جب آہوں کے بادل چھٹے، اشکوں کا مینہ تھما، تو عشق و محبت کے یہ دونوں افق مسکرائے:۔

میرے خوابوں کی شہزادی، تو آخر کب تک میرے خیالوں کی طرح آوارہ پھرتی رہیگی؟ اور نغموں کی طرح میرے رباب کے تاروں میں ڈھل جا! مضراب کی طرح میری انگلیوں کے پوروں میں پیوست ہو جا! اب جدائی برداشت نہیں ہو سکتی۔

——— "میرے مغنی محبوب! میں تیرے نغموں کی دنیا میں کھو جانے کیلئے بیتاب ہوں۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے بغیر مکمل نہیں۔ رباب اور نغمے کی طرح، مضراب اور تاروں کی طرح ——— اے میرے چاند! دنیا میرے لئے تاریک رات کی مانند ہے۔ میں چکور کی طرح تجھے ہر طرف تلاش کرتی رہتی ہوں۔ لیکن ہر قدم پہ دام بکھرے ہوئے ہیں۔"

——— "لیکن درخو پیاری! تیری منگنی؟ تیرا بیاہ؟ کیا مجھ سے میرا رباب چھین لیا جائے گا؟ میرا گلا گھونٹ کر میرے ٹپوں اور الاپوں کو موت کی نیند سلا دیا جائیگا؟ کیا میرے نغمے بے سوز کر دیئے جائیں گے؟ کیا میرا رباب کسی جلاپے کے حوالے کر دیا جائے گا؟ کیا یہ سچ ہے درخانئی؟ پیاری درخو؟"

——— میرے مغنی محبوب! بے تسرے نغمے گانے بند کر دے، کیا تجھے اپنے رباب پر اعتماد نہیں رہا؟ رباب کے ساتھ ساتھ تمہارے پاس بندوق بھی تو ہے۔ جب مضراب سے کام نہ چل سکے تو اس کی

جگر کا رتوس لے لیتے ہیں یہی ایک یوسف زئی پٹھان کی جرأت و ہمت کا تقاضا ہے، ہم دونوں ایک دوسرے کے لئے ہیں۔ مجھے تم سے کوئی نہیں چھین سکتا۔ رباب ٹوٹ سکتا ہے لیکن اناڑی انگلیوں سے سر نہیں کیا جا سکتا۔"

ستاروں کی گردش نے ہوا کے جھونکے کی طرح تاروں بھری رات کے ارمان کو درہم برہم کر دیا! دو دلوں نے ابھی راز و نیاز ختم بھی نہ کئے تھے کہ مرغ سحر نے اذان دی۔ درخانئی کے گھر کے صحن میں بندھی ہوئی بھیڑوں نے ممیانا شروع کر دیا۔ اور یہ دونوں متوالے ایک دم جیسے گہری نیند سے چونک اٹھے۔ درخانئی کے دل سے بھیڑوں کے لئے بددعا نکلی:۔

"اے میرے باپ کی بھیڑو! تمہارے گلے میں ناسور پڑ جائے تم نے میرے محبوب کو مجھ سے جدا کر دیا!"

دونوں نے آپس میں انگوٹھیوں کا تبادلہ کیا اور چاند سورج کی طرح ایک دوسرے سے جدا ہو گئے!

اب تو یہ آگ دونوں طرف بھڑک اٹھی تھی، اس کے شعلے آسمان گیر ہو چکے تھے۔ درخانئی جیسے بیمار پڑ کر چارپائی پہ پڑ گئی اس کا خیال تھا شاید اس طرح شادی کی بلا ٹل جائے گی۔ لیکن بڑی بوڑھیوں کا خیال تھا کہ شادی ہونے سے درخانئی صحت یاب ہو جائے گی۔ اس طرح جس تیر سے اس نے شکار کرنا چاہا تھا وہ اس کے سینے میں پیوست ہو گیا۔ ڈھول اور سرنا کی چیخم دھاڑ میں درخانئی کی ڈولی دوشیزگی کی لاش اور جوانی کا پُر ارمان جنازہ تھا، وہ پر کٹی کونج اور زخمی مرغابی کی طرح ڈولی میں پڑی کراہ رہی تھی۔

نئے قفس میں جا کر وہ سچ مچ بیمار پڑ گئی۔ اور نادان طبیبوں نے سمجھا کہ اسے تپ دق ہو گئی ہے۔ درخانئی خوب جانتی تھی کہ یہ روگ دوا دارو سے نہیں ٹلے گا۔ وہ دل ہی دل میں طبیبوں کی عقل پر ہنستی اور کہتی:
"ٹھیک ہی تو کہتے ہیں طبیب، تپ دق ہی تو ہے، لیکن عشق کی تپ دق جس کا علاج ان کے بس کی بات نہیں۔ اور جب علاج معالجے نے کوئی اثر نہ کیا تو اسے میکے واپس بھیج دیا گیا۔

"درخانئی رقیب کے گھر جا چکی ہے" اس خبر نے آدم کے ہوش و حواس کو برہم کر کے دیوانگی کی آغوش میں دے دیا تھا۔ اس کا رباب چھین گیا تھا اس کا مضراب چرا لیا گیا تھا، اس کی غیرت پر حملہ کر دیا گیا تھا۔ اس کے جذبات کو بری طرح جھنجھوڑا گیا تھا۔

"درخانئی سخت بیمار ہو کر میکے واپس آ گئی ہے۔ وہ چند گھڑیوں کی مہمان ہے!" اس دوسری خبر نے رہی سہی کسر بھی پوری کر دی۔ آدم خان کا بدنصیب باپ بیٹے کی حالتِ زار پہ رات دن کڑھتا۔ آخر اس نے اپنے ایک قریبی دوست میرمائی کے ساتھ مشورہ کیا اور طے پایا کہ درخانئی کو زبردستی حاصل کیا جائے۔ میرمائی اور حسن خان نے ایک مسلح جمعیت کے ساتھ طاؤس خان کے مکان پر حملہ کر دیا۔ بڑے کشت و خون کے ساتھ تدبیر کارگر ہوتی۔ اور آدم کو گوہر مراد ہاتھ آ گیا لیکن تقدیر کھڑی مسکرا رہی تھی، اسے کچھ اور ہی منظور تھا، وہ نہیں چاہتی تھی کہ دو دل مل بیٹھیں۔

جب طاؤس اور پایاؤ نے دیکھا کہ جنگ و جدل کے ساتھ درخانئی واپس نہیں مل سکتی، تو انہوں نے مال و زر کا جال پھیلانا شروع کر دیا اور میرمائی باوجود امیر و زردار ہونے کے مایا کے جال میں پھنس گیا۔ اس نے سال ہا سال کی دوستی کو دولت پر قربان کر دیا، اس نے گویا آدم خان کو اپنے ہاتھ سے ذبح کر ڈالا اور اس طرح درخانئی پھر واپس اسی رنگین قفس میں قید ہو گئی، اس کی بیماری بڑھ گئی، وہ ہر لمحہ آنسوؤں کے شیش محل بناتی جو دوسرے لمحے چکنا چور ہو جاتے۔ لیکن ان کے ٹوٹنے کی آواز کوئی بھی نہ سنتا!

آدم خان کا رباب گم گشتہ ملنے کے بعد پھر کھو گیا، اور اب اس کی تلاش بے سود تھی۔ اگر وہ دوبارہ مل بھی جاتا تو محبت کی کوئیل کو ذبح کرنے کے بعد اس سے گیت سننے کی کوشش افسردہ راکھ سے شعلہ جوالہ کی تلاش کے مترادف تھا لیکن آدم خان کے ساتھی میرو اور بالو نے رباب گم گشتہ کو پھر تلاش کرنے کی ٹھانی، انہیں آدم کی زندگی بڑی عزیز تھی، انہیں اعتماد تھا کہ درخانئی، آدم کے آغوش میں ضرور آ جائیگی۔ اور اس طرح آدم کا ساکت و خاموش رباب ایک بار پھر سوات کے نگستانوں کو ملکوتی داستانیں سنائے گا، شاداب چراگاہوں میں پھر سے سحر نغمہ راج کرے گا، ندیوں کی گنگناتی ہوئی روانی تھم جائے گی۔ اور زخم رسیدہ چکور اور دراج رباب کے تاروں کے دام میں اسیر ہو جائیں گے۔

دوسرے دن، میرو، بالو اور آدم خان ملنگوں کا روپ دھار کے دیارِ محبوب میں جا پہنچے۔ گاؤں کے باہر شہید کے مزار پر سارے دھونی مار کر بیٹھ گئے۔ آن کی آن میں نئے درویشوں کی خبر جنگل کی آگ بن کر سارے

گاؤں میں پھیل گئی۔ مزار پر ایک میلہ سا لگ گیا۔ بیسیوں نامرادوں اور حاجتمندوں نے درویشوں سے دعائیں کرائیں، تعویذ گنڈے لئے اور نامرادِ محبت آدم خاں نے سب کے لئے دعائیں کیں، ہر ایک کی ڈھارس بندھائی، لیکن اس کے اپنے آنسوؤں کے تار کوئی روکنے والا نہ تھا! اس کی ڈھارس بندھانے والا کوئی نہ تھا! اسے کسی نے ایسا عمل نہ بتایا جس سے اس کی محبت کا خاموش رباب چہک اٹھتا، لیکن اس کی رازدار بڑھیا نے اسے تسلی دی: "آدم خاں! پختون ہو، جوان ہو، ہمت سے کام لو، درخانئی تمہاری ہی ہے، وہ ضرور تمہیں ملے گی!"

درویشوں اور ملنگوں کی آمد اور کرامات کا شہرہ طاؤس خاں تک بھی پہنچا۔ بڑھیا نے طاؤس خاں سے کہا: "خان! خدا اور اس کے درویشوں کے پاس بہت کچھ ہے، کہتے ہیں یہ درویش بڑے پہنچے ہوئے ہیں! شاید ان کی دعا سے ہماری پھولوں کی ڈالی جیسی بچی پر اللہ رحم کر دے وہ تو مردوں کو زندہ کر دیتا ہے!"

جب طاؤس خاں راضی ہو گیا تو بڑھیا نے درخانئی کو خوشخبری سنائی: "بیٹیا! تمہارے اُڑے رنگ سے گرا ہوا گلاب کا پھول ابھی تمہارے ہاتھ آنا چاہتا ہے۔ اسے ہوشیاری سے اپنے بالوں میں سنوار لینا۔ بڑے زور کی آندھی چل رہی ہے۔ اب کے اگر یہ پھول گر گیا، تو آئندہ کبھی اس کی ایک پتی بھی نہ پا سکو گی!"

دھڑکتے ہوئے دل اور لرزتے ہوئے قدموں کے ساتھ آدم خاں ہزاروں عقیدتیں لئے۔ در محبوب کی طرف روانہ ہو گیا، اس وقت اس کا انگ انگ نغموں بھرا رباب بنا محبت کے گیت الاپ رہا تھا، وہ سبزے کو روندتا، پھولوں کو مسلتا، جھومتا جاتا، منزلِ شوق طے کر کے درخانئی کے سامنے جا پہنچا!

درخانئی، نرگستانِ سوات کی نرگسِ بیمار، پژمردہ کلی، کملایا ہوا پھول، خزاں گزیدہ پتی، مرجھائی ہوئی ڈال، بستر پر پڑی تھی! جب دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں تو انہوں نے ایک دوسرے کو آنسوؤں کے ہیروں کا ہدیہ پیش کیا، محبت کے چمکتے ہوئے ہیرے، پیار کے آبگینے اور ان آنسوؤں نے خموشی میں ایک دوسرے کو ہزاروں داستانیں سنا ڈالیں! درخانئی کی پھول ایسی جوانی آدم خاں کی روح میں کانٹا بن کر پیوست ہو گئی، اس کے دل میں ایک تیر لگا۔ معاً اس کا ہاتھ سینے کی طرف بڑھا اور اس نے اپنے دل کو تھام لیا۔ اس کی زبان نے اس کے دل کا ساتھ دیا، اور ایک دلدوز چیخ کے ساتھ وہ بے ہوش ہو گیا۔ طاؤس خاں کی دوررس نگاہیں معاملے کی تہ تک پہنچ گئیں، پہلے تو اس نے چاہا کہ تلوار کے ایک ہی وار میں آدم خاں کے ٹکڑے ٹکڑے کر دے، لیکن بڑھیا نے ایسا کرنے سے روک دیا۔ اور کہا: "دانشمندی کا تقاضا ہے کہ اس بات کو اسی جگہ دبا دیا جائے اور ایسا طریقہ اختیار کیا جائے جس سے سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے!"

آدم خاں کے حواس بجا ہوئے تو وہ ایک تاریک کوٹھڑی میں پڑا تھا، طاؤس خاں شمشیر برہنہ ہاتھ میں لئے گرج رہا تھا: "لڑکے! اسی وقت میرے گاؤں سے نکل جا!" آدم خاں کو ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے اسے جنت سے نکل جانے کا حکم دیدیا ہو، ٹھاٹھیں مارتے ہوئے دریا سے پیاسا لوٹ جانے پر مجبور کیا ہو، بھرے گلزار سے اس نے اپنی پگڑی پر سجانے کے لئے ایک پھول توڑنا چاہا ہو لیکن اس کے ہاتھ توڑ دئے گئے! اور وہ اپنے گاؤں واپس آ گیا، بلکہ وہاں لایا گیا۔ آدم خان نہیں بلکہ اس کا قالب بے جان!۔ اس کی روح دیارِ محبوب میں نغمے کی طرح آوارہ پھرتی رہ گئی، اور جسم بے نغمہ رباب کی مانند حسن خاں کے گھر۔

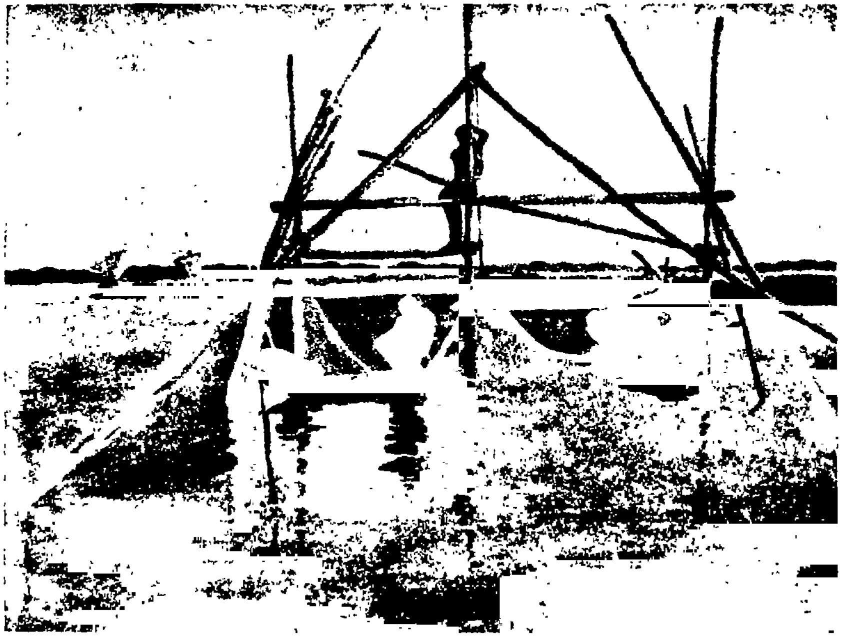
اب اسے دنیا کی ہر چیز سے نفرت ہو چکی تھی، خوبصورت دنیا کی ہر رعنائی و زیبائی سے۔ حتیٰ کہ اپنے رباب سے بھی، اس کے نغموں سے بھی! اور جب ایک دن اچانک اس کی نظر رباب پر پڑی تو اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا، وہ اسے اپنا ترآورد دیکھنے لگا۔ اور فرطِ غیظ سے کلہاڑی کے ساتھ رباب کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔

آدم کی حالت روز بروز غیر ہوتی گئی۔ ماں باپ کی محبت نے یہ دکھ برداشت نہ کیا، لاکھ تدبیریں کیں، علاج معالجہ کرایا گنڈے تعویذ سے کام لیا، لیکن آدم خاں کا مرض بیکراں ہوتا گیا۔ جب حسن خاں کو یقین ہو گیا کہ اس کا اکلوتا بیٹا، اس کا حقیقی وارث اور اس کے قبیلے کا نگہبان ہاتھ سے جا رہا ہے تو وہ بہت مضطرب ہوا، اور یہ طے پایا کہ کسی نہ کسی طرح آدم خان کو گاؤں کی حسین ترین لڑکی گلناز دکھائی جائے۔ ممکن ہے سوکھی ندی میں پانی آ جائے۔ آدم کے عشق کا بھڑکتا ہوا الاؤ ٹھنڈا پڑ جائے اور وہ درخانئی کو بھول جائے!

منگنی کے رومانی ماحول میں نقرئی قہقہوں کے سنگیت کا



سرحد کا جنگی ناچ



سے رواں کی سر زمین--(مشرقی پاکستان) عمل : انوارالحق



ہجوم تھا، چوڑیوں کے مدھر نغمات میں کائنات ٹھہری ہوئی معلوم ہوتی تھی، سرخ و سفید باہوں کی کہکشائیں، مست، الھڑ لڑکیوں کا جھرمٹ اور اس میں گلناز کا مرمریں پیکر۔ جیسے نرگستان سوات کی شہزادی گھڑی دو گھڑی کے لئے نرگس کے شبستاں سے باہر ٹہلنے آگئی ہو، لانبی لانبی، پتلی پتلی گندھی ہوئی سیاہ بالوں کی مینڈیاں، دھڑکتے ہوئے دل کی طرح لرزتا ہوا سونے کا پیزوان، دلکش اور رَبل پر سجے ہوئے خود رو پھول، جس نے دیکھا مبہوت ہو گیا! لیکن آدم خاں کو گلناز کے جلالِ حسن نے بالکل متاثر نہ کیا۔ اس کا معیارِ حسن و محبت بہت اونچا تھا۔ فرشتوں کے تقدس اور حوروں کی صباحت سے بھی اونچا!

گلناز کے خد و خال اس کے جسم کے خطوط کی شوخ محرابیں اس کے تیکھے نقوش کی ایمان ربائی کوئی چیز بھی آدم کو اپنی طرف متوجہ نہ کر سکی اس نے جیسے کچھ دیکھا ہی نہیں۔ اس کی محویت، خاموشی اور خود فراموشی کی دنیا میں کوئی انقلاب نہ آیا۔ نرگس کی ہر آنکھ میں اسے درخانئی ہی کی تصویر نظر آئی، لالۂ صحرائی کے احمریں پیالے میں درخو کھڑی اسے بلا رہی تھی، وہ ہر بار اس تخیلی پیکر کی طرف لپکتا اور ہاتھ پھیلا کر رہ جاتا درخانئی فضا میں تحلیل ہو جاتی اور آدم کے سینے پر داغ چھوڑ جاتی۔ اور فضا کا ہر ذرہ نرگس کی آنکھ سے آدم کی دیوانگی کا تماشا کرتا۔

ہجر و فراق کے طویل لمحے طویل تر ہوتے گئے، آدم خان کی دیوانگی کا رنگ پختہ تر ہوتا گیا۔ آخر ایک دن بازدرہ میں اس خبر نے کہرام مچا دیا کہ "آدم خان مر گیا!"

کسی نے کہا "ہمارا مغنی مر گیا"۔ کسی نے "عاشقِ صادق مر گیا" اور کسی نے "شہزادی درخانئی کا رباب ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گیا! اب کون نغمے سنائے گا؟"

بازدرہ میں نغمے مر گئے، اور بَین زندہ ہو گئے! درخانئی رنگین پایوں والے پلنگ پر دراز، روئیں روئیں میں آدم خاں کو بسائے ہجر اسی کے خواب دیکھتی رہتی، بڑھیا اس کے سرہانے بیٹھی رہتی، اپنے باپ طاؤس خاں کی بھری بستی میں بس ایک اس کی ہمدرد اور اس کے دکھ درد کو جاننے والی تھی، لیکن غریب بڑھیا کی کوئی سننے والا نہیں تھا، اس کے کہنے پر کوئی کان ہی نہ دھرتا تھا۔ درخانئی کے لئے تو اس کی ماں کی ممتا بھی مر چکی تھی، اس کے سینے میں دل کی جگہ پتھر کا ٹکڑا تھا۔ ماں کی ممتا پر باپ کے شملے کی غیرت اور قبیلے کی روایتی عزت غالب آ چکی تھی،

اب درخانئی کا آخری سہارا اس کے خواب ہی تھے! اس نے خواب میں دیکھا:۔

ایک بے حد خوبصورت باغ ہے جہاں وہ سہیلیوں کے ساتھ سیر کر رہی ہے۔ یکایک باغ کے ایک گوشے سے رباب کے نغمے ابھرنے لگے، جب درخو نے اس طرف رخ کیا تو سرو و شمشاد کے ہجوم میں ایک بڑے تالاب کے بیچ، چاندی کی کشتی میں آدم خاں بیٹھا رباب پر درد بھرے گیت گاتا دکھائی دیا، اس نے درخو کو دیکھ کر اپنی آغوش وا کر دی اور درخانئی جل پری کی طرح پانی کی لہروں پر چلتی ہوئی آدم کے آغوش میں کھو گئی۔ آدم نے کہا "بس درخو، اب میں تمہیں نہیں چھوڑوں گا، ہم اسی کشتی میں رہیں گے، یہیں اپنے لئے نیا گاؤں بسائیں گے" اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے تالاب ایک سمندر میں تبدیل ہو گیا، ایک خوفناک طوفان آیا، اور کشتی الٹنے لگی۔ درخانئی نے ایک چیخ ماری اور جب اس کی آنکھ کھلی، تو اپنے سرہانے بڑھیا کو پایا جو اسے تسلی دے رہی تھی۔ وہ بڑھیا سے لپٹ کر رونے لگی "میرا آدم کہاں ہے خالہ؟ اس کی کشتی ڈوبی تو نہیں؟"

بڑھیا نے کہا "درخانئی بیٹیا! آدم خان، تمہارے ماں اور باپ کی ضد پر قربان ہو گیا! وہ اس دنیا سے چلا گیا! آدم نے تیرے فراق میں تڑپ تڑپ کر جان دیدی۔ درخو بیٹی!" اور جیسے درخانئی کا کسی نے گلا گھونٹ دیا، اس کے منہ سے صرف "آدم خاں!" نکلا۔ اس نے اپنا سر تکئے میں چھپا لیا! ایک طویل لمحے تک جب اس نے سر نہ اٹھایا۔ تو بڑھیا کو فکر لاحق ہوئی۔ جب اس نے اسے جھنجھوڑا تو وہ آدم خاں کے پاس جا چکی تھی!!

کہتے ہیں جب درخانئی کو قبر میں اتارا گیا تو تھوڑی دیر بعد یوں محسوس ہوا گویا قبر میں دو لاشیں جمع ہو گئی ہیں! جب دوسری لاش کے منہ سے کفن ہٹایا گیا تو وہ آدم خان کی لاش تھی!!

آدم خان اور درخانئی کا مزار آج بھی مرجع عوام ہے۔ آدم کے مزار کے درخت کی لکڑی کا مضراب نغمہ و موسیقی کے ہر شائق کی انگلیوں میں جادو بھر دیتا ہے۔ عشق و نغمہ کے ان شہیدوں کی یہ کرامت ہے!

استقلال نمبر — ماہِ نو — اگست ۱۹۵۵ء

پاکستان کا قیام ایک تاریخی واقعہ ہے اسی طرح اس کے آٹھویں جشنِ استقلال پر یہ شمارۂ خاص

ادب، فن اور ثقافت کے مایۂ ناز شاہکار پیش کرنے میں

ایک تاریخی حیثیت کا مالک ہوگا

پاک و ہند کے مقبول اہلِ قلم کے تصورات و افکار کا یہ مجموعہ متعدد صوری و معنوی خوبیوں کا حامل ہوگا اور امید ہے کہ اس سال کی بہترین ادبی پیشکش تسلیم کیا جائے گا

ہمارے چند متوقع لکھنے والے

ڈاکٹر مولوی عبدالحق	ڈاکٹر ابواللیث صدیقی	انتظار حسین	شوکت صدیقی	روش صدیقی	تابش دہلوی
ڈاکٹر سید عبداللہ	الطاف گوہر	شفیق الرحمٰن	اشرف صبوحی	سید عبدالحمید عدم	صفیہ شمیم
محمد حسن عسکری	ضمیر جعفری	ابن سعید	●	ابن انشا	زہرہ نگاہ
ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری	●	ابوالفضل صدیقی	جگر مرادآبادی	قیوم نظر	احمد فراز
سید ہاشمی فریدآبادی	غلام عباس	اشفاق احمد	ابوالاثر حفیظ	ناصر کاظمی	حامد حسن قادری
عبدالرحمٰن چغتائی	حجاب امتیاز علی	آغا بابر	فراق گورکھپوری	شیر افضل جعفری	شان الحق حقی
سیدہ وقار عظیم	شکیلہ اختر	ابوسعید قریشی	حفیظ ہوشیارپوری	ضمیر اظہر	جلیل قدوائی
ڈاکٹر عبادت بریلوی	قدرت اللہ شہاب	یزدانی ملک	احسان دانش	سراج الدین ظفر	قتیل شفائی

ضخامت: عام اشاعتوں سے دوگنی

سرورق: نیا دیدہ زیب سرورق

رنگین تصاویر: ملک کے نامور مصوروں کے متعدد شاہکار

سادہ تصاویر: جدید حالات اور تاریخی و تہذیبی ورثہ کی آئینہ دار

مستقل خریداروں کو یہ سالنامہ بلاقیمت پیش کیا جائے گا۔ عام قیمت ۱؍ فی کاپی (پاکستان میں) ۱؍ (ہندوستان میں)

ایجنٹ حضرات:- خاص نمبر کی مطلوبہ تعداد سے فوراً مطلع فرمائیں۔

ادارۂ مطبوعات پاکستان، پوسٹ بکس ۱۸۳ – کراچی

افسانہ

گوہرِ مراد

انور عنایت اللہ

"مجھے سخت افسوس ہے موُدی" نجمہ نے جواب دیا اور کھٹ سے تیسری مرتبہ ریسیور رکھ دیا اور میں نے جھنجھلا کر ریسیور کو گھورا۔ مجھے سخت کوفت ہو رہی تھی۔ صبح سے میں تین دوانیاں محکمۂ ڈاک اور تار کی نذر کر چکا تھا اور بات اب تک کچھ نہیں بنی تھی۔ بادلِ ناخواستہ چوتھی چمکتی ہوئی دوانی نکالی، حسرت بھری نظروں سے اس کا جائزہ لیا اور ایک بار پھر نجمہ کا نمبر ملایا۔

"ہیلو ——!! دوسری طرف سے نجمہ کی آواز آئی۔

"خدا کے لئے سنو نجمہ —— میں نے پکچر کے ٹکٹ خرید لئے ہیں۔ بہترین پکچر ——!!"

ابھی میں یہی کہنے پایا تھا کہ وہ جلدی سے بولی؛

"مجھے پتہ ہے پکچر بہترین ہے اور بہترین سینما ہال میں چل رہی ہے لیکن میں نے کہہ دیا نا موُدی؛ میں آج کی شام معروف ہوں۔"

"مجھے پتہ ہے تمہاری مصروفیتیں کیا ہوں گی —— ریڈیو سے فرمائش سننی ہوگی۔"

"جی نہیں۔"

"سر درد ہونا ہوگا؟"

"جی نہیں۔"

"تو پھر کسی نئی سہیلی کی دعوت ہوگی۔"

"نہیں —— نہیں —— نہیں۔"

"تو کسی کے ساتھ کہیں جانا ہوگا۔"

"ہاں —— ہاں —— ہاں۔"

"یہ ابھی تم نے زیرِ لب کس کا نام لیا تھا؛ —— اسلم کا؟" میں نے چالاکی سے حقیقت جاننے کی کوشش کی۔

"جی نہیں۔ میں نے کسی کا نام نہیں لیا تھا لیکن اگر آپ جاننا چاہتے ہیں تو سن لیجئے۔ میں بدرز کے ساتھ پکچر جا رہی ہوں —— خدا حافظ۔"

چوتھی مرتبہ کھٹ سے ٹیلیفون کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ مجھے اپنی قوتِ سماعت پر یقین نہیں آیا اور میں نے غور سے ریسیور کا جائزہ لیا۔ مجھے آج معلوم ہوا تھا کہ کوئی معقول لڑکی بدرمنڈلی کے ساتھ پکچر بھی دیکھ سکتی ہے۔

شام تو کافی اداس میں گذر گئی۔ دوسرے دن موسم بے حد خوشگوار تھا۔ سوچا آج گاندھی گارڈن کی سیر کی جائے۔ میں نے ایک بار پھر ڈاکخانہ کا رخ کیا۔ جیب سے دوانی نکالی اور اب کے رضیہ کو فون کیا۔ —— "رضیہ آج موسم بے حد خوشگوار ہے۔ سُنا ہے گاندھی گارڈن میں افریقہ سے بہت سارے غیر معمولی بندر آئے ہیں —— چلو آج دوپہر وہیں گذاریں۔"

"معاف کرنا موُدی۔ آج میں مصروف ہوں —— پھر کسی اتوار کو سہی۔ آج میں ہاکس بے جا رہی ہوں؟" جواب ملا۔

"ہاکس بے جا رہی ہو؟ ... زماں نے مجھے نہیں بتلایا؟"

"ہم زماں کے ساتھ نہیں جا رہے ہیں ... —— دراصل آج بدر صاحب نے ہم سب کو مدعو کیا ہے۔"

رضیہ نے جواب دیا اور میں نے بے اختیار سر تھام لیا۔

"یعنی کہ منڈلی نے تمہیں مدعو کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"جی ہاں —— آپ کو کچھ اعتراض ہے؟" اس نے جل کر پوچھا۔

"جی نہیں —— بھلا مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ شوق سے جاؤ۔ خدا حافظ۔"

اب کے میں نے جل کر ریسیور رکھ دیا اور چند لمحے سوچتا رہا: الٰہی یہ ماجرا کیا ہے؟ آخر بکا یک بدر منڈلی میں ایسے کون سے سرخاب کے پر لگ گئے کہ شہر کی ساری معقول لڑکیاں، اس کی دیوانی ہو رہی ہیں؟ سارا دن میں نے گاندھی گارڈن میں گذار دیا۔ شام کو گھر واپس آ رہا

تھا کہ وکٹوریا روڈ پر رضیہ کی نئی کار زنّ سے گذر گئی۔ گاڑی رضیہ
چلا رہی تھی اور اس سے قریب یتیم صورت بنائے مڈّی بیٹھا تھا!!۔
میں نے ایک بجلی کے کھمبے کا سہارا لے کر غور کیا —— قوت سماعت
کے ساتھ ساتھ کہیں میری بینائی بھی میرا ساتھ تو نہیں چھوڑ رہی ہے؟
کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ یکایک مڈّی کی اس حد تک مقبولیت کا راز
میری سمجھ سے باہر تھا۔ دوستوں کے حلقے میں وہ احمق مشہور تھا اور
اکثر لوگوں کا خیال تھا اس کی اوپر کی منزل "شئے لطیف" سے خالی تھی۔
حالات اب خطرناک حد تک نازک ہو گئے تھے۔ پانی بڑی تیزی سے
سر سے گذر رہا تھا۔

میں نے فوراً چند دوانیاں اور خرچ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ سب سے
پہلے میں نے زماں کو ٹیلیفون کیا۔

"بھیا۔ آج رات کو سات بجے میرے یہاں گول میز کانفرنس ہے
جس میں ایک اہم مسئلہ پر —— !!"

"بھئی معاف کرنا۔ آج میں بے حد مصروف ہوں!" اس نے جلدی
سے جواب دیا "آج رات میں نے مڈّی کو کھانے پر بلایا ہے"

"کیا کہا؟ مڈّی کو بلایا ہے؟ یعنی کہ بدر مڈّی کو؟" میں بے اختیار
چیخ پڑا۔

"بھئی۔ چیخ کیوں رہے ہو؟ کہہ تو دیا نا۔ بدر آ رہا ہے۔ کانفرنس
کسی اور دن رکھو —— خدا حافظ!"

سلسلہ منقطع ہو گیا اور میں نے دیکھا پوسٹ ماسٹر صاحب کے
علاوہ، دو ڈاکئے، تین خواتین، کئی عدد بچے اور ایک چھوٹا سا کتا مجھے
گھور گھور کر دیکھ رہے تھے۔ میں نے سٹ پٹا کر جلدی سے ریسیور رکھ دیا اور
اگلے ڈاکخانے کا رخ کیا۔

اب کی میں نے اسلم کا نمبر ملایا۔

"—— آج رات کو؟ نہیں بھیا۔ معاف کرنا۔ کل یا پرسوں
ہو سکتا ہے۔ لیکن آج نہیں۔ آج تو چاندنی رات میں کلفٹن کا پروگرام
ہے —— کوئی دس بجے مڈّی آ رہا ہے!!"

یا میرے اللہ —— پھر مڈّی؟ میں نے جھنجھلا کر ریسیور رکھ دیا
اور مڈّی کو ایک موٹی سی گالی دیتا ہوا گھر لوٹ آیا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ
یا تو میں پاگل ہو گیا ہوں یا دنیا پاگل ہو گئی ہے۔ اگلے دو دن میں
گھر ہی میں گوشہ نشین رہا اور غور کرتا رہا کہ یکایک مڈّی کی اس
ناقابلِ یقین ہردلعزیزی کے پس پردہ آخر کون سا راز تھا؟

تیسرے دن میں شام کو گھر سے باہر نکلا۔ صدر میں آوارہ گردی کے
بعد رات گئے جب میں گھر پہنچا تو تاریک برآمدے میں مجھے ایک سایہ نظر آیا۔
میں نے روشنی کی تو مڈّی نے حسب عادت احمقانہ انداز میں سلام کیا۔

"مڈّی؟" میں نے حیرت سے کہا۔

"جی ہاں بھائیجان —— بدر مڈّی —— کیا میں اندر چل سکتا
ہوں؟" اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"ہاں ہاں۔ کیوں نہیں؟" میں نے کمرے کا تالا کھولا اور ہم اندر داخل
ہوئے۔

"مجھے دیکھ کر تمہیں کچھ زیادہ خوشی نہیں ہوئی؟" اس نے آرام
کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"تمہارا خیال درست ہے۔ کچھ زیادہ خوشی نہیں ہوئی" میں نے
روکھائی سے جواب دیا۔

"حیرت ہے —— آج کی رات تمہارا مجھے ہاکس بے لے جانے کا
تو کوئی پروگرام نہیں؟" اس نے پوچھا۔

"جی نہیں"

"یا میری خاطر گل فردوس میں دعوت کا؟"

"جی مطلق نہیں"

"پرسوں مجھے پکچر لے جانے کا؟"

"جی بالکل نہیں"

"حیرت ہے —— لیکن یا اللہ تیرا شکر ہے" اس نے ایک
طویل سانس لے کر کہا۔ ٹائی کی گرہ ڈھیلی کی اور کرسی پر آرام سے بیٹھ گیا۔
میں نے سگرٹ پیش کیا تو لے لیا۔ ہم دونوں نے سگریٹ سلگائے تو
میں نے پوچھا۔

"بات کیا ہے مڈّی —— تم نے آتے ہی ایسے عجیب سے سوالات
کیوں کر ڈالے؟"

"میں پارٹیوں سے تنگ آ گیا ہوں محمود بھیا —— صبح پارٹی۔
دوپہر پارٹی۔ شام کو پارٹی۔ رات کو پارٹی —— میرے پاس رات کو
سونے تک کے لئے وقت نہیں —— یہ دیکھو"

اس نے جیب سے ڈائری نکالی: "آج تک میں نے ڈائری نہیں
خریدی تھی۔ لیکن اب مجبوراً خریدنی پڑی —— خود پڑھ لو۔ اگلے

پچیس دنوں کا تفصیلی پروگرام " اس نے ڈائری میرے حوالے کر دی۔ جس کے صفحے کے صفحے بھرے پڑے تھے۔

"آخر بات کیا ہے مڈلی ؟" میں نے رازدارانہ انداز میں پوچھا۔

"بات کچھ بھی نہیں۔ اللہ میاں کو جو مذاق سوجھا تو انہوں نے مجھے ایک عدد کوٹھی بخش دی ——— چھوٹی سی کوٹھی ہے چار کمروں کی"

"کیا کہا ؟ کوٹھی بخش دی ؟" میں نے حیرت سے پوچھا " تمہارے پاس تو ایک فلیٹ تھا ؟"

"جی ہاں۔ اب ایک کوٹھی بھی میرے قبضے میں ہے۔ میرے ایک چچا ہیں انہوں نے ہاؤسنگ سوسائٹی میں ایک خوبصورت کوٹھی بنوائی۔ کوٹھی تیار ہو گئی تو وہ بیمار پڑ گئے۔ ڈاکٹروں نے صاف صاف کہہ دیا کہ کراچی میں ان کے لئے خطرہ ہے۔ اگر وہ یہاں رہے تو جلد مر جائیں گے۔ مجبوراً وہ ہمیشہ کے لئے لاہور منتقل ہو گئے اور جاتے ہوئے کوٹھی میرے حوالے کر گئے اور کہہ دیا کہ جب تک میں ڈیڑھ سو روپیہ ماہانہ کرایہ ادا کرتا رہوں یہ کوٹھی میری ہے"

"کون سے چچا ہیں ؟ تمہارے چچا نعیم تو نہیں ؟ ——— ان کا ذرا پتہ تو لکھواؤ" میں نے جیب سے ڈائری نکالتے ہوئے پوچھا۔

"یار مارو گولی چچا نعیم کو ——— میں تو اس گھڑی کو کوس رہا ہوں جب میں نے نہ صرف یہ کوٹھی بخوشی قبول کر لی بلکہ بڑی سادگی سے ایک تاتو سے کہہ دیا کہ میں یہ کوٹھی بغیر پیشگی کرایہ لئے کسی دیانت دار دوست کے حوالے کرنا چاہتا ہوں۔ یہ کہنا تھا کہ یہ خبر آگ کی طرح شہر میں پھیل گئی اور اب پچھلے سات دنوں سے دعوتیں کھاتے کھاتے میرا ہاضمہ خراب ہو گیا ہے۔ کراچی کے آس پاس کا ایسا کوئی بھی خطہ نہیں جہاں میرے اعزاز میں پارٹیاں نہ ہوئی ہوں۔ اگلے پچیس دن تک میرا تمام وقت دوستوں کے لئے وقف ہے ——— آج بڑی مشکل سے جان بچا کر تمہارے پاس پناہ کے لئے آیا ہوں"

"کیا واقعی تمہارا ارادہ یہ کوٹھی کرائے پر دینے کا ہے ؟ ——— بغیر پیشگی لئے ؟" میں نے ذرا دلچسپی سے پوچھا۔

"ہاں ہاں بابا ——— ساری مصیبت اسی کوٹھی نے کھڑی کر رکھی ہے۔ کراچی میں کم از کم تین سال کا پیشگی کرایہ لئے بغیر مکان ملنا کہاں ہے۔ شہر کی آدھی شادیاں اسی لئے رکی ہوئی ہیں کہ یہاں مکان نہیں ملتا ——— مودی بھیا ! میری ایک بات مانو گے ——— خدارا مجھے کسی نہ کسی طرح اس جنجال سے بچاؤ۔ ورنہ میں خودکشی کر لوں گا اور میرا خون ان تمام دوستوں کی گردن پر ہوگا جو بے تحاشا میرے تعاقب میں ہیں" اس نے التجا کی۔

"اب گھبراؤ نہیں مڈلی۔ اب تم میری پناہ میں ہو۔ میں کسی کو تمہارے قریب تک آنے نہیں دوں گا ——— مطمئن رہو" میں نے اسے تسلی دی۔

"سچ ! ——— خدا کی قسم میں زندگی بھر تمہارا ممنون رہوں گا" اس نے ایک پرسکون طویل سانس لیتے ہوئے کہا۔ وہ بڑی عقیدت سے میرا منہ دیکھ رہا تھا۔

"یار ——— تم انسان نہیں فرشتہ ہو۔ ایسی بے لوث دوستی ان دنوں عنقا ہے" اس نے جماہی لیتے ہوئے کہا۔

"خدا کی قسم آرام کی نیند سوئے ہوئے ایک ہفتہ ہو گیا ——— اچھا بھیا ——— خدا حافظ۔ میں یہیں آرام کرسی پر سو جاؤں گا۔ تم میرے لئے زحمت نہ کرو ——— خدا حافظ" نیند سے اس کی آنکھیں بند ہو رہی تھیں۔

"ہاں ہاں ——— ضرور سو جاؤ۔ یہ گھر آج سے تمہارا ہے ——— میں ذرا ریکس ٹیلیفون کر لوں" میں اٹھا۔

"ریکس ؟" مڈلی نے چونک کر اٹھتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں ہاں۔ میں ابھی لوٹ آؤں گا۔ اب جب تمہیں ساتھ رہنا ہے تو پھر مجھے تمہاری سیر و تفریح کا بھی خیال رکھنا ہوگا۔ کل شام پکچر کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے ؟"

"کیا کہا ؟ ——— پکچر ؟ تم بھی مودی ——— تم بھی ؟"

——— اور وہ دھڑ سے فرش پر آ رہا ✦

○

اردو کے غیر معروف ناول۔ افتادِ جوانی :۔ بقیہ صفحہ ۱۲

دے ہوئے ہیں۔ لباس اگرچہ سادہ و کم قیمت ہوتا ہے لیکن پابندیٔ صوم و صلوٰۃ اور نیز صفائی طبیعت کی وجہ سے اجلا اور شفاف رہتا ہے۔ طہارت کا شک ضرورت سے زیادہ بڑھا ہوا ہے۔ جب کبھی کہیں مہمان جاتی ہیں، لوگ ان کو آنکھوں پر بٹھاتے ہیں۔ بوڑھا اور جوان ہر شخص ان سے راضی رہتا ہے۔ اگر ان کے شکایات کی دقت نہ ہو تو مہینوں اور برسوں لوگ ان کو نہ چھوڑیں۔ علاوہ ان سب باتوں کے ایک عزت اور وقار کی نظر سے وہ قوم میں دیکھی جاتی ہیں ؛

کاف تا کاف۔ —————— بقیہ صفحہ ۳۶

اور لوگوں کی ذاتی پسند و ناپسند کی قائل نہیں معلوم ہوتی۔ مکانوں اور گلیوں کی یکسانیت طبیعت پر گراں گذرنے لگتی ہے —— مگر صاحب مزاروں، مقبروں، محلوں اور ویران مسجدوں سے جی اکتا گیا —— چلئے کراچی چلیں۔

مگر کراچی کے سلسلے میں ریلوے لائن کے کنارے کنارے ، بدبد اور سمندر کے سنگم، بابائے ملت کے مزار کے سامنے، لالوکھیت، ناظم آباد اور ڈرگ روڈ پر یہ کونسا فن تعمیر نظر آ رہا ہے؟ ہم کوئی ڈیڑھ دو ہزار میل کے سفر سے آ رہے ہیں۔ ہم نے پچاس صدیوں کا فن تعمیر دیکھا ہے لیکن یہ بات کہیں دیکھنے میں نہیں آئی۔ آٹھ دس بانس لئے، کچھ زمین میں گاڑ کچھ رسیوں سے باندھے —— چار چھ چٹائیاں اور بوریاں وغیرہ لیں اور مکان بن گیا —— یہ ان لوگوں کا فن تعمیر ہے، جو ہر ہفتے گھر گھرا پار کر کے آتے رہتے ہیں اور جنہیں اصطلاح عام میں "پناہ گیر" اور "پناہی" کہا جاتا ہے۔ ان "عمارتوں" کے عقب میں کراچی کی لوہے اور اینٹ کی اونچی اونچی عمارتیں تیزی سے ابھر رہی ہیں۔ یہاں کبوتر خانوں کی طرح کے فلیٹ بھی ہیں اور کھلے کھلے ایوانوں والے بنگلے بھی .... لیکن ان سب نئی نویلی عمارتوں اور ان کے جدید ترین فن تعمیر کے باوجود مجھے کراچی کوڑے لٹے کے کپڑوں کی طرح محسوس ہوتا ہے —— یہ میری ذاتی رائے ہے ؛

یاد آیا ہے :—————— بقیہ صفحہ ۴۴

اور گور میں پاؤں لٹکے ہیں ..... "بڑا المبری نکلا"

اور سرائے سے باہر پہنچ کر یہ آوازیں ایک مبہم شور سا سنائی دینے لگیں اور میاں ... یہ چند قدم ہی گئے تایا نے کہا "اے واہ مری جان ! لاحول ولا قوۃ ! اور میرا تہمد اور جوتیاں تو اندر رہ گئیں۔ اے واہ مری جان !"

اور میں نے تایا کے برجس کاٹ پائجامہ میں منڈھی ٹانگوں کی جانب دیکھتے ہوئے بیاختہ کہا "یعنی تہمد ! تہمد آپ باندھے ہوئے نہ تھے !" اور تایا نے اپنی کمر کے گرد ہاتھ پھیرتے ہوئے اتنی ہی سادگی سے جواب دیا "اے واہ مری جان کہاں ! وہ پٹکا کھول کر ذرا نماز کے لئے بچھایا ہی تھا کہ یہ شیطان طوفان بیچ میں آ پڑا ، اے واہ مری جان۔ نماز تو نماز وضو بھی پورا نہ ہو پایا" اور نیم داڑھی میں خلال کر کے سلسلہ کلام جاری رکھا۔ "اے واہ مری جان، مقدر کی بات ہے! وقت بھی تنگ ہو گیا اے واہ مری جان !!"

لو سنگھ بابو کچھ یار کر بولے "تایا جان یہ آپ کی جان ہماری جان لے کر ٹلے گی کسی دن، ہم سمجھتے ہیں !"

تایا نے سنگھ بابو کی جانب گھور کر دیکھا اور شکایتی لہجہ میں کہا۔ "اے واہ مری جان ! نئے آپ بھی بلند شہر کی بھٹیارنوں کی سی باتیں کرتے ہو ! اے واہ مری جان ! اتنی سی بات تھی جسے افسانہ کر دیا !"

ڈراما:

دادی امّاں

اشرف صبوحی

بیگم: اے امانی خانم! تو میں انتظار کر رہی ہوں اور تم یہاں بیٹھی نردہ کھا رہی ہو۔ پیر جی کے ہاں ہو آئیں؟

امانی خانم: نماز پڑھتے ہی چلی گئی تھی۔ تم جانو چھوٹے میاں کے دشمن پڑے ہوں اور اتنا بندی کا چین آئے! نردے کی طلب کے مارے لق لق کرنے لگی۔ اب پان کا ٹکڑا منہ میں ڈالا ہے تو اوسان درست ہوئے ہیں۔

بیگم: ان سے سب حال تو کہہ دیا نا؟

امانی خانم: تو کیا بیگم صاحب اُن کا منہ دیکھنے گئی تھی۔

بیگم: پھر انہوں نے کچھ دیا؟ کیا بتایا؟

امانی خانم: تعویذ بھی دیا ہے۔ جلانے کو فلیتے بھی دیئے اور کہہ دیا ہے کہ روز رات بیان لکھوا کرلے جایا کرو۔ اللہ میاں سب بلا ٹال دیں گے۔

بیگم: دیر بڑی لگائی میں تو کب سے جانے کو تیار بیٹھی ہوں۔

امانی خانم: بڑی بیگم میرے تو تلوؤں کو لگی ہوئی تھی۔ میں کیوں دیر لگاتی۔ مگر وہاں مجھ سے پہلے کی اتنی عورتیں آئی ہوئی تھیں کہ بڑی مشکل سے میری باری آئی ہے۔ بڑی بیگم، پیر جی تو بڑے پہنچے ہوئے ہیں۔ کوئی کہہ رہی تھی کہ میرے میاں لڑائی پر گئے ہوئے ہیں ایسا تعویذ دو جو انہیں گولی نہ لگے۔ کسی کا بیٹا شفا خانے میں تھا۔ ڈاکٹر اسکا پیٹ چیرنے کو کہتے تھے۔ پیر جی نے کہا، خبردار پیٹ نہ کٹوانا۔ ہمارا دم کیا ہوا پانی آٹھ دن پلاؤ، اچھا ہو جائے گا، ایک عورت کی نواسی کو مرض ہو گیا تھا......

بیگم: چھائیں پھوئیں۔ ارے بی تمہاری اتنی عمر ہونے کو آئی اور پھر گھر میں بتاؤ سے کا نام لیتی ہو۔

امانی خانم: توبہ توبہ بیگم صاحب مجھ نگوڑی کے اوسان کہاں درست ہیں۔ منہ سے نکل گیا۔

بیگم: اچھا پھر پیر جی کیا بولے؟

امانی خانم: کہنے لگے ڈاکٹر حکیم کی دوا نہ کرنا۔ یہ ایک طرح کی ڈائن ہے اسکا علاج جھاڑ پھونک کے سوا دوسرا نہیں۔ میں تعویذ دونگا اسے بدن سے چھوا کر آگ میں ڈال دو اور بس۔

بیگم: ہاں بوا سنا تو میں نے بھی بڑوں سے یہی ہے۔ اچھا اب ستو سے ڈولی لانے کو کہہ دو۔ دن زیادہ چڑھ جائے گا، تو ڈولی تندور ہو جائے گی۔ مگر جانا بھی تو پاس نہیں مجھ بڑھیا کو جانا ہے۔ چلتے چلتے آندھو آجاتی ہے۔

(بڑی بیگم ایک اچھے کھاتے پیتے گھرانے کی اگلے وقتوں والی عورت تھیں۔ ان کے کئی بیٹوں میں سے ایک کی شادی موری دروازے ہوئی تھی۔ اور وہ اپنی سسرال ہی میں رہتا تھا۔ اس کے چار بچے تھے۔ بڑے کی عمر کوئی اٹھارہ برس کی ہوگی۔ خدا جانے لو تھی یا تخمہ ہوا۔ دوپہر کو اچھا گھر آیا۔ آتے ہی قے کی اور ایسا بے سدھ ہو کر پڑا کہ بیسیوں حکیم ڈاکٹر تھک گئے۔ اسے ہوش نہ آیا۔ آج تیسرے دن خدا خدا کر کے اس نے ذرا آنکھ کھولی تو گھر والوں نے بھی اطمینان کا سانس لیا اور سب سے پہلے دادی اماں کو پوتے کی بیماری کی اطلاع کی۔ چنانچہ دادی اماں نے اپنے اعتقاد کے بموجب پہلے تو پیر جی سے تعویذ گنڈے منگائے اور اب پوتے کی خیر سلا کو جا رہی ہیں)

بیگم: اے امانی خانم دیکھو تو ستو کہاں جا کر مر گیا۔ اتنی دیر ہو گئی اور

ڈولی نہیں لایا۔

امانی خانم: بڑی بیگم ڈولی تو کب کی آگئی ہے۔ شبراتن نے آپ سے نہیں کہا۔

بیگم: وہ موئی نڈا مونڈی تو اب اس گھر میں رہنے کے قابل نہیں رہی نہ جانے اس کے دل میں کیا ہے۔ بھلا مجھے خبر ہوتی اور میں سوار نہ ہو جاتی۔ ذرا جو آؤں تو شفتل کو کھٹے کھڑے نکالتی ہوں۔ لو ذرا پردہ تو دیکھ آؤ۔ پھٹا پرانا تو نہیں۔ پھٹا ہوا ہو، تو چادر بندھوا دو۔ اور تاکید کر دینا کہ سنبھال کر آہستہ آہستہ لے جائیں۔ کوئی تراتی تو نہیں ہے۔ مجھ میں اتنا دم کہاں کہ وہ جانور کی طرح بلائیں اور میں ہچکولے کھاتی رہوں۔

امانی خانم: کلو کیا نہیں جانتا وہ پہلے ہی دیکھ کر لایا ہوگا دوسرے ویسے ہی اُمس پڑ رہی ہے چادر بندھنے سے بالکل گھٹس ہو جائیگی۔

بیگم: اب گھٹس ہو یا کچھ ہو۔ بازار میں ننگی تو جانے سے رہی۔ تم دیکھ لو پردہ وردہ ٹھیک ہے نا۔

امانی خانم: بیگم صاحب! آپ وہم نہ کریں۔ چیلوں کے کوچے کی ساری ڈولیاں اچھی ہیں۔

بیگم: مگر تم ہمیں سے بھیگی بلی بتلائے جاؤ گی۔ نوج کوئی ایسا بھی کام چوپٹ ہو جائے۔ اچھا سوزنی اٹھاؤ — تعویذ فلیتے میری چاندی کی ڈبیہ میں رکھ کر ڈبیہ میری پن کٹی کے کنے کے اندر رکھ دینا۔

اب بڑی بی نے دوپٹہ اوڑھا۔ رومال ہاتھ میں لیا۔ اور جھکی جھکی ڈیوڑھی میں پہنچیں۔ امانی خانم سوزنی بچھا رہی تھیں۔

بیگم: (ڈولی کو غور سے دیکھ کر) اے امانی خانم۔ کلو یہ ٹوٹا ہوا ہنڈولا کہاں سے آیا یکھٹولی ہے تو بھلا لگا۔ چھتری کا ٹیڑھی پردہ تو ذرا کھولو۔ لاحول ولا قوۃ۔ کلو آج پاگل تو نہیں ہو گیا۔

امانی خانم: (کہاروں کے پاس جاکر) کلو بیگم صاحب کہتی ہیں یہ کون سے ذوغل کہاروں کی ڈولی لے آئے۔ اس میں بھلا وہ اتنی دور جائیں گی۔

کلو: چیلوں کے کوچے کے اڈے پر تو کوئی ڈولی تھی نہیں۔ چاندنی محل سے لایا ہوں۔ وہاں بھی ایک یہی تھی۔

بیگم: بھلا اس کے منہ کو۔ خیر اب مجھے یہاں دوپہر تو کرنی نہیں۔ چادر لاکر باندھو۔

چادر باندھی گئی۔ بڑی بی پوٹلا آگے رکھ کر بیٹھیں۔ کہاروں نے ڈولی اٹھائی۔ اور سواری چلی۔ چیلوں کے کوچے سے موری دروازہ آنت کی آنت راستہ۔ جانب کار کہا نہیں۔ بڑی بی کا ہچکولوں کے مارے برا حال ہو گیا۔ خدا خدا کر کے سمدھیانے کی ڈیوڑھی پر پہنچیں۔ اندر اطلاع ہوئی کہ چیلوں کے کوچے سے سواری آئی ہے۔ ماماؤں اصیلوں دوڑیں اتروایا۔ دادی اماں منہ ہی منہ میں کچھ پڑھتی، رومال سے آنکھیں پونچھتی جہاں پوتے کی چارپائی تھی پہلے سیدھی وہاں پہنچیں۔ سمدھن پاس کھڑی ہیں۔ بہو انتظار میں کہ مجھے گلے لگائیں گی پوتیاں آگے بڑھ بڑھ کر سلام کر رہی ہیں لیکن وہ کسی طرف نہیں دیکھتیں بیمار کی طرف نظر جمی ہوئی ہے۔

دادی اماں: (بیمار کے منہ پر پھونک کر کے سمدھن سے) بہن کیا ہوا تھا۔ دو دن کے بعد مجھے خبر کی۔ مجھ کو کچھ سمجھا ہی نہیں۔ میرے بچے کا یہ حال کر دیا۔

سمدھن: بہن یہاں ہوش کس کو تھا۔ ایکا ایکی قے ہوئی اور قے کے بعد دشمن بے ہوش ہو گئے۔ سارا گھر ڈاکٹروں اور حکیموں کے لانے میں لگا رہا۔ اتنی فرصت نہ تھی کہ آپ کو خبر کراتی۔ رات کو جب ذرا آنکھ کھولی تو اوسان آئے اور رحمت کو آپ کے ہاں دوڑایا۔

(جس کمرے میں مریض کی چارپائی تھی وہ اتفاق سے ڈیوڑھی کے قریب تھا۔ اتنے میں بازار سے ایک شور کی آواز آئی۔ ماماؤں اور کہاروں میں جھگڑا ہونے لگا۔ وہ غل کہ کان پڑی آواز نہ سنائی دے۔ مریض نے جس کی ذرا آنکھ لگی تھی، آنکھیں کھول دیں)

دادی اماں: اے سمدھن ڈیوڑھی پر یہ دھمال کیسی مچ رہی ہے۔ بیمار کا بھی خیال نہیں (پوتے سے) کیوں میاں اب طبیعت کیسی ہے۔ بیٹا دیکھنا بڑھاپے میں دادی بندی کو داغ نہ دینا۔

سمدھن: کہاروں سے تکرار ہو رہی ہے۔ بیگم جو مانگتے ہیں دیدو۔ ان جوانمرگوں نے ساری ڈیوڑھی سر پر اٹھالی۔

بہو: (دادی اماں کے پاس آکر) اماں جان ڈولی والوں سے کیا کرایہ ٹھہرایا تھا؟

دادی اماں: (ناک بھوں چڑھاکر) دلہن ہوش کی باتیں کرو میں اور

کرایہ ٹھہراتی۔ میرا ایسا دیدہ دلیر نہیں کہ موئے گنواروں سے بات کروں نہ ہمارے ہاں کا یہ دستور ہے۔ ڈولی منگائی جہاں جانا ہوا چلے گئے۔ دینے والے جانیں اور کہار۔

دلہن اپنا سامنہ لے کر چلی گئیں اور کہار منہ مانگی مزدوری لے کر ٹلے۔ اب پھر دادی اماں پوتے کی طرف متوجہ ہوئیں:

"بیٹا آنکھ نہیں کھولتے۔ دیکھو یہ کون بیٹھا ہے۔ رات بھر تسبیح پڑھ پڑھ کر دعائیں مانگی ہیں"۔

پوتا :۔ (آنکھ کھول کر) آداب۔

دادی اماں :۔ جیتے رہو۔ سونے کے سہرے سے بیاہ ہو۔ چاند سی دلہن لاؤ۔

پوتا :۔ آپ کی دعا چاہیئے۔

دادی اماں :۔ دلہن سو بندی کا تو دیکھ دیکھ کر کلیجہ کانپا جاتا ہے۔ ہائے دو دن میں کیا حال ہو گیا۔ بدن میں خون کا نام نہیں۔ آواز ایسی نکل رہی ہے جیسے کنوئیں میں سے کوئی بولتا ہے۔ آنکھوں میں حلقے پڑ گئے ہیں بیٹی صدقہ بھی دیا۔ کوئی منت بھی مانی ہے؟ ابھی اچھا نہ سمجھ لینا۔ اللہ کرے اچھا ہو جب سمجھو کہ دشمن بچ گئے۔

بہو :۔ اماں جان سب ہی کچھ کیا۔ اور کیوں نہ کرتے سارے گھر کا چراغ ہے۔ اس کے سوا مجھے کس کی ممتا ہو سکتی ہے۔

دادی اماں : میرے تو جگر کا ٹکڑا ہے۔ میں بھی صدقے کے لئے بکرا لانے کو کہہ آئی ہوں۔ پیر جی کے پاس صبح ہی کو امانی خانم کو دوڑایا۔ انہوں نے تعویذ بھی دئے ہیں اور دھونی کے لئے فلیتے بھی۔ اللہ نے چاہا تو کوئی ڈر نہیں۔ تم اپنا دل میلا نہ کرو۔ دیکھو بیمار کے سامنے رویا نہیں کرتے۔

گو پھر بڑی بی خود بھی دو چار آنسو نکال کر بھرائی ہوئی آواز میں فرمانے لگیں "دلہن تمہارا کچھ دینا آگے آ گیا۔ خدا ہمیشہ ہمیش کو تمہارا کلیجہ ٹھنڈا رکھے۔ پوتے پوتی کھلانے نصیب ہوں۔ بیماری تو بڑی بری تھی۔ ابھی پچھلے جمعہ کا ذکر ہے ہمارے محلہ میں اے بھلا ہی سا نام ہے تم نے دیکھا ہو گا وہ جو کپڑا بیچنے آیا کرتی ہیں ان کا جوان جتنا کتنا بیٹا (مریض کی طرف اشارہ کر کے) اس کی جان سے دور ساتھ سات قرآن درمیان کھٹ پٹ ہو جائے۔ بس اسی بیماری میں دیکھتے دیکھتے ایک ہی دن کے اندر چٹ پٹ ہو گیا۔

سبحان اللہ! کس قدر بے تکلفی کے ساتھ ممتا کو بھڑکایا گیا۔

ایک اور تارا ٹوٹا

یہ شمارہ تقریباً طبع ہو چکا تھا کہ اُردو کے نامور صحافی اور مزاح نگار مولانا چراغ حسن حسرت کے سانحۂ ارتحال کی خبر موصول ہوئی۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ. مرحوم کہنہ مشق لکھنے والے اور نہایت شگفتہ ذوق کے مالک تھے۔ "لاہور کا جغرافیہ" ان کے شگفتہ طنز کا مثالی نمونہ ہے۔ اہلِ ذوق ان کے "حرف و حکایت" کی لطیف نشتریت کو مدتوں فراموش نہ کر سکیں گے۔

مرحوم کچھ عرصہ تک "ماہِ نو" کی ادارت میں بھی شریک رہے اور یہ رسالہ ان کی وقیع خدمات سے مستفید ہوا۔ ہم مرحوم کے پسماندگان سے اس سانحہ پر دلی ہمدردی محسوس کرتے ہیں۔ جو در اصل اردو زبان و ادب کے لئے بھی اتنا ہی عظیم ہے ؎

فروغِ شمع جواب ہے رہے گا صبحِ محشر تک
مگر محفل تو پروانوں سے خالی ہوتی جاتی ہے!

(ادارہ)

بیمار اچھا ہوتے ہوتے پھر سمجھ لے کہ آخری سانس ہیں۔ کیونکہ دادی اماں نے ثبوت بھی بہم پہنچا دیا کہ ان کے محلہ میں اسی بیماری سے ایک موت بھی واقع ہو چکی ہے۔

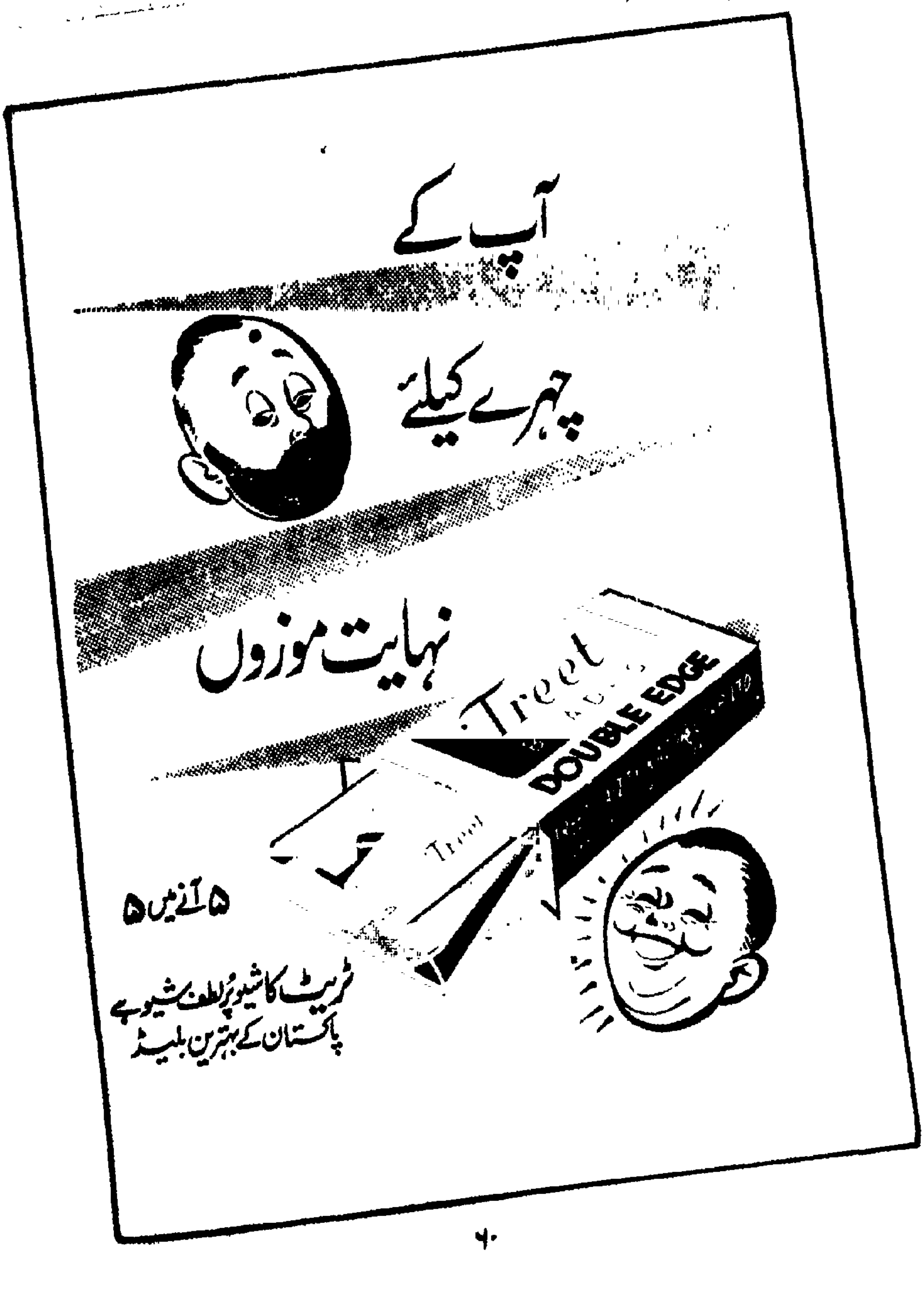
ان کو کھانے کی ایسی آ پڑی تھی، مرنا ہو یا جینا نمو ہو جاتی اسی لئے تھیں کہ خاطریں ہوں گی۔ اچھے اچھے کھانے کھانے میں آئیں گے۔ چنانچہ دادی اماں بیٹھی تو بیمار پوتے کے پاس تھیں مگر دل میں برابر یہ خیال آ رہے تھے کہ دیکھوں میرے لئے کیا کیا پکایا جاتا ہے۔ خدا کرے میرے من بھاتی چیزیں ہوں۔ بہو تو آخر انجان نہیں۔ کچھ دیر تو چپ بیٹھی رہیں کہ شاید کان میں کوئی آواز پڑے۔ جب دیکھا کہ کھانا پکانے والی ماماسے کسی نے کچھ نہیں کہا تو کب تک صبر کرتیں۔ مہمان آئی ہیں تو میزبانی کے فرائض کیوں نہ ادا کرائے جائیں۔ بہو کو ٹھوک کر کہنے لگیں۔ "دلہن! اے سنتی ہو۔ زیادہ تکلف نہ کرنا۔ میرا تو گھر ہے۔ ایک دن کا آنا تو نہیں، ہزار دفعہ آؤں گی۔ بچے کا جی اللہ رکھے اچھا ہو جائے پھر جو کھلاؤ گی کھاؤں گی۔ میں بھی پچھلے دنوں بیماری سے اٹھی ہوں۔ حکیم صاحب کی دوا آج بھی

(باقی صفحہ ۹۵ پر)

دادی اماں؛ ——— بقیہ صفحہ ۵۷

پی ہے۔ ثقیل کھانے منع کر رکھے ہیں۔ اب تو تم اس وقت تھوڑے سے میٹھے چاول پکا لو۔ بازار سے دودھ منگا لینا۔ آدھ سیر مجھ کو بہت ہے۔ اور میری چاند اگر ہو سکے تو تھوڑا سا سوجی کا حلوا بنانے کو کہہ دو۔ تھولی تو شاید گھر میں نہ ہو۔ مگر تاکید کر دینا کہ گھی ڈال کر ذرا اچھی طرح بھونیں۔ ملائی تو تمہارے محلہ میں ہوتی ہوگی۔ ملائی نہ ملے تو ربڑی سہی زیادہ نہ منگانا پاؤ سیر کافی ہے۔"

بیمار پوتے کے حلق میں کھیل کا دانہ اتر کر نہ گیا۔ سارے آدمی فاقے سے تھے۔ لیکن دادی اماں کی خاطریں اور فرمائشیں پوری ہونی ضروری تھیں اور ہوئیں۔ دادی اماں ہی جو ٹھہریں۔ بیٹے کے گھر پوتے کی بیمار پرسی کو آئی ہیں یا ہنسی ٹھٹھا ہے۔ پھر ادھر سے کبھی کوئی کسر اگر رہ جائے تو ناک کہاں رہے۔ گھر میں میت بھی پڑی ہو سمدھیانے والوں کو نہ پوچھنا اور ان کی خاطر تواضع نہ کرنا۔ ایسا سمجھو جیسے قیامت آگئی۔ آپ کھاؤ نہ کھاؤ انہیں کھلاؤ۔ ہزار کام چھوڑو اور ان کا آگا تاگا دیکھتے رہو۔ ان کا بگڑنا خدا کا بگڑنا ہے ✽


آپ کے
چہرے کیلئے
نہایت موزوں
Treet
DOUBLE EDGE
۵ آنے میں ۵
ٹریٹ کا شیو پُرلطف شیو ہے
پاکستان کے بہترین بلیڈ


"میں جانتی ہوں
لکس ٹائلیٹ صابن آپکی جلد
زیادہ دلکش بنائے گا"
— سمترا
سمترا کہتی ہیں۔ اس
خالص و سفید صابن کی دلفریب
خوشبو میری جلد میں بس جاتی ہے
آپ بھی اپنی جلد نہایت ملائم
اور خوبصورت بنانے کیلئے لکس
ٹائلیٹ صابن استعمال کیجیئے
لکس
ٹائلیٹ صابن
فلمی ستاروں کا
LUX
TOILET SOAP


اپنے سرمایہ سے
۲ گنا
دوہرا فائدہ اٹھائیے
اپنے مستقبل کی طرف سے اطمینان
اور اپنے ملک کی خوشحالی کا سامان
سرکاری تمسکات میں روپیہ
لگائیے جن سے آپ کو بھی زیادہ منافع حاصل
ہوتا ہے اور آپ کے ملک کی ترقی میں بھی مدد ملتی ہے آپ
اپنی بچت حسب ذیل تین (۳) مدات میں لگا سکتے ہیں
پوسٹل لائف انشورنس
پاکستان سیونگس سرٹیفکیٹ
پوسٹ آفس سیونگس بینک
روپیہ بچائیے اور منافع سے لگائیے
اپنے قریبی پوسٹ آفس سے پوری تفصیلات حاصل کیجئے

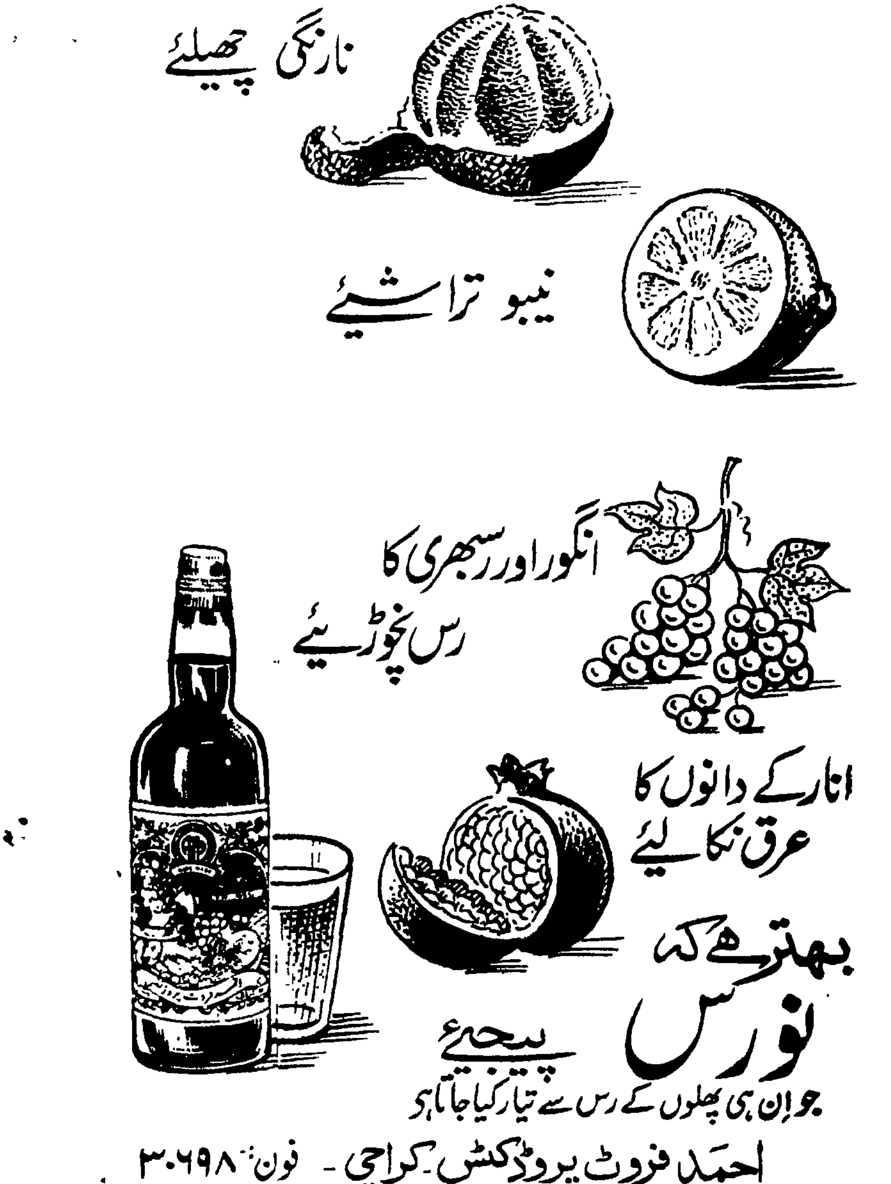

پنجاب کونسل میں دل روز کا ذکر
"پنجاب کونسل کے گذشتہ اجلاس میں آنریبل ملک سر فیروز خان صاحب نون وزیر لوکل سلف گورنمنٹ پنجاب نے
جب طب قدیم و طب جدید پر اظہار خیالات کر رہے تھے تو آپ نے ایک دلچسپ واقعہ یوں بیان کیا
کہ مسٹر بیرے سیکرٹری گورنمنٹ پنجاب کے ہاتھ پر بد قسمتی سے ایک پھوڑا پیدا ہو گیا جس کا
علاج بڑے بڑے ڈاکٹر بھی نہ کر سکے۔ مگر انارکلی لاہور کے یونانی طبیب حکیم طاہر الدین صاحب کی دوا دل روز
کے چند روزہ استعمال سے آپ کو کامل صحت ہو گئی۔ مسٹر بیرے کو آنریبل خان بہادر سر شہاب الدین صدر پنجاب کونسل
نے حکیم طاہر الدین صاحب سے علاج کرانے کا مشورہ دیا تھا۔ بہرکیف اس تاریخی واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ دل روز اپنی تاثیر
میں ایک بے نظیر چیز ہے۔"
(۸۔ فروری ۱۹۳۰ء کے خادم سے)
تمام لاعلاج اور پرانی جلدی بیماریوں ہر قسم کے پھوڑے پھنسی لاہوری پھوڑے بغلائی پھوڑے ناسور بھگندر۔ بال توڑ
داد چنبل۔ خارش۔ گنج خنازیر۔ کھپرالی۔ گلٹی۔ رسولی۔ ناسورہ۔ چنڈی۔ مسہ۔ مہاسہ۔ درد۔ جلن۔ سوجن۔ چوٹ۔ نئے اور
پرانے زخم اور زہریلے جانوروں کے کاٹے اور ڈسے کا بے نظیر اور تیر بہدف علاج ہے۔ قیمت فی شیشی
ہر جگہ بکتی ہے
دل روز رجسٹرڈ
حکیم طاہر الدین اینڈ سنز



ادارہ مطبوعات پاکستان پوسٹ بکس نمبر ۱۸۳ - کراچی نے شائع کیا - مطبوعہ ناظر پرنٹنگ پریس - میکلوڈ روڈ - کراچی
مدیر: رفیق خاور


CAP/GX/9
بہتر ہے
کیپسٹن خریدیئے!
ان کا قوام بہتر ہوتا ہے
MEDIUM
CAPSTAN
Navy Cut
PAKISTAN TOBACCO CO. LTD.
SUCCESSORS TO W. D. & H. O. WILLS BRISTOL & LONDON.
CIGARETTES MADE IN PAKISTAN


آپ کو ہر روز گندگی کے جراثیم سے بیماری کا خطرہ رہتا ہے
لائف بوائے سے ان جراثیم کو اپنے جسم سے دھو کر ہر روز اپنی حفاظت کیجئے
لائف بوائے کا محافظ جھاگ آپکی تندرستی کی حفاظت کرتا ہے
لائف بوائے صابن
ہر روز کی گندگی کے جراثیم سے آپ کی حفاظت کرتا ہے
LIFEBUOY


نارنگی چھیلئے
نیبو تراشیئے
انگور اور رسبھری کا
رس نچوڑیئے
انار کے دانوں کا
عرق نکالیئے
بہتر ہے کہ
نورس
پیجیے
جو اِن ہی پھلوں کے رس سے تیار کیا جاتا ہے
احمد فروٹ پروڈکٹس - کراچی - فون: ۳۰۶۹۸

جلد ۵ شمارہ ۵ — اگست ۱۹۵۵ء

ماہِ نو

استقلال نمبر

مدیر : رفیق خاور
نائب مدیر : ظفر قریشی

چندہ سالانہ: پانچ روپے آٹھ آنے (پاکستان میں) سات روپے (ہندوستان میں) فی کاپی سوا روپیہ (پاکستان میں) ڈیڑھ روپیہ (ہندوستان میں)

REVISED PRICE

آپس کی باتیں

"ماہِ نو" کی روایات میں سے ایک روایت یہ بھی رہی ہے کہ اس کا ہر سالنامہ گزشتہ سالناموں سے بازی لیتا ہوا نکلا۔ ہم نے اس بار بھی اس التزام کو قائم رکھنے کی کوشش کی ہے۔ ہمارا سالنامہ یوم استقلال سے منسوب ہوتا ہے جو ہماری قوم کے دورِ رواں کا سب سے یادگار دن ہونے کی بنا پر اس ادبی ضیافت کے لیے بھی سب سے موزوں تقریب ہے۔ ماہِ نو پاکستان کے ادب و ثقافت کے ساتھ ساتھ، عمومی تہذیب و ترقی کا بھی کسی نہ کسی حد تک آئینہ دار رہا ہے۔ اس طرح اس نے ادب کو قومی زندگی سے قریب تر رکھنے کی بہت اچھی مثال قائم کی ہے۔ اس کے صفحات میں آپ رفتارِ ادب اور ذہنی ترقی کے ساتھ ساتھ بعض خوشگوار مادی تبدیلیوں کا عکس بھی دیکھ سکتے ہیں۔ اس نے ادیبوں کے ذہنی کارناموں کو بھی اپنے دامن میں سمیٹنے کی کوشش کی اور دوسرے گوناگوں مشاغل کو بھی حسب توفیق نظر انداز نہیں کیا۔ اس نے روشن کارناموں، بدیہی ترقیوں، حوصلہ افزا منصوبوں اور ابھرتی ہوئی تعمیروں کے ساتھ ساتھ قوم کے دشوار مسائل کو بھی زیرِ غور لانے کی کوشش کی، قومی مسرتوں اور قومی آلام کو کھلے دل سے منایا اور اپنی بساط کے مطابق ملک کے ذی فکر طبقے کے لئے جد و جہد کی رفتار کا ایک جامع اور متوازن مرقع بننے کی کوشش کی۔ یہی ہمارے مقاصد ہیں۔ چونکہ ذہنی افزائش ویسے بھی معاشرتی ترقی پر سبقت رکھتی ہے، لہٰذا آپ ماہِ نو کو جو پاکستان کا ادبی و ثقافتی مجلہ ہے، قوم کی عمومی ترقی کا آئینہ خیال کر سکتے ہیں۔ اس آئینے میں جو ذہنی اور مادی مرقعے آپ کو نظر آئیں گے، ہمارے احساسِ تشنگی کے باوجود، یقین ہے کہ حوصلہ شکن نہ ہوں گے۔

اس شمارے میں قوم کی ہمہ جہتی رفتارِ ترقی کا ایک مختصر جائزہ بھی شامل ہے۔ ہمیں اعتراف ہے کہ یہ چند صفحات اس بیان کے لئے بہت ہی ناکافی رہے اور بہت سی اہم توسیعات و اصلاحات کا نام بھی نہ لیا جا سکا، جو بہرحال اپنے اپنے دائرے میں بڑی اہم تھیں۔ اس کمی کو ہمارے ادارے کی بعض دوسری مطبوعات بڑی حد تک پورا کرتی ہیں۔ تاہم امید ہے کہ ناظرین ماہِ نو پاکستان کے آٹھویں سال کے اختتام پر اس مضمون کو دلچسپ اور مفید پائیں گے۔

ذہنی و قلبی احساسات کا عکس اس شمارے کی طویل اور مختصر نظموں میں دیکھئے جو بعض بڑے گہرے اور سچے تاثرات کی حامل ہیں۔ صنفِ ادب ہونے کی حیثیت سے ماہِ نو صداقت اور وسعتِ نظر کا قائل ہے۔ خام جذبات یا ناواجب باتوں کو سراہنا ہمارا مقصد نہیں، نہ یہ باتیں دیدہ وروں سے داد لے سکتی ہیں۔ یقیناً ہمارے شاعروں کے جذبات میں کہیں کچھ تلخی اور درد کی کسک بھی موجود ہے لیکن یومِ آزادی پر ان کی یہ بھرپور آمد بدیہی خلوصِ کلام اور یقین و خود اعتمادی کی پھوٹتی ہوئی کرنیں آنکھوں کو روشن کرنے کے لئے کافی ہیں۔ اسی قومی دردمندی اور احساسِ مقاصد کو ہم اپنا حاصلِ ترقی اور خلاصۂ کائنات سمجھتے ہیں۔

پاکستانی ثقافت کے سلسلے میں "صہبائے پاک" کے زیرِ عنوان ایک بوقلموں انتخابِ کلام پیش کیا جا رہا ہے جس میں مغربی پاکستان کے مختلف کلاسیکی افسانوں کے منظوم اقتباسات شامل ہیں۔ اہلِ نظر سے یہ بات چھپی نہ رہے گی کہ قدیم تمدنی اور جغرافیائی وحدت ہونے کی بنا پر مغربی پاکستان کی مقامی زبانوں کے ادب کی روح اور لہجہ کس قدر مماثل ہیں۔ اب جبکہ اس محکم و مسلم وحدت کے درمیان سے عارضی علاقائی بندشیں اٹھائی جا رہی ہیں، اور مغربی پاکستان ایک دائمی و لازمی وحدت ہونے کے ساتھ، آئینی وحدت بھی تسلیم کیا جا رہا ہے، علاقائی ادب کا یہ گلدستہ امید ہے پسند کیا جائیگا۔

ادبی مضامین میں، ڈاکٹر سید عبد اللہ کا مقالہ "غالب بشیرِ اقبالؒ" سرفہرست ہے جس میں انہوں نے ان دونوں کے روحانی رابطے کو خوب واضح کیا ہے۔ ان میں سے ایک کے دم کیساتھ فارسی شاعری کا ایک دفتر ختم اور دوسرے کی ذات سے ایک نیا فلک آغاز ہوتا ہے۔ یہ موضوع بہت ضروری تھا۔ اور یہ مضمون قدر کے قابل ہے۔

کسی مصنف کا مرنے کے بعد غلو آمیز خراجِ تحسین پانا تعجب کی بات نہیں، خصوصاً جبکہ مرنے والا منٹو جیسا مقبول اور غلغلہ انداز مصنف ہو۔ رفتہ رفتہ [illegible] ایک اور مضمون میں منٹو کا صحیح مقام بتانے کی کوشش کی ہے۔ ان کے مضمون سے بہت لوگوں کو اختلاف ہوگا اور ہمیں بھی ہے۔ ہمارا کہنا ہے کہ، ع عیب جملہ بگفتی ہنرش نیز بگو، ہمیں مضمون کا یہ پہلو تشنہ نظر آیا۔ تاہم اہلِ نقد کے لئے اختلاف کا ہر نقطۂ نظر دلچسپ ہوگا جسے انہوں نے بڑی کاوش سے ایک تجزیے کے طور پر مرتب کیا ہے ٭

غنائیہ

سرودِ باقی

رفیق خاور

"قلقلوں سے جس کے لذت گیر آہنگِ گوش ہے
وہ جرس کیا اب ہمیشہ کے لئے خاموش ہے؟"

ایک آواز:-

"سرودِ رفتہ" میں اک دلبری تھی — نوائے داستاں میں ساحری تھی
وہ کیف اسکے بہاریں قلقلوں میں — کہ جذبے رقص پیرا ہوں لہوں میں
سرودِ رفتہ میں شانِ جلالی — سرودِ رفتہ آہنگِ مثالی
سرودِ رفتہ میں اک گونج گرج تھی — ترنم میں حیات افروز بھی تھی
سرودِ رفتہ آہنگِ حجز تھا — پیامِ جاوداں سوز و تپش کا
نہاں نغموں میں شانِ کبریائی — مسیحائی کا کیفِ دلربائی
سرودِ رفتہ تھا نیرنگ نیرنگ — سرودِ رفتہ تھا طوفان آہنگ
صدا اس کی صدائے قم باذنی — تکلم میں ادائے روح الامیں کی
جہانِ نو جہاں اعجاز اس میں — فضائے قدس کا انداز اس میں
سرودِ اولیں کُن و بیاں کا — سرودِ جاوداں سیارگاں کا
قیامت آفریں صورِ سرافیل — تلاطم کی جلال آمیز تمثیل
سرودِ رفتہ کیا آہنگِ داؤد تھا — دمادم کون کا رمز آشنا تھا

سرودِ رفتہ اک مدت سے مستور
جہانِ آب و گِل سے اس قدر دور
کہاں آواز اسکی پائیں گے ہم — دل و جاں سونے کو ترسائیں گے ہم
سرودِ رفتہ پھر بھی آئے گا کیا؟
جہانِ زیست پہ چھا جائے گا کیا؟

دوسری آواز:-

یہ گرد و پیش آہنگِ مسلسل — ہے یکسانی سے جس کی سامعہ شل
خدا جانے یہ کیسا غلغلہ ہے
ملا [illegible] ہوش، جس کا غلغلہ ۔۔

کسی کل کے مہیب و ہول پرور — ہلاکت خیز دندانوں کا منظر
تواتر ان کی صوتِ جانگزا کا — کہ پہیوں کے خشن کلّوں[1] کا غوغا
یہی ڈر ہے کہ یہ ہوں آفریں شور — مثالِ موجِ دریا تند و پرزور
نہ کرلے جذب پہنائے جہاں کو — طبق ہائے زمین و آسماں کو
سرودِ رفتہ بھی اس میں نہ بہہ جائے — فنا کے دام میں پھنس کر نہ رہ جائے
یہ شورِ بیکراں، نغمے لگاتار — فضا ان کی صداؤں سے دُھواں دھار
قطاریں جیسے بہتی جوہروں کی — بلائے ہیروشیما، ناگاساکی...

آمات:-

صبحِ ازل سے، شامِ ابد تک، اپنی اک رفتار
فرشِ زمیں سے بامِ فلک تک طوفانی یلغار
نقطے ہی نقطے جیسے رواں ہوں رنگے سب جاں دار
ایک قطار اور ایک آہنگ، اک لشکرِ بے زنہار!
اک یورش ہے، ایک لپک، اک حرکت سلسلہ دار

حلقہ بہ حلقہ اک زنجیر ہے جس میں تا ماہی
جیسے جاگتے جوہروں کا اک سلسلہ لامتناہی
ہم کو آن اور لمحے کہنا بینش کی کوتاہی
ہم باقی ہیں، لافانی ہیں، باقی ہر شے راہی
اپنی لہریں، سب جگ پھیلیں، سب پہ اپنی شاہی

اپنے من پہ نقش ابھاریں، اور پھر ان کو مٹائیں
بلبلے، لہریں سامنے لائیں، اور پھر آپ ہٹائیں

---

[1] گرفت

اپنے سینوں ہی سے اُبھریں یہ بدمست گھٹائیں
اپنے ہی شانوں پہ جوبن نے پھیلائی ہیں جٹائیں
ہم ہی بڑھائیں جس کو بڑھائیں، ہم ہی سب کو گھٹائیں

رنگ و بو کے یہ سب دھارے، اپنی اسی کے دھارے
بہتے ہوں یا چاند اور سورج اپنی لگن کے تارے
اپنی ہے یہ پھیلی دھرتی، قدرت کے نظّارے
اپنے ہی دامن، کل دھرتی کے لہراتے گہوارے
اپنی برقِ نفس کے آگے کون ہے جو دم مارے!

مٹ جائے گا اپنی اگن سے چھوٹا بڑا ہر کوئی
داناؤں کی مایا بھی اپنے سیلاب میں کھوئی
بڑے بڑوں کی قسمت اپنے قبرستان میں سوئی
کس کی آنکھ ہے جو نہیں آخر اپنے بھنور میں روئی
ہر ہر قبر کی تختی اپنے طوفانوں نے دھوئی....

دوسری آواز:۔

سنی یہ بادۂ ہستی فاخراد یہ گفتارِ کرخت و قاہرانہ؟
گرفتِ آفات کی ہو گرچہ ہمہ گیر قوی ہے پنجۂ گیرائے تقدیر
تو پھر انساں کیا اس کی بساط کیا
سرِ دورِ فتنہ ماموانِ فنا کیا
اجل کا تیرا تیرِ بے خطا ہے
تب و تابِ دوام اک سیلہ ہے
یہ کیا، تیرے لبوں پر مسکراہٹ
اُدھر، اس سمت طوفانِ ضیا دیکھ۔

پہلی آواز:۔

جلوہ بہ جلوہ شعشعے
مہر بہ مہر ضو فشاں
قمقمہ ہائے بے کراں
دستہ بہ دستہ موجِ نور
سلسلے طور طور طور!

جلوۂ روئے قدسیاں
تابشِ بالِ نوریاں
عکسِ جمالِ حوریاں
جیسے طلسمِ سیمیا!

دوش بہ دوشِ موجِ نور
سیل بہ سیل زمزمے
ساز بہ ساز ہمہمے
کوہ بہ کوہ غلغلے
نغمگیٔ بہشتِ گوش
تا بہ فرازِ کبریا
غلغلے دور دور دور!

آسماں شق گشت و حورے پاک زاد

یہ پیکر نیا کس نئے آب و گل سے اُٹھا ہے!
نیا معجزہ کن عناصر سے مل کر بنا ہے!
نیا شعبدہ کس انوکھی اگن میں ڈھلا ہے!

ہوا کس تجلی کدے سے یہ حسن آشکارا؟
طلسمی جواہر کو قدرت کے کس نے اُبھارا؟
یہ کس نے جِلا دے کے اس مورتی کو سنوارا؟

یہ ہے کون جادو بھری نازنیں حور پیکر؟
یہ ہے کون شانِ تجلی میں زہرہ سے برتر؟
یہ ہے کون جس کی اداؤں میں اندازِ محشر؟

یہ وہ حور ہے جو محبت کی لو میں ڈھلی ہے
یہ وہ ساحرہ ہے جو اعجازِ نو سے بنی ہے
پلی ہو جو آغوشِ جاں میں، وہ نازک پری ہے

تب و تاب میں مہر وش اس کا روئے درخشاں

بلندی میں کیواں ہے اس کا ہلالِ فسروزاں
چمک میں ہے روشن تر از قطب سیمائے تاباں

محبت میں اس کی دل و جان سب کچھ لٹا دیں
اشارے پہ سرمست آنکھوں کے دنیا ہلا دیں
بصد شوق خونِ حیات اس کی رہ میں بہا دیں

کہ جب اس کی تابش سے روشن فضائے جہاں ہو
زمیں اس کے جلووں سے غیرت دہ آسماں ہو
تو اپنی محبت کی سنو اس کے رخ سے عیاں ہو

صدائے غیب :۔

اک نئی زیست کا در باز ہوا
نئے خورشید کا سامانِ سفر
پھر محبت نے لیا تازہ جنم
تازہ طغیانِ جنوں ، تازہ نوا
ذوقِ بے تاب ازل نغمہ سرا!
"نیا راگ ہے ساز بدلے گئے
زمانے کے انداز بدلے گئے"۔

سالِ آغاز :۔

اوّلیں نغمۂ بہار ہوں میں   حسن کی شانِ آشکار ہوں میں
نت نئی ہے، نئی ترنگیں ہیں   تلملاتی ہوئی ترنگیں ہیں
نونہالوں کا سبز گوں پرچم   نور کی دھار جیسے ساتھ ہو شبنم
ابھی کلیوں نے آنکھ کھولی ہے   روشنی جسم میں سمو لی ہے
تازہ تازہ پھوار پھولوں پر   پیارا پیارا نکھار پھولوں پر
نت نئی کونپلیں ابھرتی ہیں   دمبدم اور بھی سنورتی ہیں
ڈالیاں ہمکنار ہوتی ہیں   ساقیوں پر نثار ہوتی ہیں
سینۂ ارض سے ابھرتا ہوا   یہ سہانا، نیا نیا نقشہ۔
تازہ کردار ہائے نورانی   کتنی روشن ہے ان کی پیشانی!
یوں چمکتا ہے چہرۂ سیمیں   جیسے براق جامِ بلوریں۔

اوپر سب دنیا سے بالا
بوڑھا عظیم الشان ہمالہ
نیچے لئے اک رس کا پیالہ
جادو بھرا، شیریں بنگالہ
خیبر کی صف بستہ چٹانیں —
سرحد کا طوفانی لشکر،
سندھ کی وادی، ہندوستاں میں
پہلی مسلمانوں کی بستی،
دخترِ عرب کی آئینہ دار،
اور پنجاب وہ دیس سہانا
وہ رومانوں کا گہوارہ!

صدائے غیب :۔

یہ بستی، یہ سوادِ اعظم نور   جو شرق و غرب میں پھیلا ہوا ہو
نہاں ہیں خاک میں اسکی وہ جوہر   کچھ ایسی بجلیاں سینے میں مضمر
کرے گی اور بھی پیدا تب و تاب
حریف جلوۂ خورشید و مہتاب

آٹھواں زمزمہ ہوں زمزمۂ ہشت آہنگ
اَن گنت راگنیوں، راگوں کا سنجوگ ہوا
کتنی جولانیاں معروفِ تگ و تاز ہوئیں
پھر کہیں جا کے مکمل ہوا اعجاز مرا
میری ترکیب میں آمیز ہیں صد رنگ فنوں۔
وہ لپیٹ میں الاپ اور وہ درتے میں تھت
اک عجب طرح کی گمبھیرتا، سمپورن راگ
سُروں اور سرتیوں کا اک آخری، نادِ آہنگ
جیسے وہ ناچ رہے ہوں کوئی طوفانی ناچ
ایک پیراہنِ سیال، لچکتا سرگم
جس میں دو ڈرے ہوں سجل، نرم سنہری لیٹے
کہیں بل کھاتے ہوں سیماب نما تار پہ تار
سادہ پُرکار اداؤں کا دلآویز طلسم
مینڈھیں اور گمکیں، وہ کھرج اور گرج کی سنگت

کہیں ندیوں کی ہمہ رنگ، کہیں بجلی کا دھمال
آشوب زمزمہ ہوں، شعبدۂ صد نیرنگ

ندی (مشرقی پاکستان) :-

تصویرِ روانی ہوں میں
رستا ہوا پانی ہوں میں
میرا سیّال آئینہ
اس کے ہر ہر پارے میں
دھرتی کے نظارے جھلکیں
یہ دھانی دھانی پودے
یہ بان، یہ تاڑ کے جھرمٹ
وہ بور آموں پر آیا
وہ سیتا پھل گدرایا
جھوم اٹھے سنہری ریشے
گونج اٹھی سینی رات کی
ہر سمت وہ اک ہلچل سی
دھرتی نے چولا بدلا
جیون کی کایا پلٹی
گھنگھور گھٹائیں چھائیں
طوفانی برکھا لائیں
موجوں کی وحشی دوڑیں
جو اپنی سرمستی میں
گھر گھاٹ جو چاہیں روندیں
یہی ان کے من میں بسی ہے
ہم دوڑ میں کیسے جیتیں
موجوں کو اُمنگ جو آئی
وہ کیسے جوت جگائیں
بجلی کے روپ میں آئیں
گھر گھر ہے جانا میرا
ہر اک در ہے میرا رستہ
شمپان وہ بیڑا بیڑا
ہر جا سب ڈگمگ ڈولیں

وہ کشتیاں بڑی ڈُخانی
اُن کی ہر سو جولانی
وہ گھوڑوں کی مست روانی
وہ کہیں تُم شور جوانی
گیتوں کا جادو جاگا
نس نس میں امرس گھولا
کیا جانئے اک ساحر نے
ہے کیسا افسوں پھونکا
اس دیس کی شوبھا بدلی
یہ دیس رسیلا پیارا
اس ساحر کے جادو سے
اب جانے کیا ہو جائے!

سرحد :-

بہار راغلے
بہار راغلے
ڈال ڈال پات پات
پرند چہچہا اٹھے
چٹانیں سخت و آہنیں
ازل سے محوِ خواب تھیں
یکایک ایسے جاگ اٹھیں
کہ جیسے جاتے جاتے کوئی ساحرِ ہزار فن
غنودہ سنگلاخ بستیوں پہ سحر کر گیا
بلند و پست پر اُٹھا ہے حشر خیز غلغلہ
بہار راغلے
بہار راغلے
وہ زندگی کی ہاؤ ہو
جو کوہ اور دمن میں تھی
احاطۂ چمن میں تھی
وہ اب ہے زیبِ کاخ و کو

نہ مشرقی پاکستان میں کم سن لڑکے عموماً گھوڑوں پر تیر کر اسکول آتے جاتے ہیں۔

حیات آب و گل میں ہے
حیات سب کے دل میں ہے
بہار رہا نفلے
بہار رہا نفلے

کاریز (بلوچستان) :-

زمیں دوز رستوں پہ نظروں سے اوجھل مسلسل رواں ہوں، کہاں؟[1] دواں
گراں بردہ در پردہ ظلمات کے خولِ سنگیں میں ہے آب جیواں نہاں
طلسم آفریں ہے یہ تاریکیٔ بے کراں میں اندھا دھند مخفی روانی
ہو جس طرح پردے میں شب کے کسی لشکرِ بے محابا نے شب خون کی ٹھانی
چٹانوں چٹانوں رواں ہوں دواں ہوں کبھی آشکارا کبھی بے نشاں ہوں
مری آمد و شد ہے رستہ برستہ محبت کی مشاطہ جاوداں ہوں
ملاتی ہوں چپ چاپ دشتے ہی دشتے ادھر سے اُدھر ندیوں کو ملا کر
رگِ جانِ صحراؤں کو سیراب کرتی ہوں شیرِ مصفا کے جرعے پلا کر
ازل سے ابد تک یہی سلسلہ ہے، یہی رشتۂ باہمی دوستی کا
اُبھر کر کبھی دیکھ لیتی ہوں منظر محبت کی مشاق جادوگری کا
یہ ہے سحر کاری کا روشن کرشمہ کہ نادیدہ اعجازِ صنعت گری سے
کہ اس سنگ خارا کے ماحول میں بھی نئی دلبری ہے، نئی زندگی ہے
نئے شعلہ ہائے فروزاں کی تابش سے ہے کاف تا کاف آفاق روشن
تفِ برقِ خود ساختہ سے منور ہے مانندِ سینا پہاڑوں کا دامن

پنجاب :-

جینا ہے بیلوں میں
ہم بیلی کیا جانیں۔ کیا موج ہے میلوں میں
کھیتوں میں اُگے پودے
جب کوٹھیاں پُر ہو جائیں۔ تب دلوں کے ہوں سودے
آباد ہوئے سارے
جیون ہے، جوانی ہے۔ پھر کیوں نہ ملیں پیارے!
گلیں سیٹیاں دینے لگیں
کھیتوں میں کھیل چکے۔ اب آؤ شہر چلیں
رنگ ریزی کی دو کلیاں
دل اُجلے یاروں کے۔ اور سینوں کی گلیاں

آزاد ہیں دل اپنے
آ، اونچی فضاؤں میں۔ پر کھول کے اُڑ جائیں
ان اونچی فضاؤں کی
حد بست نہیں کوئی۔ پروا نہ ہو دور اپنی
آ اُڑن کھٹولوں میں
طیاروں کے اُڑ اُڑ کر۔ افلاک کو زیر کریں

جہازراں (کراچی) :-

لبِ ساحل اک شاہزادی ہے جس کی نگاہِ فسوں کار برق آفریں ہے
یہی ہے یہی جس کے سحرِ محبت سے موجِ نفس شعلۂ احمریں ہے
ادھر دو قطبین تک گرمِ جولاں جہاں یخ سے ہوں منجمد خوں کی لہریں
ادھر آتشیں منطقوں تک نگاہ پو جہاں ندیاں خشک ہو ہو کے ٹھہریں
یہ چپو ہمارے یہ بازو ہمارے، طنابیں ہوں اک دامِ گیتی ستاں کی
عناں گیرِ ہفت آب تہا رو جاریہ ہمارے جہازوں کا پیکِ حجازی
جو طوفاں چھائیں فضا پر تو کیا ہے، حدِ آخری تک سمندر کی جائیں
ہماری رسائی کراں تا کراں ہو جہاں شوق کی انتہائیں
سمندر کی بپھری ہوئی تند موجوں کے سینے پہ اپنا سفینہ رواں ہو
یونہی یہ تھپیڑوں پہ سنگیں تھپیڑے، یہ یونہی آہنیں کشمکش جاوداں ہو

سندھ :-

دشتر پاک لبوں پر آئی، اب کوئی سر نہ من کو بھائے
اور یہی دُھن اب من میں سمائی، اور لگن نہ کائی
اب ہے یہی چھچھی وائی، کسی سے من نہ لاگے
دل نے چین کی منزل پائی، کچھ نہیں اور سہائے
دور سے ساجن ملنے آئے، آنگن میں شگن پائی
گلے لگاؤں میں سودائی، دردی پریت کی ماری

آبشار (کشمیر) :-

ہمالہ کے برفانی آئینہ خانے جو ہیں شیش محلوں سے بڑھ کر فروزاں
جہاں خوش تراشیدہ الولہ سیمیں کے براق پیکر ہیں تنویر افشاں

---

[1] شاہ عبداللطیف بھٹائی نے سُر سوہنی، سُر ستی، سُر حسینی، سُر رائیل وغیرہ کے عنوان سے کئی نظمیں لکھی ہیں جو ہیں ایک خاص صنفِ وائی کے بیشمار نمونے ہیں۔ اس صنف میں قافیہ کہیں بھی واقع ہو سکتا ہے، جیسا کہ خط کشیدہ الفاظ سے ظاہر ہے۔

بشکریہ نیشنل میوزیم، نئی دہلی



انوارِ سہیلی کی ایک جھلک
(شہنشاہ اکبر کے زمانے کے ایک مصور نسخہ سے)

جھاگ: اَن گنت آئینے دیو قامت، جڑ کا چوندھ جنگی چمک سے نگاہیں
پریشان ہوں جیسے شبنم خانۂ آذری میں بتوں کی درخشاں شبیہیں،
فضاؤں میں جس کی پرستاں کا عالم، پسِ وہم ہر سو چھماچھم چھماچھم
ہیں نادیدہ شفاف پاؤں میں پازیب جیسے دمادم ہے جن سے چھماچھم
پرافشاں ہواؤں میں سرگشتہ طائر کے مانند مبہوت حیرانیاں ہیں
جہاں آفتابی شعاعوں کو بھی یکپاتی اجل کی پریشانیاں ہیں
یہی کوہساروں کے پاکیزہ آغوش میں میری سرشار دوشیزگی ہے
انہی ہاں انہی برف زاروں میں میرا سدا موج سرچشمۂ زندگی ہے
میں تختہ بہ تختہ تھرکتی تھرکتی، جھلکتی جھلکتی، دھمکتی دھمکتی
کبھی گودیوں کھیلتی وادیوں کی، کبھی لوٹتی سبز دشت گھاٹیوں پہ
کبھی گولیوں کی سی بوچھاڑ سہتی، کبھی پھٹتے سینے پگوڈوں کے پتھر[1]
مرا ملاح خنجر بکف، سینہ وا موت کا ناچ ہے وحشیانہ[2]
کہ میرا حوادث کے طوفان سے کشمکش کا ہے ہنگامہ فاتحانہ
بلندی سے مستانہ بھر کر بناتی ہوں پھیلی ہوئی جھاگ کے تو پارے
وہ شفاف فوارے گنبد نما، وہ سفید ابر پاروں کے مانند گھونگھے
جھلکتے ہوئے تیرتے بادلوں کے کنارے کنارے کبھی برقِ مضطر
دمِ رقص دوشیزۂ کاشمیری کا پیراہن اُجلا، چمکدار جھالر
وہ اک سیم تن اپنے چاندی سے پاؤں کو لٹکائے جیسے روپہلی لہر آئی
جنہیں اَن گنت مست لہروں کے ہونٹوں سے ہیں چومتی ہوئی صد کریٹ دیتی
وہ شاخِ صنوبر مری سمت کیسے نزاکت سے جھکتی ہوئی آ رہی ہے
کہ جیسے کوئی مستیٔ آسمانی بسیطا برزاروں میں لہرا رہی ہے
جو گھمڑا دکھاتی ہے وہ حور جیسا فضاؤں کی رنگیلی چنری اٹھا کر
تو رک جاتی ہوں یک بیک چلتے چلتے تنِ نرم و نازک سمٹتے میں رک کر
بہت سیدھی سادی ہے معصوم ہے یہ جو فردوسِ رنگیں زمیں میں پلی ہے
یہ پاکیزہ حورِ جناں ہے کہ پیکر کوئی اوس کی بوندیوں میں ڈھلا ہے
یہ اک جلوہ مہتابی ہے یا جھاگ میری ہی موجوں سے اچھلا ہوا ہے
یہ خود چاندنی بن کے نیلے پہاڑوں کی اونچائیوں میں بکھر آگیا ہے
کہ چمکیلے سینوں کا آئینہ ہیولیٰ ہے جو بن کے بُراق نور آگیا ہے
کھڑی ہے کچھ اس طرح جنت نما وادیٔ گل زمیں کے بہاروں پہ جلوہ ہیں

کہ ساری خدائی کا جوبن سمٹ کر کھڑا ہو سویرے یہ جس طرح پَو میں
وہ بادام، اخروٹ، سیبوں، زیتلوں[1] کے دکھاتے گل کے جنگل خیاباں
وہ اونچے شجر سبز شہتوتوں کے معدن سپیدار قدرت کے محلوں کے دربان[2]
وہ بیلیں، شکارے، وہ بھیڑوں کے گلے، وہ شالیں، وہ مٹھی تپش کانگڑی کی
ادھر شالامار اور نشاط اور ان میں وہ سرو و صنوبر کا نانا۔ اذیت رہی
ادھر بیسے اور اُدھر موجۂ خون بہشت اور رو و رخ سیم جلوہ ساماں
وہ جنت کا پس منظر قوسِ قزحی، خد و خال قدرت کے سب سے نمایاں
انہیں دیکھتی جاؤں مڑ مڑ کے ہر دم چٹانوں کے رخ سے پھسلتے پھسلتے
جھلکتے رہیں میری لہروں کے آئینہ پارہ پارہ میں جنت جو لیے ہے
کہ میں خود بھی بیٹی ہوں اس سرزمیں کی، یہیں ہوں ڈلی، یہیں گودوں میں پلی ہوں
اگرچہ ہر اک گام پر ڈگمگاتی، میں ہر لمحہ پردیس کو جا رہی ہوں
یہ اونچے پہاڑوں کے منڈل جہاں گونجتی گھاٹیاں ہیں، جہاں بجاتی ہیں صدائیں
جہاں گھاٹیوں گھاٹیوں گونجتی ہیں چٹانوں سے ٹکرا کے بہتی ہوائیں
وہاں گنگناتی ہوئی اپنے من بھاتے نغموں کو میں چھوڑتی جا رہی ہوں
ابد تک جوان کوہساروں میں گونجیں وہ جادو بھرے بول بکھرا رہی ہوں
کہ نغمے ہیں میرے محبت کے نغمے، ترانے محبت کے شیریں ترانے
کبھی بزم کی سحر زا داستانیں، کبھی رزم کے روح پرور فسانے

مجھے یاد آئیں گے خوابوں میں اکثر
اٹھائے تفنگ اپنے شانوں پہ راہی
اور ان سے زیادہ غزائے وطن میں
دل و جان فدا کرنے والے سپاہی!
غزائے وطن میں ..... دل و جان
..... فدا کرنے والے سپاہی!

پہلی آواز:۔

اُدھر اُس سمت
طوفانِ ضیا —
دیکھ!

---

۱ سیب سے ملتا جلتا چھوٹا سا پھل ۲ چیل کے درخت کے ایک لانبے لانبے تنوں کی طرف اشارہ ہے ۳ دور سے آنے والے کشمیری مسافر عموماً اپنے شانوں

۱ پہاڑوں پر پتھروں کا لڑھکنا ایک عام منظر ہے ۲ بعض وحشی قبائل میں تہمت زدہ عورت خنجر ہاتھ میں لے کر موت کا ناچ ناچتی ہے۔ اور بالآخر خنجر کو اپنے برہنہ سینے میں پیوست

رازداں

(ایک تصور)

عبدالحمید عدم

فضا پیما پرندوں ہی کو ہے معلوم اے ہمدم!
کہ دریا پار اس گنجان جنگل کی فضاؤں میں
سرود آگیں بہاروں میں طرب افزا ہواؤں میں
طیورِ عامِ ناآگاہ کی شیریں نواؤں میں
جنہیں کہتے ہیں حیوانِ زباں ان فاختاؤں میں
غزالوں کے لباسوں میں، درختوں کی قباؤں میں
اندھیری رات کے خلق ملائم کی ضیاؤں میں
خلوصِ نکہتِ معصوم کی سادہ دعاؤں میں
مقدس جگنوؤں کی جاگتی سوتی اداؤں میں
وہ ہستی کون ہے جس کا عمل بیدار ہوتا ہے
یہ اس کے یار ہوتے ہیں، وہ ان کا یار ہوتا ہے

یہ دھرتی کے سفیروں ہی کو ہے معلوم اے ہمدم!
یہ اُڑتے رنگ پاکستان کے پرچم کی صورت ہیں
یہ افسانوں کے خالق ہیں، یہ معمارِ حقیقت ہیں
یہ سیاحانِ دشتِ دو جہاں، ذوقِ مشیت ہیں
یہ موسیقی کے داتا ہیں، یہ رنگوں کی کرامت ہیں
یہ بنجارے عظیم الشان خوابوں کی حلاوت ہیں
یہ پیغاموں کے دفتر ہیں، یہ الہاموں کی آیت ہیں
سبک اندام ہیں، خوش صوت ہیں، نبضِ لطافت ہیں
یہ سرتاپا قلندر ہیں، یہ سرتاپا طہارت ہیں
انہیں بخشا گیا ہے فرض ہر گلشن میں جانے کا
اور ان کی رسم و بود و باش کے احوال لانے کا

فضائی شہسواروں ہی کو ہے معلوم اے ہمدم!
تجھے یا مجھ کو اس کی واقفیت ہو نہیں سکتی
ہماری آگہی میں اتنی وسعت ہو نہیں سکتی
تری کشتی پر پروازِ نکہت ہو نہیں سکتی
مری ہستی میں وہ شانِ جسارت ہو نہیں سکتی
نظر اوجِ آشنائے بامِ رفعت ہو نہیں سکتی
زمیں کی سوجھ گردوں کی فراست ہو نہیں سکتی
ہماری عقل میں اتنی بصیرت ہو نہیں سکتی
ہوائے شوق، مانوسِ اقامت ہو نہیں سکتی
سعادت اُڑنے والی قوتوں کا ساتھ دیتی ہے
محبت بجلیوں کے ہاتھ اپنا ہاتھ دیتی ہے

یہ ان روشن ضمیروں ہی کو ہے معلوم اے ہمدم!
یہ طائر کلفت و راحت میں صبح و شام کرتے ہیں
سحر پر تولتے ہیں، رات کو آرام کرتے ہیں
سخن سنتے ہیں، سر دھنتے ہیں استفہام کرتے ہیں
پیامی ہیں، اکٹھے نامہ و پیغام کرتے ہیں
تمیزِ ہر زہ و افسانہ و الہام کرتے ہیں
پرندے ہیں جو صیادوں کو زیرِ دام کرتے ہیں
مسیحا ہیں، یہ جبریلِ امیں کا کام کرتے ہیں
یہ نورانی پیمبر روشنی کو عام کرتے ہیں
عیاں ہے ان کی آنکھوں پر کہ سب قوموں کی تقدیریں
ہیں کس کی دانشِ بیدار کی دھندلی سی تصویریں

باقی دو حرفوں ہی کو ہے معلوم اے ہمدم!
یتیموں، عاجزوں، بیواؤں کو کس نے ابھارا ہے؟
شعورِ زندگی کی زلف کو کس نے سنوارا ہے؟
وہ طوفاں کون ہے جو ہر سفینے کا سہارا ہے؟
وہ تنکا جس کی ہیبت سے ہمالہ پارا پارا ہے؟
جو عزمِ ایزدی کا نو تراشیدہ ستارا ہے
جو رستہ ہے، جو منزل ہے، جو کشتی ہے، جو دھارا ہے
وہ مردِ راہ اس کردار کا روشن شرارا ہے
جسے تاریخ کے گہرے اندھیروں نے پکارا ہے
مٹا کر اس نے خود کو قوم کو جینا سکھایا ہے
شکستہ استخواں ملاح نے ساحل دکھایا ہے

یہ ان زندہ شراروں ہی کو ہے معلوم اے ہمدم!
کہ کس کس ملک کی سچی دعائیں اُڑ کے آتی ہیں؟
کہ کس کس باغ کی ٹھنڈی ہوائیں اُڑ کے آتی ہیں؟
گھٹائیں اُڑ کے آتی ہیں، نوائیں اُڑ کے آتی ہیں
ادب کے پھول لیکر التجائیں اُڑ کے آتی ہیں
عقیدت کے نگاروں کی قبائیں اُڑ کے آتی ہیں
خموشی کے جھروکے سے صدائیں اُڑ کے آتی ہیں
محبت کی تڑپتی مامتائیں اُڑ کے آتی ہیں
سویرے سجدہ کرتے ہیں ضیائیں اُڑ کے آتی ہیں
کہ صرف اک دم کی خاطر زندۂ جاوید ہو جائیں
اجازت لیکے اس درگاہ کے خورشید ہو جائیں

روش شعاروں ہی کو ہے معلوم اے ہمدم!
کہ دنیا کے عوام الناس کیا محسوس کرتے ہیں؟
اکابر کس بشر کو رہنما محسوس کرتے ہیں؟
قلندر کس غنی کو کبریا محسوس کرتے ہیں؟
ستارے کس کو لافانی ضیا محسوس کرتے ہیں؟
کسے اہلِ نظر ظلِ ہما محسوس کرتے ہیں؟
کسے اہلِ خرد لاانتہا محسوس کرتے ہیں؟
حدودِ آب و گل سے ماورا محسوس کرتے ہیں؟
عروجِ آدمیت کا دیا محسوس کرتے ہیں؟
گل و لالہ ہیں قرباں کس کے سانسوں کی حلاوت پر؟
سمندر بوسہ زن ہے کس کے خوابوں کی صداقت پر؟

یہ ان روشن ستاروں ہی کو ہے معلوم اے ہمدم!
کہ قریہ قریہ، بستی بستی کس کا ذکر جاری ہے؟
کہاں عہدِ کہولت ہے، کہاں فصلِ بہاری ہے؟
کہاں شاداب کاری ہے، کہاں سینہ فگاری ہے!
کہاں انسانیت کے عدل کا افسون طاری ہے!
محبت شادکامی ہے، تعصب خام کاری ہے
زمیں بنجر بھی ہو تو خلق، روحِ آبیاری ہے
محبت کی شریعت کتنی روشن کتنی پیاری ہے
ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ سب دنیا ہماری ہے
ہمارے بازوؤں نے اک نیا سنسار ڈھالا ہے
جہاں کی صبحِ اول آدمیت کا اجالا ہے

فضا کے تاجداروں ہی کو ہے معلوم اے ہمدم!
کہ پاکستاں کے بانی مردمانِ پاک ہیں کتنے
جنونِ عشقِ ملت سے گریباں چاک ہیں کتنے
زبونِ فرعون ان سے اور خجل سفاک ہیں کتنے
جنوں آشفتہ و آتش زنِ ادراک ہیں کتنے
یہ مردانِ مشیت در بغل بے باک ہیں کتنے
بھڑک اٹھیں تو پروانے قیامت ناک ہیں کتنے
تجھے کیا علم ان کے پاؤں میں افلاک ہیں کتنے
فلک کو روندنے والے بزیرِ خاک ہیں کتنے
مزارِ قائدِ اعظمؒ ہر اک ملت کی دولت ہے
کہ اس زرخیز مٹی میں خمیرِ آدمیت ہے

قافلۂ بیدار

محشر بدایونی

اٹھی اُفق سے شعاعِ حسیں سنورتی ہوئی   نگارِ صبحِ وطن کو سلام کرتی ہوئی
ہوئی شب اپنے اندھیرے سمیٹ کر رخصت   طلوعِ مہر کی شعلہ وری سے ڈرتی ہوئی
سحر نے وقت کے آئین ہی بدل ڈالے   وہ رسمیں اٹھ گئیں سب تھیں جو شب کی بیتی ہوئی
عجب قرینے سے آئی عروسِ صبحِ طرب   خود اپنے حسن، خود اپنی ادا پہ مرتی ہوئی
چمن میں چلنے لگی بادِ سلسبیل خرام   قدم قدم پہ سنبھلتی ہوئی ٹھہرتی ہوئی
گذر رہی ہے صبا پھول پھول کو چھوکر   طلب کی آتشِ سوزاں کو تیز کرتی ہوئی

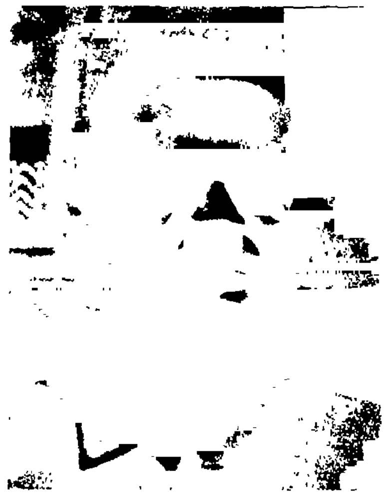
حریفِ جلوۂ بامِ فلک ہے ارضِ حیات   فروغِ روشنیِ وقت سے نکھرتی ہوئی
نصیبِ سبزۂ پامال کو جگانے لگی   سرشتِ موسمِ نامہرباں سنورتی ہوئی
بڑھی شباب میں ڈھل کر سحر کی رقاصہ   فضا میں نغمگی و رنگ و نور بھرتی ہوئی
نظر فروزِ تخیل نکھار ہے کتنی   شفق کی دھوپ سرِ شاخسار اترتی ہوئی
سمیٹے لیتے ہیں دامن میں تشنگانِ بہار   متاعِ جلوہ سرِ گلستاں بکھرتی ہوئی
وصال و ہجر کی لذت سے کر رہی ہے قریب   بہار آتی ہوئی اور خزاں گذرتی ہوئی
جواں لہو رگِ ہر گل کو کر رہی ہے عطا   روش روش سے نئی زندگی ابھرتی ہوئی
رواں دواں کن ارادوں سے ہے کسے معلوم   گلوں کے سائے میں دیوانگی بپھرتی ہوئی

جو دورِ شب تھا وہ تا ختمِ شب فنا نہ ہوا
سحر ہوئی کہ ادھر قافلہ روانہ ہوا

دلوں میں برق صفت حوصلے مچلنے لگے   کہ جسم و روح بھی سوزِ طلب سے جلنے لگے
جنوں کی راہ گزاروں میں عشق کے راہی   ہر ایک پیچ و خمِ راہ پر سنبھلنے لگے
نئی امید کی منزل سے روشنی ابھری   اندھیرے یاس کے اب تک جو تھے وہ ڈھلنے لگے
نفس نفس میں لئے جوشِ اہلِ شوق بڑھے   یہ دیکھتے ہی ہواؤں کے رخ بدلنے لگے
نظامِ نو کے افق سے نئی کرن پھوٹی   پرانے جادوں سے جادے نئے نکلنے لگے
حق آشناؤں کی شعلہ فشاں صداؤں سے   ستمگروں کے بھی سنگین دل پگھلنے لگے

[illegible] دہلی

بیاد رفتگاں



سعادت حسن منٹو



چراغ حسن حسرت

کیسے کیسے لوگ !



استاد بندو خاں

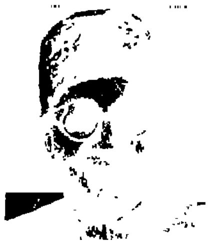


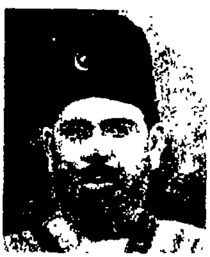
[illegible] چودھری

قومی تحریک کے چند اکابر

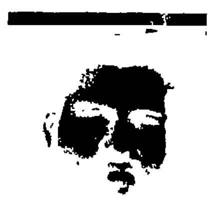










ہے زندگی ہمہ رعنائی و ہمہ جلوہ
فضا نے روپ اُبھارا غبار ڈھلنے لگے

گداز عزم و یقیں نے اثر کیا ایسا
تمام حلقۂ زنجیرِ طلسم گلنے لگے

ہزار کانٹوں میں اُلجھے ہوئے تھے لیکن اہلِ سفر
مسرتِ سفرِ شوق سے بہلنے لگے

یہ سوچ کر کہ قریب آ رہی ہے اب منزل
جو سرنگوں تھے وہی سر اُٹھا کے چلنے لگے

کچھ ایسی تیز ہوئیں سرخ رو تمنائیں
رگوں میں جیسے جوانی کا خوں اُچھلنے لگے

مسافروں کو جو دیکھا بہ شوق بڑھتے ہوئے
تو ذرّے خاک کے تابانیاں اُگلنے لگے

کچھ اس فروغ سے آیا خیال منزل کا
سیاہ خانے میں جیسے چراغ جلنے لگے

وہ وقت آیا کہ خود قافلے کی راہوں سے
مصائب و غم و آلام بچ کے چلنے لگے

تمام حادثے پیچھے کو ہٹتے جاتے ہیں
طویل فاصلے خود ہی سمٹتے جاتے ہیں

بجا کہ دشت و چمن ان کے اختیار میں ہیں
ابھی یہ راہی کسی اور انتظار میں ہیں

انہیں بھی کرنا ہے اک روز آشکارِ چمن
کئی چھپے ہوئے جلوے ابھی بہار میں ہیں

ابھی بہت ہیں [illegible] تو عالم
جو سامنے نہیں اور چشم اعتبار میں ہیں

بہت سی منزلیں معلوم ہو چکی ہیں مگر
بہت سی منزلیں پنہاں ابھی غبار میں ہیں

ابھی تو سیکڑوں رعنائیاں بہشتِ نگاہ
حجابِ پیرہنِ صبحِ زرنگار میں ہیں

مہ و نجوم سے بڑھ کر بھی ہیں بہت انوار
مہ و نجوم کے انوار کس شمار میں ہیں

ان اُلجھنوں میں جو ہیں کچھ انہیں کا دل جانے
کس آرزو و تمنا کے خارزار میں ہیں

ہزار آفتِ دوراں سے بے نیاز سہی
بہت کچھ اُلجھے ہوئے فکر روزگار میں ہیں

کبھی کبھی تو یہ عالم بھی ان پہ گذرا ہے
نہ گھر نہ دشت نہ منزل نہ رہگزار میں ہیں

بس ایک دھن میں چلے جا رہے ہیں دیوانے
کہاں یہ ہوش ہے ان کو کہ کس دیار میں ہیں

نہیں ہے کچھ انہیں ہستی و نیستی کا خطر
یہ اک مقامِ جنونِ خرد شکار میں ہیں

یہ اور بات کہ غم کا اثر نہ لیں دل پر
یہ واقعہ ہے کہ دردِ غم آشکار میں ہیں

گزرنا ہوگا ابھی کتنے عرصۂ غم سے
غلط ہے یہ کہ ابھی دردِ خوشگوار میں ہیں

یہ بے قراری ہی عینِ قرار ہے ان کو
نہ ہوں گے اور نہ ابھی منزلِ قرار میں ہیں

ابھی تو راہ کی گرد ان کے رخ کا غازہ ہے
ابھی مذاقِ غمِ عشق تازہ تازہ ہے

طلوعِ صبحِ بہار

مترجمہ مقبول احمد سعید

کشمیر کے نامور شاعر مہجور کی مشہور نظم "طلوعِ صبحِ بہار" نے تحریکِ آزادی کی جدوجہد میں، جوانانِ قوم کے سینے کی حرارت کو شعلہ زن رکھنے میں بڑی مدد کی ہے۔ (مدیر)

سیاہیٔ شبِ ہجراں کا زور ٹوٹ گیا
اُفق سے جھانک رہی ہے نگارِ صبحِ وصال
قدم قدم پہ ہیں لالے کی مشعلیں روشن
نظر نظر سے عیاں ہے سکون و صبر و قرار
چمن کا دامنِ صد رنگ ہے بہارِ نظر!

★

روش روش پہ کھلے ہیں کنول محبت کے
سنا ہے سیرِ گل و لالہ کے بہانے سے
ہماری دید کو آئے گی وہ بہارِ خیال!
مہک اٹھی ہے جو بوٹے وفا سے وادیٔ دل

★

مٹا چکے ہیں دلوں سے غبارِ جورِ خزاں
فسانۂ شبِ ہجراں بھی لوگ بھول گئے
کچھ اس طرح سے ہوئی ہے طلوعِ صبحِ بہار

منزل بمنزل

کسی غیر معمولی شکست و ہزیمت کے بعد سیاسی و تہذیبی میلانات کہیں برسوں میں جاکر واضح صورت اختیار کرتے ہیں۔ جبکہ زندگی ایک نئے اَن دیکھے راستے پر رواں ہو، نہیں کہا جاسکتا کہ وہ آخر کیا رُخ اختیار کرے گی۔ ہر طرح کے خارجی و داخلی عوامل اس پر اثر انداز ہوتے رہتے ہیں اور زندگی آہستہ آہستہ کسی نئے سانچے میں ڈھلتی رہتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ نمایاں خدوخال پیدا کرلیتی ہے۔

اس سے کون انکار کرسکتا ہے کہ پاکستان کا قیام دورِ جدید کی تاریخ کا ایک عظیم الشان واقعہ ہے جس نے برصغیر کی تاریخ کا رخ ہی بدل دیا۔ قدرتی طور پر ابتدا میں قومی زندگی کا کوئی پہلو بھی واضح نہ تھا۔ کیونکہ ابھی تو محض اس کی داغ بیل ہی پڑی تھی۔ اس کا آئین، اس کا سیاسی مسلک، اس کی تہذیبی ہیئت کیا ہوگی؟ ان کے متعلق زیادہ سے زیادہ قیاس آرائی ہی کی جاسکتی تھی۔ اس کے ذہنی میلانات و عواطف کا مرتب ہونا تمام تر مستقبل پر موقوف تھا جس کی ہم کچھ جھلکیاں ہی دیکھ سکتے تھے۔ جو کچھ ہمارے پیش نظر تھا وہ محض دھندلے دھندلے امکانات تھے۔ ان کا بدیہی طور پر جلوہ گر ہونا حالات پر موقوف تھا۔ بلکہ پاکستان کی تو پیدائش ہی طوفانوں کے سایہ میں ہوئی تھی۔ اور سب سے یہ کہنا ہی مشکل تھا کہ یہ نوزائیدہ مملکت طوفانِ حوادث اور زمانے کی بے پناہ چیرہ دستیوں کے ہاتھوں جاں بر بھی ہوسکے گی یا نہیں۔ لیکن وہ زبردست روح جو پاکستان کے وجود میں آنے کا باعث ہوئی تھی، اس کی بقائے دوام کا باعث بھی ہوئی۔ اور یہ ہماری قوتِ خیر ملت کی جبلی توانائی اور جدوجہد ہی کا نتیجہ ہے کہ آج بھی (شہید ملت لیاقت علی خاں مرحوم کے الفاظ میں) مملکتِ پاکستان چٹان کی طرح مضبوط ہے اور ہم نہ صرف آزاد ہیں، بلکہ اپنے راستے پر پہلے سے زیادہ مضبوطی سے قدم جمائے ہوئے ہیں۔

ہماری بقا کا حقیقی انحصار اس روح یا نصب العین کی بقا سے ہے جس کے ہم علمبردار ہیں اور جس کے لئے پاکستان وجود میں آیا۔ اگر یہ روح، یہ نصب العین زندہ ہے اور ہماری زندگی میں پوری طرح کارفرما ہے تو پاکستان کے زندہ رہنے میں کوئی شبہ نہیں۔ یہی بات ہمارے لئے سب سے زیادہ موجب تشفی ہے کہ مشرقی پاکستان ہو یا مغربی پاکستان، اس سرزمین کا ذرہ ذرہ اپنی باقی کا زمزمہ ہر کہیں سنائی دیتا ہے۔

بیدار قومیں کبھی اپنے کارناموں سے مطمئن نہیں ہوتیں۔ اکثر صورتوں میں ایسی طمانیت کوتاہ نظری کی دلیل ہوتی ہے۔ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ ہم اپنی ہشت سالہ رفتارِ ترقی سے مطمئن ہیں۔ ہمارے بہت سے حوصلے ابھی تشنۂ تکمیل ہیں۔ اور ہمیں اپنی آزادی کی آٹھویں سالگرہ مناتے وقت ایک طرح کا احساسِ ناتمامی بھی ہے لیکن یہی ایک واقعہ کہ ہم آج یہ دن منا رہے ہیں اور آئندہ ایسے بیشمار دن منانے کا یقین رکھتے ہیں، کچھ معنی ضرور رکھتا ہے۔ ہمارے دوست اور دشمن یکساں اس بات کے معترف ہیں کہ آج پاکستان پہلے سے کہیں زیادہ استوار ہے۔ ہماری دفاعی قوتیں بفضلِ خدا برابر فروغ پذیر ہیں۔ ہماری بری فوج اپنی تنظیم اور معیارِ تربیت کے لحاظ سے دنیا کی بہترین بری فوجوں کی ہم دوش ہے۔ ہمارا بحریہ گزشتہ دنوں اپنے طویل دورہ میں کئی دوستانہ ممالک سے خراجِ تحسین لے چکا ہے۔ اور ہماری ہوائی فوجوں نے اپنی کارکردگی کے مظاہروں میں دوسرے ملکوں کے ماہرین کی موجودگی میں اپنے اعلیٰ معیار کا سکہ بٹھادیا۔

پاکستان بنیادی طور پر ایک زراعتی ملک تھا۔ مگر چند ہی سال کی صنعتی ترقی کی بنا پر ایک صنعتی ملک شمار ہونے لگا ہے۔ صنعتی ترقی کے لئے وسیع تجربہ، وافر سرمایہ، شبانہ روز محنت، بین الاقوامی تعاون، تفصیلی منصوبہ بندی۔ غرض کتنے ہی لوازم تھے جن کا بیک وقت میسر آنا اس نوزائیدہ مملکت کے لئے اس افراتفری کے زمانہ میں محال نظر آتا تھا، اس نے اپنی صنعتی نشوونما کا آغاز ایک وسیع خلا میں محض حوصلے کی مدد سے کیا۔ آج جب ہم گزشتہ آٹھ سال کے مجموعی نتائج پر نظر

ڈالتے ہیں تو ہمیں صنعتی نشو و نما کا نہایت دلکش منظر دکھائی دیتا ہے جو روز بہ روز وسعت پذیر ہے۔

اس وقت ہماری صنعتی ترقی کی مجمل کیفیت یہ ہے کہ پاکستان موٹے اور درمیانی درجے کے سوتی پارچات میں بڑی تیزی سے خودکفیل بنتا جا رہا ہے۔ جہاں ۱۹۴۸ء میں صرف تقریباً دو لاکھ تکلے اور ۵ ہزار کرگھے نصب تھے، وہاں آج تقریباً ۱۲ لاکھ ۶۱ ہزار تکلے اور ۲۲ ہزار کرگھے نصب ہیں۔ اس کے ساتھ ہی اعلیٰ درجے کے کپڑے، رنگائی اور چھپائی پر بھی بیش از بیش توجہ دی جا رہی ہے۔ اعلیٰ قسم کے پٹ سن کی ۸۰ فیصدی پیداوار پاکستان ہی میں ہوتی ہے مگر تقسیم کے وقت پاکستان میں ایک جیوٹ مل بھی نہ تھی۔ اس وقت آٹھ ملیں زور شور سے کام کر رہی ہیں۔ شش سالہ ترقیاتی منصوبہ (جولائی ۱۹۵۱ء لغایت جون ۱۹۵۷ء) کے مطابق ۶ سال کے اندر اندر ۶۰۰۰ کرگھوں کا نصب کرنا طے پایا تھا لیکن یہ مرحلہ ۲½ سال پہلے ہی طے ہو گیا۔ یہ کرگھے پٹ سن کی ۲ لاکھ ٹن کی مصنوعات تیار کرتے ہیں جن کی قیمت ۲۲ کروڑ روپے ہے۔ ۳۰۰۰ مزید کرگھوں کے اضافہ کا منصوبہ تقریباً مکمل ہو چکا ہے۔ پاکستان انڈسٹریل ڈویلپمنٹ کارپوریشن کو بطور خاص جیوٹ انڈسٹری کو ترقی دینے کا کام سپرد کیا گیا ہے اور وہ اس پر اپنی پوری توجہ مبذول کر رہی ہے۔ اس وقت پاکستان اپنی ضروریات سے ۴ ہزار ٹن زیادہ مال تیار کر رہا ہے، جس کی قیمت ۴ کروڑ روپے ہے، اور اس کو بیرونی ممالک میں ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا ہے۔ چنانچہ ۱۹۵۴ء میں پٹ سن کی ۱۱ ہزار ٹن مصنوعات برآمد کی گئیں۔

پاکستان میں اون کی پیداوار بھی کافی کثیر ہے اور ہم اونی کپڑے کی پیداوار میں بھی بہ آسانی خودکفیل ہو سکتے ہیں۔ اس وقت موٹے قسم کا اونی کپڑا فالتو از ضرورت پیدا ہو رہا ہے۔ اس سلسلہ میں جو تدابیر اختیار کی گئی ہیں ان کے پوری طرح عمل میں آنے پر امید ہے کہ ہم اعلیٰ قسم کا اونی سامان بھی حسب ضرورت پیدا کر سکیں گے۔

کاغذ کی مختلف اقسام کی تیاری ایک اور دلپذیر کارنامہ ہے۔ کرنافلی پیپر ملز کی بدولت آج پاکستان کاغذ کی اکثر اقسام میں خودکفیل ہو چکا ہے جس سے بیرونی زرمبادلہ میں ۳ کروڑ روپے سالانہ کے بقدر بچت ہو گئی ہے۔ نوشہرہ اور راہوالی میں بھی گتے اور دفتی کے کارخانے قائم کئے گئے ہیں جو جاری ہونے پر پاکستان کو کاغذ کی کم بیش جملہ ضروریات میں خودکفیل بنا دینگے۔ اخباری کاغذ تیار کرنے کے سلسلہ میں بھی تحقیق جاری ہے اور بعض اہم اقدامات کئے گئے ہیں۔

جہاں تک شکر سازی کا تعلق ہے، مردان، جوہرآباد اور لیہ کے کارخانوں کا نام لے دینا ہی کافی ہے۔ اب چارسدہ (سرحد) اور رنگپور (مشرقی پاکستان) میں بھی کارخانے قائم کئے جا رہے ہیں۔ اور ٹنڈو آدم (سندھ) میں گنے کی پیداوار بڑھانے کے لئے وسیع فارم بنائے جا رہے ہیں۔

سیمنٹ میں ہم فی الحال خودکفیل نہیں، لیکن حیدرآباد اور داؤدخیل کی سیمنٹ فیکٹریوں کے مکمل ہونے پر صورتِ حال بہت بہتر ہو جائے گی۔

جہاز سازی کا اہتمام ایک اور بڑا کارنامہ ہے۔ پی۔آئی۔ڈی۔سی نے جہازوں کی مرمت اور تعمیر کے لئے کراچی میں گودیاں بنانے کا کام جاری کیا ہے جو اس سال کے آخر تک امید ہے مکمل ہو جائے گا۔ اس سے نہ صرف زرمبادلہ میں بچت ہو گی بلکہ کافی آمدنی بھی ہو سکے گی۔ اُدھر کھلنا میں بھی جہازوں کی مرمت کے لئے ایک گودی تعمیر کرنے کا بندوبست کیا جا رہا ہے۔

ہماری صنعتی ترقی کی حکایت اتنی لذیذ ہے کہ اسے دراز تر کرنے کو جی چاہتا ہے لیکن ان چند اوراق میں جملہ صنعتوں کا نام گنوانا بھی محال ہے۔ انہی چند صنعتوں پر اکتفا کرتے ہوئے ہم اس عظیم الشان صنعتی ادارے کی طرف رجوع کرتے ہیں جس کو ہمارے صنعتی دور کا پیش خیمہ کہنا چاہیئے یعنی "پاکستان انڈسٹریل ڈویلپمنٹ کارپوریشن"۔ اس ادارہ نے جنوری ۱۹۵۲ء میں اپنی سرگرمیوں کا آغاز کیا تھا، اور اس وقت ۲۰ صنعتی منصوبوں کی تکمیل میں لگا ہوا ہے، جن پر تقریباً ۸۰ کروڑ ۴۰ لاکھ روپے صرف آئیں گے۔ یہ ۲۰ منصوبے ۱۹۵۵ء کے اختتام تک مکمل ہو جائیں گے۔ ان سے بیرونی زرمبادلہ میں ۴۰ کروڑ روپے کی بچت ہو گی اور ایک لاکھ لوگوں کو روزگار ملیگا۔ اب تک کارپوریشن کے بارہ منصوبے مکمل ہو چکے ہیں۔

اس حوصلہ افزا کامیابی کے بعد کارپوریشن نے سترہ اور صنعتی منصوبے، جن پر ۵۶ کروڑ روپے کی لاگت آئے گی، اپنے پروگرام میں شامل کر لئے ہیں، جن میں سوئی گیس کی توسیع بھی ہے۔ ان منصوبوں کی تکمیل کا کام ۱۹۵۵ء میں جاری ہو جائے گا۔ حکومت نے کارپوریشن کے متنوع کاموں کے لئے ۵۶-۱۹۵۵ء کے میزانیہ میں ۱۵ کروڑ روپے سے زیادہ رقم دینی منظور کی ہے۔

برقی ترقیاتی منصوبوں کی داستان بھی کچھ کم دلچسپ نہیں۔ تقسیم کے وقت زندگی کے تقریباً ہر شعبہ میں نئے سرے سے آغازِ سفر کی ضرورت تھی۔ اب بجلی اور پن بجلی پہلے سے کئی گنا زیادہ مقدار میں پیدا کی جا رہی ہے۔

ابتدا میں ہمارے یہاں کل گرم آبی (تھرمل) قوت تقریباً ۷۶ ہزار کلوواٹ تھی آج اس کی مقدار ۲ لاکھ کلوواٹ ہے۔ برق آبی قوت پہلے ۱۰ ہزار کلوواٹ تھی اور وہ بھی صرف مالاکنڈ میں۔ اب یہ ۶۲ ہزار کلوواٹ ہے اور ابھی اس میں نئے منصوبوں کی بدولت غیر معمولی اضافہ ہونے والا ہے۔ سوئی (بلوچستان) میں گیس کے ذخیرے

کی دریافت ایک نہایت اہم واقعہ ہے جس کا پاکستان کی اقتصادیات پر دور رس اثر پڑے گا۔ بلوچستان سے لے کر کراچی تک تمام علاقے میں صنعتی ضروریات کے علاوہ ارزاں نرخ پر خانگی ضروریات بھی پوری ہو سکیں گی۔ یہ ذخیرہ اتنا وسیع ہے کہ اس سے ساٹھ سال تک دس کروڑ مکعب فٹ گیس روزانہ بہم پہنچائی جا سکے گی۔ اب تک آبپاشی کے کوئی پندرہ اہم منصوبے اختیار کئے گئے ہیں۔ ان میں سے "غلام محمد بیراج" مکمل ہو چکا ہے اور نہروں کی کھدائی جاری ہے۔ بقیہ منصوبے تکمیل کے مختلف مدارج میں ہیں۔ ان میں تھل پروجیکٹ، تونسہ پروجیکٹ، خرم گڑھی ویئر، وارسک گدو بیراج "سیلابہ" اور گنگا کا بودک شامل ہیں۔ ان منصوبوں پہ ۱۶۷ کروڑ روپے کی لاگت کا اندازہ ہے۔ اور جو نہریں جاری ہوں گی ان سے ۱۰۷ کروڑ ایکڑ زمین سیراب ہوگی۔ بلوچستان کے دو منصوبے بھی پایۂ تکمیل تک پہنچ چکے ہیں۔ مشرقی پاکستان میں ایک اور عظیم الشان منصوبہ "تستا بیراج" بھی زیرِ نظر ہے جس پہ ۹ کروڑ دس لاکھ روپے خرچ آئیں گے۔ دس لاکھ ایکڑ سے زیادہ رقبہ سیراب ہوگا اور ۳ لاکھ ٹن اناج پیدا ہوگا۔

وسل و رسائل میں جہاں ریلوں، شاہراہوں، سڑکوں، دریائی راستوں اور بندرگاہوں میں نمایاں ترقیاں ہوئی ہیں، وہاں شہری پرواز میں بھی غیر معمولی ترقی ہوئی ہے۔ اس سلسلہ میں ہماری پہلی قومی ہوائی سروس "پاکستان انٹرنیشنل ایئر لائنز" کا ذکر لازمی ہے۔ یہ سروس ۱۹۵۴ء میں قائم ہوئی اور اس کا شمار دنیا کی بہترین ہوائی سروسوں میں ہے۔

مہاجرین کی بحالی ایک ضروری مگر بہت کڑا کام تھا اور آج بھی ایک صبر آزما مسئلہ ہے۔ کیونکہ پاکستان کی تقریباً ۱/۱۰ آبادی مہاجرین پر مشتمل ہے۔ کاشتکاروں اور کاریگروں کو بحال کرنے کے لئے مرکزی اور صوبائی حکومتوں نے مالی اعانت، الاٹمنٹوں، نئی بستیوں اور متروکہ جائیداد منقولہ و غیر منقولہ کے سلسلہ میں آئینی امداد کی شکل میں متعدد تدبیریں کی ہیں۔ اس سلسلہ میں "ریفیوجیز ری ہیبلیٹیشن فنانس کارپوریشن" کی کارگزاری ایک مثالی حیثیت رکھتی ہے۔

پاکستان نے گزشتہ آٹھ سالوں کی مختصر مدت میں دیگر سرکردہ ممالک سے بالعموم اور دنیائے اسلام کے ساتھ بالخصوص جو قوی روابط پیدا کئے ہیں وہ ہمارے عہدِ آزادی کی مختصر تاریخ کا ایک روشن باب ہیں۔ کراچی میں ممالک اسلامی کے نوجوانوں کی کانفرنس ایک بارونق اور مفید تقریب تھی۔ اس وقت دنیا کے متعدد ممالک کے ساتھ پاکستان کے سفارتی تعلقات قائم ہیں۔ بین الاقوامی کانفرنسوں میں ہمارے ملک نے نمایاں طور سے شرکت کی اور اہم مذاکرات میں حصہ لیا۔ حال یہ بنڈونگ کانفرنس میں وزیر اعظم محمد علی صاحب کے تجویز کردہ امن عالم کے سات اصول بالاتفاق منظور ہوئے، اور دنیا کے پریس میں ان کو سراہا گیا۔ ان اصول کو تسلیم کیا جانا بڑی نیک فال ہے، اس سے ہمارے بعض الجھے ہوئے مسائل کا حل بھی آسان ہو جاتا ہے۔

کشمیر کا سوال ہماری قومی ناموس اور انسانیت کے بنیادی حقوق کا سوال ہے۔ ہم نے اس کے لئے برابر اخلاقی و آئینی ہر طرح سے جد و جہد کی ہے اور برابر کوشاں رہیں گے۔ حتٰی کہ ہمارے کشمیری بھائی اپنا فطری حق خود اختیاری حاصل کر لیں۔ اس سلسلہ میں پاکستان کی تحریک اور کوشش سے چند مذاکرات اور منعقد ہوئے اور عنقریب پھر ہمارے اور انڈیا کے وزرائے اعلیٰ کی ملاقات کی توقع ہے۔ وزیر اعظم محمد علی صاحب نے اپنی نشری تقریر میں اعلان فرمایا کہ اگر متوقع مذاکرات کا حسب دلخواہ نتیجہ نہ نکلا تو پھر پاکستان کو پُرامن تصفیہ کے لئے اور ذرائع ڈھونڈنے پڑیں گے۔ پاکستان نے ایک طرف "سیٹو" اور دوسری طرف ترکی و عراق کے عہد ناموں میں شریک ہو کر اپنی دفاعی حیثیت کو اور مضبوط کر لیا ہے اور اس سے بین الاقوامی مشترک دفاع کو بھی یقیناً بڑی تقویت پہنچی ہے۔ اس بات کا اعتراف بھی شرط ہے کہ ہم نے اپنے ہمدرد ممالک سے اپنی مادی ترقی کے سلسلہ میں وافر امداد حاصل کی۔ یہ ہماری سلامت روی مخلصانہ تعاون اور حسن تدبیر ہی کی بدولت ممکن ہو سکا۔

۱۹۵۴ء میں وفاقی پایۂ تخت کراچی کی یونیورسٹی قائم ہوئی جو پاکستان کی چھٹی یونیورسٹی ہے۔ پشاور یونیورسٹی نے بھی اس اثنا میں نمایاں ترقی کی اور اب وہاں ایک نہایت عمدہ سائنس کا شعبہ قائم ہو گیا ہے۔ شہروں کے علاوہ حکومت نے بلوچستان اور قبائلی علاقہ کی تعلیم پر بھی خاص طور سے زور دیا، جہاں بیسیوں نئے سکول قائم کئے گئے۔

آثارِ قدیمہ کی دریافت کے سلسلہ میں میناماتی (مشرقی بنگال) کی تازہ ترین کھدائیاں اور بلوچستان، سندھ، خیرپور، بہاولپور اور نواح کراچی کا جائزہ جو غیر ملکی ماہرین کی معیت میں مکمل کیا گیا، نہایت نتیجہ خیز ثابت ہوا۔

یہ ہماری ہمہ جہتی ترقی کے جستہ جستہ پہلو ہیں لیکن ان سے بھی اہم ترین پہلو ہے جو پاکستان کی سالمیت سے تعلق رکھتا ہے۔ ہمارا اشارہ اس فیصلہ کی طرف ہے کہ مغربی پاکستان کی عارضی حد بندیاں دور کر کے اس کو ایک وحدت بنا دیا جائے۔ ہم نے ایک ہی قوم کی حیثیت سے پرچم آزادی بلند کیا تھا اور آج بھی وحدت کے پرستار ہیں۔ ہماری نظر جو کل پاکستان کو ایک وحدت شمار کرتی ہے

ایک خطہ میں مختلف وحدتوں کو قدرتاً تسلیم نہیں کر سکتی۔ تمام علاقائی امتیازات اور مقامی تفریقات سے ماورا یگانگت، جو کشمیر کی فلک بوس چوٹیوں سے لیکر سندھ کے ریگزاروں اور ساحلِ کراچی کی سرمست موجوں تک تمام خطے میں پائی جاتی ہے، یعنی سندھ کی وادیٔ کبیر جو پنجاب، سرحد، سندھ اور بلوچستان وغیرہ میں خفیف امتیازات کے باوجود ایک ہی رنگ اور ایک ہی روپ رکھتی ہے اور جس کی زبانوں، باشندوں، سرگرمیوں، ہنگاموں، داستانوں اور مجموعی زندگی میں ایک بنیادی ہم آہنگی کا نغمہ ہے۔ اب ایک ہی صوبائی حکومت کے زیرِ اہتمام آجائے گی۔ یہ وحدت پہلے ہمارے شعور میں ایک زیریں احساس کے طور پر جاگزیں تھی، آج آٹھ سال کے طویل تجربہ کے بعد یہ ہمارے شعور کی سطح پر ابھر آئی ہے اور ہم پورے ذوق و شوق اور غیر متزلزل عزم کے ساتھ اس کی طرف قدم بڑھا رہے ہیں۔ یہ ہماری ہشت سالہ زندگی کا ایک اہم واقعہ اور ایک نئی ترقی کا نقطۂ آغاز ثابت ہوگا۔ ہمارا آٹھواں جشنِ استقلال اس لئے اور بھی مبارک ہے کہ یہ ہمیں اس وحدت کے ایک عملی حقیقت بننے کی نوید دے رہا ہے۔ علامہ اقبالؒ کے اس ارشاد پر عمل کرتے ہوئے کہ ؎

بتانِ رنگ و بو کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا

نہ ایرانی رہے باقی نہ تورانی نہ افغانی

ہم پنجابی، سندھی، پٹھان اور بلوچی کی تفریق کو مٹا کر ایک رشتہ میں منسلک ہونے کا تہیہ کر چکے ہیں۔ اس طرح ہماری سالمیت کو اندرونی یا بیرونی ریشہ دوانیوں سے کوئی اندیشہ نہیں رہے گا۔ نیز پورے خطے کے مجموعی وسائل کو ملا کر ترقی کی رفتار تیز کی جا سکے گی۔

اس عرصہ میں اس لطیف عالم معنی۔ ادب و فن کی کیا کیفیت رہی؟ آجکل ادبی جمود کا بہت چرچا ہے۔ دراصل ادب دنیا کے کسی دور میں بھی بہت تیز گام نہیں رہا۔ ہر عہد کی یادگار صرف چند چوٹی کے کارنامے ہوتے ہیں۔ ہمارے ہاں تعلیم ابھی تک محدود ہے۔ اور اسے خاطر خواہ وسعت دینے کیلئے برسوں کی محنت، بے اندازہ صرفہ، ساز و سامان، عمارات، کتابوں اور استادوں کی ضرورت ہے۔ جو رفتہ رفتہ ہی پوری ہو سکتی ہے۔ ان سب کوتاہیوں کے باوجود یہ کہنا غلط ہوگا کہ پاکستان نے کسی ذوقِ ادب کا ثبوت نہیں دیا۔ شیخ سعدی کا وہ مقولہ کہ "یاراں فراموش کردند عشق" یہاں صادق نہیں آتا۔ اگرچہ ہم نے خشک سالی، سیلاب، آفات حتیٰ کہ آشوبِ قیامت تک دیکھے۔

یہاں ہمارا مقصد ادبی جائزہ پیش کرنا نہیں۔ دراصل اس کا حق آئندہ نسلیں ہی ادا کر سکیں گی، البتہ اس عمومی جائزہ کے ساتھ کچھ ثقافتی سرگرمیوں کا ذکر مناسب معلوم ہوتا ہے۔

ملک میں فنونِ لطیفہ کے جو ادارے سرگرمِ عمل ہیں ان میں آرٹ کونسل، انسٹیٹیوٹ میوسکوں آف آرٹس، لاہور، ڈھاکہ آرٹ سکول، آرٹ کونسل ڈھاکہ اور فوٹوگرافک سوسائٹی آف پاکستان کے علاوہ اب بلبل اکاڈمی آف فائن آرٹس کا بھی اضافہ ہو گیا ہے۔ ان کی بدولت ملک میں فنونِ لطیفہ کا چرچا پہلے سے بڑھ گیا ہے۔ مصوروں کی تعداد اور ان کے اسالیب نہ صرف مشرق و مغرب کے جدید ترین فنی مشربوں کے جامع ہیں، بلکہ ان میں نئے نئے تجربوں اور ترغیبوں کا میلان نمایاں ہے۔ ڈھاکے کی عظیم الشان نقاشی کی نمائش کے علاوہ مختلف مصوروں کے انفرادی کام کی نمائشیں وقتاً فوقتاً منعقد ہوتی رہیں، جن میں تازہ ترین، کراچی میں زبیدہ آغا کی نمائش تھی جو جولائی ۱۹۵۵ء میں منعقد ہوئی۔ بعض پاکستانیوں نے بین الاقوامی مقابلوں میں انعام بھی حاصل کئے۔ بلبل چودھری مرحوم کا فنِ رقص میں نئی روح پھونکنا، فوٹوگرافک سوسائٹی آف پاکستان کے کارنامے، فلموں کی طرف رجوع۔ یہ سب ایک حرکت اور بڑھتے ہوئے ذوق کی علامات ہیں۔ رفیق غزنوی نے سازینوں اور تعبیری یعنی (REPRESENTATIONAL) موسیقی کے جو نمونے پیش کئے ہیں، مثلاً "سنانا" وہ اس فن میں ایک نئے تجرباتی میلان کی خبر دیتے ہیں۔ گویا وہ مشرقی و مغربی موسیقی کو آپس میں سمو کر اسے ایک نئی طرح دے رہے ہیں اور ترقی کا ایک نیا راستہ کھول رہے ہیں۔ ڈھاکہ میں رقص و موسیقی کا بین الاقوامی میلہ جس میں متعدد قوموں کے نمائندوں نے شرکت کی، وسیع پیمانہ پر ثقافتی اختلاط کی تمہید ہے۔ مغربی پاکستان میں بھی یہی عمل جاری ہے۔ اور کچھ عجیب نہیں کہ یہ خطہ مختلف تہذیبوں اور تمدنوں کی آماجگاہ ہونے کا روایتی منصب پھر ادا کرے۔ اور پہلے سے کہیں زیادہ وسیع پیمانہ پر۔

شعر و ادب اور صحافت بھی اس میلان سے بیگانہ نہیں رہے۔ انجمن ترقی اردو پاکستان، حلقۂ اربابِ ذوق، اکاڈمی پنجاب، اقبال اکاڈمی، ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ لاہور اور سندھ ادبی بورڈ سب اپنے اپنے طور پر علم و ادب میں توسیع و ترقی کے نئے نئے طریقے اختیار کرنے میں سرگرم ہیں۔ خصوصاً ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ نے اسلامی افکار کو نئے تحقیقی زاویۂ نگاہ سے پیش کر کے ایک نئی بصیرت پیدا کی ہے اور اخلاقی تصورات کو بہت کچھ اجالا ہے۔ انجمن ترقی اردو میں بابائے اردو مولوی عبدالحق اردو

لغات کے مسودات پر نظرِ ثانی کرنے میں مصروف ہیں جو اُن کے زیرِ نگرانی تیار کی گئی تھی۔ دوسرے اشاعتی اداروں نے بھی ادب و فن کی ترویج میں کسی نہ کسی حد تک حصہ لیا ہے۔ اخبارات، رسائل اور تصانیف کی تعداد روز افزوں ہے اور کاغذ سے بندشیں اُٹھ جانے کے بعد اس میں بیش از بیش اضافے کی توقع ہے۔ بعض رسائل نے خاص خاص موضوعات پر ضخیم شمارے شائع کر کے بڑی مستحسن مثال قائم کی۔ بعض اداروں نے عکسی طباعت کے ذریعہ دلکش مصور جریدے شائع کرنے میں پیش قدمی کی ہے۔

ایک اہم اقدام جو قومی ثقافت سے گہرا تعلق رکھتا ہے، قومی ترانے کے نغمے اور نظم کا منظور کیا جانا تھا۔ ان دونوں سے اثر پذیر ہونے کے لئے عقیدت شرط ہے لیکن انہوں نے قدر دان دلوں کو فنی حیثیت سے مایوس نہیں کیا اور جوں جوں کان ان سے مانوس ہو رہے ہیں۔ ان کی مقبولیت بڑھتی جا رہی ہے۔

غنائیوں کی ترویج، طویل نظموں سے لگاؤ اور منظوم ڈراموں (پابند و آزاد) کا بڑھتا ہوا ذوق "دورِ پاکستان" کی امتیازی خصوصیت ہے۔ اس نئی راہ میں ترقی کا امکان بے پایاں ہے۔ ڈراموں کا شوق خصوصیت سے ترقی کر رہا ہے۔ زیادہ اہم بات یہ ہے کہ ان نظموں اور ڈراموں میں تکنیک، ہیئت اور محاکات کے نہایت وقیع تجربے کئے گئے ہیں۔ غزل نے بھی اپنی حدود میں، ترقی کی طرف قدم بڑھایا ہے۔

قیامِ پاکستان کا ایک لازمی نتیجہ یہ تھا کہ پاکستانی علاقے، ان کی زبانیں، ادب، قصص و حکایات اور رسم و رواج آپس میں اور شیر و شکر ہوں اور اردو نے بے تکلف علاقائی زبانوں کے الفاظ اور روایات کو جذب کرنا شروع کر دیا ہے۔ اس اختلاط نے ایک تحریک کی صورت اختیار کر لی ہے جس کو ادارۂ مطبوعات پاکستان کی گوناگوں مطبوعات جن میں متعدد علاقائی اور بیرونی زبانوں کے رسائل بھی ہیں، کے ذریعے کافی فروغ ہوا۔ مستقل تصانیف میں علاقائی زبانوں کی مختصر تاریخیں بھی شامل ہیں، جن سے ان کی امتیازی خصوصیات کافی حد تک متعارف ہو جاتی ہیں۔ ایک طویل بنگلا ناول "عبداللہ" کا ترجمہ اردو میں کیا گیا ہے اور ڈاکٹر نذیر احمد کے مشہور ناول "توبۃ النصوح" کا ترجمہ بنگلا میں شائع ہوا ہے۔

مشرق و مغرب کی دوسری زبانوں سے شغف بھی بڑھ رہا ہے۔ محمد حسن عسکری، مسٹر ہادی حسین، اور دیگر مترجمین نے انگریزی سے جو تراجم کئے ہیں، وہ ہمیں نئے نئے تصورات سے روشناس کر رہے ہیں۔

افسانوں کی پیداوار کثیر ہے اور بہتر افسانے بھی کمتر سہی مگر نایاب نہیں۔ رپورتاژ خاص طور پر مقبولیت حاصل کر رہا ہے۔

تنقید میں بھی نئے احساس، نئے نظریوں اور نئے طریقوں کو اپنانے کی کوشش جاری رہی ہے۔ محمد حسن عسکری خواہ ادب کی رفتار سے کتنے ہی مایوس ہوں، خود ان کی تحریروں نے ادبی شعور کو بیدار کرنے میں اچھا کام کیا اور ادبی مسائل کی طرف مفید طور پر توجہ دلائی۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے ایک مبسوط کتاب میں مقدمہ شعر و شاعری کو زیرِ بحث لا کر نئے حقائق کو اجالا ہے۔ تنقید کا ایک خالص پاکستانی مظہر "مذاکروں" کی ترویج ہے جن میں ترقی کی بہت ضرورت اور گنجائش ہے۔

مغربی ادب کی تقلید کے ساتھ، اپنے کلاسکی ادب کی طرف بھی خصوصی رجحان نمایاں ہے۔ گزشتہ چند سال میں بعض شاعروں نے میر کا دلچسپ طور پر تتبع کیا۔ غالب کے فارسی کلام سے رغبت بڑھ رہی ہے۔ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کی تازہ تصنیف "افکارِ غالب" اس کی مسلسل جاذبیت کا تازہ ترین ثبوت ہے۔ کلامِ اقبال سے یورپی، ایرانی اور مصری اہلِ ادب نے جس تازہ شغف کا اظہار کیا وہ ان کی مقبولیت کے ایک نئے دور کا آغاز ہے۔ اس سلسلے میں کرشنو ایسانندرو یونانی، پروفیسر آربری، آلسے، سعید نفیسی اور ڈاکٹر عبدالوہاب عزام بے وغیرہ کا ذکر لازم ہے۔ اندرونِ ملک بھی اقبال پر نئی مفید تصانیف رونما ہوئیں۔ مثلاً "اقبالیات کا تنقیدی جائزہ"، منظوم ترجمہ "اسرارِ خودی"، "انٹروڈکشن ٹو اقبال" وغیرہ۔ ادارۂ مطبوعات پاکستان کے زیرِ اہتمام پشتو اور سندھی میں "اسرار و رموز" دونوں اور بنگلا میں "رموزِ بیخودی" کے منظوم ترجمے بھی شائع ہوئے۔ اقبال اکاڈمی نے بھی اقبال کے متعلق تحقیق اور اشاعت کا کام شروع کر دیا ہے۔ اور اس سے بڑی امیدیں وابستہ ہیں۔

اس سرسری جائزہ سے ظاہر ہے کہ ہماری زندگی اور ادب میں ترقی کی کتنی صلاحیت ہے۔ ابھی ہماری آنکھیں افق کی طرف لگی ہوئی ہیں۔

غالبؔ پیشروِ اقبالؔ

سید عبداللہ

بلحاظِ زمانہ غالبؔ کا پیش روِ اقبالؔ ہونا تو حقیقت ہے۔ مگر کیا
بلحاظِ فکر بھی وہ ان کے پیش رو تھے؟ اس قیاس کی جانچ کی جا سکتی ہے مگر
پوچھ سکتا ہے کہ صرف غالبؔ ہی کو اس مطالعہ کے لئے کیوں مخصوص کر لیا
گیا؟ بلا مبالغہ بے شمار دوسرے شعرا بھی اقبالؔ کے پیش رو تھے۔ مگر
ان معنوں میں پیشروی جبھی ثابت ہوتی ہے کہ متقدم فنکار بعد میں آنے
والے کسی عظیم تر فنکار کے اندازِ فکر اور اندازِ فن کی سمت نمائی
کرے، ان بادلوں کی طرح جو بارش کی جھڑی لگنے سے پہلے آسمان پر
چھا جاتے ہیں۔ افکارِ انسانی کی فضائے لطیف میں بھی اسی طرح کی
ہوائیں چلتی رہتی ہیں جن سے آنے والے طوفانوں کا اندازہ لگایا جا سکتا
ہے۔ فکرِ انسانی اور تہذیبِ اجتماعی کے اُفق پر بھی ایسی علامتیں اکثر
نمودار ہوتی رہتی ہیں جو ایک نئے دور کا اعلان کرتی ہیں۔

فکر و فن کی دنیا کا یہ عام واقعہ ہے کہ بعض سماجی اور سیاسی عوامل
ایک خاص دور میں بحران و طغیان کی حدوں سے گزر کر کسی نئی روش
کی داغ بیل ڈالتے ہیں تو یہ عمل اچانک نہیں بلکہ آہستہ آہستہ ظہور
میں آتا ہے، مدتوں کے داخلی عمل و ردعمل کے بعد ایک نئے قسم کا شعور
آنکھیں کھولتا ہے۔ اگرچہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ان میں جتنی مماثلت ہوتی
ہے اتنا ہی اختلاف بھی ہوتا ہے۔ بعض اوقات یہ محسوس بھی نہیں ہوتا
کہ آنے والے نے اپنے پیش رو سے کچھ لیا بھی ہے یا نہیں — اور
بعض دفعہ تو قدرت کچھ اس طریق سے کام کرتی ہے کہ پیش رو اور
فیض یاب دونوں اپنی اپنی جگہ ایک طرح کے معلوم ہوتے ہیں۔
— یعنی ان کی آواز وقت کی ایک ایسی عام آواز ہوتی ہے
جس سے ایک متاثر ہوتا ہے تو دوسرا بھی۔

جب غالبؔ نے یہ کہا تھا۔ ؎ کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میرؔ بھی تھا
تو یہ ایک لحاظ سے میرؔ کی محض اس پیش روی کا اعتراف تھا جس کے
متعلق کوئی شبہ نہیں کیا جا سکتا۔ عمرانی لحاظ سے بھی دیکھا جائے تو
میرؔ و غالبؔ میں اتنا بُعد نہیں جتنا مثلاً ولیؔ اور غالبؔ میں ہے کیونکہ
یہ دونوں تہذیب کے سماجی عنصر کے دو نشانِ راہ ہیں۔ محمد شاہ کے
زمانے میں (جسے ضعفِ احساسات کا زمانہ کہا جا سکتا ہے) ضعفِ
احساس کی جو لہر اٹھی تھی، اس سے میرؔ اور غالبؔ دونوں ہی متاثر ہوئے،
میرؔ پہلے، غالبؔ بعد میں۔ یہی وجہ ہے کہ دونوں کی نوا کے بعض پہلو
ایک دوسرے کے خاصے قریب ہیں۔

بہرصورت سوال ذہنی مماثلتوں کا ہے جو اتفاقی بھی ہو سکتی
ہیں مگر سماجی عوامل کے اثرات یقینی ہیں۔ یہ مماثلتیں غالبؔ اور
اقبالؔ میں بھی ہیں۔ میرؔ و غالبؔ کی باہمی مماثلتوں سے بہت
زیادہ۔ غالبؔ، میرؔ سے اتنے قریب نہیں ہیں، جتنے اقبالؔ
غالبؔ کے قریب ہیں۔ اوّل تو اقبالؔ اور غالبؔ کا زمانہ بہت قریب
تھا۔ اقبالؔ نے جن ادبی روایات میں تربیت پائی۔ وہ غالبؔ کے
زمانے کی پروردہ تھیں۔ یہ صحیح ہے کہ زمانے کے لحاظ سے اقبالؔ، شبلیؔ،
حالیؔ اور اکبرؔ کے بھی زیادہ قریب تھے اور بعض سماجی اور قومی احساسات
میں ان کے ہم خیال بھی تھے مگر ان تینوں بزرگوں کو اپنے عصر کا
نمائندۂ خاص نہیں کہا جا سکتا۔ یہ تو چند متفرق آوازوں کے آئینہ دار تھے۔
پورے زمانے کی روح ان کے فن میں منعکس نہیں ہوئی۔ اور پھر یہ ان
نوابغ میں سے بھی نہ تھے جن کا فن زمان و مکان کی حدوں کو پھاند کر
آفاق کی وسعتوں پر چھا جایا کرتا ہے۔ یہ تو دراصل وہ متفرق اجزا تھے
جن کی شخصیتوں اور قابلیتوں کے مجموعی مواد سے اقبالؔ کی منفرد اور
نابغہ شخصیت وجود میں آئی۔ اس عہد کی نابغہ شخصیتیں دو اور صرف

دوبستیں۔ اقبال اور غالب۔

مولانا حالی۔ اور مولانا حالی کیا، خود زمانے کے نئے تقاضوں نے غالب کے انتقال کے بہت جلد بعد غالب شناسی کے ایک نئے مکتب کی بنیاد رکھ دی تھی، جدید تعلیم اور جدید انداز نظر نے غالب کو وہ قبولِ عام بخشا کہ اس کا مطالعہ اور اس سے استفادہ وقت کا مقبول ترین ادبی فیشن بن گیا تھا اسی ترقی پذیر غالب پرستی کے زمانے میں اقبال کی شاعری نے پہلی انگڑائی لی۔ اور ادبی ذوق و شوق کی اسی ابتدائی حالت میں اقبال کو غالب کی شاعری میں معنی کے بڑے بڑے طلسمات نظر آئے۔ اسکا اظہار ان کی نظم "مرزا غالب" (مطبوعۂ بانگِ درا") سے ہوتا ہے جس کے ہر ہر شعر سے اقبال کی غالب شناسی اور غالب پسندی کا واضح ثبوت مہیا ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اقبال کے دل میں غالب کے افکار کی عزت کسی رسم عام یا روشِ عام کی بنا پر نہ تھی، بلکہ اس سبب سے تھی کہ انہیں غالب کی شاعری میں ایک ایسا بڑا فن کار نظر آیا جس کے فن کے بعض پہلو خود ان کے اپنے رجحانات کے ہم رنگ تھے۔ انہیں مرزا غالب کی شخصیت اور ان کے فن میں اپنی ہی طبعی اور ذہنی خصوصیات کی جھلک نظر آئی

> بہ آب جو نگرم خویش را نظارہ کنم
> بایں بہانہ مگر روئے محرمے بینم

مذکورہ بالا نظم میں اقبال نے یہ واضح کیا ہے کہ مرزا غالب کو خالق نے وہ تخیل عطا فرمایا تھا جس پر فکرِ انسانی متحیر ہے۔ اقبال کے نزدیک غالب اس حسنِ مطلق کے متلاشی تھے جو سوزِ زندگی بن کر کائنات کے ذرّے ذرّے میں پوشیدہ رہتا ہے۔ (یہاں اقبال نے سوزِ زندگی اور حسن کو اپنی اصل اور منتہا کے لحاظ سے ایک ہی شے قرار دیا ہے) اس کے علاوہ اقبال کی نظر غالب کی شوخیٔ تحریر پر بھی پڑی ہے، جو زندگی بخش اور حیات افزا ہے۔ اس شوخیٔ تحریر سے ایک ایسا اسلوب پیدا ہوا ہے جس پر عرفی اور سعدی و حافظ بھی رشک کر سکتے ہیں ؂

> شاہدِ مضموں تصدق ہے ترے انداز پر
> خندہ زن ہے غنچۂ دلی گلِ شیراز پر

سعدی، حافظ اور عرفی تینوں فارسی کے بہت بڑے شاعر تھے اور تینوں کا وطن شیراز تھا۔ ان میں سے اقبال کا اشارہ کس کی طرف ہے۔ تیقن سے کچھ نہیں کہا جا سکتا مگر اقبال کی اپنی پسند اور غالب کے بعض اقوال کو ملحوظ رکھا جائے تو عرفی ہی ان کے مدِ نظر معلوم ہوتا ہے۔ بہرحال اقبال، غالب کے اندازِ بیان کے دلدادہ ہیں اور یہ رائے ظاہر کرتے ہیں کہ شیرازیوں کی شاعری تو غالب کے کلام کا مقابلہ نہیں کر سکتی البتہ گلشن ویمر میں محو خواب ایک دوسرا خوش فکر و بلند مرتبہ شاعر گوئٹے ضرور ایسا ہے جو غالب کا ہمنوا و ہمسر بن سکتا ہے۔ کیونکہ یہ وہ شاعر ہے جسکی شاعری میں تخیل و تعقل دونوں اپنی اپنی بہار دکھا رہے ہیں۔

> آہ تو اجڑی ہوئی دلّی میں آرامیدہ ہے
> گلشنِ ویمر میں تیرا ہمنوا خوابیدہ ہے

اس نظم سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ غالب کی اہمیت اقبال کی نظر میں اس لئے بھی ہے کہ غالب ایک تہذیب کا نمائندہ، اور ایک عظیم فکری و ادبی روایت کا وارث و ترجمان بلکہ آخری وارث و ترجمان تھا جس کے بعد جہان آباد یعنی دلّی کے بام و در سراپا نالۂ خاموش بن گئے۔ گویا غالب کی قدر و قیمت اسلئے بھی ہے کہ وہ ان تہذیبی و فکری قدروں کا شناسا و معیار شناس تھا جن کی معیار شناسی خود اقبال کے فکر و فن کا امتیاز خاص ہے۔ گویا اقبال کی نظر میں وہ ایک شخص تھا جو ان سے پہلے انہی راستوں اور شاہراہوں کا سراغ لگا چکا تھا جن کی نشان دہی بعد میں انہوں نے کی۔

ان سب تصریحات کا مقصود یہ ہے کہ اقبال جن رجحانات و اقدار کے نمائندہ سمجھے جاتے ہیں ان میں سے بعض نمایاں رجحانات و اقدار غالب کے یہاں بھی ہیں۔ مگر اس سے یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہیئے کہ اقبال کی سب اقدار و خصائص غالب میں ہیں۔ بعض اقدار و خصائص جو ان دونوں شاعروں میں مشترک معلوم ہوتے ہیں ان کی مختصر فہرست یوں پیش کی جا سکتی ہے:۔

۱۔ برجستہ اور جوش انگیز اسلوب بیان

۲۔ ارتقائے حیات کے لئے سخت کوشی اور خارا شگافی (جس کو اقبال کے مضامین کی اصطلاح میں "سیتز" کہا جا سکتا ہے)

۳۔ جذبہ و تفکر کا اجتماع

۴۔ جنون و آشفتگی کا ایک خاص انداز

۵۔ خود کا شعور۔

بایںہمہ غالب کی پیش روی افکار و نظریات کے منظم سلسلوں میں اتنی نمایاں نہیں جتنی بعض شخصی و نفسی کوائف میں ہے یا پھر بعض

اسالیب بیان میں جن کی نفسی روح اقبال کے ذہن و نفس اور نظریہ و تاثر کے بہت قریب ہے، غالب ایک برجستہ اسلوب اور فکر آفریں ذہانت کے مالک تھے جس کی ندرت اور طرفگی تجربہ و تخیل کے نئے میدانوں اور وادیوں کے انکشاف کے ساتھ ساتھ سرور و نشاط بھی پیدا کرتی ہے۔ غالب کی آواز میں بھی افکار کی خصوصیات کے اعتبار سے نہیں بلکہ لہجہ و صوت کی حد تک، اقبال کی آواز کا سا رعب و طنطنہ پایا جاتا ہے۔ اردو شاعری کے لہجے میں مدتوں سے بعض سماجی اثرات کے ماتحت جو نسوانیت سی پیدا ہو گئی تھی، اس کو غالب نے بہت بڑی حد تک دور کیا اور اس کو ایک توانا لہجہ بخشا۔ ان کی فارسی شاعری تو مردانہ اور قاہرانہ لب و لہجہ کے لئے امتیازِ خاص رکھتی ہے۔ غالب کے ہاں اظہار کے یہ پُرجلال پیرائے جن کے آہنگ میں ہی نشیدِ زندگی کے ساتھ ساتھ ولولہ و نشاط بھی ہے، اقبال کے ہنگامہ خیز اسالیب کے نقوش اولیں معلوم ہوتے ہیں۔ اسکا واضح ثبوت اقبال و غالب کی ان غزلیات کے تقابلی مطالعہ سے مہیا ہو سکتا ہے جو ایک ہی بحر و زمین میں ہیں مثلاً ذیل کی غزلیات جن کے چیدہ چیدہ اشعار یہاں درج کئے جاتے ہیں:-

غالب	اقبال
سوخت جگر تا کجا رنج چکیدن دہیم	خیز، شرر ذرہ را تن بہ تپیدن دہم
رنگ شو اے خونِ گرم تا بہ پریدن دہیم	تن بہ تپیدن دہم بال پریدن دہم
عرصۂ شوق ترا مشتِ غباریم ما	سوزِ نوایم نگر ریزۂ الماس را
تن چہ پرینده زہم ہم بہ تپیدن دہیم	قطرۂ شبنم کنم خوئے چکیدن دہم
جلوہ غلط کردہ اند رخ بکشا تا زمہر	چوں ز مقامِ نمود نغمۂ شیریں دہم
ذرہ و پروانہ را مژدۂ دیدن دہیم	نیم شباں صبح را میلِ دمیدن دہم
بر اثرِ کوہکن نالہ فرستادہ ایم	یوسفِ گم گشتہ را باز گشودم نقاب
تا جگرِ سنگ را ذوقِ دریدن دہیم	تا بہ تنک مایگاں ذوقِ خریدن دہم
شیوۂ تسلیم ما بودہ تواضع طلب	عشقِ شکیب آزما خاک ز خود رفتۂ
در خمِ محراب تیغ تن بہ خمیدن دہیم	چشمِ ترے داد و من لذتِ دیدن دہم
غالب از اوراقِ ما نقشِ ظہوری دمید	
سرمۂ حیرت کشیم دیدہ بہ دیدن دہیم	

ان دونوں غزلیات کا پُرجلال لہجہ اور رقص آفریں آہنگ و صوت اور اقبال کے یہاں "دہیم" کی بجائے "دہم" کی پُراعتماد ردیف کے سبب کچھ زیادہ نمایاں ہے) ان دونوں شاعروں کے مزاج کے داخلی اشتراک و اتحاد کا صاف صاف اعلان کر رہا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اقبال کی طرح غالب بھی ہندوستان کے متاخرین شعرائے فارسی کے فیضان کے شرمندۂ احسان ہیں۔ خصوصاً عرفی و نظیری کے مگر اقبال و غالب کے شخصی نفسیاتی خصائص کا اشتراک بھی ان دونوں کو ہم جنس شاعر قرار دیتا ہے۔ کیونکہ عرفی و نظیری کی نفسی کیفیتیں بہت سے امور میں غالب سے بالکل مختلف ہیں۔ عرفی کا جوشِ بیان بے شک غالب کے جوشِ بیان کے مماثل ہے اور ان کے شخصی خصائص بھی غالب، بلکہ اقبال کے بھی قریب ہیں۔ مگر اس سے انکار نہ کیا جائے گا کہ غالب کے جوشِ بیان اور نوائے گرم میں جو پیچیدہ جذباتی اور عمرانی تقاضے کار فرما ہیں۔ وہ عرفی وغیرہ کے یہاں نہیں۔ بہرحال وہ پُرجلال، مردانہ اور قاہرانہ آواز جس کو اقبال نے "بانگِ درا" اور نوغائے جرس بنا کر اجتماعی مقاصد کیلئے استعمال کیا، غالب کے یہاں بھی واضح صورت میں موجود ہے۔ ان کے قصائد میں تو ایک طنطنہ ہے ہی مگر ان کی عام غزلوں میں بھی بڑی توانائی اور قوت پائی جاتی ہے۔ اس موقعے پر زیادہ مثالیں پیش نہیں کی جا سکتیں، صرف ذیل کی چند غزلوں سے ہی اسکا کچھ نہ کچھ اندازہ ہو سکے گا:-

خیز دبے راہ روے را سر راہے دریاب

سحر دمیدہ و گل در دمیدن است مخسپ

بیا کہ قاعدۂ آسماں بگردانیم

رفتم کہ کہنگی ز تماشا بر افگنم

نشاطِ معنویاں از شراب خانۂ تست

یہ سب غزلیں ان کے جوشِ بیان کے عمدہ نمونے پیش کرتی ہیں۔ غزلیات کو امر و نہی کے صیغوں میں شروع کرنے اور ردیفوں میں امر و نہی کی کثرت سے ان کے ولولہ و جوش کا اظہار ہوتا ہے۔ عرفی کی طرح ہیجان خیز استعارات، معمولات و مسلمات کے خلاف طنز و شوخی اور احتجاج و

انحراف ان سب وسائلِ اظہار سے یہ بات اچھی طرح ثابت ہو جاتی ہے کہ غالب نے ایک اسلوب تخلیق کیا جس میں وہ خیالات بھی بڑی حد تک سما سکتے ہیں جو اقبال کی شاعری میں موجود ہیں۔ غالب کے یہاں وہ افکار ہوں یا نہ ہوں جو اقبال سے مخصوص ہیں، مگر ان کا اسلوبِ بیان اقبال کے اسلوبِ بیان سے اشتراک کے خاصے پہلو رکھتا ہے۔

غالب کے یہاں جو تند و تیز لہجہ پایا جاتا ہے وہ جوشِ زندگی اور نشاطِ آرزو کی پیداوار ہے، وہ ایک ایسی شخصیت کے سرچشمہ ہائے باطن سے نمودار ہوا ہے جس کے نزدیک زندگی کی تڑپ اور زندگی کی آگ ہی وہ متاعِ گراں مایہ ہے جو لذتِ درد اور لذتِ ادراک دونوں کی بیک وقت امین اور سرمایہ دار ہے۔ اقبال کی نفسی ساخت میں بھی یہی تب و تاب اور اضطرابِ دائم ایک مستقل عنصر کی حیثیت رکھتا ہے۔ البتہ اقبال نے اضطراب کی ان پرسوز کیفیتوں کو اجتماعی آرزوؤں اور تمناؤں میں ڈھال لیا ہے۔ غالب کا سوز و درد عموماً انفرادی ہے، یا زیادہ سے زیادہ اس بلند تر انسانی نوعیت کا ہے، جو صوفیانہ اندازِ نظر نے انہیں عطا کیا ہے۔ اور جس کی غایت یہ ہے کہ جزو پھر کل سے ہم آغوش ہو جائے۔ کلیت کا یہ وہ عارفانہ تصور ہے جو زندگی کی عقلی و مادی بنیادوں پر قائم نہیں بلکہ ایسے ماورائی تصور پر قائم ہے جس کا تعقل دشوار ہے۔ بایں ہمہ غالب و اقبال دونوں کا درد و سوز اپنی اصل و حقیقت کے اعتبار سے ایک ہی ہے یعنی ولولۂ آرزو اور اضطرابِ شوق دونوں کے نفس کا ایک عنصرِ مشترک ہے۔

اقبال و غالب دونوں کے یہاں عقلی نظریات اور جذبات و تاثرات کی مخلوط صورتیں موجود ہیں۔ فرق یہ ہے کہ اقبال کے جذبات و تاثرات عقلی تنظیم کے تابع رہتے ہیں۔ اقبال نے افکار ہی کو جذبے کی سطح پر لاکر ان کی خشک یا سرد "عقلیت" کو کم کر دیا ہے۔ مگر اقبال کے احساسات کا وہ عنصر برائے نام ہے جس کی عقلی توجیہ ممکن نہ ہو۔ اقبال کی شاعرانہ فطرت اور حکیمانہ طبیعت میں کچھ اس طرح کا امتزاج پیدا ہو گیا ہے کہ ان کے افکار جذبات اور ان کے جذبات افکار معلوم ہوتے ہیں۔

غالب کی شاعرانہ فطرت اور حکیمانہ طبیعت کے مابین اس قسم کا توازن پیدا نہیں ہوا۔ ان کے یہاں جذبہ و تعقل کے درمیان تضادات پائے جاتے ہیں۔ مجموعی لحاظ سے غالب کی فطرت شاعرانہ زیادہ اور حکیمانہ کم تھی۔ پھر بھی وہ تعقل و تفکر میں اعتقاد رکھتے ہیں۔ تعقل میں ان کا بھی ایک نظامِ فکر ہے مگر نامربوط اور ڈھیلا ڈھالا سا۔ ان کا تعقل زیادہ سے زیادہ ان آزاد خیال صوفیوں کا تعقل ہے جو شرع کے ظواہر کے خلاف آزادیٔ عقل اور شوخیٔ اندیشہ کی مدد سے تنقید کی جرأت کر لیتے ہیں۔ مگر ان کا نظامِ فکر کسی عقلی تنقید کی تاب نہیں لا سکتا۔ غالب کے تعقل کی بھی کسی حد تک یہی کیفیت ہے۔

یہ عجب اتفاق ہے کہ اقبال جن کی شاعری میں ایک مربوط عقلی نظام موجود ہے خود اپنی دعوت کے اعتبار سے "عقل" کی کارفرمائی اور کمال کے بہت بڑے مفکر اور ناقد ہیں۔ اور غالب جن کے یہاں عقلی نظریات کی حیثیت بھی زیادہ سے زیادہ جذباتی طرزِ ادراک کی حد تک پہنچ سکتی ہے، خود کو عقل و خرد کا بہت بڑا معتقد سمجھتے ہیں اور نظری طور پر عقل کو جذبے کے برابر بلکہ اس سے بھی زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ انہوں نے اپنے اردو اور فارسی کلام میں اندیشہ، عقل، خرد، دانش، آگاہی کی اصطلاحیں جا بجا استعمال کی ہیں، اکثر موقعوں پر ہم معنی الفاظ کے طور پر، بعض موقعوں پر الگ الگ جداگانہ مفہوم میں۔ مگر ان سب حوالوں کو یکجا رکھ کر دیکھنے سے یہ گمان گذرتا ہے کہ غالب کے نزدیک عقل کی حیثیت وجدان سے کسی طرح کم نہیں۔ وہ جذبے کی طرح کی ایک شے ہے، غالب نے یہ خیال بھی ظاہر کیا ہے، کہ عقل میں بھی مستی اور نشے کی کیفیت ہوتی ہے۔ ؎

بہ مستی خرد رہنمائے خود است
رود گر ز خود ہم بجائے خود است
ازیں بادہ ہر کس کہ سرمست شد
بافشاندنِ گنج تر دست شد

غالب کے نزدیک عقل سے بصیرت پیدا ہوتی ہے، عقل نفس کی اصلاح و تہذیب کرتی ہے، عقل سے سیرتوں میں توازن پیدا ہوتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ عقل کے یہ وظائف قابلِ تسلیم اور درست ہیں اور یہ بھی اصولاً درست ہے کہ ؎

سخن گرچہ پیغامِ راز آورد
سرود ار چہ در اہتزاز آورد
خرد داند ایں گوہریں در کشاد
ز مغزِ سخن گنجِ گوہر کشاد

خرد دانا، آں پردہ بر ساز بست
براش طعنے بر آواز بست

مگر غالب کا یہ خیال خاصہ توجہ طلب ہے کہ خرد میں بھی ایک قسم کی مستی ہوتی ہے، ان کے اس خیال کی اصلیت کیا ہے؟ یہ تو آگے آتا ہے مگر یہ سن لیجئے کہ اقبال کے نزدیک بھی علم و عقل میں سرور کی کیفیت ہوتی ہے مگر اس میں مستی کی کیفیت پیدا نہیں ہوسکتی ؎

عقل گو آستاں سے دور نہیں
اس کی تقدیر میں حضور نہیں
علم میں بھی سرور ہے لیکن
یہ وہ جنت ہے جس میں حور نہیں

غالب اور اقبال کے نظریۂ عقل میں یہ تفاوت کیوں ہے؟ یعنی اقبال کے یہاں تعقل کی خالص اور منظم و مربوط صورتوں کے باوجود تعقل کی ستائش کم ہے اور وجدان پر زور دیا گیا ہے۔ مگر غالب کے یہاں تعقل کی ستائش کم ہے، اور وجدان پر زور دیا گیا ہے، مگر غالب کے یہاں تعقل کے نظام کی سستی کے باوجود عقل و تعقل کی اتنی تعریف کیوں کی گئی ہے؟ جہاں تک میں غور کرسکا ہوں یہ فرق مذاق زمانہ کے سبب سے ہے۔ غالب کے زمانے میں عقل پسندی کی تحریک کی ابھی ابتدا تھی۔ اس میں معقولات کا شوق، پابندی فکر کا ثبوت سمجھا جاتا تھا اور اس وقت تک عقلیت اور وجدان کے باہمی تصادم کے وہ اثرات منکشف نہ ہوئے تھے جن سے وجدان اور روحانی تصورات کی ساری عمارت ڈھے سکتی تھی۔ اس لئے غالب اپنی خرد پرستی کا بڑا چرچا کرتے ہیں مگر اقبال عقل پسندی کے تمام نتائج سے پوری طرح باخبر تھے۔ ان کے زمانے میں تعقل کے جدید مرکزوں میں بھی نری عقلیت کے متعلق تشکک پیدا ہوچکا تھا اسلئے اقبال کے یہاں عقل کے مقابلے میں وجدان کے حق میں زبردست ردِ عمل پایا جاتا ہے۔

یہاں یہ بھی واضح کردینا ضروری ہے کہ غالب کے یہاں سخن یعنی ادبی تخلیق عقل سے الگ ایک سلسلۂ عمل ہے جس کو وہ عقل سے بلند تر نہ سہی اس کے برابر درجہ عطا کرتے ہیں ؎

سخن گرچہ گنجینۂ گوہر است
خرد را ولے تابشِ دیگر است

ان کا عقیدہ ہے کہ سخن کی صحیح قدر و قیمت بھی فکری عنصر کے طفیل ہوتی ہے تاہم ان کا کہنا یہ بھی ہے کہ سخن خود بھی ایک متاعِ گراں بہا ہے، جو ہمیں اپنے دل و جگر کی طرح عزیز ہے ؎

گفتمش چیست جہاں گفت سراپردۂ راز
گفتمش چیست سخن گفت جگر گوشۂ ماست

خلاصۂ بحث یہ ہے کہ غالب تعقل کے مداح و معترف ہیں۔ اور ان کی شاعری میں ایک فکری لہر بھی پائی جاتی ہے، وہ جذبات کے فکری تجزیہ کی بھی ضرورت محسوس کرتے ہیں اور کبھی ان کی فکری نوعیت اور حقیقت سے بھی سروکار رکھتے ہیں۔ مگر یہ بھی صحیح ہے کہ ان کی سوچ جذباتی انداز کی ہے، وہ جذبات پر افکار کا ملمع چڑھانے کے عادی ہیں۔ حقیقی افکار ان کے یہاں بہت کم ہیں۔ ان کے کلام میں علمی حقائق بھی پائے جاتے ہیں مگر ان کے پاس کوئی مربوط سلسلہ نہ حکمت کا ہے نہ عقل کا۔ وہ صوفی ہیں بھی اور نہیں بھی، وہ حقائق آگاہ ہیں بھی اور نہیں بھی۔ البتہ ایک بات ایسی ہے جس کی "نہیں" مسلّم ہے۔ مگر جس کی نہیں کا پہلو موجود ہی نہیں۔ وہ ان کا ایک "آرزومند شاعر اور فنکار" ہونا ہے۔ اور یہ وہ مرکز ہے جس کے ارد گرد ان کی ساری نفسیات شناسی، ان کا سارا تعقل گھومتا ہے۔ وہ "دلِ گداختہ" کے مالک ایک عظیم شاعر ہیں۔ ان کی یہ حیثیت مسلّم ہے۔ غالب کچھ بھی ہوں حکیم نہیں۔ ان کا تعقل جذبہ پرستی ہی کا دوسرا نام ہے۔ وہ تعقل کے دعوے کے باوجود "یک رخ" ہیں؟ وہ اندیشۂ بلند کے باوجود اپنے وجدان اور اپنے قلب ہی کے پرستار ہیں۔ دھواں ساتویں آسمان تک بھی پہونچ جائے، تب بھی یہ اسی آگ کا دھواں ہے جو تن میں لگی ہوئی ہے۔ اقبال کے یہاں تعقل کی مخالفت کے باوجود بلند تعقل پایا جاتا ہے۔ انہوں نے تاثر و تعقل کی آمیزش اس طرح کی ہے کہ شعر و حکمت اور کلیم و حکیم یک جان ہوگئے ہیں۔

غالب اور اقبال دونوں کے یہاں پُر جوش آرزومندی پائی جاتی ہے مگر یہاں بھی اصول اور سیرتوں کا فرق واضح ہے۔ اقبال نے اپنی آرزومندی کو انسان کی اجتماعی آرزوؤں اور امنگوں کی صورت دیدی ہے کیونکہ اقبال کا غم انسانیت کی تکمیل کے لئے ہے۔ یہ غم کسی سے ملنے اور اس میں ڈوب کر محو ہوجانے اور خود کو فراموش کردینے کی آرزو نہیں بلکہ تسخیر، توسیع اور چھا جانے کی وہ آرزو ہے جس کی کوئی حد و انتہا نہیں۔

غالب کی آرزومندی بھی شدید ہے مگر اس سے مختلف۔ اس کی نوعیت خالصتاً انسانی اور زیادہ قابلِ فہم ہے۔ اس میں شوق کی لگن اور محبت کا درد ہے۔ وہ زندگی کی سچائیوں سے زیادہ قریب ہے۔ کیونکہ اصولاً شخصی و ذاتی ہے۔ ان کا غم ناآسودگی سے بھی ابھرا ہے اور احساسِ ناتمامی سے بھی۔ ان کی بعض آرزوئیں آسودہ ہو کر بھی آسودہ نہیں۔ ان میں سے بعض آرزوؤں کی نوعیت حد درجہ غیر معقول بھی ہے جن کی کوئی عقلی توجیہ نہیں کی جا سکتی مگر ایک دل ہے اور ہزار آرزوئیں:

اب میں ہوں اور ماتمِ یک شہرِ آرزو

ان سب باتوں کے باوجود غالب کو اپنے غم سے لذت حاصل ہوتی ہے، مگر یہ وہ لذت نہیں جس سے دل بیٹھ جاتا ہے بلکہ وہ لذت اور طلب اور بے تابی ہے جس سے لذتِ آرزو تخلیق ہوتی ہے۔ تاہم جو غم احساسِ ناتمامی اور احساسِ ضعف و زوال کا نتیجہ ہے۔ اس کا رخ انفعالیت کی طرف ہے۔ البتہ جو غم ناآسودگی سے نکلا ہے اس میں طلب و امید کا اثباتی رُخ پایا جاتا ہے ؎

بہ فیضِ بے دلی نومیدیٔ جاوید آساں ہے
کشائش کو ہمارا عقدۂ مشکل پسند آیا

نہ لائی شوخیٔ اندیشہ تابِ رنجِ نومیدی
کفِ افسوس ملنا عہدِ تجدیدِ تمنا ہے

یہ تو مسلّم ہے کہ ہر انسان، فن کار یا غیر فن کار کی زندگی میں کچھ ایسے خلا ہوتے ہیں جو کبھی پُر نہیں ہو سکتے۔ دل کے ان داغوں کو کوئی مٹانا بھی چاہے تو مٹا نہیں سکتا، کیونکہ زخمِ دل کی لکیر پتھر کی لکیر سے زیادہ مستقل ہوتی ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ اس کے پیچھے کوئی بہت بڑا حادثہ ہی ہو۔ محض معمولی سی بات بھی گہرے زخم لگا سکتی ہے کیونکہ احساس کی دنیا میں سوچ کے انداز نرالے ہوتے ہیں۔

غالب کے یہاں ہر قسم کے غم پائے جاتے ہیں۔ ان کی شاعری کے ایک حصے میں ضعفِ حیات اور زوالِ عمر کا ماتم پایا جاتا ہے، ایک حصے میں اس کا غم و الم کہ نفسِ انسانی میں یہ حوصلہ ہی نہیں کہ بقدرِ شوق داد عیش دے سکے۔ اور پھر اس کا بھی کہ جتنا غم مطلوب ہے زمانہ اس سے بھی اس سبب سے محروم رکھ رہا ہے کہ اہلِ کمال کے حصے میں محرومی ہی محرومی ہے۔

بہر حال یہ طلسم کدۂ آرزو ہے جس کے غم و نشاط کے شعبدے

شاعر کے لئے وجہِ سکون بھی ہیں اور وجہِ اضطراب بھی! وہ بالکل قدرتی انداز میں ان غموں کا طالب بھی ہے اور ان کا شاکی بھی۔ مگر طلب و شکایت کی اس دوئی میں اس کو بڑی لذت ملتی ہے جس کا خمار اسے اکثر مضطرب رکھتا ہے۔ شوق و درد کی ان لذتوں میں وہ لذت بھی شامل ہے جسے لذتِ ادراک اور لذتِ تخلیق سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ صوفیا کے نزدیک لذتِ ادراک "جنون" کی ایک بڑی غایت ہے۔ ان کا عقیدہ یہ ہے کہ وحشت اور جنون سے صوفی کو دو فائدے حاصل ہوتے ہیں: اول سرور و مستی کی کیفیت، دوم کشف و ادراک کی تجلی۔ اسی سبب سے صوفیوں نے، یہاں تک کہ عیسائی صوفیوں نے بھی جنون کے فوائد کی حد درجہ تشریح کی ہے پروفیسر لیوبا نے اپنی کتاب میں کی ہے، ان دونوں غایتوں کو برحق قرار دیا ہے۔ غالب بھی جنون کو ایک "لذت بخش" اور "ادراک بخش" عارضہ خیال کرتے ہیں ؎

یک قدم وحشت سے درسِ دفترِ امکاں کھلا
جادہ اجزائے دو عالم دشت کا شیرازہ تھا

کچھ نہ کی اپنے جنونِ نارسا نے ورنہ یاں
ذرہ ذرہ روکشِ خورشیدِ عالم تاب تھا

مگر لذتِ ادراک کوئی ایسی ارزاں شے نہیں کہ اسے اور بازار سے خرید لائیے۔ اس کے لئے نفس کو ایک جنون و آشفتگی کی کیفیت سے تکلیف کرنا پڑتا ہے اور دل و جگر میں وہ گرمی پیدا کرنی پڑتی ہے جس کا ذکر غالب نے اس شعر میں کیا ہے ؎

عرض کیجے جوہرِ اندیشہ کی گرمی کہاں
کچھ خیال آیا تھا وحشت کا کہ صحرا جل گیا

یا اس شعر میں کہ ؎

دل افتاب بلا گداز و خوں کن
ز دانش کار بکشا یہ جنوں کن

یہ بہت بڑی حد تک وہ انداز نظر ہے جو دانش و جنوں کے متعلق اقبال کے افکار میں بھی ملتا ہے۔ اقبال و غالب کے خیالات کا اسالیب کے ماسوا، کوئی دوسرا پہلو ایسا نہیں جو باہم اتنی مماثلت رکھتا ہو۔ اقبال نے دانشِ دری کے مقابلے میں، جس کو غالب "دانش سوزی" کی اصطلاح سے یاد کرتے ہیں۔ جذب و جنوں اور حکیم کے مقابلے میں کلیم اور رازی کے مقابلے میں رومی کو جو اہمیت دی ہے، وہ اتنی مسلم

ہے کہ اس کے لئے کسی ثبوت کی ضرورت نہیں۔ غالب کی طرح اقبال کے نظریہ میں بھی جنونِ آشفتگی کی بڑی تقدیس پائی جاتی ہے۔ صرف فرق یہ معلوم ہوتا ہے کہ اقبال کا مجنوں آشفتگی کے باوجود غالب کے مجنوں سے زیادہ بااصول ہے۔ غالب کے مجنوں کی دیوانگی عاشقانہ دیوانگی ہے، مجذوبانہ دیوانگی نہیں۔ مثلاً ذیل کے اشعار میں ؎

عجب نشاط سے جلاد کے چلے ہیں ہم آگے
کہ اپنے سائے سے سر پاؤں سے ہے دو قدم آگے
خدا کے واسطے داد اس جنونِ شوق کی دینا
کہ اسکے در پہ پہنچتے ہیں نامہ بر سے ہم آگے

ظاہر ہے کہ یہ کردار کلیم کے کردار سے مختلف قسم کا کردار ہے جس کی حلیہ نگاری اقبال نے جابجا کی ہے

غالب کے ہاں غمِ عشق کے ساتھ وہ غم بھی ہے جسے غمِ تخلیق کہا جاسکتا ہے۔

نشاطِ زمزمہ و لذتِ جگر خواری

یہ وہ غم ہے جس سے فنکار کو ایک تکلیف دہ لذت ملتی ہے یا ایک لذت بخش تکلیف۔ ایک فنکار تخلیق سے پہلے اپنے تجربے کو اپنی شخصیت میں جذب کرتا ہے اور پھر جسم کے ہر ہر رونگٹے سے اس طرح سے باہر لاتا ہے کہ "جگر خواری" کے باوجود اس میں نشاطِ زمزمہ کی کیفیت پیدا ہو اس کا حال وہی لوگ جان سکتے ہیں جن کو غمِ تخلیق سے کبھی سابقہ پڑا ہو۔

بینم از گدازِ دل در جگر آتشے چو سیل
غالب اگر دمِ سخن رہ بہ ضمیرِ من بری

آتش چکد ز نبضِ مویم اگر بغسر من
ذوقِ تم تجود قرارِ گل دگلستاں دہد

گریہ را در دل نشاطے دیگر است
خندہ بر لب ہائے خنداں می زنم

اب اقبال و غالب کی بعض دوسری مماثلتوں کا ذکر آتا ہے۔

غالب کی انا اور اقبال کے فلسفۂ خودی میں بظاہر کوئی علمی یا فکری رابطہ نہیں۔ مگر ان دونوں شاعروں کے ان افکار کے پس پردہ جو شخصی احساس اور نفسی رجحان کار فرما ہے اس کے درمیان ایک رابطہ ضرور قائم کیا جاسکتا ہے۔ انا کی انفرادیت اور اس کا شعور کمال یا آرزوئے کمال "خودی" کے انفرادی و اجتماعی تصورات سے کچھ نہ کچھ رابطہ ضرور رکھتا ہے۔

یہ صحیح ہے کہ غالب کی انا یا شعورِ خود کا دائرہ بظاہر محدود ہے کیونکہ اس کی وسعت "شخص" کے نفسی ممکنات تک ہی معلوم نہیں ہوتی مگر حقیقت میں اس شخصی انا کا علاقہ اثر بھی کافی وسیع ہے۔ اور اس کا تعلق ذاتِ شخص کے علاوہ ساری انسانی نوع سے بھی ہے جس کا شعورِ خود اس کو روحانی ارتقا کی بلند ترین معراج پر پہنچانے کا ذمہ دار ہے اور جب غالب یہ کہتا ہے کہ ؎

میں عدم سے بھی پرے ہوں ورنہ غافل بارہا
میری آہِ آتشیں سے بالِ عنقا جل گیا

تو اس سے مراد غالب کی ذاتِ واحد نہیں بلکہ وہ ساری نوع ہے جس کا وہ ترجمان ہے صوفیوں کے شعورِ خود (عرفانِ نفس) کی یہی تشریح ہے اور غالب کا شعورِ خود بھی عام طور سے صوفیوں کے اس تصور سے جدا نہیں۔ اقبال کے شعورِ خود میں روحانی اور مادی دونوں قسم کی غایتیں موجود ہیں مگر صوفیوں کے شعورِ خود کا تعلق محض روحانی ارتقا سے ہے۔ غالب اور اقبال کی بے خودی میں بھی یہی فرق ہے بعض لوگوں نے یہ سمجھ لیا ہے کہ اقبال صرف خودی کے ترجمان ہیں۔ حالانکہ اقبال جتنے خودی کے مبلغ ہیں اسی قدر بے خودی کے بھی شارح ہیں۔ اگرچہ غالب کی خودی و بے خودی اور اقبال کی خودی و بے خودی میں مفہوم اور دائرۂ اثر کے اعتبار سے خاصا فرق ہے، پھر بھی ان کے ڈانڈے کسی جگہ باہم مل جاتے ہیں۔ بالکل اسی طرح جس طرح حقیقت اور مجاز میں معناً واضح فرق بھی ہو، تب بھی ان کے کئی رخ ہم شکل ہوتے ہیں۔ کم از کم شکلوں اور صورتوں، طریقوں اور وسیلوں میں ہم رنگ ہونے کے کئی وجوہ نکل آتے ہیں، مثلاً اظہار و بیان ہی کو لیجئے۔ غالب کے یہاں جو شدید احساسِ انا ہے (انفرادی اور قومی) اس کے پیرایہ ہائے اظہار بڑی آسانی سے اقبال کے شعورِ انا کے ترجمان بن سکتے ہیں۔ اگرچہ عملی تشریح و تعبیر میں جدا ہی کیوں نہ ہوں۔

غالب کی انا کا عارفانہ رنگ تو وہی ہے جو عام صوفیوں کا ہے مگر ان کی انا کا خالص شخصی رخ بھی نہایت نمایاں ہے۔ ان کے

شعورِ خودی کی انتہا یہ ہے کہ عالمِ انفس و آفاق میں روحانی، ادبی ذہنی بلندی کا کوئی درجہ ایسا نہیں جو ان کو حاصل نہ ہو۔ منصور، موسیٰ فرہاد، زلیخا، مجنوں۔ غرض عاشقی اور روحانیت کی دنیا کا کوئی مشہور فرد ایسا نہیں جس کا کمال ان کے نزدیک عیب دار اور ناقص نہ ہو ـــــ کوہکن؟ وہ تو رسوم و قیود کا بندہ تھا۔ نازی تھا۔ بے حوصلہ اور پیشہ ور قسم کا آدمی تھا وہ تو یہ سمجھتا تھا کہ پتھر دل سے سر پھوڑنے اور پہاڑوں کو کاٹنے سے کوئی شخص کسی کی محبت کو جیت سکتا ہے ؎

کوہکن نقاشِ یک تمثالِ شیریں تھا اسد
سنگ سے سر مار کر ہووے نہ پیدا آشنا

مجنوں؟ جو "تصویر کے پردے میں بھی عریاں نکلا" ـــــ جاذبۂ عشق سے خالی تھا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو لیلیٰ گھر کی چار دیواری توڑ تاڑ کر صحرا میں کیوں نہ بھاگی آتی! ـــــ منصور؟ سو اُن کی "تنگ ظرفی" پر تو غالب کے علاوہ بعض دوسرے "عالی ظرفوں" نے بھی بڑی لے دے کی ہے! یہ سب کیا ہے؟ وہی شعورِ ذات اور احساسِ خودجس کے کمال کے سامنے کسی اور کا کمال نظر میں جچتا ہی نہیں۔ یہ سب خودی کی تجلیات ہیں۔ جو کلامِ اقبال میں ایک بصیرت افروز فلسفے کی صورت میں آفتاب بن کر ظاہر ہوئی۔

اقبال کے یہاں تسخیر و ستیز کا فلسفہ بھی خودی سے مربوط ہے۔ زندگی، جو خودی کی نمود ہے، دائمی جدل و پیکار سے تشکیل پاتی ہے۔ اسی پیکار سے زندگی ارتقا پذیر ہو کر اس منزلِ کمال کی طرف بڑھتی جاتی ہے جو زندگی کے مقدر میں ہے۔ تسخیر و ستیز اور جدل و پیکار کی معمولی اور ابتدائی علامت ہے قوتِ ارادی کی مضبوطی اور ان نامقبول اثرات کو تسلیم نہ کرنا جو خودی کو ضعیف کرنے والے ہوں۔ طلبِ دائم، مقاومت دائم، جارحانہ پیشقدمی (جس میں خودی کا اثبات پایا جاتا ہے) اس تسخیر و پیکار کا مسلّم حربہ ہے۔ یہ حربہ تسخیر کے شخصی، ذہنی، اور اجتماعی سب میدانوں کے لئے ضروری ہے۔ عشق کی ہر صورت اور شوق کے ہر ہر مرحلے میں اسی سے کام چلتا ہے۔ طلب کے ہر سفر میں اسی سے ساز و برگ مہیا ہوتا ہے۔

اقبال کی شاعری میں تسخیر کائنات اور کشودِ حیات کی جو صورتیں پائی جاتی ہیں۔ وہ تو ظاہر ہی ہیں۔ غالب کے کلام میں بھی ستیز، جارحانہ پیشقدمی اور اثباتِ خودی کی صورتیں کچھ کم ہیں۔ جو ہے اس سے نا آسودگی اور ایک نئی زندگی کی تخلیق و تشکیل، اور اس کے لئے جارحانہ، اور انقلاب آفریں اندازِ فکر، غالب کی کئی غزلیات میں ملتا ہے مثلاً اس غزل میں جس کا مطلع یہ ہے ؎

بیا کہ قاعدۂ آسماں بگردانیم
قضا بہ گردشِ رطلِ گراں بگردانیم

اور مقطع یہ ؎

بمن وصالِ تو باور نمی کند غالب
بیا کہ قاعدۂ آسماں بگردانیم

اہتمام کی یہ حالت ہے کہ ؎

اگر ز شحنہ بود گیر و دار نندیشیم
وگر ز شاہ رسد ارمغاں بگردانیم
اگر کلیم شود ہم زباں سخن نہ کنیم
وگر خلیل شود میہماں بگردانیم

یا مثلاً اس غزل میں جس کا مطلع یہ ہے ؎

رفتم کہ کہنگی ز تماشا برافگنم
در بزمِ رنگ و بو نمطے دیگر افگنم

اسی غزل میں وہ مشہور شعر بھی ہے جو اقبال کے محبوب اشعار میں شامل ہے ؎

تا بادہ تلخ تر شود و سینہ ریش تر
بگدازم آبگینہ و در ساغر افگنم

غالب کا یہ مخصوص احساس ان کی ساری شاعری پر چھایا ہوا ہے۔ اور "نظارہ

دامن کو آج اس کے حریفانہ کھینچئے

کی منزل سے لے کر

بیا کہ قاعدۂ آسماں بگردانیم

تک طلب و سعی اور تگ و تاز کے ہزاروں مرحلے آتے ہیں جن میں یہی آرزوئے استیلا اور عزمِ تسخیر نظر آتا ہے۔ اسی اندازِ فکر اور طرزِ احساس نے غالب کو اقبال کی طرح عمل و توانائی کا شاعر بنا لیا ہے۔ سخت کوشی و خارا شگافی ان کے افکار کی ایک تہ موج ہے جس میں تمام

نظام فلکی کو درہم برہم کردینے کی خواہش ہے۔ ط
لئے پھرتا ہے اک دوچار جام واژگوں وہ بھی

ــــ ایک نئی دنیا آباد کرنے کا عزم اور اس کے لئے جہاد و مجاہدہ کا ارادہ بھی پورا پورا موجود ہے۔ غالب کا عشق بھی انہی رجحانات و خصوصیات کا آئینہ دار ہے اور ان کا ارتقائے روحانی بھی انہی منزلوں کی نشان دہی کرتا ہے تسلیم و رضا کا شیوہ، جو حافظ اور ان کے ہمنوا صوفیوں کا مسلک خاص ہے۔ غالب کے یہاں ذرا مشکل ہی سے ملے گا۔ ان کے یہاں تو احتجاج و شکایت کی جس جس نے ان کے اسلوب بیان میں شوخی و طنز کے زہرناک نشتر بھر دئے ہیں اتنی تند و تیز ہے کہ اس کی بنا پر بعض نے ان کے تشکک کو لادینی کے مترادف قرار دیا ہے یہی وجہ ہے کہ غالب کے ذہن میں کفر و ایمان کے متضاد تصورات پائے جاتے ہیں جو ان کے لئے بڑی کشاکش کا باعث ہوتے ہیں۔ ط
ایماں مجھے کھینچے ہے تو روکے ہے مجھے کفر

مگر دراصل یہ سب "شوخی اندیشہ" ہے۔ غالب کے افکار میں زندگی کی مادی اقدار اور جسم و صورت کے تقاضوں کو جو اہمیت ملی ہے اس کے لحاظ سے بھی غالب بیسویں صدی کے پیش رو معلوم ہوتے ہیں۔ ان کے یہاں ط
گر بمعنی نہ رسی جلوۂ صورت چہ کم است

کی صدا بے مقصد نہیں۔ ان کے احساس پر آنے والی صدی کی "صورت" پسندی اور مادیت کی پرچھائیں پڑ گئی تھی۔ اور یہ مصرع اسی رجحان کی خبر دیتا ہے:

شہرت شعرم بہ گیتی بعد من خواہد شدن

خلاصہ یہ کہ توانائی، جدل، پیکار، قوت، احتجاج، اثبات خودی، جارحانہ اقدام، اور طلب دوام و تب و تاب جاوداں کے اعتبار سے بھی اور ان افکار کے لحاظ سے بھی جن کے لئے پُرجوش اسالیب بیان کی ضرورت ہوتی ہے۔ غالب کی شاعری کو اقبال کی شاعری کی منزل اوّل قرار دیا جاسکتا ہے۔ جاوید نامہ میں اقبال نے غالب کو طاہرہ اور منصور کے ساتھ فلک مشتری میں دکھایا ہے اور ان کی شخصیت پر ان الفاظ میں تبصرہ کیا ہے ؎

غالب و حلاج و خاتونِ عجم　　شورہا افگندہ در جانِ حرم

این نواہا روح را بخشد ثبات　　گرمی او از درون کائنات

غالب کی نواکی یہی گرمی ان کو اقبال کے سلسلے کا شاعر قرار دیتی ہے۔ غالب و اقبال کی لفظی مماثلتیں بھی کچھ کم قابل توجہ نہیں ان کے ذہن و فکر کے رخ بھی عام طور پر ایک ہی ہیں۔ ان کے ادبی ارتقا کے بعض واقعات، مثلاً اردو سے زیادہ فارسی سے اعتنا اور اپنے افکار کے لئے نئے اسالیب و تراکیب کی اختراع وغیرہ بھی ان کی ذہنی وحدت کا پتہ دیتے ہیں۔ دونوں کی ذہنی ادبی تربیت کے سرچشمے بھی ایک خاص حد تک مشترک ہیں شعرائے عہد اکبری و جہانگیری کے کلام اور مغلیہ عہد کی روایات سے یہ دونوں شاعر یکساں طور پر مستفید ہوتے ہیں۔ غرض یہ اور اس قسم کے کئی اور وجوہ یہ ثابت کرنے کے لئے کافی ہیں کہ غالب کی شاعری کو اقبال کی شاعری سے وہی نسبت ہے جو نمود سحر کو طلوع آفتاب سے ہوتی ہے۔ غالب کی دوسری پیشگوئیوں کی طرح ان کی یہ پیشگوئی بھی صحیح ثابت ہوئی ؎

خارہا از اثر گرمی رفتارم سوخت
منتے بر قدمم راہروان است مرا

کتنے جوہر ہیں غربت میں پریشاں ابھی
کتنے ٹکڑے ہیں دل کے پریشاں ابھی
درد کتنے ہیں محتاج درماں ابھی
دور کتنا ہے انساں سے انساں ابھی
کتنے لب قطرۂ غم سے نادر ہیں
کتنے دیدے ہیں یارب کہ بے نور ہیں
تجھکو اس کور دنیا میں رہنا نہیں
کر دکھانا ہے کچھ صرف کہنا نہیں

(حقی)

ایک اور صنم

الطاف گوہر

پنسل اپنے لئے نئے دیوتا تراشتی ہے، پرستش میں چونکہ سوچ بچار کی زحمت نکل جاتی ہے، اسلئے کم از کم وقتی طور پر اطمینان میسر رہتا ہے۔ ان دیوتاؤں میں ہر نسل کی بصیرت اور مذاق کے مطابق کچی، "توتی، لکڑی کھوٹی سبھی قسم کی شخصیتیں ہوتی ہیں۔

آزادی کے وقت ادبی اصنام بھی بانٹے گئے، چھوٹے بڑے ہر طرح کے افسانہ نگاروں میں سے قریب قریب سب ہندوستان میں جم رہے، البتہ سعادت حسن منٹو بمبئی سے مغربی پاکستان ہجرت کر آئے۔ عصمت چغتائی کے کہنے کے مطابق اس ہجرت کا باعث منٹو کا یہ خیال تھا کہ "پاکستان میں حسین مستقبل ہے۔۔۔ وہاں ہم ہی ہم ہونگے، بہت جلد ترقی کر جائیں گے۔" اس میں بہت کچھ محض زیب داستاں بھی ہوسکتا ہے، مگر اس میں شک نہیں کہ منٹو نے پاکستان آ کر افسانہ نگاری کے علاوہ ایک برف فیکٹری بھی اپنے نام الاٹ کروالی۔ بہر حال منٹو کے آنے سے قومی ادب کے قدردانوں کی ڈھارس بندھ گئی، منٹو نے فسادات کے موضوع پر دو چار زوردار افسانے لکھے، تو لوگوں پر ان کے نئے افسانوی دیوتا کا روپ اجاگر ہونے لگا، منٹو نے بھی کھلے بندوں کہنا شروع کردیا کہ پاکستان میں اس کی ٹکر کا کوئی افسانہ نگار نہیں، جلسوں اور محفلوں میں اگر کوئی اس کے افسانوں کے بارے میں کچھ کہنا چاہتا تو وہ فوراً پوچھتا "تم افسانہ نگاری کے متعلق جانتے کیا ہو؟" سڑک پر جاتے جاتے اگر کسی گڑھے کی وجہ سے اس کا تانگہ رک جاتا تو وہ چلاتا کہ اگر میں اس گڑھے میں گر پڑتا تو پاکستان کا سب سے بڑا افسانہ نگار ہمیشہ کے لئے ختم ہو جاتا۔ معاملہ پاگل خانہ تک پہنچا، صحت بگڑتی گئی، خبر آئی ہسپتال میں ہیں۔ حالت بہت خراب ہے، ڈاکٹروں نے موت کے منہ سے بچا لیا، پھر وہی حال ہوگیا اور آخر ایک دن چل بسے۔

"ٹھنڈا گوشت" اور "بابو گوپی ناتھ" کے مصنف کی موت کی خبر سن کر کسے دکھ نہ ہوا ہوگا، مگر لوگ تو شاید اس کی موت کے انتظار میں تھے، ادھر اس نے دم توڑا ادھر بت تراشوں نے اس کے مجسمے کی نقاب کشائی کی اور کہنا شروع کیا "یہ اس دور کا دیوتا ہے آؤ ہم سب مل کر اس کی پوجا کریں!"

محمد حسن عسکری نے فیصلہ دیا "میں منٹو کو اردو کا سب سے بڑا افسانہ نگار کہتا ہوں۔" عبادت بریلوی نے کہا "منٹو اردو کا سب سے بڑا نہیں، تو بہت بڑا افسانہ نگار ضرور ہے۔" ممتاز شیریں نے یہ رائے دی کہ منٹو نہ صرف ایک فطری فن کار ہے، بلکہ بڑا ہی شعوری فن کار ہے۔ اس قسم کے جملے پچھلے دو چار مہینوں میں اتنی بار دہرائے گئے ہیں کہ مجھے یہ خوف محسوس ہونے لگا ہے کہ کچھ عرصے تک اب یہ پود محض اس دیوتا کی پرستش میں لگی رہے گی اور اس کو صحیح طور پر سمجھنے کی کوشش آئندہ پر ملتوی کردی جائیگی۔ پڑھے لکھے اہل قلم جب اس قسم کی باتیں کرنے لگیں تو یہ گمان ہونے لگتا ہے کہ وہ جو کچھ کہہ رہے ہیں، ادبی تنقید کے طور پر نہیں کسی اور خواہش کے زیر اثر کہہ رہے ہیں۔ منٹو کے معاملہ میں یہ خواہش قومی ادب کی خدمت کا خیال ہے، خدمت کا یہ جذبہ قابل ستائش ہے، مگر اس جذبے کے ساتھ تنقیدی توازن برقرار رکھنا بھی لازم ہے۔

یہاں تک پڑھ چکنے کے بعد آپ سوچینگے کہ میں یہ مضمون منٹو کے خلاف لکھ رہا ہوں اور منٹو کو ایک نہایت ادنیٰ اور معمولی افسانہ نگار ثابت کرنے کے لئے میں نے یہ تمہید باندھی ہے۔ ممکن ہے آپ میں سے بعض کو یہ خیال بھی گذرے کہ مجھے منٹو سے کوئی ذاتی عناد ہوگا جس کا بدلہ میں اس کی موت کے بعد لے رہا ہوں، اور منٹو کے پرستار تو یہ ضرور کہیں گے کہ لیجئے صاحب جنگل سے ایک افسانہ نگار ملا تھا یہ دشمن قوم اس میں بھی کیڑے ڈالنے لگے۔ میں یہ عرض کردوں کہ بدقسمتی سے مجھے منٹو سے ملنے کا اتفاق نہیں ہوا، البتہ اس کے افسانوں اور دوسری تحریروں کا میں نے نہایت احتیاط اور صدق دل سے مطالعہ کیا ہے۔ اس پر جو کچھ لکھا گیا ہے وہ بھی جہاں تک ممکن ہو سکا ہے۔ میں نے نہایت غور سے پڑھا ہے، اس لئے نہیں کہ منٹو اردو کا سب سے اچھا یا برا افسانہ نگار ہے۔ اس لئے کہ مجھے اس کی تحریر اور شخصیت دونوں کی

دلچسپی ہے۔ اچھے یا برے کی بحث ادبی تنقید میں ایک عدالتی رنگ پیدا کردیتی ہے جس سے تنقید ذاتی سی ہوجاتی ہے اور پھر یہ فیصلہ دینے کے لئے کہ کوئی ادیب اچھا یا برا ہے۔ یہ بھی تو ضروری ہے کہ اس کی تخلیقات اور اس کی شخصیت کو صحیح طور پر سمجھنے کے لئے ان کا ادبی اور فنی تجزیہ کیا جائے، تنقید میں میری دلچسپی تجزیہ کی حد تک ہے، فیصلہ دینے کی ذمہ داری قبول کرنے سے میں نے ہمیشہ احتراز کیا ہے۔ اس مضمون کی نوعیت تجزیاتی ہے مگر اس تجزیہ کی اہمیت ایک ذاتی تاثر کی سی ہے، ممکن ہے یہ تاثر ادھورا ہو اور منٹو کی ساری شخصیت کا آئینہ دار نہ ہو، مگر اس تاثر کی بنیاد ان شواہد پر ہے جو مجھے منٹو کی تحریروں اور منٹو کو جاننے والوں کے مقالوں سے ملے۔ ان شواہد کے انتخاب میں میں نے صرف انہی باتوں کو اہمیت دی ہے جو منٹو کی زندگی اور اس کی تحریروں سے بار بار ظاہر ہوتی رہی ہیں اور جن کا تعلق کسی مخصوص وقت سے نہیں بلکہ منٹو کی ساری زندگی سے تھا۔

منٹو کی ادبی شخصیت ایک مستقل بحث کی صورت اختیار کرچکی ہے، اس بحث میں گالی گلوچ، پارٹی بندی، مقدمے بازی سبھی کچھ ہوتا رہا ہے۔ منٹو کے بیشتر نقاد دشمنوں اور دوستوں کی طرح صف آرا ہیں۔ ذاتی تعلقات ہمیشہ تنقید کی راہ میں حائل ہوتے ہیں۔ ہمارے ہاں تو خاص طور پر ادبی تنقید ذاتی تعلقات ہی کے محور پر گھومتی رہی ہے، کسی شاعر سے آپ کے دیرینہ مراسم ہیں تو ظاہر ہے کہ آپ اس کے دیوان کا مقدمہ لکھیں گے۔ اور جب مراسم دیرینہ ہیں تو مقدمے میں آخر کہاں تک سچ بولیں گے۔

کسی افسانہ نگار سے آپ کی کسی محفل میں چل گئی تو اس کے بعد وہ جو کچھ لکھے گا اس میں وہ پہلی سی بات کہاں رہے گی۔ منٹو کو شاید اتنے نقاد نصیب نہیں ہوئے جتنے دوست اور دشمن۔ دشمنوں نے اپنے دل کی بھڑاس نکالی اور دوستوں نے اپنا حق ادا کیا۔ جب سے منٹو کا انتقال ہوا ہے بڑے زور شور سے عقیدت مندی کا اظہار ہو رہا ہے، منٹو کے انتخاب اور منٹو نمبر چھاپے جا رہے ہیں۔ مجھے ڈر ہے کہ منٹو کہیں اس عقیدت مندی کے بوجھ تلے سچ مچ دفن ہو کر نہ رہ جائے۔ فن کار کی موت کا اس کی فنی اہمیت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا، اور نہ فن کار کی موت اس بات کا جواز ہو سکتی ہے کہ اس کے فنی محاسن پر بحث کرتے ہوئے عقیدت کا لہجہ اختیار کر لیا جائے۔ منٹو نے میراجی کی وفات کے بعد ان پر ایک مضمون "تین گولے" لکھا، ایک صاحب نے احتجاج کیا کہ "دنیا کے ہر مہذب ملک اور ہر مہذب سماج میں یہ اصول مروج ہے کہ مرنے کے بعد خواہ دشمن ہی کیوں نہ ہو، اسے اچھے الفاظ کے ساتھ یاد کیا جاتا ہے۔" اس کے جواب میں منٹو نے اپنے مخصوص تلخ لہجے میں کہا کہ میں ایسے مہذب سماج پر ہزار لعنت بھیجتا ہوں جہاں یہ اصول مروج ہو کہ مرنے کے بعد ہر شخص کا کردار اور تشخص لانڈری میں بھیج دیا جائے جہاں سے وہ دھل دھلا کر آئے اور رحمۃ اللہ علیہ کی کھونٹی پر لٹکا دیا جائے۔" منٹو کو ایک عظیم افسانہ نگار کا مرتبہ دے کر فرطِ جذب سے آنکھیں جھکا لینا اس مرحوم فن کار پر بڑا ظلم ہوگا۔

منٹو کی تحریروں سے فن کار کی جو شخصیت ذہن میں ابھرتی ہے، اس کے کئی پہلو ہیں جن میں سے بیشتر آپس میں الجھے ہوئے ہیں۔ اس شخصیت کے پس منظر میں جو جذبات کارفرما تھے ان میں سب سے اہم تحسین و ستائش کا جذبہ تھا۔ حامد جلال نے اپنے مضمون میں بیان کیا ہے کہ منٹو کی عمر بیس برس کی تھی جب انہوں نے اسی جذبے کی تسکین کی خاطر ایک شعبدہ گر کے کہنے پر دہکتے ہوئے انگاروں پر برہنہ پا چلنا گوارا کر لیا، اور بقول حامد جلال کے منٹو کو اس واقعہ کے بعد یہ خیال ہو گیا کہ "ایک مصنف اور منفرد شخصیت کی حیثیت سے آگ پر چلنا بھی ان کی زندگی کا حصہ ہے اور غیر شعوری طور پر وہ سمجھنے لگے کہ اگر وہ ایسے کرتب نہ دکھائیں جو اتنے ہی غیر معمولی اور خطرناک ہوں جتنا آگ پر چلنا، تو کوئی ان کی تعریف نہ کرے گا۔" طرح طرح کی افواہیں پھیلا کر لوگوں کی توجہ کا مرکز بنے رہنا اسی جذبے کے اظہار کی ایک اور صورت تھی۔ منٹو اپنے پڑھنے والوں کو بار بار یقین دلاتا ہے کہ وہ جو کچھ کہتا یا کرتا ہے، کوئی آسان کام نہیں۔ خود اپنے متعلق اس نے لکھا ہے "وہ ایک ایسا انسان ہے جو صاف اور سیدھی سڑک پر نہیں چلتا بلکہ تنے ہوئے رسّے پر چلتا ہے، لوگ سمجھتے ہیں کہ اب گرا لیکن وہ کمبخت آج تک کبھی نہیں گرا۔" اسی جذبے نے منٹو کو لیڈری کی طرف مائل کیا۔ آپ کو یہ لیڈری والی بات عجیب سی معلوم ہوگی، مگر منٹو کی تحریروں میں جابجا ایسے واضح اشارے ملتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی بڑی خواہش تھی کہ لوگ اسے ایک معلّمِ قوم اور لیڈر کی حیثیت سے قبول کر لیں، اس کی ایک مثال تو حامد جلال کے مضمون سے ملتی ہے جہاں انہوں نے یہ کہا ہے کہ منٹو امرتسر کے نوجوان دانشوروں کے ایک گروہ کا لیڈر تھا۔ اس کی اپنی تحریروں میں کئی بیانات ایسے ہیں جن سے اس نظریہ کو تقویت پہنچتی ہے، مثال کے طور پر "کرچیں اور کرچیاں" کا یہ مکالمہ

> "ہندوستان کے مشہور نیتا کے داخلے پر کشمیر میں پابندی کر دی گئی ہے اور یہ طرفہ تماشہ ہے کہ یہ مشہور اور نڈر لیڈر خود کشمیری ہیں، سعادت حسن منٹو بھی کشمیری ہے"......

"ہندوستان کے مشہور اور نڈر رہنما جو کشمیری ہیں"
"زندہ باد"
"سعادت حسن منٹو"

اپنے آپ کو مصلح قوم سمجھنے کی خواہش اس مختصر سے مکالمے سے ظاہر ہے۔

"یہ کون ہے؟"
"منٹو"
"نہیں، شیخ سعدی، جو اپنے وقت کا منٹو تھا"

("اوپر نیچے درمیان")

"پس منظر" میں منٹو نے اپنے اصلاحی جذبے کا اظہار یوں کیا ہے:

"معلوم نہیں کم بخت کو ایسے گرے ہوئے انسانوں کو اٹھانے میں کیا مزا آتا ہے۔ ساری دنیا انہیں ذلیل اور حقیر سمجھتی ہے مگر وہ ان کو سینے سے لگاتا، ان کو پیار کرتا ہے"

سیاسی لیڈری میں منٹو کی دلچسپی اس سے بھی ظاہر ہے کہ اس کے افسانوں اور مضامین میں جابجا جلیانوالہ باغ کے حادثے کا بڑے ہی جذباتی انداز میں ذکر آتا ہے۔ اس کی سب سے واضح مثال منٹو کا افسانہ "۱۹۱۹ کی بات" ہے۔ اپنے ایک اور افسانہ "سوراج کے لئے" میں منٹو نے اپنے اس سیاسی جذبہ کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے: "میرا حال بھی ان دنوں بہت دگرگوں تھا، جی چاہتا تھا کہ کہیں سے پستول ہاتھ آ جائیں تو ایک دہشت پسند پارٹی بنائی جائے" افسانے کے ہیرو کا ذکر جس انداز سے منٹو نے کیا ہے اس سے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے یہ ہیرو اس کے سیاسی آدرش کا آئینہ دار ہو۔ ہیرو جلیانوالہ باغ میں تقریر کر رہا تھا اور منٹو کا ردعمل یہ تھا: "تقریباً ایک گھنٹہ تک وہ بولتا رہا۔ اس دوران میں کئی بار میرے رونگٹے کھڑے ہوئے اور ایک دو دفعہ تو میرے جسم میں بڑی شدت سے یہ خواہش پیدا ہوئی کہ میں بم کی طرح پھٹ جاؤں ......"

ابو سعید قریشی، منٹو کو طالب علمی کے زمانے سے جانتے تھے، ان کے مضمون "رحمدل دہشت پسند" میں منٹو کی طبیعت کے اس رجحان کی طرف یہ اشارہ ملتا ہے "متحرک تصویروں کی کہانیوں پر بحث کرنے کے بجائے انگریزوں کو ملک سے نکالنے کے پلاٹ سوچتے، دہشت پسندی کی داستانوں میں ہمیں لطف آتا، تختہ حکمرانوں کا تختہ الٹنے والوں کے آئینوں میں بھی ہمیں اپنا عکس نظر آنے لگا۔ ہم نے اپنی چشم تصور میں امرتسر کے گلی کوچوں کی ناکا مورچہ بندی کی اور انقلاب زندہ باد کے نعرے لگاتے ہوئے انگریزوں پر ٹوٹ پڑے" انہی منصوبوں کے کھلونوں کا ذکر خود منٹو نے اپنے مضمون "باری صاحب" میں ان الفاظ میں کیا ہے۔ "ہمارے خلیفہ صاحب یعنی باری صاحب اگر بزدل نہ ہوتے تو یقیناً ہم چاروں اس زمانے میں ان کھلونوں سے اپنا جی بہلانے کے جرم میں پھانسی پا گئے ہوتے اور امرتسر کی خونیں تاریخ میں ایسے شہیدوں کے نام کا اضافہ ہو گیا ہوتا جو اب خلوص دل سے کہہ سکتے ہیں کہ ان کو اس وقت اپنے اس جوش کے رخ کا بھی صحیح علم نہ تھا۔

منٹو کی باغیانہ طبیعت پر بحث کرتے ہوئے ابو سعید نے یہ کہا ہے "لیکن بغاوت کی وہ چنگاری جو سعادت کے سینے میں سلگ رہی تھی، دبی نہ رہ سکی، باپ کی بے رخی، بھائیوں کی بے اعتنائی اور عزیزوں کی ستم ظریفی سے جو شعلہ بھڑکا تھا زمانے کے حوادث نے اسے ہوا دی اور وہ معاشرے کے دیمک خوردہ شہتیروں کو چاٹنے لگا، اس کے قلم کی روشنائی لاوا بنکر بہہ نکلی، جن لوگوں کے گھر اس کے راستے میں آئے وہ چیخ اٹھے، انہوں نے قانون کو مدد کے لئے پکارا، مذہب اور اخلاق کے فائر بریگیڈ کو حرکت میں لائے لیکن لاوا نہ رکا، آگ نہ بجھی"

اس جذبہ کے سارے نفسیاتی پہلوؤں کا صحیح طور پر مطالعہ اور تجزیہ کرنے کے لئے ضروری ہے کہ منٹو کی زندگی کی پوری تفصیلات مہیا کی جائیں مگر جو اقتباسات میں نے پیش کئے ہیں ان سے یہ ضرور واضح ہو جاتا ہے کہ اس جذبے کی منٹو کی زندگی میں بڑی گہری اہمیت تھی۔ اس جذبے کے زیر اثر منٹو آخر تک سیاسی قسم کے مضامین اور خط لکھتا رہا چچا سام کے نام اس کے خط اسی جذبے کی آخری جھلک تھے۔ ظاہر ہے کہ اس جذبے نے منٹو کے فکر اور اسلوب دونوں پر اپنا اثر چھوڑا ہوگا۔ یہ اثر دہشت پسندی اور ذاتی شہرت افزائی کی شکل میں منٹو کی تحریروں میں جابجا ملتا ہے۔

آگے چل کر سیاسی لیڈری اور مصلح قوم بننے کے جذبے نے جو روپ دھارے اور جس طرح یہ جذبہ منٹو کے تخلیقی عمل پر اثر انداز ہوا، اس کا ذکر میں بعد میں کروں گا فی الحال ان شواہد کی مدد سے اس جذبہ کی اصلیت اور نوعیت واضح کرنا مقصود ہے۔ ایک دفعہ منٹو نے ہندو مسلم فسادات پر ایک اشک آور اپیل شائع کر دی جس میں نہایت سستے لیڈرانہ انداز میں یہ کہا کہ "قصر آزادی کی تعمیر فرقہ وارانہ فسادات کے شکار انسانوں کے لہو اور خود غرض لیڈروں کے نمائشی پروپیگنڈے سے نہیں ہو سکتی" اس سستے لیڈرانہ انداز کی

ایک اور مثال منٹو کے مضمون "مجھے شکایت ہے" میں ملتی ہے۔ اس مضمون میں یہ مطالبہ کیا گیا ہے کہ ادیبوں کو ان کی تحریروں کا مناسب معاوضہ ملنا چاہئیے، مطالبہ کا انداز یہ ہے۔

"آؤ ہم اپنا ایک محاذ بنائیں، سب اکٹھے ہو جائیں، اگر ہم سب اپنے قلم ایک جگہ پر رکھ دیں تو ایک پہاڑ کھڑا ہو سکتا ہے، کیوں نہ ہم تعاون سے اس بدعت کے خلاف آواز بلند کریں جو ہمارے وقار پر ایک بدنما دھبہ ہے، حضرات حالات بہت نازک ہو گئے ہیں ..... میں کہتا ہوں، اٹھو، اپنے سوئے ہوئے بھائیوں کو جھنجھوڑو، ان کے کانوں تک میرا پیغام پہنچاؤ۔ ایک جھنڈے تلے جمع ہو جاؤ ...... "

منٹو نے اپنے ادبی رفیقوں اور سیاسی کارکنوں کو جو پیغام دیئے ان کا کوئی اثر نہ ہوا، وہ نہ کوئی ادبی جماعت بنا سکا اور نہ کسی سیاسی تحریک کی رہنمائی کر سکا، اس کی وجہ یہ تھی کہ منٹو کے پاس کوئی ایسا نظام فکر نہ تھا جو کسی سیاسی یا ادبی تحریک کا باعث بن سکتا، منٹو نے جتنے علمی قسم کے مضامین لکھے ان میں ایک جذباتی رنگ تو ضرور ہے مگر خیال اور فکر کی قطعی کوئی گہرائی نہیں۔ "تجدید اسلحہ"، "عصمت فروشی"، "گناہ کی بیٹیاں، گناہ کے باپ" اور اس قسم کے کتنے ہی اور مضامین جو منٹو نے لکھے ان کی علمی سطح بہت ہی پست ہے، ان مضامین کو پڑھ کر کہیں بھی یہ احساس نہیں ہوتا کہ مصنف نے اپنے موضوع کا گہرا مطالعہ کیا ہے، یہی حال منٹو کے طنزیہ اور ڈرامائی مکالموں اور خاکوں کا ہے۔

میں نے ابھی یہ عرض کیا کہ منٹو کے پاس کوئی انفرادی نظام فکر نہ تھا، اور اسی کمی کی وجہ سے منٹو کی شخصیت کے ایک اہم مطالبے کی تسکین نہ ہو سکی، اس تشنگی نے مطالبہ کی نوعیت بدل دی اور اب منٹو نے اپنے آپ کو متعجب کر دا کر مرکز توجہ بنانا چاہا۔ بقول حامد جلال، اپنے افسانوں کے پہلے مجموعے کے متعلق منٹو نے ناشر کو یہ ہدایت خاص طور پر دی کہ گرد پوش اس کا خاکہ ایسا بنایا جائے کہ لوگ مشتعل ہو کر گالیاں دینے لگیں، اس میں جب اسے کامیابی ہوئی تو منٹو نے اپنے آپ کو ایک ایسی شخصیت تصور کر لیا جو سماجی نظام کو منہدم برہم کرنے پر مصر ہو، اپنی تحریروں میں اس نے یہ ظاہر کرنا شروع کیا کہ اس کا مقصد روایتی کڑیوں کو توڑنا، روایتی رنگوں کو مٹانا، اور ذہن کو روایتی بندھنوں سے آزاد کرنا ہے۔ منٹو نے خوش ہو کر یہ بات دہرائی کہ "عصمت" نے اس کے متعلق کچھ ٹھیک ہی کہا تھا کہ منٹو کو عجیب و غریب تہلکہ ڈال دینے والی اور سوتوں کو چونکا دینے والی چیزوں سے بڑی رغبت ہے، وہ سوچتا ہے اگر بہت سے لوگ سفید کپڑے پہنے بیٹھے ہوں اور کوئی کیچڑ مل کر وہاں چلا جائے تو سب ہکا بکا رہ جائیں گے۔ سب لوگ رو پیٹ رہے ہوں، وہاں ایک اونچا قہقہہ لگا دو تو سب دم سادھ کر تکر تکر منہ دیکھنے لگیں گے۔ بس دھاک بیٹھ جائے گی، سکہ جم جائے گا" جذبے کی اس کیفیت کا منٹو کے افسانوں اور ان کے اسلوب بیان پر بڑا گہرا اثر پڑا، اور اسی کی مدد سے منٹو نے اپنی فکری زندگی میں ایک قدر پیدا کر لی۔ وہ قدر یہ تھی کہ دیکھنے میں جو چیزیں بھلی معلوم ہوتی ہیں ان کی تہ میں کوئی نہ کوئی برائی ضرور ہوتی ہے اور جو چیزیں عام طور پر بری سمجھی جاتی ہیں ان میں کوئی نہ کوئی خوبی نہاں ہوتی ہے۔ اپنے متعلق ممتاز حسین کی یہ رائے بھی منٹو کو پسند آئی کہ "وہ نیکی کی تلاش میں نکلتا ہے اور اس کی ایک کرن ایسے انسان کے پیٹ سے نکالتا ہے جس کے بارے میں آپ اس قسم کی کوئی توقع ہی نہیں رکھتے"۔ فکری نقطہ نظر سے یہ قدر بھی ایک روایتی سی بات ہے، منٹو نے اس قدر کی ترجمانی میں بیان اور اظہار کے کچھ نئے اور موثر طریقے ضرور نکالے ہیں، مگر خیال اور فکر کے اعتبار سے اس میں کوئی اضافہ نہیں کیا۔ اس کی بنیادی وجہ شاید یہ تھی کہ طبعاً منٹو ایک بھلے مانس قسم کا انسان تھا، جس کی شخصیت میں روایتی قدریں اور روایتی مطالبے کارفرما تھے اور محض شخصی امتیاز کی خاطر اس نے اپنی تحریک میں روایتی قدروں اور روایتی مطالبوں کے خلاف احتجاج کرنا شروع کر دیا، ان روایتی قدروں اور مطالبوں کی جگہ پر کرنے کے لیے منٹو اگر کوئی نیا نظام فکر یا نئی قدر پیش کر سکتا تو اس کی تحریروں میں نہ تلخی رہتی اور نہ شخصی امتیاز حاصل کرنے کی ناقابل ضبط خواہش اس کی سادہ شخصیت کو تڑپائے رکھتی۔ انانیت اور شخصی امتیاز کی خواہش نے منٹو کی زندگی میں آخری دم تک شور و غوغا برپا کئے رکھا۔ منٹو کی زندگی کے اس پہلو پر سب سے دلچسپ مضمون اپندر ناتھ اشک کا "منٹو میرا دشمن" ہے۔ اس مضمون میں اشک نے ایک جگہ کہا ہے "پارٹی ہو، میٹنگ ہو، فارمل یا انفارمل منٹو ہمیشہ پیش پیش رہنا پسند کرتا تھا۔ اگر کسی پارٹی یا محفل میں کوئی دوسرا آدمی لوگوں کی توجہ مبذول کرے تو وہ بڑی خاموشی سے بغیر کسی کو بتائے کھسک جاتا تھا"۔

منٹو کی ذہنی اور فکری شخصیت کے یہ پہلو میں نے کسی قدر وضاحت سے اس لیے پیش کیے ہیں کہ ایک افسانہ نگار کی حیثیت سے ان پر بحث کرتے ہوئے اس کے تخلیقی عمل کے مختلف عناصر کا صحیح طور پر جائزہ لیا جا سکے۔ منٹو نے ڈھائی تین سو افسانے اور خاکے لکھے ہوں گے، ان میں سے بیشتر مختلف مجموعوں میں شامل ہیں، ان میں سے کئی ایسے ہیں جو محض صحافتی اور

کاروباری نقطۂ نظر سے لکھے گئے۔ خصوصاً مزاحیہ خاکے جن میں طنز اور مزاح کا معیار عام اخباری سا ہے، مثلاً "طویلے کی بلا"۔ "دیواروں پر لکھنا"۔ "بن بلائے مہمان"۔ "ناک کی قسمیں"۔ ان کے علاوہ آخری دور کے وہ افسانے بھی ہیں جو منٹو نے بلا سوچے سمجھے محض روپیہ حاصل کرنے کی خاطر لکھے۔ اس دور میں منٹو نے ایک ہی افسانے کو مختلف عنوانات دے کر یا اپنے کسی ڈرامے کو افسانے کی شکل دے کر ناشروں کا مضحکہ بھی اڑایا۔ اور اگر محمد اسد اللہ نے اپنی کتاب "منٹو میرا دوست" میں جو کچھ لکھا ہے وہ صحیح ہے، تو منٹو نے اور لوگوں کے افسانے بھی اپنے نام سے ناشروں کے ہاتھ بیچے۔ اس کے ریڈیائی ڈراموں کے متعلق تو کئی لوگ یہ کہتے ہیں کہ وہ ادھر ادھر کے انگریزی رسالوں میں چھپے ہوئے ڈراموں اور افسانوں کا چربہ ہیں، مگر یہ بات ابھی تحقیق طلب ہے، ان سب باتوں کے باوجود اس میں شک نہیں کہ منٹو نے جو کچھ بھی لکھا اس میں ایک انفرادی رنگ ضرور ہے۔

موضوع کے اعتبار سے منٹو کے افسانے ان چار قسموں میں تقسیم ہو سکتے ہیں:

(الف) وہ افسانے جن کا تعلق کسی علمی یا فکری موضوع سے ہے۔

(ب) فسادات سے متعلق افسانے

(ج) خالص جنسی افسانے

(د) ایک مخصوص ماحول اور کردار کے افسانے

پہلی قسم کے افسانوں میں قابل ذکر "سرکنڈوں کے پیچھے" ہے۔ افسانے میں چار کردار ہیں، سردار، اس کی بیٹی نواب، ہیبت خاں اور وہ عورت شاہینہ جو کہتی ہے "میرا نام ہلاکت ہے"۔ نواب کا کردار ایک ایسی فاحشہ عورت کا ہے جس کو اس امر کا قطعاً احساس نہ تھا کہ وہ گناہ کی زندگی بسر کر رہی ہے ...... اس کے جسم میں خلوص تھا، وہ ہر مرد کو جو اس کے پاس ہفتے، ڈیڑھ ہفتے کے بعد طویل مسافت طے کر کے آتا تھا، اپنا آپ سپرد کر دیتی تھی۔ اس لئے کہ وہ یہ سمجھتی تھی کہ ہر عورت کا یہی کام ہے اور وہ اس مرد کی پوری سازش، اس کے ہر آرام کا خیال رکھتی تھی"۔ ہیبت خاں کیلئے نواب ایک بے پناہ کشش تھی، مگر ہیبت خاں کو ایک خوف سا لگا رہتا تھا، افسانے کا بیشتر حصہ نواب اور ہیبت خاں کے تعلق کے بارے میں ہے۔ آخر میں افسانہ یک لخت پلٹا کھاتا ہے اور ہیبت خاں ایک ہفتہ تک غائب رہنے کے بعد جب نواب سے ملنے آتا ہے تو اس کے ساتھ ایک نوجوان اور خوبصورت عورت ہے، یہ عورت آتے ہی افسانے کے سارے ماحول پر چھا جاتی ہے اور دراصل اس خوف کی علامت ہے جو ہر وقت ہیبت خاں کو لگا رہتا تھا۔ وہ سردار اور ہیبت خاں دونوں کو باہر نکال دیتی ہے اور نہایت اطمینان سے نواب کو مار کر اس کا گوشت اس کی ماں کو پکانے کے لئے دے دیتی ہے۔ ہیبت خاں یہ سب کچھ چپ چاپ برداشت کر لیتا ہے۔ محض اس لئے کہ یہ عورت" اس کی زندگی کی سب سے پہلی عورت تھی"۔ وہ اس کے حکم کے نیچے شاید اس لئے دب کے رہ گیا تھا کہ وہ بالکل اناڑی تھا۔" ہیبت خاں جب زور سے چلا کر یہ کہتا کہ تم نے یہ کیا کیا، تو وہ مسکرا کر جواب دیتی ہے "جانِ من یہ پہلی مرتبہ نہیں۔ دوسری مرتبہ ہے، میرا خاوند اللہ اسے جنت نصیب کرے، تمہاری طرح ہی بے وفا تھا، میں نے خود اس کو اپنے ہاتھوں سے مارا تھا اور اس کا گوشت پکا کر چیلوں اور کوّوں کو کھلا یا تھا تم سے مجھے پیار ہے، اس لئے میں نے تمہارے بجائے ......"

نواب کا کردار افسانہ نگار نے اپنے ایک پسندیدہ نظریہ کے مطابق ڈھالا ہے اور وہ نظریہ یہ ہے کہ وہ لڑکیاں جو طوائفوں کے ماحول میں پلتی ہیں ان کے دل میں اپنی زندگی کے بارے میں کوئی گناہ کا احساس نہیں ہوتا، نواب چونکہ سرکنڈوں کے اس پار کی دنیا سے ناواقف ہے، اس لئے وہ اپنی دنیا کو بغیر کسی جھجک کے قبول کر لیتی ہے۔ ہیبت خاں، جس کا قد چھ فٹ ہے، اس لئے دبکا رہتا ہے کہ وہ اپنی زندگی کی سب سے پہلی عورت کے سامنے سر نہیں اٹھا سکتا، شاہینہ وہ روایتی عورت ہے جو رقابت کے جذبے کے زیر اثر قتل کرنے سے بھی گریز نہیں کرتی۔ افسانہ میں یہ تین کردار جو مختلف نظریوں کے حامل ہیں، علیحدہ علیحدہ رہتے ہیں اور کہیں بھی ان کے آپس میں ملنے سے کوئی ایسی کیفیت پیدا نہیں ہوتی جسے افسانے کا مرکزی نقطہ کہا جا سکے اور نہ ان تینوں میں سے کوئی اپنے نظریے کی ایسی ترجمانی کرتا ہے کہ پڑھنے والے کو اس کی سچائی کا یقین آ سکے۔ ممتاز شیریں نے اس افسانے کے تینوں کرداروں پر بڑی طویل بحث کی ہے اور ان کے رشتے افسانوی ادب کے بعض معروف کرداروں سے ملائے ہیں، مگر اس بات کا اعتراف انہوں نے بھی کیا ہے کہ افسانہ کا انجام میلوڈرامائی اور تاثر کے لحاظ سے ناکام ہے۔

اس طرح کے دوسرے افسانوں میں بھی جہاں کہیں منٹو نے کسی مخصوص نظریئے کی ترجمانی کے لئے کرداروں کو علامتوں کے طور پر استعمال کیا ہے وہاں نہ تو کردار ہی قائم ہو سکے ہیں اور نہ نظریئے کی وکالت ہوئی ہے۔ ایسے افسانوں کا انجام عموماً میلوڈرامائی انداز سے ہوا، "فرشتہ"۔ "اولاد"۔ "خالد میاں"۔ "پڑھیے کلمہ"۔ "حسن کی تخلیق" اور "بادشاہت کا خاتمہ" اس کی مثال ہیں۔ "حسن کی تخلیق" میں شاہدہ

اور شاہد احساس حسن اور خود پسندی کی علامتیں ہیں۔ ان دونوں کی شادی سے جو بچہ ہوا اس کے سر پہ سینگ اور ماتھے پہ ایک آنکھ تھی۔ "بادشاہت کا خاتمہ" ایک ایسے کردار کی کہانی ہے جس کی زندگی کی حسرت عورت کی محبت تھی۔ ٹیلیفون پہ ایک اجنبی عورت اس سے اظہارِ محبت کرتی ہے، ٹیلیفون پر بڑی عجیب گفتگو ہوتی رہتی ہے، مگر افسانہ نگار محبت کی بھوک کے نظریے کے ترجمان کردار سے جب کوئی خاطر خواہ افسانوی صورتِ حال پیدا نہیں کر سکتا تو اسے ٹیلیفون کے پاس ہی اوندھے منہ گرا کر ختم کر دیتا ہے۔

بعض جنسی موضوع بھی منٹو نے جب ایک فکری معیار پر لا کر اپنے افسانوں میں پیش کئے تو ان کا انجام بھی میلوڈرامائی ہو کر رہ گیا۔ اس کی سب سے واضح مثال "ننگی آوازیں" ہے۔ افسانہ ایک نفسیاتی الجھن کے متعلق ہے۔ یہ الجھن افسانے کے مرکزی کردار کے ذہن میں رات کے اندھیرے میں آس پاس چارپائیوں پر پڑے ہوئے لوگوں کی آوازیں سن کر پیدا ہوتی ہے، وہ آوازیں "جو فوراً تصویر بن کر اس کی آنکھوں کے سامنے سے گزر جاتی تھیں"۔ اس الجھن میں پھنس کر یہ کردار اپنی جنسی صلاحیت کھو بیٹھتا ہے۔ یہاں تک تو بات سمجھ میں آ سکتی ہے مگر افسانہ نگار نے اختتام پر جو قطعی غیر ضروری میلوڈرامائی کیفیت پیدا کر دی ہے اس سے افسانے کے مرکزی نظریے کا کوئی تعلق نہیں۔ بھولو کو جب پتہ چلا کہ اس کے بھائی اور بھاوج کو اس کی حالت کا علم ہو چکا ہے تو وہ "اٹھا اور کوٹھے پر چڑھ کر جتنے ٹاٹ لگے تھے اکھاڑنے شروع کر دیئے، کھٹ کھٹ پھٹ پھٹ سن کر لوگ جمع ہو گئے انہوں نے اس کو روکنے کی کوشش کی تو وہ لڑنے لگا، بات بڑھ گئی، کسی نے بانس اٹھا کر اس کے سر پہ دے مارا، بھولو چکرا کر گرا اور بے ہوش ہو گیا، جب ہوش آیا تو اس کا دماغ چل چکا تھا، اب وہ الف ننگا بازاروں میں گھومتا پھرتا ہے، کہیں ٹاٹ لٹکا دیکھتا ہے تو اس کو اتار کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا ہے۔"

یہاں منٹو کے ایک میلوڈراما "اس منجدھار میں" کا ذکر بے محل نہ ہوگا۔ اس ڈرامے کے متعلق ممتاز شیریں کی یہ رائے ہے کہ "اگر کوئی اس منجدھار میں کی گہرائیوں کو سمجھ سکے تو اسے یہ احساس ہوگا کہ اس میں منٹو نے منفی عناصر کو، جن میں زندگی کی قوت نہیں، عدم اور فنا کی طرف جاتے ہوئے دکھایا ہے اور ان اثباتی عناصر کو آپس میں ملایا ہے جن سے حیات کی تجدید ہوتی ہے اور زندگی آگے بڑھتی ہے۔" منٹو کا یہ میلوڈراما زندگی کی ایک ایسی کیفیت کو پیش کرتا ہے جو پہلے بھی مختلف صورتوں میں ادبی اظہار کا موضوع بن چکی ہے۔ ایک حسین بیوی، اس کا مفلوج شوہر، شوہر کا تندرست بھائی جو بیوی کے لئے ذریعہ نجات بنتا ہے، اور ایک بدصورت خادمہ جو مفلوج مرد کا ساتھ دیتی ہے۔ یہ ہیں وہ چار کردار جن پر منٹو نے اپنے میلوڈراما کی بنیادیں رکھی ہیں۔ ممتاز شیریں نے مفلوج شوہر اور خادمہ کو منفی عناصر قرار دیا ہے، جو فنا ہو جاتے ہیں اور حسین بیوی اور بھائی کو اثباتی عناصر کہا ہے جن سے حیات کی تجدید ہوتی ہے۔ مرکزی سوال منفی اور مثبت عناصر کی کشمکش نہیں ہے، ایک مفلوج شوہر کی نفسیاتی الجھن کا حل کرنا ہے۔ ڈرامہ میں اثباتی عناصر یعنی مجید اور سعیدہ ساتویں منظر کے آخر میں ایک لمحہ کے لئے الجھے دکھائی دیتے ہیں۔ مجید چاہتا ہے کہ جب تک اس کا بھائی زندہ ہے وہ کہیں اور چلا جائے، مگر سعیدہ "ایسا نہ کہو مجید۔ اتنے ظالم مت بنو" کہہ کر اسے روک لیتی ہے۔ ان دونوں کے بڑھتے ہوئے تعلقات ڈرامہ میں دوسرے کرداروں کے ذریعے واضح کئے گئے ہیں۔ ڈرامہ نگار نے کہیں ان دو کرداروں کو وہ اہمیت نہیں دی جس سے یہ احساس ہو کہ وہ اثباتی عناصر کو تجدیدِ حیات کا باعث بنا کر پیش کر رہا ہے، خاص طور پر سعیدہ کا کردار تو محض اس کے مفلوج شوہر کی بے چارگی کو اور زیادہ گہرا بنانے کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔ چوتھے منظر کے آخر میں جب امجد، سعیدہ سے کہتا ہے کہ وہ محض بہلاوے کے طور پر اس کے پاس لیٹ جائے تو سعیدہ اس پر رحم کھا کر اس کی یہ درخواست قبول کر لیتی ہے۔ سعیدہ کے رویہ سے کہیں یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ امجد کے مسائل میں اس کی ذات بھی شریک ہے۔ وہ تمام ڈرامہ میں ایک حسین اجنبی کی طرح دور دور رہتی ہے ڈرامہ نگار کو دراصل سعیدہ کے مسئلے کا نہ کوئی گہرا احساس تھا اور نہ اس سے ہمدردی ہی تھی، لہٰذا وہ سعیدہ کے رویے کو قابلِ نفرین بنا کر امجد کو اس کی خادمہ اصغری کی طرف دھکیل دیتا ہے۔ چوتھے منظر کی بہ نسبت آٹھویں منظر کا وہ حصہ جس میں امجد اور اصغری ایک دوسرے کے قریب آ جاتے ہیں کہیں زیادہ ہمدردی اور احتیاط سے لکھا گیا ہے۔ ڈرامہ کا انجام یہ ہوتا ہے کہ امجد اور اصغری کھڑکی سے اندھیرے میں کود کر خودکشی کر لیتے ہیں اور امجد یہ کہتے ہوئے "میری پیاریاں، میری پیاری پیاریاں، میری پیاری اصغری"! جان دے دیتا ہے۔ ڈرامہ کا انجام ہی یہ بتاتا ہے کہ جو مسئلہ اس نے انتخاب کیا، منٹو کے پاس اس کا کوئی حل نہ تھا۔ ڈرامہ میں اصغری، امجد کی ذہنی اذیت کا باعث بن جاتی ہے اور خود اس کا اپنا کردار نامکمل رہتا ہے۔ ڈرامہ میں کہیں بھی یہ احساس نہیں ہوتا کہ وہ اثباتی عناصر تحریک میں

اگر کسی خاص مقصد کو اپنانا چاہتے ہیں مجید اور سعیدہ دونوں جامد کردار ہیں جن کے بے جان ہونے کا پورا احساس ڈرامے کو اسٹیج پر دیکھ کر ہی ہو سکتا ہے۔

فکری یا نظریاتی تحریروں میں منٹو کی سب سے پُر اثر چیز اس کا افسانہ "نیا قانون" ہے۔ اس میں فکر یا نظریہ کی کوئی گہرائی تو نہیں، مگر جس جذبہ کا اظہار کیا گیا ہے وہ ایک خاص ماحول کا آئینہ دار ہے۔ ایک ایسا ماحول جس سے منٹو جس کی روح میں جلیانوالہ باغ کی یاد تازہ تھی، پوری طرح آشنا تھا اور جس کو درہم برہم کرنے کے لئے وہ مدتوں تڑپتا رہا۔ استاد منگو جب گورے کو دھڑا دھڑ پیٹ کر رکھ دیتا ہے، تو اس سے منٹو کے دل میں جو انتقام کی خواہش برسوں سے پل رہی تھی، اس کی شدت کا پتہ چلتا ہے۔

فسادات کے موضوع پر منٹو نے "ایک اشک آلود اپیل" کے علاوہ بہت کچھ لکھا۔ جہاں کہیں نظریہ اور خیال کو چھوڑ کر منٹو نے کوئی سیدھا سادا واقعہ بیان کیا ہے وہ ضرور اپنا اثر چھوڑ گیا ہے۔ فسادات کے افسانوں میں "رام کھلاون"۔ "سہائے" اور "ڈار لنگ" پُر اثر افسانے ہیں۔ ہیروئن کی ذات کو ایک نظریاتی رنگ میں پیش کرنے کے لئے افسانہ نگار کو میلو ڈراما کا سہارا لینا پڑا۔ افسانہ دراصل وہیں ختم ہو جاتا ہے جہاں ہیروئن کچھ دیر گردن جھکائے کھڑی رہنے کے بعد دروازہ کھول کر باہر چلی جاتی ہے۔ اس کے بعد افسانہ نگار اور "س" میں اس کی ذات کے متعلق جو مزید گفتگو ہوتی ہے، وہ غیر ضروری ہے اور اسی گفتگو کے دوران میں افسانہ نگار ہمیں یہ بھی اطلاع دیتا ہے کہ وہ عورت جب چلی گئی تو اس کی موٹر سے کوئی حادثہ پیش آیا اور وہ مر گئی۔

"سیاہ حاشیے" کے دیباچہ میں محمد حسن عسکری نے لکھا ہے: "فسادات کے متعلق جتنے بھی افسانے لکھے گئے ہیں، ان میں منٹو کے یہ چھوٹے چھوٹے لطیفے سب سے زیادہ ہولناک اور سب سے زیادہ رجائیت آمیز ہیں۔ منٹو کی دہشت اور منٹو کی رجائیت سیاسی لوگوں یا انسانیت کے نیک دل خادموں کی دہشت اور رجائیت نہیں ہے، بلکہ ایک فن کار کی دہشت اور رجائیت ہے۔ اس کا تعلق بحث و تمحیص یا تفکر سے نہیں ہے بلکہ ٹھوس تخلیقی تجربے سے۔ یہی منٹو کے ان افسانوں کا واحد امتیاز ہے۔" "سیاہ حاشیے" کے افسانوں اور لطیفوں میں منٹو کا مشاہدہ ذاتی اور بلاواسطہ تھا، جسے منٹو نے خام مواد کی طرح بغیر کوئی جذباتی یا نظریاتی رنگ دئے پیش کر دیا۔

فسادات کے افسانوں میں "ٹوبہ ٹیک سنگھ" ایک خاص اہمیت رکھتا ہے، اس لئے کہ اس افسانہ میں منٹو ایک معمولی سے واقعہ کو ایک ایسا رنگ دے دیتا ہے کہ انسان ایک لمحہ کے لئے پھر سے وہ ذہنی توازن حاصل کر لیتا ہے جو فسادات کے زمانے میں جذباتیت کی بنا پر مفقود ہو چکا تھا۔ منٹو کے افسانے "کھول دو" پر بڑی لے دے ہوئی، اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ منٹو نے جو کردار پیش کیا تھا اسے قبول کرنے کو ذہن تیار نہ تھا، یہ کردار فسادات کا نہایت ہی عام سا کردار تھا جس کی مظلومیت اور معصومیت دونوں مسلمہ تھیں۔ البتہ افسانہ نگار نے کہانی کو کچھ اس طرح ختم کیا کہ لوگ بنیادی جذبے کو چھوڑ کر محض ان دو الفاظ "کھول دو" سے چونک کر رہ گئے۔ یہ کہانی منٹو کی دہشت پسندی کی نذر ہو گئی۔ افسانہ نگار کردار کی طرف توجہ دینے کے بجائے سارا وقت ان دو الفاظ کے استعمال کے لئے زمین تیار کرنے میں لگا رہا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ تو چونک اٹھے مگر کہانی کا جمال اور مرکزی کردار دونوں سطحی اور دھندلے دھندلے سے ہو کر رہ گئے۔

جہاں تک عام پڑھنے والوں کا تعلق ہے، وہ منٹو کو اس کے جنسی افسانوں کی وجہ سے جانتے ہیں۔ انہی افسانوں کی وجہ سے منٹو مشہور بھی ہوا اور انہی کی وجہ سے اس کی زندگی میں مصیبتیں بھی آئیں۔ "بو"، "دھواں"، "کالی شلوار"، "ٹھنڈا گوشت" ان افسانوں میں سے ہیں جن پر وقتاً فوقتاً فحاشی کا الزام لگتا رہا ہے۔ ان میں سے پہلے تین "لذتِ سنگ" میں ہیں اور اسی مجموعے میں منٹو کے وہ مضامین بھی ہیں جو اس نے جنسی ادب اور فحاشی کے متعلق لکھے۔ "ٹھنڈا گوشت" پر منٹو نے بڑی تفصیل سے بحث کی ہے جو "زحمتِ مہرِ درخشاں" کے عنوان سے اس کے افسانوں کے مجموعے "ٹھنڈا گوشت" میں شامل ہے۔ فحاشی کے مسئلے پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ میری رائے میں فحاشی کا مسئلہ ایک اخلاقی مسئلہ ہے، ادب کا تعلق اظہار اور ذوق سے ہے اور ادب کی قدروں کو کسی مخصوص اخلاقی قدر کے پابند یا ماتحت نہیں کہا جا سکتا۔ ایک ادبی شاہکار کی جانچ پرکھ، اظہار اور ذوق ہی کے معیار پر کی جا سکتی ہے۔ کسی زمانے کے ذوق اور اظہار کی اقدار میں بالواسطہ اخلاقی اقدار کے بعض عناصر بھی شامل ہوتے ہیں، گو ان عناصر کی ان اقدار میں اہمیت متعین کرنا آسان نہیں۔ خالص ادبی اور فنی اصولوں کے علاوہ تاریخی اور سماجی شعور، اخلاقی احساس، اور ذہنی مطالبوں کی گونج سب مل جل کر ایک خاص زمانے کے ذوق اور اظہار کی اقدار کی ترتیب دیتے ہیں۔ اس امتزاج میں یہ سب عناصر کچھ ایسے گھل مل جاتے ہیں کہ ان کو علیحدہ کرنا اور انفرادی حیثیت سے پرکھنا ممکن نہیں رہتا۔ اعلیٰ ذوق میں ان عناصر کی ترتیب ایسی متوازن ہوتی ہے کہ وہ اپنے وقت کی مکمل ترجمانی کر سکتا ہے، ادنیٰ یا پست ذوق میں کوئی خاص عنصر دوسروں پر

اس طرح حاوی ہو جاتا ہے کہ ترتیب غیر متوازن اور اس کا دائرہ محدود ہو جاتا ہے۔ ایک ادبی تخلیق کو صحیح طور پر ذوق اور اظہار کی اقدار کے مطابق ہی سمجھا جا سکتا ہے۔ ان اقدار میں حسن اور سچائی کی اقدار شامل ہوتی ہے لیکن کسی ادبی تخلیق کو اگر سچائی کے اصولوں پر ہی پرکھا جائے تو ظاہر ہے کہ اس تخلیق کے ساتھ پورے طور پر انصاف نہیں ہوگا۔ اس کے برعکس ایک تاریخی مقالے کی صحیح وقعت سچائی ہی کے اصولوں کے مطابق قائم کی جا سکے گی۔ اسی طرح کسی ادبی تخلیق کو کسی مخصوص اخلاقی قدر کی روشنی میں جانچنا یا اس قدر میں اس تخلیق کا جواز ڈھونڈنا مناسب ادبی تنقید قرار نہیں دیا جا سکتا۔

منٹو کے جنسی افسانوں پر عام طور پر جو اعتراض کئے جاتے ہیں ان کی نوعیت اخلاقی ہے۔ ان اعتراضات کے جو جواب منٹو نے دیئے وہ بھی اخلاقی ہیں۔ معترضین کی طرف سے کہا گیا کہ افسانوں میں مرد اور عورت کے رشتے کو جس طرح بیان کیا گیا ہے اس سے ذہن پر غیر اخلاقی اثر پڑتا ہے۔ اس کا جواب منٹو نے یہ دیا کہ اس کے افسانے تندرست اور صحت مند لوگوں کے لئے ہیں، اگر انہیں اچھی طرح پڑھا جائے تو ان سے ان کے اخلاق پر یقیناً اچھا اثر پڑے گا۔ "ٹھنڈا گوشت" کے سلسلے میں منٹو نے اخلاقی جواز پیش کیا ہے کہ افسانے کو پڑھنے کے بعد ہمیں انسانیت کی وہ رمق دکھائی دیتی ہے جو ایشر سنگھ کے سیاہ قلب میں خود اس کا مکروہ فعل پیدا کرتا ہے۔ اور یہ ایک صحت مند چیز ہے کہ اس افسانے کا مصنف انسانوں اور انسانیت سے مایوس نہیں ہوا۔ اگر مصنف نے ایشر سنگھ کے دل و دماغ پر نفسیاتی ردعمل پیدا نہ کیا ہوتا تو یقیناً "ٹھنڈا گوشت" ایک نہایت ہی مہمل چیز ہوتی۔" اس بیان سے ظاہر ہے کہ افسانہ نگار نے اپنی ایک تخلیق کا جواز ایک مخصوص ذہنی کیفیت میں ڈھونڈا ہے، اور یہ مخصوص ذہنی کیفیت چونکہ اسے موجودہ اخلاقی اقدار کے مطابق صحت مند معلوم ہوتی ہے، لہٰذا وہ افسانے کو کامیاب سمجھتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں ان حالات میں اگر ایشر سنگھ کا ردعمل اس مخصوص ردعمل کے علاوہ کچھ اور ہوتا تو افسانہ بے معنی اور مہمل ہو کر رہ جاتا۔ ادبی اقدار کے مطابق یہ نقطۂ نظر صحیح نہیں سمجھا جا سکتا، اس لئے کہ ان حالات میں ایک انسان کے ردعمل کی ہزار نفسیاتی صورتیں ہو سکتی ہیں، افسانہ نگار اپنے مشاہدے اور تجربے کے مطابق کسی ایک صورت کو تخلیق کی آنچ دے کر روشن کر سکتا ہے۔

اپنے جنسی افسانوں کی وجہ سے منٹو کے ذاتی امتیاز حاصل کرنے کی خواہش تو پوری ہو گئی، مگر اس کے مصلح وقت بننے کے جذبے کو کچھ ٹھیس لگتی رہی۔

بنیادی طور پر چونکہ وہ سیدھا سادا اور واقعی قسم کا انسان تھا۔ لہٰذا فحاشی کے الزام سن کر اسے ذہنی طور پر ضرور کوفت ہوتی ہوگی۔ اسی لئے اس نے لوگوں کو یقین دلانا چاہا کہ منٹو ایک "طہارت پسند" انسان ہے اور اپنے متعلق یہ بیان دیا کہ میں ایک شریف خاندان کا فرد ہوں، اتفاق سے میرا پیشہ تصنیف و تالیف ہے، اپنی فطرت اور جو تعلیم و تربیت مجھے ملی ہے، اس کی بدولت میں نے آج تک سستا اور سوقیانہ ادب پیش نہیں کیا۔ آخر میں اس لعن طعن سے گھبرا کر اس نے یہ کہنا شروع کیا کہ اگر میں ناجائز شراب کشید نہیں کرتا، الاٹمنٹ نہیں کراتا، بلیک نہیں کرتا تو مجھے حق پہنچتا ہے کہ میں فحش افسانے لکھوں، لکھنا چھوڑ دوں یا احتساب سے قطعاً بے پروا ہو کر قلم زنی کرتا رہوں، سچ پوچھئے تو طبیعت اس قدر کھٹی ہو گئی تھی کہ جی چاہتا تھا کہ کوئی چیز الاٹ ہو جائے تو آرام سے کسی کونے میں بیٹھ کر چند برس قلم اور دوات سے دور رہوں، دماغ میں خیالات پیدا ہوں تو ایسی پھانسی کے تختے پر لٹکا دوں، الاٹمنٹ میسر نہ ہو تو بلیک مارکیٹنگ شروع کر دوں یا ناجائز طور پر شراب کشید کرنے لگوں۔"

اس فحاشی کی بحث میں ایک نقصان یہ بھی ہوا کہ منٹو کے جنسی افسانوں کے متعلق ادبی اور فنی نقطۂ نظر سے بہت کم سوچا گیا، فیض احمد فیض نے "ٹھنڈا گوشت" کے متعلق بیان دیتے ہوئے کہا کہ "اس افسانے کے مصنف نے فحش نگاری نہیں کی، لیکن ادب کے اعلیٰ تقاضوں کو بھی پورا نہیں کیا۔" خود منٹو کو اس بات کا افسوس تھا کہ اس کی اس تصنیف پر مقدمے کے دوران میں کوئی ادبی تنقید نہیں ہوئی، مجھے اس سے غرض نہیں کہ یہ افسانہ اخلاقی نقطۂ نظر سے فحش ہے یا نہیں۔ ادبی سوال یہ ہے کہ افسانہ کا مرکزی جذبہ مناسب الفاظ اور موزوں انداز میں پیش کیا گیا ہے یا نہیں؟ کیا پڑھنے والے کا ذہن طریقِ اظہار سے مرکزی جذبے کو اپنانے میں کامیاب ہوتا ہے یا نہیں؟ افسانے کی ادبی کامیابی کا انحصار اسی سوال کے جواب پر ہے۔ مرکزی جذبہ یہ ہے کہ ایک انسان جو انتہائی بے باکی سے قتل و غارت اور لوٹ مار میں حصہ لے رہا ہے جب ایک مردہ لڑکی سے جنسی فعل کا مرتکب ہونے لگتا ہے تو اس کا ردعمل اس قدر شدید ہوتا ہے کہ وہ اپنی جنسی خواہش ہمیشہ کے لئے کھو بیٹھتا ہے۔ ایشر سنگھ افسانے میں ایک ایسے نفسیاتی مریض کی حیثیت سے داخل ہوتا ہے جس پر پورا واقعہ گزر چکا ہے اور جس کی یاد نے اسے دیوانہ سا کر دیا ہے۔ وہ ایک دفعہ پہلے اپنی بیوی کے پاس آ کر ناکام جا چکا ہے اور اب کئی دنوں کے بعد پھر لوٹ کر آیا ہے، افسانے کے

شروع کے منظر میں ایشر سنگھ کی ذہنی کیفیت کے متعلق اشارے موجود ہیں، مگر بیان میں جا بجا ایسے مقام آتے ہیں جہاں ذہن بنیادی جذبے سے ہٹ کر ادھر خیالوں کی طرف نکل جاتا ہے۔ پہلے چند جملوں ہی میں ایسے لفظ نکل آتے ہیں جو ایک خاص جنسی پہلو لئے ہوئے ہیں: "کلونت کور نے تھوڑی دیر کے بعد اپنا آسن پسند نہ آیا اور دونوں ٹانگیں پلنگ سے نیچے لٹکا کر ہلانے لگی" اور آگے چل کر جب افسانہ نگار ایشر سنگھ اور کلونت کور کے قرب کا منظر پیش کرتا ہے تو اس میں جو الفاظ استعمال کئے گئے ہیں وہ کسی طرح بھی ایک نفسیاتی مریض کے ذہن کا پرتو نہیں ہو سکتے، وہ جنسی منظر افسانہ نگار بالکل اس طرح پیش کرتا ہے جیسے مرد اور عورت دنیا و مافیہا سے بے خبر ایک دوسرے میں گم ہوئے جا رہے ہوں۔ ایشر سنگھ ہونٹوں سے آج ظلم کر کر مزید ظلم ڈھانے لگتا ہے اور کلونت کور "تیز آنچ پر چڑھی ہوئی ہانڈی کی طرح ابلنے لگتی ہے۔" اس منظر کے بیان میں افسانہ نگار نے جو الفاظ استعمال کئے ہیں وہ قاری کے ذہن کو مجبور کرتے ہیں کہ وہ ایشر سنگھ کے نفسیاتی مسئلے کو بھول کر منظر کے خالصتاً جنسی پہلو کو قبول کرے، اسی لئے منظر کے اختتام پر افسانہ نگار جب یہ کہتا ہے کہ "ایشر سنگھ ان تمام حیلوں کے باوجود خود میں حرارت پیدا نہ کر سکا" تو ذہن کو یہ بات کچھ عجیب سی لگتی ہے، افسانہ نگار چند لمحوں کے لئے مرکزی تجربہ کو چھوڑ کر ایک ایسا جنسی منظر بیان کرنے لگتا ہے، جو قاری کے ذہن کو تجربے سے دور لے جاتا ہے۔ یہی خامی "دھواں" میں ہے۔ اس افسانے کے متعلق منٹو نے کہا ہے "دھواں میں شروع سے لے کر ایک کیفیت، ایک جذبہ، ایک تحریک کا نہایت تیز ہوا نفسیاتی بیان ہے۔ اس میں ہمیں کہیں بھی ایسی ترغیب نظر نہیں آتی جو قارئین کو شہوانی لذتوں کے دائرے میں لے جائے۔" پہلی بات تو یہ ہے کہ اس افسانے میں ایک جذبے کا بیان نہیں ہے بلکہ دو جذبوں کا بیان ہے۔ ایک وہ گمنام غیر شعوری احساس جو مسعود کیلئے لذت کا سامان پیدا کرتا ہے اور دوسرا لذت کا وہ شعوری احساس جو کلثوم کو اکساتا ہے، انہی دو جذبوں کی وجہ سے کہانی کا توازن برقرار نہیں رہتا، اس لئے کہ افسانہ نگار کا مقصد تو محض مسعود کی غیر شعوری جنسی بیداری کا اظہار کرنا تھا۔ یہ صحیح ہے کہ افسانہ نگار نے مسعود کی ذہنی کیفیت کا اظہار نہایت ہی پُراثر اور بقول منٹو کے "نہایت درجہ محتاط" انداز میں کیا ہے، منٹو کو اس بات کا احساس تھا کہ اگر اس نے مسعود کے دماغ میں شہوانی خیالات کی موجودگی کا ذکر کیا تو "ایسی لغزش افسانے کا ستیاناس کر دیگی" مگر افسانہ نگار نے اپنی تمام تر توجہ مسعود پر صرف کر دی اور کلثوم افسانے میں شروع سے آخر تک بڑی آزادی سے جنسی تسکین کے ذرائع نکالتی رہی۔ منٹو کو یہ خیال تھا کہ اس نے "اس بے نام سی لذت میں جو مسعود کو محسوس ہو رہی تھی خود کو یا قارئین کو شریک نہیں کیا" مگر اسے اس بات کا احساس نہیں تھا کہ اس نے اپنے انداز بیان سے پڑھنے والے کو اس لذت میں شریک ہونے کا موقع دیا جو کلثوم محسوس کر رہی تھی: "مسعود کے وزن کے نیچے کلثوم کی چوڑی چکلی کمر میں خفیف سا جھکاؤ پیدا ہو گیا، جب اس نے پیروں سے دبانا شروع کیا، ٹھیک اسی طرح جس طرح مزدور مٹی گوندھتے ہیں، تو کلثوم نے مزا لینے کی خاطر ہولے ہولے ہائے ہائے کرنا شروع کیا۔"

اس "ہولے ہولے ہائے ہائے" کرنے میں جو لذت ہے اس میں افسانہ نگار اور قاری دونوں شریک ہیں۔ اس کے بعد کی گفتگو کا جو رنگ ہے اس میں بہن بھائی کا تعلق قریب قریب ختم ہو جاتا ہے۔ لڑکی کہتی ہے "میرے گدگدی ہوتی ہے تم دھوبیوں کی طرح دبا رہے ہو" لڑکا کہتا ہے "اب کی دفعہ میں پورا بوجھ آپ پر نہیں ڈالوں گا" قاری کا ذہن لڑکی کے جسم کی طرف منتقل ہو جاتا ہے اور افسانہ کا مرکزی خیال پس منظر میں چلا جاتا ہے۔

منٹو کے جنسی افسانوں میں اگر بنیادی جذبے اور اظہار بیان میں پوری مطابقت ہوتی تو نہ صرف یہ افسانے ادبی لحاظ سے کامیاب ہوتے، بلکہ ان پر اخلاقی نقطۂ نظر سے جو اعتراض ہوتے رہے ہیں، ان کی شدت بھی شاید بہت کم ہوتی۔

ہم نے شروع میں عرض کیا تھا کہ منٹو کی شخصیت کا سب سے بڑا مطالبہ نام پیدا کرنے کا تھا، اسی دھن میں اس نے رہبر قوم اور مصلح ملت بننے کی بھی بڑی کوشش کی، مگر اس لئے کہ اس کے پاس کوئی علمی یا فکری نصب العین یا پیغام نہیں تھا، وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکا۔ اس کا نام تو اس نے پیدا کر لیا مگر اسے اس بات کا احساس ضرور رہا کہ اس کے اصلی عمل کو لوگ صحیح طور پر سمجھ نہیں پائے، اس نفسیاتی مسئلے کی مختلف کیفیتیں میں نے ان کے مضامین اور مختلف قسم کے افسانوں سے اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔

اب منٹو کے افسانوں اور خاکوں کی وہ قسم رہ گئی ہے جس میں نفسیاتی الجھنوں سے کسی حد تک آزاد ہو کر منٹو کے جوہر کو اظہار کا موقع ملا۔ یہ افسانے اور خاکے وہ ہیں جن میں منٹو نے ایک خاص ماحول اور اس ماحول میں چلتے پھرتے کئی ایک زندۂ جاوید کردار پیش کئے ہیں۔

اس گروہ میں فلمی دنیا کی وہ کہانیاں بھی شامل ہیں جو منٹو نے اپنے

مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی



[illegible] ایک نمونہ) [illegible] احمد [illegible]

نئے والوں کے متعلق لکھیں۔ ماحول اور کردار کی کہانیوں اور افسانوں کا معیار کے اعتبار سے منٹو کی دوسری تحریروں سے بلند تر ہے، مگر ان میں بھی جا بجا منٹو کی انانیت اور دہشت پسندی کی مثالیں ملتی ہیں۔ "میرا نام رادھا ہے" اور "موذیل" دونوں کا اختتام میلوڈرامائی انداز سے ہوتا ہے۔ "میرا نام رادھا ہے" میں راجہ جب نیلم کے قابو میں آجاتا ہے تو اس منظر کے بیان میں افسانہ نگار نے بہت ہی گہرے اور شوخ رنگ استعمال کئے ہیں۔ "وہ سی سی کرتا رہا، لیکن میں نے اس کے ہونٹوں سے اپنے لہو بھرے ہونٹ پیوست کئے اور اسے خطرناک جلتا ہوا بوسہ دیا تو وہ انجام رسیدہ عورت کی طرح ٹھنڈا ہوگیا، ... اٹھ کھڑی ہوئی ...... مجھے اس سے ایک دم نفرت پیدا ہوگئی ...... میں نے پورے قد سے اس کی طرف نیچے دیکھا۔ ..... اس کے خوبصورت چہرے پر میرے لہو اور لپ اسٹک کی سرخی نے بہت ہی بدنما بیل بوٹے بنا دئے تھے۔" اسی طرح موذیل کے ایثار کی کہانی بھی افسانہ نگار کی دہشت پسندی کی وجہ سے غیر متوازن ہوگئی ہے۔ موذیل جب کرپال کور کو بچانے کے لئے اپنی جان کی قربانی پیش کر دیتی ہے تو اس کے بعد اس کی موت کی گھناؤنی تفصیلات بیان کرنے سے افسانہ کو کوئی تقویت نہیں پہنچتی، مگر منٹو فطری انجام سے مطمئن نہیں ہوتا۔ موذیل سیڑھیوں سے گر پڑتی ہے۔ "اس کی ناک سے خون بہہ رہا تھا، کانوں کے رستے بھی خون نکل رہا تھا۔ وہ جو دروازہ توڑنے آئے تھے اور گرد جمع ہوگئے۔ کسی نے بھی نہ پوچھا کیا ہوا ہے۔ سب خاموش تھے موذیل کے ننگے اور گورے جسم کو دیکھ رہے تھے جس پر جا بجا خراشیں پڑی ہیں۔"

"موذیل"، "ممی" اور "جانکی" ایک ہی کردار کے مختلف روپ ہیں۔ ان کردار کا بنیادی تقاضا ایثار کا ہے، ان میں جانکی نسبتاً زیادہ سپاٹ کردار ہے۔ اسلئے کہ کسی واقعے کے اثر سے بھی اس کی خود سپردگی کا جذبہ برہم نہیں ہوتا، موذیل میں ایک لاابالی پن ہے جو اسے ایک انفرادیت بخش دیتا ہے اور ممی میں یہ جرأت ہے کہ وہ اس کو دھتکار دے جو اس کی زندگی کا سہارا ہے۔

میں نے شروع میں عرض کیا تھا کہ اپنی فکری زندگی کے لئے منٹو نے جو غذا چاہی تھی وہ یہ تھی کہ جو چیزیں عام طور پر بُری سمجھی جاتی ہیں ان میں بھی کوئی نہ کوئی خوبی ہوتی ہے۔ اسی تصور کی وضاحت کے لئے منٹو نے ایک مخصوص افسانوی ماحول کو زندہ کیا، اس ماحول میں پیشہ ور داشتائیں، رنڈیاں، طوائفیں اور ان کے گرد ان کے دلال، اور چاہنے والے سب کے سب چلتے پھرتے، کاروبار کرتے نظر آتے ہیں، اور وہاں بھی شاید ہی کوئی کردار ایسا ہو جس میں زندگی کی کوئی نہ کوئی جھلک موجود نہ ہو۔ اس ماحول کے دو افسانے خاص طور پر قابلِ توجہ ہیں: "ہتک" اور "بابو گوپی ناتھ"۔ "ہتک" میں تجزیہ مکمل ہے اور اس کا اظہار متوازن اور انتہائی پُر اثر ہے۔ منٹو نے جتنے کردار ایسے پیش کئے ہیں ان میں سے شاید کوئی بھی اس قدر زندہ اور قابلِ قبول نہیں جتنا کہ سوگندھی کا کردار ہے، اس کردار میں ایک فرد کی پوری نفسیاتی تاریخ ہے۔ سوگندھی انتہائی مجبور اور لاچار ہونے کے باوجود زندہ اور آزاد ہے اور اس میں زندگی کا پوری طرح مقابلہ کرنے کی اہلیت ہے۔ ایک سیٹھ جب اسے یہ کہہ کر رد کر دیتا ہے "دس روپے اور یہ عورت۔ نخرہ کیا بری ہے ......" تو سوگندھی کے سر سے پاؤں تک گرم لہریں دوڑنے لگتی ہیں، وہ چاہتی ہے کہ سیٹھ ایک بار اس کے سامنے آجائے تو وہ اندھا دھند اپنے دونوں پنجوں سے اس کا منہ نوچنا شروع کر دے، مگر پھر وہ سوچتی ہے "نہ آئے۔ بلا سے۔ میں اپنی جان کیوں بیکار ہلکان کروں۔ گھر چلتے ہیں اور آرام سے لمبی تان کر سوتے ہیں ..... سیٹھ اور اس موٹر کی ایسی تیسی۔" لیکن اسے چین نہیں آتا، انتقام کے نئے نئے طریقے اس کے ذہن میں آتے ہیں، اتنے میں مادھو آجاتا ہے جو محبت کے نام پر اس سے اپنا ہر کام نکالتا ہے۔ سوگندھی اپنا سارا انتقام مادھو سے لیتی ہے، مادھو کو طرح طرح کچوکے لگا کر جب وہ اس کی محبت کے فریب کا مضحکہ اڑا چکتی ہے تو کہتی ہے "سوگندھی کے بچے تو آیا کس لئے ہے یہاں؟ تیری ماں رہتی ہے اس جگہ جو تجھے پچاس روپے دے گی؟ یا تو کوئی ایسا گبرو جوان ہے جو میں تجھ پر عاشق ہو گئی ہوں ......" مادھو دبے ہوئے لہجہ میں صرف اس قدر پوچھ سکتا ہے "سوگندھی تجھے کیا ہوگیا ہے؟" "تیری ماں کا سر۔ تو ہوتا کون ہے مجھ سے ایسے سوال کرنے والا۔ بھاگ یہاں سے ورنہ۔" سوگندھی کی بلند آواز سن کر اس کا خارش زدہ کتا جو سوکھے ہوئے چپلوں پر منہ رکھے سو رہا تھا، ہڑبڑا کر اٹھا اور مادھو کی طرف منہ اٹھا کر بھونکنا شروع کر دیا۔

مگر سوگندھی کا انتقام پورا اس وقت ہوتا ہے جب وہ مادھو اور اس کے ساتھ دوسرے سب انسانوں کو اپنے گھر سے نکال کر اپنے خارش زدہ کتے کو ساگوان کے چوڑے پلنگ پر اپنے پہلو میں لٹا کر سو جاتی ہے۔

بابو گوپی ناتھ کا کردار سوگندھی کی طرح بھرپور اور قابلِ قبول نہ سہی، دلکش ضرور ہے۔ توازن اور تاثر کے اعتبار سے اس افسانے کو بھی ایک منفرد حیثیت حاصل ہے۔ بابو گوپی ناتھ کا مسلک اپنے آپ کو

(باقی صفحہ ۲۱۲ پر)

اردو ادب اور نفسیات*

ابواللیث صدیقی
ممتاز مفتی
سجاد علی قیصر

تنقید (ابواللیث صدیقی)

ماہرینِ نفسیات کے خیال میں ہر فن پارے کی تخلیق میں قبلِ شعور، شعور اور لاشعور کارفرما رہتے ہیں، اور جب تک کسی فنکار کے ذہنی عوامل کا پورا مطالعہ نہ کیا جائے، فن پارے کی حقیقت آشکار نہیں ہو سکتی۔ ظاہر ہے کہ اس نقطۂ نظر سے فنکار کی انفرادیت اور شخصیت کی اہمیت بہت بڑھ جاتی ہے، اور فن پارے کے مطالعے یا تنقید میں فنکار کے مطالعے کا عنصر شامل ہو جاتا ہے۔ نفسیاتی تنقید کا یہ سب سے نمایاں رجحان ہے، جس سے ہمارے پرانے تذکرے، تاریخیں اور تنقیدیں بڑی حد تک محروم ہیں۔ تذکرہ نگار تو شاعر کے ذاتی حالات کو بالکل غیر ضروری سمجھتے ہیں۔ مثلاً میر کے کلام پر رائے دیتے ہوئے ان کے سوز و گداز اور الم پرستی کا ذکر تو سب نے کیا ہے، لیکن اس کے اسباب کا تجزیہ صرف دورِ جدید کے تنقید نگاروں میں ملتا ہے۔ میر کے کلام کا مطالعہ ان کی آپ بیتی "ذکرِ میر" کی روشنی ہی میں کیا جا سکتا ہے اگر اس میں بھی میر نے سب کچھ نہیں کہہ دیا، بہت سی "سخن ہائے ناگفتنی" اس میں چھپائی گئی ہیں، ان کا کھوج لگانے کے لئے ہمارے پاس صرف میر کا کلام رہ گیا ہے۔ ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ میر کے الفاظ اور خیالات ان کے شعور، قبلِ شعور اور لاشعور کی کن کیفیتوں کے غماز ہیں۔

نفسِ انسانی انفرادی ہونے کے باوجود اجتماعی بھی ہے۔ محرکات خارجی دنیا سے ہی اثر انداز ہوتے ہیں۔ بہت سے تجربات قبلِ شعور میں سماجی ورثے کے طور پر ملتے ہیں۔ لاشعور میں چلے جانے والے حالات اور کیفیات بھی خارجی دنیا سے تعلق رکھتے ہیں، اسلئے نفس کے مطالعے کو ماحول کے آئینے میں دیکھنا پڑے گا۔ نفسیاتی تنقید میں خاندان، سماج اور سیاسی و معاشی حالات پس منظر کے طور پر کام میں لائے جاتے ہیں۔ اردو کے جدید نقاد ان میلانات اور رجحانات کی وضاحت جو قدیم اردو ادب میں نمایاں ہیں، ان ملکی، معاشرتی اور تہذیبی حالات کے مطالعے سے کرتے ہیں جو اس برصغیر میں اورنگ زیب کی وفات اور سلطنتِ مغلیہ کے زوال کے باعث انتشار کی صورت میں ظاہر ہوئے تھے۔ اس طرح ادبی اور تنقیدی تحقیق کے لئے ملک کی تحریکوں کا مطالعہ ناگزیر ہو گیا ہے۔ اب نقادوں کی توجہ ہیئت اور بیان پر اسی حد تک مرکوز ہے جہاں تک ان خارجی عناصر سے فنکار کی داخلیت یعنی شخصیت اور انفرادیت کا سراغ لگانے میں مدد ملتی ہے۔ لیکن ان کا اصلی موضوع اب فنکار کے ذہنی واردات ہیں۔

نفسیاتی مطالعے نے جنسی نفسیات کے نازک موضوع کو بڑی اہمیت دی ہے، بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ فرائڈ کے نظریات کا وہی حصہ اب سب سے زیادہ اثر انداز ہو رہا ہے جس کا تعلق جنسی نفسیات سے ہے۔ شعری اور ذہنی تخلیقات میں جنس کا جذبہ کہیں نہ کہیں بنیادی طور پر کارفرما ہے۔ چنانچہ تنقید نگار فنکاروں کی جنسی کیفیات، جنسی الجھاؤ اور جنسی بھوک کے مسائل سے مفر نہیں پاتا، یہ اور بات ہے کہ بعض نقاد خود لذت پرستی کا شکار ہو جاتے ہیں اور اس موضوع کو چھوڑ کر جنسی بیماریوں کی تشریح و تجزیہ میں پھنس جاتے ہیں۔

آج اردو کے اکثر نقاد جو نئی نسل سے تعلق رکھتے ہیں، نفسیاتی تنقید کی طرف مائل ہیں۔ جیسے جیسے اس ملک میں نفسیات کے مطالعے اور علمِ تجزیۂ نفسی کو فروغ ہوگا، اردو تنقید میں نئے افکار اور نئے پہلو پیدا ہوں گے۔ اور اقلیدس کا یہ فرضی نقطہ "ایک وسیع دائرہ نظر آنے لگے گا۔

افسانہ (ممتاز مفتی)

نفسیات نے افسانے کی تکنیک یا ہیئت کو نہیں بدلا، اس کا مرکزی خیال اور

صورت تاثر جوں کے توں قائم رہے ہیں لیکن اس کے موضوع اور تفاصیل میں بعید اضافہ اور تنوع پیدا ہو گیا ہے۔

واقعاتی افسانے کے دور میں افسانے کا موضوع قتل ہوتا تھا، اب قاتل ہوتا ہے۔ تب افسانے میں مظالم اور مصائب کا تذکرہ پایا جاتا تھا، اب ظالم اور مظلوم نے ان کی جگہ لے لی ہے۔ تب مشکلات بیان کی جاتی تھیں، اب مشکلات کے بیان نے ذہنی کشمکش کے اظہار کی صورت اختیار کر لی ہے یعنی سینما کی اصطلاح میں پہلے بعید درمیانی شاٹ میں واقعہ پیش کیا جاتا تھا، اب واقعہ کی اہمیت کو نظر انداز کر کے اس کے نتائج دکھانے کے لئے کردار کا "کلوز اپ" یعنی قریبی عکس پیش کیا جاتا ہے۔ غرض اب افسانے میں پیشکش کا زاویہ بدل گیا ہے۔ اور انسان کے محسوسات نے اہمیت اختیار کر لی ہے۔

اس تبدیلی کے باعث ایسے افسانے وجود میں آئے جیسے کرشن چندر کا "دو فرلانگ لمبی سڑک" جس میں معمولی روزمرہ کے مناظر سے تاثر پیدا کیا گیا ہے۔ منٹو کا افسانہ "ہتک" جس میں ایک گاہک کے اظہار ناپسندیدگی پر طوائف شدید رد عمل محسوس کرتے ہوئے بنی نوع انسان سے انتقام لینے کی خاطر ایک کتے سے پیار کرتی ہے لیکن نفسیاتی زاویۂ نگاہ صرف اسی صورت میں مناسب تاثر پیدا کرتا ہے۔ جبکہ افسانے کا مرکزی خیال اس سے ہم آہنگ ہو۔ جبکہ مرکزی خیال کا تقاضا ہو کہ اسے نفسیاتی زاویۂ نگاہ سے پیش کیا جائے، نفسیاتی زاویۂ نگاہ کو زبردستی ٹھونسنے سے کوئی خوبی پیدا نہیں ہو سکتی۔ نفسیاتی افسانوں کے دور میں فرویڈی نفسیات کا ایک سیلاب اُمڈ آیا ہے۔ جس سے قارئین اکتائے جا رہے ہیں اور اس میں از سر نو یہ خواہش پیدا ہو رہی ہے کہ افسانے میں پھر سے سیدھے سادے واقعات کا ذکر ہو۔ نفسیات کے دور میں بھی ایسے خارجی افسانے لکھے گئے ہیں۔ جو زبردستی کی نفسیات سے پاک ہیں، مثلاً غلام عباس کی "آنندی"۔

پرانے دور میں محبت صرف محبت سمجھی جاتی تھی، اور وہ پاک ہوتی تھی یا ناپاک۔ اب نفسیاتی نقطۂ نظر سے محبت ٹپدس کی سازش ہو سکتی ہے، جذبۂ انتقام کا ایک روپ ہو سکتی ہے، ضد ہو سکتی ہے، جذبۂ کمتری کو چھپانے کا پردہ ہو سکتی ہے۔ اب محبت خالص محبت نہیں رہی، مفرد کی بجائے وہ ایک مرکب جذبہ بن چکی ہے۔ اس طرح قربانی، ماتا، وفا اور ایسے دیگر جذبات جن کے مفہوم سکہ بند اور ٹکسالی حیثیت اختیار کر چکے تھے، تحلیل نفسی کے دور میں از سر نو زیر تحقیق ہیں اور انسانی نفس کے نئے اور انوکھے پہلوؤں سے واقف ہو رہا ہے۔۔ ایسے پہلو جو واقعاتی افسانے کے دور میں پیش نہ کئے جا سکتے تھے۔

ناول (سجاد علی قہر)

خارجی واقعات کے رخ سے نقاب اٹھ جانے کے ساتھ ساتھ ناول نے نفسانی شعور و لاشعور کی تہیں بھی کھولنی شروع کر دی ہیں۔ چنانچہ ناول نگار واقعات کی دنیا سے "محشر خیال" کی طرف متوجہ ہو گیا ہے۔ اگر پہلے ناول نگار زیادہ تر "پھر کیا ہوا؟" سے سروکار رکھتا تھا، تو اب "کیوں ہوا؟" اور "کیونکر ہوا؟" سے بحث کرنے لگا ہے۔ خارجی واقعات اور انسانی تعلقات کے عمل کی بجائے اب داخلی کیفیات کا زیادہ جائزہ لیا جانے لگا ہے لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ اردو کے ابتدائی ناول محض خارجی واقعات کی پوٹ تھے اور ان میں کردار کی ذہنی کشمکش یا اس کے نفسی عمل کا جائزہ بالکل مفقود تھا۔ سرشار کا "خوجی"، نذیر احمد کا "مرزا ظاہر دار بیگ"، مرزا رسوا کی "امراؤ جان ادا" اور پریم چند کے دیہاتی کردار اردو ناولوں کی جیتی جاگتی تصویریں ہیں اور ان کے ذریعہ نفسیاتِ انسانی کے نہایت دلچسپ انکشافات کئے گئے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ نفسیاتی مطالعہ دور جدید کا کارنامہ ہے اور اس کی مدد سے انسانی نفس کے وہ پہلو بھی پیش کئے جا سکتے ہیں جن کا اس سے پہلے امکان نہ تھا۔

جدید ترین نفسیاتی رجحانات کے ماتحت اردو ناولوں میں جو ناول سرفہرست رکھے جاتے ہیں، وہ قاضی عبدالغفار کے ناول "لیلیٰ کے خطوط" اور "مجنوں کی ڈائری"، عصمت کا ناول "ٹیڑھی لکیر"، کرشن چندر کا "شکست" اور عزیز احمد کا "گریز" اور "ہوس" ہیں۔

"لیلیٰ کے خطوط" میں پورا ناول ایک کردار کے گرد گھومتا ہے، یا پھر دوسرا کردار وہ ہے جس کے نام یہ خطوط لکھے گئے ہیں، لیکن یہ دوسرا کردار محض پس منظر کا کام دیتا ہے۔ پیش منظر میں لیلیٰ ہی نظر آتی ہے، جو سرتاسر اپنی ذات میں گم ہے۔ وہ کسی شخص میں دلچسپی ہی نہیں لے سکتی۔ اس کے خطوط اس بات کا ثبوت نہیں ہیں کہ اسے مکتوب الیہ سے کوئی دلچسپی ہے، بلکہ ان کے لکھنے کا مقصد محض اپنی ذات کا تذکرہ ہے۔ اس کی آواز میں طوائف کے کچلے ہوئے وجود کی بیچارگی نہیں، بلکہ ایسا استہزا ہے جو ساری دنیا پر قہقہہ لگا سکتا ہے۔ "لیلیٰ کے خطوط" انسانی فطرت کو سمجھنے میں تحلیل نفسی کا کام دیتے ہیں۔ ان میں بڑی تلخی اور طنز بھرا ہوا ہے۔ لیلیٰ شدت سے انفرادیت پسند ہے اور خود میں اسیر، اپنے دکھوں کی پرورش کرتی ہے۔ اس میں خود بینی کی عادت ہے، جیسے وہ خود بھی تسلیم کرتی ہے۔ اسے اپنے زخموں کو کریدنے سے فرصت نہیں ملتی۔ "لیلیٰ کے خطوط" میں خارجی واقعات کے برعکس ذہنی کیفیات کا عکس ہے۔

عصمت چغتائی کی "ٹیڑھی لکیر" درحقیقت اردو ادب میں اپنی طرز کا پہلا ناول ہے جس میں تحلیل نفسی کو بہت سلیقے سے برتا گیا ہے۔ یہ ناول ایک اچھے گھرانے کی تعلیم یافتہ آزاد خیال اور آزاد روش لڑکی شمشاد یا شمن کی کہانی ہے۔

(باقی صفحہ ۱۲۸ پر)

چراغ حسن حسرت مرحوم

عبد المجید سالک

چراغ حسن حسرت کا انتقال بلاشبہ اردو ادب و صحافت کا نقصان عظیم ہے، اور فطرت اتنی فیاض واقع نہیں ہوئی کہ عظیم نقصانات کی تلافی جلد تر کر دے۔ حسرت ایک شیوا بیان شاعر، ایک مقبول عام مزاح نویس، ایک عالی پایہ اخبار نویس اور ایک وسیع المعلومات ادیب تھا۔ غرض اس ہیرے کے مختلف پہلو اپنی اپنی مخصوص چمک دمک رکھتے تھے، جس سے بڑے بڑوں کی نگاہیں خیرہ ہو جاتی تھیں۔ ان کے شعر کا ذخیرہ کم ہے، لیکن انہوں نے جو کچھ کہا ہے اس سے کہنہ مشقی اور استادی کے تمام جوہر نمایاں ہوتے ہیں۔ ان کا رنگ سخن زیادہ تر حضرت شاد عظیم آبادی سے متاثر ہے۔ ظریفانہ کالم لکھنے میں کوئی ان کا شریک و سہیم نہ تھا۔ وہ بات میں سے بات پیدا کرتے اور پڑھنے والا دفعتہً ان کی ذہانت، اپج اور تلاش سے بھونچکا سا رہ جاتا۔ میرے نزدیک ان کی اردو دانی اور اردو نویسی عدیم المثال تھی۔ جن لوگوں کی مادری زبان اردو نہیں ان میں حسرت سے بڑا با محاورہ اور دلآویز اور باغ و بہار اردو لکھنے والا اب تک پیدا نہیں ہوا۔ علم و فضل اور وسعت معلومات کے اعتبار سے ہمارے ادیبوں اور انشا پردازوں میں شاید بہت ہی کم لوگ حسرت کا مقابلہ کر سکتے تھے۔

میرے ساتھ حسرت کے نہایت گہرے مخلصانہ تعلقات اٹھائیس برس سے چلے آتے تھے۔ اس دوران میں وہ تعلقات روز افزوں ہی ہوتے چلے گئے، کبھی ایک لمحے کے لئے بھی ان میں کوئی فرق نہ آیا۔ وہ بے انتہا مخلص دوست اور ایثار پیشہ اور وفادار ساتھی تھے۔ ان کا دل آئینے کی طرح صاف تھا۔ دوست تو دوست کسی دشمن کی طرف سے بھی ان کے قلب میں تکدر جاگزیں نہ ہو سکتا یعنی تکدر پیدا ہونا گو طبعی ہے۔ لیکن حسرت اس کو چند لمحوں کے اندر جھٹک دیتے اور ان کے قلب کی وسعت دشمن کو بھی گلے لگانے پر بھی تیار ہو جائے گی

حسرت کی نظم و نثر اس کی انشا پردازی اور اس کے علم و فضل پر اظہار خیالات کرنے کے لئے عمر پڑی ہے۔ رسائل و اخبارات، ادبی انجمنیں، ریڈیو، حکام، عوام سبھی حسرت کے علم و فن کو خراج تحسین پیش کریں گے، لیکن میں تو فی الحال اس محبت کی تصویر، اس وضعداری کے پیکر، اس خلوص کے مجسمے کو یاد کرتا ہوں اور اس کی یاد میں آنسو بہاتا ہوں، جسکو چراغ حسن حسرت کہتے ہیں اور جس کا مثیل و نظیر معاشرے کے موجودہ دور میں شاید ہی کبھی پیدا ہو سکے۔ شمع اردو تو روشن ہے۔ چراغ محبت بھی جل رہا ہے۔ لیکن محفل پروانوں سے خالی ہوتی جاتی ہے۔ تاجور، باری، برقی، تاثیر، منٹو اور اب حسرت۔

ع اک دیا اور بجھا، اور ہوئی تاریکی!

(بہ شکریہ ریڈیو پاکستان لاہور)

وفات حسرت آیات

چراغِ محفل افسوس بجھ گیا سرِ شام ۔۔۔ نہ شوقِ نغمہ اب ہے نہ ذوقِ بادہ و جام

جیاذِ حسرت مغموم اب ہیں سب احباب ۔۔۔ وفاتِ حسرت آیات مرگ بے ہنگام (حفیظ ہوشیارپوری)

۱۹۵۵ء ۔۔۔ ۱۹۵۵ء

۱۰ نو، کراچی، استقلال نمبر ۱۹۵۵ء

وہی لاہور ــــــ!

ابوالاثر حفیظ

میں ہوں اب تک اسیرِ دانہ و دام   جو رہا ہو چکے ہیں ان کو سلام   عارضی سی شکست و ریخت کیا تھا   چل رہا ہے وہی قدیم نظام

ہو گیا گل چراغِ حسرت بھی   کر لیا آرزو نے کام تمام   شجر و شاخ ہے کہ برگ و ثمر   اپنے معمول پر ہیں پختہ و خام

ایک آغازِ نو کا وقت آیا   دوستو اب قریب ہے انجام   ہاں پرانی ترقیٔ معکوس   اور بھی ہو گئی ہے تیز خرام

نگہِ واپسیں ہے خوں آلود   آفتاب آ چکا ہے برلبِ بام   بعدِ تخریب پھر وہی تعمیر   خودکشی کی طرف وہی اقدام

مرگِ تاثیر دے چکی ہے پیام   خامیاں پختہ ہوتی جاتی ہیں   دیرپا بنتے جاتے ہیں اسقام

ہے خموشی ہی انتہائے کلام   وائے بر حالِ فن و شعر و ادب   ہائے ذوقِ عوام کالانعام

دوستی، دوست، یار، یارانے   جب ترانے تھے اب ہیں افسانے   علمِ شے پر ہے جہلِ شے غالب   ہر اناڑی ہے اپنے فن کا امام

جو قیامت اٹھائے پھرتے تھے   سو رہے ہیں وہ لمبیاں تانے   صورتوں پر جما لیا ہے رنگ   سیرتوں کا سڑا بسا ہے قوام

سخن رنگ رنگ سے لبریز   آج ٹوٹے پڑے ہیں پیمانے   دسترس ہو تو سب حلال حلال   جس پہ قابو نہ ہو حرام حرام

اک زیارت گہِ خرد ہے جہاں   مل کے بیٹھے تھے چند دیوانے   فرش کو عرش کی نہیں پروا   پستیاں ہیں بہت بلند مقام

جن پہ اپنے بھی تھے مست مستانے   گھٹ گئی ہے تسلیِ محکوم   بڑھ گئی ہے تعلّیِ حکام

ہائے لاہور کے وہ میخانے   دوستانِ قدیم، عصرِ جدید   دوستی کو ہے موت کا پیغام

وہی لاہور ہے، وہی در و بام   وہی ہنگامۂ خواص و عوام   نفسی نفسی کا شور و ہنگامہ

زلزلے، آگ، آندھیاں، سیلاب   لائے تشریف چل دیئے ناکام   زندگی ہے تو زندگی کو سلام

پھر کیا؟

تصدق حسین خالد

نہیں جو میرے مقدر میں آستانۂ دوست،
رہی جو زندگیِ مستعار غم آلود،
جو لب پہ آ نہ سکا حرفِ مدعا
پھر کیا؟

نگاہ اٹھی ہر اک سمت، نامراد آئی
نہ چارہ گر نہ کوئی غمگسارِ تنہائی
خیالِ بے کسیِ عشق، رنجِ نومیدی
جہانِ زیست کو پامال کر گئے
پھر کیا؟

جنوں گرفتہ سمجھتے ہیں مجھ کو میرے جلیس
وہ یوں گزرتے ہیں مجھ سے کہ آشنا ہی نہیں
ستارہ ایک فلک کی جبیں پہ چمکا تھا
کہ ہمرہوں کی کشاکش نے اپنے محور سے
اٹھا کے پھینک دیا بیکراں گپھاؤں میں
"نہ کہکشاں، نہ ثریا، نہ خوشۂ عنبی"
نہ ہو اگر مجھے اب اذنِ واپسی
پھر کیا؟

کہ طرفہ کاریِ اندازِ دلربائی دوست
کرشمہ سنج ہے دنیا کے گوشے گوشے میں
سنہری دھوپ میں پھولوں کا ابتسامِ جمیل
ہوا کا سبزے کے آنچل سے شوخیاں کرنا
فضا میں چڑیوں، ممولوں، بیوں، چہوں کی اڑان
جواں دلوں میں شجاعت کا گرم و تیز لہو
حریمِ ناز کی زینت، وہ پاسبانِ بہار
وفا و مہر و محبت کی داستانِ خموش،
زمیں کے سینہ سے ہر لحظہ زندگی کی نمود
جلو میں حسن و مسرت، خلوص، آزادی،
نہ ہو اگر مجھے اب اذنِ واپسی
پھر کیا؟

معرکۂ نظم و غزل

فضل احمد کریم فضلی

حضرت جوشؔ تھے کل رونقِ بزمِ احباب
کیسے چھڑتا نہ وہاں معرکۂ نظم و غزل
بحث پُرجوش تھی، پُرمغز تھی، پُرلطف بھی تھی
خوب آپس میں دلائل کا ہوا ردّ و بدل
نکتۂ نغز اُٹھے لے کے جگن ناتھ آزادؔ
ایسا نکتہ جو کرے عقدۂ دشوار کو حل
"ہے یہ توہینِ غزل گر ہو غزل نظم صفت
اور یہ نظم کی معراج کہ ہو مثلِ غزل"
جوشؔ باوصفِ تخلص بھی ہیں مردِ معقول
سُن کے یوں کھل پڑے جس طرح کہ کھلتے ہیں کنول
ان کے انکار سے اقرار کا پہلو تھا عیاں
جیسے انکارِ محبت کرے کوئی چنچل
بات کی بیچ ہے مجھے ورنہ حقیقت یہ ہے
گونجتا ہے مری نظموں میں بھی کلبانگِ غزل
مسکراتے ہوئے فضلیؔ نے یہ اک شعر پڑھا
جس کو احباب نے ٹھہرا دیا قولِ فیصل
غمِ دوراں میں کہاں بات غمِ جاناں کی
نظم ہے اپنی جگہ خوب، مگر ہائے غزل!

رُباعیات

روشؔ صدیقی

•

رہزن کوئی، نہ خضرِ منزل میرا
دشمن طوفاں، نہ دوست ساحل میرا
کیا کم ہے یہی کہ اس بھری دنیا میں
ہر دل کا شریکِ حال ہوا دل میرا

•

کونین سے دور جا کے دیکھا ہے تجھے
شمعِ امکاں بجھا کے دیکھا ہے تجھے
کیا ذکر یہاں نگاہ و دل کا اے دوست
میں نے تجھ سے چھپا کے دیکھا ہے تجھے

•

خوابِ شبِ ہجر بھول جانے دے مجھے
اب حسرتِ دید کو جگانے دے مجھے
فردا نے پہن لیا لباسِ امروز
اے حسنِ ازل نقاب اٹھانے دے مجھے

•

سب نقشِ قدم چھپا دئیے ہیں میں نے
سجدوں کے نشاں مٹا دئیے ہیں میں نے
جب سے دیکھا لباسِ آدم میں تجھے
لاکھوں پردے گرا دئیے ہیں میں نے

•

کیا مرگ ہے کیا حیات، میں کیا جانوں
کیا ہے پسِ کائنات، میں کیا جانوں
اے حلقۂ زلفِ دوست، عمر تو دراز
کہتے ہیں کسے نجات، میں کیا جانوں

دو گیت

قیوم نظر

گھٹا گھنگھور چھائی ہے

یہ چہکاریں، یہ جھنکاریں، دہائی ہے، دہائی ہے
گھٹا گھنگھور چھائی ہے

ہوا کے مدھ بھرے جھونکے یہاں گھومیں، وہاں گھومیں
کبھی پتوں میں چھپ جائیں کبھی پھولوں کا منہ چومیں
کبھی پیڑوں کو دے ماریں، دہائی ہے دہائی ہے
گھٹا گھنگھور چھائی ہے

اندھیرا ہو رہا ہے ہول آتا ہے اکیلے میں
چمکتی ہے ذرا بجلی تو جی ڈرتا ہے سینے میں
جھما جھم جھام کی دھاریں، دہائی ہے، دہائی ہے
گھٹا گھنگھور چھائی ہے

یہ ناگن بن بسں گھولتی ہے رس بھری رجنی
یہ برہن کس سے ملنے کو مدھوبن کی بنی سجنی
یہ پل پل اس کی جھنکاریں، دہائی ہے دہائی ہے
گھٹا گھنگھور چھائی ہے

ضمیر اظہر

پھر شام سلونی آئی
دن ڈوبا، آکاش پہ پھیلے رنگ رنگیلے سائے
اودے، نیلے، پیلے آنچل پربت پر لہرائے
پھوٹ بہا جھرنوں کا جوبن جونہی چلی پروائی
پھر شام سلونی آئی

لوٹے میدانوں سے گڈریئے، باغوں سے رکھوالے
سپنا بن کر اڑتے جائیں شرمیلے اجیالے
بچھڑے سجے واپس لائے جوگی کی شہنائی
پھر شام سلونی آئی

من میں لئے سندر آشائیں، نینوں میں پھلواری
پنگھٹ پر جل بھرنے چلی ہے گاؤں کی پنہاری
ڈگ ڈگ ڈولے مست جوانی، چھم چھم لے انگڑائی
پھر شام سلونی آئی

جلنے لگے ہیں پل پل دیپک، گھر گھر ہے دیوالی
جوت جگا کر کرتے ہیں جگنو کھیتوں کی رکھوالی
چلی برات دلہن کے دوارے، چھوٹی موٹی منہ پھلائی
پھر شام سلونی آئی

جانے شام میں ہے کیا جادو، شام میں کیا سنگیت بھرا
شام سے پہنچے من کو ٹھنڈک مکھڑا اس کا پریت بھرا
چپکے چپکے، دھیرے دھیرے، سمٹی اور سمٹائی
پھر شام سلونی آئی

ہمارے چند لکھنے والے



پروفیسر دو؟ی



ابوالاثر حفیظ



عبدالمجید سالک



ابوالفضل صدیقی



ابواللیث صدیقی



صوفی حسن خالد



صفیہ سجیہ



رضا ہمدانی



یوسف ظفر







جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی
سقافتی سرگرمیاں









دُلہن

(۱۵ویں صدی کے مشہور بنگالی شاعر علاؤل کی نظم کا ترجمہ)

ابن انشا

تری ضد مجھ کو ستا نہ تو
ترے لئے دیس میں بھیجے ہوئے!

اے دلاری دُلھن! میری پیاری دُلھن! — تجھے ڈھونڈ مری
بڑی صبح تھی جب گئی جمنا پہ تو — کیا بات ہوئی!
گیا دن بھی گزر، ہوئی شام بسر — اب رات ہوئی
اے دلاری دُلھن! سب کو پیاری دلھن — کہاں دیر کری؟
اٹھی نیند سے میں تو چمن میں دکھا — مجھے ایک کمل
چلی اس کی طرف، اک بھڑ گئی ڈس — گئی جان نکل
ملا پھول کی چاہ کے کانٹوں سے بس — مجھے اتنا ہی پھل!
بیچ تال کے اب ہوا ایسا غضب — مری چوڑی گری
اور اسے ڈھونڈنے، اس کمل کے کنے — میں جو نیچے گئی
مرے ساتھیوں کا، ماتھے کے سیندور کی — ساری سرخی دھلی
نرسلوں کے طمانچوں کو سہتے ہوئے — دیہہ میری دکھی
سارے گھر کی تمہی نور روشان ہو — اے دلاری دلھن!
روپ کی کان، ماگن کی تم جان ہو — اے دلاری دُلھن!
جان تم پہ علاؤل کی قربان ہو — میری پیاری دلھن!

حسنِ بے خبر سے

شیر افضل جعفری

لالہ و گل سے کھیلنے والے
مہر و مہ بھی ہیں تیرے متوالے
آسماں نے رواں دواں سے فتنے
تیری پلکوں کی چھاؤں میں پالے
بجلیوں نے تڑپ کے ڈال دیئے
تیرے کانوں میں دو حسیں بالے
تیرا ماتھا بہار کا سورج
تیرے رخسار نور کے ہالے
تیرا قامت گلاب کی ٹہنی
تیرے قدموں میں جھومتے لالے
تیری آنکھوں میں لاج کی سرخی
دل میں معصومیت کے اُجیالے
تیری داسی یہ باغ باغ زمیں
سات آکاش تیرے رکھوالے
تجھ پہ قربان چودھویں کا سماں
تیرے مستوں میں آسماں والے

خدایانِ کہن

جعفر طاہر

یہ خود دار و خود کام و خود بین و خود سر خداوندگارانِ اقلیمِ یوناں
ہوسناکیوں، بزم آرائیوں، عیش فرمائیوں کے نشے میں خروشاں
کبھی کوئی دیوی سے آنکھیں لڑائے، ندی آنا کے ہمراہ دھومیں مچائے
کوئی ایک ڈال کی پھیلی ہوئی ٹہنیوں کے تلے لاکھ آنسو بہائے

ہوا یہ کہ اک روز ننھے کیوپڈ میاں کے اپالو نے ہتھیار دیکھے
سبر دوش پھولوں میں لپٹی ہوئی وہ کماں، وہ طلاکار سوفار دیکھے
وہ سوفار جن سے یہ ننھا شکاری بڑی تمکنت سے نشانے لگائے
شب و روز پیوستہ گر دیویوں، دیوتاؤں کے دل چھید کر مسکرائے

اپالو نے باتوں ہی باتوں میں اتنا کہا یہ جوانوں کو زیبا ہیں ساماں
یہ تیر و کماں چھوڑ دو اور شہرِ خدایاں کے بچوں سے کھیلو مری جاں
ابھی خیر سے عمر ہی کیا ہے، پھر مشغلے ہیں کئی اور بھی کمسنی کے
مگر یہ جگر آزماؤں کے ہتھیار! دل میں یہ ارمان صید افگنی کے

کیوپڈ بھی آتش بجاں ہو کے بولا کہ سرکار مانے ہوئے ہیں شکاری
جوانِ جگر آزما مفت میں بن گئے، عمر بھر ایک چڑیا نہ ماری
یہ کہتے ہوئے اس خدائے محبت نے ننھی کماں میں کوئی تیر جوڑا
اپالو نے دل کا نشانہ لیا، کھینچ کر تیر مارا، سبھی مان توڑا

اپالو نے آنکھیں اٹھائیں تو آئی نظر پی نیئس کی جواں سال بیٹی
خداوندِ قلزم کی ماہ جبیں دخترِ نازنیں اور مقدر کی ہیٹی

اپالو نے کچھ سوچ کر ساحلِ زرفشاں کی طرف اپنا گھوڑا بھگایا
وہ لہروں کی الماس گوں سیج پر کسمساتی ہوئی دافنے کو جگایا

محبت! نہ پوچھو جو اس کجکلہ رہرواں نے شب و روز ناگیں دہائیں
نہ پوچھو جو اعیانِ بزمِ فلک نے اپالو کی جانب سے کیں التجائیں
کبھی اس غزالِ ستارہ قدم کی طلب میں شب و روز جانیں جلائیں
کبھی اپنے تختِ سحر سے اتر کر سمندر کے ساحل پہ آنکھیں بچھائیں

وہ طوطی نوایانِ گلزارِ گردوں، شناسندگانِ رسومِ محبت
وہ جادوگرانِ کہن مشق، وہ رازدارانِ اسرار و آدابِ الفت
اپالو کے ہجر و مصیبت کی آکر سناتے رہے پی نیئس کو کہانی
مگر ماجرا پی نیئس نے کہا بھی تو کوئی نہ اس شوخ نے بات مانی

اپالو نے غصے میں اک روز رستے میں جاتی ہوئی دافنے کو بلایا
مگر وہ ڈری، ڈر کے دوڑی، ادھر دیوتا نے جو پیچھا کیا جا دبایا
اسی کشمکش میں حسیں دافنے نے دعا کے لئے دستِ نازک اٹھائے
اپالو نے دیکھا تو اب ایک لارل کھڑا تھا وہیں دافنے کی بجائے

ادھر یہ جگر آزما نرم شاخوں کے سائے تلے لاکھ آنسو بہائے
ادھر ایک ننھا شکاری ذرا فاصلے پر کھڑا زیرِ لب مسکرائے
وہ ننھا شکاری جو وینس کے پہلوئے سیمیں میں کاری نشانے لگائے
کہ دیوی کسی پیکرِ آب و گل کی محبت میں سرشار دھرتی پہ آئے

سلہ: ایک درخت

وہ نوشابۂ آسماں، وہ نگارِ فلک، وہ سرِ برگِ بستانِ گردوں
وہ سرتاجِ صد رہ نشینانِ خوبی، وہ سلطانۂ شہرِ الہام و افسوں

وہ دیوی کہ جس کے سنہری رتھوں کو حسیں قمریاں، کوکتی فاختائیں
نشیلی ہواؤں، سنہری خلاؤں، طلسمی فضاؤں میں ہر سو اڑائیں
وہ دیوی کہ جس کے جلو میں بہاروں کی معصوم پریاں خراماں خراماں
وہ چونچوں میں سورج مکھی کے طلائی کرن پھول تھامے ہوئے محوِ پرّاں

کبھی اپنی زلفوں کے رقصاں اندھیروں سے بے خواب آنکھوں کو تسکین بخشے
کبھی ایک بوسہ اڈونس کا لے اور تشکر کے انداز میں تین بخشے
وہ البیلی صبحوں کا روشن جزیرہ، وہ جھل جھل جھمکتا ہوا شوخ سینہ
جزیرہ کہ جس کے حسیں ساحلوں پر نہ اترا کوئی سینیوں کا سفینہ

وہ دو سبز زمینیں کہ جن کے طلائی مضافات میں رقص فرما سویرے
وہ دو ملک جن پر نہ لہرائے اب تک کسی تاجدارِ جہاں کے پھریرے
وہ دو شہر جن کی طلب اور تسخیر میں دیوتاؤں نے عمریں لٹا دیں
وہ ٹیلے کہ جن کی بلندی نے یارانِ عرش آشیاں کی بھی نیندیں اڑا دیں

وہ آنکھیں صنم خانۂ آذرِ آبادگانِ وفا کے مقدس پیامی
وہ پاکیزہ پلکوں کے پردے میں لپٹے ہوئے معبدِ عاشقاں کے سلامی
سفیرانِ ملکِ حیا، بارگاہِ جنون و محبت کے مخلص پجاری
اڈونس کے پاؤں پہ جب سر جھکائیں تو دم سادھ جائیں زمیں کنواری

وہ پیشانیٔ ناز، وہ مسکراتی ہوئی چاندنی کا نشیمن درخشاں
وہ کتنے سویروں کا محور، وہ کتنے حسیں آفتابوں کی لوحِ زر افشاں
وہ شرمیلی صبحوں کا مامن، جوانی کے پُر نور لمحات کا آشیانہ
وہ قبلہ گہہ اہلِ دل، زخم خوردہ تمناؤں کا مرمریں آستانہ

وہ عارض، وہ جامِ جگر تاب، وہ آتشِ سامری کے چھلکتے پیالے
پیالے کہ جن کی حسیں جھلکیوں سے امیدوں کے ہونٹوں پہ نذریں اچھالے

سحر ساز کرنوں، شفق تاب جلووں، نظر سوز شعلوں کی آرام گاہیں
وہ روشن چتائیں کہ جن پر ستی ہو گئیں مسکرا کر ہزاروں نگاہیں

وہ قد جیسے دشمن کی لاشوں کے انبار میں کوئی سالارِ لشکر کھڑا ہو
بصد کر و فر خاک زادوں کے انبوہ میں جیسے اک دیو پیکر کھڑا ہو
کبھی کاخِ سیمیں مرمر سے جو اترے سنہری لٹیں نرم شانوں پہ ڈالے
افق تا افق لہلہانے لگیں ان کشیدہ کمانوں کے پُر نور ہالے

اڈونس کی بے خواب آنکھوں کو چومے، کبھی چومتے چومتے ہچکیاں لے
وہ اک موجۂ نرم رو جو کہ شرما کے ساحل کی آغوش میں سسکیاں لے
تھی آب تاروں کے پھیلے ہوئے بیکراں ریگزاروں کی زخمی غزالہ
اڈونس نے ہی جس کے نازک کلیجے میں اٹکا ہوا کوئی پیکاں نکالا

اڈونس وہ نوخیز، نا تجربہ کار سا اک جواں، ایک المڑ شکاری
وہ جس نے سحر کی تمنا میں یہ آخری رات بھی جاگتے ہی گزاری
یہی شوق جنگل میں یاروں کے ہمراہ جائے تو جاتے ہی نخچیر مارے
کیوپڈ کے تیروں سے بڑھ کر کسی صیدِ وحشی کے سینے میں وہ تیر مارے

جواں سال محبوب کی بارگہ میں محبت کی دیوی نے کیں التجائیں
مگر وہ ستمگر نہ مانا تو پھر مانگتی رہ گئی اس کے حق میں دعائیں
جو وہ کھیل کھیلا وہاں بے محابا تو جاتے ہی تقدیر نے مار ڈالا
یہ وینس کی الفت کا انجام ـــ دھرتی پہ بہتے ہوئے خون کا سرخ نالا!

ہواؤں میں اک چیخ سن کر ڈری، آنِ واحد میں دیوی سرِ لاش آئی
ادھر زندگی کی سسکتی لکیروں کا نوحہ، ادھر الفتوں کی دہائی
چمن در چمن اپنے محبوب کی یاد میں پھر "گلانِ ہوائی" اگائے
شقیقہ کے وہ پھول جن کو اڈونس کی صورت جوانی میں ہی موت آئے

ہوا اس طرح دیوتاؤں میں اور خاک زادوں میں قربت کا احساس پیدا
ملاقات کا سلسلہ سا رہا گو دلوں میں ہوئے لاکھ وسواس پیدا

افسانہ

بحران

غلام عباس

جب سے سرکار نے لوگوں کو مکان بنوانے کے لئے زمینیں اور قرضے دینے شروع کئے ہیں شہر کی کایا ہی پلٹ گئی ہے۔ اطرافِ شہر کے وہ علاقے جو میلوں تک ویران پڑے تھے، اب ان میں جگہ جگہ کھدائیاں ہو رہی ہیں۔ اَن گنت راج مزدور، مستری اور ٹھیکہ دار ایک بے چینی کی سی کیفیت کے ساتھ کام کرتے اور اِدھر اُدھر اُدھر سے اِدھر دوڑتے بھاگتے نظر آتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے آثارِ قدیمہ کا کوئی بہت ہی بڑا محکمہ اپنے پورے لاؤ لشکر کے ساتھ، پرانے زمانے کے کسی بھرے پُرے شہر کو، جو کسی آفتِ ناگہانی کے سبب زمین میں دھنس گیا تھا، جوں کا توں باہر نکالنے میں کوشاں ہے۔

مکان بنوانے کی آرزو انسان کی فطرت میں داخل ہے۔ یہ وہ آرزو ہے جو بچپن ہی سے، جب وہ گھروندے بنا بنا کر کھیلتا ہے، اس کے دل میں نشو و نما پاتی ہے اور پھر عمر بھر کبھی ابھرتی کبھی دبتی رہتی ہے۔ زندگی کے کسی دور میں بھی جب کبھی انسان کو ذرا سی بھی خوش حالی نصیب ہوئی، اس نے اپنی اس دیرینہ خواہش کو پورا کرنے کی ضرور کوشش کی۔ اور صاحبِ جائیداد کہلانے کا فخر حاصل کر لیا۔

حکومت کی اس امداد کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو کوئی تھوڑی سی بھی مقدرت رکھتا تھا کچھ زیادہ سوچے سمجھے بغیر مکان بنوانے پر کمربستہ ہو گیا۔ بہت سے لوگ بے سہارے ہی کسی لطیفۂ غیبی کے بھروسے پہ تعمیر کے منصوبے باندھنے لگے۔

سہیل ایک کالج میں فلسفے کا پروفیسر تھا۔ وہ دبلا پتلا، کم سخن اور خاموش طبع انسان تھا۔ اور شہر کے اندر ایک کمرے کے فلیٹ میں اپنی بیوی اور دو بچیوں کے ساتھ رہتا تھا۔ جب تک بچے چھوٹے چھوٹے تھے جیسے تیسے گزر ہوتی جاتی تھی، مگر جب لڑکیاں بڑی بڑی ہو گئیں۔ تو ایک کمرے میں سب کے ساتھ رہنے میں قباحتیں پیدا ہونے لگیں۔ آخر پروفیسر سہیل نے ایک سوسائٹی کی وساطت سے چھ سو مربع گز زمین شہر کے باہر ایک کھلے علاقے میں خرید لی۔ پندرہ ہزار روپیہ حکومت سے قرض مل گیا۔ کوئی تین ہزار روپیہ پاس تھا۔ کالج سے دو مہینے کی چھٹی لی اور مکان بنوانے میں مصروف ہو گیا۔

ناتجربہ کاری کی وجہ سے بسم اللہ ہی غلط ثابت ہوئی۔ جس ٹھیکہ دار کو مکان بنانے کا ٹھیکہ دیا گیا۔ وہ دو ایک روز پلاٹ پر آیا اور زمین پر کچھ نشانات وغیرہ لگائے۔ یہ کام ایک رسم کی صورت میں جس کے دوران میں آس پاس کے مستریوں اور مزدوروں میں شیرینی بانٹی گئی عمل میں لایا گیا۔ اس سے فارغ ہو کر اس نے پروفیسر سے پانچ سو روپے پیشگی مانگے جو اسی وقت دے دیئے گئے۔ دوسرے روز ٹھیکہ دار کچھ ایسا گم ہوا کہ شہر ہی سے روپوش ہو گیا۔ پروفیسر کی بیوی نے یہ سنا تو اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ وہ دیر تک آنسو بہاتی رہی۔ آخر یہ تجویز پائی کہ آئندہ کام ٹھیکے پر نہیں بلکہ امانی پر کرایا جائے۔

چاند خاں کسی دفتر میں چپراسی تھا۔ وہ تھا تو ادھیڑ عمر کا مگر اس کا جسم خوب گٹھا ہوا تھا۔ دن بھر سائیکل چلا چلا کے اس کی ٹانگیں تو مضبوط ہو گئی تھیں مگر رنگ کالا پڑ گیا تھا۔ وہ اپنی بڑھیا ماں، بیوی، دو بیٹوں اور ایک بیٹی کے ساتھ جھونپڑیوں میں رہا کرتا تھا۔ بڑا بیٹا علی الصباح اخبار بانٹتا تھا۔ چھوٹا بیٹا اسکول جاتا۔ بیٹی محلے کے ایک بابو کے گھر میں دس روپے ماہوار اور ایک وقت کے کھانے پر برتن مانجھنے جایا کرتی تھی۔ چاند خاں کو ستر مربع گز زمین

سا نگڑا اور چھ سو روپیہ قرض ملا۔ اس کی بیوی نے اپنے چاندی کے کڑے اور پازیبیں اتار کر میاں کو دیں کہ انہیں بیچ کر مکان پر لگا دو وہ کانوں سے چاندی کی بالیاں بھی اتارنا چاہتی تھی، مگر میاں نے روک دیا کہ ان کے تو کوئی بارہ آنے بھی نہیں دے گا۔ شام کو چاند خاں کی بیوی نے محلے کے گوالے سے، جو سائیکل پر دودھ بیچنے جایا کرتا تھا، کہا "تمہارے بھیا مکان بنوا رہے ہیں۔ پیچھے دو کمرے آگے دالان کوئی کرایہ دار ہو تو ذرا دھیان رکھنا"

ایک فوجی افسر کو، جس کی لمبی لمبی اکڑی ہوئی مونچھیں تھیں، ایک ہزار گز مربع زمین ملی۔ وہ ہر روز ڈیوٹی سے فارغ ہوتے ہی، وردی سمیت ٹرک پر سیدھا اپنے زیر تعمیر مکان پر پہنچ جاتا۔ اور پیٹی میں پستول لٹکائے گھنٹوں کڑی دھوپ میں راجوں، اور مزدوروں کے درمیان چکر لگاتا رہتا۔ کبھی کبھی وہ ان سے اپنے جنگِ عظیم کے کارنامے بھی بیان کرتا۔ اس کے پاس جو پستول تھا وہ اس نے بقول خود ایک جرمن سپاہی کو قتل کر کے چھینا تھا۔

پروفیسر سہیل کے مکان کی نیو کھد چکی تھی، اور اب لوہے کے سریے کھڑے کئے جا رہے تھے کیونکہ اس نے ملبر شائل کو پسند کیا تھا۔ وہ ہر روز اپنے ہاتھ سے ایک کتاب میں مستریوں اور مزدوروں کی حاضری درج کرتا، اور ہفتے کے ہفتے سب کا حساب چکتا کر دیتا۔ ایک مستری کو جو شکل صورت سے بڑا تجربہ کار معلوم ہوتا تھا۔ اس کی روزانہ اجرت کے علاوہ پچاس روپے ماہوار زائد دینا مقرر کیا تھا تاکہ وہ کام کی نگرانی بھی کرتا رہے۔ یہ اس لئے کہ اوّل تو پروفیسر تعمیری کام سے کچھ واقفیت نہیں رکھتا تھا، دوسرے وہ ہر وقت وہاں موجود بھی نہیں رہ سکتا تھا، مگر اس مستری کی نگرانی کے باوجود کام بہت دھیرے دھیرے ہو رہا تھا۔ اس سلسلے میں جو اطلاعات چوکیدار اور دوسرے ذریعوں سے اس کے کانوں تک پہنچیں ان کا خلاصہ یہ تھا:

یہ مستری خود اپنے ہاتھ سے کوئی کام نہیں کرتا، اور ہر ایک پر بڑی دھونس جماتا ہے۔

یہ صرف ان ہی کاری گروں اور مزدوروں کو رکھتا ہے جو اپنی اجرت سے ایک خاص رقم بطور کمیشن اسے دینا منظور کرتے ہیں۔ مزدوروں کو چونکہ پوری مزدوری نہیں ملتی اس لئے وہ دل لگا کے کام نہیں کرتے۔

علاوہ ازیں آئے دن جھگڑے بھی ہوتے رہتے۔ اور سیمنٹ کی بوریوں کی گنتی میں تو ہر روز ہی کچھ نہ کچھ گڑبڑ ہو جاتی۔ سہیل سب کچھ دیکھتا، سنتا مگر زبان سے کچھ نہ کہتا۔

ایک دن شام کو جب سب راج مزدور چھٹی کر گئے اور چوکیدار نماز پڑھنے میں مشغول ہو گیا، تو پروفیسر کا ایک ہمسایہ جس کا مکان کوئی دو سو گز ادھر بن رہا تھا، اس کے پلاٹ پر آیا، اور کہنے لگا:۔

"کیا آپ سچ مچ اپنا سیمنٹ بیچنا چاہتے ہیں؟"

"نہیں تو۔ کیوں کیا بات ہے؟"

"کل آپ کا مستری دو مزدوروں کی پیٹھ پر دو بوریاں اٹھوائے میرے پاس آیا تھا اور میرے ہاتھ فروخت کرنا چاہتا تھا مگر میں نے لینے سے انکار کر دیا۔ اس پر وہ مزدوروں کو لئے ہوئے کسی اور طرف چل دیا"

پروفیسر سہیل نے مستری کو موقوف کر دیا، اس کے ساتھ ہی کام رک گیا۔ نئے مستری کی جستجو میں کئی دن لگ گئے اور کام بند پڑا رہا۔

چاند خاں چپراسی نے ایک مستری سے دوستی گانٹھی۔ وہ سگرٹ بیڑی اور چائے سے اس کی تواضع کرتا۔ اور اس کو خوش کرنے کے لئے بڑی چاپلوسی کی باتیں کرتا۔ اور بڑے بڑے افسروں کی گھریلو زندگی کے واقعات مزے لے لے کر بیان کرتا۔ دونوں کی خوب گاڑھی چھننے لگی جس دن دفتر میں چھٹی ہوتی، چاند خاں اور اس کے بیٹے خود مزدوروں کی جگہ کام کرتے۔

اس کے گھر کی دیواریں کھڑی ہو چکی تھیں۔ اور دروازوں اور کھڑکیوں کی چوکھٹیں بھی چنائی میں لے لی گئی تھیں۔ مگر چھت تک پہنچتے پہنچتے اچانک اس کے پاس دام ختم ہو گئے۔ اس نے اپنے چھوٹے بھائی کو جو کسی دوسرے شہر میں آڑھت کی دوکان کرتا تھا، خط لکھا کہ میں سخت بیماری کی حالت میں ہسپتال میں پڑا ہوں۔ روپے کی سخت تنگی ہے، جیسے بھی ہو دو سو روپے فوراً بھیج دو۔ دو ہفتے گزر گئے، مگر ادھر سے کوئی جواب نہ آیا۔ چاند خاں نے بھائی کو بھاری بھاری مغلظات جو چاند خاں ہی سنا سکتا تھا، سنائیں، اور سود پر قرض دینے والے پٹھانوں کی تلاش شروع کر دی۔

ایک دن ایک برقعہ پوش عورت جہاں جہاں مدد لگ رہی تھی

جاتی ہوئی دیکھی گئی۔ وہ لوگوں کو اس طرح خطاب کرتی تھی :۔

"اے مسلمان بھائیو میں بیوہ ہوں۔ میرا خاوند مکان بنوا رہا تھا کہ اچانک مر گیا، میں بے یار و مددگار ہوں اللہ میرے یتیم بچوں پر ترس کھاؤ۔ اور مجھے کوئی ایماندار اور نیک مستری دلواؤ۔"

سب مستری اور راج مزدور اپنا اپنا کام چھوڑ کر بڑے غور سے اس کی بات سنتے۔ اور جب وہ اپنا مدعا کہہ چکتی تو اسے کوئی جواب دیئے بغیر پھر اپنے اپنے کام میں مصروف ہو جاتے۔

دو باپ بیٹے اپنی نگرانی میں مکان بنوا رہے تھے۔ باپ کو تعمیر کے کام کی خاصی سوجھ بوجھ تھی۔ بیٹا حساب کتاب اور لین دین میں بڑا ہوشیار تھا۔ لوہا بندھ چکا، سنٹرنگ ہو چکی۔ اور ایک خاص دن چھت ڈالنے کے لئے مقرر کر لیا گیا۔ مگر اس دن نہ تو مستری ہی پہنچا اور نہ بھرائی والے ہی آئے۔ آخر باپ بیٹوں نے ادھر ادھر سے دو چار مزدور اکٹھے کئے۔ اور خود ہی چھت ڈالنے پر تل گئے۔ کہتے ہیں کہ یہ چھت آٹھ روز میں جا کے پڑی۔ ایک ایک کمرے پر دو دو دن خرچ ہوئے۔ اس واقعے کا اس نواح میں کئی روز بڑا چرچا رہا۔

ایک وکیل صاحب نے زمین کا ٹکڑا تو خاصا بڑا خرید لیا تھا، مگر مکان بنانے کی استطاعت نہ تھی۔ انہوں نے صرف ایک کمرہ اور ایک باورچی خانہ بنوایا، اور دیواروں پر پلستر، سفیدی یا رنگ روغن کرائے بغیر باقاعدہ رہنا شروع کر دیا۔ ان کا کنبہ خاصا بڑا تھا۔ رات کو یہ لوگ لالٹین جلاتے۔ چونکہ یہ پلاٹ سر راہ تھا جس پر راہ چلتے کی نظر پڑتی تھی اس لئے انہوں نے کچا ڈنڈی دیوار کی جگہ بڑی محنت سے جنتر کی باڑھ اگا دی تھی جس سے خاصا پردہ ہو گیا تھا۔ مگر جب کبھی مٹی ڈھونے والوں کے گدھے اس طرف سے گزرتے تو وہ اس ہریال پر بری طرح ٹوٹ پڑتے، اور دیکھتے ہی دیکھتے جنتر کے درجنوں پودے چر جاتے۔ اس پر گھر کے سب لوگ جو زن و مرد اور بچوں سمیت تعداد میں دس تھے، شور مچاتے ہوئے باہر نکل آتے۔ اور ڈنڈے اور پتھر مار مار کر گدھوں کو بدحواس کر دیتے۔

پروفیسر سہیل کے ہاں تعمیر کا کام پھر شروع ہو گیا تھا۔ اپنے پچھلے تلخ تجربے کے بعد جس میں اس کی نصف سے زیادہ چھٹی یونہی ضائع ہو گئی تھی اس نے ٹھان لی تھی کہ وہ مستریوں اور مزدوروں کی بے ایمانیوں پر چشم پوشی کرے گا۔ اور ان سے کچھ تعرض نہیں کرے گا۔ وہ دیکھتا کہ بعض کاریگر دوپہر کو کھانا کھانے کے بعد اپنے ٹفن کے خالی ڈبوں کو سیمنٹ سے بھر لیتے ہیں۔ وہ دیکھتا کہ لوہار۔ لوہا باندھنے والے تار کے پونڈ کے پونڈ غائب کر دیتا ہے۔ وہ دیکھتا کہ بڑھئی پیمائش کر کے اس سے جتنی لکڑی منگواتا ہے اس سے آدھے دروازے اور کھڑکیاں بھی نہیں تیار کر پاتا۔ اور ہر روز شام کو وہ سیمنٹ کی خالی بوری میں لکڑی کے کئی کارآمد ٹکڑے برادے کے ساتھ بھر کر سائیکل کے پیچھے باندھ لے جاتا ہے۔ وہ دیکھتا کہ چوکیدار مستریوں کے ساتھ ملا ہوا ہے۔ اور وہ سب مل کر اسے لوٹ رہے ہیں۔ رات کو وہ اپنی بیوی سے ان لوگوں کی دغابازیاں بیان کرتا۔ وہ سنتی اور چپکے چپکے آنسو بہاتی رہتی۔

اس کی دو مہینے کی چھٹی ختم ہو گئی۔ اور وہ پھر کالج جانے لگا۔ مگر اس کا دل پڑھانے میں مطلق نہ لگتا۔ اس کا دوپہر کا کھانا بالکل چھوٹ گیا تھا، کالج سے گھر جانے کے بجائے وہ اپنے پلاٹ کا رخ کرتا۔ اور وہاں سے شام کو بڑی دیر میں گھر پہنچتا۔

غضب یہ ہوا کہ ابھی مکان کا بہت سا کام باقی تھا۔ کہ مستریوں کی بے ایمانیوں، عمارتی سامان کی نایابی اور بلیک مارکٹ کے باعث اس کا سرمایہ ختم ہو گیا۔ رفتہ رفتہ بیوی کے زیورات، ریڈیو، بائیسکل کپڑا سینے کی مشین، کیمرا، اور کئی دوسری مفید چیزیں مکان کی بھینٹ چڑھ گئیں۔ اس کے پاس نایاب کتابوں، قلمی تصویروں اور پرانے بادشاہوں کے سکوں کا بہت قیمتی ذخیرہ تھا۔ وہ سب کوڑیوں کے مول بک گیا۔ اس کی آدھی سے زیادہ تنخواہ مکان پر اٹھ جاتی۔ اس نے سگرٹ پینا چھوڑ دیا۔ گھر میں دونوں وقت دال بھاجی پکنے لگی۔ گھر میں کسی کے پاس پہننے کو کوئی کام کا کپڑا نہ رہا۔ کالج پرنسپل سمیت کوئی پروفیسر یا لکچرار ایسا نہ تھا جس کا وہ سو پچاس کا مقروض نہ ہو۔ وہ شب و روز غموں اور فکروں میں گھلنے لگا اس کی صحت جواب دینے لگی۔

جس علاقے میں پروفیسر سہیل کا مکان بن رہا تھا، اس کے قریب ہی چار سو گز کے پلاٹ میں ایک دفتر کے سپرنٹنڈنٹ کا مکان بھی زیر تعمیر تھا۔ سپرنٹنڈنٹ نے اپنے اثر و رسوخ سے ہر کام سستے داموں کرایا تھا۔ پھر بھی مکان تیار ہونے میں چار پانچ ہزار روپے کی کسر رہ گئی۔ یہ رقم اس نے ایک انجینئر سے دو سال کے پیشگی کرائے کے طور پر حاصل کرلی۔ جب مکان بن کر تیار ہوا تو سپرنٹنڈنٹ کی بیوی جو مصری وضع کا برقع پہنتی تھی اپنے نصف درجن بچوں کو لیکر اس پر قابض ہوگئی۔ انجینئر یہ دیکھ کر بہت سٹپٹایا۔ مگر سپرنٹنڈنٹ نے اس سے درخواست کی۔ کہ چند روز میرے بیوی بچوں کو نئے مکان کا چاؤ پورا کرلینے دو۔ پھر ہم اسے خالی کردیں گے۔

مگر یہ چند روز رفتہ رفتہ ہفتوں میں تبدیل ہوگئے —
اب سپرنٹنڈنٹ نے انجینئر کی خوشامد کی۔ کہ ہمیں اسی مکان میں رہنے دیا جائے۔ ہمارے پاس رہنے کو کوئی جگہ نہیں۔ میں آپکا روپیہ ماہانہ قسطوں کی صورت میں ادا کردوں گا۔

اس پر انجینئر نے وکیل کے ذریعے اسے نوٹس دیا۔ اور قانونی چارہ جوئی کرنے کی دھمکی دی۔ آخر میں سپرنٹنڈنٹ نے مکان خالی کردینے ہی میں مصلحت سمجھی۔ جس وقت اس کی بیوی گھر سے نکلی تو اس کی آنکھوں میں آنسو بھر بھر آرہے تھے۔

ایک اونچے عہدہ دار نے دو ہزار مربع گز زمین پر ایک عالی شان کوٹھی تعمیر کی۔ اور اس میں ایک خوش نما باغیچہ بھی لگوایا۔ جب کوٹھی تیار ہوئی تو اس کا نام "نفیس" تجویز ہوا۔ ایک دوست نے مشورہ دیا۔ کہ اس پر "ھٰذا من فضل ربی" بھی لکھوا دیا جائے۔
عہدہ دار نے اس رائے کو پسند کیا۔ اور جلی خط نسخ میں یہ الفاظ کوٹھی کی پیشانی پر کندہ کرادیئے۔ دو ہفتے بھی نہ گزرنے پائے تھے کہ یہ کوٹھی جس پر کوئی نوّے ہزار روپے کے قریب لاگت آئی تھی ڈیڑھ لاکھ میں بک گئی۔

چاند خاں کو بالآخر ایک کرایہ دار مل گیا۔ جس نے حامی بھرلی۔ کہ میں تمہارے ادھورے مکان کو مکمل کرادوں گا بشرطیکہ تم مجھے اس میں ابھی سے بس جانے دو۔ چاند خاں کو مجبوراً اس کی یہ شرط منظور کرنی پڑی۔ اس کی بیوی نے اس خوشی میں پورے من بھر دودھ کی کھیر پکوائی اور سارے جھونپڑیوں کے رہنے والوں کا منہ میٹھا کرایا۔

خدا خدا کر کے پروفیسر سہیل کا مکان تکمیل کو پہنچا۔ مگر وہ اس قدر خراب بنا تھا۔ کہ اس کے اندر جاتے ہوئے پروفیسر کا دم گھٹتا تھا۔ دیواروں میں کوب، کھڑکیاں اور دروازے ٹیڑھے بینگے۔ برآمدہ بے ڈھنگا ایک طرف سے چھوٹا ایک طرف سے بڑا۔ فرشوں پر ابھی سے دراڑیں پڑ گئی تھیں۔ پھر اسے یہ بھی یقین نہ تھا۔ کہ اس کی تعمیر میں مستریوں نے لوہا اور سیمنٹ پوری مقدار میں خرچ کیا ہوگا۔

کئی دن تک وہ مکان خالی پڑا رہا۔ آخر ایک دوست کے کہنے پر اسے کرائے پر اٹھانے کے لئے ایک اخبار میں اشتہار دیا۔ دو روز میں اسے کوئی پندرہ بیس خطوط وصول ہوئے جن میں نصف کے قریب غیر ملکیوں کے تھے۔ یہ لوگ سفارت خانوں یا تجارتی فرموں سے تعلق رکھتے تھے۔ اور مکان نہ ملنے کے باعث ہوٹلوں میں بھاری کرائے ادا کر رہے تھے۔

اس نے تین چار اچھی اچھی اسامیوں کو منتخب کیا، اور مکان دکھانے کے لئے بلوایا۔ اس کے اچنبھے اور خوشی کی حد نہ رہی جب ان لوگوں میں سے کسی نے بھی ان نقائص کو محسوس تک نہ کیا جو وہ اپنی دانست میں اپنے مکان میں پاتا تھا۔ آخر ایک شخص کو اس نے مکان کرائے پر دیدیا۔ اس سے اسے اتنی رقم پیشگی کرائے کے طور پر مل گئی، جس سے اس کی آدھی کے قریب مکان کی لاگت وصول ہو جاتی تھی۔

اس کاروبار کو یوں خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دینے کے بعد وہ خوشی خوشی گھر پہنچا۔ اور بیوی سے کہنے لگا:۔
"اچھا ہی ہوا کہ ہم خود اس مکان میں نہیں گئے۔ کیونکہ اس کی بناوٹ بڑی ناقص ہے۔ مگر اب مجھے مکان بنوانے کا کافی تجربہ ہوگیا ہے۔ اب کے میں انتہائی احتیاط سے کام لوں گا۔ اور ایسا مکان بنواؤں گا جو بے عیب ہوگا۔ اور کوئی چاہے کتنا ہی کرایہ دے میں منظور نہیں کروں گا۔ وہ مکان ہمارے اپنے رہنے کے لئے ہوگا۔ کیونکہ لڑکیاں بڑی بڑی ہوگئی ہیں۔ اور ہم سب کا ایک کمرے میں رہنا ٹھیک نہیں۔"

اس نے اخبار اٹھایا، اور اس کا وہ کالم بڑے غور سے پڑھنے لگا۔ جس میں زمینوں کی خرید و فروخت کے اشتہار دیئے ہوئے تھے ٭

افسانہ:

گلابِ خاص

ابوالفضل صدیقی

آموں کے تین سالہ تاریخی مقابلہ کی تیاریاں بڑے زور شور سے ہو رہی تھیں اور حسنِ اتفاق سے اس سال فصل بڑی اچھی تھی اور بور لگنے ہی سے موسم سازگار چلا آ رہا تھا، اودھ اور روہیلکھنڈ کے باغ اور نرسری رکھنے والے زمیندار حسبِ معمول پانچ سال سے تیاریاں کر رہے تھے، اور ہمیشہ کی طرح اس سال کے شروع سے ہی سرگرمیوں میں شدت پیدا ہو گئی تھی۔ آموں کی نمائش تو ہر سال ہوا کرتی تھی، مگر نئے آموں کی ایجاد اور ترقی کا مقابلہ پانچ سال بعد اسی نمائش کے ساتھ ہوا کرتا تھا۔ یہ پانچوں سال اپنی اپنی تیاریوں اور مقابل کی تیاریوں کے راز معلوم کرنے کی کوشش میں گزرتے تھے۔ اس سلسلہ میں بڑی بڑی سازشیں ہوتیں، ایک دوسرے کے نوکر اور مزدور لالچ دے کر توڑے جاتے، نرسریوں میں بھید لگانے کی سکیمیں بنتیں۔ پھر گھر گھر کے زمینداروں کی قبیلہ داری قسم کی لاگ ڈانٹ کے ساتھ ساتھ اودھ روہیلکھنڈ کی تاریخی چشمک بھی بروئے کار رہتی۔ "شمالی ہند" اور "جنوبی ہند"، "بنگال بہار" اور "یو۔پی"، "مرشد آباد، دربھنگہ" اور "اودھ روہیلکھنڈ" میں کرتے، بڑی بڑی دھڑے بندیاں ہوتیں۔ مرشد آباد اور دربھنگہ والے اودھ والوں کی سیادت تسلیم کرنے کو تیار نہ تھے، وہ ہر مقابلہ میں دو چار ایسے آم پیش کرتے کہ اودھ اور اودھ کے ساتھ اودھ کے حلیف روہیلکھنڈ کی آنکھیں پھٹی رہ جاتیں۔ لیکن روہیلکھنڈ والے اودھ والوں کی سیادت منہ سے تسلیم نہ کرنے پر بھی دل سے لوہا مانے ہوئے تھے، اور خوب سمجھتے تھے کہ اودھ والوں میں آم کی تجدید اور جستجو کا فن بہت بڑھا ہوا ہے۔

مقابلہ تو ہمیشہ بڑا کڑا رہتا تھا اور اودھ کے ہاتھ میدان یوں زیادہ چلا آ رہا تھا کہ اودھ کے گھر گھر سے دو چار نئے آم پانچوں سال ایجاد ہو کر نکلتے تھے اور روہیلکھنڈ، بہار، بنگال وغیرہ میں یہ شوق اتنی عمومیت پائے ہوئے نہ تھا۔ لیکن اس سال شہرت تھی کہ مقابلہ بڑے زور کا رہے گا۔ اور بھانت بھانت کی افواہیں بنگال سے لے کر اودھ روہیلکھنڈ تک گشت کر رہی تھیں، اور مشہور تھا کہ روہیلکھنڈ والے بڑی تیاریوں کے ساتھ آ رہے ہیں۔ اس میدان میں ویسے تو ایک سے ایک بڑھ کر باون گزا ہی اترتا تھا اور یہ مقابلہ سادات اودھ کی یادگار تھا، مگر روہیلکھنڈ کے خمیر میں مخصوص طرز کی سیادت منوانے کے ساتھ ساتھ روہیلوں کے دورِ حکومت سے کچھ تاریخی قسم کی جمہوریت کا رجحان پایا جاتا ہے۔ انہوں نے چھوٹے چھوٹے زمینداروں اور کسانوں کی عوامی قسم کی طاقت کے زور پر اٹھارہویں صدی کے تاریک دور میں نواب اودھ، وارن ہیسٹنگز، نواب بنگش اور شہنشاہ دہلی سب کو ایک آواز چیلنج کیا تھا، اور حافظ رحمت خاں کی بے وقت شہادت کے بعد روہیلکھنڈ فتح ہو جانے پر بھی ایک قسم کا جمہوری مزاج تمام روہیلکھنڈ کے جاگیردار طبقہ میں پایا جاتا تھا، لہٰذا مقابلہ میں کبھی کبھی اپنے یہاں کے معمولی کاشتکاروں کی بھی دو ایک ایجادیں لے آیا کرتے تھے۔ اگرچہ وہ کبھی معیار پر پوری نہ اتر سکیں۔

ویسے آموں کے مقابلے کے علاوہ یوں بھی روہیلکھنڈ کے بانکے چودھری، ملیح آباد کے افغان سورت پٹھان، اور شاہجہانپور، بریلی، رام پور کے اکھڑ روہیلے، شاہ آباد کے جلالی سید، جنہوں نے اپنی اپنی ایجادوں سے دنیا بھر کو آم کی کاشت کا کچھ دیا تھا، جس وقت اپنے اپنے خاندانی جھگڑوں میں بگڑ بیٹھتے تھے تو ہاتھی مارنے کی بندوقیں درمیان میں آ کر فیصلہ کیا کرتیں اور انہوں کے سینوں پر چاندماری کے ہدف کی طرح گولیاں دے مارتے تھے۔ لیکن آموں کے مقابلہ میں اپنے اپنے علاقہ کی کامیابی اور

فتح کی کوشش میں ایک نظر آتے۔ اور باہر والوں کے ساتھ مہمان نوازی میں ایسے نرم کہ ریشم کے رومال سے کلائیاں باندھ باندھ کر اور ہاتھ جوڑ کر اور پاؤں پر ٹوپی ڈال کر مہمان کو ٹھہرانے کا اصرار کریں اور دوستوں اور مہمانوں کا بیت المقدس سے بڑھ کر احترام کریں۔ کھانے اور کھلانے والے ایسے زندہ دار سواتی کہ آم کی فصل میں اشتہار عام دیدیں کہ "لوٹ عام ہے" اور جو کوئی خواہ ہمارا شناسا ہو یا نہ ہو، ہمارے نام پیسے کے کارڈ پر فرمائش بھیج دے گا۔ اس کے نام تحفہ میں پارسل پہنچے گا۔ ادنیٰ پٹواری سے لے کر وائسرائے تک اور فقیر سے لے کر امیر تک یکساں دریادلی کے ساتھ آم کھلاتے۔ اور خود کھانے بیٹھتے تو صبح سے شام اور شام سے صبح تک منہ چلتا ہی رہتا اور بقول شخصے کہ رس نتھنوں سے بہنے لگتا اور منہ سے آم نہ چھوٹتا۔ اور پھر جب آم کے نشہ سے دھت ہو کر اور برف دودھ کے گلاس چڑھا کر سونے پڑائیں تو سولہ سولہ گھنٹہ کی خبر لائیں اور دوپہر کے سوئے کہیں کسی روز آدھی رات آنکھ کھل جائے تو کھانے کی بھوک میں آمولیا کی ترنگ لگا کر بستر سے اٹھیں۔ اور ساون بھادوں کی اندھیری رات میں یہ سے باغ فارغ کریں اور سنا تی لکتی پروائی میں بجلی کی چمک کے سہارے گھنے درختوں کے نیچے آم ٹٹولتے نظر پڑیں، اور لہراتے کلکتے سانپوں کا ڈر بھی دھیان میں نہ لائیں۔ غرض پوری فصل آم کھانے اور آم کھلانے، آم بھیجنے اور آم منگانے کے سوا کوئی مشغلہ نہ ہوتا۔ دنیا آم ہی آم ہوتی اور زندگی نام آم کا ہوتا جاگتے میں آم پر بحث، اور سوتے میں آم کے خواب، اور جب آنکھ کھلتی تو غنودگی میں بستر کی چادر اور تکیہ پر ایسا محسوس ہوتا کہ تین تین انچ رس اور گودے کی تہہ چڑھی ہے۔

ہر سال آموں کی نمائش کی تیاری تو حد سے زیادہ سرگرمی کے ساتھ ہوتی اور پنج سالہ مقابلہ میں تو عسکری اہمیت کا سماں باندھ دیتے اور اپنے متعلقین میں چھوٹے بڑے کی توجہ اسی پر مرکوز کر دیتے۔ آموں کے مقابلہ میں تو مرشد آباد، بہار، بنگال اور آسام تک کے آم رکھے جاتے۔ یو۔ پی کے پچھمی اضلاع اور وسط ہند کی بھی ایک آدھ ایجاد پیش ہوتی، لیکن اصل مقابلہ اودھ رودہیلکھنڈ اور مرشد آباد کے ہی درمیان ہوتا اور تقریباً ہمیشہ میدان اودھ کے ہاتھ رہتا۔ لیکن ہر مرتبہ دس پانچ نئے پھل روہیلکھنڈ اور مرشد آباد والے بھی نمائش اور مقابلہ میں ایسے پیش کر دیتے کہ اودھ والے چکرا جاتے۔ جب کبھی مرشد آباد والے بڑھتے معلوم ہوتے تو پورب اور پچھم کا مسئلہ اٹھ جاتا۔ اور بنگال اور یو۔ پی کا سوال آپڑتا اور اودھ اور روہیلکھنڈ والے مبصرین متفق ہو کر کثرت رائے سے مرشد آباد کو شکست دے دیتے مگر ایجاد کا لوہا تو دل میں ماننا ہی پڑتا۔ اس وقت انعام نمبر ایک اور دو چپکے سے قرعہ اندازی کے ذریعہ اودھ اور روہیلکھنڈ آپس میں تقسیم کر لیتے۔

آغا صاحب کا بڑا باغ تھا اور بڑے پیمانہ کی نرسری اور خان صاحب کا اس سے بڑا باغ تھا مگر نرسری کا انتظام اتنا معقول نہ تھا جتنا آغا صاحب کے یہاں تھا، ویسے نرسری بھی باغ کے رقبہ کے مطابق تھی۔ دونوں کا اعلان تھا کہ ہم صرف پتہ فروشی کرتے ہیں اور پھل فروشی کو عار خیال کرتے ہیں۔ دونوں اکبر الٰہ آبادی کے اس شعر پر عامل تھے کہ ؎

ایسا نہ ہو کہ آپ لکھیں یہ جواب میں
تعمیل ہوگی پہلے مگر دام بھیجئے

ان کے باغوں کے ہزاروں اقسام کے لاکھوں آم فصل پر مفت تقسیم ہو جاتے اور سارے ملک میں نرسری کی قلمیں بکتیں، اور آموں کی مفت تقسیم میں ساونتی فیاضی سے زیادہ تجارتی اشتہار بازی کو دخل تھا۔ اس طرح مفت آم کھلا کھلا کر پودوں کا نمونہ دیکر اشتہار دیا کرتے۔ اور جاگیردارانہ فیاضی اور تواضع کی آڑ میں تاجرانہ پردہ پوشی ہوتی۔ ہر سال ہزاروں پودوں کے آرڈر آتے اور آم کی اقسام کے لحاظ سے پودوں کی قیمت ہوتی، ویسے گھٹیا بڑھیا ہر آم کی قلم تیار کرنے میں لاگت تو وہی ۳ر فی پودا آتی مگر لنگڑا، بمبئی، سفیدا، دسہری مالدہ، فجری وغیرہ عام دستیاب ہونے والے اقسام کے پودوں کی قیمت ایک روپیہ فی قلم رکھی تھی اور جتنی تھدیریں کرتے گئے اور نئے نئے آم پیدا کرتے گئے اتنی ہی ان کے پھلوں کی اعلیٰ خصوصیات اور کمیابی کے سبب پودوں کی قیمت کا تعین کرتے رہے یہاں تک کہ ملیح آباد والوں نے "شمس الاثمار" کی قیمت چار سو روپیہ فی پودا قائم کی اور شاہ آباد والوں نے "مٹنے بے خودی" کی قیمت پانچ سو روپیہ فی پودا رکھی اور ملیح آباد والوں نے "ثمر بہشت چوسنہ" کا نام "گوہری کمال" رکھ کر اس کی قیمت سو روپیہ رکھی۔ بڑی زبردست معاصرانہ چشمکیں چلتیں۔ سال کے سال بورڈ کے سامنے بے ضوابطیوں کی شکایتیں گزرتیں، داد رسی ہوتی، تادیبیں ہوتیں اور کارخانوں کی لسٹوں میں بورڈ کے فیصلوں کے مطابق ترمیمیں، تنسیخیں ہوتیں اور یہ نرسری مین قسم کے خاندانی زمیندار عجیب قسم کی مجسمہ منفی تاجرانہ اور جاگیردارانہ ذہنیتوں کے حامل بن کر رہ گئے تھے۔

آموں کی نمائش کے لئے یہ جگہ مخصوص تھی یہاں پر روہیلکھنڈ اور اودھ کی سرحدیں ملتی تھیں، ویسے خالص دیہاتی علاقہ تھا۔ مگر زمینداروں کی توجہ خاص کا مرکز رہا تھا۔ میلوں لمبے لمبے چوڑے علاقہ میں باغ ہی باغ نصب تھے، زمینداروں نے اپنے اپنے کئی کئی گاؤں کے رقبوں کو ملا کر باغ لگائے تھے اور چونکہ اور کاشت نہ تھی لہٰذا دیہاتی مرد و عورت چھوٹی اجرت پر دستیاب ہو جاتے تھے، دیہاتی اسٹیشن سے پودوں اور پھلوں کا لدان بہت آسانی سے ہو جاتا تھا۔ اور کہتے یہ تھے کہ اس علاقہ کی زمین آم کی پیداوار کے لئے بہت سازگار ہے۔ اگرچہ اس میں بجز اپنی تاجرانہ مصلحتوں کے اور کوئی بات نہ تھی۔ یو۔پی کے پورے صوبہ کی زمین کا چپہ چپہ آم کے لئے نہایت سازگار ہے۔

آموں کے مقابلہ کی بڑی شہرت تھی، نمائش کا سالانہ انتظام اور پانچ سال بعد مقابلہ کا انتظام۔ خاں صاحب اور آغا صاحب کے سر رہتا۔ پچھلے مقابلہ میں "ثمر بہشت ہوفسہ" اور "آمن ابراہیم پور" اول اور دوئم انعامات لے گئے تھے یہ دونوں آم خاں صاحب کے تھے اور خاں صاحب کو فکر تھی کہ کہیں اس مرتبہ کوئی آم ان کے آموں سے بڑھ نہ جائے، ویسے انہوں نے بھی چند نہایت نفیس آم ان پانچ سال میں پیدا کر لئے تھے۔ وہ دن رات اس فکر میں تھے کہ انہیں کسی صورت سے آغا صاحب کے یہاں کا وہ خاص آم جو اس مرتبہ مقابلہ میں پیش کرنے والے ہیں، مل جائے تاکہ وہ پہلے سے اس کی خصوصیات سے آگاہ ہو جائیں اور پھر اپنے دونوں پچھلے جیتے ہوئے آموں اور نئے تیار کئے ہوئے آموں سے اس کا تقابل کر کے فیصلہ کر سکیں کہ انہیں اس مرتبہ میدان میں نیا آم اتارنا چاہیئے یا وہی پرانے آم رکھنا چاہئیں۔ پانچ سال سے آغا صاحب کے نئے پیدا کئے ہوئے آموں کی شہرتیں اور افواہیں سن سن کر خاں صاحب ڈر رہے تھے کہ کہیں تین پشت کی بنی بنائی سیادت گرد نہ ہو جائے۔ جوں جوں مقابلہ کا وقت قریب آ گیا، خاں صاحب کے جذبات شدت پکڑتے گئے۔ اور تین پشت سے یہی ہندوستانی، مگر اصل نسل سے تو افغان بچہ تھے ہی؛ اپنی اصل پر پلٹ پڑے اور جس راز کو پانے کے لئے وہ پانچ سال سے سرگرداں تھے اس کے حصول میں آخری اور انتہائی اقدام کر بیٹھے۔ رات تو بڑے غضب کی تھی اور ایسے اقدامات کو پکار پکار کر دعوت دیتی تھی، اساڑھ کی بھیانک نم، رات جب آسمان پر سیاہ بادل چھائے ہوتے ہیں اور زمین ساری کیچڑ بنی ہوتی ہے اور انہیں آغا صاحب کے چند نوکروں کی سازش سے مقابلہ میں آنے والے آموں کے درختوں کی بابت تو معلوم ہی ہو گئی تھی، اس مطلب کے چند مخصوص دل چلوں کو اشارہ کیا، اور یہ جانباز رات بھیگی پر رکھ کر آغا صاحب کے باغ میں داخل ہو گئے اور مقابلہ میں آنے والے آموں کے چند دانے اور دو پودے لے کر چلے آئے، محافظوں پر برسات کی پروائی کا نشہ، آم کے رس کا نشہ اور تکان کا نشہ سوار تھا کتے بھی سوئے پڑے رہے، صبح تک کسی کو خبر نہ ہوئی، مگر آغا صاحب تو روزانہ آکر معائنہ کرتے تھے، صبح کو درخت پر پہلی نظر ڈالتے ہی بھانپ لیا کہ رات آم چوری ہو گئے اور پھر پودوں کے گملے بھی کم پائے، آپے سے باہر ہو گئے، پہلے تو محافظوں سے مطالبہ کیا لیکن سختی نہ کی، اور سراغ رسی میں مشغول ہو گئے اور صبح ہی صبح برسات میں سراغ رسی تو بڑی آسان تھی، زمین نم اور نرم تھی اور آغا صاحب کے باغ سے خاں صاحب کے باغ تک چوروں کے نشانات قدم بنے چلے گئے تھے۔

آغا صاحب ایرانی نژاد تھے اور مغل دور میں یہاں کے جاگیردار ہوئے تھے۔ اگر خاں صاحب کو دس پانچ آدمی رات میں اپنی مطلب برآری کے لئے مل گئے تو آغا صاحب تو یہاں کے سات اور سات چودہ پشت کے بوئے تھے، اپنا پانچ سال کا راز اس طرح فاش ہوتے دیکھ کر مرنے مارنے اور سب کھوٹ پھینکنے پر تل گئے اور خاں صاحب نے تو خیر شبخون مارا تھا۔ آغا صاحب نے اپنے ہوا خواہ، کاشتکار، اور نوکر چاکر، مزدور جمع کر کے دن دہاڑے خاں صاحب کے باغ پر حملہ کر دیا اور ان کے محافظوں کو مار بھگایا۔ خاں صاحب کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ جواب میں آغا صاحب دن دہاڑے اتنی بڑی ہمت کا مظاہرہ کریں گے۔ خیر اس باغ پر تو طاقت زیادہ بچی ہوئی تھی۔ خاں صاحب نے لام بندی کر کے آغا صاحب کے ایک اور بڑے باغ پر قبضہ کر لیا۔

دونوں زوردار قسم کے جتھہ بند زمیندار تھے، اور بانکے زمیندار عدالت میں نالش کرنا اپنی توہین خیال کرتے ہیں۔ آغا صاحب علاقہ کے اندر خاں صاحب کی نسبت زیادہ اثر رکھتے تھے۔ انہوں نے ذرا بڑی جتھہ بندی کی اور خاں صاحب کے بڑے باغ پر دخل کیا۔

اللہ خاں صاحب اپنی پوری طاقت کے ساتھ اپنے باغ پر مدافعت کے لئے تیار تھے کیونکہ اب ۲۰ پورا پورا امکان ہو گیا یوں تو قبضہ اور دخل کے معاملات میں زمینداروں کے جھگڑوں میں پولیس دخل نہیں دیتی ہے اور کبھی کبھی وراثت کے جھگڑوں کے سلسلہ میں قبضہ اور دخل کے لئے فریقین لام بندیاں کر کے فوجداریاں لڑتے رہتے ہیں اور متعلقہ پولیس خاموش بیٹھی دیکھتی رہتی ہے اور انہیں جبریہ قبضوں کی بنا پر سال کی عدالتیں داخل خارج کے مقدمات طے کرتی ہیں لیکن نہ تو یہ وراثت جھگڑا تھا اور نہ اس کی تہ میں کوئی داخل خارج کا مقدمہ چل رہا تھا، بلکہ بنیادی طور پر یہ تمام جھگڑا چوری اور مداخلت بے جا کے جرائم سے چلا تھا۔ لہٰذا سرکاری حکام نے بروقت مداخلت کی اور بلوہ بچایا، اور باغات نیلامی کو حسب دفعہ ۱۴۵ ضابطہ فوجداری قرق کر کے اپنے قبضہ میں لے لیا۔

اور تمام ملک میں ہلچل پڑ گئی۔ نمائش اور آموں کے مقابلے کے وقت نمائش کرتا دھرتا اس فساد میں پڑ گئے اور یہاں سیکڑوں شائقین انبہ پانچ سال سے اس مبارک وقت کے منتظر بیٹھے تھے، سب نے مداخلت کی۔ اعلیٰ حکام چونکہ تحفہ میں نت نئے آم ہر دو فریقین سے پاتے رہتے تھے اور دونوں جانب سے یکساں تواضع کے ساتھ نوازے جاتے رہتے تھے لہٰذا اپنے قلم سے کوئی چیز طے کرنا مناسب خیال نہ کرتے تھے۔ انہیں یہ مداخلت بڑی غنیمت معلوم ہوئی، اپنے سر سے ٹالی اور فریقین اور درمیان والوں کی متفقہ مرضی سے معاملہ ثالثی میں ڈال دیا اور بالاتفاق رائے ہر دو فریقین نے فاروقی صاحب کو ثالث منظور کر لیا۔

جھگڑا چونکہ اودھ والوں کا آپس کا تھا اور اودھ بحیثیت مجموعی حیثیت آدمی کسی نہ کسی جانب دلچسپی رکھتا تھا لہٰذا فاروقی صاحب سے مناسب ثالث کوئی نہ ہو سکتا تھا۔ فاروقی صاحب روہیلکھنڈ کے مشہور ضلع کے ساکن تھے اور ولایت سے تعلیم یافتہ سائنٹفک تھے۔ ان کے باپ درمیانی حیثیت کے زمیندار تھے۔ تھوڑا بہت نرسری کا کام کرتے تھے۔ فاروقی صاحب کو باقاعدہ زمینی کی تعلیم دلوائی اور پھر اعلیٰ تعلیم کے لئے انگلستان بھیجا۔ وہاں سے تین سال میں فارغ ہو کر آئے تو اپنی سائنٹفک معلومات اور یورپ کے تجربات نے والد آپ کے کام میں ایک روح پھونک دی۔ وہ بن گئے مذہبی اعتبار سے بھی بڑے پختہ تھے۔

نرسری کے کام کے ساتھ اپنی اعلیٰ تعلیم اور وسیع تجربہ کی بنا پر فن باغبانی پر "رموزِ باغبانی" کے نام سے بڑی پُر مغز کتاب لکھی جس نے اس حلقہ کے اندر انہیں سارے ملک میں مشہور کر دیا۔ پختہ کار نوجوان تھے مگر پورا کل وقت فنی معلومات کو عملی تجربات سے ہم آغوش کرنے میں گزرتا۔

روہیلکھنڈ والوں کو جب معلوم ہوا کہ اودھ والوں کا بڑا جھگڑا چکانے کے لئے گورنمنٹ اور فریقین نے ثالث مقرر کیا ہے، تو سب کو بڑی خوشی ہوئی اور بڑے جوش کے ساتھ رخصت کیا۔

فاروقی صاحب بڑے تجربہ کار قسم کے ماہر انبہ تھے۔ پھر خاندانی تربیت اور تجربات کے ساتھ اعلیٰ تعلیم ہر اعتبار سے خوب جلا پائے ہوئے تھے۔ انہیں سرخ آم پیدا کرنے کا شوق بچپن سے وراثت میں ملا تھا۔ نرسری میں حسن آرا، برائڈ آف رشیا، سبز، ہند، نرگس، سیندوریہ جیسے سرخے انہیں کے پیدا کئے ہوئے تھے۔ باوجود سائنٹسٹ ہونے کے مزاج میں تھوڑی سی شعریت اور رومان پسندی تھی۔ اور آم میں تو ماہرِ خاص تھے۔ اندھیری رات میں پتہ ہاتھ میں دیدو تو آم کی قسم بتا دیں اور درخت کی عمر دور سے دیکھ کر پہچان لیں۔ ہزاروں قسم کے نئے آم تمام ملک کے نرسری مینوں نے پیدا کئے ہیں۔ ان سب کی اصل نسل کے پورے محرم تھے اور موسم کے زیرِ نظر آم کی فصل کے متعلق نجومیوں کی طرح پیشگوئی کرنے والے ماہر تھے اور ملک کے ہر خطہ کی زمین اور آم کے درخت کے تعلق کے پورے شناور تھے۔ یہ زمین پر سرزمین، خاں صاحب اور آغا صاحب کا جھگڑا چکانے پہنچے جس سے تمام ملک کے شائقین قلم انبہ اور چھوٹے بڑے نرسری مین متاثر ہو رہے تھے۔

فاروقی صاحب نے پہلے سرکاری مسل حاصل کی، پھر فریقین کے درمیان یونہی مصالحت کرانی چاہی لیکن جب اس میں کامیاب نہ ہوئے تو ضابطہ کی کارروائی شروع کی۔ باقاعدہ خاں صاحب اور آغا صاحب کے بیانات لئے اور تحریری ثبوت ملکیت اور قبضہ کا مانگا۔ اور باغ کے درخت وار نقشے لئے اور باغات کا معائنہ کیا۔ اور نقشوں کے مطابق درخت درخت کو جانچا۔ اور اسی سلسلہ میں ایک روز تنہا قطار قطار اور قطعہ قطعہ درجا پہنچتے خاں صاحب کے ایک باغ کی سرحد تک پہونچ گئے، جس کے برابر ہی آغا صاحب کا باغ تھا۔ بیٹھ گئے کہ سب بیٹھا کچھ دور پر آغا صاحب کے باغ کے درخت

نظر آئے اور جب ذرا نظر اِدھر اُدھر کو ڈالی تو دونوں باغوں کے درمیان ایک پٹی جیسے مستطیل شکل میں ایک سبز قطعہ نظر آیا۔ ان کے اور اس قطعہ کے درمیان باغ کی کٹیلی باڑھ تھی ورنہ وہ ایک قدم بڑھا کر وہیں پہنچ جاتے اور انہوں نے قطعہ کے بیچوں بیچ ایک کٹیا دیکھی جو نیچے سے اوپر تک شاداب بیل سے اتنی مکمل ڈھکی ہوئی تھی کہ کہیں پر دیوار یا چھپر نظر نہ آتا تھا۔ انہوں نے خلافِ امید آم کے دو بڑے باغوں کے درمیان یہ عجیب سا قطعہ دیکھ کر تعجب سا کیا اور غور سے جائزہ لیا تو دیسی گلاب کی کاشت نظر آئی نہایت سلیقہ سے گلاب ہی گلاب تیلی لمبی پٹی میں کھڑا ہوا تھا اور جب غور کیا تو کٹیا بھی گلاب کی بیل میں چھپی ہوئی تھی اور قطعہ کے اندر مکمل سکون تھا، اور یہاں کوئی آدمی نظر نہ آتا تھا لیکن دوسری تیسری تجسسانہ نگاہ میں انہوں نے ایک مالی کو ایک گوشہ میں بیلچہ لئے کام کرتے دیکھ لیا۔ مالی کی اِدھر کو پشت تھی اور گوڑائی کر رہا تھا۔ یہ اطمینان کے ساتھ جائزہ لیتے رہے، اور اندازہ کر لیا کہ قطعہ کی ترتیب میں کاشت کا انتظام ہے۔ اور چمن والی صورت نہیں ہے۔ دونوں باغوں کے درمیان لمبی پٹی چھ کو قطعوں میں لگی ہوئی ہے اور دونوں باغوں کے محاذ میں مربع گلاب کے پودوں کے تختے سے چلے گئے ہیں۔ "مگر اس گلاب کے قطعہ کا نہ تو فریقین کے بیانات ہی میں ذکر آیا اور نہ نقشہ میں ہی دکھلایا گیا ہے۔" انہوں نے دل میں خیال کیا اور پھر وہ تو گلاب کے عاشق تھے چپہ چپہ اور پتہ پتہ پر بڑی گہری نگاہ ڈالی تو کٹیا کے چاروں کونوں پر گلاب کی چار جھاڑیاں سی نظر آئیں تمام کی تمام پھولوں سے ڈھکی ہوئی، ایسی کہ گلابی ہی گلابی نظر پڑیں، کہیں سبز پتی دکھائی نہ دے۔ "گلاب کی بہار کا موسم تو ہے نہیں، پھر یہ کون سا خاص گلاب ہے، جو برسات میں اتنے زور سے پھول رہا ہے؟" انہوں نے دل میں کہا اور جب غور کیا تو آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ "ارے یہ تو آم کے پودے ہیں: چار پانچ فیٹ بلند، اور بڑے متناسب پرواں چڑھے ہوئے جیسے چار گنبد، ایک دوسرے کا جواب، یکساں قطروں میں پھیلے ہوئے، گویا تراش کر رکھ دئے ہیں۔ سرخ سرخ آموں سے اس درجہ لدے ہوئے کہ کہیں پر سبزی کی جھلک نظر نہ آتی تھی۔ درختوں کی ہیئت دیکھ کر ہر ایک کی نظر جم کر رہ جاتی۔ اور پھر فاروقی صاحب کو تو سرخ آموں سے خاص شغف تھا اور وہ بہترین سرخوں کے موجد تھے۔ بے اختیار منہ سے نکلا "سبحان اللہ"! اور ایک جست لگا کر باغ کی کٹیلی باڑھ پھاند کر ادھر جا گرے۔ "کیسا عجیب سرخہ ہے۔ باغ کی دلہن، اگر یہ تابعی ہو تو بھی وہ باغ باغ نہیں جس میں اس کا پودا ایک قطعہ نصب نہ ہو!" انہوں نے دل میں کہا اور قریب جا کر دیکھنے لگے۔ درختوں کی نمو اعلیٰ داشت اور توجہ کا پتہ دیتی ہے۔ پورب رخ کے آم جو ذرا گدرائے ہوئے ہیں ان پر وہ روپ ہے جو کسی حسین دوشیزہ کے بدن پر نوجوانی کی پہلی سنسناہٹ پر پیدا ہوتا ہے۔ اور کچی کیریاں کیا ہیں ننھی کنواریاں نوجوانی کی سرحد میں قدم رکھنے سے ذرا پیشتر، اور درخت کیا ہیں گلال بھری پیالیاں!"— اور فاروقی صاحب حسنِ فطرت کے نظارے میں کھو گئے اور آدمی شاعر مزاج تھے، اور سیما کی قربت اور انگلستان کے قیام نے کچھ حسن پرست، اور نقاد بھی بنا دیا تھا اور وہ تو سرخ آموں میں فرانس اور انگلستان کی دوشیزاؤں سے لے کر گلال رخ سیما کے دہکتے رخساروں کے نظارے کر لیا کرتے تھے اور بڑے شوق کے ساتھ چوسا کرتے تھے۔ اور اس وقت کچھ تو موسم اور وقت کی فسوں کاری ماحول کا حسنِ انتظام اور پھر ان چار پودوں کی بہار، وہ خود فراموشی کے عالم میں کھو گئے، نگاہیں ہٹائے نہ ہٹتی تھیں کہ مالی کے سلام کی آواز پر چونکے اور مالی ادب کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔ انہوں نے سوال کیا "یہ پھلوار — یہ کس کی؟ یہ آغا صاحب کی یا خاں صاحب کی ہے؟"

اور مالی آغا صاحب اور خاں صاحب کے نام سن کر سہم سا گیا! سب کو ان کے جھگڑوں کے متعلق علم تھا، اور یہ بھی علم تھا کہ ریسٹلمنٹ کے ایک صاحب بہاؤ تصفیہ کے لئے آئے ہیں اور مالی تو فاروقی صاحب کو دیکھ بھی چکا تھا اور پہچانتا تھا۔ نہایت ادب سے ذرا گردن جھکا کر جواب دیا "سرکار یہ پھلوار آپ ہی کی ہے!" اور رک کر کہا "اور سرکار ہم تو سب کے نمک خوار ہیں آغا صاحب ہوں، خاں صاحب، یا خواجہ صاحب ہوں کہ شیخ صاحب!" اور فاروقی صاحب نے اندازہ کیا کہ مالی نہایت نستعلیق ہے۔

"اچھا تو یہ تمہاری اپنی ہے مگر ان دونوں باغوں کے درمیان آغا صاحب اور خاں صاحب کے بیچوں بیچ بڑے عجیب موقع پر ہے!"

اور مالی کچھ گھگھیا سا گیا اور دانت نکال کر عاجزی کے ساتھ بولا "ہاں سرکار اور غلام تو سب کا ہی ہے، اور بڑوں بڑوں کے جھگڑے میں چھوٹے ہاتھ ڈالنے والے نہیں۔ بڑوں کے معاملہ میں بڑے ہی پڑ سکتے ہیں — ارے بھئی میرا مطلب یہ ہے کہ یہ چھوٹا سا قطعہ

ان دو بڑے باغوں کے درمیان تمہارا کیا ہے؟"

اور مالی ادب آمیز عاجزی کے ساتھ ہاتھ جوڑ کر بولا "سرکار ہاتھی کی ہاتھی سے ٹکر ہے، اور مجھے معلوم ہے آپ فیصلہ کرانے اور تحقیقات کرنے آئے ہیں۔ میں کوئی بیان نہیں دوں گا۔ غریب آدمی سب کا نمک خوار۔"

"تو دیکھو مالی میں تمہارا بیان نہیں لے رہا ہوں، صرف یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ اس علاقہ میں بس چار زمیندار ہیں۔ خاں صاحب، آغا صاحب، اور ان کے نواسے اور داماد۔ ان چاروں میں سے یہ اراضی جو تمہاری گلاب کی کاشت میں ہے، کس کی زمینداری میں ہے؟"

خیر جب سرکار بیان نہیں لکھ رہے ہیں تو بتاتا ہوں۔ کاغذ تو مجھے دیکھنا نہیں آتا مگر پٹواری سے معلوم ہوا تھا کہ آدھی آدھی خاں صاحب اور آغا صاحب دونوں کے محالوں میں پڑتی ہے اور سرکار مجھ کو ملی بھی دونوں سرکاروں سے ہے، اور سرکار دیکھ سکتے ہیں بھلا اتنے بڑے دو باغوں کے مینڈھوں کے درمیان یہ تپلی پٹی، بھلا زمین کس کام کی ہوگی، دو طرفہ "چھینٹہ" کسی پیداوار کے تو لائق تھی نہیں، پھر سرکار زمینداروں کا انعام بڑی چیز ہوتا ہے۔ اور سرکار پشتوں سے انہیں سرکاروں کا نمک کھاتا چلا آرہا ہوں۔ اور راجکنواروں اور راجکنواریوں کو اپنے سہرے سے پار لگاتا چلا آرہا ہوں۔ سو سرکار آغا صاحب کے لڑکے کے صاحبزادہ کی شادی کی تاریخ مقرر ہوئی۔ چوٹ پر خاں صاحب نے بھی وہی تاریخ ڈالی، پہلے تو ذرا تنی۔ پھر دونوں جانب کے مہمانوں نے تصفیہ کرا دیا۔ غلام دونوں ڈیوڑھیوں کا خادم۔ دونوں سہرے گوندھے، دونوں سرکاروں سے ایک ایک گنی، ایک ایک جوڑا، ایک ایک کنگن اور یہ ایک ایک ایکڑ بھر زمین بے لگانی کاشت معافی خدمتی انعام میں ملی۔ سو سرکار میں نے بھی کنگن اور گنیاں اسی میں لگا دیں، اور یہ گلاب ہرا کر لیا۔ اور سرکار ہم مالی لوگ رئیسوں کے کھلانے آپ کو پھول سنگھا کر اپنا پیٹ بھرتے ہیں اور سرکار نے کہیں مالی ہل پھاوڑا چلاتے بھی دیکھے۔ پھر میں تو جب تک پہنچوں میں دم رہا، بہت کرتا رہا، اور یہ پھلوار کا سہارا تو اب کر لیا ہے بڑھاپے میں آ کر۔ یہ آم کے سب باغ میرے ہی لگائے ہوئے ہیں اور ساری سبزی اپنی ہاتھوں کی دکھائی پڑتی ہے ثمر بہشت جو لنسہ میں نے تیار کیا اور ثمر بہشتی مل باغ میں نے نکالا۔ خاص الخاص شاہ آباد، فردوسیہ، نرگس، بے نظیر، شیر و شکر، دلربا۔ سب انہیں ہاتھوں کے بنے ہوئے آم ہیں۔ اور حضور عنابی گولہ جو بمبیا کہ میں ہی مد پر آ جاتا ہے اور زمینداروں کو کھانے کو مل جاتا ہے میں نے ہی نکالا۔ اور اس کے بعد جیٹھ میں زرد آلو مد پر آ جاتا ہے اور سرکار زرد آلو بھی میرا ہی تیار کیا ہوا ہے۔ اور سرکار آمن رذول مظفر نگر سے میں نے ہی منگوا کر دی۔ معرکتہ الآرا، سرخہ، برہما، سیب ہند اور آمن حسن آرا اور سرکار آمن ابراہیم پہلوری شمس الاثمار میں ہی لایا۔ راتوں رات سر ہتھیلی پر رکھ کر چودھری صاحب کے باغ سے بنگلہ والی قلم منزل مار کر میں لایا اور خواجہ صاحب کے ذخیرہ سے مٹے بے خودی لایا، جن کے کتے رات کو باغ میں شیر کی طرح پہرہ دیتے ہیں اور اب سرکار ایک لڑکی ہے پرایا دھن، آج نہیں تو کل دوسرے کی ہو گی اور غلام تو اسی پھلوار کے سہارے یہیں پر کاٹ جائے گا۔ جب اپنے لگائے باغوں پر نگاہ ڈالتا ہوں تو جی کو تسلی ہو جاتی ہے۔ مجھ سے پہلے تو یہاں سب تخمی باغ تھے اور کہیں کہیں لنگڑا، بمبئی، سپیدہ، فجری، اور کہیں کہیں دسہری کے پرانی چال کے قلمی پیڑ تھے اور جب ان اپنی پیدا کی ہوئی اور پالی ہوئی نئی نئی قلموں کے باغ دیکھتا ہوں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میرے بیٹوں کی فوج کھڑی ہے۔ پھر یہ کیسی بات ہے کہ جتنی قلمیں بنگال، بہار، حیدرآباد سے آتی ہیں وہ بھی میں نے پروان چڑھائیں اور ان سے ہزاروں قلمیں تیار کیں۔ اب یہ آلو لے سے شربتی بگرین اور مرشد آباد سے کالا پہاڑ مرشد آبادی کوہ طور مرشد آبادی، کیلگوا، چمپا، ایک ایک قلم آئی اور دربھنگے سے ہاتھی جھول، لنگڑا دربھنگہ، اور دیوان سانقا آئے اور شاہ آباد سے کھجری کمال آیا، اور ناگپور سے کھلن بھوگ موہن بھوگ آئے اور سب کی قلمیں انہیں ہاتھوں سے تیار کر کے ہزاروں درخت پروان چڑھا دیا۔ یہاں کے سب سرخے اور آمنیں بھی میری باندھی اور پالی ہوئی ہیں اور اب تو آخر عمر ہے فصل پر آم بھی نہیں کھایا جاتا سرکار جی بھر گیا بس درخت دیکھ کر دل ہرا رہتا ہے۔ اور روٹیوں کی گزر اس پھلوار سے ہو جاتی ہے ویسے شہر جا کر ہاروں کا روزگار کروں تو شام کو اتنے پیسے مل جایا کریں جتنے یہاں مہینے بھر میں ملتے ہیں۔ پھر سرکار ان باغوں کی محبت نہیں چھوڑتی۔"

مالی نے دور دور تک زمینداروں کے پھیلے ہوئے باغوں پر پیار بھری نظر ڈال کر کہا۔

"لیکن یہ تو بہت پھول اترتا ہو گا۔ اتنے گلاب کا یہاں دیہات میں کیا کرتے ہو؟"

تھے سرکار یہ تو گلاب ہے کہ سوکھا بھی بک جاتا ہے۔ عطاروں کے ہاتھ فصل پہ بیچنے والے آجاتے ہیں۔ عرق کھینچ لیے جاتے ہیں، سہاگ کی کرپا سے روٹی چلی جاتی ہے اور جی لگ گیا ہے۔"

اور فاروقی صاحب نے غور کیا کہ مالی سب ہی آموں کا ذکر کر گیا اور نہ کیا تو اس سرخہ کا جو اس کی کٹیا کے چاروں کونوں پر لدا کھڑا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ کچھ گریز کر رہا ہے۔ انہوں نے خود ہی کہا "اور یہ سرخہ؟ یہ کیا ہے یہ کوئی نئی چیز باندھی؟ یہ تو بڑے زور کا سرخہ ہے۔" اور مالی پھر کچھ سٹپٹا سا گیا، کہ ایک زمیندار کے علم میں یہ چیز آ گئی۔ اسے یو پی ٹیننسی ایکٹ کی اس دفعہ کا خوب علم تھا جس کی بنا پر کسی کاشتکار کو اپنی اراضی پر آم کا درخت نصب کرنے کا حق نہیں تھا اور آم نصب کر کے تو کاشتکار برا پھنستا ہے۔ اگر درخت ایستادہ رکھے گا تو بیدخل ہو جائے اور بیدخلی کے خوف میں کاٹ دے گا تو قید ہو جائے گی۔ مگر مالی کی تو ساری عمر رئیسوں میں ہی کٹی تھی بہت ہی ہلکی بات کرتے ہوئے بولا "ہوں سرکار یہ ایک پپیا جم اٹھا تھا وہ دیکھیے واں پر منڈیر ہے۔" اور مالی نے پھلوار کے کنارے پر کھڑے ہوئے ایک ذرا بڑے درخت کی جانب اشارہ کیا، کوا نہ معلوم کہاں سے گٹھلی کھا کر ڈال گیا، یہ اس کا اصلی گچھا ہے اور سرکار یہ بھی جلدی پروان چڑھ گیا، ویسے تو ٹیڑھا سا تھا اور گلاب کی باڑھ میں پھنسا ہوا۔ مگر میری سندریا اس وقت پانچ چھ برس کی تھی آپ کی لونڈی، اس کی نگاہ پڑ گئی اور اونچے تو اکھیڑ کر اور پپیا بنا کر بچا لیتے۔ مگر پالن کی جنی اس نے تو پروان چڑھانا شروع کیا، اور کھیل کھیل میں اس کے پاس ڈیڑھ ہاتھ گہرا کنواں کھود لیا اور ہاتھ بھر لکڑی کی رہٹ لگا کر اور دیوالی کی ٹھلیوں میں ڈوری باندھ کر اسے پانی دیتی اور کنوئیں کو نہر پر سے پانی لا لا کر بھرتی اور سرکار ایسے ہی مذاق ہی مذاق میں کل کی سی بات معلوم ہوتی ہے۔ بارہواں سال۔ مگر پانچ ہی سال بعد پپیا پیڑ بن گیا اور سرکار میرے جو پھل لایا تو سرخہ! اور بڑا اور دار رنگین سرخہ نکلا! اور چکھا تو سرکار بس میں گھوم گیا اور سندریا دس بارہ برس کی ہو گئی تھی، اور آپ جانیں مچھلی کے بچے کو تیرنا کون سکھائے۔ اس نے ہوش سنبھال کر دن رات گلاب دیکھے تھے مگر نہ معلوم قلم باندھنا کیسے سیکھ گئی اور میں نے تو دیکھا بھی نہیں اس نے چپکے سے چار قلمیں باندھ لیں اور وہ چاروں یہ ہیں۔" مالی نے کٹیا کے کونوں پر کھڑے چاروں درختوں پر اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ اور فاروقی صاحب نے سرخ آموں کے لدے پودوں پر پیار بھری نگاہ ڈالی۔ اور مالی نے سلسلہ کلام جاری کیا "یہ سرکار اندر مہاراج کی کرپا۔ یہ تین ہی سال میں اس کے ہاتھوں کی سیوا سے پروان ہو کر پھل گئے اور تیسرے برس پھل لینا ٹھیک نہیں ہوتا۔ آپ جانتے ہی ہیں، میں نے بور جھاڑ دیا، پچھلے سال بھی پہلے تھوڑے بہت پھل لگائے اور اس سال بھرپور فصل لے آئے۔ قلم میں پھل بھی بہت بڑھ گیا اور مزہ مٹھاس بھی چڑھ گئی، گٹھلی گھٹ گئی، رس بڑھ گیا، ریشہ غائب ہو گیا۔ اب دیکھئے نا" مالی نے پھر اصل درخت کی جانب اشارہ کیا جس پر چھوٹے چھوٹے آم لدے ہوئے تھے "کتنا بڑھ گیا! بس سرکار یہ سب اسی کے ننھے منے ہاتھوں کا کرشمہ ہے اور اب سرکار ایک پھانک ذرا چکھ کر دیکھیں"۔ اور یہ کہہ کر آواز دی "اری سندریا ذرا سرکار کو ایک آم تو چکھا" اور سبز کٹیا کے اندر سے لال پری نکلی، سندریا باہر آئی، الحفیظ والاماں! جیسے ساری پھلوار پھول اٹھی! اور درختوں پر لدے ہوئے آم کا دانہ دانہ شرما گیا، سارے چمن کے گلابوں کا رنگ اور دنیا بھر کے سرخوں کی ملاحت اسی میں سمٹ کر آ گئی ہے۔ پہلی بے ساختہ نگاہ پر فاروقی صاحب بھونچکا سے رہ گئے، بھڑکتا ہوا شعلہ قد آدم سامنے تھا۔ پھر کچھ سنبھلے اور حلق میں پھنستی ہوئی آواز میں بولے "اچھا، یہ، سندریا! تمہاری لڑکی؟" اور پھر سندریا کے سندر روپ میں کھو گئے۔ مالی نے پھر کہا "اری ذرا سرکار کو تو اپنے پیڑ کا آم چکھا، ذرا سرکار بھی دیکھیں ہم غریبوں کا پروان چڑھایا ہوا ایک پھل اور سرکار میں نے بھی یوں رہنے دیا کہ فصل پر جی چاہے، تو کیوں کسی زمیندار کے باغ میں جاکر ہاتھ پھیلانا پڑے۔"

اور سندریا نے پاس کے درخت پر سے چند پکے ہوئے دانے توڑے اور توڑتے وقت فاروقی صاحب اس کی گل رنگ بانہوں کے نیچے کا مرمریں حصہ دیکھ کر چکا چوند سے ہو گئے۔ یوں تو زمیندار گھرانے کے تھے اور پھر ولایت پلٹ، کسی ادنیٰ طبقہ کے فرد کی اس قسم کی کاوش پر شاید توجہ نہ دیتے، مگر توجہ نہ دینے کا انہیں ہوش کب تھا، گلابی انگلیوں میں دبی ہوئی گلابی قاش نہ معلوم انہوں نے کس وقت لے لی، اور پہلی قاش کے باوجود مصر ہونے کے انہیں کھاتے وقت آم کے حسن و ذائقے پر سکنے کا ہوش نہ رہا اور جب دوسری گلابی قاش نازک مخروطی انگلیوں میں بڑھتی دکھائی دی تو انہوں نے سنبھل کر چکھی اور پھر تحسین و آفرین کرتی ہوئی نگاہیں اوپر اٹھیں تو داد طلب نرگسی انکھڑیوں سے چار

ہوئیں اور پھر سر سے پاؤں تک داد مانگتی لڑکی پر نگاہ ڈالی۔ یورپ کی سوسائٹیوں میں بھی کبھی یہ موقع نصیب نہ ہوا تھا کہ کوئی فنکار اپنی انگلیوں کی تخلیق ان کے سامنے اس طرح داد طلب انداز میں پیش کرتا اور سندریا نے اپنے ہاتھ کے بنائے ہوئے آم کی تیسری چوتھی، پانچویں، چھٹی قاش پیش کی، اور آم والی کے ساتھ فاروقی صاحب نے آم کی بھی ایک ایک خوبی پرکھ لی۔ اور بے ساختہ منہ سے نکلا۔ آم ہے کہ پھل کی معراج۔ اور پھر غضب کا حسین و جمیل۔ اور سندریا تو بچپن سے زمینداروں کے گھروں میں پھول بہندی لے کر جایا کرتی تھی، بڑی بھولی اور آزاد تھی۔ تعریفی الفاظ سن کر گلاب کی طرح کھل اٹھی اور بڑی شیریں آواز میں بولی "اور سرکار پتہ نہیں کہ آپ ڈال پسند کرتے ہیں کہ پال۔ اور اس کی کچی کیڑی پال اٹھ جاتی ہے، ایسی کچی کہ جالی بھی نہ پڑی ہو جیسے، بس اگھر میں پال لگا دو اور اٹھ جائے گی۔"

"ہوں، خوب!" فاروقی صاحب نے ہونٹ چاٹتے ہوئے کہا "اور سرکار ہیں تو معلوم ہوتی نہیں یوں کہ ہماری ناک میں تو ہر وقت گلاب ہی گلاب لہار رہتا ہے مگر جنہیں ایک دو رات کا لبا ہوا کھلایا وہ کہتے ہیں کہ اس میں لس کر گلاب کی خوشبو پیدا ہو جاتی ہے۔" مالی نے کہا اور پھر لڑکی سے مخاطب ہوا "دیکھو تو کوئی ہے بسا ہوا۔ لاؤ نکال کے، سرکار ذرا آزما کر دیکھیں کہ گلاب کی خوشبو پیدا ہو جاتی ہے کہ ایسی ہی باد ہوائی بات ہے۔"

اور لڑکی کٹیا کے اندر سے چار دانہ نکال کر لائی۔ اور پانی سے دھوئے اور پہلے دو آم سے کر کاٹے اور قاش کھا کر فاروقی صاحب بولے "ہوں، ضرور گلاب کی خوشبو دے جاتا ہے۔"

"اچھا سرکار تو یہ تو ایک رات کے بسے ہوئے تھے" اور لڑکی نے بقیہ دو آم کاٹے اور فاروقی صاحب نے قاش چکھ کر کہا "ہوں ہوں بالکل بالکل۔ نہایت نمایاں گلاب کی خوشبو ہے۔" "تو بس سرکار یہ دو رات کے بسے ہوئے ہیں اور یہ خوشبو آخر تک رہتی ہے چاہے آم سوکھ کیوں نہ جائے۔" لڑکی نے کہا اور مالی نے کہا "اور سرکار یہ سڑتا نہیں ہے بلکہ پکنے کے بعد خشک ہو جاتا ہے۔" ثالثی کا کام یوں بھی حکومت کی جانب سے فاروقی صاحب کو تفویض ہوا تھا۔ پھر نمائش اور مقابلے کے انعقاد کا دار و مدار اسی کی کامیابی پر تھا۔ کل برِ عظیم کی آنکھیں انہیں کی جا

لگی ہوئی تھیں اور انہیں یہ کام کچھ تاریخی اہمیت کا حامل معلوم ہو رہا تھا۔ لہٰذا بڑی خاص توجہ دی اور پوری احتیاط سے کام لے کر اور ساری ذمہ داریاں اپنے سر دھر کر خاں صاحب اور آغا صاحب میں سمجھوتہ کرا دیا اور دل نے بھی ہاتھ تو ملوا ہی دیئے اور آموں کی نمائش کے لئے راستہ صاف کر لیا۔ اسی میں اور آموں کی نمائش اور مقابلہ کا ہفتہ آ گیا۔ بڑی زبردست تیاریاں تھیں، اور تیاریوں میں چار چاند یوں لگ گئے کہ اس مرتبہ جنرل سکریٹری اور منیجر کا اعزاز فاروقی صاحب کو بخشا گیا تھا۔ ہفتہ بھر پہلے جھڑی لگنے کے بعد بھی بادل صاف نہ ہوا تھا اور نمائش کے خاص ہفتہ کے بیچوں بیچ تو ساون بھادوں کے گلے ملنے کا دن آ پڑا تھا جو آم کے شوقینوں کا نوروز کہلاتا ہے۔ ہلکی ہلکی سی چال پروائی لہک رہی تھی۔ بھیگی بھیگی، بھاری بھاری پانی کی بوندیں سی بھرے، اودی اودی گھٹائیں امنڈ رہی تھیں۔ دنیا نم تھی، سبز ہی سبز، زمین کی چھاتی پر تھی۔ فضا میں آم کی خوشبو بھری ہوئی تھی۔ ماحول میں نشیلا متوالا رس ہی رس رچا ہوا تھا۔ بار بار کالے کالے بادلوں میں اندر مہاراج کا خنجر تڑپ کر چمک اٹھتا تھا۔ اور گرج پر گھمبیر سے باغوں میں موت جیخ پڑتے تھے، اور باغوں میں تو اندھیریاں سی پڑی ہوئی تھیں، نمی اور پھلوں کے بوجھ سے ڈالیاں سبز گھاس کے فرش پر لوٹ رہی تھیں اور پھلوں سے لدے لٹکے درخت دماغ کو مستی اور دلوں کو الہامی کیفیت سے آشنا کر رہے تھے۔ اس مرتبہ علاقہ کے نو دے باغ کی شادی تھی اور اسی میں نمائش کا انتظام کیا گیا تھا اور بارہ نو پویلین نمائش اور مقابلہ کے لئے منتخب کیا گیا تھا۔ او وہ اور ریپلکینٹ کے تو قصبہ قصبہ قریہ قریہ کے نئے آم نمائش میں آئے تھے اور ملک کے طول و عرض سے ہر خطہ کا آم جمع تھا۔ مرشد آباد اور دربھنگہ کا گروپ، بمبئی اور کاٹھیاواڑ، ڈھاکہ اور آسام کی تجدیدیں، اور حیدر آباد کے گروپ کے ساتھ وسط ہند کے چند آم کچھ پارسل کے ذریعہ آئے ہوئے تھے اور بعض بعض کو نمائندے لے کر آئے تھے اور دعوتِ عام تھی، جس کے لئے اس علاقہ کے زمینداروں نے اعلیٰ سے اعلیٰ آم اپنے اپنے باغوں سے لا کر جمع کئے تھے۔ باغ میں تا حدِ نظر آموں کا فرش تھا۔ آموں کے ڈھیر تھے، آموں کے ٹیلے تھے، آموں کے پہاڑ تھے، آموں کے تودے تھے، رنگ برنگے، بھانت بھانت کے ملے جلے گڈمڈ، اور کہیں تنہا ایک قسم کے اوپر آم، نیچے آم، دائیں آم بائیں آم، آگے آم پیچھے آم، آم ہی آم سے دنیا بسی ہوئی تھی۔ درختوں تلے جوبن ہی جوبن تھا، مہک ہی مہک تھی، رس ہی رس تھا۔ مہمانوں کی آنکھوں میں

آم کا رس شراب کی طرح چھلک رہا تھا۔ دعوتِ عام تھی، ایک ہی باغ کے آم کیا کم تھے اور دوسرے باغوں سے چھکڑوں اور ٹوکروں میں بھرے چلے آ رہے تھے۔ خاص خاص مہمانوں کے لئے نگنیں اور شامیانوں میں پولین کے نیچے نشست پر انتظام تھا اور آئس کریم تیار ہو رہی تھی۔ عام مہمانوں کے لئے دودھ برف کی سبیلیں لگی ہوئی تھیں۔ دور دیہات اور قصبات میں عام دعوت کا اعلان تھا اور ٹولیاں کی ٹولیاں مزدوروں، کسانوں کی چلی آ رہی تھیں ہر زمیندار اپنے باغ کے کل آموں سمیت میزبان بنا ہوا تھا۔ لنگڑا، بمبئی، سپیدا، دسہری فجری، مقبول عام آموں کے ڈھیروں کا تو شمار نہ تھا۔ بہت سے زمیندار نئے نئے آموں کی لذت سے عوام کو آشنا کر کے شہرت حاصل کرنے کے لئے ثمر بہشت چونسہ، خاص الخاص شاہ پان، ثمر بہشتی علی باغ، حسن آرا، براڈ آف رشیا، آمن ابراہیم پور، حامد پسند، شاہ پسند، ننھے خوردی، شیر و شکر اور شارع نبات وغیرہ کے چھکڑے بھر کر لائے تھے اور دوسرے جن سے ان سے ذرا نوک جھوک رہتی تھی مقابلہ پر شربتی بگرین، دل ربا، سیب بندو نیلم گلاس، گولہ بصیر باغ، ہاتھی جھول، قوس قزح، کوٹھی حیدر آباد اور نایاب وغیرہ جیسے غیر معروف آم لے کر آئے تھے اور ہر حیثیت کے لوگوں کو تواضع کے ساتھ کھلا رہے تھے، چار روز تک آنے جانے کھانے پینے کا اسی طرح بازار گرم رہا، پانچویں دن چیونٹوں کے ساتھ کچھ تیتیں بھی سیر ہوئیں اور شاید کچھ منہ بھی تھکے۔ مجمع بھی قدرے گھٹا، اگرچہ آم بٹتا ہی رہا اور اب ٹولیاں کی ٹولیاں آم کھانے کے بجائے اپنی اپنی فکر و استعداد کے مطابق آموں کی خصوصیات اور اقسام پر تبصرہ کرنے لگیں، نمائش کے آموں پر بحث ہونے لگی، اور مقابلہ میں آئے ہوئے آموں کے متعلق افواہیں سنائی جانے لگیں کھانے والے نمائش کے آموں کو دیکھنے میں زیادہ دلچسپی لینے لگے۔ دو دن اسی میں گزرے۔

اور تیسرے دن سہ پہر کو آموں کا مقابلہ تھا تیاری صبح سے ہی شروع ہو گئی تھی۔ فاروقی صاحب بہت مصروف تھے۔ دوپہر تک فاروقی صاحب نے مقابلہ میں شریک ہونے والوں کی فہرست بنا کر ججوں کی بورڈ کے سامنے پیش کر دی۔ اور سب سے نیچے سندیا دختر رہبکا پرشاد مالی نام دیکھ کر ججوں کا ماتھا ٹھنکا، اور شدہ شدہ بات باہر پہنچی۔ زمینداروں میں آزردگی کی لہر دوڑ گئی اور ان کی پارٹیوں میں جگہ جگہ چہ میگوئیاں شروع ہو گئیں۔

"یہ اچھے نئے سکریٹری بنائے، مقابلہ پر مالی کھڑا کر دیا!"

"ایسی تو پشتوں سے نہ ہوئی تھی۔"

"بھلا کسان، چمار شریفوں کے مقابلہ پر! - کونسی بھلمنسات ہوئی؟"

"بھلا یہ بھی کوئی شرافت کی بات ہوئی؟"

"برا زمانہ آگیا، وضعداری اور شرافت دنیا سے ختم ہو گئی، کہلاتے تو یہ بھی شریف زادہ ہی ہیں۔"

جی ہاں ان کی خاندانی وضعداری اور شرافت کے بھروسے پر انہیں پہلے ثالث بنایا اور پھر اس نمائش کا سکریٹری بھی بنا دیا۔"

"ہوں بس، اب آبروئے شیوۂ اہلِ نظر گئی۔"

یہ روہیلکھنڈی، یہ تو تاریخی کمین پرور ہیں۔ انہوں نے تو اپنے تخت پہ جاٹ کسان بٹھلائے ہیں!"

"اور اودھ والوں سے تو کبھی بنا کر چلے ہی نہیں!"

خیر روہیلے پٹھان تو پھر غنیمت ہیں، بھڑ بھڑیا ہیں، غصیلے ہیں ذرا کھرے ہیں، مگر یہ شیخ! روہیلکھنڈی شیخ! الاماں، بڑے فطرتی ہوتے ہیں شیخ، دیکھی اس فاروقی کی حرکت؟" لیکن انتظام تو اودھ والوں نے ہی ان انگریزینش صاحبزادہ کے ہاتھ میں دیدیا۔ سب پٹھانوں اور ٹھاکروں کی آبروریزی کرا دی، روہیلکھنڈ ہی والے کے ہاتھ میں دینا تھا تو رامپور، شاہجہاں پور، بریلی، مرادآباد کے کسی ڈھنگ کے روہیلے پٹھان کے ہاتھ میں دیتے، جسے کم سے کم شرفا کی عزت کا تو پاس ہوتا۔"

"وہ کیا کرتا! ارے بھئی تاریخ اٹھا کر پڑھ لو، انہوں نے کب نہیں کیا ایسا، شاہ اودھ شہنشاہ دہلی نواب بنگش اور ملکہ وکٹوریہ سب کے مقابلہ پر یہ جاٹوں، کسانوں، چماروں کی فوجیں لے کر آتے۔ اور آج دیکھئے وہی دن پھر کھڑا ہے، ایک ادنیٰ مالی اودھ کے شہزادوں راجکماروں کے مقابلہ پر لے آئے۔"

"سب ملے ہوئے ہیں، اور پہلے سے سازش معلوم ہوتی ہے کہ انکے اندرونی جھگڑے میں ہاتھ ڈال کر میاں کا جوتا میاں کا سر کے مصداق کر دو۔"

"بالکل صحیح، پوری سازش ہے، معلوم ہوا ہے کہ پہلے یہاں سے بھی مقابلہ میں رکھنے کے لئے فاروقی صاحب نے آموں کی ٹوکریاں منگائی تھیں۔ مگر جب شکست دینے کے لئے یہ مالی ہاتھ آگیا تو وہ آم مقابلہ پر نہیں رکھے اور چپکے سے نمائش میں رکھ دئے۔"

"ہوں! تو اب کی مرتبہ کوئی رو پیلکھنڈی آم مقابلہ میں شریک ہی نہیں ہوگا۔ ہوں! ٹھیک ہے!"

"کیوں شریک ہوگا! وہ تو ہم تو چاول خور اور پتلی دال کھانے والے علاقہ کے پوربیوں کی بگڑی پنچی کرناتھی سازش کرکے اب نتیجہ تو اللہ کے ہاتھ میں، کمین مقابلہ پر تو لاکر کھڑا کر ہی دیا۔"

"بُرا زمانہ آگیا، بھائی شرفا کی عزت کا اللہ ہی بیلی ہے لو یہ نہیں دیکھتے کہ اس مرتبہ دعوت کتنی بڑھا دی۔ ویسے ہر مرتبہ تھوڑے بہت آجاتے تھے مگر اس دفعہ تو دنیا بھر کے گنوار جمع کر لئے۔ اور ہزاروں من آم برباد کرادیا۔"

اور باہر تو جتنے منہ اتنی باتیں تھیں۔ اندر بھی ججوں نے دبی زبان سے فاروقی صاحب سے کہا کہ وہ اس پر ایک مرتبہ اور غور کریں۔ کہ اس مرتبہ وہ مقابلہ میں ایک ایسے عنصر کو شرکت کی اجازت دے رہے ہیں جو روایات کے خلاف ہے۔ مگر انہوں نے کہا کہ مقابلہ تو عام ہے اور قواعد میں کوئی ایسی شرط نہیں ہے کہ چھوٹی حیثیت کا آدمی اپنا آم مقابلہ میں نہیں لا سکتا، اور پھر ہمیں تو یہ طے کرنا ہے کہ ملک میں پانچ سال کے اندر بہترین آم کون سا پیدا ہوا اور یہ آموں کا کھلا ہوا مقابلہ ہے نہ کہ آم پیدا کرنے والوں کا۔ اگر کوئی بہترین آم مقابلہ میں آنے سے رہ گیا تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ آپ کی پانچ سالہ ریسرچ ناقص رہ گئی، جج اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکتے تھے۔ اور بحیثیت سکریٹری یہ چیز تو فاروقی صاحب ہی کے طے کرنے کی تھی کہ مقابلہ میں آم پیدا کرنے والے کی سماجی حیثیت کا لحاظ ضروری ہے یا نہیں۔

○

مقابلہ کے آم پہلے ایک مخصوص کمرہ میں جمع کرکے رکھ لئے گئے تھے اور پھر نام وار ہر ہر جدا اپنا آم لے کر ججوں کی بورڈ کے سامنے طلب کیا جا رہا تھا جنہوں نے بغیر کسی نمائندہ کے باہر سے بذریعۂ پارسل مقابلہ کے لئے آم بھیجے تھے ان کو سکریٹری اپنے انتظام سے رکھواتا اور خود ہی پیش کرتا تھا۔ مقابلہ شروع ہونے سے چند گھنٹے پیشتر سب نے اپنے اپنے آم پہنچا دئے تھے، اور عین وقت کے وقت مقابلہ شروع ہونے سے ذرا دیر قبل ستندریا پہونچی۔ ماحول اور حالات سے بے خبر، اسی معصومیت اور بیباکی کے ساتھ جیسے زمینداروں کی حویلیوں میں پھول مہندی کی ڈلیا لے کر عید، بقرعید، ہولی، دیوالی پہنچا کرتی تھی زمینداروں سے شتکاروں کے اتنے بڑے مجمع میں جب آئی تو آگے آگے امبکا پرشاد مالی پیچھے پیچھے ستندریا۔ دھلی ہوئی ساڑھی میں ملبوس، آموں کی سر پر ڈلیا لئے اور گلرنگ بانہیں اوپر اٹھائے دونوں جانب سے پکڑے ہوئے، نگاہیں نیچی کئے عوام کے مجمع سے چپ چاپ گذرتی پویلین تک پہنچی۔

اور پویلین کی پہلی سیڑھی سے ساتویں سیڑھی تک چڑھتے ہوئے ادھر ادھر سے بیسیوں زمینداروں کی بھوئیں ملیں، آپس میں آنکھیں مڑیں، پرمعنی مسکراہٹیں الٹ پلٹ ہوئیں۔ منچلے نوجوان ٹھنڈی سانسیں بھر کر رہ گئے۔ دل چلے جوان لوٹ پوٹ سے ہوکر رہ گئے اور جھک سفید تائب بوڑھوں تک کے جھری دار چہرے ہموار ہو گئے۔ اپنا زمانہ یاد آگیا اور اندر ہی اندر ہوگئے کھوکھلے سینے گنگنا سے پڑے اور سرگوشیاں چھنے لگیں اور ساتویں سیڑھی پر پہنچتے پہنچتے چودھویں فنی تبصرے ہوئے۔

"لونڈیا ہے کہ آم انگوری!"

"نہیں یار آم فرنگن کہو۔"

"آم حسن آرا کہو آم حسن آرا!" ایک نے کہا گیا کہتے ہوئے برائٹ آف رشیا" نہیں کہتے" دوسرے نے لقمہ دیا۔

اور کسی نے پہچان کر کہا "ارے ستندریا! امبکا پرشاد مالی کی ستندریا! اللہ بچائے کا فرنے کیسے رنگین پر پرزے نکالے ہیں، چیت کی تتلی کی طرح۔"

"قوس قزح ہو رہی ہے۔"

"ارے یہ تو خود ہی نمائش میں رکھنے کی ہے۔"

"بھلا اس سے مقابلہ میں کون جیتے گا! بچئے میرے مالک!"

اور نگاہوں ہی نگاہوں میں گندمی مخصوص متوالی چال چلتی معصومیت کے ساتھ، ماحول سے بے خبر ستندریا ساتویں سیڑھی چڑھ کر پویلین کے بڑا منے میں سے مقابلہ کے آموں کے کمرے میں داخل ہوگئی اور فاروقی صاحب کی نگرانی میں مقابلہ شروع ہوا۔ کسی نے اپنا نام حسب نسب لکھ کر چاندی کے طشت میں پیش کیا اور جس کی چھری سے کاٹ کر ججوں کو چکھایا، کسی نے اپنی آمن سن ل اور آبنوس کی کشتی میں پیش کرکے مقابلہ پر رکھ لی، کوئی روئی کے پہلو میں نہایت نفاست کے ساتھ سامنے لایا۔ اور کسی نے اپنا سرخہ برف کی سل توڑ کر نکالا، اور اس طرح سرد بلوریں خاکے کی رومانٹک زیبائش میں پیش کیا۔ جج خارجی و داخلی خصوصیات دیکھ دیکھ کر اور چکھ چکھ کر پرکھتے رہے۔ حسب نسب سنتے رہے اور نمبر دیتے رہے، اور سب سے اخیر پر ستندریا کی باری آئی۔ کیلے کے پتے سے ڈھکی ہوئی

ٹوکری پوری کی پوری یوں ہی نے بڑھ گئی، اور سامنے جا کر رکھ دی۔ ججوں نے موجد کا نام پوچھا تو آہستہ سے بولی سندریا۔ اور فاروقی صاحب نے لقمہ دیا: "ختر ابیکا پرشاد مالی۔" ججوں نے آم کا نام پوچھا، تو لاچاری کھڑی جھینپ گئی۔ فاروقی صاحب بھی اصرار کرکے مقابلہ میں تو لوا لائے تھے۔ یہ خاص چیز گڑھ کر بتانا بھول ہی گئے تھے۔ لونڈیا تو چپ رہی مگر فاروقی صاحب نے ایک گھونٹ لے کر بے ساختہ کہا "جی آم؟ آم کا نام؟ گلاب خاص"۔ اب حسب نسب کا سوال ہوا تو فاروقی صاحب بیچارے بھی چپکے ہو گئے۔ سکّرے کی کھائی گٹھلی کا حسب نسب کیا معلوم! مجبوراً حسب نسب کی معلومات والے نمبروں میں ججوں نے صفر دیا۔ اب جو سندریا نے ٹوکری کا پتہ اوپر سے ہٹایا تو ججوں کو قدرت پر در دگار نظر آئی۔ آموں کی بھری ٹوکری تھی کہ گلاب کے پھولوں کی لبریز کنڈی! اور دوسری ہی سانس پر گلاب کی روح پرور خوشبو نے شامہ نوازی کی۔ رنگ روپ، صورت شکل اور بُو باس کے پورے نمبر چپکے ہی رکھ دیئے۔ اب کاٹ کر چکھنے کا نمبر آیا، سندریا نے سلیقہ سے کاٹ کر ایک ایک قاش پیش کی۔ "سبحان اللہ بشّہ۔

حسن آرا و برانڈ آف رشیا کے رنگ کے ساتھ آمن فرنگن کا روپ اور ملاحت! ثمر بہشت چونسہ کی شیرینی کے ساتھ خاص الخاص شاہ آباد اور انفانسو کا کیف ہے!" ایک جج نے کہا۔

"شیرینی تو ثمر بہشت چونسہ سے بھی زیادہ تیز اور صاف ہے۔" دوسرے نے اظہار خیال کیا۔

اور مغز کی لطافت میں تو دسہری گرد ہے اور شادابی میں شربتی بگرین کو مات کرتا ہے۔"

"پوست کتنا باریک اور مضبوط ہے۔"
"گٹھلی کیسی چھوٹی اور بے ریشہ ہے۔"

"اور خوشبو؟ خوشبو!!" ایک جج نے ذرا جوش کے ساتھ کہا اور بقیہ چاروں یکدم بول پڑے "یہ خوشبو تو آج تک کسی آم میں پائی ہی نہیں گئی۔ گلاب خاص تو خاص گلاب ہی ہے۔"

اور پھر چند دانے ہاتھ میں لے کر ڈنٹھل دیکھا اور کہا۔ "ڈنٹھل کا بڑا مضبوط ہے۔ ہوا سے گرتا نہیں ہے نا؟" سندریا سے سوال کیا۔ سندریا نے آہستہ سے جواب دیا "جی ایک دانہ نہیں گرتا، پھر پودا ابھی نیچا ہے تو بہاری ہوا زیادہ ستا بھی نہیں پاتی۔"

"کتنا آم ہے، پھلتا کیسا ہے؟" ایک جج نے سندریا سے سوال کیا اور سندریا نے کہا "درخت پر آم ہی آم دکھائی پڑتا ہے پتہ نظر نہیں آتا، چل کر دیکھ سکتے ہیں، بالکل سپیدہ ملیح آبادی کے ڈھنگ سے پھلتا ہے۔"

ججوں نے ایک گہری سانس لی، سیکڑوں سال کی روایات گرد ہو گئیں۔ نتیجہ ظاہر تھا، ہر پہلو سے گلاب خاص مکمل آم ثابت ہوا اور آموں کی ملکہ قرار دیا گیا اور ستم بالائے ستم یہ ہوا کہ ظاہری و داخلی دونوں معیاروں پر اس حد تک پورا اترا کہ نقرئی کپ اور طلائی تمغہ دونوں کے نمبر اسی کے نام پر پڑے۔

اعلان ہوتے ہی کسانوں، اور مالیوں مزدوروں کے منہ تو حیرت سے کھلے رہ گئے کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی۔ بڑے بڑے انعام اور اعزاز کے ٹھیکیدار زمینداروں پر مُردنی سی پڑ گئی اور جب سندریا نقرئی پیالہ اور طلائی تمغہ لے کر نکلی تو باہر مجمع میں کہرام سا پڑ گیا، خائف اور متحیر کسان طبقہ بھی تحسین و آفریں کا نعرہ لگا بیٹھا، زمیندار فرا فرا کر بغل کھا کھا کر رہ گئے۔

فاروقی صاحب سہرا تو فتح کا اودھ ہی کے سر باندھ آئے، اگرچہ طوفہ کی ستم ظریفی کو رنگین تر بنا کر اپنی ناتجربہ کاری سے بیت ہی چھوٹے سر پڑ اور آئے تو تھے ثالثی کا خشک کام انجام دینے کو، مگر یہاں بھی کچھ ایسی ہی صورت سے دوچار ہو گئے۔ ولایت پلٹ نوجوان تھے، لیکن ابتدائی سالوں سے ہی مخلوط سوسائٹی کی سطحی رنگینیوں میں دلچسپی لینے کے عادی تھے، بڑے رومان پسند شاعر مزاج! ایسا طفیلیہ کے حسن پرست نوجوان گھر پہنچ کر اور کچھ نہیں تو سرخ آموں کے پیدا کرنے میں ہی دلچسپی لے کر اپنی رنگین مزاجی کو برقرار رکھا تھا۔ پھر چچا کی لڑکی سے منگنی کر دی گئی تھی لہٰذا ساری عمر حسن پرستی اور حسن گری میں ہی لٹی تھی اور رنگین مزاجی کا سلسلہ کبھی نہ ٹوٹا تھا۔ چھ سات ہفتہ کے لئے یہاں جو آئے تو یہاں بھی قدرت نے سامان پیدا کر دیا اور عملی طور پر ان کی دلبستگی کے لئے تاریک مٹی سے گلاب کا پھول اُگا دیا۔ سندریا اور اس کے ہاتھ میں گلاب خاص، ان کی رنگین اور ہنگامہ پسند طبیعت کے لئے ایک اور ایک گیارہ ذریعہ بن کر ان کے ہاتھ میں آ گیا۔ اور کچھ نہیں، صرف اپنی سطحی اور ذہنی دلبستگی اور وہ بھی وقتی طور پر ایام گزاری کے مشغلہ کے طور پر، اور اس کے ساتھ ساتھ لڑکپن کی کچھ غیر سنجیدہ ستم ظریفی اس کے ہاتھ سے گلاب خاص کو بڑے بڑے اونچے اونچے آموں کے مقابلہ میں رکھوا دیا اور یہ نہ سمجھے کہ اس غریب کے رخساروں کی سرخی اور پھر گلاب خاص کی

سرخی اور ان سرخیوں پر زرد پیلے کپ اور سنہرے تتلوں کی چمک کا انعکاس اس کے سر پر دھواں بن کر سوار ہو جائے گا۔ وہ تو دلی تفریح کر کے اور اپنے کیمرے میں یہاں کے قیام اور سندریا کے ساتھ چند رنگین لمحوں کی یادگار کچھ تصویریں محفوظ کئے چلے گئے اور یہاں کا بقیہ سب یہیں چھوڑ گئے۔ مگر سارے علاقہ میں شور اٹھا کہ کیسی آگ سی بھڑکی ہے یہ! اور ہر گلا سندریا کو ہار بنا کر پہن لینے کی آرزو میں کٹنے لگا۔

ویسے خاں صاحب بڑے بوڑھے کہلاتے تھے۔ لیکن ان کے ہوا خواہ ساٹھا سو پاٹھا کی ضرب المثل کا حوالہ دینے لگے۔ بیچارے دائمی قبض کے پرانے مریض تھے پھر جوں جوں عمر بڑھتی گئی تھی، قبض بھی بڑھتا گیا تھا۔ حکیموں نے ہمیشہ گلقند آفتابی نسخہ میں لکھا تھا اور ہمیشہ سے اس کم بخت قبض کی شکایت کے سبب خاں صاحب کے دل میں گلاب کا پھول دیکھ کر مسلسل گلقند بنا غٹ سے نگل جانے کی شدید خواہش پیدا ہوتی تھی اور بات الٹی یہ کہ جتنی عمر بڑھی اور خاں صاحب ظاہری صورت میں ڈھیلے پڑے اتنے اندرونی اعتبار سے کستے گئے اور اب ساٹھ پینسٹھ کی عمر میں تو یہ عالم ہو گیا تھا کہ یہ گلقند کم بخت ان کی دوا سے بڑھ کر غذا میں شامل ہو گیا تھا اور بغیر اس کے روٹی ہضم نہ ہو سکتی تھی اور آج تو انہوں نے اپنی غذا کے لئے جنگلی گلاب کا ایک شاداب تر و تازہ پھول دیکھ پایا تھا۔

اور آغا صاحب تو ایرانی نژاد تھے، رنگین سیبوں اور بیدانہ اناروں کے دیس کے لوگ، یہاں آ کر پشتوں سے ایرانی پھل تو نصیب نہ ہوئے تھے لہٰذا سرخ آموں اور سیندوریہ آموں کے قطعے رکھنے کا شوق ورثے میں چلا آ رہا تھا۔ ہر دو اقسام کے پھلوں کے پشتینی اور پرانے شوقین تھے۔

اپنے علاقے کے چھوڑ دور دور کے سرخ آم اور سیندوریاں آمیں ان کا جائز اور فطری حق تھیں اور اب تو خیر منہ میں دانت بھی باقی نہ رہا تھا، جب بتیسوں برقرار تھے جب بھی سرخے آم اور سیندوریہ آمیں چوس کر ہی کھانے کے قائل تھے اور سندریا میں سرخ بریہا، گلاب خاص، حسن آرا اور آمن فرنگن کے کل رنگ و ملاحتیں اور ساری شیرینیاں و حلاوتیں بھری تھیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور وہ ان کی نرم شاداب شیریں اور رنگین غذا تھی۔ اور وہ تو معقول تجربہ کار ٹھنڈے بزرگ تھے اور اتنا بڑا قضیہ کا جھگڑا فاروقی صاحب کو

درمیان میں ڈال کر طے کر لیا تو یہ بھی آپس میں طے کر لیتے، اور پھر ان کے طبقہ کی روایات میں اس قسم کے لین دین کی رواداری چلی ہی آ گئی تھی، اور مل بانٹ کر کھانے کے عادی تھے۔ آگے پیچھے کی ایک ذرا سی بات تھی سو اس معاملہ میں شیر شاہ کی تڑی کہ سلیم شاہ کی بڑی کے یہ بزرگ زیادہ قائل بھی نہ تھے۔ اور سیندوریاں سرخے ادھر سے ادھر تحفہ میں ہر فصل پہنچتے ہی رہتے تھے، چپ چاپ بانٹ ہی لیتے تو کوئی بات نہ تھی ایک دو دن آگے پیچھے کی مگر بیچارے دونوں عجیب چکر میں پڑ گئے اور ناخلف اولاد کے ہاتھوں ہمیشہ شریف آدمیوں کو ایسی الجھنوں کا سامنا ہوتا چلا آیا ہے۔ آغا صاحب کے بھانجے جن کے سر دامادی کا بھی سہرا تھا اور خاں صاحب کے نواسے جن کا پچھلے ہی سال مونچھوں کا کونڈا ہوا تھا۔ نئی عمر گرم خون پھر ہمیشہ کے دوست، اور شریک کار دونوں نے سندریا کو اپنی اپنی جائداد منقولہ کی فہرست میں شامل کر لیا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

باہر تو بچپن کے دوستوں، دوستوں میں چلی اور گھروں میں خسر، داماد اور نانا نواسے میں ٹھن گئی اور بزرگوں کو اپنے اپنے لڑکوں کے خراب ہو جانے کا اندیشہ تھا۔ لڑکے دونوں اپنے اپنے گھر کے زمیندار اور خود مختار تھے۔ نگرانی خاص رکھنے کے لئے مصلحتاً آغا صاحب نے اپنے دیوان خانہ کے پاس باغ میں اور خانصاحب نے اپنی بارہ دری کے چمن میں امبکا پرشاد مالی کو اپنی زیر خدمات منتقل کرنے کا حکم دیا اور بالکل یہی اوفر دونوں لڑکوں نے امبکا پرشاد کے اعلیٰ فنی شعور کے زیر نظر پیش کیا کیونکہ انہیں اپنی نئی وضع کی تعمیر شدہ کوٹھیوں میں جدید طرز کی چمن بندی کے لئے ایک ایک تجربہ کار مالی کی سخت ضرورت پیش آ گئی تھی مگر امبکا پرشاد نے چاروں سرکاروں سے معذوری ظاہر کی تو صاحبزادوں کے درمیان گویا اپنی ٹیمیں رسہ کشی کے لئے تن گئیں۔ لیکن معاملہ ٹل سا گیا اور دونوں نے ایک دوسرے کی چوٹ پر مدافعانہ شکل اختیار کر کے اور رسے کو ڈھیل دے کر اپنی جانب کھینچنے کی اسکیم بنائی۔ لیکن خاں صاحب اور آغا صاحب دونوں پرانے اکھاڑے کے پکیت تھے۔ اپنے اپنے لقمۂ خسرے کی جانچ کی اور جب کاغذات کے معائنہ سے پتہ چلا کہ امبکا پرشاد والی کی پھلواری کی کاشت نصف نصف دونوں کی زمینداری میں پڑتی ہے اور اس پر دونوں کے ایک برابر قانونی حقوق ہیں اور اس سلسلے میں بغیر حصولِ اجازت نامہ دونوں نئے اقسام کے درخت نصب کرنے

ہیں لہٰذا قابلِ بے دخلی ہے چنانچہ دونوں نے اپنے جائز حقوق کی بنا پر بیدخلی کاشت کا نوٹس دیدیا کہ "چونکہ تم نے اپنی مقبوضہ اراضی ذیل کاری میں بلا اجازت ہمارے آم کے درخت نصب کرلئے ہیں۔ لہٰذا وجہ ظاہر کرو کہ کیوں نہ تم کو حسب دفعہ ۵۰ قانون قبضہ آراضی، ممالک متحدہ آگرہ و اودھ بیدخل کیا جائے۔ نیز یہ بھی لکھا کہ اگر بعد تعمیل نوٹس ہٰذا تم درختوں کو کاٹ دو گے تو تم پر فوجداری کا مقدمہ چلایا جائے گا۔" امبکا پرشاد مالی ہزاروں آم کے جدید درختوں کا خالق، اور بیسیوں نئے باغوں کا پروان چڑھانے والا آج چار آم کے درخت پیدا کرنے کے جرم میں کسا ہوا تھا۔ مگر وہ ادنیٰ شودر ہونے کے ساتھ ساتھ ان راجپوتوں کی نفسیات کا پورا محرم تھا اور وہ تو وہ اس کی سدھی معصوم سندریا تک سمجھ رہی تھی کہ وہ گلاب خاص آم کے درخت پیدا کرنیکے جرم میں ماخوذ نہیں ہے بلکہ گلابی رنگ کی لڑکی پیدا کرنے کے حسین تصور میں باندھا جا رہا ہے۔ اب اس کے سامنے دو راستے کھلے ہوئے تھے۔ پہلا تو یہ کہ پھلواری اور سندریا دونوں سے ہاتھ دھو کر ان چاروں میں سے کسی ایک کا ہو رہے اور دوسرا یہ تھا کہ فرار کا راستہ اختیار کرے۔ پہلے پر گامزن ہونے کا تو سوال ہی نہ تھا، اور اس کا تعزلت سامنے تھا۔ دوسرے میں کچھ امید کی کرن نظر آئی اور پیشتر اس کے کہ گلاب خاص کے شائقین کوئی عملی اقدام کرنے پائیں ایک اندھیری رات میں امبکا پرشاد مالی جس کے ہاتھ میں پشتوں سے بیلچہ ہی رہا تھا۔ کلہاڑا لئے نظر آیا اور سیدھا گلاب خاص کے اصلی تخمی درخت پر جھپٹا اور ارادھڑام کاٹ کر پھینک دیا۔ سندریا الیسورتی رہی، اور خائف خائف نگاہوں سے اپنے چاروں "نو دمے" قلمیوں کو دیکھتی رہی مگر جب وہ کلہاڑ لئے کر قلمی پودوں پر پھیلا تو پہلی ضرب پر سندریا کی چیخ نکل گئی جیسے کلہاڑا اس کے سر پر پڑا۔ مگر امبکا پرشاد مالی نے سنی بھی نہیں اور ذرا دیر میں چاروں رنگین شاداب اور پھلے "نو دمے" کاٹ کر اپنی سندریا کی بارہ سالہ محنت اور شوق مٹی میں ملا دیا۔ اور گلاب خاص کے چاروں قلمی درخت جن کے اندر سندریا کا مشکبو پسینہ عرق بن کر دوڑتا تھا الٹ کر مردہ لکڑی کا ڈھیر ہو گئے اور وہ بھرے گلاب خاص جن میں سندریا کی جوانی کی شراب چھلکتی تھی اور عارضوں کا رنگ جھلکتا تھا چاروں طرف دانہ دانہ بکھر گئے۔ اب امبکا پرشاد مالی گملوں کی اس قطار کی جانب رجوع ہوا، جس میں گلاب خاص کی ایک سالہ قلمیں رکھی ہوئی تھیں۔ ایک ایک کرکے اکھیڑتا چلا آیا۔ سندریا سسکیوں سے رو رہی تھی اور حسرت بھری نگاہوں سے گلاب خاص کے ڈھیر کو دیکھ رہی تھی۔ جب نئی قلمیں نوچتا ہوا امبکا پرشاد مالی، اخیر کے دو گملوں پر پہنچا تو سندریا بڑے پیار کے ساتھ جھپٹی اور دونوں گملوں سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی۔ ان میں اس کے ہاتھ کی تیار کی ہوئی اسی سال کی دو تندرست ہونہار قلمیں ایستادہ تھیں۔ امبکا پرشاد مالی ذرا ٹھٹکا اور ان دو گملوں کے قریب آکر ٹھہر گیا، اور چاروں طرف برباد ڈھیروں پر نگاہ ڈال کر ذرا اطمینان کا سانس لیا۔ رات اندھیری تھی، بھادوں کی اماوس والی سال کی تاریک ترین رات، جب کل کائنات ہی "اندھیاری" ہوا کرتی ہے۔

"چلو بٹی" اس نے ذرا پُراطمینان لہجہ میں کہا۔ اور سندریا نے دونوں گملے اس طرح بغل میں دبائے جیسے گھونگھٹ سے دو بچے ہوئے گھر سے۔

کوئی اثاث البیت تو لینا ہی نہ تھا اور وہ دونوں بیک بینی و دوگوش نکل پڑے۔ امبکا پرشاد مالی کا ہر قدم ملکِ خدا تنگ نیست پائے مرا لنگ نیست سا کہتا ہوا، اور سندریا بغیر یہ سوچے کہ ؎

"منزل ہے کہاں تیری اے لالۂ صحرائی"

گملے بغل میں دبائے چل پڑی۔ پھلوار کے پھاٹک پر پہنچ کر دونوں نے گردن موڑ کر کچھ دیکھنے کی کوشش کی۔ امبکا پرشاد مالی نے نہ معلوم کیا...... اور سندریا نے شاید اس ویران کٹیا کو جس میں وہ پیدا ہو کر پروان چڑھی تھی اور غالباً گلاب خاص کے درختوں کے اس ڈھیر کو جو اس نے پیدا کیے پروان چڑھائے تھے۔ مگر بلا کی تاریکی تھی، کچھ نظر نہ آیا اور وہاں تو کچھ بھی نہ تھا۔

امبکا پرشاد مالی نے میدان میں پہنچ کر ایک لمبی سانس لی۔ ماحول کو پرتالا، دور و قریب ہالے ہمالے باغ سنسنا رہے تھے، جن کی زمین کے چپہ چپہ پر اس کے اعلیٰ فن اور شدید محنت کی مہریں ثبت تھیں۔ مگر آج اسے پتہ چلا کہ اس نے تیری میری زمین پر دودھ اور شہد کی نہریں کھود دی تھیں، اور ہر آم کو پیدا کرتے وقت خام خیالی سے اپنا بیٹا تصور کیا تھا اور پرورش ہو نے کے بعد تو اس کے ہر بچے پر دوسروں کی ملکیت درج ہو گئی تھی۔ آگے پیچھے دائیں بائیں باغ ہی باغ تھے۔ اس کے پیدا کئے ہوئے پروان چڑھائے ہوئے اور اس کے تاریک تصور میں دور دور تک شاداب، تندرست، تنومند، چھتری دار،

(باقی صفحہ ۱۲۳ پر)

ماہ نو، کراچی۔ استقلال نمبر ۱۹۵۵ء

دہلیز

انتظار حسین

کوٹھری کی دہلیز اس کے نزدیک اندھیر دیس کی سرحد تھی۔ مٹی میں اٹی چوکھٹ لانگتے ہوئے دل دھیرے دھیرے دھڑکنے لگتا، اور اندر جاتے جاتے وہ پلٹ پڑتی۔ اس کوٹھری سے اس کا رشتہ کتنی دفعہ بدلا تھا۔ آگے وہ اک مانوس بستی تھی، مانوس میٹھے اندھیرے کی بستی۔ گلی آنگن کی جلتی بلتی دھوپ میں کھیلتے کھیلتے کوٹھری میں کواڑوں کے پیچھے یا میلی بے قلعی دیگ کے برابر کونے میں جا چھپنا، ہنکتے ہوئے بدن میں آنکھوں میں اندھیرا ٹھنڈک بن کر اترنے لگتا، اور ننگے پیروں تلے کی مٹی کی ٹھنڈی ٹھنڈی نرمی تلوؤں سے اوپر چڑھنے لگتی۔ اماں جی ابھی جیتی تھیں، کوٹھری میں نکلتے بڑھتے دیکھتیں تو چلانے لگتیں: "ذوبی تو کہاڑن ہے کہ کاٹ کباڑ میں گھسی گھسی پھرے ہے۔ اندھیرے میں کیڑے کانٹے نے کاٹ لیا تو......" بچپن اور اماں جی کے ساتھ اندھیرا بھی جدا ہو گیا۔ کوٹھری کا وجود نفضلے یاد سے ایسا محو ہوا کہ یہ تک خیال نہ آتا کہ گھر میں کمروں، دالانوں، چھتوں اور آنگن کے سوا اک کوٹھری بھی ہے۔ برسوں سے بند پڑی تھی۔ کبھی کبھار کھلتی موسم بدلنے پر جبکہ جاتے موسم کا ٹنڈیرا اندر رکھا جاتا اور آنے موسم کا سامان باہر نکالا جاتا، یا کبھی کوئی ٹوٹی پنڈی کوئی انجر پنجر چارپائی اندر ڈالنے کے لئے کوئی پیندا نکلا لوٹا، کوئی جوڑ کھلی بالٹی مرمت کی نیت سے نکالنے کے لئے۔ اب کی گرمیاں آنے پہ کوٹھری پھر کھلی تھی اور اس کے ساتھ کوٹھری سے رشتہ اسکا پھر بدل گیا۔ لحاف گدے ٹانڈ پر سنگوا کر نیچے اترتے اترتے سامنے والی کھونٹی پر کالا چٹیلنا ٹنگا دیکھ کے اسے اپنے چٹیلنے کا خیال آیا کہ میلا چیکٹ ہو گیا تھا اور سوچنے لگی کہ یہ چٹیلنا اس سے تو اجلا ہو گا ہی، اسے اتار لے چلو کہ اتنے میں نیچے نظر گئی، جہاں گردمیں زمین پہ، جسے جانے کن برسوں سے جھاڑو نہیں لگی تھی، ایک موٹی لکیر کونے میں رکھے ہوئے برتنوں والے ریت میں اٹے پڑے صندوق کے پاس سے چل کر لہراتی ہوئی سی دروازے کے قریب کے کونے میں رکھی ہوئی تانبے کی میلی بے قلعی دیگ کے نیچے گم ہوتی دکھائی دی۔ کچھ اچنبھے سے کچھ ڈر سے اسے غور سے اس نے دیکھا۔ شک پڑا۔ جی میں آئی کہ آپا جی کو دکھائے۔ مگر وہ ان کھلے جھلنگے کو دیکھ کر اپنا شک اسے لغو معلوم ہوا اور گمان کیا کہ اودوان کا نشان ہے۔

دالان اور کمروں میں جھاڑو دیتے دیتے کوٹھری کے آس پاس پہنچتی تو کوٹھری کے کچے فرش کا اسے خیال آ جاتا۔ جہاں گونٹوں گونٹوں مٹی تھی کہ ننگے پیر چلتی تو پورا پنجہ اس پہ ابھر آتا، اور جھاڑو لاکھ دیجئے مگر ریت اتنی کی اتنی ہی۔ اور وہ لہریا نشان کہ برتنوں کے بڑے صندوق کے نیچے سے نکل کر تانبے کی میلی بے قلعی دیگ تک گیا تھا۔ اس کے سامنے تصویر سی آتی اور وہ اسے دفع کر دیتی۔ مگر تھوڑی ہی دیر میں اس کے ارادے میں ضعف آ جاتا اور اندھیری مٹی میں بل کھاتا نشان پھر تصور میں ابھرتا اور ماضی کے اندھیرے میں لہرلیتا دور تک رینگتا چلا جاتا.......

"تا بہو نام مرت لے" اماں جی نے ٹوکا: "اس کے کان بڑے بڑے ہوویں ہیں، اور اپنا نام تو بڑی جلدی سنے ہے۔ ایک دفعہ کیا ہوا کہ میں جو پچھلے پہرے اٹھی، جوتی پاؤں میں ڈالی، سامنے آنگن میں کیا دیکھوں کہ موا ادھ موا پڑا ہے۔ میں نے تیرے میاں کو آواز دی۔ مجید کال کھاتی نے جو اس کا نام لیا تو وہ تو سرسراتا ہوا یہ جا وہ جا۔"

آپا جی گم سم، ٹھوڑی گھٹنے پہ رکھی ہوئی اور نظریں اماں جی کے

چہرے پہ۔ اماں جی پھر شروع ہو گئیں۔ "گھر ہے بہت پرانا، ہم تو جب سے اس گھر میں آئے اس کا ذکر سنا۔ اللہ بخشے ہماری ساس کی ایسی عادت تھی کہ جب دل کسی چیز کا لینے کی ضرورت ہوئی چراغ بتی بغیر کوٹھری میں گھس گئیں۔ کئی دفعہ ایسا ہوا کہ آہٹ سنی اور سر سر کرتا صندوق کے پیچھے۔ بچاری کم کم دیکھتا تھا، اٹکل سے چلتی پھرتی تھیں۔ ایک دفعے تو بال بال بچیں، اندر جو گئیں تو بڑبڑانے لگیں کہ اے لو چٹیلا زمین پر کس نے پھینک دیا ہے۔ ہاتھ جو ڈالیں تو اے میاں وہ تو رسی......"

آپا جی گم متعجب بیٹھی تھیں۔ پھر پھریری لے کے بولیں "یہی بات ہے ہمیں تو کبھی شک بھی نہیں پڑا تھا۔ آپ کے بیٹے کے ساتھ ایک دفعہ ہوئی۔ دوپہری کا وقت۔ میں نے سوچا کہ آج مسہری نکال کے کھول ڈالوں۔ نواڑ بہت مٹی میں اٹ گئی ہے۔ پیچھے پیچھے تمہارے بیٹے آ گئے۔ میں تو مسہری نکال رہی تھی، وہ بڑبڑانے لگے کہ چھڑی کس نے زمین میں پھینکی ہے۔ نینی تال سے اس مشکل سے منگائی ہے، ٹوٹ گئی تو بس لی۔ وہ ہاتھ ڈالنے کو تھے کہ سلے اماں جی وہ تو لہر کھا کے سٹاک سے غائب؟"

اماں جی نے تائید کی۔ "ایسے ہی غائب ہووے ہے ابھی دکھائی دیا، ابھی غائب ..... بس خدا ہر بلا سے بچا تا ہی رکھے"

آپا جی سوچ میں پڑ گئی تھیں۔ پھر پھریری لے کے واپس آئیں "ہاں خدا ہر بلا سے بچائے۔ اور اس موذی کے نام سے تو میری جان جاتی ہے"

"مگر بی بی اپنے اپنے نصیبے کی بات ہے" اماں جی بولیں "جنہیں فیض پہنچنا ہووے ہے، دشمن سے بھی پہنچ جاوے ہے۔ اللہ بخشے ہماری ساس ایک کہانی سنایا کریں تھیں کہ ایک شہزادے سے سسرالیوں نے ساکا کیا اور شہزادی کی بجائے ایک بدشکل ٹھنڈی لونڈی کو ڈولے میں بٹھا دیا۔ منہ میں دانت نہ پیٹ میں آنت۔ چمڑی جھر جھر، چونڈا چٹا۔ عروسی کی رات مسہری پہ بیٹھی، لال جوڑے میں لپٹی تھر تھر کانپے، کہ شہزادہ آوے گا اور گھونگھٹ اٹھاوے گا تو قیامت مچا دے گا۔ اتنے میں کیا دیکھے ہے کہ کڑیوں سے کالی ڑی لٹکی ہے۔ دم اوپر سر نیچے، منہ کھلا ہوا، نیچے لٹکا، اور نیچے لٹکا اور اس کا منہ اس کے چونڈے پہ۔ اس بدبختی ماری کی بری

حالت۔ ساؤ تو بدن میں لہو نہیں۔ تو بی بی کیا ہوا کہ اس نے ایک بال منہ میں لیا اور چھوڑ دیا۔ وہ کالا پڑ گیا اور یہ لمبا کہ کولہے سے نیچے پہنچے۔ ایک بال منہ میں لیا، دوسرا بال منہ میں لیا، تیسرا، چوتھا اے بی بی دیکھتے دیکھتے سارے بال کالے ہو گئے اور یہ لمبے چٹیا کولہے سے نیچے بل کھاوے۔ شہزادہ جو داخل ہوا تو شش سمجھا کہ عروسی کے کمرے میں مسہری نہیں بچھی، پری کا کھٹولا اترا ہے۔ دلہن ہے کہ پری۔ چندے آفتاب، چندے ماہتاب، میدے کی لوئی، ناگن سی لہراتی زلفیں۔ وہ تو دل و جان سے فریفتہ ہو گیا۔!!"

آپا جی اماں جی کا منہ تکیں۔ خود وہ حیران تھی کہ لونڈی شہزادی کیسے بن گئی۔

"اماں جی وہ شہزادی کیسے بن گئی؟" وہ پوچھنے لگی۔

"بیٹی جب تقدیر پلٹا کھاوے ہے تو جون بھی بدل جا ہے۔"

"مگر اماں جی ایسی بھی کیا جون بدلی ہوئی" آپا جی تعجب سے بولیں۔

اماں جی کی تیوری پہ بل پڑ گئے۔ "اری مجھے کیا جھوٹ بول کے اپنی عاقبت بگاڑنی رئی ہے۔ عذاب ثواب کہنے والے پہ، ہم نے تو یوں ہی سنی تھی۔ بی بی بات یہ ہے کہ اپنا اپنا نصیب ہے نہیں تو وہ آدمی کو کسی کل پہنچنے ہی نہیں دیتا۔ کلموا زہری جان کا بیری۔ اور خود ایسا ڈھیٹ کہ نہ بیاری ستاوے نہ موت آوے"

"اے اماں جی کیا کہہ رہی ہو؟" آپا جی نے بہت ضبط کیا مگر پھر منہ سے حیرت کا کلمہ نکل گیا۔

"اے لو پھر وہی شک، اری اس کی تو یہ حالت ہے کہ ہزار سال میں جا کے کہیں بوڑھا ہووے ہے۔ سو کینچلی اتاری، اور پھر ویسا ہی جوان۔ اپنی موت تو وہ مرتا نہیں ہے، کوئی سر کچل دے الگ بات ہے"

"اماں جی" وہ سوچتے ہوئے بولی "وہ مرتا کیوں نہیں ہے؟"

"بیٹی اس نے بوٹی کھا لی ہے" اماں جی چل پڑیں۔

"اب سے دور بابل میں ایک بادشاہ تھا اب اسے جو

جھوٹ بتادو، اس کا تھا اک وزیر بڑا کا بہادر۔ دونوں نے مل کے فتح کے خوب ڈنکے بجائے۔ ہوا کیا کہ وزیر بیمار ہو کے مرگیا۔ بادشا کی کمر ٹوٹ گئی۔ مگر وہ ہمت ہارنے والا کہاں تھا۔ بیڑا اٹھایا کہ موت پہ فتح پائے گا۔ ہر سو مرگ کھینچا، پاپڑ بیلتا، دن سفر، رات سفر، تن بدن کا ہوش، نہ کھانے پینے کی سدھ۔ سات سمندر پار اک سمندر پہ پہنچا کر ایک پہنچے ہوئے فقیر نے اسکا پتہ دیا تھا۔ اور غوطہ لگا کے اس کی تلی سے بوٹی لایا، جسے کھالیتا تو موت کے جھنجھٹ ہی سے چھٹکارا مل جاتا۔ ڈوبے کی قسمت کہ واپس ہونے لگا تو رستے میں ندی پڑی۔ میلوں کے سفر سے تھکا ماندہ تو ہو ہی رہا تھا، جی میں آئی کہ نہالوں، پنڈا ٹھنڈا کردوں۔ کپڑے اتار فڑاپ سے ندی میں۔ اے بی بی اس نے ڈبکی لگائی اور ادھر ایک کیڑا بوٹی کو منہ میں دبا یہ جا وہ جا۔ بادشاہ ندی سے نکلا نکل پیچھے بھاگا۔ سارا جنگل تلپٹ کردیا۔ ایک ایک درخت کو چھانا۔ ایک ایک کھوہ کو ٹٹولا۔ مگر بی بی وہ تو آن کی آن میں چھو ہوگیا۔"

دم کے دم میں ظاہر ہونا اور غائب ہوجانا۔ بجلی آنکھوں کے آگے کوندی اور اندھیرا۔ چیزوں کا یہ چھلاواپن اس کے لئے حیرت کا مستقل سامان تھا۔ اسے تو یاد آجاتا جو ہوا کیا صبح کیا شام، کھڑی دوپہریوں میں اور چاندنی راتوں میں اس کے ساتھ کھیلتا رہتا اور گھومتا پھرتا اور پھر ایسا گم ہوتا کہ کہیں نظر نہ آتا۔ وہ دوپہریاں اور وہ چاندنی راتیں اس کے لئے اب خواب تھیں، چور سپاہی کھیلتے کھیلتے کوٹھری میں اسکا جا چھپنا۔ کونے میں رکھی ہوئی میل سے قلعی دیگ، برتنوں کا بڑا صندوق، بے لانگی نگی مسہری، برابر میں الٹی کھڑی چارپائی جسکے بان بیچ میں سے تو بالکل ہی غائب ہوگئے تھے۔ اندھیرے میں دھیرے دھیرے ساری چیزیں دکھائی دینے لگتیں، نہ دکھائی دیتا تو تو۔ یا اللہ کہاں چھو ہوگیا۔ کس کھوہ میں جا چھپا۔ زمین میں سما گیا کہ آسمان نے کھالیا اور اتنے میں برتنوں والے صندوق کے پیچھے سے کالا کالا سر ذرا سا ابھرتا اور وہ لپک کر کھٹ سے پکڑ لیتی" ہا چور پکڑا گیا۔" کبھی آنکھ مچولی میں دونوں اکٹھے کوٹھری میں جا چھپتے۔ اندھیرے کونے میں کھڑے کھڑے دیر ہو جاتی اور اندھیرا اپنا عمل شروع کردیتا۔ اندھیرا جسموں میں اترنے

لگتا، اندھیرا جسموں سے نکلنے لگتا۔ اور اندر اور باہر میں ایک رشتہ پیدا ہوجاتا۔ لگتا کہ آوازوں اور اجالوں کی بستی بہت پیچھے رہ گئی ہے۔ اندھیرے کا جہان شروع ہے۔ کالے کوسوں کا سفر بے نشان بے منزل، ہر دالان میں آہٹ ہونے پہ اندھیرے کا جہان بکھرنے لگتا۔ چور ڈھونڈتا ڈھونڈتا انہیں ڈھونڈ نکالتا۔ کبھی جب تنہا اندھا بیٹھا جتا تو کوٹھری میں اس اطمینان سے داخل ہوتا جیسے اسے سب کچھ دکھتا ہے اور دیگ کے پاس آکر کھٹ سے اس پہ ہاتھ ڈال دیتا اور اس زور سے چٹیا کھینچتا کہ اس کی چیخ نکل جاتی۔

چٹیا میں چٹیلنا وہ اب باندھنے لگی تھی۔ آگے بال اتنے لمبے تھے کہ جنجال لگتے۔ سارے چمکیلے لمبے لمبے بال کہ چٹیا موٹا سونٹا سی بنتی اور گوری گردن سے نیچے کمر پہ ناگن سی لہراتی۔ کولھوں سے نیچے پہنچتی، اور جب نہانے سے پہلے چوکی پہ بیٹھ کے لپے ہوئے بھیگے ریٹھوں سے دھونے کو بال کھولتی تو کالی لٹیں گیلی زمین کو جا چھوتیں۔ سر کے بال اس کے سرسام میں گئے۔ مرض آندھی دھاندی آیا، اور تین دن تک یہ عالم کہ آپے کا ہوش نہ یہ خبر کہ کہاں ہے۔ ان تین دنوں کا اب خیال آتا تو لگتا کہ اندھیرے میں سفر کررہی ہے۔ اس سفر میں وہ کتنی دور نکل گئی تھی۔ کالی اندھیری سرحد تک، جہاں آگے اندھیرے سے اندھیرا پھوٹتا تھا اور اندھیرے کی کالی راجدھانی شروع تھی۔ سرحد کو چھوتے چھوتے وہ پلٹی اور پھر آوازوں اور اجالوں کی دنیا میں واپس آگئی۔ پر لمبے کالے کوسوں والے دہشت بھرے سفر کے اثر آثار جسم پہ ظاہر تھے کہ جھٹک گیا تھا، اور بالوں پر کہ چھدرے اور چھوٹے ہوگئے تھے۔ اور چمکیلا پن اُن کا مدھم پڑگیا تھا۔ اب چٹیا چٹیلنے کے وسیلے سے کولھوں تک پہنچتی تھی۔

دالان سے گذرتے گذرتے اس کے قدم کوٹھری کی طرف اُٹھتے اور پلٹ پڑتے۔ سوچتی کہ چٹیلنا میلا چیکٹ جانے کن برسوں کا کھونٹی پہ ٹنگا ہے۔ اس قابل کب ہے کہ چٹیا میں ڈالا جائے؟ اور اسے کھونٹی سے اتارنے کی نیت توڑ توڑ دی۔ مگر پھر بے دھیانی میں کوٹھری دیکھ کر چٹیلنے کا خیال آجاتا اور اس کے قدم اس طرف اٹھتے۔ دہلیز تک پہونچتے پہونچتے پھر رکتے اور الٹے پھر آتے۔ ہاں تصور کی لکیر پھیلنے لگتی۔ لمبی ہونے لگتی۔ اور بیچ کھاتی بیتے دنوں کے کونوں کھدروں میں جا نکلتی۔۔۔۔۔۔

اماں جی تیل تو اچھا خاصا تھا۔ میں نے سوتے وقت لالٹین ہلا کے دیکھا ہے۔ میں جانوں کہ بتی گر گئی۔"

"تو بہو بتی اتنی کم کیوں کی تھی۔" اماں جی بولیں۔ "دن خراب ہیں۔ جانیں کیا وقت ہے کیا موقع۔ لالٹین بالکل گل نہیں کرنی چاہیئے۔ مجھ دکھیا کی سمجھ میں کچھ نہ آوے کہ کیا کروں۔ اندھیرا گھپ، ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دے۔ سرسر سرسر، سو چل کر کیا چیز ہے۔ شک پڑا کر رہتی۔ پھر سوچوں کہ شاید میرا وسوسہ ہو کہ اتنے میں دڑبے میں مرغیں چیخنے لگیں۔ دڑبے کی طرف جو دیکھوں تو بہو تجھے یقین نہ آئے گا، یہ لمبا...... میرا تو دم نکل گیا۔ حلق سے آواز نہ نکلے۔ پھر میں نے ہمت کر کے تجھے پکارا۔ بہو او بہو۔"

"اماں جی، مجھے تو ذرا ہوش نہیں کہ آپ نے کب آواز دی تھی۔"

"بی بی تیری نیند تو بیہوشی کی ہے۔ گھر میں قیامت آ جاوے تیرے کان پہ نقارے بجیں پہ تجھے پتہ نہ چلے۔ مرا تو بار بار گر ایسی نیند بھی کیا۔ تو پھر میں نے نعیمن کو پکارا۔ واری نعیمن...... او نعیمن! مگر اس بخت ماری کو بھی سانپ سونگھ گیا تھا۔ اب کیا کروں بی بی۔ ساری رات تھرتھری بیٹھی رہی اور آیتیں پڑھتی رہی۔ دھڑکا یہ کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ میں تو سو جاؤں اور بچّا نے پیشاب کے لئے کوئی اٹھے اور ...... صفیہ کی تو ایسی بری عادت ہے کہ آدھی سوتی آدھی جاگتی چرپائی سے اترے گی اور ننگے پیر نالی پہ۔ بس اسی دھڑکے میں تڑکا ہو گیا تو ذرا ذرا اجالا ہوا اور......"

"اری صفیہ کیا کر رہی ہے بی بی۔" باورچی خانے سے آپا جی کی آواز آئی اور صفیہ بڑبڑائی، اور تصور کی لکیر شاک سے غائب۔ پھر وہ کام دھندے میں ایسی جٹتی کہ تن بدن کا ہوش نہ رہتا۔ جھوٹے باسن پھیلائے اور برابر میں رکھی تھالی سے بھر بھر مٹھی راکھ ہر برتن میں ڈالی، اور بانوں کے جونے سے اتار گڑتی اتار گڑتی کہ نل کے پانی سے تر لیپڑے دیکر جب وہ دیگچیوں، پتیلیوں، مٹی کی ہانڈیوں کو، پیتل کے لوٹوں، تانبے کی قلعی کی ہوئی سینی اور بھرت کے تسلے کو، ایلومونیم کے ناشتے دان، سلیقہ کے بڑے بادیئے اور بے قلعی کرتے مرادآبادی گلاس کو کھرنجے والی چبوتری پہ دھوپ میں چنتی تو وہ شیشہ سے چمکتے اور گنگنا اٹھتے نہیں تھے ہیں قلعی ہوتی ہے۔ میلی راکھ میں تھڑے ہاتھ بھی نل کے تریڑوں سے کہ کلائی میں بھری پکی آسانی چوڑیوں میں میٹھا میٹھا شور پیدا کرتے ایک نئی تازگی پاتے، اور گورے پوروؤں سے کہنیوں تک اور اجلی کلائی سے کہنی تک اجالے کی ایک کرن دوڑنے لگتی لیکن تھوڑی ہی دیر میں وہ اجلی انگلیاں اور ہتھیلیاں بھیگتے آٹے میں سن جاتیں، اور لگتا کٹوں سے کونڈا بجنے لگتا، اور گیلا آٹا کلائیاں چھوڑ آگے کی ایک دو چوڑیوں تک کو سان لیتا۔ صفیہ آٹا کمال لوچدار گوندھتی تھی کہ کوا چونچ مارے تو چپک کر رہ جائے۔ پھر توے پہ بڑی بڑی ورق سی روٹیاں ڈالنا، کھمنی میں سینکنا اور ڈلیا میں تھئی کی تھئی جما دینا۔ کبھی کبھی جب شام کے اندھیرے میں توا چولہے سے اتار کر الٹا کرتی، تو سرخ سرخ ننھے ان گنت ستارے توے کی کالونس میں تیرتے ہلکورے لیتے نظر آتے۔

"آپا جی توا ہنس رہا ہے۔"

"توے کا ہنسنا اچھا نہیں ہوتا۔" آپا جی متفکرانہ لہجہ میں جواب دیتیں۔ "اس پہ راکھ ڈال دے۔"

کام کاج کی اس مصروفیت میں بھی ذہن جسم سے الگ بھٹکتا۔ کبھی دالان میں جھاڑو دیتے دیتے، کبھی چار پائی کی ادوان کستے کستے کبھی ریشم کی نیلی پیلی لچھیاں کھولتے سلجھاتے، اس کے جسم کی نقل و حرکت سے الگ تصور کی گتھی کھلنے لگتی اور لہریا لکیر بھولے بسرے بیتے دنوں کے اندھیرے میں رینگنے لگتی۔ اماں جی یاد آتیں، اماں جی کی باتیں اور کہانیاں، کسی سادہ سی بات پہ ان کا چونک اٹھنا اور چونکا دینے والی باتوں پر سادگی سے بات کرنا اور گزر جانا۔ کوٹھری کے کونے میں رکھی ہوئی دیگ کو صاف کرتے کرتے جب اماں جی کے ہاتھ میں کیچلی آ گئی تھی تو کس سادگی سے انہوں نے اٹھایا اور یہ کہتے ہوئے الگ احتیاط سے رکھ دیا کہ بشیرن کی لونڈیا کو کالی کھانسی ہے، اسے بھجو دینگے۔" اور ایک صبح کو جب کابک کے خانے سے سفید کبوتری پلکرو کی طرح سوکھی مری نکلی تھی تو اماں جی کو فوراً یاد آیا کہ رات انہوں نے کابک کے برابر پھنکارنی تھی۔ اماں جی پہ اسے کتنا رشک آتا تھا کہ غائب چیزیں ان کے لئے حاضر تھیں اور ایک وہ تھی کہ نشانات لو آثار بچپن سے قدم قدم پہ دیکھتی چلی آ رہی تھی لیکن اصلی چیز ہمیشہ نگاہوں سے اوجھل رہی۔ پرچھائیں ہر موڑ پہ رستہ کاٹتی، لیکن پرچھائیں والا کہاں ہے۔ کبھی کبھی نشان کو دیکھ کر لگتا کہ گزرنے والا ابھی گزرا ہے اور دو قدم ماریں تو اسے جا پکڑیں۔ اس خیال سے

[illegible] اسلامیہ [illegible]

آرقی کی فضاؤں



[illegible]



[illegible]

خوش خرام قافلہ [illegible] آباد کے [illegible] کی طرف

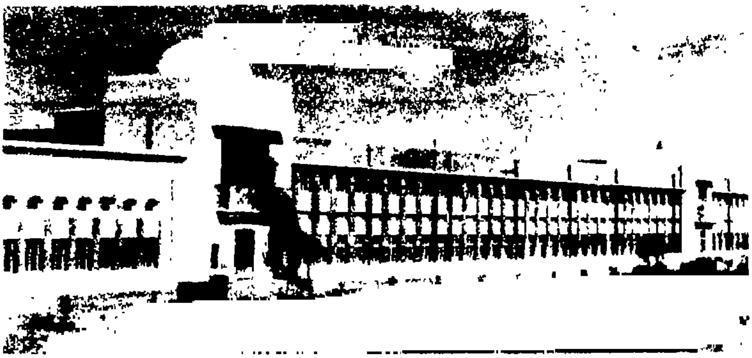
[illegible] کی ایک سرسبز وادی میں [illegible]



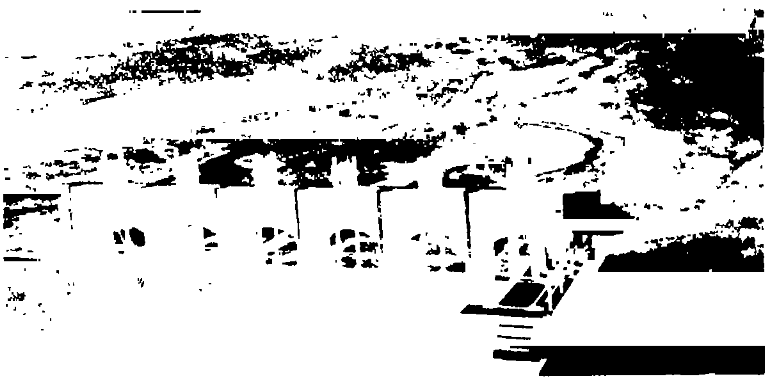




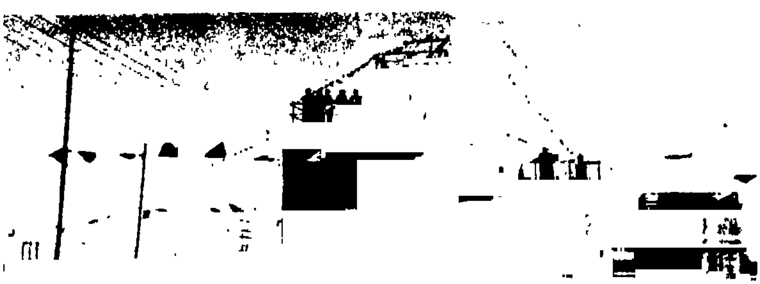
ل مکٹری داؤد [illegible]



[illegible]



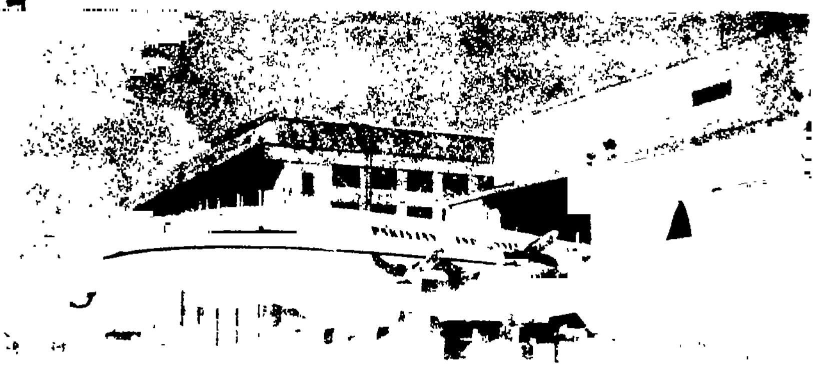
[illegible]



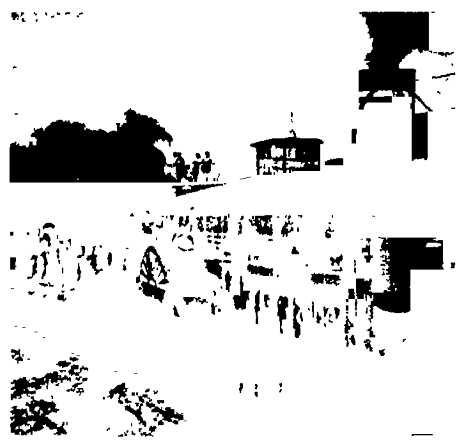
ی افکٹری نوسہر

مجلہ ۱۲ — ادارہ سیرت اسلامیہ

پاکستان کی بین الاقوا
سروس پی۔ آئی۔
ورٹ کے حاتی کا ٹ

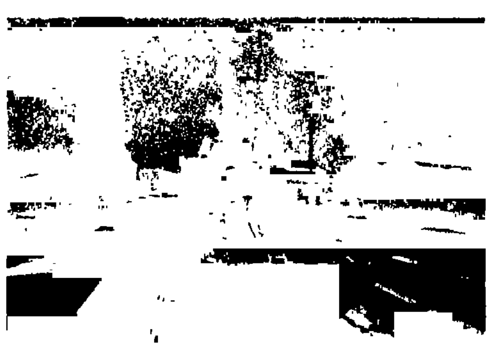


پاکستان میں دریائی نہروں کے ذرائع میں توسیع کی جا رہی ہے



پاکستانی بحریہ کے ماہ کی جہاز سروس میں مرمت کے دوران





ی کی منسک اردوی ہار ہو چکی ہے



[illegible] اسلامیہ دہلی

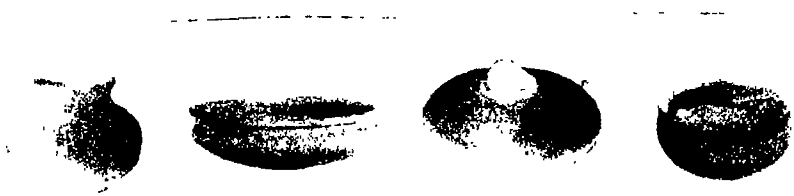
میذامتی











اسکا دل دھڑکنے لگتا، اور جھرجھری آجاتی، اور پاؤں سوئیوں کے
ہوجاتے بیٹھ پڑے پہ جب ایک دن صبح ہی صبح وہ اور تمو بیربہٹیاں
پکڑنے گھر سے نکلے تھے تو کالے آموں والے باغ کے کنارے بھیگی
زمین پہ پانی میں تربتر نیم کا پیڑ گرا پڑا تھا، یہ لمبا اژدہا سا، تنہ کالا
بھجنگ، جابجا بکل اڑجانے سے سفید چربی سی نکلی ہوئی جیسے ابھی
کسی نے کلہاڑی چلائی ہے۔ دونوں حیرت سے کھڑے کے کھڑے
رہ گئے۔

"رات بجلی گری تھی۔"

"بجلی؟"

"پتہ نہیں ہے رات مینہ برستے برستے کتنی زور سے بجلی
تڑخی تھی۔" تمو کہنے لگا "ایسا کہ ہماری چھت پہ گری ہے......
یاں گری تھی.... " وہ بڑبڑانے لگا "اس کی کھکھل میں کالا سانپ
رہتا تھا بہت پرانا تھا۔ رات نکلا ہوگا۔ بجلی کالی چیز پہ گرے ہے۔"

"کہاں گیا وہ پھر؟" اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا

"کہاں گیا۔" وہ اس کی بیوقوفی پہ ہنس دیا۔ "بجلی نے اسکے
بکل اڑا دیئے۔"

سوچتے سوچتے اس میں یہ خواہش شدت سے جاگتی، کہ
وہ زمانہ پھر پلٹ آئے، اور بدن کے کڑیالے کو منہ سے چٹکی
میں کوئی پکڑلے اور اسمار دآثار کا وہ گم ہوتا جلوس جاتے جاتے
پھر پلٹ پڑے۔ اماں جی سے اسی طرح کہانیاں، حکائتیں اور نصیحتیں سنی
جائیں اور یہی ان سنی کرکے بارش ہونے پہ منہ اندھیرے بے ہاتھ منہ
دھوئے ننگے پیر، پانی میں چھپ چھپ کرتے بیربہٹیاں پکڑنے
جنگل نکل جائیں۔ بیربہٹیاں نہیں تو پپیئے اور پپیئے نہیں تو سانپ کی
چھتریاں، دالان کے ماتھے پہ جھکا ہوا وہ لکڑی کا چھجا اتنا پرانا
ہوگیا تھا کہ لکڑی گل گلا کر بالکل کالی پڑ گئی تھی، اور برسات میں تو اسکا
رنگ اور بھی کالا پڑ جاتا تھا۔ دو چار بارشیں ہوئیں اور اس کی
جڑوں اور دراڑوں اور ناؤیوں میں سفیدی پھوٹنی شروع ہوئی
پھر دیکھتے دیکھتے سفید گالا سی چھتریاں تن جاتیں، چونے سے ٹوپ بن جاتے
اور کسی کسی چھتری پہ کہیں کہیں کالی چتی، سرمئی دھاریاں۔ انہیں توڑنا
بھی اک مرحلہ تھا۔ چھجے کے اوپر اگی ہوئی سانپ کی چھتریاں تو اس کی
اور تمو کی دونوں کی دسترس میں تھیں۔ لیکن وہ بڑے بڑے ڈھیروں ٹوپ
جو چھجے کے تپتے نیچے دیوار کے برابر پھولتے تھے، ان تک اسکا تو کیا تمو
کا بھی کبھی ہاتھ نہ پہونچ سکا۔ حالانکہ ایک دفعہ تو وہ جنگلے کے
سہارے، پھر طاق پہ پیر رکھ کر اتنا اونچا پہونچ گیا تھا کہ چھجے
کی کڑی کو جا چھوا تھا۔ سانپ کی چھتری پھر بھی اس سے پرے
رہی۔ لیکن کوئی بات اس کی پہونچ سے کتنی ہی پرے کیوں نہ ہو، ایک
مرتبہ وہ اسے ضرور باندھتا تھا۔ کالے آموں والے باغ کو جاتے
ہوئے جو کالی کوئیا پڑتی تھی اور جس پہ پھیلا ہوا بڑ کا درخت اتنا
گھنا تھا کہ جب تک نہ بہت جھک کر لگاتار نہ دیکھتی، بالکل یقین
نہ آتا کہ اس میں پانی بھی ہے، اس پہ پہنچکر تمو بڑ پہ چڑھتا اور مین
کوئیا کے اوپر پھیلے ہوئے گدے پہ پہنچکر اعلان کرتا کہ "کودتا ہوں"۔ اور
اس کے پیروں تلے کی زمین نکل جاتی اور گڑگڑا کے کہتی "نئیں تمو نئیں"
تمو کے تیوروں سے لگتا کہ اس کی گڑگڑاہٹ کی اسے ذرہ برابر
پروا نہیں، اور اس نے اب چھلانگ لگائی۔ مگر پھر آپ ہی آپ وہ
ارادہ ترک کردیتا اور گدے سے پھسلتا پھسلا تکتا تنے پہ آجاتا۔ اور نیچے
اتر پڑتا۔ مگر آج اس نے چھلانگ لگا ہی دی۔ چھلانگ لگائی تھی یا گر
پڑا تھا، یا کیا ہوا تھا، اسے تو پتہ نہیں۔ اس روز وہ اکیلا ہی گیا تھا،
اس نے تو بس اک شور سا سنا۔ شبراتی سقہ بھاگا بھاگا آیا اور تمو کے
گھر کے کواڑ پیٹ ڈالے۔ تمو کے ابا گھبرائے ہوئے نکلے اور جس حال
میں تھے اسی حال میں حیران و پریشان سٹ پٹ کرتے کالی کوئیا کو ہولئے۔
ان کے پیچھے پیچھے محلے کے اور لوگ۔ جو نہیں گئے تھے وہ جابجا ٹولیاں
بنائے ششدر کھڑے تھے۔

"کون؟ تمو؟"

"گر پڑا کالی کوئیا میں۔ کیسے؟"

"اللہ جانے۔"

"ارے صاحب وہ لونڈا تو نرا وحشی ہے وحشی۔"

آپا جی کہہ رہی تھیں۔ "ابھی لونڈا تھا بھی بہت نڈر۔ یہاں آتا تھا
تو کبھی چھجے پہ لٹک رہا ہے، کبھی کوٹھے والی منڈیر پہ۔ میرا دل کانپ
کانپ جاوے تھا۔ ہزاروں دفعے ڈانٹا بھی کہ بھیا گھر جا کے ماں کو
یہ نٹ کا تماشا دکھا اور صفیہ کو بھی مارا کہ اس کے ساتھ تو کیوں باؤلی
بنے ہے۔ مگر بابا اس پہ تو جن سوار تھا، ایک نہیں سنتا تھا کسی کی۔"

اماں جی بولیں "ارے غریب کا ایک ہی بچہ ہے اللہ رحم کرے۔"

"ہاں اللہ رحم کرے۔" اور پھر آپا جی کا لہجہ بدلا۔ "اللہ لے سمجھائے مگر ہم اب صاف کہہ دینگے کہ بابا ہنڈیا سیلا رہے یا جائے ہماری بیٹی اسے نہیں جائے گی۔ ابھی ایسے لونڈے کا کیا اعتبار، کیا گل کھلاوے۔"

"ابھی یہ تو بعد کی بات ہے۔" اماں جی نے پھر ٹھنڈا سانس لیا۔ "اللہ رحم کرے غریب پہ۔ یہ سالی کونیا بڑی کمبخت ہے۔ ہر برس بھینٹ لیکے رہے۔"

شام پڑے وگ لے چارپائی پہ ڈال کے لائے۔ کپڑے پانی میں شرابور، بال چہرے پہ چپکے ہوئے، چہرہ پیلا ہلدی، جسم نڈھال، بیہوشی طاری۔ تھوڑی دیر کے لئے گلی میں سناٹا چھا گیا۔ سناٹا جس نے سال بعد اس گلی میں ایک بار پھر عود کیا تھا اور تجو ہی کے حوالے سے۔ جب تجو کا تار آیا تھا۔ تجو کے جانے کیا جی میں سمائی کہ گھر میں بے کہے سنے فوج میں بھرتی ہو محاذ پہ لڑ گیا تھا۔ سال ڈیڑھ سال اسکا کوئی اتا پتا نہ ملا اور جب اتا پتا ملا تو سناونی کے ساتھ۔

"اری بیا تجو کا تار آیا ہے۔"

"تجو کا تار؟"

"اللہ رحم کرے۔"

آپا جی نے روٹیاں پکاتے پکاتے توا الٹ دیا، چولہے کی آگ بجھا دی گئی۔

گلی میں تھوڑی دیر تک بالکل سناٹا رہا۔ آنکھوں آنکھوں میں باتیں کرتی ہوئی ششدر ٹولیاں۔ تجو کے ابا کے ہاتھ تار پڑھتے پڑھتے کانپنے لگے اور بغیر نگاہ اٹھائے اسی طرح تار لئے سر جھکائے ہلتے کانپتے اندر چلے گئے۔ . . . .

وہ جھرجھری لیکر ہوش میں آ گئی۔ کٹورے میں بھیگے ریٹھے دھوپ میں چوکی پہ رکھے رکھے بہت دیر ہوئی، پھول گئے تھے۔ جلدی جلدی چٹیا کھولی کہ چکٹ گئی تھی اور الجھے ہوئے بال بدرنگ ہو گئے تھے۔ بھیگے ریٹھوں کا کٹورا لے کر جب وہ غسل خانے میں پہنچی اور کھلے مچنے۔ بالوں میں اسے اٹا تو میلے میلے سفید جھاگوں سے بال گچھا اور بدرنگ ہو گئے۔

غسل خانے سے نہا دھو کر واپس ہوتے ہوتے وہ گھڑی بھر کے لئے ڈھلتی دھوپ میں چوکی کے پاس رکی۔ بالوں کو دو تین جھٹکے دے اندر کمرے میں گئی اور آئینے کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ دھل دھلا کر ان میں ہلکی سی شادابی اور نرمی ضرور پیدا ہو گئی تھی مگر وہ کیفیت کہاں، کہ کھلتے تو گھٹا سی گھر آتی اور جوڑا باندھتی تو سر کے پیچھے ایک سیاہ چمکتا طشت معلق نظر آتا۔ اماں جی گھنٹہ گھنٹہ بھر تک بالوں کو کریدتیں اور جوئیں اور دھکیں اور لیکھیں بینتی رہتیں، کنگھی کرتیں، سلجھاتیں، پٹیاں باندھتیں اور جھڑے ہوئے بالوں کا لچھا سا گچھا لپیٹ کر اس پہ تھو تھو کرتیں اور ککڑیا انیٹوں والی دیوار کی کسی دراڑ میں اڑس دیتیں۔ روکھے چھدرے مرے مرے سے بال، نہ جوئیں، نہ دھکیں، نہ لیکھیں نہ اماں جی کی کنگھی، نہ ان کی مشاق انگلیاں کہ ایک ایک لٹ کو ریشم کے لچھے کی طرح سلجھاتیں اور سنوارتیں۔ بالوں سے ہٹ کر اس کی نگاہ چہرے پہ گئی، جسکی دمک خوشبو بن کر اڑتی جا رہی تھی بلکہ پورے بدن میں جو آگے اک آنچ تھی مندی ہو چلی تھی۔ اسے خالہ جان کی وہ کھسر پھسر یاد آ گئی جب وہ پچھلے دنوں آئی تھیں اور آپا جی کے ساتھ سر جوڑ کر بیٹھی تھیں۔

"آپا جی کب تک اسے کوٹھے سے لگائے بیٹھی رہوگی عمر اور زیادہ ہو گئی تو لونڈیا تھک جاوے گی۔"

"بہنو مجھے کوئی شوق ہے کہ جوان لونڈیا کو گھر میں ٹنگوائے بیٹھی رہوں اور اب عمر اس کی بیٹھنے کی نہیں ہے، مگر کروں کیا؟"

"آپا جی میں تو جانوں جیسا کیسا بھی ملے دو بول پڑھوا کے ہاتھ میں ہاتھ پکڑا دو۔"

اس نے پھر اک جھرجھری لی اور ذرا سرگرمی سے بالوں میں کنگھا کرنا شروع کر دیا۔ انگلیوں سے بالوں کی لٹیں سنوارتے سنوارتے اس نے محسوس کیا کہ تیل لگنے پر بھی بال اس کے کچھ روکھے روکھے ہیں۔ روکھے بال کہ چھدرے بھی ہیں اور پھیکے بھی۔ ان کی وہ چمک اب کتنی مدھم پڑ گئی تھی۔

چٹیا باندھتے باندھتے جب اس نے چٹیلنا اٹھایا تو وہ بالوں سے بھی زیادہ روکھا اور روکھے سے زیادہ چکٹا اور میلا نظر آیا۔ چٹیلنا دہیں رکھ چٹیا ادھ بندھی چھوڑ کر کمرے سے نکلی، دالان میں آئی۔ دالان سے مڑی، کوٹھری کی طرف چلی۔ کھوئی کھوئی جا تو خواب میں چل رہی ہے، یا کسی نے جادو میں باندھا ہے۔ دہلیز پہ قدم رکھ کے کنڈی کھولی۔ کواڑوں کو ہلکا سا جھٹکا دے کر دھکا دیا۔ داخل ہوتے ہوتے وہ ذرا جھجکی؛ احساس ہوا کہ اندھیرے کی حد شروع ہے۔ اس لہریا لکیر کا خیال آیا، جو بڑے صندوق کے پاس سے بل کھاتی ہوئی دیگ کے برابر تک پہونچی تھی اس کا دل آہستہ آہستہ دھڑکنے لگا۔

(باقی صفحہ [illegible] پر)

خزاں نے لوٹ لیا

حجاب امتیاز علی

بیگم تجمل کے سالانہ جشن رقص و محفل سرود سے لوٹتے ہوئے رستے میں مجھے خزاں کی تیز رفتار آندھی نے آلیا۔ خیال آیا آج زلفی کی شادی کی پانچویں سالگرہ ہے، جب تک آندھی تھمے اسے مبارکباد ہی دے آؤں۔

اپنی ناکام عشقیہ شادی کے بعد اس نے اپنی تمام سہیلیوں سے قطع تعلق کر لیا تھا۔ البتہ اس سے کبھی کبھی سر راہے مختصر ملاقات ہو جایا کرتی تھی۔

آج کئی دنوں کے بعد اپنی سہیلی کی اقامت گاہ پر پہونچ کر میں نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ زلفی نے دروازہ کھول دیا۔ مجھے دیکھتے ہی آنکھیں پھاڑ کر بولی "تم روحی! ——— رستہ بھول کر آئی ہو؟"

اس کے طنزیہ فقرے کو سن کر میں نے ضبط کر لیا، پھر بولی: "دراصل مجھے کسی کی خلوت میں مخل ہونا ناپسند ہے۔ آج تمہیں شادی کی سالگرہ پر مبارکباد دینے چلی آئی"۔

"آندھی کے شور میں کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی، اندر آؤ نا ———" وہ مجھے اندر لیجا کر لکھنے کی میز کے پاس ایک مومی شمع کے مقابل بٹھاتے ہوئے بولی "خزاں کی رات ہے"۔

"ہاں بہار کب کی گذر چکی! مگر ہم سب کا خیال تھا کہ آج ہمارے ہاں کچھ نہ کچھ اہتمام ضرور ہوگا۔ شادی کی سالگرہ کا دن ہے"۔

"تم سب کا خیال تھا! ———" وہ ایک پھیکی ہنسی ہنس پڑی۔ پھر ذرا سے توقف کے بعد بات ٹالنے کے انداز میں پوچھنے لگی: "آ، کہاں سے رہی ہو؟"۔

"بیگم تجمل کے جشن سرود سے" میں نے اپنی نئی شال شانوں پر سے گرا دی اور اعصاب کے سکون کے لئے اوڈی کلون سونگھنے لگی۔

"آہ بیگم تجمل کے سالانہ جشن سرود سے؟" اس نے بے قابو لہجہ میں کہا، پھر دردانگیز طریق پر مسکرا کر بولی: "نجانے ان کے یہ سالانہ جشن کتنوں کی زندگی کی محفلیں برہم کریں گے! وہاں مرا تو کوئی ذکر نہیں آیا"۔

"چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں"۔

"کہ میں نے غلط شادی کی؟"

"اور اپنے پاؤں پر آپ کلہاڑی ماری"۔

"زبانِ خلق کو کون روک سکتا ہے روحی؟"

"صرف انسانی کردار زلفی!"

اس کے بعد تھوڑی دیر کے لئے خاموشی طاری ہو گئی۔ وہ ایشیائی خزاں کی رات تھی، بے حد ویران اور بہت ہی کالی۔ آندھی کا خوفناک شور ساحلوں پر واویلا کر رہا تھا۔ جو اصلیں بہ ہیچ چیخ کر رہی تھیں خشک پتے زندگی کی فنا کی یاد تازہ کر رہے تھے۔ فضا کی اس پراگندگی نے مجھ پر مالیخولیا کی سی کیفیت طاری کر دی۔ میں نے اپنے دستی بٹوے میں سے نکال کر برو مانڈ کی ایک گولی نگلی اور غمگین آواز میں پوچھا: "فیروز صاحب کیسے ہیں؟"

وہ لمحہ چپ رہی۔ پھر بولی: "ویسے ہی! ایک لمحہ ڈوبتے ابھرتے تنکے کی طرح! شراب نے ان کے دل و دماغ و جگر کو دیمک کی طرح چاٹ کر کھوکھلا کر دیا ہے۔ فن کا وہ پرستار اب زندگی کا منکر ہو رہا ہے۔ بعض وقت تو روحی! مرا پیمانۂ صبر لبریز ہو جاتا ہے۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں فیروز سے بیزار ہو گئی ہوں"۔

"اور کیا مطلب ہے؟ جب تم بیزار نہیں ہو تو تمہیں یہ کہنے کی ضرورت ہی کیا آن پڑی ہے کہ تم اس سے بیزار نہیں ہو؟" میں نے فکر مندی سے کہا، پھر بولی،

"پانچ سال پہلے کی بہاریں یاد کرو زلفی! وہ قہقہے، وہ چہچہے، وہ

بےفکریاں، وہ محفلیں اور وہ لذتیں ——" میں عہد ماضی کی سیر کرتے کرتے افسردہ سی ہوگئی۔

اس نے تڑپ کر آنکھیں بند کرلیں گویا کہہ رہی تھی کہ

"خزاں کو دیکھ رہے ہیں بہار دیکھ چکے"

لیکن اس نے زبان سے کچھ نہ کہا۔ بڑی دیر بعد اپنے آپ کو سنبھال کر اگر کہا تو اتنا کہا: "خزاں میں بہاروں کا ذکر نہ کرو روحی! میں انہیں بھول جانا چاہتی ہوں"۔

میں یاس انگیز لہجے میں بولی "انہیں بھولنا اور بھلانا تو تمہارے اختیار میں ہے نہ میرے قابو میں، کسی ٹھوس حقیقت سے گریز کا فائدہ بھی کیا زلفی؟ یہ واقعہ ہے کہ آج سے پانچ سال پہلے کی خزاؤں نے تمہاری بہاریں لوٹ لیں۔ یاد ہے، وہ بالکل ایک ایسی ہی خزاں کی پرشور رات تھی؟"۔

وہ کانپ کر بولی "اور بیگم نجم کے ہاں محفل سرود منعقد تھی! اسی محفل نے میری زندگی کی محفل ہمیشہ کے لئے درہم برہم کر دی۔ وہاں میں نے آبِ حیات کے دھوکے میں زہر ہلاہل پی لیا، مگر توبہ! میں بھی کیسی باتیں کر رہی ہوں!! تم سب کے نقطۂ نظر سے میں نے کیسی ہی عظیم غلطی کی ہو مجھے اس کا مطلقاً افسوس نہیں روحی! کیونکہ مجھے فیروز سے محبت ہے!"

میں نے ایک ترحم آمیز نگاہ اس پر ڈالی "تم بار بار اپنی محبت کا اقرار کرکے اپنی مخالفت آپ کر رہی ہو۔ میں نے تو کوئی شبہ ظاہر نہیں کیا تھا"۔

وہ بگڑ کر بولی "کون کہہ سکتا ہے کہ مجھے فیروز سے محبت نہیں؟ مانا کہ وہ شرابی ہے، مگر مجھے آج بھی اس سے اتنی ہی محبت ہے جتنی پہلے دن تھی" یہ کہتے کہتے اس نے غصے کی بے دھیانی میں شعلے کے طور پر سامنے رکھا ہوا کاغذ کاٹنے کا چاقو، جس کی شکل بالکل تلوار جیسی تھی، ہاتھ میں اٹھا لیا اور گھمانا شروع کر دیا۔

میری نظر اس تلوار سے ٹکرائی "ہوں! میں انسان کو اس کی زبان سے نہیں، اس کی بے اختیارانہ حرکات اور اس کے کردار سے پہچاننے کی عادی ہوں زلفی! تم ہوا سے کیوں لڑتی ہو؟ آدمی سے لڑنا سیکھو"۔

رات گہری ہوتی گئی، اور سمندر کے تلاطم کا شور کسی وحشی درندے کی آواز کی طرح سنائی دینے لگا۔

میرا ذہن آج سے پانچ سال قبل کے ماضی کی ایک رات کی تصویر کشی میں محو ہوگیا۔ خزاں کی پرشور رات تھی۔ مگر بیگم نجم کے وسیع ایوانوں میں سالانہ جشن رقص و سرود منعقد تھا۔ موسیقی کی درد انگیز تانیں کلاسکی رقص کے تھمے ہوئے وقفوں میں جذبات میں ایک ارتعاش سا پیدا کرکے قلب کی عجیب کیفیت کر دیتی تھیں۔ خوش باش اور زندہ دل جوان جوڑے ایوان کے بیچوں بیچ، ہاتھ میں آبِ خوش رنگ کے چھلکتے ہوئے جام تھامے کھڑے تھے اور اپنے رفیقوں اور محبوبوں سے سرگوشیوں میں مصروف تھے۔ کچھ اہلِ جنوں ایسے بھی تھے جو ان سے الگ تھلگ، کناروں پر دریچوں کے سہارے بیٹھے یا کھڑے ہوئے موسیقی کی دلدوزی پر بے قابو ہوکر سر دُھن رہے تھے۔ اور چشم نیم باز سے انسانوں کے اس جیتے جاگتے سمندر کی بیتاب امواج کا تماشہ دیکھ رہے تھے۔ انہی کی صف میں ایک میں بھی تھی، جو ایک پرانی درد انگیز غزل کو سن کر متاثر ہوگئی تھی اور ایک قدِ آدم فانوس کے پاس تصویر بنی کھڑی تھی کہ دو نوجوان خواتین کے مکالمے نے مجھے اپنی طرف متوجہ کرلیا۔

"یہ پیازی رنگ کی پوشاک میں کون لڑکی ہے۔ جس سے وہ اس انہماک سے باتیں کر رہا ہے؟ وہ تو سنبل کے عشق میں دیوانہ ہو رہا تھا ابھی اگست کے مہینے کی بات ہے"۔

"یہ ستمبر ہے" دوسری نے جواب دیا "اگست کے مہینے کے رومان کو ستمبر تک زندہ رکھنا دقیانوسی پن ہے"۔

دوسری طرف ایک معمر خاتون اپنی دستی دوربین میں سے پیازی پوشاک والی لڑکی کو بغور دیکھ کر فرمانے لگیں "خدا کی پناہ، آجکل کی عورتیں یہ نہیں دیکھتیں کہ انسان کا باطن کس قسم کا ہے۔ جہاں کسی خوب صورت مرد نے اپنے کوٹ کے کاج میں کارنیشن کی مہکتی ہوئی کلی اٹکالی اور مسکرا کر ان کو کرسی پیش کی، یا ان کے لئے آئس کریم کی طشتری کہیں سے اٹھا لایا۔ وہ سمجھیں کہ ہم پر جان دینے لگا ہے۔ اپنے زمانے میں ہم کتنی محتاط ہوتی تھیں۔ کیوں عائشہ؟"

"بے حد محتاط" ان کی بوڑھی سہیلی نے جواب دیا "مگر پھر بھی ترچھی نظروں کی گھائل فوراً ہو جاتی تھیں۔ یاد ہے نواب فرخ کی برقِ تبسم نے تمہارے خرمنِ آرزو پر کس زور کی بجلی ——"

"وہ اور بات تھی —— بالکل اور —— ہم میں اور آجکل کے چھچھورپن میں بڑا فرق ہے۔ عائشہ! ہم محتاط ہوتے ہوئے گھائل

ہوجاتی تھیں۔ مگر آجکل کی عورتیں بے احتیاط ہوکر گھائل ہوتی ہیں ـــ" یہ فرق بتاکر انہوں نے فخر سے اپنے سنہرے دامن سمیٹے، اور مطمئن ہوکر بیٹھ گئیں۔

میں نے سر اٹھا کر دیکھا کہ کس کے متعلق چہ میگوئیاں ہو رہی ہیں۔ سامنے زلفی تھی شگفتہ پیازی رنگ کے ریشم میں ملبوس۔ سیاہ زلفیں شانوں پر بکھیرے بڑے انہماک سے سر جوڑ کر ایک سجیلے ذان جان سے مصروف کلام تھی۔ دونوں بے حد جاذب نظر معلوم ہو رہے تھے جیسے ہنس کا حسین جوڑا پانی کی لہروں پر تیر رہا ہو! ان کی گفتگو کی طوالت اور ان کی یکجائی نوجوانوں کو پریشان اور متنفر اور بوڑھوں کو طنز و استہزا پر مجبور کر رہی تھی۔

چند منٹوں کے بعد بیگم نجم میرے قریب سے گذریں "یہ کون شخص ہے نجمہ؟" میں نے پوچھا۔

"ارے مشہور مصور فیروز کو نہیں جانتیں؟ خود تصویر حسن معلوم ہوتا ہے نا!؟" بیگم نجم نے جواب دیا۔

"ہاں بالکل" میں نے کہا "زلفی کے ان سے پرانے تعلقات ہیں؟"

وہ ہنس کر بولیں "پرانے ہوتے تو ان میں ایسی شیرینی کہاں سے آتی؟"

"ہاں ایسی لگاوٹ ہمیشہ نئے تعارف کی علامت ہوتی ہے مزید برآں میں نے ابھی ابھی اس سلسلے میں اس باکمال مصور کی تعریف سنی تھی کہ دوستی کے متعلق ان کے خیالات نہایت وسیع ہیں۔ اور نئی دوستی کو ہمیشہ پرانی پر ترجیح دیتے ہیں" میں نے کہا۔

بیگم نجم مسکرائیں "یہ خوش مذاقی کی علامت ہے ـــ ایسے ہی لوگ تو رونق محفل ہوتے ہیں اور ہر ہنگامے میں مدعو کئے جاتے ہیں"

"بے شک۔ رونق کے لئے کیا کچھ نہیں کرنا پڑتا" میں نے جواب دیا۔ ستمبر اور اکتوبر کے مہینے ان دو وارفتگان محبت نے دریائے عشق کی غواصی میں بسر کر دئے۔ اور خزاں میں بہاروں کا مزہ لوٹا۔ اور حسب توقع کے مطابق دقیانوسی دماغ کے مخلص دوستوں نے خلل اندازی شروع کر دی۔ اور اپنے وعظ میں زلفی کو محبت کی اس ڈھلوان جہاں کی قلابازی سے بہت روکا۔ دشت محبت کے خاروں سے ڈرایا۔ اس پرخطر رستے کے نشیب و فراز سے آگاہ کیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ زلفی نے ان مخلص بے وقوفوں سے ہمیشہ کے لئے قطع تعلق کر لیا۔ اور اسی زمانے کی بیاہتا میں دونوں نے شادی سے فراغت بھی پالی۔ شادی کے چند ہی مہینوں بعد مصور کی جدت ابھر آئی۔ چنانچہ اس نے پرانی تصویر سے بیزاری اور نئی سے دلچسپی کا اظہار شروع کر دیا۔ پرانی تصویر تنہائی کی ٹوکری کے حوالے کر دی۔ زلفی کی بہاروں پر خزاں نے تسلط جما لیا۔

کچھ دیر بعد میں چونک پڑی۔ ماضی کی وادیوں میں بھٹکتے بھٹکتے افسردہ ہوکر میں نے کہا "نجانے تم پر کیا افتاد پڑی تھی کہ خطرے کی گھنٹیاں بجتی رہیں اور تم پناہ لینے کی بجائے سینہ تان کر کھڑی ہوگئیں۔ اس رات فیروز کا حسن اور بانکپن قیامت خیز ضرور تھا۔ مگر اس کے ہاتھ میں شراب ارغوانی کا جام بھی تو چھلک رہا تھا! جس میں نجانے کتنی زندگیاں غرق ہو چکی تھیں! اس وقت وہ مخمور تھا، قدم مرتعش تھے اور ہاتھ لرزاں۔ پھر بھی تم اس کے دام محبت میں گرفتار ہوگئیں؟"

اس کا غصہ رفع ہو گیا تھا۔ اب وہ ایک شکستہ پر پرندے کی طرح نظر آ رہی تھی، بے بسی کے انداز میں بولی "پھر کیا کرتی رو تی؟ سنا نہیں آتش عشق کے متعلق کیا کہا گیا ہے کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے؟ حسن آمادۂ پیکار ہو تو عشق ہتھیار پھینک دیتا ہے"۔

ایک لمحے کے لئے میں متاثر ہوگئی، پھر اپنے آپ کو سنبھال کر کہا "کیا بکتی ہو زلفی؟ اس قسم کا جذباتی اندھاپن مردوں کی ذہنیت ہوتی ہے۔ جذبات کے سیلاب میں ایک حقیر تنکے کی طرح بہہ جانا، مگر عورتیں ان معاملات میں دل سے نہیں ہمیشہ دماغ سے سوچنے کی عادی ہوتی ہیں" میں برافروختہ ہو کر بولی۔

"میں اب محسوس کرتی ہوں کہ عقل اور جذبے کے کیا مدارج ہوتے ہیں ـــ"

"اب محسوس کر رہی ہو! نادان روح! آج سے پانچ سال پہلے تمہارے خیرخواہوں اور دوستوں نے تمہیں کتنا روکا! کتنی اونچ نیچ دکھائی۔ مگر تم ایک ہی وار میں کسی زخمی پرند کی طرح پھڑپھڑاتی ہوئی زمین پر گر چکی تھیں۔ مجبور اور بے بس! میں سوچتی ہوں۔ اس میں بھلا تمہارا بھی کیا قصور؟ تم فطرتاً اذیت میں لذت جو محسوس کرنے کی عادی ہو۔ بعض وقت تم مجھے اسی مدرسۂ فکر کی طالب علم معلوم ہوتی ہو جس سے بعض پرانے یونانی فلسفی وابستہ تھے۔ جن کا نظریہ قنوطیت تھا۔ مگر میرا خیال ہے ان پانچ سالوں میں تم اذیت کا خوب

خوب لطف اٹھا چکی ہوگی۔ آخر اب اور کیا چاہتی ہو؟"

"بس اب یہی چاہتی ہوں کہ فیروز کی بجائے مجھے موت آجائے۔"

"کیا تمہیں اپنے الفاظ پر یقین ہے؟ مری پیاری! ممکن ہے تم بالکل اس کے برعکس چاہتی ہو، کیونکہ ہم جو کچھ چاہتے ہیں صاف دلی سے اس کا اظہار شاذ ہی کرتے ہیں۔ البتہ جو نہیں چاہتے اسے طشت از بام کرتے رہتے ہیں۔ حالانکہ اپنے اس فعل سے ہم باخبر نہیں ہوتے۔"

میرا جملہ ختم ہی ہوا تھا کہ سمندر کی گرج اور بجلی کی کڑک نے دفعتاً فضا میں ایک دھماکا سا پیدا کر دیا، جسے میں نے تو نہیں مگر زلفی نے فوراً محسوس کر لیا اور لرز کر بولی "سنتی ہو روحی! سمندر کا تلاطم اور طوفان کا زور؟"

میں نے اسے بغور دیکھ کر کہا "ہاں سنتی اور محسوس کرتی ہوں زلفی، مگر کس طوفان کا؟"

"کس طوفان کا!! کیا مطلب؟" وہ اداس ہو کر بولی "خزاں کی پریشان رات ہے روحی! یوں فلسفیوں کی سی پیچیدہ گفتگو مت کرو، دم الجھتا ہے۔ میں نے برا کیا یا اچھا کیا۔ غلطی کی یا نہیں کی۔ جو کچھ بھی کیا اب تو صبر کی سل سینے پر دھر لی ہے۔"

"میں صبر کی سلوں کی اسلئے مخالف ہوں کہ ان سے انسان کی قوت مقابلہ کمزور ثابت ہوتی ہے۔ صبر آسان اور مقابلہ مشکل ہوتا ہے۔ جو شخص ڈٹ کر کسی مصیبت یا ظلم کا مقابلہ کرتا ہے اسے کسی سل پتھر کی ضرورت نہیں ہوتی۔ مگر تم نے اب تک اپنا عقیدہ اور ایمان پرانے مذاہب کی تلقین پر استوار کر رکھا ہے کہ ایذا برداشت کرنا ہی انسانیت کا جوہر اور اس کی معراج ہے۔ صبر و شکر سے ہر وار پر گردن خم کر دینا ہی گویا زندگی کا مقصد ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ آخر کیوں، انسان اس چار دن کی زندگی میں تختۂ مشق بنا رہے؟"

"ٹھیک کہتی ہو۔ اس بات کا مجھے بھی احساس ہے کہ آج سے پانچ سال پہلے بیگم نجم کی محفل سرود میں جس شخص نے مجھے ایک لہلہاتے ہوئے مرغزار سے نکال کر ایک لق و دق صحرا میں بے سہارا چھوڑ دیا وہ ہرگز قابل معافی نہیں۔ بلکہ سزا کا مستحق ہے، بہت بڑی اور سنگین سزا کا۔"

طوفان کا زور اور آندھی کا شور بڑھتا ہی گیا اور وہ شدتِ جذبات سے ہانپنے لگی۔

"بہت بڑی اور سنگین سزا کا!؟ یعنی تمہارے نہاں خانۂ دل کے کسی خفیہ گوشے میں اس کے خلاف غم و غصے کی آگ بھڑک رہی ہے! بھلا بتاؤ میں نے غلط کیا کہا تھا ——— اسی لئے تو مجھے تمہاری بات کا یقین کرنے میں تامل تھا، جب تم اس کی بجائے اپنی موت کی دعائیں مانگ رہی تھیں، اسی لئے تو میں نے تم کو ٹوکا تھا۔ اب تم فیروز کو سنگین سزا کا مستحق سمجھ رہی ہو۔ اس قسم کا اجتماع ضدین تمہاری جذباتی نابالغی کا ثبوت ہے۔ فیروز پر تمہارا غصہ غیر فطری نہیں ہے۔ یوں آگ کو پردوں میں چھپا ڈگی تو وہ ایک دن بھڑک کر تمہاری ہستی اور تمہاری کائنات ہی کو خاکستر کر دے گی۔"

وہ بے چین ہو کر بولی "نہیں، نہیں، میں اب بھی دعوے سے کہہ سکتی ہوں کہ:

"وہی سوز دل کی ہیں گرمیاں، وہی درد دل کی ہیں شدتیں"

پانچ سال پہلے محبت کا جو چشمہ پھوٹ پڑا تھا، وہ اب تک ابل رہا ہے۔"

میں بیزار ہو کر بولی "تم ہمیشہ سطح پر تیرتی رہیں۔ تہہ میں جھانک کر دیکھنے کی زحمت کبھی قبول نہیں کی۔ اسی لئے اپنے جوش محبت پر نازاں ہو۔ مگر زلفی! بدقسمتی سے مجھے سطحی اور غیر سطحی چیزوں کے پرکھنے کا جنون ہے۔ میرے اسی جنوں نے مجھے سرگوشی میں کہا ہے کہ محبت کے اس حسین اور بظاہر پرسکون سمندر کی تہ میں خونخوار مچھلیاں بھی موجود ہو سکتی ہیں۔ یہ شاعرانہ باتیں نہیں، خالص حقیقتیں ہیں۔ خیر ان باتوں کو اٹھا رکھو۔ یہ بتاؤ معالج کیا کہتا ہے؟"

"مجھے اس سے نفرت ہے۔"

"معالج سے! اس کی کیا وجہ ہے؟" میں حیران ہو کر پوچھنے لگی۔

زلفی میرے اس سوال پر چونک سی پڑی۔ اور دریچے کے باہر اندھیرے میں بجلی زور سے کانپی۔

"وجہ کیا ہوتی! بس ہے نفرت۔" وہ بے تعلقی سے کہنے لگی۔

"نفرت ہے تو معالج بدل کیوں نہیں دیتیں؟"

لمحہ بھر بعد وہ بولی "معالج کا بدلنا کچھ آسان تھوڑا ہی ہے؟ کئی مجبوریاں ہوتی ہیں۔"

"بہت ماہر معالج ہے؟"

"خاک"

"مفت علاج کرتا ہے؟"

"نہیں"

"تو پھر تامل کس بات کا؟"

"ہاں سوچتی ہوں اسے بدل ہی دوں"

اس کے تذبذب کو میں حیران ہو کر دیکھنے لگی۔ دو لمحے وہ کچھ بے چین سی نظر آئی پھر سرگوشی میں کہنے لگی "تمہیں معلوم ہے اس نے ایک دن مجھ سے کیا کہا تھا؟"

"کیا؟" میں نے بھی سرگوشی میں پوچھا "کہتا تھا۔ بیگم فیروز! آپ کا اور آپ کے میاں کا کیا جوڑ! آپ حور، وہ ہر وقت نشے میں چور۔"

"تو تم نے کیا کہا؟"

"کہتی کیا؟ جواب میں ایک تھپڑ رسید کر دیا۔" وہ نہایت فاتحانہ انداز میں میری طرف دیکھ کر بولی۔

"ارے تھپڑ!" بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔ شاید اس کا خیال تھا کہ میں اس کی موقع شناسی اور شوہر پرستی کی تعریف کے پل باندھ دوں گی۔ مگر مجھ پر اس کی اس بے ساختہ حرکت کا بالکل الٹا اثر پڑا۔ جھنجھلا کر میں نے کہا "جب تمہارا باطن صاف تھا تو تمہیں اپنی اتنی توانائی استعمال کرنے کی کیا ضرورت پڑ گئی تھی؟ کس جذبے کے خلاف تمہیں اتنی سخت جدوجہد کرنی پڑی؟"

اور اسی وقت دریچے کے باہر تاڑ کے منحوس درخت پر ایک چمگادڑ نے بڑے زور سے اپنے دونوں بازو پھڑپھڑائے "اف! یہ کیا چیز تھی؟"

"میرا ضمیر ــــ اسی نے تھپڑ لگوایا"

"اب تک ضمیر ضمیر!" میں نے حقارت سے کہا۔

"زمانۂ جاہلیت کا آدمی ضمیر کی آواز پر نازاں ہو کر بلا سوچے سمجھے سرِ تسلیم خم کر دیا کرتا تھا۔ مگر آج کے انسان کو اپنے آپ اور اپنے ضمیر پر حکمرانی کی تمنا ہے۔ کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ اس کا قابو میں آ جانا انسانی انفرادیت کی توہین ہے ــ اسی لئے تو تمہارے ضمیر نے تم سے مشورہ لئے بغیر تھپڑ لگوا دیا۔"

"تو اور کرتی بھی کیا؟ تمہاری رائے میں نہیں لگانا چاہئے تھا تھپڑ؟ ــ

"تم نے کبھی سوچا، مجرم اُس وقت اپنے ریوالور یا اپنے کسی ہتھیار کو استعمال کرتا ہے، جب اسے پکڑے جانے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ تم کو تو پکڑے جانے کا ڈر نہیں تھا۔ تمہارا باطن صاف تھا۔ پھر کس سلسلے میں تم نے اسے تھپڑ لگایا؟ خیر تو اس تھپڑ کے بعد؟"

وہ اس اہم گفتگو کے درمیان یک لخت اٹھ کھڑی ہوئی۔

"میں تمہارے لئے قہوہ تو تیار کر دوں"

"نہیں زلفی! قہوہ نہیں چاہئے۔ سوچنے کے لئے مواد چاہئے۔ تو پھر اس تھپڑ کے بعد؟"

"اس کی زیادتی تو تم دیکھو ذرا سی! تھپڑ کے جواب میں اس نے مجھے ایک روز تھیٹر پر مدعو کیا"

"اس کے بعد ہی منزل آتی ہے زلفی! انکشاف کی، آدمی معلوم ہوتا ہے، اور گہرائیوں میں جھانکنا چاہتا ہے ــــ پھر؟"

"مجھے اس سے اور بھی نفرت ہو گئی"

"اور بھی نفرت! کتنی؟ ــــ" میں بے چین ہو کر پوچھنے لگی۔

وہ قدرے حیران ہو کر بولی "دماغ ٹھکانے ہے؟ میرے پاس نفرت یا محبت ناپنے کا کوئی پیمانہ رکھا ہے؟"

"ان کے لئے دو مختلف پیمانوں کی ضرورت نہیں ہوتی زلفی! یہ دونوں چیزیں ہمیشہ ایک ہی پیمانے سے ناپی جاتی ہیں۔ مگر تم سچ کہتی ہو۔ اس قسم کی جنس کو تولنے کا نہ کوئی پیمانہ ہوتا ہے نہ ترازو۔ تاہم ایک کامل انسان کے لئے نفرت و محبت کے بیوپار میں توازن قائم رکھنا کچھ ایسا جوئے شیر لانا بھی نہیں ــــ" یہ کہتے کہتے میں کچھ فکرمند سی ہو گئی۔

کمرے پر سکوت طاری ہو گیا۔ میں مومی فانوس کے آگے چپ چاپ بیٹھی قیاس آرائیاں کرتی رہی۔ اور شعلہ بھڑکتا رہا۔ زلفی نہایت جوش و خروش کے ساتھ اپنی نفرت کا اظہار کرتی رہی "جی چاہتا ہے گلا گھونٹ ڈالوں اس بدمعاش ڈاکٹر کا۔ مسکراتا ہے اور سمجھتا ہے میں اس کے برقِ تبسم کی تاب نہ لا سکوں گی"

"بہت زیادہ بدشکل ہے؟" میں نے آہستہ سے پوچھا۔ اور اعصاب کو تسکین پہنچانے کے لئے اوڈی کلون سونگھنے لگی۔

وہ دو لمحے چپ رہی پھر بولی: "مجھے کیا معلوم! میں نے کبھی اسے اتنی توجہ سے دیکھا ہی نہیں۔ گذشتہ دنوں ایک نرس رکھ لی تھی۔ وہ کہتی تھی ہسپتال میں اپنی شکل و صورت کی وجہ سے بہت مقبول ہو رہا ہے۔ ہوں۔ میری بلا سے!"

وہ دیر تک بڑے شد و مد سے غم و غصے کا اظہار کرتی رہی اور میں خاموشی سے سنتی رہی۔ خزاں کی آندھی کا شور بڑھتا ہی جاتا تھا۔ یہاں تک کہ اس نے کہا: "فیروز شرابی اور کمینہ ضرور ہے۔ مگر میں چاہتی ہوں کہ وہ زندہ رہے۔"

دُور سمندر کا تلاطم اس کے فقروں پر قہقہے لگا رہا تھا۔

میں افسردہ لہجے میں بولی: "تم بار بار فیروز کے متعلق یہ کیوں کہتی رہتی ہو کہ اسے زندہ رہنا چاہیئے؟ کیا مجھے تمہاری اس آرزو کا تمہارے کہے بغیر یقین نہیں آسکتا؟ یا تم خود اپنے آپکو یقین دلانا چاہتی ہو کہ تم اس کی زندگی کی خواہاں ہو؟"

لمحہ بھر کے لئے آندھی تھمی۔ پھر پہلے سے بھی زیادہ زور و شور کے ساتھ چل پڑی۔

زلفی نے تیز نظروں سے مری طرف دیکھا: "تم بعض وقت خارج از عقل باتیں کرنے لگ جاتی ہو روحی! بھلا تمہارے اس سوال کا کوئی جواب بھی ہو سکتا ہے؟"

میں مسکرائی: "ایسے سوال ہمیشہ تشنۂ جواب ہی رہ جاتے ہیں زلفی! مجھے معاف کرو، محبت و نفرت کی یہ پیچیدہ داستانیں لامحدود ہوتی ہیں۔ مجھے خزاں کی ویرانیوں نے مضمحل کر دیا ہے۔ کہو تو تھوڑی دیر آرام ہی کر لوں؟" یہ کہتے کہتے میں ایک کوچ پر نیم دراز سی ہو گئی۔

اس نے کہا: "مگر خزاں میں مری نیند جیسے پر لگا کر اڑ جاتی ہے۔ مجھ سے تو لمحہ بھر کو سویا نہیں جاتا۔"

"تو پھر ساری رات بیٹھی رہتی ہو؟" میں نے ایک جماہی لیکر غنودگی کی آواز میں پوچھا۔

"نہیں تو، پریشانی کے باعث جو کام دن بھر میں انجام نہیں دے سکتی، انہیں رات کے سناٹے میں ختم کر لیتی ہوں۔ تم جانو گھر کی بیسیوں مصروفیتیں ہوتی ہیں۔ جو میں نے رات کے لئے مخصوص کر رکھی ہیں۔ کبھی کتاب پڑھتی ہوں، کبھی سلائی لے کر بیٹھ جاتی ہوں، گذشتہ ہفتے نمائش سے میں نے فیروز کے شب خوابی کے لباس کے لئے ایک بڑا خوب صورت دھاری دار ریشم خریدا تھا۔ آج تک اسے بھی نہ سی سکی۔"

کچھ دیر بعد مری آنکھیں بے اختیار بند ہونے لگیں، آندھی ابھی تک چیخیں مار رہی تھی اور سمندر دھاڑیں مار کر رو رہا تھا۔

میں نے نیم وا آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا اس نے مجھے سوتا سمجھ کر مجھ پر شال ڈال دی اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ پھر دریچے کے پاس چپ چاپ سناٹے کے عالم میں یوں کھڑی رہی جیسے اس کی سوجھ بوجھ کی تمام قوتیں مفلوج ہو چکی ہوں۔ اور نہ جانتی ہو کہ اسے کیا کرنا چاہیئے۔

نجانے کیا بات تھی یکلخت اس نے مڑ کر میز کی طرف دیکھا اور تیزی سے وہاں پہونچی، جھک کر قینچی اٹھالی، بالشت بھر لمبی اور نوکدار قینچی! اتنی تیز اتنی خوفناک کہ کپڑا تو کیا انسانی شہ رگ کو بھی آنِ واحد میں بڑی آسانی سے کاٹ سکتی تھی۔ پھر اس نے قینچی کی زبانیں کچھ اس طرح کھولنی اور بند کرنی شروع کیں جیسے وہ اس بات کا اندازہ لگانا چاہتی تھی کہ وہ تلوار کی دھار کی طرح تیز ہیں یا نہیں!

لمحہ بھر وہ خیالات میں گم ساکت کھڑی رہی۔ پھر تیز گامی سے مریض کے کمرے کی طرف بڑھی اور درمیانی دروازہ زور سے کھول دیا۔ سامنے شرابی مریض بدمست پڑا تھا وہ آہستہ آہستہ اس کی چارپائی کی طرف بڑھی۔ بڑی احتیاط سے قدم جما جما کر —— تاکہ اس کی آنکھ نہ کھل جائے!

باہر خزاں کی رات میں کسی ہوا مل نے ایک ہولناک چیخ ماری —— دُور ندی کے کنارے ایک کتا اپنی منحوس آواز میں زور زور سے رونے لگا —— کمرے میں گھڑیال کی ٹک ٹک واضح طور پر سنائی دینے لگی۔ اور آندھی کا شور بڑھتا گیا۔ وہ ہاتھ میں تیز اور نوکدار قینچی لئے مریض کے سرہانے پہونچ گئی۔

اس کے ہاتھ میں نوکدار قینچی تھی، ہر طرف سناٹا تھا، وہ تیز تیز سانس لے رہی تھی۔ یکلخت وہ مریض پر جھک گئی۔ اس کے کرتے کا گریبان کھول دیا اور بغور دیکھنے لگی —— پھر چارپائی سے لگ کر نیچے فرش پر بیٹھ گئی۔ ایک گٹھڑی کھول کر اس میں سے

(باقی صفحہ ۱۲۳ پر)

ماہ نو، کراچی، استقلال نمبر ۱۹۵۵ء

پیراں نمی پرند...

محمود تیمور (مصری)
مترجمہ اسماء طیب حسین

عم متولی، مونگ پھلی اور خربوزے کے بیج اور مٹھائیاں بیچا کرتا تھا۔ جلیہ کے باشندے اور اس کے قرب و جوار میں رہنے والے اس کو خوب جان گئے تھے۔ وہ ہمیشہ سفید بڑا سا صافہ باندھے رہتا اور سفید جلبیہ میں ملبوس ہوتا۔ اس کے طور طریقے بہت ہی باوزن تھے۔ وہ بچوں کو خاص سوڈانی لہجہ میں پکار پکار کے ان کے ہاتھ سودا بیچتا۔ اس کی آواز میں غربت اور بیماری کی وجہ سے رقت آگئی تھی۔ لیکن اب بھی ایک حکمانہ انداز تھا۔

یہ شخص سوڈان میں پلا بڑھا تھا۔ اور مہدی کی فوج میں فوجی دستہ کے کمانڈر کی حیثیت سے لڑ بھی چکا تھا۔ وہ تمام عمر تنہا ہی رہا۔ نہ اس کی بیوی تھی نہ بچے۔ عبداللہ بے کی گلی میں ایک چھوٹی تنگ و تاریک کوٹھڑی میں وہ محض ایک صندوق ایک پھٹے ہوئے کمبل اور پرانے بوسیدہ تکیے اور ایک پھٹی پرانی چٹائی کے سہارے زندگی بسر کرتا تھا۔ لیکن انتہائی غربت کے باوجود وہ خود اور اس کی چیزیں ہمیشہ صاف ستھری ہوتیں۔

وہ اپنے کمرہ میں تھکا ماندہ واپس آتا۔ اور مغرب کی نماز سے فارغ ہونے کے بعد اپنا بوسیدہ تیل کا لیمپ جلا لیتا۔ اپنے صندوق کے پاس بیٹھ کر اس میں سے ایک پرانی تلوار نکالتا۔ جسے اپنے گھٹنوں پہ رکھ کے وہ ایک گہری اور لمبی سوچ میں غرق ہو جاتا۔ اور پرانی یادوں کو دل ہی دل میں دہراتا، اور جب مہدی کی یاد اس کے دل میں جاگ اٹھتی تو وہ خدا سے دعا مانگتا کہ جلدی رجعت کا وقت قریب آجائے۔ تاکہ مہدی جلدی سے دوبارہ ظاہر ہوں۔ جو مذہب کے علمبردار ہیں۔ اور آکر دنیا کی خرابیوں کو دور کر دیں گے۔ اس کے بعد وہ اپنی غمناک آنکھوں کو نیچے جھکا کے اپنی ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرتا اور اس پرانی تلوار کو نہایت جوش اور عقیدت سے چوم لیتا۔ پھر وہ عشا کی نماز اور رات کے کھانے کے لئے اٹھتا۔ اور اس سے فارغ ہو کے سو جاتا۔ اور بہت جلد گہری لمبی اور پر سکون نیند میں کھو جاتا جس میں وہ اپنے قابل فخر ماضی اور اس آنے والے زمانہ کے خواب دیکھتا جو مہدی کی رجعت سے خوش آئند ہو جائے گا۔ صبح سویرے اٹھ کے وہ فجر کی نماز ادا کرتا۔ اور سیدی گلشن کی لکھی ہوئی نعتیں پڑھتا۔ یہاں تک کہ صبح کے سورج کی شعاعیں اس کی تنگ کھڑکی پر پڑتیں۔ تب وہ اٹھ بیٹھتا اور پشت پر اپنی ٹوکری لاد کر حسب معمول اپنی بندھی ہوئی پھیری پر چل دیتا۔ پندرہ سال ہوئے جب وہ قاہرہ آیا تھا اور جب سے اس کا یہی معمول تھا۔ اس زندگی کے معمولات میں رتی برابر بھی تبدیلی نہ ہوتی تھی۔ حالانکہ اس عرصہ میں پرانی عمارتیں ٹوٹیں اور ان کی جگہ نئے نئے مکان تعمیر ہوئے سینکڑوں لوگ مرے اور لاکھوں بچے دنیا میں آئے لیکن عم متولی کو قاہرہ اور اس کے گرد و نواح سے ذرا بھی واقفیت نہ پیدا ہوئی۔ سوائے اپنی مقررہ پھیری کے اس نے کسی چیز پہ دھیان نہ دیا جس کے دوران میں اس کی آرام لینے اور سستانے کی جگہیں معین تھیں۔ ان میں سے دو خاص طور پہ اسے پسند تھیں پہلی تو ایک چھوٹی سی مسجد جس کے دروازے پر بیٹھ کے وہ دن کا کھانا کھاتا۔ کھانا ختم کر کے خدا کا شکر ادا کرتا مسجد کے اندر جا کے ظہر کی نماز پڑھتا اور کچھ دیر میں دوپہر کی نیند لیتا۔ اس کا دوسرا مرغوب ٹھکانہ صوفیہ میں نورالدین کا عالی شان مکان تھا۔ جہاں ہر روز عصر کی نماز کے بعد وہ پہنچ جاتا۔ یہاں محل کے دروازے پہ آس پاس کے گھروں کے بواب (دربان) اور نورالدین بے کے نوکر چاکر جمع ہو جاتے۔ اور اسلام کی پرانی شان و شوکت اور اس کے موجودہ زوال اور انحطاط

باتیں کرتے اس ذکر پر عم متولی کی آنکھیں چمکنے لگتیں۔ وہ جوش میں آ کے کھڑا ہو جاتا اور ان کو مہدی کی رجعت کے متعلق روایات سناتا۔ اس وقت اس کا لہجہ بہت ہی سنجیدہ اور بارعب ہوتا اور اس کی زبان میں وہ قوت اور بلاغت پیدا ہو جاتی کہ لوگوں کے دلوں کو تسخیر کر لیتی۔ وہ سب نہایت مودب بیٹھ کے بڑے شوق سے اس کی بزرگانہ باتیں سنتے۔ اور جب وہ مہدی کے ظہور، دنیاوی خرابیوں کی بیخ کنی اور اسلام کی قدیم شان کے دوبارہ پلٹ آنے کی باتیں کرتا۔ تو نورالدین بے بھی اپنی قیمتی چھڑی کا سہارا لئے باہر آ جاتا۔ وہ عم متولی کے پاس آ کے اسے ادب سے سلام کرتے۔ اس کو کچھ انعام دیتے اور بڑے باوقار انداز میں کھنکارتے ہوئے وہاں سے چلے جاتے۔ ابراہیم یا نورالدین بے کا لڑکا ایک خوش باش اور ہنس مکھ سولہ سالہ نوجوان بھی اکثر عم متولی کے پاس آ جاتا اور پوچھتا "کیا تم پھر وہی مہدی کی فوج اور لڑائی کے قصے سنا رہے ہو؟"

"ہاں میں سنا رہا ہوں اور نہایت فخر سے سنا رہا ہوں۔ اس زمانہ میں ہزار سپاہیوں کی کمان میرے سپرد تھی۔" ابراہیم ہنسی کے مارے لوٹ جاتا پھر مسخرے پن سے سینہ تان کر اپنی جاکٹ کے بٹن بند کرتا۔ ٹوپی اتار کے، دائیں ہاتھ سے اس کو فوجی سلام کرتا۔ اور پھر اپنی جیب سے ایک قرش نکال کے عم متولی کو دیتا اور کہتا "جنرل صاحب لائیے مجھے ایک قرش کی مونگ پھلی اور بیج تو دیجیے۔"

ایک دن دوپہر کو عم متولی حسب معمول نورالدین بے کے مکان پہ گیا۔ اور دستور کے مطابق ڈیوڑھی پر بیٹھ گیا۔ فوراً ہی سب بچے اس کے گرد مونگ پھلیاں لینے جمع ہو گئے۔ اور چاروں طرف کے نوکروں نے بھی اس کو گھیر لیا سب اس کے گرد بیٹھ گئے۔ عم متولی نے حسب عادت کھڑے ہو کے اپنا وعظ شروع کیا۔ اور وہ محو ہو کے اس کے مسحورکن الفاظ سنتے رہے۔ عین اس وقت ابراہیم بے باہر آیا اور کہنے لگا جنرل متولی ....! اس نے اپنی تقریر بند کر دی اور لوگ خفگی اور استعجاب سے اس کھلنڈرے لڑکے کی طرف دیکھنے لگے۔ ابراہیم بے آگے بڑھا اور بات یوں ختم کی کہ "میرے والد آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ آپ میرے ساتھ تشریف لے آئیے۔"

مجمع کو یہ مداخلت پسند نہ آئی۔ عم متولی نے ٹوکری اپنی پیٹھ پہ رکھی اور آہستہ سے دروازہ کی طرف بڑھا۔ اس نے اپنے وفادار عقیدت مندوں پر معذرت اور محبت کی نگاہ ڈالی۔ ابراہیم بے کے ساتھ وہ بائیں باغ میں داخل ہوا کچھ دیر تک وہ دونوں ساتھ ساتھ باغ کی روش پر چلتے رہے۔ یہ روش مہمان خانہ تک جاتی تھی جہاں نورالدین بے ایک تخت پر بیٹھے ان کا انتظار کر رہے تھے۔ نورالدین بے نے اپنے بیٹے کو وہاں سے بھیج دیا، گرمجوشی سے عم متولی کا خیر مقدم کیا اور بوڑھے کو اپنے قریب ہی زمین پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اس دوران میں کچھ لمحے خاموشی رہی عم متولی نیچی آواز میں حمد و نعت پڑھتا رہا۔ نورالدین بے نے مختصر سی تمہید کے بعد کہا کہ ان کی والدہ بزرگوار نے اس کی تعریف سنی ہے۔ لہذا وہ اس سے ملنا چاہتی ہیں تاکہ اس کی زبانی تاریخ اسلام کی شاندار روایات سنیں۔ عم متولی کا دل خوشی سے بے قابو ہو گیا اب اس کی شہرت گلی کوچوں سے گزر کر چار دیواری کے اندر بیٹھی ہوئی خواتین کے کانوں تک پہنچ چکی تھی۔

نورالدین بے اٹھ کر زنان خانہ کی طرف چلے۔ عم متولی بھی پیچھے پیچھے ہو لیا۔ وہ ایک کشادہ گلی میں سے ہوتے ہوئے مکان کے دروازہ تک پہنچے۔ اور ایک اندھیرے چبوترے کی سیڑھیوں پہ چڑھ کے ایک وسیع ہال میں داخل ہو گئے۔ عم متولی نے جیسے ہی اس عظیم الشان ہال میں قدم رکھا اس کا دل خوف اور حیرت کے مارے دھڑکنے لگا۔ اس نے ایسا ایوان مہدی کے محل میں بھی نہیں دیکھا تھا۔

عم متولی ابھی حیرت میں غرق ہی تھا کہ ایک نحیف نسوانی آواز اس کے کانوں کو سنائی دی۔ وہ اس آواز کی طرف متوجہ ہوا۔ اور اس نے دیکھا کہ مکان کی مالک اس کے قریب ہی ایک بڑے تخت پر بیٹھی حقہ پی رہی تھیں۔ وہ ان کی طرف بڑھا کہ ان کو اچھی طرح دیکھ سکے۔ یہ ایک خمیدہ کمر جھریاں پڑے ہوئے چہرے کی خاتون تھیں جنہوں نے سیاہ لباس پہن رکھا تھا۔ اور نازک سنہری فریم کی عینک لگائے ہوئے تھیں۔

عم متولی ان کی طرف بڑھا ان کے دبلے ہاتھ کو بوسہ دیا۔ اور خوش بختی و درازی عمر کی دعائیں دیں۔ نورالدین بے تعارف کرانے کے بعد وہاں سے چلے گئے۔ خانم نے اس کی آمد پر خوشی ظاہر کی اور کہا کہ وہ اس کی کہانیاں سننا چاہتی ہیں۔ اس نے نگاہیں نیچی کر کے اپنے ذہن میں سب قصے اور قدیم روایات

دہرانی شروع کیں۔ پھر اس نے اپنا سر اٹھایا اور اس روانی اور جوش کے ساتھ اپنا بیان شروع کیا کہ خانم سحر زدہ ہو گئیں۔ جب وہ ختم کر چکا تو انہوں نے اس کو انعام دیا۔ اس قدر بڑی رقم کہ جس کا کبھی اسے خواب و خیال بھی نہ تھا اور اتنی اس کی تعریف اور توصیف کی کہ وہ تھوڑی دیر کے لئے پریشان ہو گیا۔ آخر وہ ان کو اور ان کے خاندان کو دعائیں دیتا ہوا وہاں سے اٹھ کھڑا ہوا۔ ابھی وہ باغ ہی تک پہنچا تھا کہ خادماؤں اور چھوکریوں کے ایک گروہ نے اس کو گھیر لیا۔ اس کے دامن اور ہاتھوں کو چوما اور اس سے دعائے خیر کی طالب ہوئیں۔ تبرک کے طور پر اس سے کچھ مونگ پھلیاں اور ریچ وغیرہ خریدنے چاہے۔ وہ خوش خوش زمین پر بیٹھ گیا اور سارا سودا ان ہاتھوں ہاتھ بیچ ڈالا۔ پھر وہ سیدھا مسجد میں گیا۔ وہاں جا کے خدائے تعالیٰ کی بارگاہ میں چالیس سجدے شکرانے کے ادا کئے۔

اس دن سے عم متولی اکثر نورالدین بے کے مکان پر جاتا۔ وہاں اس کی خوب آؤ بھگت اور اس پر عنایتوں کی بوچھاڑ ہوتی۔ اس کی حالت تبدیل ہو گئی۔ اب وہ خوب اکڑ کے سیدھا چلتا اور کڑک دار آواز میں بات کرتا۔ اس نے اپنی رہائش کے لئے بھی پہلے سے بہتر کمرہ لے لیا تھا۔ اب وہ پنیر روٹی پیاز اور گاجروں کے بجائے روزانہ چاول اور ترکاری اور ہر ہفتہ میں دو بار گوشت کھانے لگا تھا۔ صافہ بھی زیادہ لمبا ہو گیا تھا۔ جبہ کی آستینیں اور زیادہ چوڑی ہو گئی تھیں۔ وہ کاندھے پر ایک بسنتی سی کشمیری شال ڈالنے لگا تھا۔ گہرے سرخ رنگ کی نئی جوتیاں تھیں۔ کمر پر خوب لمبی جھالر کا ریشمی پٹکا بندھا ہوا ہوتا۔ اس نے رفتہ رفتہ پھیری پر بیچنے کا کام بند کر دیا۔ اس نے اپنی روزانہ کی کوچہ گردی سے نجات حاصل کر لی تھی۔ اب وہ خوب لمبی تان کر سوتا۔ غریبوں میں خیرات بانٹتا۔ حاجت مندوں کا سہارا سمجھا جاتا۔ فرصت سے مسجد میں جاتا اور دل لگا کے وعظ سنتا تاکہ بعد میں ان بزرگ خانم یعنی نورالدین کی والدہ کو سنا سکے۔ اس طرح اس کی شہرت گرد و نواح میں پھیل گئی۔ لوگ آپس میں اس کا ذکر کرتے اور اس کی خیر خبر پوچھتے۔ پھیری والا عم متولی اب ایک درویش بن چکا تھا۔

اس کے عقیدت مندوں کا گروہ نورالدین بے کے مکان کے سامنے ایک دن اس کی آمد کا منتظر تھا کہ کسی نے کہا "میرے دوستو! کیا تم عم متولی کو بس ایک حق پرست آدمی سمجھتے ہو جو بڑی فصاحت سے وعظ کہتا ہے؟" دوسرے نے پوچھا "تمہارا اپنا کیا خیال ہے؟" اس شخص نے سرگوشی میں جواب دیا "وہ خدا کے بڑے برگزیدہ بندوں میں سے ہے۔"

"تمہیں کس نے بتایا؟"

"تم اس کی آنکھوں کو ذرا دیر دیکھو۔ ان میں سے ایک عجب نور دکھائی دے گا۔"

"میں تمہیں ایک واقعہ سناؤں لیکن جھجکتا ہوں کہ شاید تم میرا یقین نہ کرو۔" مجمع اس کے نزدیک ہو گیا۔ "بتاؤ۔ بتاؤ۔۔۔۔" اس نے کہا "میں ایک دن اس کے ساتھ سیدی شارلیش میں چلا جا رہا تھا۔ شام کا وقت تھا اور گلی میں صرف دو مدھم سے چراغ روشن تھے۔ یکایک ہوا کے تند جھونکے سے وہ دونوں لیمپ بھی گل ہو گئے۔ ہم دونوں اب گھپ اندھیرے میں تھے۔ مجھے کچھ خوف سا محسوس ہوا اور میں نے عم متولی کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اس نے کہا "ڈرو نہیں ہم خدا کی امان میں ہیں۔" اتنے ہی میں ایک اور شخص نے کہنا شروع کیا "تمہارا قصہ سن کر مجھے بھی ہمت ہوتی ہے کہ اس برحق بزرگ کے بارہ میں کچھ سناؤں جس سے ہمارا سابقہ اتنی مدت سے ہے لیکن حقیقت سے ہم ابھی تک خاطر خواہ طور پر واقف نہیں۔" مجمع کی نگاہیں اب اس شخص کی جانب اٹھ گئیں اور سب نے پوچھا "تو بتاؤ تم اس کے بارہ میں کیا جانتے ہو؟" اس شخص نے سہمی ہوئی آواز میں نہایت سنجیدہ چہرہ بنا کر کہا "وہ مہدی ہے۔"

"مہدی۔۔۔۔۔ مہدیٔ موعود؟" وہ ایک دوسرے کے ساتھ سر جوڑے سرگوشی کرنے لگے۔ "مہدی۔ مہدیٔ موعود؟" وہ بولا "میں نے اس کے صندوق میں نبوت کی تلوار دیکھی ہے۔ جس سے چھو کر اس نے میرے بیمار بیٹے کو اچھا کر دیا۔ حالانکہ ڈاکٹر جواب دے چکے تھے۔" ہر شخص دوسروں سے پہلے سوال کرنے کے لئے بے چین تھا۔ اور یہ شخص بڑی متانت سے سب کا جواب دے رہا تھا۔ ہیجان بڑھتا گیا۔ اس گروہ میں اب کچھ اور لوگ بھی آ کے شامل ہو گئے کہ یہ کیا قصہ ہے۔ اور یہ شخص تلوارِ نبوت اور مہدی کا کیا ذکر کر رہا ہے۔ عین اس وقت عم متولی دور سے آتا نظر آیا۔ مجمع نے اسے دیکھ کر جلدی جلدی دو رویہ قطار باندھ لی۔ عم متولی نپے تلے قدموں سے وہاں آیا۔ سنجیدگی اور وقار کے ساتھ۔ اور ادھر گردن

استقبال کرنے والوں پر ایک مسکراتی ہوئی نظر ڈالی اور لوگوں نے با ادب ہو کر اس کے گرد حلقہ ڈال دیا۔ اس کے دامن کے ہاتھوں اور اس کے پٹکے کو عقیدت سے چومنے لگے۔ جس شخص نے تلوار کو چھوا تھا وہ آگے بڑھا۔

"میرے آقا، میرے مالک۔ میرے بیٹے کو موت سے بچانے والے۔ آپ نے خود کو بہت چھپایا مگر ہم آپ کو پہچان گئے۔ آپ ہی خدا کے وہ برگزیدہ بندے ہیں جسے اس نے ہماری ہدایت کے لئے بھیجا ہے۔ آپ رسول کے جانشین ہیں ..... آپ مہدی ہیں ....."

عم متولی حیران ہو کے اس شخص کی طرف مڑا۔ "تم کیا کہہ رہے ہو؟ تمہیں ہذیان ہو گیا ہے۔"

"اب آپ اپنی اعلیٰ و ارفع ذات کو ہم سے چھپا نہیں سکتے۔ ہاں ہاں آپ مہدی ہیں۔ رسول کے نائب ہیں۔ خدا نے صداقت کی تلوار آپ کو بخشی ہے۔"

"خاموش رہو، خاموش رہو" اس نے کہا۔ "اس لئے کہ مجھے یہ مرتبہ حاصل نہیں۔"

"کیا آپ نے میرے بیٹے کو موت سے نہیں بچایا تھا؟"

"میں نے؟"

وہ شخص جس نے اندھیری گلی کا قصہ سنایا تھا آگے بڑھا۔ "کیا آپ نے اپنے چہرے کے نور سے تیرہ و تار گلی کو روشن نہیں کر دیا تھا؟"

"میں۔ میں نے؟" پہلے شخص نے کہا۔ "ابوبکر صدیق، ان پر خدا کی رحمت ہو، میرے خواب میں آئے اور آپ کی اصلیت مجھ پہ انہوں نے ظاہر کی۔" اس نے کچھ دیر خاموشی کا سہارا لیا۔ اور چاروں طرف گھورتا رہا۔ پھر یوں بولا جیسے اپنے آپ سے گویا ہو:

"میرے بچو! مہدی تو بہت بڑی قوت والے ہیں۔ مجھ سے کہیں زیادہ قوی اور بزرگ ہیں۔ میں تو ایک خدا کا تابعدار بندہ ہوں۔" وہ ان کے ساتھ زیادہ دیر نہیں بیٹھا۔ اور سوچ میں غرق گھر جلدی واپس آگیا۔

دوسرے دن صبح کو ابھی وہ جاگا بھی نہیں تھا کہ دروازہ پر دستک سنائی دی۔ وہ کیا دیکھتا ہے کہ ایک شخص سر پہ پٹی باندھے نحیف اور کمزور بدن، روتا گڑگڑاتا چلا آتا ہے اور اس کے دامن کو تھام کر کہنے لگا۔ "مجھے بھی اپنے پاک ہاتھوں سے نبوت کی تلوار چھو جانے دیجئے۔"

"نبوت کی تلوار؟" اس نے حیرت سے کہا۔ وہ بولا "میرے آقا مجھے تکلیف سے نجات دلایئے۔ اس بدبخت پہ رحم کیجئے۔ اے رسول کے نائب! رحم کر۔"

عم متولی اسے اپنے کمرہ میں لے گیا۔ دن بھر اس کی تیمارداری میں مصروف رہا۔ رات کو دعائیں پڑھ کے اس کے اوپر دم کیں اس کی خواہش کے مطابق تلوار اس کے تکئے کے نیچے رکھ دی۔ اور اسے اپنے پہلو میں سلا لیا۔ صبح کو اس بیمار شخص نے اٹھ کر کہا کہ وہ بالکل تندرست ہے بلکہ ایسی تندرستی کا احساس اسے پہلے کبھی نصیب ہی نہ ہوا تھا۔ اس نے عم متولی کے ہاتھوں پہ بوسوں کی بوچھاڑ کر دی۔ اس کی زبان سے دعاؤں کی جھڑی لگی ہوئی تھی۔

دن گذرتے گئے عم متولی کا مکان ہر طرف سے آنے والوں کی زیارت گاہ تھا۔ جو اپنے جسمانی رنج یا روحانی آزاروں کا علاج ڈھونڈنے وہاں آتے۔ عم متولی شاذ ہی کبھی باہر جاتا۔ زیادہ ایک گہری سوچ میں غرق رہتا۔ کبھی وہ اپنی تلوار نکال لیتا۔ اور اسے گھٹنوں پر رکھ کے وحشت ناک نظروں سے گھورتا رہتا۔ ایک دن عم متولی نے دیکھا کہ وہ بزرگ خانم نذرالدین بے کی والدہ ہیں اس کے عقیدت مندوں کے ہجوم میں اس کی زیارت کو تشریف لائی ہیں۔ وہ اسے دیکھتے ہی دو زانو ہو گئیں۔ اس کے دامن کو بوسہ دیا اور کہا "اے نائب رسول یہ کمترین آپ کی خدمت میں حاضر ہوتی ہے آپ کے دیدار کی سعادت حاصل کرنے کے لئے ..."

اس دن سے عم متولی نے اپنے کمرہ کے باہر قدم نہیں نکالا۔ کبھی وہ لوگوں کو اندر آ جانے دیتا اور کبھی اندر سے دروازہ کو قفل لگا اور کسی کو قریب نہ آنے دیتا۔ وہ دیوار سے پیٹھ لگائے لگا بیٹھا زمین پر گھٹنے ٹیک کے بیٹھ جاتا۔ اور گھنٹوں اسی حالت میں بیٹھا رہتا پھر وہ ایک دم اپنے خواب سے چونک اٹھتا۔ سخت ہیجان اور جوش کے عالم میں جھپٹ کے تلوار اٹھا لیتا۔ کمرہ میں تلوار کے ہوائی ہاتھ چلاتا۔ کودتا چیختا چلاتا۔ ملعونوں کو بھاگ جانے کی دھمکیاں دیتا یہاں تک کہ بیہوش ہو کے زمین پر گر جاتا تھا۔ یہ سب چیخ پکار سنتے اور سمجھتے کہ حق پرست بزرگ پہ تنہائی میں

(باقی صفحہ [illegible])

جانہار

قادر جاوید

چار دن سے وہ دکان نہیں آیا تھا اور آج صبح ہی اس کے بیٹے علی اکبر نے آکر اطلاع دی کہ کل رات اس کا انتقال ہو گیا۔ مجھے اور میرے سارے نوکروں کو بے حد تعجب ہوا۔ چند دنوں سے وہ کچھ ملول اور مضمحل سا تھا لیکن ہم یہ گمان بھی نہ کر سکتے تھے کہ وہ یوں یکایک مر جائے گا۔ علی اکبر نے بتایا کہ اسے مسلسل بخار رہنے لگا تھا اور مرنے سے دو دن قبل اس کے ہاتھ اور پیر پر سوجن آگئی تھی۔ میں نے اور دکان کے نوکروں نے اس کے اس چھوٹے سے بچے کی تسلی تشفی کی اور یہ طے پایا کہ رات میں دکان بند ہونے کے بعد میں اور میری دکان کا ایک پرانا ملازم مرزا جو مرحوم کا گہرا دوست تھا اس کے مکان جائیں گے اور اس کی بیوی سے مل کر پرسہ دیں گے۔

علی احمد میری دکان کا منیجر تھا اور میری دکان کے دوسرے نوکر اسے منیجر صاحب کہہ کر پکارتے تھے۔ میں نے جب سے ہوش سنبھالا ہے ہمیشہ اسے اپنی کرسی پر بیٹھے کام کرتے ہوئے یا گاہکوں کو نہایت ہی نرم اور متین لہجے میں عینکوں کے فریم اور ان کے شیشوں کی قیمتیں بتلاتے پایا ہے۔ میرے ابا کہتے تھے کہ وہ دکان کو کبھی دیر سے نہیں آتا اور نہ وقت سے پہلے جاتا ہے۔ دوپہر میں صرف آدھے گھنٹے کے لئے وہ باہر جاتا اور پھر واپس آکر ہم لوگوں کے ساتھ کھانا کھا لیا کرتا۔ وہ ہمارا بہت پرانا نوکر تھا اور میرے ابا مجھ سے زیادہ اس پر اعتماد کیا کرتے تھے۔ دکان کا سارا انتظام اسی کے ذمے تھا۔ وہ دنیا کی ہر مشہور کمپنی کی فہرستیں منگوا کر نئی نئی وضع کے فریموں کا انتخاب کرتا، ان کے لئے آرڈر دیتا اور خود ہی ان کی واجبی قیمت فروخت مقرر کرتا۔ گاہک سے وہ انتہائی توجہ کے ساتھ پیش آتا لیکن اس کے چہرے پر خوشامد یا چاپلوسی کے آثار نہ ہوتے۔ وہ بہت ہی شستہ لہجے میں ایک ایک لفظ پر زور دے کر اس انداز سے گاہک سے بات کرتا گویا اپنی بات پر اسے کامل اعتماد ہے اور گاہک کو چاہیے کہ بلا چون چرا اس کی بات مان لے — خریدار جب بلا کسی جھجک کے معاملے طے کرنے پر آمادہ ہو جاتا تو علی احمد کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ جاتی لیکن صرف ایک لمحے کے لئے اور دوسرے ہی لمحے وہ ویسے ہی سنجیدہ ہو جاتا اور گاہک کو بڑے احترام کے ساتھ کرسی پیش کرتا۔ جب کوئی ستانے والا گاہک آتا اور مختلف قسم کی عینکوں کے نمونے دیکھ کر اور شوکیس پر فریموں کا ایک انبار چھوڑ کر چلا جاتا تو اس وقت علی احمد کا تحمل دیکھنے کے لائق ہوتا۔ وہ پتلون کی جیب سے اپنا سفید اور ہلکی ہلکی خوشبو میں بسا ہوا رومال نکال کر چہرے کو بڑی ملائمت سے پونچھتا اور پھر مرزا سے کہتا کہ ہر فریم کو بڑی احتیاط سے اس کی جگہ رکھ دیا جائے۔ گاہک اگر خریداری پر آمادہ ہو جائے تو پھر علی احمد سارے فریم خود ہی ان کی جگہ پر رکھ دیتا ورنہ یہ خدمت مرزا کو انجام دینی پڑتی۔

اسے دکان کی آرائش کا بڑا خیال رہتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ عینکوں کی دکان کی سجاوٹ ایسی ہونی چاہیے کہ کمزور بینائی کے لوگ جب اپنی عینک لینے کے لئے اس دکان پر آئیں تو ان کی آنکھیں چکا چوند ہو جائیں۔ وہ اس بات کا ہرگز قائل نہ تھا کہ گاہکوں کی پوزیشن اور ان کی معاشی حالت کا اندازہ لگا کر ایک ہی فریم کی مختلف قیمتیں بتائی جائیں۔ اس کا خیال تھا کہ اس طرح کے چکموں سے ہماری ساکھ بگڑ جائے گی اور وقتی منافع کی خاطر ہمیں برے نتائج بھگتنے پڑیں گے۔ دکان کی سجاوٹ کے لئے نئی نئی باتیں سوچا کرتا تا کہ شہر کی دوسری عینک کی دکانوں اور عینک سازوں سے بازی لے جائے۔ دکان کے لئے وہ نئی نئی وضع کے شوکیس بنواتا، ڈیڑھ دو سال کے بعد دکان کی ساری ترتیب بدل ڈالتا، سائن بورڈ خوبصورت وضع اور قوس قزح جیسے رنگوں سے لکھواتا، ان پر مختلف زاویوں سے

رنگین روشنی ڈوتا تاکہ شاہراہ پہ سے گزرنے والے کی نظر اس پر پڑے اور ہماری دکان کا نام اس کی آنکھوں کی شعاعوں سے گزر کر اس کے تحت الشعور میں جم جائے اور جب بھی اسے عینک کی ضرورت پڑے وہ سیدھا ہماری دکان پر آ جائے۔ تین ساڑھے تین ماہ قبل اس نے کلکتہ کی ایک مشہور ایڈورٹائزنگ کمپنی کے ذریعے ہماری دکان کے سائن بورڈ کے اوپر ایک دائیں بائیں اور اوپر نیچے گھومنے والی بڑی سی عینک لگوائی ہے جس پر بے شمار چھوٹے چھوٹے رنگین بلب جگمگاتے ہیں اور شام ہی سے ہزاروں راہ گیروں کی توجہ اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔ اس طرح کی نمائش اور اشتہار بازی پر ہر سال وہ کافی خرچ کرتا تھا اور غالباً اسی کا نتیجہ تھا کہ روزانہ سینکڑوں روپوں کا کاروبار ہوتا اور دکان خوب چلتی۔

کہتے ہیں کہ وہ ہماری دکان پر اُس وقت ملازم ہوا تھا جب کہ اس کی عمر پچیس چھبیس سال کی ہوگی اور اب مرنے کے وقت وہ پورے باسٹھ سال کا تھا۔ گویا اس کی عمر کے تقریباً ۳۶ سال اسی دکان پر گزرے تھے اور یہی وجہ تھی کہ میرے ساتھ اس کا بزرگانہ مربیانہ رویّہ تھا۔ وہ میرے ساتھ بیٹے یا بھتیجے جیسا برتاؤ کرتا اور سوائے کسی بڑے خرچ کے معاملے کے وہ چھوٹے چھوٹے معاملوں میں میری رائے بھی طلب نہ کرتا میں بھی اس کا بڑا احترام کرتا تھا۔ کیونکہ نہ صرف وہ عمر میں بہت بڑا اور میرے والد کا بااعتماد ملازم تھا بلکہ بہت ایماندار اور کافی منتظم آدمی تھا۔ اسے دکان پر کام کرتے دیکھ کر مجھے بڑا سکون ہوتا اور میرے والد کے انتقال کے بعد اپنی ناتجربہ کاری سے جو ذہنی پریشانی لاحق ہو گئی تھی وہ اس علی احمد کے باعث پرسکون زندگی میں تبدیل ہو گئی تھی۔ چونکہ مجھے اس پر کافی اعتماد تھا اور اس بات کا بھی یقین تھا کہ میری غیر موجودگی میں بھی کسی گاہک کو کوئی شکایت پیدا نہ ہوگی اس لئے اکثر میں دکان پر دیر سے آتا بلکہ بعض اوقات تو سارا سارا دن دکان سے غائب رہتا لیکن باوجود دکان کا مالک ہونے کے مجھے ڈر لگا رہتا کہ میرے اس طرح غائب رہنے پر کہیں علی احمد خفا نہ ہو جائے۔ میری کوئی بات اسے ناگوار گزرتی تو اکثر و بیشتر وہ مجھ سے ذکر نہ کرتا بلکہ میں خود اس کی حرکات و سکنات اور چہرے کے اتار چڑھاؤ سے پتہ چلا لیتا کہ آج وہ مجھ سے خوش نہیں ہے۔

والد کے انتقال کے چند ماہ بعد مجھے جوئے کی عادت پڑ گئی تھی اور میں کئی کئی دن اور کئی کئی راتیں مسلسل جوا کھیلتے گزار دیتا تھا۔ ہماری بیٹھک نظام الدین کے گھر پر ہوتی تھی اور میں بڑا مطمئن تھا کہ اس کا شاید کسی کو پتہ ہی نہ ہوگا۔ لیکن ایک دن شام کے وقت علی احمد نظام الدین کے گھر پہنچا اور نظام کے چھوٹے بھائی کے ذریعہ مجھے باہر بلوایا۔ میں چونکتے ہوئے باہر چلا آیا اور دل ہی دل میں کھول رہا تھا کہ نہ جانے اس کم بخت کو کیسے پتہ چل گیا۔ اس نے ایک لفظ کہے بغیر مجھے بازو سے پکڑ کر رکشا پر لدا دیا۔ اور ہم سیدھے دکان پر پہنچ گئے۔ دکان کے سامنے فٹ پاتھ پر رکشا سے اترتے ہوئے اس نے آہستہ سے میرے کان میں کہا "اقبال میاں! آئندہ ایسی حرکتیں نہ ہوں تو بہتر ہے۔" وہ دن اور آج کا دن میں نے جا تو جوا تاش کے پتوں کا گھروندا تک نہیں بنایا۔

دکان پر وہ بظاہر اپنے کام میں منہمک رہتا لیکن اس کے کان ہمیشہ میری میز کی طرف لگے رہتے جہاں اکثر میرے دوست احباب مجھ سے ملنے جلنے آتے۔ میرے جن دوستوں کو وہ پسندیدہ نظروں سے دیکھتا تھا ان کے ساتھ اس کا برتاؤ بہت اچھا ہوتا اور جن کے بارے میں اس کی رائے اچھی نہ تھی انہیں ہمیشہ علی احمد کے روکھے سوکھے برتاؤ کی شکایت رہتی۔ نظام سے اُسے بڑی کد تھی اور کئی دفعہ باتوں باتوں میں اس نے اس کا اظہار بھی کر دیا تھا کہ اس طرح کے بُرے لوگوں سے ملنا جلنا ٹھیک نہیں ہے۔ نظام کے بڑے بھائی کافی روپیہ پیسہ چھوڑ کر حال ہی میں مرے تھے اور اسی لئے نظام الدین اپنے بے تکلف دوست احباب کے ساتھ خوب گل چھرے اڑاتا پھرتا اور ان سب کے بے حد و بے جا اصرار پر کبھی کبھی مجھے بھی ان کے شوق ذوق میں شریک ہونا پڑتا۔ لیکن ہمیشہ مجھے علی احمد کی ترچھی گھورتی ہوئی نگاہیں نظر آتیں اور میں کوشش کرتا کہ میری مصروفیتوں کا علی احمد کو علم نہ ہو۔ اس کو اتفاق سمجھئے یا علی احمد کی جاسوسی کہ اس کو پتہ لگ گیا کہ میں نظام کی محفلوں میں گاہے ماہے شراب بھی پی لیتا ہوں اور بعض وقت ہوش و حواس کھو بیٹھتا ہوں۔ کئی دن تک وہ منہ لٹکائے بیٹھا رہا اور مجھ سے سیدھے منہ بات تک نہ کی۔ ایک رات جبکہ ہم سب دکان بند کر چکے تھے اور میں گھر جانے کے لئے اپنی موٹر سیکل اسٹارٹ کر رہا تھا، علی احمد جو دکان بند ہونے کے بعد سے فٹ پاتھ پر کھڑا ہوا تھا میرے قریب آیا اور اپنی سفید پتلون کی جیب میں سے ایک لفافہ نکال کر اس نے میرے ہاتھ پر رکھ دیا، اور کہا "اقبال میاں! گھر پہنچ کر پڑھ لینا۔" اس کی اس عجیب سی حرکت سے میرا ماتھا ٹھنکا کہ اس لفافے میں یا تو تنخواہ میں اضافہ کرنے کا مطالبہ ہوگا یا پھر کوئی ایسی ہی بیہودہ بات ہوگی جس کو کوئی اہمیت نہیں دی جا سکتی۔ لیکن میری طرح شاید آپ کو بھی انتہائی حیرت ہو کہ اس نے اس لفافے میں سیدھی سادی انگریزی

ہیں میرے نام چٹھی لکھی تھی اور مجھے خدا اور رسول کا واسطہ دے دے کر اور خاندان کی عزت یاد دلا دلا کر یہ التجا کی تھی کہ میں آئندہ سے شراب کو ہاتھ نہ لگاؤں کیونکہ علی احمد کو یہ خطرہ تھا کہ یہ ام الخبائث نہ صرف میرے کاروبار کو تباہ کر دے گی بلکہ میری صحت کو بھی گھن لگا دے گی۔ تحریر کا انداز نا التجایانہ تھا کہ گویا میرے ماننے یا نہ ماننے پر چٹھی لکھنے والے کے کسی بہت بڑے ذاتی معاملے کا انحصار ہو۔ جہاں مجھے علی احمد کی سادہ لوحی اور اس چٹھی لکھنے والی حرکت پر ہنسی آئی وہیں اس کی محبت اور خیر خواہی نے میری آنکھیں نم کر دیں۔ میں نے اسی وقت اپنے گھر کے ملازم سعید کو سائیکل پر کریم آباد رسول بھیجا جہاں علی احمد رہتا تھا کہ اس کو بلا لائے۔ اسکے آنے پر میں نے اس سے سچی وعدہ کیا کہ آئندہ سے ہرگز شراب نہ پیوں گا۔ بلتے ہوئے اس نے حسبِ عادت چند ایک کلمے کہے "اقبال میاں! تم نے میری لاج رکھ لی۔"

اس کی خانگی زندگی کے متعلق نہ مجھے کچھ زیادہ معلوم تھا اور نہ میرے دوسرے ملازمین کو۔ وہ انتہائی کم گو آدمی تھا اور اپنے گھر کے متعلق تو وہ بہت کم باتیں کیا کرتا تھا۔ مجھے صرف اتنا علم تھا کہ اس نے کافی بڑی عمر میں ایک نوجوان بیوہ سے شادی کی جس سے علی اکبر پیدا ہوا جس کی عمر اس وقت پندرہ ایک سال ہو گی۔ علی احمد کی ازدواجی زندگی خوشگوار نہ تھی کیونکہ سننے میں آیا تھا کہ اس کی بیوی بڑی تیز مزاج تھی۔ میں نے علی احمد کی زندگی کے متعلق خود ہی کچھ تصور باندھ رکھے تھے کہ وہ، اسکی بیوی اور اس کا اکلوتا بچہ اچھی زندگی گزارتے ہوں گے کیونکہ میں اسے ماہانہ ڈیڑھ سو روپے دیا کرتا تھا۔ جب میرے والد زندہ تھے اور میں چھوٹا تھا اس وقت علی احمد مجھے اپنے گھر لے جایا کرتا تھا لیکن اس وقت وہ اکیلا زندگی بسر کرتا تھا اور اس کے بیوی بچے نہ تھے۔ ایک طویل عرصے سے میں اس کے گھر نہ گیا تھا اور مجھے علم نہ تھا کہ اس کی ازدواجی زندگی کس نہج کی ہے۔

ارادہ تو تھا کہ رات میں دکان بند کر کے میں اور مرزا اس کے گھر جائیں، لیکن پھر اس خیال سے کہ وہ ہماری دکان کا قدیم ترین ملازم اور منیجر تھا میں نے گیارہ بجے ہی دکان بند کر دی اور وہاں سے مرزا کو اپنی موٹر سائیکل پر بٹھا کر سید صاحب مرحوم کے گھر کی طرف چل پڑا۔

اس کا گھر ایک گلی میں تھا جہاں سڑی گلی نالیاں بہتی تھیں اور ہر طرف غلاظت بکھری پڑی تھی۔ گھر کیا تھا دو کمرے تھے۔ ایک تنگ کمرہ جس میں دو پلنگ بچھے ہوتے تھے اور اندر کا چھوٹا کمرہ بیک وقت باورچی خانہ، اسٹور روم اور حمام تھا۔ میرے پہنچنے تک تدفین ہو چکی تھی۔ ہمارے پہنچنے پر اس کی بیوی اور بچہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگے۔ میں نے اور مرزا نے بڑی تسلی دی اور میں نے وعدہ کیا کہ میری زندگی تک انہیں کوئی تکلیف نہ ہو گی۔

ہمارے باہر آنے پر علی احمد کے ایک دوست نے مجھ سے اپنے گھر چلنے کی خواہش کی جو بالکل علی احمد کے گھر سے لگا ہوا تھا۔ چھوٹے سے دروازے میں سے ہم مردانہ بیٹھک کے کمرے میں آ گئے۔ دیواریں گیلی گیلی تھیں اور نیچے پورے فرش پر ایک دری بچھی ہوئی تھی اور طاقچوں میں ٹوٹے پھوٹے ایش ٹرے اور گلاس پڑے تھے۔ میں، مرزا اور وہ صاحب وہیں فرش پر بیٹھ گئے۔ علی احمد کی زندگی کی بہت ساری باتیں یاد آتی گئیں اور باتیں ہوتی رہیں۔ ان صاحب نے آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا: "سچ پوچھئے تو صاحب ایسا یار باش آدمی بھی کم پیدا ہوتا ہے۔ اسی گھر میں، اسی کمرے میں ہماری محفلیں جمتی تھیں۔ آپ کی دکان بند ہونے کے بعد وہ سیدھا گھر آتا، بیوی سے لڑائی کرتا اور پھر یہاں آ جاتا۔ دور چلتا اور ہم سب تین چار بجے رات تک جاگتے رہتے اور جوا کھیلتے رہتے۔ وہ اکثر ہارتا مگر کبھی دنگا نہ کرتا۔ بڑے رکھ رکھاؤ اور سلیقے کا آدمی تھا۔ ٹھرے کو اس نے کبھی ہاتھ نہیں لگایا۔ ہر رات پیتا، خوب پیتا مگر وہی عمدہ درجے کی وہسکی۔ اتنی پی جاتا کہ چلنے پھرنے کا ہوش نہ رہتا۔ مگر جوں ہی صبح ہوتی شیو بناتا اور اجلے کپڑے پہن کر رومال میں عطر لگا، آپ کی دکان پر چلا جاتا۔ اس کی اس شب بیداری اور شراب نوشی نے اس کی صحت کو گھن لگا دیا۔ اسے بخار رہنے لگا اور ڈاکٹروں نے کہا کہ اس کا جگر خراب ہو گیا۔ ہائے کمبخت نے آخری وقت تک سوائے شراب کے دوا کو ہاتھ نہ لگایا۔ علاج کے لئے بیوی جو بھی پیسے لاتی وہ لڑ جھگڑ کر چھین لیتا اور شراب پی لیتا۔ آخری وقت میں اس کے ہاتھ پاؤں پر سوجن آ گئی تھی، اٹھنا بیٹھنا مشکل ہو گیا تھا۔ اسی بری حالت میں اس نے ہم سب کا ساتھ چھوڑ دیا۔"

ان بزرگ نے جب رقت آمیز آواز میں اپنی بات ختم کی تو میں نے سر اٹھا کر مرزا کی طرف دیکھا۔ وہ پھٹی پھٹی اور متعجب آنکھوں سے ان کا چہرہ تک رہا تھا۔

ماہِ نو میں مطبوعہ مضامین نظم و نثر دوسرے جرائد میں بخوشی نقل کئے جا سکتے ہیں بشرطیکہ ماہِ نو کا حوالہ دیا جائے۔ (ادارہ)

لکیروں کی زبان

زین العابدین
مترجمہ: الطاف گوہر

ایک دفعہ مجھے خیال آیا کہ وائلین بجانا سیکھوں۔

کسی کہانی میں میں نے پڑھا تھا کہ ایک فن کار دیوار پر اپنی تصویر لٹکا کر اُسے دیکھ دیکھ کر وائلن بجایا کرتا تھا، یہ ترکیب مجھے بہت پسند آئی۔

ایک پُرانا وائلین لیا اور کئی دن تک خوب مشق ہوتی رہی۔

پھر کسی نے صلاح دی، "وائلین سے ستار بہتر ہے۔ آخر اپنے دیس کا ساز ہے۔"

میں نے سوچا، چلو ستار ہی سہی۔

ستار کے تار سے انگلی کٹ گئی۔

اب کے میں نے "اسراج" شروع کیا۔

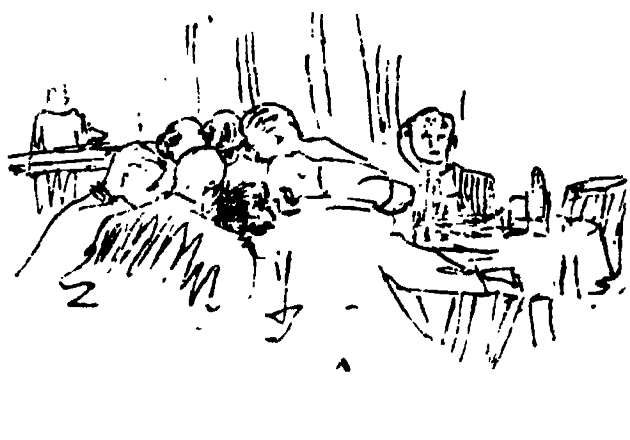
جب وہ ہو چکا تو ایک دوست نے سمجھایا، "زین العابدین! کن باتوں میں پڑے ہو، تمہارا کام ہے مصوری، بس وہی کرو۔"

میں نے سوچا ٹھیک ہی کہتا ہے، مصوری ہی میں میری نجات ہے۔ تصویر کی لکیروں اور رنگوں میں جو کچھ میں کہہ سکتا ہوں اور کسی طرح نہ کہہ سکوں گا۔

یورپ سے لوٹ کر آیا تو جو دیکھا تھا دوستوں کو سناتا رہا۔ تنگ آ کر انہوں نے کہا کہ بھائی جو کچھ کہنا ہے ایک بار لکھ کیوں نہ ڈالو، مگر لکھنا تو فن ہی اور ہے — میں تحریر کی زبان ہی سے نا آشنا ہوں، تھوڑی بہت زبان جو میں جانتا ہوں وہ تصویر کی زبان ہے، اسی زبان کا ایک واقعہ سُنئے۔

یہ واقعہ اسپین میں ہوا۔ اسپین کے گلی کوچوں میں گھومنے پھرنے کی جس چیز نے مجھے ہمت دلائی وہ لکیروں کی زبان تھی جس کی مدد سے میں نے انگریزی جاننے والے لوگوں سے راہ و رسم پیدا کی اور کھانے پینے، چلنے پھرنے کا ایک انوکھا طریقہ نکالا۔ اسپین کا سارا قصہ کہنے کا نہیں۔ طالب علمی ہی کے زمانے سے مجھے اسپین جانے کا شوق تھا، الحمراء اور قرطبہ کی مسجد، کمالِ فن کے وہ نمونے دیکھنے کی مجھے بڑی خواہش تھی۔ لندن پہنچ کر میں نے جاننے والوں سے اسپین کے بارے میں جو معلومات حاصل کیں ان سے آتشِ شوق اور بھڑکی، پیرس پہنچ کر اتنا کچھ سُنا کہ سارا اسپین آنکھوں کے سامنے سے گزر گیا، بس ایک جانا باقی تھا۔ دوستوں نے ہدایات دینے اور پتے بتانے میں کسر نہ کی، کون سی گیلری کہاں ہے، کون سا مجموعۂ تصاویر کس کلب میں ہے، اور اسپین کا انگور، سبحان اللہ! تربوز ایسا میٹھا کہ کیا کہئے، جنگلی بھینسوں کا مقابلہ ضرور دیکھنا، اور ہسپانوی حسیناؤں کا رقص تو خیر دیکھو گے ہی، وغیرہ وغیرہ۔

پانچ چھ مہینے پیرس میں رہنے کے بعد اسپین کا سفر طے ہوا، اسپین میں جہاں جہاں مجھے جانا تھا، سب کا انتظام ایک ایجنسی کے ذریعے کر لیا۔ کئی دن کی بھاگ دوڑ



کے بعد یہ کا پاس بھی مل گیا۔ "پاس" پر لگانے کے لئے فوٹو درکار تھا۔ "پاس" کیا، پورا پلندہ تھا۔ "پاس" کی کتاب ... ۳۰ کلومیٹر کے سفر کے لئے راستے کے مختلف اسٹیشنوں کے نمبروں سے بھری ہوئی تھی، جہاں آپ کو جانا ہو ریل کا افسر پاس پر سے وہ نمبر کاٹ کر آپ کو ایک ٹکٹ دے دے گا۔ اپنا پاس تھرڈ کلاس کا جس پر قریب قریب ایک سو روپیہ خرچ آیا تھا مگر خیر اس قصے کو جانے دیجئے۔

یہ سب کچھ ہو چکا تو اطمینان کا سانس لیا۔ مگر ایک خیال آتے ہی جیسے دم سا رک گیا، بات چیت کروں گا کس زبان میں؟ چپ رہوں گا تو آخر کب تک، سنا تھا اسپین میں انگریزی جاننے والے خال خال ہیں، فرانسیسی جاننے والے بہت ہیں مگر ایں جانب دانت بھینچ بھینچ کر جس قسم کی فرانسیسی بولتے تھے اس سے کام چلانا ممکن نظر نہ آتا تھا، پیرس میں تو غیر لفظوں سے نہیں ہاتھوں کے پر زور اشاروں سے بات بن جاتی تھی مگر اسپین میں پہلے کسی ایسے آدمی کو ڈھونڈنا ہوگا جو فرانسیسی جانتا ہو۔

اللہ کا نام لیا اور روانہ ہو گیا، ایک تو گرمی، اس پر بھیڑ، آخری جنگ کے زمانے میں کلکتے سے گھر آتے ہوئے ریل گاڑی میں جو بھیڑ دیکھی تھی وہ بھول گیا، گاڑی کے برآمدے تک میں تل دھرنے کی جگہ نہ تھی، اس پر بھی لوگ تھے کہ دھڑا دھڑ گھسے چلے آ رہے تھے، میں نے سوچا ہجوم میں گھر گیا تو خیریت نہیں ایک کونے میں دبک گیا۔ بیٹھا رہا کہ کھڑا یہ یاد نہیں، ہر لحظہ یہ گمان ہوتا تھا کہ ابھی مار پیٹ ہو جائے گی۔ سروں میں بکسوں اور سوٹ کیسوں کے کونے چبھ رہے تھے، مگر کیا مجال کہ آہ تک سنائی دی ہو، میں حیران تھا، جی چاہتا تھا تھوڑی سی گھٹن جائے تو اچھا ہے — کچھ تو ہو، جو لوگ گاڑی میں گھسے چلے آ رہے تھے ان کی طرف گھور گھور کر آنکھوں ہی آنکھوں میں کہا خدا کے لئے مت آؤ جگہ نہیں ہے، دوسری گاڑی دیکھو — مگر منہ سے ایک لفظ نہ نکلا، دل ہی دل میں گھٹتا رہا۔ تھک ہار کر اپنے آپ کو سمجھایا کہ میں نے آخر کوئی گاڑی بھر کا ٹھیکہ تو نہیں لے رکھا! بعض ایسے بھی تھے جو نچلے درجے میں جگہ نہ پا کر کھسکتے کھسکتے اوپر والے ڈبوں کی طرف بڑھے جا رہے تھے، مجھے خیال آیا کہ یہ بھی کچھ ہم لوگوں سے کم استاد نہیں ہیں، یہ سوچ رہا تھا کہ ٹکٹ چیکر نازل ہوا اور میرے ٹکٹ پر دستخط کرنے کے بعد اشارے سے مجھے اپنے ساتھ اوپر والے درجے میں چلنے کو کہا، کچھ سمجھ میں نہ آیا، میں خاموش کھڑا رہا، تھوڑی دیر کے بعد چیکر پھر آیا، اور لگا اپنی تیز کلامی سے رعب جمانے، میں حیران تھا کہ نہ جانے کیا [illegible] ہے، اتنے میں اس نے میرا بکس اٹھایا اور لگا گاڑی کے برآمدے کی طرف بڑھا، اتنی گرمی اور اس قدر بھیڑ، اس پہ یہ ایک نیا عذاب آ گیا، شک ہوا شاید ٹکٹ غلط ہو، بیوقوفوں کی طرح چیکر کے پیچھے پیچھے چلنے لگا، فرانسیسی کے جو دو چار لفظ آتے تھے ان میں سے کوئی بھی صورتِ حال کے اظہار کے لئے موزوں نہ تھا، مجبوراً کہنا شروع کیا "ایکسکیوزے موا، سلوو پلے، موسیے، موسیے"، چیکر نے اشاروں میں ہزار تسلی دی کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں مگر یقین نہ آیا۔

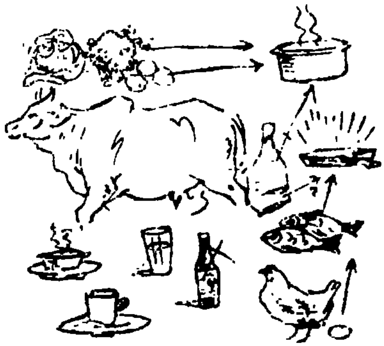
نیا شہر، چھوٹا سا گائیڈ بک نکالی، سوچا پہلے محل اور قلعہ دیکھوں گا، کتاب کھولی تو ایک کم خرچ اور بہتر آسائش رہائش گاہ کے پتہ پر نظر پڑی، جہاں میں ٹھیرا ہوا تھا وہ جگہ کچھ ایسی اچھی نہ تھی، میں نے کہا قلعہ دیکھنے سے پہلے کیوں نہ قیام گاہ بدل دوں، مگر سوال یہ تھا کہ کس سے کہوں کیسے پوچھوں، کسی راہ گیر سے پوچھ کر بیوقوف



بننے کی سمجھ میں ہمت نہ تھی، سوچا کسی پولیس والے سے پوچھوں گا، لندن میں پولیس والا سب کا دوست اور راہبر ہوتا ہے، پیرس میں معاملہ اس کے بالکل برعکس، ذرا سی بات پوچھئے اس قدر تفصیل سے جواب دیگا کہ سنتے سنتے سر چکرا جائے، اب یہ فکر ہوئی کہ معقول صورت پولیس والا نظر آئے تو اس سے پوچھوں، تصویر کشی میں انسان کے چہرے کے متعلق میں نے جتنا علم حاصل کیا تھا سب صرف کر ڈالا اور ایک ٹریفک پولیس مین کے پاس پہنچا، بڑے ڈھیلے ڈھالے انداز سے آواز میں جس قدر مٹھاس ہو سکتی تھی پیدا کی اور انتہائی فرانسیسی لہجے میں بولا "ایکسکیوزے موا، کیا آپ فرانسیسی جانتے ہیں؟" آواز حلق سے زیادہ ناک سے نکلی، پولیس مین مرعوب ہو کر

میری طرف دیکھنے لگا، اس نے سوچا کہ شاید اس کا واسطہ فرانسیسی زبان کے کسی عالم سے پڑا ہے، بیتر دم سے ایک جوابی تقریر کرنے لگا، ایک لفظ سمجھ میں نہ آیا، ایکبار میں نے پینترا بدل کر پوچھا "کیا آپ انگریزی جانتے ہیں" اسکے چہرے پر اداسی چھا گئی اور بڑے مغموم طریقے پر سر ہلا کر اس نے کہا "نہیں" اس کے بعد اس نے ہاتھ ہلا ہلا کر طرح طرح کے اشاروں سے میری مدد فرمانی چاہی مگر میں نے کچھ سمجھنے کی کوشش کئے بغیر شکریہ ادا کیا اور کان لپیٹ کر راہگیروں کے ہجوم میں ایک طرف چل دیا۔

مجھے خیال آیا کہ کلکتہ میں ملک ملک کے سیاح کالی گھاٹ سے گیندے کی مالا پہنے ماتھے پر ٹیکا لگا کر آرٹ اسکول کے سامنے جادو گھر دیکھنے آیا کرتے تھے اور ہم لوگ ان کی ہیئت کو دیکھ دیکھ کر ہنسا کرتے تھے مجھے یوں لگا جیسے لوگ اسی طرح مجھ پر ہنس رہے ہوں سخت پشیمان ہوا کہ کہیں نہ فرانسیسی زبان سیکھ لی سیکھ لیتا تو آج یہ حالت نہ ہوتی مگر اس کے باہر بھی کچھ تو وہ زبان کام آتی۔



اب نہ جانے کہاں کہاں مارے مارے پھرتا بڑے بڑے تصویروں کی گیلری میں البتہ چند لمحوں کے لئے زبان کی الجھن میرے دل سے محو ہو جاتی مگر جونہی گیلری سے نکلتا اسی مسئلے کا سامنا ہوتا۔ ابھی تک معاملہ صرف راستہ پوچھنے تک ہی محدود تھا، کھانے کے لئے ریستوران میں کیا ہوگا؟ یہ خیال آتے ہی دم نکل گیا۔

ایک طریقہ ڈھونڈ نکالا۔ دور سے پہلے ریستوران کا اندازہ اور وہاں کے لوگوں کا مزاج بھانپ لیتا اور جب ریستوران منتخب کر لیتا تو پھر بھی حتی الامکان ریستوران کے اندر نہ جاتا باہر برآمدے ہی میں جہاں لوگ کم ہوتے کسی خالی میز کے قریب رک جاتا اور چپکے سے وہاں بیٹھ رہتا ہوٹل کے اندر جاتا تو لوگ میرے بادامی رنگ اور ہاتھ کے اشاروں سے مدعائے دل بیان کرنے کے طریقے پر حیران ہوتے۔ ایک دن ایسے ہی ایک ہوٹل کے برآمدے میں ایک میز خالی دیکھ کر بیٹھ گیا، کوئی ویٹر نظر نہ آتا تھا اور کسی کو بلانے کی مجھے تاب نہ تھی۔ اتنے میں دیکھا کہ سامنے کی میز پر ایک صاحب بھنی ہوئی مچھلی سے محظوظ ہو رہے ہیں۔ اب مجھ سے کسی طرح نہ رہا گیا، وطن کی یاد نے اور بھی تڑپایا۔ سوچا ویٹر کے آتے ہی اُسے سامنے کی طرف اشارہ کر کے سمجھا دوں گا کہ وہی لے آؤ۔ وہی کہ جس کو آنکھیں ترس گئی تھیں۔ مگر ویٹر تھا کہ آنے کا نام ہی نہ لیتا تھا۔ وہ صاحب کھا پی، میرے سامنے سے چلے گئے اور مچھلی کی خالی

پلیٹ میرا منہ چڑاتی رہی، ایک ویٹر آیا بھی تو خالی برتن اٹھا کر میری طرف توجہ کئے بغیر غائب ہو گیا۔ دس پندرہ منٹ اور گذر گئے تو ایک ویٹر آیا اور میرے سامنے آ کر کچھ انداز سے ٹھیر گیا جیسے کہہ رہا ہو "جلدی کہو، کیا چاہتے ہو، اندر بھی بہت سے لوگ ہیں"۔ میں نے ہاتھ اور انگلیوں کے اشاروں سے بھنی ہوئی مچھلیاں بنا بنا کر اُسے سمجھانا چاہا اور جب اُس کی کچھ سمجھ میں نہ آیا تو سامنے والی میز کی طرف ہاتھ کر کے چلایا "موسیو، وہی، وہی"۔

ویٹر میرا منہ دیکھنے لگا، کچھ بولا بھی مگر میری سمجھ میں خاک نہ آیا۔ بڑی جانفشانی کے باوجود بھی جب یہ مشکل حل ہوتی نظر نہ آئی تو میں نے سوچا دفع بھی کرو مگر ویٹر کہاں چھوڑنے والا تھا، اُسے شاید خیال ہوا کہ اگر مجھے کھانے کو نہ ملا تو میرا دل ٹوٹ جائیگا۔ اس نے اشارہ سے مجھے ساتھ چلنے کو کہا۔ میں نے دل ہی دل میں کہا کہ یہ سب مصیبت چنگڑی کی چاٹ کی وجہ سے نازل ہوئی، بچپن میں جب بہت بگڑ جاتے تو اماں خوب سمجھا بجھا کے سمجھتیں کہ وہاں جا کر انڈا نہ مانگنا، کیلا نہ کھانا مگر یہ نہ بتایا تھا کہ بھوکے ہو کر چنگڑی نہ مانگ بیٹھنا، مجبوراً چلا ویٹر کے پیچھے پیچھے، وہ مجھے لوگوں کے بیچ میں سے نکالتا ہوا باورچی خانہ میں لے گیا۔

باورچی خانہ دیکھ کر آنکھیں کھل گئیں، صاف ستھرا اور کشادہ، عورتیں کام کر رہی تھیں، ویٹر ان سے کچھ کہہ رہا تھا اور میں مجرموں کی طرح اس کے پیچھے کھڑا تھا۔ ویٹر کی بات سن کر عورتیں ہنسنے لگیں، پھر بڑی باقاعدگی سے انہوں نے ایک ایک کر کے مجھے مختلف چیزیں دکھانا شروع کیں اور میں بھی نہایت آرام سے نہیں نہیں کہتا گیا۔

وہ پریشان ہو گئے اور ان کی پریشانی دیکھ کر مجھے سخت شرم آئی، میں نے کئی دفعہ جانا چاہا، مگر وہ جانے بھی تو نہ دیتے تھے جیسے فیصلہ کر چکے ہوں کہ میرے دل کی بات مان کر چھوڑیں گے۔

اتنے میں چنگڑی مچھلی نظر آئی تو میں خوشی کے مارے بے اختیار چلا اُٹھا، انہیں کسی قدر حیرت ہوئی مگر پھر وہ بھی خوب ہنسے کہ اتنی سی بات کے لئے اتنا ہنگامہ ہوا، انہیں کیا معلوم کہ اس اتنی سی چیز میں میرے لئے کتنی مسرتیں تھیں۔

سر جھکا کر میں نے ان سب کا شکریہ ادا کیا۔

ویٹر کے ساتھ اپنی میز پر پہنچ کر مجھے یوں لگا جیسے ریسٹورانٹ کے سب

لوگ مجھ پر ہنس رہے ہوں اور شاید کئی دن تک ایک بادامی رنگ کے آدمی کا یہ قصہ سنا کر ہنستے رہیں گے۔

بیٹھے بیٹھے مجھے خیال آیا کہ باورچی خانے میں عورتیں بھی دل کھول کر ہنس رہی ہوں گی۔ اتنے میں ویٹر پلیٹ میں جگر سی مچھلی کا بھاجا لیکر آیا اور مجھے یوں لگا جیسے چگر دی مچھلی بھی ہنس رہی ہو۔

کھانا جا رہا تھا مگر دل کو یہ خیال ستا رہا تھا کہ رات کے کھانے کا کیا ہوگا؟ اتنے میں ایک ایسی بات ذہن میں آئی جیسے چودہ طبق روشن ہو گئے۔

میں نے فیصلہ کیا کہ رات کا کھانا بھی اسی ہوٹل میں کھاؤں گا اور لوگوں کے بیچ میں بیٹھ کر۔

رات کے وقت میں جا کر بیٹھا ہی تھا کہ ویٹر میرے پاس آیا۔ دبی دبی ہنسی اس کے ہونٹوں پر کھیل رہی تھی۔

اس کے آتے ہی میں نے اسے پنسل دکھائی اور پھر میز پر سے اپنا سکیچ پیڈ اٹھایا۔

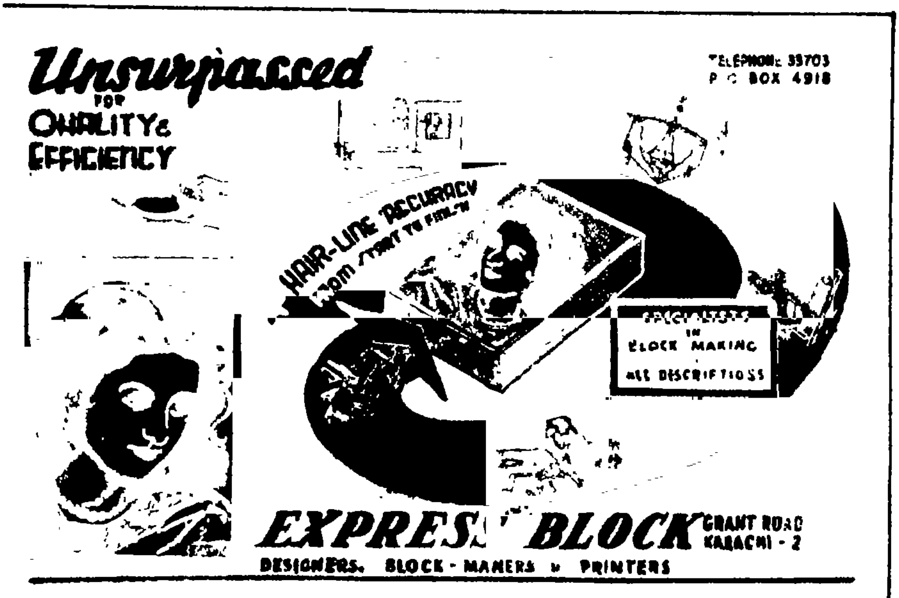
سادے کاغذ پر ایک طرف میں نے ابلے اور دوسری طرف بھونے کی تصویر بنائی۔ اور پھر ایک بڑی سی گائے کی تصویر بنا دی۔ ویٹر کی آسانی کے لئے میں نے گائے کی پچھلی ٹانگ کی ران کو تیر کے نشان سے اس تصویر سے ملایا جو چیزوں کو پالنے کے لئے بنائی تھی۔ طالب علمی کے زمانے میں میں نے گائے کی جو بنائی تھیں، کھیتوں میں بھاگتی ہوئی۔ گھر میں بندھی ہوئی۔ کھلیان سے چھڑا کر بھاگتی ہوئی۔ مگر ویٹر کے لئے جو گائے میں نے بنائی۔ اس کی بات اس کے بعد ایک ایک کر کے انڈا، مرغی، کوا بھی اور جس چیز کی تھی۔ اس کی تصویر بنا تا گیا۔ میں نے سر اٹھا کر ویٹر کی طرف نہ دیکھا۔ طرف طرح طرح کی باتیں ہو رہی تھیں۔ لوگ کرسیاں کھینچ کھینچ کر میز آ رہے تھے، تھوڑی ہی دیر میں میرے گرد جمگھٹا سا لگ گیا۔ سب دیکھ رہے تھے۔

میں نے مسکرا کر ان کی طرف دیکھا اور کہا "پاکستان شائقین میں کسی نے صاف انگریزی میں کہا " معاف کیجئے۔ کیا میں یہاں بیٹھ جاؤں" یہ کہہ کر انہوں نے سب لوگوں سے میرا تعارف کرایا اور بڑی شفقت رہے۔

کچھ دیر کے بعد ویٹر میرا کھانا لے آیا۔ کھانا منگوانے کے لئے میں نے بنائی تھیں، وہ لوگ ادھر ادھر لئے پھر رہے تھے۔

جن صاحب نے دوسروں سے میرا تعارف کرایا تھا انہوں

(باقی صفحہ ۱۲۹ پر)





عکس : رضا عابدی

پایان تابستان [illegible]

غزل

جگر مرادآبادی

غنچہ و گل نہیں، کہ خار نہیں
کیا نہیں ہے مگر بہار نہیں

اب کوئی تیر دل کے پار نہیں
اب مجھے زندگی سے پیار نہیں

اب غمِ عشق نغمہ بار نہیں
اب کوئی شعر شاہکار نہیں

اب کوئی روح کی پکار نہیں
اب کسی کا بھی انتظار نہیں

اب کوئی غم نہیں طرب افزا
اب کوئی درد خوشگوار نہیں

اب تری یاد بھی گریزاں ہے
اب تصور بھی ہم کنار نہیں

دلبری شیوۂ بتاں نہ رہی
عاشقی حشر در کنار نہیں

نگہِ التفات، ایک طرف
کوئی ظالم ستم شعار نہیں

زخم سینے پہ آج بھی ہیں مگر
ناخنِ عشق تازہ کار نہیں

•

عقل، اک تجربہ ہے پیار نہیں
عشق جب تک بروئے کار نہیں

ہیں تو دیوانۂ بہار بہت
کوئی دیوانۂ بہار نہیں

زندگی ہے تمام فکر و عمل
زندگی وقت کا شمار نہیں

حسن رہتا نہ اس قدر دلکش
خیر گذری کہ پائدار نہیں

دل کی کلیاں نہ جس سے کھل جائیں
اور کچھ ہو تو ہو بہار نہیں

عشق اپنا پیام خود ہے جگر
عشق مرہونِ اشتہار نہیں

غزل

فراق گورکھپوری

دل وہ گھر خیر سے شرِ دست و گریباں ہی یہاں
نو بنو عالمِ ایجاد کا امکاں ہے یہاں

بے جنوں ہاتھ نہ آیا سرِ دامن تیرا
آج معلوم ہوا میرا گریباں ہے یہاں

خاص انداز سے شامل ہے نظر باتوں میں
لے اُڑے گا وہ فسونِ لبِ جاناں ہے یہاں

درد یوں دل میں پکارا ترے بیماروں کے
ڈھونڈتے کیا ہو ہر اک درد کا درماں ہے یہاں

رہ گیا رنگِ پریدہ کا فسانہ باقی
ہم بھی سوچ رہے تھے کہ گلستاں ہے یہاں

دل نے کس عالمِ ہُو میں مجھے لا کر چھوڑا
کوئی زنداں نہ گلستاں نہ بیاباں ہے یہاں

دم بخود ہے لبِ اعجاز مرے بالیں پر
نگہِ ناز نوازش پہ پشیماں ہے یہاں

کبھی فرصت ہو تو کر سیرِ دیارِ دل بھی
عشق ہی عشق ہے اب، کفر نہ ایماں ہے یہاں

میں نے ہر روز کو اک دورِ جدائی پایا
کوئی بھی رات ہو اے دل شبِ ہجراں ہے یہاں

دیکھنا جلوۂ رخ کا ترے مشکل نکلا
آنکھ صاحب نظراں کی بھی تو حیراں ہے یہاں

سر بسر ایک ہے عالم تری زیبائی کا
ہر بنِ مو سے عیاں شوخیٔ مژگاں ہے یہاں

دیکھ لی آج سرِ بزم تری گردشِ چشم
جس کو کہتا ہے جہاں گردشِ دوراں ہے یہاں

پیچ در پیچ ہیں باتیں ترے سودائی کی
خم بہ خم زلفِ مسلسل بھی پریشاں ہے یہاں

کیوں کہو صرف عناصر سے بنا ہے عالم
دل کو بھی دیکھ چلو عالمِ امکاں ہے یہاں

خود ہی جلتے ہیں تو کیوں شمع کو پگھلائیں فراق
دل کے داغوں ہی سے اک طرفہ چراغاں ہے یہاں

غزل

حفیظ ہوشیارپوری

کہاں کا عشق کہ اب رسم و راہ بھی تو نہیں — جو روز تھی وہ نظر گاہ گاہ بھی تو نہیں

کہاں کی جنبشِ لب، اتنی احتیاط ہے اب — کہ ترجمانِ محبّت نگاہ بھی تو نہیں

عذابِ جاں ہی سہی عشق لیکن اسکے بغیر — غمِ زمانہ سے کوئی پناہ بھی تو نہیں

وہ ایک راہ جو چھوٹی تو پھر کہاں جائیں — نظر کے سامنے اب کوئی راہ بھی تو نہیں

اگر ہے جرم محبت میں سانس لینا بھی — تو دیکھ لو کہ مرے لب پہ آہ بھی تو نہیں

تمیزِ روز و شب و صبح و شام ہجر میں کیا — نظر میں انجم و خورشید و ماہ بھی تو نہیں

گر ابتدائے محبت ہی بس کی بات نہ تھی — تو اہلِ عشق پہ لازم نباہ بھی تو نہیں

قصور وار وہ بدلی ہوئی نگاہ سہی — خود اپنے دل میں وہ پہلی سی چاہ بھی تو نہیں

وفا کا ذکر کریں تو کسے یقیں آئے — ترے سوا کوئی اس کا گواہ بھی تو نہیں

بہر قدم کوئی جیسے پکارتا ہے مجھے — یہ راہ ترکِ محبّت کی راہ بھی تو نہیں

ہزار شکوہ ہے بیدادِ رائیگاں سے نہیں — کہ اس کے بعد کوئی دادخواہ بھی تو نہیں

حفیظ ترکِ طلب کس قدر مکمّل ہے

اب اُن سے مل کے پریشاں نگاہ بھی تو نہیں

غزل

سراج الدین ظفر

پھر زاویے نئے سرِ میخانہ کھینچیے
تحریرِ بحث پر خطِ پیمانہ کھینچیے

دینا ہے آج معرکۂ شب کو اور طول
شاہد کو زلف سے سرِ میخانہ کھینچیے

گردش میں آسماں ہے مسافر ہے اپنے گرد
شب کو حصارِ شاہد و پیمانہ کھینچیے

اس زلف کی ہو بات تو تشریح کے لیے
روحِ ہمہ حقیقت و افسانہ کھینچیے

پھر لے اڑا ہے شوق سوئے راہِ ناصواب
اب کیا عنانِ مرکبِ شاہانہ کھینچیے

دل میں خیالِ زہ اٹھائے جو سر کبھی
اس پر کمانِ ابروئے جانانہ کھینچیے

ملتی نہ ہو طوائفِ رندانہ کو جو اوٹ
آگے قناتِ سبزۂ بیگانہ کھینچیے

جی چاہتا ہے شب کو کسی شمع رو کے ساتھ
تصویرِ بیقراریٔ پروانہ کھینچیے

گرتے ہیں ماہ رو ثمرِ پختہ کی طرح
آغوش میں اگر انہیں رندانہ کھینچیے

آرامِ جاں ہے ذکرِ غزالاں اسی طرف
دامانِ ہر روایت و افسانہ کھینچیے

یہ شہر بھی ہے سلطنتِ بختِ برہمن
دل تک نشانِ سرحدِ بت خانہ کھینچیے

جس طرح بندِ غنچہ سے آویزشِ نسیم
اس طرح پردۂ رخِ جانانہ کھینچیے

یہ چیز بھی ہے درخورِ تحقیق و تجزیہ
گوتے سے اس قبا کو حکیمانہ کھینچیے

ہاں کچھ تو خیر مقدمِ خوبانِ رہگزار
اک آہِ سرد ہی پئے نذرانہ کھینچیے

ملتی نہ ہو شعورِ خبر سے اگر نجات
زنجیرِ قیصر بازوئے میخانہ کھینچیے

شامل نہ ہو جو شاہدِ میخانہ کی نظر
ہاتھ اپنا ظرفِ بادہ سے شاہانہ کھینچیے

دنبالہ ہائے چشمِ غزالاں ہیں مصحفی
اک خطِ رقص تا درِ میخانہ کھینچیے

پھر ذکر کیجیے مژہ ہائے دراز کا
شمشیر پھر پئے دلِ دیوانہ کھینچیے

خاکِ حرم ملے جو ذرا سی تو اس سے آج
قشقہ بیادِ دخترِ بت خانہ کھینچیے

اس انجمن میں ہم سے بنے اور کیا ظفر
اس کے سوا کہ نعرۂ مستانہ کھینچیے

غزل

شان الحق حقی

بڑے دوستی میں خسارے ہیں یارو
مگر کیا کریں دل کے مارے ہیں یارو

مہ و نجم رہے ماہ پارے ہیں یارو
قیامت کے سامان سارے ہیں یارو

جو اترے چلے آرہے ہیں زمیں پر
یہ کس آسماں کے ستارے ہیں یارو

کہاں تک یہ اپنے پرائے کا قصہ
سبھی غم ہمارے تمہارے ہیں یارو

جہاں کی جہاں پھر رہی ہیں نگاہیں
جہاں کے جہاں چھان مارے ہیں یارو

نگر سے نگر تک زمینوں کے سر پہ
یہی چاند سورج ستارے ہیں یارو

نگاہوں پہ دل کو بھروسا تھا کیا کیا
عجب قول ہستی سے ہارے ہیں یارو

کہاں چھوٹ سکتے ہیں غم زندگی کے
یہ غم زندگی سے بھی پیارے ہیں یارو

میسر کسے دل کے تاروں کو چھونا
بہت نغمہ گر اس میں ہارے ہیں یارو

غزل

یوسف ظفر

ترے نقوش مرے رخ پہ یوں ابھر آئے
کہ جیسے تو مجھے افسردہ دیکھ کر آئے

مرا وجود وہی منزل نہ ہو تری اے دوست!
پلٹ کے راہ سے کیوں میرے ہمسفر آئے

ہنسے ہیں تیرے لئے تیرے ہجر کے مارے
کہ کچھ تو کہنے کو ہو اب جو آنکھ بھر آئے

روش روش ہیں گلوں کی طرح نقوشِ قدم
وہ لوگ کون تھے جو ہم سے پیشتر آئے

تری وفا کے لئے جان ہے عزیز کسے؟
ہم آج مرتے ہیں گر کچھ ہمیں نظر آئے

نثار عمرِ شکستہ دلی و محرومی!
جو مسکرا کے گئے تھے بچشمِ تر آئے

ترے خیال پہ الزام تو نہیں لیکن
کئی خیال مرے دل میں رات بھر آئے

تجھے نہ دیکھ کے وہ دل میں کیا نہیں کہتے
فریبِ زیست میں جو تجھ کو دیکھ کر آئے

دل و نظر کو چھپاتا ہوں اہلِ فن سے ظفر
جو میری بات کو سمجھے وہ نکتہ ور آئے

غزل

قتیل شفائی

آئینہ دارِ جمالِ سحر آثار بنے
ہم تجھے دیکھ کے خود مطلعِ انوار بنے

تو وہ جھونکا ہے کہ پھولوں کی مہک ہے جس میں
تو گذر جائے جدھر سے وہیں گلزار بنے

کچھ اُداسی بھی تو لازم ہے ترے لب کیلئے
یہ کلی کھل کے نہ مرجھائے تو تلوار بنے

آبلہ پا ہوں مگر ہائے ری ثابت قدمی!
کوئی منزل ہی مری راہ میں دیوار بنے

مجھ سے کترا کے ترا حسن ہے پھیکا پھیکا
تو مرے ہاتھ جو آجائے تو شہکار بنے

کفر و ایماں کی کوئی بات نہیں ہے اس میں
راس دنیا نہ جنہیں آئی وہ دیندار بنے

یہ بھی اِک طرفہ کرامت ہے ارے ملّاجو!
تم کنارا جسے کہہ دو وہی منجدھار بنے

جن کو پینے کا سلیقہ ہے وہ پیاسے ہیں قتیلؔ
جتنے کم ظرف تھے اس دور میں میخوار بنے

غزل

صفیہ شمیم

حُسن ہر چند بے پناہ بھی ہے
کچھ مگر شوخیٔ نگاہ بھی ہے

اے صبا رہگزارِ جاناں میں
کچھ نشانِ دلِ تباہ بھی ہے؟

کون مُنکر ہے حُسنِ دلکش کا
اپنی اپنی مگر نگاہ بھی ہے

لاکھ غم دِل شکن سہی لیکن
غم ہی سے دِل کو رسم و راہ بھی ہے

دیکھ، دُنیا بسانے والے دیکھ
ایک میرا دلِ تباہ بھی ہے

حسن یکتا ترا سہی، لیکن
شاملِ حُسن کچھ نگاہ بھی ہے

جلوۂ حسن ڈھونڈنے والو!
اعتبارِ دل و نگاہ بھی ہے

دل گریزاں بھی غم سے رہتا ہے
دل ہی اے عشق غم پناہ بھی ہے

صہبائے پاک

سُر سسّی کی ایک جھلک

شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ
مترجمہ: شہاب رفعت

جگ کو کیوں دُکھ اپنا بتائیں؟
پر کیونکر اس دُکھ کو چھپائیں؟
دل میں درد کی ٹیس اُٹھی ہے
اِ چاری سی لاچاری ہے!
عشق کے اپنے میخانے سے
میں نے بس دو گھونٹ لئے تھے
لیکن ہیں بیچ بیچ کے شعلے
بھڑ عشق کے انگاروں سے
میں تھی میٹھی نیند میں کھوئی
دل میں پریم کی بیل اُگی تھی
ڈالے ہیں کیا کیا گل بیتاں
کونپل کونپل کلیاں کلیاں
اَن دُکھ، غم دکھ جانتی تھی میں
لیکن اب وہ طور نہیں ہیں
ایسا درد نے آن لیا ہے
تڑپن، کلپن حد سے سوا ہے
جتنا لوٹوں درد کے مارے
کوئی دارو راس نہ آئے
میں نے نہ کی تھی پریت اس مارے
چاہ کو کر دے دل سے کنارے
آج مرے ہردے پر برسی
پریم کی اک برکھا مستانی
اے ساجن! من موہن آجا
دھیان سے کر اس جیو کی رکھشا

تھی بلوچوں میں کوئی بات بھلی
جبھی نیند میں ان کی یاد آئی
مرا غم ہے ویسے ہی تازہ
مرا تکیہ آنسوؤں سے بھیگا
ہاں ہاں مرے ہاتھوں پر اب بھی
ہے جاری اک اشکوں کی جھڑی
آ ساجن! مجھ کو یاد میں لا
اے سکھیو! ناش ہے جیو مرا
آنکھوں کو پل بھر خواب نہیں
پھر بھی وہ یونہی بے آب نہیں
افسردہ میں پر بے تاب ان میں
ہیں ساجن تیرے خواب ان میں
پچھم سے چلی آندھی
وہ زور وہ زنّاہٹ اس کی
یاں بر میں، نہیں کملی
سر پر نہیں چادر بھی
جاڑے نے زور دکھائے
اب جان ہی لے کر جائے
کیا اس کو جھیلیں گے
ہیں جن کے کھلے ڈیرے
اک چھوٹی سی کٹیا
اک لکڑی کا جالا
ٹھٹرا کر رہ جائے
جب باد کا جھکڑ آئے

کہے زلیخا

مولوی غلام رسول
مترجمہ اشہاب رفعت

مولوی غلام رسول کی "یوسف زلیخا" پنجابی کی بہترین منظومات میں شمار ہوتی ہے۔ ذیل میں اسکے ایک حصہ کا ترجمہ پیش کیا جاتا ہے۔ اس شاہکار کے علاوہ مولوی صاحب اپنی متعدد دیگر نظموں کے لئے مشہور ہیں۔ جن سے بے اختیار ٹینی سن کی "ان میموریم" یاد آتی ہے۔ —— مدیر

"آج ہے کیسا حال زلیخا؟" یوسف نے فرمایا
کہے زلیخا جو کہ لظاہر یوسف نے پایا

یوسف پوچھے کہو زلیخا، کیونکر وقت گھلایا
کہے زلیخا جیسے جیسے میں نے [illegible] بتایا

یوسف پوچھے کہو زلیخا کہاں گیا وہ جوبن
کہے زلیخا عشق میں تیرے کر دیا قربان تن من

یوسف پوچھے کہو زلیخا، کہاں گئیں وہ زلفیں
کہے زلیخا درد سے تیرے چھڑ کے آئیں گٹھریوں میں

یوسف پوچھے کہو زلیخا اور وہ لڑی دانتوں کی؟
کہے زلیخا تیری ہی مالا جپتے گھس کر ٹوٹی

یوسف پوچھے کہو زلیخا اور وہ قاتل آنکھیں
کہے زلیخا بہ گئیں ہو کر خون تری فرقت میں

یوسف پوچھے کہو زلیخا کھوئے کہاں وہ ناز
کہے زلیخا بچھڑے جب سے بھولے سب انداز

یوسف پوچھے کہو زلیخا، کیوں چھوڑیں وہ گھاتیں؟
کہے زلیخا عشق میں دل کو ہو گئیں سو سو ماتیں

یوسف پوچھے کہو زلیخا اور وہ شان تمہاری
کہے زلیخا چار ہی دن وہ رہ کر ہو گئی بھاری

یوسف پوچھے کہو زلیخا ہوش سدھارے کیونکر؟
کہے زلیخا کتنے پتھر آن کے ٹوٹے ان پر

یوسف پوچھے کہو زلیخا کیوں نہیں نور جبیں پر؟
کہے زلیخا چاند نہ چمکے صبح ہوئی جب سر پر

یوسف پوچھے کہو زلیخا، نین ترے کیوں روئیں؟
کہے زلیخا میرے رخ سے گزرے دکھوں کی جوئیں

یوسف پوچھے کیسے زلیخا کھوئے مال خزانے؟
کہے زلیخا نام پہ تیرے لوٹ لیا دنیا نے

یوسف پوچھے اجڑی زلیخا کیونکر عمارت عالی؟
کہے زلیخا ہو گئی خاک اب خود ہی عمارت والی

یوسف پوچھے کہو زلیخا کہاں ہے فرش حریری
کہے زلیخا ہجر پلنگ اور فرش مراد گیری

یوسف پوچھے کہو زلیخا، کہاں ہیں زیور تیرے
کہے زلیخا نام نہ ان کا لے تو سامنے میرے

یوسف پوچھے کہو زلیخا، کہاں ہیں تخت سنہری
کہے زلیخا لے گئے لوٹ کے نام پہ تیرے شہری

یوسف پوچھے کہو زلیخا، کہاں ہے دایہ مائی
کہے زلیخا نہ وہ میرے دیتی پھرے دہائی

یوسف پوچھے کہو زلیخا آج کہاں سرداری
کہے زلیخا درد نے تیرے لوٹ لی مایا ساری

یوسف پوچھے کہو زلیخا، مجھ پہ ستم کیوں ڈھایا
کہے زلیخا جو بھی کیا تھا سامنے میرے آیا

یوسف پوچھے کہو زلیخا، کیا مشکل پیش آئی
کہے زلیخا عشق نے تیرے من میں آگ لگائی

یوسف پوچھے کہو زلیخا، کیونکر یہ دن بیتے
کہے زلیخا دم دم یوسف زہر کے پیالے پیتے

یوسف پوچھے کہو زلیخا چین پھر آیا کیسے
کہے زلیخا تیرے دکھ پر سکھ کو قربان کر کے

یوسف پوچھے کہو زلیخا، کیونکر عمر گزاری؟
کہے زلیخا روئے بنا اک گھڑی نہ گزری واری!

ماہِ نو۔ کراچی۔ استقلال نمبر ۱۹۵۵ء

بلوچی

"لیلیٰ مجنوں"

(عوامی کہانی)

عاصمہ حسین

سہانا ہے کھجور پربت کا دامن
یہاں لے کے جاتی ہے ہر روز لیلیٰ
کہیں بیٹھ جاتی ہے چشمے کے تٹ پر
گرہ گیر زلفِ رسا کھولتی ہے
نکھرتی ہیں زلفیں کہ جیسے سویرے
وہاں سے وہ اٹھلاکے جانے کا جادو
وہ ننھا سا، بھورا سا، چوکور خیمہ
پھر اک آئنہ کسوتِ دلنشیں سے
وہ رہتے حسیں خلد کی حور جیسا
وہ آہستہ سرکانا خیمے کی چلمن
ادھر وہ بچارا، محبت کا مارا
بیاباں بیاباں بھٹکتا بھٹکتا
نکل آیا لیلیٰ کے خیمے کی جانب
محبت سے نظریں اٹھا کر جو دیکھا
"اگر تو مرے دیس کو چھوڑ جائے
کئی اونٹ مضبوط اور گھوڑیاں بھی"
یہ سن کر کہا اس صنم سے مجنوں نے
مجھے کیا تری تیز پا گھوڑیوں سے
نہ چھوڑوں گا ہرگز ترا دیس پیارا
ہوئی سخت برہم یہ الفاظ سن کر
کہا اس کی ماں نے غضبناک ہو کر
فریبی ہے یہ، آ اسے آزمائیں
ہوئی جب سحر، خادمہ حسبِ ایما
غٹا غٹ اسے پی گیا ہے محابا
مجھے تو نے سمجھا ہے لسّی کا پیالہ

حسین بادلوں کا دل افروز مسکن
وہ مٹی کی پیاری سی، نازک سی ٹھلیا
سراپ شیریں، خنک اور معطر
اور اس میں وہ چشمے کا رس گھولتی ہے
چھلکتے ہیں بادل گھنیرے گھنیرے
بھرا جال ہیں اک زمانے کا جادو
اٹھاتی ہے اس سے جٹائی کا پردہ
اچکتی ہے وہ اپنے دستِ حسیں سے
چمکتا ہوا شعلۂ طور جیسا
وہ بھرپور چاند اور وہ چت چور چتون
مجنوں جو کہ تھا دل کے ہاتھوں سے ہارا
پہاڑوں سے سر کو پٹکتا پٹکتا
محبت کے پُر کیف کعبے کی جانب
پکارا اٹھی خیمے سے وہ حور لیلیٰ
تو وعدہ ہے میرا کہ بخشوں گی تحفے
کہ کانوں کی نوکیں ہیں جن کی نکیلی"
"نہ لوں گا کبھی اونٹ مضبوط تیرے
کہ تیور رہوں جن کے غضب کے نکیلے
اسے چھوڑنے سے ہے مرنا گوارا"
پری چہرہ لیلیٰ، وہ حورِ سمن بر
"عجب طرح کا ہے یہ عاشق ستمگر!
اسے زہر کا ایک پیالہ پلائیں"
لئے پاس آئی مجنوں کے وہ پیالہ
کہا پھر کہ کہنا یہ جا کر کہ لیلیٰ
بس اک اور ایسا ہی جام اسے دکھا!

ہوئی سن کے برہم یہ بات اور لیلیٰ
ادھر اسکی ماں جو سراپا غضب تھی
پکڑ لایا صحرا سے جو ناگ کالا
لئے زہر سا تھا اور کالے کا بچھو بھی
مجنوں نے اسی طرح وہ زہر پی کر
مقدر ہے تیرا مرا ایک ہونا
یہ سن کر ہوئی اور بھی سوختہ لیلیٰ
دیا حکم اس نے یہ خیل و حشم کو
سحر کے ہاتھوں میں گردش اب ہوتی
مجنوں اپنی منزل پر آخر کو پہنچا
اسی وقت لیلیٰ نے کتے سے اپنے
خطاب اس کو پنے سے سمجھا مجنوں نے
سر دیا پہ آگ آئیں بیلیں ہی بیلیں
کئی روز بعد آئے پھر اونٹ والے
کوئی لکڑیاں کاٹنے کو سدھارا
لگا کاٹنے پیڑ کنڈے کا سوکھا
نہیں پیڑ سوکھا ہوا، میں مجنوں ہوں
یہ سن کر وہ انسان حیران و ششدر
بمشکل کہا اک عجب ماجرا ہے
یہ سن کر ہوئی اتنی بے تاب لیلیٰ
پرے پھینکی جوتی، چلی پا برہنہ
وہاں دوڑتی دوڑتی آن پہنچی
ہٹائیں شتابی سے چہرے سے بیلیں
یہ جاڑے سے مجھ کو بچاتی رہی ہیں
کرم ان کا مجھ سے زیادہ رہا ہے

تعجب سے دل میں کہا اس نے یہ کیا؟
بلا لائی اک ماہر کارِ جوگی
معاً اس کا زہر ہلاہل نکالا
وہی خادمہ دوسرے روز چل دی
کہا جا کے کہیو کہ اے یار دلبر!
کیا زہر نے عشق مغلوب میرا
ہوا آشفتہ ماں کا غضب اور بھڑکا
کہ اس مستقر سے ابھی کوچ کر دو
سوا تھی کہیں جن کی تمردوں سے جوتی
کہ شاید قبیلے انہیں پیاری لیلیٰ
کہیں کہہ دیا "دور رہو" برہمی سے
وہیں رہ گیا سوکھ کر کانٹا بن کے!
سرِ ا ٹھنٹھ جس پہ عقاب آ کے ٹھہریں
کئے نصب اس جانے ویراں پہ خیمے
لئے ہاتھ میں ایک تیکھا کلہاڑا
صدا آئی بس بس نہ یہ قہر فرما
محبت کی خاطر اسیرِ محن ہوں
روانہ ہوا سوئے لیلیٰ کے منہ سر
تمہارا مجنوں ٹھنٹھ بن کر کھڑا ہے
کہ کپڑے سے جو ہاتھ آئے جھٹ ان کو پہنا
دھڑکتے ہوئے دل کو ہاتھوں سے تھاما
جہاں عشق کی زندہ لاش اک گڑی تھی
"ہٹا نا نہ ان کو" کہا یہ مجنوں نے
مرا دھوپ سے سر چھپاتی رہی ہیں
یہ وہ بیلیں ہیں جن میں تو نے دفنا ہے

کشمیری

گلعذارِ شہرِ عاج

(عوامی رومان)

عاصمہ حسین

دور اک وادی ہے سیم و نور کی　　جیسے ہو تصویر کوہِ طور کی
چار جانب برف کا گویا ہے راج　　اس لئے کہتے ہیں اس کو "شہرِ عاج"
عاج کے تختے بچھے ہیں ہر طرف　　عاج کے ایواں بنے ہیں ہر طرف
عاج ہی کے راستے نرم و گداز　　محوِ حیرت جن سے ہوں آئینہ ساز
عاج ہی کا فرش تا حدِ نظر　　عاج سے آراستہ کوہ و کمر
راستے، گھر بار ہاتھی دانت کے　　برج اور مینار ہاتھی دانت کے
سیکڑوں طائر قطار اندر قطار　　جیسے ہاتھی دانت کے دُرّاج و سار
عاج ہی کی بلبلیں اور قمریاں　　عاج کی مانند بھیڑیں بکریاں
عاج کے پودے بھی تھے، اشجار بھی　　عاج کے تھے پھول بھی، اثمار بھی
عاج کی پھیلی ہوئی وہ کونپلیں　　جیسے پھلجھڑیاں ہوں باغ و راغ میں
چلتی پھرتی عاج ہی کی مورتیں　　جو نظر آئیں بشر کی صورتیں
یہ چمکتا، اُجلا اُجلا شہرِ عاج　　سر پہ تھا وادی کے اک چاندی کا تاج
عاج کی وہ گوری گوری ناریاں　　نور کی پھیلی ہوئی گلکاریاں
خلد زارِ روح و نظارہ تھا وہ　　حسن کا سرمست گہوارہ تھا وہ
وجد میں کہتے تھے لب بے اختیار　　حسن زار! اے حسن زار! اے حسن زار!
پُرفسوں پردہ دیارِ مرمریں　　اس میں تھی اک شاہزادی نازنیں
ایک زندہ عاج کی مورت تھی وہ　　سر سے پا تک صندلی مورت تھی وہ
ہاتھ عاج اور پاؤں عاج اور چہرہ عاج　　اس کے زانو عاج، اس کا سینہ عاج

نام اس کا فرِ ادا کا "گلعذار"
شاہدِ سیمیں بر و سیمیں کنار

ناگہاں شہزادۂ بے خانماں　　چلتے چلتے ہو گیا وارد وہاں
جس کا تھا اپنا ہی گویا یہ دیار　　اک جہانِ مطلعِ نور انتہار
اک ندی میں پانی پینے کو جھکا　　ہاتھ میں پانی کا اک کاسہ لیا
آئی پانی میں نظر ایسی پری　　سر بسر آئینۂ دارِ دلبری
اس نظارے سے وہ حیراں رہ گیا　　دست بر دل، شعلہ در جاں رہ گیا

جب نظر اوپر اٹھائی کچھ نہ تھا — وہ طلسمِ سیمیائی کچھ نہ تھا
پھر لیا کاسے میں پانی اک ذرا — پھر نظر آئی وہ شکلِ دلربا
سامنے دیکھا تو تھی اک نازنیں — اک پری وش، زہرۂ ناز آفریں

ہو گیا مدہوش شانِ جلوہ سے
جیسے اس میں سحر کے انداز تھے

ہوش میں آیا تو ساتھی سے کہا — میں نے دیکھا ایک طرفہ ماجرا
اک پری آئی نظر ندی کے پار — دیدہ و دل ہو گئے جس پر نثار
میں نے دیکھا تو وہ صورت موہنی — اک کنول سے اس نے فوراً ڈھانپ لی
دیکھتا تھا میں تو مسکاتے ہوئے — عاج کی ڈبیا نکالی جیب سے
دور سے ڈبیا کو دکھلایا مجھے — نازکے تیروں سے برمایا مجھے
تب سے میں سرگشتہ و مبہوت ہوں — ہو نہ ہو اس میں تھا اندازِ فسوں
ہو نہ جب تک اس پری وش سے وصال — ہے سکونِ دل مرے حق میں محال
سن کے ساتھی نے کہا تھا ابنِ وزیر — یوں کہا ہو گی یہ حورِ بے نظیر
شاہزادی گلعذارِ شہرِ عاج — حسنِ عالم جس کو دیتا ہے خراج
کامیابی ہو گی کوشش سے نصیب — فتح و نصرت کد و کاوش سے نصیب
مدتوں شہزادہ سرگرداں رہا — دربدر کی ٹھوکریں کھایا کیا
پر اسے مل کر رہی وہ گلعذار — اپنے کاشانے میں لوٹا کامگار

آج بھی موجود شہرِ عاج ہے
جو کہ خوبی میں جہاں کا تاج ہے

وہ بناتِ خویش ہے اک گلعذار — حسن میں چشم و چراغ روزگار
اور اک شہزادۂ بے خانماں — بے سر و سامان و بے تاب و تواں
دل میں رکھتا ہے تمنائے وصال — کھینچتا ہے اس کو افسونِ جمال
ہے مسلسل، بے محابا گرمِ کار — شعلہ زن سینے میں شوقِ گلعذار
گرچہ ہے رستے میں سو سنگِ گراں — یہ تگاپو ہو گی آخر کامراں
امتحاں کے مرحلے دشوار ہیں — دشت رستے میں بہت پُر خار ہیں
اس کو ملنی ہے مرادِ انجامِ کار — منقلب ہو گی ہوائے روزگار

کامیاب و کامراں ہو جائے گا
چشمۂ عشرت رواں ہو جائے گا

پشتو رومان

شمروز غزالہ

احمد فراز

دور ان سُرمئی پہاڑوں سے
کہساروں کی سرحدوں سے پرے
ایک سنسان سا خرابہ ہے
جس کی پھیلی ہوئی خموشی میں
جب کبھی چاندنی بکھرتی ہے
گھنگروؤں کی دبی دبی آواز
ایک نغمے کے روپ میں ڈھل کر
دفعتاً چیخ چیخ اٹھتی ہے

(گھنگروؤں کی چھنک کے ساتھ
پس منظر سے آواز ابھرتی ہے)

آواز ۔ پریت کے دکھ اپنا کر ہم نے
کیا کھویا؟ —— کیا پایا؟

داستان گو ۔ صبح تک یہ اداس اداس کھنک
رات کی دھڑکنوں میں رہتی ہے
اور پہلی شعاع مہر کے ساتھ
پھر وہی سوگوار سناٹے
اس خرابے پہ پھیل جاتے ہیں

—

لوگ کہتے ہیں اک زمانہ ہوا
وہ زمانہ جو اب فسانہ ہوا
پہلے یاں مختصر سی بستی تھی
اور بستی کے آس پاس کہیں
چیڑ کے سربلند پیڑوں کا
سخت گنجان ایک جنگل تھا

اسی جنگل سے کچھ پرے ہٹ کر
تنگ و تاریک جھونپڑے تھے جہاں
چند خانہ بدوش رہتے تھے
یہی خانہ بدوش لوگ کہ جو
منقسم تھے کئی قبیلوں میں
صبح ہوتے ہی چھوڑ کر بستی
اپنے سرداروں کی اعانت میں
پاس کے شہر میں نکل جاتے
اور وہاں رقص و نغمہ و نے سے
اپنے فن کا مظاہرہ کرتے
جس کے بدلے میں کچھ تماشائی
کچھ نہ کچھ حسب حال دے دیتے

—

کورس : پلک جھپک کا کھیل
یہ دنیا
پلک جھپک کا کھیل
پل پل بدلے رنگ زمانہ پل پل بدلے راگ
تو بھی میٹھی نیند کے ماتے اب سپنوں سے جاگ

جیون کے دکھ جھیل

یہ دنیا
پلک جھپک کا کھیل
یہ جگ اور اس جگ کے دھندے دو گھڑیوں کے میلے
تو بھی اس بازار میں ہو کر کچھ دے دے کچھ لے لے

پانی آگ کا میل

یہ دنیا
پلک جھپک کا کھیل
یاں بس بکے بے انت بیاسے گر امرت کے کچھ پیالے
من میں جو کچھ آئے پی لے سوکھے ہونٹوں والے
بس میں رس کو انڈیل

یہ دنیا
پلک جھپک کا کھیل

اس طرح شہر کے گلی کوچے
صبح سے شام کے اندھیرے تک
مست نغموں سے گونجتے رہتے
اور خورشید کے غروب کے ساتھ
ان قبیلوں کے ساتھ نغمے بھی
جنگلوں کی طرف پلٹ جاتے
ان میں ایسا بھی اک قبیلہ تھا
جس کا سردار "داور" نامی
دن کو شہروں میں کھیل دکھلاتا
اور شب کے گھنے اندھیروں میں
ڈال دیتا کسی جگہ ڈاکہ
پھر مقدر سے ہاتھ جو لگتا
اپنی بستی کی سمت لے اڑتا
ایک دن جبکہ داور ڈاکو
شہر سے نامراد جانے لگا
ایک کمسن مگر حسین بچی
راستے میں اسے دکھائی دی
موقع پاتے ہی لے اڑا اس کو
اپنے ڈیرے میں ساتھ لے آیا
جس جگہ اس کے دوسرے ساتھی
ڈیرے اس کے انتظار میں تھے

زبیل: آؤ سردار خیریت باشد!
آج کیوں اتنی دیر سے آئے
کیا کہیں کوئی واردات ہوئی

داور: ہاں زبیل اک عجیب بات ہوئی
کوئی معقول سلسلہ نہ ہوا
پھر بھی تم جانو اللہ مالک ہے

(بچی کے رونے کی آواز)

بڑھیا: ہائے میرا اِدھر تو دھیان نہ تھا
کون ہے یہ؟ کہاں سے لائے ہو؟
کس کی گودی اجاڑ آئے ہو؟
کس کا لختِ جگر چرایا ہے؟
کس کے گھر کا دیا بجھایا ہے؟
کس دکھی ماں کا جی جلایا ہے؟

داور: چُپ رہو بد زبان مکارہ!
اور بکواس کی اگر تو نے
کھینچ لوں گا زبان گدی سے

زبیل: چھوڑو، سردار! اس کو جانے دو
باؤلی ہو گئی ہے یہ عورت
کہو اس خوش نصیب بچی کو
کس طرح سے یہاں اٹھا لائے؟

داور: تمہیں معلوم ہے زبیل کہ میں
ایک مدت سے اس تلاش میں تھا
کہ کوئی خوش جمال لڑکی ہو
جس کو میں فنِ رقص و نغمہ میں
ایسا یکتائے روزگار کروں
جس کے فن و جمال کے چرچے
صاف و شفاف چاندنی کی طرح
شہر در شہر پھیلتے جائیں
جس کے بدلے میں ڈھیر دولت کے
میری ان محنتوں کا پھل ہونگے

زبیل: یہ تو سب ٹھیک ہے مگر سردار

اتنی کمسن جمیل بچی کو
کون اِن دقتوں میں پالے گا؟

داورس: یہی عورت، نمک حرام کنیز

زبیل: اور ہاں اس کا نام کیا ہوگا!

داورس: دیکھو اس ننھی مُنی گڑیا کی
کس قدر پیاری پیاری آنکھیں ہیں
جس طرح دشت کے غزالوں کی

زبیل: ٹھیک ہے! نام ــــ میں نے سوچ لیا

داورس: کیا؟

زبیل: غزالہ

داورس: بہت ہی خوب ہا!

اس طرح روز و شب گزرتے گئے
داورس کی کنیز عورت نے
یوں غزالہ کو پیار سے رکھا
جس طرح دختر حقیقی ہو
اور شب و روز کی ریاضت سے
نغمہ و رقص میں بھی طاق کیا
آخر کار وہ گھڑی آئی
داورس جس کے انتظار میں تھا
دس برس کی طویل عمر کے بعد
وہ غزالہ جو تھی کبھی کمسن
اب تھی چودہ برس کی دوشیزہ
نوجواں، کامیاب رقاصہ
جس کے حسن و جمال کی شہرت
چاندنی بن کے ہر طرف پھیلی
جس کی آواز کی کھنک جیسے
آبشاروں سے گیت بہتے ہوں
جس کے بھرپور ناچنے کی ادا
رقصِ طاؤس کو بھی شرمائے
داورس کی اُمید بر آئی
اب غزالہ کو ساتھ لئے
شہر میں دور دور تک جاتا
اور غزالہ کی دلنشیں آواز
رقص کے زاویوں پہ لہرا کر
لوٹ لیتی متاعِ اہلِ نظر

غزالہ:ـ میں روپ نگر کی شہزادی
اپنی جھولی پھیلاؤں
ناچوں گاؤں ــ وادی وادی
میں روپ نگر کی شہزادی
امرت سے بھرے یہ نین کنول یہ انگ انگ کا روپ
میں زلفوں کی چھاؤں بیچوں، بیچوں مکھڑے کی دھوپ
میں دور کھڑی مسکاؤں
پاس نہ آؤں ــــ بات بتاؤں
میں روپ نگر کی شہزادی
اس جھوٹے جگ میں کانچ کے ٹکڑے بکے پیار کا مول
تو بھی پگلے نینوں کے موتی مٹی میں مت رول
سب بھید تجھے بتلاؤں
خود نہ پاؤں ــــ میں آزادی
میں روپ نگر کی شہزادی

ایک دن جب قریب بستی میں
تھی غزالہ بشوقِ رقص کناں
اُن تماشائیوں کے حلقے میں
ایک خوش رنگ خوش لباس جواں
نام شہروز ــــ حُسن کا پیکر
ہو کے غرقِ جمالِ نغمہ و رقص
کھو گیا جلوۂ غزالہ میں
اور غزالہ وہ حسن کی دیوی
ایک لمحے کی مسکراہٹ میں
ہوگئی صیدِ الفتِ شہروز
آنکھوں آنکھوں میں کہہ گئے دونوں
زخم خوردہ دلوں کے افسانے

آخرش رقص جب تمام ہوا
اور ماحول کا فسوں ٹوٹا
سب تماشائیوں نے حسبِ بساط
کچھ نہ کچھ داورس کی نذر کیا
اور شمروز نے بہ عجز و نیاز
کسی حیلے کسی بہانے سے
سب سے چھپ کر بہ احتیاطِ تمام
مسکرا کر حسین غزالہ کو
اپنی نادر انگوٹھی دے ڈالی
اور غزالہ کی مست آنکھوں میں
شکریے کے پیام لہرائے

غزالہ: نام
شمروز: شمروز... اور
غزالہ: غزالہ مرا
شمروز: پھر ملوگی ؟
غزالہ: کہاں ؟
شمروز: جہاں بھی کہو
غزالہ: آج شب دور وہ کھنڈر ہیں جہاں
داستان گو: داورس کی حریص آنکھوں نے
جب یہ سارا معاملہ دیکھا
فرطِ وحشت سے تھرتھرا اٹھا
لیکن اس وقت مصلحت تھی یہی
کہ خموشی سے زخم سہہ جائے
اس کے مکار ذہن نے سوچا
کہ یہ دل پھینک نوجواں شمروز
کوئی ناداں امیر زادہ ہے
جو غزالہ کی مست آنکھوں پر
اپنا سب کچھ نثار کر دے گا
اس طرح مکر اور فریب کے ساتھ
لا اُبالی امیر زادے سے
خوب دولت وصول کی جائے

شام ہوتے ہی داورس ڈاکو
ساتھ لے کر حسین غزالہ کو
اپنی بستی کی سمت لوٹ گیا

(قدموں کی چاپ)

بڑھیا: کون ؟
داورس: اپنے ہیں
غزالہ: کوئی غیر نہیں
بڑھیا: آؤ بیٹی! میں انتظار میں تھی
داورس: دیکھو بڑھیا! سنبھالو یہ ساماں
اور کچھ ہے تو ناشتہ لاؤ
بڑھیا: اتنی جلدی بھی کیا ہے ستا لو
داورس: مجھے جانا بھی ہے
بڑھیا: کہاں
غزالہ: اس وقت ؟
داورس: شہر کچھ کام ہے ذرا جانم!
بڑھیا، جلدی سے ناشتہ لاؤ
بڑھیا: ابھی لاتی ہوں......
.... لو یہ کچھ پھل ہیں
داورس: اور غزالہ سنو
غزالہ: کہو بابا
داورس: آج شاید میں دیر سے لوٹوں
تم بھی کچھ تھک چکی ہو، سو جاؤ
اچھا لو میں چلا
غزالہ: خدا حافظ!

(داورس چلا جاتا ہے)

بڑھیا: پھیلتی جا رہی ہے تاریکی
تم بھی اب سو رہو مری بیٹی!
غزالہ: نہیں ماں نیند ابھی نہیں آئی
آج کچھ ڈس رہی ہے تنہائی
بڑھیا: دن کی آوارگی سے چور ہو تم
پھر بھی کس درجہ ناصبور ہو تم

(باقی آئندہ)

جدید جاپانی ادب

کیویا ڈوئی

پروفیسر کیویا ڈوئی ٹوکیو یونیورسٹی میں اردو کے استاد ہیں۔ ان کی صاف و شستہ تقریر کی طرح یہ تحریر بھی ان کی زباندانی کا آئینہ ہے۔ (ادارہ)

جدید جاپانی ادب شاہ میجی کے دور یعنی ۱۸۶۸ء سے شروع ہوتا ہے اس وقت تک جاپان میں نوابی حکومت تھی اور غیر ملکوں سے لین دین منع تھا ۱۸۶۸ء نوابی حکومت کا خاتمہ کر کے جب شاہ میجی خود حکومت کرنے لگے تو غیر ملکوں سے تجارتی تعلق پیدا کیا اور یورپ کا جدید تمدن سیکھنے لگے۔ جب یورپ کا راستہ کھل گیا تو وہاں کا ترقی یافتہ تمدن دیکھ کر جاپان کے لوگ حیران رہ گئے اور جلدی جلدی اسے سیکھنا شروع کر دیا۔ شاہ میجی ۴۵ برس تک تخت پر رہے۔ ہم ان کی حکومت کے زمانے کو دور میجی کہتے ہیں۔ میجی کے زمانے میں جاپان نے یورپ کی نئی نئی چیزیں قریب قریب سب سیکھ لیں۔ علم ادب کے بہت سے اصول بھی لے لئے گئے۔

شاہ میجی کے بعد شاہ تائی شو نے ۱۵ برس تک حکومت کی۔ اس زمانے کو دور تائی شو کہتے ہیں۔ (۱۹۱۲ء تا ۱۹۲۶ء) اس کے بعد سے آج تک شاہ شووا کا زمانہ ہے۔

اب شووا کا تیسواں سال ہے تائی شو اور شووا کے شروع کا زمانہ سب سے اچھا تھا اور اس میں تمدن اور علم ادب کو بڑی نشو ونما ہوئی۔ شووا کے ساتویں برس میں (۱۹۳۲ء) مانچوریہ میں لڑائی شروع ہوئی۔ ہم دور شووا پر زور دے کر جدید علم ادب کا کچھ حال دیکھنا چاہتے ہیں۔

ناول

عہد میجی کے ابتدائی ۱۰ برس یعنی ۱۸۶۸ء سے ۱۸۷۸ء تک کے زمانے میں اصل علم ادب کو نشو ونما نہیں ہوئی۔ علم ادب کو تعلیم دینے یا لوگوں کو اچھائی بتانے کا ذریعہ سمجھا جاتا تھا۔ اس وقت سیاسی تحریک بہت زور سے چل رہی تھی اس لئے لوگ اپنا خیال ظاہر کرنے کے لئے ناول لکھتے تھے۔

عہد میجی کے ۱۸ برس بعد یعنی ۱۸۸۵ء میں تسوبو اُچی شویو نے "روح ناول" نام کی کتاب شائع کی۔ یہ ناول لکھنے کا طریقہ سکھانے کی کتاب تھی۔ اس میں انہوں نے لکھا تھا کہ ناول کا مطلب اس زندگی کا اصلی حال اور لوگوں کے دل کی باتیں لکھنا ہے۔ اس وقت کے ناولوں کی طرح صرف قصہ سے اصلی ناول نہیں لکھا جا سکتا۔ ان میں ذاتیات اور نفسیات کے اصول ناول کا ضروری حصہ قرار دیئے تھے۔ اس وجہ سے اس طرز کو نفسیاتی کہہ سکتے ہیں اور دوسری طرف حالات اور واقعہ کے بموجب لکھنے کی وجہ سے اسے مشاہدہ پرستی کہا جا سکتا ہے۔ یہ طرز سائنٹفک اصول سے بھی ملتا ہے۔ اس کتاب کے بعد جاپانی ادب میں حقیقت پرستی کا زمانہ شروع ہوتا ہے۔

تسوبو اُچی نے اپنے اصولوں کے بموجب ایک ناول بنام "طلباء کا حال" لکھا تھا۔ لیکن اس ناول میں پرانے زمانے کے مذاقیہ ناول کا اثر غالب تھا۔

تسوبو اُچی کی تصنیف "روح ناول" سے ایک بڑا مصنف متاثر ہوا۔ وہ روسی علم و ادب کا شوقین فوتابا تے شی مے تھا جس نے ۱۸۸۷ء میں "بادل" نامی ناول لکھا۔ یہ اصلی معنی میں حقیقت پرستی کا سب سے پہلا ناول ہے۔ اس ناول میں ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ یہ ناول معمولی بول چال کی زبان میں تحریر ہوا ہے۔ اس زمانے میں فوتابا تے اور یاماداؤ میو مصنف تحریری زبان کو ترک کر کے بول چال کی زبان میں ناول لکھنے لگے۔ اس کا جدید ناول کی نشو ونما پر بہت بڑا اثر ہوا۔ "بادل" نامی ناول کے بعد کوئی ۱۲ برس تک کے زمانے کو کورو کا زمانہ کہتے ہیں کیونکہ اس زمانے میں کویو اور روہن سب سے اچھے مصنف سمجھے جاتے تھے۔ کویو اس زمانے کے بہت سے حقیقت پرستی کے مصنفوں میں سب سے بڑا مصنف تھا اور روہن ان لوگوں سے الگ، معیار نگاری کا مصنف تھا۔ اس کے بعد عہد میجی کے ۳۰ سے ۳۴ برس تک کا زمانہ (۱۸۹۷ء تا ۱۹۰۱ء) رومانیت کا زمانہ ہے۔ اس زمانے میں بہت سی نئی نئی نظمیں لکھی گئیں۔ اس وقت کے شعرا شیمازاکی توسون

میں یوسانو تیکسو کان رسالہ میو جیو نکالنے لگا اور رومانوی شاعری کو بہت ترقی ہوئی۔ اُسے دا بن نے مغربی نظموں کا ترجمہ کیا اور بہت اثر ڈالا ناول نگاری میں۔ ازو می کیو کا بہت مشہور ہے۔ ان کا ایک ناول کویا پہاڑ کا زاہد" ایک پجاری کی کہانی ہے۔ ایک پجاری ملک کے ہر حصہ میں گھومتا پھرتا تھا۔ ایک دن پہاڑ میں ایک چھوٹی سی جھونپڑی میں آرام کرنا چاہا۔ اس اس جھونپڑی میں ایک نہایت خوبصورت عورت تھی جس نے پجاری کی بہت خدمت کی۔ وہ عورت اتنی خوبصورت تھی کہ جنگل کے جانور بھی اس کے پاس آیا کرتے تھے۔ پجاری بھی فریفتہ ہو گیا اور اس جھونپڑی سے باہر نکلنا نہیں چاہتا تھا۔ لیکن پجاریوں کے فرائض کے احساس سے مجبور رہا اور ہمت کر کے اسی عورت سے رخصت ہو کر پہاڑ سے اتر آیا لیکن اس کا دل بے قرار تھا۔ راستہ میں پھر دل نے مجبور کیا کہ اس کے گھر واپس جائے لیکن ٹھیک اسی وقت ایک آدمی مل گیا جس نے بتایا کہ وہ عورت معمولی عورت نہیں ہے۔ جو جانور اس عورت کے پاس آتے ہیں وہ سب پہلے انسان تھے۔ اس عورت کی خوبصورتی میں پھنس کر ایسی صورت اختیار کرنی پڑی ہے۔ یہ سن کر پجاری حیران ہو گیا اور اس کے دل کی بے قراری بھی ختم ہو گئی اور وہ صحیح سلامت پہاڑ سے اتر آیا۔

عہد میجی کے آخری چھ برس یعنی ۱۹۰۶ء تا ۱۹۱۲ء فطرت نگاری کا زمانہ تھا۔ اس زمانہ کے مصنفوں میں تایاما کاتائی اور شیمازاکی توسون ماسامونے ہاکوچو، توکودا شیوسے اور مایاما سے کا مشہور رہیں۔

اس وقت ان مصنفوں کے گروہ سے الگ رہنے والے دو بڑے مصنف تھے۔ وہ ناتسومے سوسیکی اور موری اوگائی تھے۔ ناتسومے سوسیکی کا کہنا تھا کہ فطرت نگاری کے پرستار زندگی کے گندے پہلو پر زیادہ زور دیتے ہیں اور اپنی ہی باتیں لکھنے میں لگے رہتے فرصت نہیں ملتی۔ ہم لوگوں کو فرصت چاہئے۔ موری اوگائی تو ڈاکٹر تھے اور فوج میں علاج معالجہ کا کام کرتے کرتے سرجن جنرل ہو گئے تھے۔ لیکن ان کو ابتدا سے علم ادب کا بہت شوق تھا۔ شروع میں یورپ کے ناول اور نظموں کا ترجمہ کرتے رہے اور نکتہ چینی میں اپنا نظیر نہ رکھتے تھے۔ بعد کو تاریخی کہانیاں لکھنے لگے۔ ان کی تاریخی کہانیاں بہت اعلیٰ درجے کی ہیں۔

۱۹۱۰ء کے قریب ایک دوسرے اصول سے لکھنے والے دو مصنف پیدا ہوئے وہ ناگائی کافو اور تانی زاکی جن اچیرو تھے۔ جب فطرت نگاری کے پرستار زندگی کے خراب پہلو پر زور دیتے تھے تو اس کے خلاف وہ لوگ پیدا ہوئے۔ ایک خوبصورتی پر زیادہ زور دینے والا خوبی نگار تھا۔ دوسرا سیار نگار۔

ناگائی اور تانی زاکی خوبی نگار تھے۔ ناگائی کافو عہد توکوگاوا (۱۶۰۳ء تا ۱۸۶۷ء) کے تمدن کے پرستار تھے اور اپنے زمانے کی سب چیزوں کا مذاق اڑایا کرتے تھے لیکن ان کی تصنیفوں میں " بوکُو توکیدَن " (دریائے سومیدا کے مشرقی علاقہ کے حصے) "امریکہ کی کہانیاں" "فرانس کی کہانیاں" وغیرہ مشہور ہیں۔ انہوں نے رنڈیوں کی زندگی کی بہت سی کہانیاں لکھی ہیں۔ تانی زاکی غیر معمولی زندگی کے ناول لکھتے ہیں۔

یہ دونوں مصنف آج کل بھی بہت اچھا کام کر رہے ہیں۔ تانی زاکی نے جاپان کے سب سے پرانے اور مستند ناول گینجی مونوگاتاری کا ترجمہ آجکل کی زبان میں کیا ہے۔ اور کچھ تاریخی ناول بھی بہت اچھے لکھے ہیں۔ ناگائی اب بھی رنڈیوں کی زندگی کی کہانیاں لکھ رہے ہیں۔

عہد تائی شو یعنی ۱۹۱۲ء تا ۱۹۲۵ء علم ادب کے لحاظ سے بہت اچھا زمانہ تھا۔ یہ معیار نگاری اور ذہنی ادب کا زمانہ تھا۔ معیار نگاری کے مصنفین رسالہ "شیرا کابا" میں لکھا کرتے تھے۔ یہ لوگ شخصیت کا احترام کرتے تھے اور اس کی پوری نشو و نما کے لئے کوشش کرتے تھے۔ انہوں نے لوگوں کی انفرادی خصوصیت اور دنیا کی ہم آہنگی کو زندگی کا مقصد قرار دیا۔ زندگی کے روشن پہلو سے بحث کر کے محبت کی زندگی میں روحانی اطمینان حاصل کرنا چاہتے تھے۔ ان مصنفوں میں موشانو کوجی سانے آتسو، شیگا ناؤیا، آری شیما تاکے او، ساتومی تون وغیرہ ہیں۔

موشانوکوجی اب بھی بہت لکھتے ہیں۔ لڑائی کے بعد تصنیف شدہ ناولوں میں " استادشین ری " بہت مشہور ہے۔

۱۹۲۰ء کے قریب سے ذہنی ادب کے پرستار کثرت سے اپنی تصانیف چھپوانے لگے۔ یہ ایک طرح سے پرانے سب اصولوں کو ملا کر ایک نیا اصول بن گیا۔ اس کی خصوصیت یہ تھی کہ اصلی زندگی پر بحث کرتے وقت مصنف اپنی خاص رائے رکھتے تھے۔ اس طرز کے مصنفوں میں کیکوچی کان، اکوتاگاوا ریونوسوکے، کومے ماسااو، یاماموتو، یوزو وغیرہ ہیں۔

کیکوچی کان کا ڈرامہ "باپ واپس آیا" بہت مشہور ہے۔ اس کی کہانی یہ ہے کہ ایک گھر میں ماں، دو نوجوان لڑکے اور ایک لڑکی غریب لیکن بہت آرام سے رہتے ہیں۔ اس گھر میں باپ نہیں ہے۔ جب بچے چھوٹے تھے باپ بچوں کو چھوڑ کر کسی دوسری عورت کے ساتھ چلے گئے تھے۔ ایک رات کو وہی باپ واپس آتا ہے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اب اس کا حال اچھا نہیں ہے۔ وہ اس گھر میں پناہ مانگتا ہے۔

ماں چھوٹا بھائی اور بہن باپ کے خیر مقدم کرنے کو تیار ہیں لیکن بڑا بھائی کہتا کہ باپ کے چلے جانے کے بعد میں نے چپراسی بن کر پڑھنے کی کوشش کی اور اب سرکاری ملازم بن گیا۔ بہت دکھ اٹھا کر بھائی بہن کو پڑھایا۔ یہ کیوں ہوئے کہ ہم لوگوں کو چھوڑ کر گھر سے چلے گئے تھے۔ جب اس وقت کا دکھ یاد آتا ہے تو باپ کو اس گھر میں واپس آنے نہیں دے سکتا۔ باپ یہ سن کر مایوس ہو کر چلا جاتا ہے۔ لیکن باپ کے چلے جانے کے بعد بڑا بھائی بھی گھبرا جاتا ہے اور چھوٹے بھائی کے ساتھ باپ کو ڈھونڈنے جاتا ہے۔

جنگ کا زمانہ

جنگ شروع ہوتے ہی کمیونزم پر دباؤ پڑا اور بہت سے لوگ آسانی سے اپنا اصول چھوڑ کر "فن برائے فن" والوں میں شامل ہو گئے۔ لیکن کچھ لوگ اپنا اصول چھوڑنے میں تامل کرتے تھے اور اس مسئلہ پر ناول لکھتے تھے۔ ان مصنفوں میں شیما کی کین ساکو نامی مصنف بہت مشہور ہیں۔ ان کا ناول "زندگی کی کھوج" نے اس زمانے کے نوجوانوں پر بڑا اثر ڈالا۔

اس زمانہ میں نہ صرف کمیونسٹ بلکہ دوسرے اصول کے مصنفوں پر بھی دباؤ بڑھتا گیا۔ ان مصنفوں کے لئے انسان دوست ادب کے سوا کوئی جائے پناہ نہ تھی۔ اس زمانے میں بے قراری کی زندگی میں کچھ نہ کچھ امید دکھانے والے مصنف پیدا ہوئے۔ ان میں اشی کاوا تاتسوزو، ہنیوا فومیو وغیرہ تھے۔ لیکن آخر میں ان دونوں پر بھی دباؤ پڑنے لگا اور سب کے سب مصنفوں کو لڑائی میں مدد کرنی پڑی۔ بہت سے مصنفوں کو فوج میں بھرتی ہو کر میدانِ جنگ میں جانا پڑا کسی کسی کو میدانِ جنگ کے باشندوں کو سمجھانے کا کام سپرد کیا گیا۔ بعض لوگ لڑائی کے حالات لکھنے لگے۔ میدانِ جنگ کے تجربہ سے لکھے گئے ناول یا رپورٹ میں ہینو آسی ھے کا "گیہوں اور سپاہی"، اشی کاوا تاتسوزو کا "زندہ سپاہی" اور ہنیوا فومیو کا "جنگ سمندر" مشہور ہیں۔

جنگِ ثانی کے ختم کے بعد پرانے زمانے کے بڑے بڑے مصنف جو لڑائی میں مدد دینے کی وجہ سے اپنے کلام چھپوا نہ سکتے تھے بہت شوق سے لکھنے لگے۔ اوشیے ناگائی کافو، تانی زاکی جن اچیرو، موشانوکوجی سانے آتسو وغیرہ نے بہت اچھی تصانیف لکھیں۔ ان کے بارے میں پہلے لکھ چکا ہوں۔ ان میں تانی زاکی کے ناول ساسامے یوکی اور شیو شیو شیگے موتو نو ہا ہا بہت مشہور ہیں۔

وہ مصنف جو لڑائی کے زمانے میں مجبوراً فوج کا کام کرتے تھے بھی بہت سے ناول لکھ رہے ہیں۔ ان میں اِشی کاوا تاتسوزو، ہنیوا فومیو، اکوری ادا، ساکا گوچی آنگو، تامورا تائی جیرو، کون ہی دے می، آبے متومو جی، ہیبنو ماسوجی وغیرہ ہیں۔

ان لوگوں کی خصوصیت یہ ہے کہ لڑائی کے بعد کی بے قرار زندگی سے نفرت کا اظہار کر کے ایسی باتوں کا مذاق اڑاتے ہیں اور ناامیدی کو بہلانے کے لئے زندگی کے نفسانی پہلو کو خوبصورت بنا کر دکھانا چاہتے ہیں اور اس خیال سے عورت مرد کی جذباتی زندگی کے مختلف پہلوؤں سے بحث کرتے ہیں۔

ان کے علاوہ لڑائی کے بعد کے لکھنے والے مصنف بھی بہت پیدا ہو گئے ہیں۔ ان میں سب سے مشہور میشیما یوکیو ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ لڑائی کے بعد کے نوجوان دنیا کی بے قراری کے عادی ہو چکے ہیں۔ اور بہت سبق لے چکے ہیں۔ اس لئے ایسی بے قراری اب ان مصنفوں کی تصانیف سے دو ایک اقتباس پیش کرتا ہوں تاکہ آپ لوگ کچھ اندازہ لگا سکیں کہ لڑائی کے بعد کیا حال ہے۔

اِشی کاوا تاتسوزو "باپ کی خوشی"۔ اس ناول کا ہیرو ایک دفتر کا معمولی کلرک ہے۔ اس کی بیوی اور چار مہینے کا بچہ ہے۔ وہ لوگ ایک بیوہ کے مکان کے ایک فلیٹ میں رہتے ہیں۔ میاں بیوی ایک دوسرے سے اکتا گئے ہیں۔ شوہر کوئی نیا شغل چاہتا ہے کہ اس کی بے رنگ زندگی میں کچھ رنگینی پیدا ہو۔ اس خیال سے وہ چھوٹے موٹے کام کرنے لگتا ہے۔ سب سے پہلے وہ دفتر کی کلرک لڑکی سے دوستی کرتا ہے۔ جب اس لڑکی کی شادی کا دن آتا ہے تو لڑکی کو دھمکا کر ۵ روپیہ لے لیتا ہے کہ روپیہ نہ ملنے پر دونوں کا تعلق بتا دے گا۔ جب اس کے فلیٹ کی بیوہ مالک فلیٹ خالی کرنے کی درخواست کرتی ہے تو وہ دھوکہ سے دھوکا دیتا ہے اور اس سے بھی تعلق پیدا کرتا ہے۔ اس کی پرانی معشوقہ کا شوہر کسی مشکل میں پھنس جاتا ہے۔ وہ عورت پرانے یار کی یعنی ناول کے ہیرو کی مدد مانگتی ہے۔ ہیرو اس عورت کو مدد دے کر پھر پرانا تعلق رکھنا چاہتا ہے۔ ہیرو کا صرف ایک دوست تھا جو مالی مدد دے سکتا تھا۔ جب ہیرو نے اپنے دوست سے مدد مانگی تو اس نے انکار کیا۔ اس پر ناراض ہو کر وہ اپنے اس دوست کو قتل کرتا ہے۔ قتل کرنے کا مقصد روپے کا لالچ نہیں تھا بلکہ وہ بھی بڑا پاپ کرنے کا شوق تھا۔ وہ پکڑا جاتا ہے اور اپنے سب کرتوت بیان کر دیتا ہے کیونکہ اس کے سب دوست جنہیں وہ نقصان ہی دیتا رہتا تھا سب بہت ہمدرد تھے اور اس کی مدد کرتے تھے۔ اس ہمدردی کا یہ اثر ہوا کہ اسے گناہ کی زندگی میں بھی دل بہلانا مشکل ہو گیا اور ایسی زندگی کا کوئی مقصد اسے نظر نہ آیا۔

(باقی آئندہ)

آثارِ قدیمہ:

مینامتی

کومیلا سے پانچ میل دور پہاڑیوں کا ایک حسین سلسلہ ہے جس کی ایک چوٹی میناؔمتی اور دوسری لال ماتی کہی جاتی ہے۔ پچھلی عالمی جنگ میں یہاں فوجی ڈیرے پڑے ہوئے تھے۔ ٹھیکہ داروں نے جگہ جگہ کھدائی کی تو حسن اتفاق سے ان کو ایک ایسی جگہ مل گئی جو بدھ مت کی تہذیب کا مرکز سمجھی جا سکتی ہے۔ پھر تو محکمۂ آثار قدیمہ نے ان قطعات کا باقاعدہ جائزہ لیا۔ کھدائی کی گئی، بہت سی نادر چیزیں دستیاب ہوئیں جو محفوظ کر لی گئیں۔ انہیں محفوظ آثار میں سے سلیمان راجہ کا محل بھی ہے جو دائیں پشت چوٹی پر واقع ہے۔ پاکستان کے محکمہ آثار قدیمہ نے ۱۹۵۰ء میں اس علاقہ کی مساحت کا کام شروع کیا اور جنوری ۱۹۵۵ء کے دوسرے ہفتہ میں کھدائی کی داغ بیل ڈال دی۔

مشرقی بنگال میں پال خاندان کی حکومت کے بعد چندر خاندان کی حکومت قائم ہوئی جو ۹۰۰ء سے ڈیڑھ سو برس تک رہی۔ اس وقت روہت گری راج دھانی تھی جو آج لال ماتی ہے۔ یہ چوٹی جنوبی سرے پر ہے، شمالی چوٹی میناؔمتی کہلاتی ہے۔ چندر خاندان کے لوگ گوتم بدھ کے ماننے والے تھے۔ رسم و رواج ہندوؤں سے ملتے جلتے تھے۔ ۶۳۹ء میں چین کے مشہور سیاح ہیون سانگ نے اسی علاقہ کا سفر کیا تھا۔ اس کا بیان ہے کہ اس وقت یہاں بدھ مذہب کے تیس معبد تھے۔

پچھلی عالمگیر جنگ میں فوجی ٹھیکہ داروں کو یہاں بالکل اتفاقیہ طور سے تانبے کی ایک تختی مل گئی تھی جس پر ایک فرمان کھدا ہوا تھا۔ اس شاہی فرمان کے رو سے سنہ ۱۲۲۰ء میں پٹی کیرا کے ایک بدھ مندر کو جاگیر عطا ہوئی تھی۔ یہ پٹی کیرا اسی علاقہ کے آس پاس تھا۔ سلیمان راجہ کے محل کی کھدائی قیام پاکستان کے بعد آثار قدیمہ کی پہلی کھدائی تھی مگر اس کام میں محکمہ کو امید سے زیادہ کامیابی ہوئی۔ کھدائی کے کام میں محکمہ کے ماہرین کے علاوہ پنجاب، ڈھاکہ اور راج شاہی یونیورسٹی کے دس طالب علم تھے اور قریب قریب دو سو مزدور شریک تھے۔ کھدائی کے نتیجہ میں بدھ مت کا ایک وسیع معبد برآمد ہوا ہے۔ اور بہت سی ایسی نادر چیزیں ملی ہیں جن کی مدد سے اس زمانہ کی تاریخ و تہذیب کے بارے میں دلچسپ انکشافات ہوتے ہیں۔ آثار اور نوادر آٹھویں صدی عیسوی سے بارھویں صدی عیسوی تک کے ہیں۔

محل کی پائدار دہلیزی سڑک ۱۷×۴ فٹ چوڑی ہے جس پر اینٹیں بچھی ہوئی ہیں۔ صدر دروازے کا پیش صحن ۴۰ فٹ چوڑا ہے۔ داخلہ کا بڑا ہال ۳۳ فٹ لانبا اور ۳۲ فٹ چوڑا ہے۔ ہال کے دونوں طرف حفاظتی کمرے ہیں۔ اس کے بعد زینہ، زینہ کے بعد صحن ہے جس کے آگے ۴ پانچ فٹ کا برآمدہ ہے اور پھر چالیس حجروں کا ایک سلسلہ ہے۔ شمالی فصیل ۵۵ فٹ برآمد ہو چکی ہے، مغربی فصیل کی کھدائی چار سو فٹ تک پہنچ چکی ہے۔ محل کے اندر ایک مندر بھی ہے اور ایک خانقاہ کے وسیع آثار بھی ملتے ہیں دونوں پختہ اینٹوں کے ہیں اور ابھی تک کافی اچھی حالت میں ہیں۔ تعمیرات ٹھوس اور سنگین ہیں۔ اضافوں اور مرمتوں کے نشان جا بجا ہویدا ہیں۔ معبد کی باہری دیواریں ۱۶ فٹ کے قریب موٹی ہیں فصیل آج بھی ۴ فٹ سے چھ فٹ تک باقی ہے۔ ماہرین کا اندازہ ہے کہ پوری خانقاہ میں ۱۲۰ حجرے ہوں گے۔ اب تک صرف چالیس حجرے برآمد ہوئے ہیں۔ یہ ساڑھے سولہ ساڑھے دس فٹ کے ہیں۔ پردے کی دیواریں ساڑھے پانچ فٹ دبیز ہیں۔ حجروں میں تکونے طاقچے بنے ہوئے ہیں۔ ان میں اس زمانہ کے پجاری بدھ کی مورتی اور دیا رکھتے ہوں گے۔ بعض حجروں میں چبوترے بھی ہیں جو پوجا پاٹ اور دوسرے تیوہاروں میں کام آتے ہوں گے۔ ہر حجرے میں الگ الگ چولہا ہے۔ غالباً ہر پجاری اپنا اپنا کھانا پکاتا ہوگا، مشترکہ باورچی خانہ کا کوئی نشان نہیں ملا ہے۔ سفالی برتنوں میں پچھلی صدیاں

سیڑھیاں اور گلیاں زیادہ ہیں۔ پانی کے بڑے گھڑے ہیں، پیالے اور مرتبان بھی ہیں۔ مٹی کے چراغ بہت ہیں، حجروں کے سامنے سیڑھیاں اور آگے ساڑھے آٹھ فٹ چوڑا برآمدہ ہے۔ ان حجروں سے بہت سی انمول چیزیں ملی ہیں جیسے پیتل کا ایک ڈبہ یا پٹارہ۔ تانبے کی ایک نقشین تختی جس پر ۲۵ سطر کی عبارت درج ہے اور جب پڑھنے والے اسے حل کر لیں گے تو اس معبد کے بہت سے راز روشنی میں آ جائیں گے۔

سکوں میں ایک طلائی اور بارہ نقرئی سکے ملے ہیں، پختہ مٹی کی سرخی مائل بادامی رنگ کی ایک مہر بھی ہاتھ لگی ہے جس پر بدھ مذہب کا ایک مقدس نقش کندہ ہے، پدماپانی دیوی کی ایک برنجی مورتی ہے پختہ مٹی کی اور بہت سی تختیاں ہیں، نقشین اینٹیں ہیں، سادے اور نقشین سفالی برتن بے شمار ہیں۔ کنول کے پھول، مچھلیاں اور جالی والے نقوش اکثر برتنوں پر ہیں۔ تانبے کی منقش تختی ۱۵ انچ لانبی، آٹھ انچ چوڑی اور پاؤ انچ دبیز ہے۔ سامنے والے رخ پر شاہی تاج کا نشان ہے۔ دھرم چکر بنا ہوا ہے اور دو ہرن آمنے سامنے بیٹھے ہوئے ہیں۔ عبارت کی صرف ایک سطر کندہ ہے۔ تختی کی پشت پر صرف دھرم چکر ہے اور دو تہائی حصہ تحریر سے پُر ہے، باقی صاف ہے۔ تختی پر دو فرمان ہیں۔ پہلا راجہ آنند دیو کا ہے۔ دوسرا اس کے پتر بھاوا دیو کا جو پہلے فرمان کی تصدیق ہے۔ یہ دونوں راجہ مشرقی بنگال میں گزرے ہیں، عبارت کا رسم خط ناگری سے ملتا جلتا ہے۔ اس کا اصطلاحی نام "کا" ہے یہ خط نویں صدی عیسوی میں رائج تھا۔

سونے کا سکہ ویسا ہی ہے جیسا ساتویں اور آٹھویں صدی میں مشرقی بنگال کے اندر رائج تھا۔ چاندی کے بعض سکے ذرا خراب سے ہو گئے ہیں لیکن نشانات ابھی تک بجنسہ باقی ہیں۔ سامنے والے رخ پر کوہان والا بیل بیٹھا ہوا ہے، پشت پر ترسول، چاند اور سورج ہے۔ ایک نقرئی سکہ سب سے الگ تھلگ ہے، اس کی عبارت خط کوفی میں ہے۔ وہ رسم خط جو دورِ عباسیہ میں رائج تھا۔ صاف ظاہر ہے کہ عراق اور بنگال میں بہت قدیم تجارتی تعلقات تھے۔

پدماپانی کی برنجی مورت بھی نہایت اہم ہے۔ پدما دیوی کنول کے تخت پر براجمان ہیں۔ یہ مورتی ۴ ½ انچ اونچی ہے اور بالا کنول کی آمیزہ دار ہے۔ تخت کے پیچھے بدھ مت کا مقدس مقولہ درج ہے "یے دھرما ہیتو پربھوا"۔ یہی عبارت گوتم بدھ کی ایک اور مورتی پر بھی ملی ہے۔

برنجی ڈبہ یا پٹارہ سوا پانچ انچ اونچا ہے۔ دور ڈھائی انچ کے قریب اور دہانہ ڈیڑھ انچ کے قریب ہے۔ پختہ مٹی کی تختیاں اور اینٹیں اپنی زبان بے زبانی سے اس زمانے کی تہذیب کی داستانیں کہتی ہوئی سنائی دیتی ہیں۔ کھدائی کے دوران میں زمین کی ہر سطح سے مختلف قسم کے سفالی برتن برآمد ہوئے ہیں۔ بعض اصلی حالت میں ہیں اور بعض ٹوٹے پھوٹے لیکن اتنے محفوظ ہیں کہ ان کی ساخت اور سائز کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ اکثر برتنوں کے پیندے نقشین ہیں اور بعض کی دیواریں بھی منقش ہیں۔ جہاں ڈبہ پر ناچنے والیوں کی تصویریں ہیں وہاں سفالی برتنوں پر اقلیدسی خطوط اور جالی دار نقوش بنے ہوئے ہیں۔ بہت سے ایسے چھوٹے چھوٹے برتن ہیں جو غالباً خاص خاص تیوہاروں میں کام آتے ہوں گے۔

ان کے علاوہ روزمرہ کے استعمال کی چیزیں بھی ملی ہیں جیسے لوہے کی کیلیں، زنجیریں، بنیان، چکیاں، سنگ مالا کے دانے، شیشے کے کنگن، برنجی اور نقرئی انگوٹھیاں، سفیاں، ہتھوڑیاں۔ ان سب سے بھی اس زمانہ کے رہن سہن کا کافی اندازہ ہوتا ہے۔ چکیوں میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مسالے پیسے جاتے تھے۔

ظاہر ہے کہ یہ نشانیاں بدھ مت کی یادگاریں ہیں جن میں اس کے زمانہ عروج کے آخری دور کی جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں۔ یہ نشانیاں ان آثار سے بڑی حد تک ملتی جلتی ہیں جو آج سے پچیس سال پہلے راج شاہی ضلع کی کھدائی میں پہاڑپور سے برآمد ہوئی ہیں۔ سلبان راجہ کے محل کی ساخت اور وضع بھی پہاڑپور والے معبد سے بہت مشابہ ہے۔ خاص طور سے پختہ مٹی کی تختیاں قریب قریب ایک ہی سی ہیں ٭

قوم کے خادم:

بہادر یار جنگ

بلیغ الدین

---

۲۵ جون ۱۹۴۴ء کو یکایک حیدرآباد دکن میں یہ خبر گشت کر گئی کہ نواب بہادر یار جنگ کا انتقال ہو گیا۔ لیکن اس خبر کو ماننے میں بڑا تامل ہوتا تھا۔ وہ تو پچھلے ہی دن نہایت ہشاش بشاش، چاق و چوبند تھے۔ پھر یکایک تیر قضا کا نشانہ کس طرح بن گئے۔ یہ سمجھ میں نہ آتا تھا۔ تیزی سے ٹیلیفون گھومے، اخباروں کے لئے بھاگ دوڑ ہوئی تو معلوم ہوا کہ رات جسٹس ہاشم علی خاں کے پاس، جو ان کے بہت اچھے دوستوں میں سے تھے، کھانے پر مدعو تھے۔ اپنے گھر سے درسِ اقبال ختم کر کے چلے تھے، اس درس کے شرکاء خصوصاً ڈاکٹر رضی الدین مخاطب تھے اور اقبال کے مصرعے:

حیات ذوقِ سفر کے سوا کچھ اور نہیں

کے معنی و مفہوم پر گفتگو ہو رہی تھی۔ دسترخوان چنا جا رہا تھا کہ کسی نے حقہ ان کے سامنے رکھا! نیچہ ہاتھ میں لیا، نہال کو ہونٹوں سے لگایا، ایک کش میں چہرہ کا رنگ متغیر ہو گیا۔ ہاتھ پیر بے قابو ہو گئے، نیچہ ہاتھ سے چھوٹ گیا اور گردن ایک طرف ڈھلک گئی۔ لوگوں نے دوڑ کر سنبھالا لیکن دیکھتے ہی دیکھتے روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔ کیا ہو گیا، کسی کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ ایسی اچانک افتاد پر حواس ٹھکانے رہیں، بہت مشکل ہے۔ لب گنگ اور عقل ماؤف تھی۔ کچھ کام کیا تو آنکھوں نے، جن سے آنسو تھمتے ہی نہ تھے۔

نواب مرحوم جو حیدرآباد میں عام طور پر "قائدِ ملت" کے لقب سے یاد کئے جاتے تھے، ایک رئیس گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ انکے والد نواب نصیب یاور جنگ ثالث بڑے کلے جبڑے کے آدمی اور نظام کی بے قاعدہ فوج کے جمعدار تھے۔ جو کرنل کے برابر کا عہدہ ہے۔ ان کے آباؤ اجداد معرکہ آرائیوں کے سلسلہ میں افغانستان سے چلے اور ہندوستان کی مختلف ریاستوں کی فوجی تنظیم کرتے ہوئے دربارِ دکن پہنچے۔ جہاں وہ نیل کی تجارت کے سلسلہ میں آئے اور اپنی شجاعت اور اعلیٰ فوجی صلاحیتوں کی بنا پر جاگیر اور خطابوں سے نوازے گئے پھر جو ایک بار یہاں رہے تو یہیں کے ہو رہے۔ ان کے جدِ امجد نواب نصیب یاور جنگ اول نے سلطنت کی بقا و استقرار میں بڑی مدد کی اور وفاداران ملک و عمائدین سلطنت میں خاص مقام حاصل کیا۔

فروری ۱۹۰۵ء کی کسی تاریخ نواب نصیب یاور جنگ ثالث کے محل میں ایک لڑکا تولد ہوا۔ خلفِ اول، محمد بہادر خاں نام رکھا گیا۔ جاہ و جلال، شان و طمطراق کے تمام مظاہرے ہوئے لیکن ابھی پورے طور پر خوشیاں منائی بھی نہ گئی تھیں کہ چھٹے دن آغوشِ مادری چھوٹ گئی۔ اس سانحہ کے بعد تربیت کی ذمہ داری ان کی نانی نے سنبھالی۔ جو بڑی خدارسیدہ خاتون تھیں۔ بارہ برس تک انہوں نے اپنی خاص نگرانی میں رکھا۔ یہ پہلا مکتب تھا جہاں فکر و نظر کی صحیح تہذیب ہوئی۔ نواب خود کہا کرتے تھے کہ "مجھ میں جو کچھ ہے وہ انہی بارہ برس کا سرمایہ ہے۔"

عربی فارسی کی تعلیم گھر پر ہوئی پھر وہ دارالعلوم میں شریک کر دئے گئے۔ لیکن والد کی بے وقت موت کی وجہ سے تعلیم ادھوری رہ گئی اور دستاربندی نے آپ کو مسندِ امارت پر کھینچ لیا۔ دولت کی اس گھرانے میں کمی تو نہ تھی لیکن خرچ کی زیادتی اور داد و دہش کی عادتیں کہیں زیادہ تھیں۔ چنانچہ جب نصیب یاور جنگ ثالث نے انتقال کیا تو قائدِ ملت کی عمر کوئی اٹھارہ بیس کے لگ بھگ ہو گی۔ وسیع جاگیر کے ساتھ بڑے بھاری قرض کا بوجھ بھی ورثہ میں ملا ——— رئیسوں کے نقطۂ نظر سے اس بوجھ کو بوجھ نہیں سمجھتے تھے لیکن انہوں نے شب و روز کی تگ و دو سے بہت جلد گرتی ہوئی

امارت کو سنبھال لیا۔ قرض سے نجات ملی تو اس عمر میں جب رئیسوں کے کھیل کھیلنے کا وقت آتا تھا، جامۂ احرام سر سے باندھا اور دربارِ رسالتؐ میں حاضری دی۔

حج بیت اللہ سے مشرف ہو کر نواب نے پھر بلادِ اسلامیہ کا ایک تفصیلی دورہ کیا۔ عرب، عراق، مصر، ایران، افغانستان اور ترکی کے رہنماؤں سے ملاقاتیں کیں، مسلمانوں کی عام حالت اور ان کی حیاتِ ملی و سیاسی کا گہرا مشاہدہ کیا۔ وطن لوٹے تو ان کی فکر و نظر میں بڑی گہرائی اور بڑی وسعت پیدا ہو چکی تھی۔ مطالعہ کی عادت تو پرانی تھی لیکن اس مشاہدہ نے اسے جلا دی اور خدمتِ ملک و ملت کا جذبہ نکھر گیا۔

میلاد کی محفلوں سے ان کی عوامی زندگی کا آغاز ہوا۔ دکن میں آریہ سماجی یورش نے تبلیغ اور پھر ملک کی سیاست کی طرف متوجہ کیا۔ انہوں نے نئے سرے سے "انجمن اتحاد المسلمین" کی تنظیم کی۔ ریاستی مسلم لیگ کی بنا ڈالی، مسلم لیگ سے قریب ہوئے اور دن بدن قائدِ اعظم سے ان کی وابستگی بڑھنے لگی۔ شولاپور کے پلیٹ فارم سے پہلی مرتبہ انہوں نے مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں تقریر کی، اور پھر پٹنہ، الٰہ آباد، مدراس، دہلی، لاہور اور کراچی کا کوئی جلسہ ایسا نہ تھا جس میں نواب صاحب نے شرکت نہ کی ہو۔ وہ ایک دیسی ریاست کے باشندے تھے اس لئے مسلم لیگ کے باضابطہ رکن نہ تھے۔ لیکن قائدِ اعظم کے خصوصی مہمان کی حیثیت سے وہ ہر اجلاس میں شمعِ محفل بنے رہتے۔ ان کی شخصیت کا اثر طلسم بن کر پھیلتا گیا۔ جس نے ان کی تقریر سنی گرویدہ ہو گیا جس نے ان سے ملاقات کی ان کا ہو رہا۔ یہ حاشیہ آرائی نہیں، حقیقت بیانی ہے وہ میکروفون کے سامنے آتے تو قائدِ اعظم گھڑی اور گھنٹی میز سے اٹھوا دیا کرتے اور پھر قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کا سا شعار رکھنے والا وہ رئیس زادہ ایک گلیم پوش تخت نواز کے صحیح روپ میں جلوہ گر ہوتا۔ یہ میرا اپنا خیال نہیں، سید سلیمان ندوی مرحوم، عبدالماجد دریابادی، میاں بشیر احمد اور خود قائدِ اعظم نے ان کے بارے میں فرمایا ہے۔

ان کی سیاست میں کرا و زنگاہوں میں کرسی کا سحر کبھی بھی داخل نہ ہو سکا۔ ایک نہیں کئی مرتبہ انہیں وزارت کی پیشکش ہوئی لیکن ان کے لئے اس میں کوئی جذب و کشش نہ تھی ان کا خیال تھا کہ

"میں کرسی وزارت پر بیٹھ کر مہماتِ سلطنت پر غور کرنے نہیں بلکہ گرد کوچہ و بازار بنکر قلوب کی دنیا میں طوفان برپا کرنے کے لئے پیدا کیا گیا ہوں۔ اقبالؔ کی زبان میں شاہین زادہ ہوں۔ میرا مقام دامنِ کوہ اور وسعتِ صحرا ہے۔ میں وہ مزدور ہوں جو راستہ تیار کرتا ہے کہ ملتِ اسلامیہ کی گاڑی آسانی سے منزلِ مقصود پر پہونچ جائے"

خطاب یافتہ جاگیردار کی حیثیت سے ان پر کچھ پابندیاں تھیں۔ ان کے لئے دو ہی راستے باقی رہ گئے تھے۔ نمائشی وفاداری کے ساتھ دربار سے وابستگی یا جاگیر و مناصب سے محرومی۔ بعض ذہنیر کی کشمکش کے لئے ایک عجیب کٹھن سی منزل تھی لیکن امتحان کی یہ ساعتیں بہت آسان بن گئیں۔ جب انہوں نے خود آگے بڑھ کر طبل و علم، عماری کٹاری، جاگیر، خطاب حکومت کی بارگاہ میں واپس نذر گذران دیا اور کچھ کہا تو اپنی قوم سے مخاطب ہو کر صرف یہ کہ:

"میرے آقائے مجازی نے میرے لئے دو راستے تعین کئے ہیں، ایک عطا، ایک سزا!! عطا کی تمنا اور سزا کا خوف میرے حسنِ عمل کو رائیگاں کر دیتا ہے۔ ایک طرف جاگیر اور خطاب کی حفاظت اور دوسری طرف ملت کی خدمت۔ مجھ سے زیادہ قابلِ گردن زدنی، تن آسان، بندۂ زر اور نمک حرام کوئی اور نہ ہوگا اگر میں ایسے نازک وقت میں جبکہ ملت کی کشتی طوفان و بھنور میں گھر کر موت و زیست کی آخری کشمکش سے دوچار ہے، چپو کسی اور کے ہاتھ میں تھما دوں اور خود اپنے آشیانے کے لئے تنکا تنکا جوڑتا رہوں۔ الحمد للہ! کہ آج دیوانۂ کوئے محبت جیب و داماں کی فکر سے بھی آزاد ہو گیا"

گویا یہ شانِ امارت ایک روک تھی ملت کی خدمت گذاری میں۔ کوئی اس نظر سے دار و رسن کی طرف دیکھنے لگے تو نگاہ کی بلندیوں کا کیا پوچھنا! فرماتے تھے:

عمر لیست کہ افسانۂ منصور کہن شد
من از سرِ نو جلوہ دہم دار و رسن را

قائدِ اعظم کی ذات سے انہیں بے انتہا عقیدت تھی۔ کوئی اور ہوتا تو مقبولیت کا نشہ سر چڑھ جاتا، قیادت کا جادو بولنے لگتا، لیکن جیسے جیسے ان کی ہر دلعزیزی بڑھتی جا رہی تھی، ان کی شہرت پھیل رہی

تھی، وہ سمٹ سمٹ کر قائدِ اعظم کی شخصیت سے قریب تر ہو رہے تھے۔ ان کی محبت اور عقیدت کا ایک واقعہ یاد آیا —— جب قائدِ اعظم پر قاتلانہ حملہ ہوا تو ایسوسی ایٹڈ پریس کے نمائندے نے اس کی اطلاع نواب صاحب کو دی۔ پھر کوئی اس کے بعد کا منظر دیکھتا! ان کی آنکھوں سے آنسو اُمڈ پڑے اور دل درد میں ڈوب گیا۔ وہ رات بھر گریہ و زاری کرتے رہے یا سجدے میں پڑے رہے۔ قریب سحر جب درِ قبول وا ہوتا ہے، انہوں نے دعا مانگی کہ:

"اے خداوندِ قدوس! اے ربِ عزوجل!! حیات و موت کے قادر!!! برصغیرِ ہند میں تیرے محبوب کی امت کا سراغ مسلم لیگ کے اس بڈھے رہنما کی زندگی کے چراغ سے وابستہ ہے۔ اگر تُو نے اسے بھی بجھا دیا تو ملتِ مرحوم کی تباہی پر خون رونے والی ایک آنکھ بھی باقی نہ رہے گی اگر اس خضرِ راہ کی حیات گھٹ گئی ہے تو اے میرے مالک اے ربِ ذوالجلال! میری زندگی کی ساری عرضِ مدت اس کے مقدر میں جوڑ دے اور حرم کی پاسبانی کے لئے میری زندگی کی یہ قربانی قبول فرما۔"

صبح ہوئی تو وہ پہلی ٹرین سے قائدِ اعظم سے ملنے بمبئی چلے گئے اور کچھ بہت زیادہ دن نہیں گزرے کہ چالیس سال سے بھی کچھ کم عمر میں یکایک ان کی زندگی کا رشتہ ٹوٹ گیا جو بہادر یار جنگ کو جانتے ہیں انہیں معلوم ہے کہ وہ کس صدق و صفا کے انسان تھے۔ کیا عجب قدرت نے ان کی یہ دعا قبول کر لی ہو۔

عہدِ حاضر کے خطیبوں میں بہت سے قابلِ ذکر نام آتے ہیں۔ لیکن مرحوم کی شعلہ بیانی اور آتش نوائی اور تھی۔

ان کی تقریروں میں بلا کی ادبی لطافت ہوتی تھی اور اکثر غالب اور اقبال کے اشعار سے مزین ہوتیں۔ تاریخ اسلام پر انہیں کامل عبور تھا۔ حدیث و قرآن کو سمجھ کر پڑھا ہی نہیں تھا بلکہ اس پر عامل تھے۔ دل میں خلوص اور زبان پر صداقت ایسے جوہر تھے کہ وہ جبھی محفلوں میں بھی گفتگو کرتے تو جی چاہتا تھا، گھنٹوں سنئے اور سر دھنیئے۔

قیادت کا منصب ان کو خوب جچتا تھا۔ سوجھ بوجھ، خوفِ خدا علم اور عمل ہر لحاظ سے وہ درست تھے۔ گو وہ انگریزی سے کم حقتر بہرہ ور تھے لیکن وقت کے تقاضوں کو خوب سمجھتے تھے۔ نئی نئی

(بقیہ صفحہ ۱۲۹)



مری کی کہانی

کرم حیدری

امسال مری نے اپنی زندگی کے ایک سو سال ختم کر کے دوسری صدی میں قدم رکھا ہے۔ ۱۸۴۹ء میں جب انگریزوں نے سکھوں کو آخری بار شکست دے کر پنجاب کا الحاق کیا تو یہ دور افتادہ پہاڑیاں بھی قلمرو برطانیہ کا ایک حصہ بن گئیں۔ لیکن اس وقت مری نام کی کوئی جگہ نقشے پر موجود نہ تھی۔ یہاں اس پہاڑی پر جسے آج کل پنڈی پوائنٹ کے نام سے پکارا جاتا ہے ایک چھوٹا سا سنگین برج موجود تھا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ برج سکھوں نے بنوایا تھا۔ یہ برج ایک مختصر سے فوجی دستے کی قیام گاہ تھا۔ جو ایک طرف ارد گرد کے کوہستانی دیہات پر اقتدار قائم رکھنے کا ذریعہ تھا تو دوسری طرف کشمیر کی طرف جانے والے راستے کی نگرانی بھی کرتا تھا۔ اس طرح کی طرح کا ایک اور برج راولپنڈی سے چھ میل مشرق کی طرف پنڈی لاہور ریلوے لائن پر بنا ہوا ہے۔ اور ایک ذرا مختلف ساخت کا برج مری سے تین میل کے فاصلے پر کرور نامی گاؤں میں ہے۔ پنڈی پوائنٹ کے برج سے دوربین کے ذریعے ان دونوں برجوں کو بآسانی دیکھا جا سکتا ہے۔ پرانے زمانے میں ان مختلف برجوں میں مقیم فوجی دستے آئینے اور جھنڈی کے ذریعے ایک دوسرے سے تعلق قائم رکھتے تھے۔ اور بوقت ضرورت ایک دوسرے کو کمک اور رسد کے لئے پیغام پہنچاتے تھے۔

پنڈی پوائنٹ کے اس برج کے نیچے پتھروں کی ایک گول ڈھیری سی ہے۔ روایت ہے کہ یہ ڈھیری ایک بزرگ عورت کی قبر ہے جن کا نام بی بی مریاں یا بی بی مریم تھا۔ ان بزرگ عورت کے زمانۂ حیات کے متعلق کسی کو کچھ معلوم نہیں۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ یہ بی بی مریم خود مریم علیہا السلام تھیں۔ لیکن یہ بات نہ قرین قیاس ہے۔ نہ کوئی تاریخی شہادت اس کی تائید کرتی ہے۔ ایسی قبر کو مقامی زبان میں "مڑھی" کہا جاتا ہے۔ چنانچہ اسی رعایت سے آج تک مقامی لوگ پنڈی پوائنٹ کو "مڑھی کی گلی" کے نام سے پکارتے ہیں۔ جب انگریز یہاں پہنچے۔ اور انہوں نے مقامی لوگوں سے اس جگہ کا نام دریافت کیا۔ تو انہیں یہی نام بتایا گیا۔ انہوں نے "مڑھی کی گلی" کو مختصر کر کے محض "مڑھی" کہنا شروع کر دیا۔ لیکن چونکہ انگریزی لب و لہجہ "ڑ" کی آواز سے نا آشنا ہے۔ اس لئے "مڑھی"، "مری" میں تبدیل ہو گیا۔ اور اسی نام سے یہ مختصر سا پہاڑی شہر آباد ہوا۔

انگریزوں نے اس مقام کی آب و ہوا اور قدرتی پیداوار کو دیکھا، تو ان کے دل و دماغ میں مسرت کی ایک لہر دوڑ گئی۔ گرمائی بارش، سرمائی برفباری سے گہری وادیاں اور ان وادیوں میں بہتی ہوئی صاف شفاف پانی کی ندیاں دیکھ کر ان کے پردۂ تصور پر سکاٹ لینڈ کی پہاڑیاں ابھر آئیں۔ شاہ بلوط اور صنوبر کے اونچے اونچے درخت جو ہندوستان بھر کے میدانی علاقوں میں کہیں نظر نہیں آتے، دیکھ کر انہیں اپنے وطن کے شیروڈ کے جنگلات یاد آ گئے۔ دیار غربت میں کسی ہم وطن سے مل کر جو خوشی ہوتی ہے۔ وہی خوشی انگریزوں کو شاہ بلوط، صنوبر اور شمشاد کے درختوں کو دیکھ کر ہوئی۔ قدرتی مناظر کے اعتبار سے یہ مقام ان کے اپنے وطن سے اس قدر مشابہ تھا کہ انہوں نے یہاں ایک شہر بسانے کا فیصلہ کر لیا۔ اتفاق سے کشمیر کو جانے والی سڑک پر یہ ایک اہم مقام بھی تھا۔ اس لئے فوجی نقطۂ نظر سے بھی اسے بڑی اہمیت حاصل تھی۔ چنانچہ ۱۸۵۰ء ہی میں یہاں ایک فوجی چھاؤنی قائم کرنے کا فیصلہ کر لیا گیا۔ دو تین سال تک ابتدائی تیاریاں ہوتی رہیں۔ اور بالآخر ۱۸۵۴ء میں مری کے نام سے ایک



کوه مری

عکس : علی امام

نیا شہر صفحۂ ہستی پر اُبھرنے لگا۔

ہر چند کہ انگریز یہاں فاتح کی حیثیت سے آئے تھے۔ اور اس تمام علاقے پر بلا شرکت غیرے انہیں ہر طرح کا تصرف حاصل تھا۔ تاہم ان کی فطری آئین پسندی نے یہ گوارا نہ کیا۔ کہ اُن لوگوں کی رضامندی حاصل کئے بغیر جنہیں پرانے کاغذاتِ مال کی رُو سے مالکانہ حقوق حاصل تھے۔ یہاں تعمیر شہر کا سلسلہ شروع کریں۔ چنانچہ انہوں نے مقامی مالکوں سے زمین حاصل کرنے کے لئے گفت و شنید شروع کی۔ یہ گفت و شنید پانچ سال تک جاری رہی۔ اور آخر ۱۸۵۵ء میں اس کا فیصلہ ہوا۔ موجودہ مری کی حدود پر مضافات کے بارہ دیہات کے مالکانہ حقوق تھے۔ یہ گاؤں مسیاڑی، اروباڑی، چار ہان، رولات۔ تپہ کیر۔ لوٹ، کھنی طاق، سندھیاں، دھار جاوا، نمب نبیل اور سالی تھے۔ ان بارہ دیہات میں سے گیارہ دیہات کے باشندوں نے اپنے حقوق کے عوض نقد قیمت لینے پر رضامندی کا اظہار کیا۔ لیکن بارہویں گاؤں کے لوگوں نے یکمشت رقم لینے کی بجائے سالانہ رقم لینے پر اصرار کیا۔ ان لوگوں کے مطالبات بالآخر منظور کئے گئے۔ اور مسٹر جے۔ ڈبلیو۔ ڈارمپل نے ۲۲ر نومبر ۱۸۵۵ء کی ایک چٹھی میں سر جان لارنس چیف کمشنر پنجاب کو آگاہ کیا کہ گورنر جنرل اِن کونسل نے مسیاڑی کے علاوہ باقی گیارہ دیہات کے لوگوں کو ایک ہزار نو سو پینتیس روپے نقد دینے اور ایک سو چودہ روپے چار آنے مالیانے میں سے کم کرنے کی منظوری دے دی ہے۔ مسیاڑی گاؤں کے لوگوں کو پچاس روپے سالانہ ادا کئے جایا کریں گے۔ یہ رقم ۱۸۵۵ء کی فصل خریف سے لے کر آج تک باقاعدگی سے ادا کی جا رہی ہے —

یہ فیصلہ صاف اور واضح ہے اور حکومت کے کاغذات میں اس کا تمام ریکارڈ موجود ہے۔ اس میں کہیں مری کے پچاس روپے کے عوض بکنے کا ذکر نہیں۔ لیکن نہ معلوم کس طرح مشہور ہو گیا کہ مری والوں نے صرف پچاس روپے میں انگریزوں کے ہاتھ مری کو بیچ دیا تھا۔ یہ افسانہ اتنی شہرت اختیار کر گیا۔ کہ آج بھی جو سیاح یہاں آتے ہیں۔ وہ اِسے سنتے ہیں۔ اور اس پر یقین کر کے مری کے لوگوں کی سادہ لوحی پر ہنستے ہیں۔

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی جس میں ہندوستان کے آزادی پسندوں نے برطانوی سامراج کے خلاف آخری مسلح جد و جہد کی تھی جو اس دُور افتادہ پہاڑی مقام کو بھی متاثر کر گئی۔ اور یہاں کی مختصر سی آبادی نے بھی ہتھیار اٹھانے کا فیصلہ کر لیا۔ پہاڑی قبائل کے سرداروں کا ایک خفیہ اجلاس کسی دور افتادہ مقام پر ہوا۔ جہاں یہ فیصلہ کیا گیا کہ ایک مقررہ تاریخ کو تمام قبائل مختلف اطراف سے مری میں مقیم برطانوی دستے پر ہلہ بول دیں گے۔ چنانچہ مختلف قبائل اپنی جنگی تیاریوں میں مصروف ہو گئے۔ لیکن اس زمانے میں انگریزی اقتدار کا سورج ابھر رہا تھا۔ اور ہندوستان کے دوسرے مقامات کی طرح یہاں بھی اس کے پرستار پیدا ہو گئے تھے۔ انگریز کمانڈر کو قبل از وقت خبردار کر دیا گیا۔ اور اس نے فوراً راولپنڈی سے کمک منگوا کر اس خطرے کا مقابلہ کرنے کی تیاری کر لی۔ مقررہ تاریخ کو جب قبائلی سردار اپنے جوانوں کو لے کر جو توڑے دار بندوقوں، کلہاڑیوں، نیزوں اور لاٹھیوں سے مسلح تھے۔ مری پر چڑھ دوڑے تو انہوں نے انگریزی فوج کے چند دستوں کو استقبال کے لئے تیار پایا۔ ایک مختصر سی لڑائی ہوئی۔ جس میں باقاعدہ اور مسلح برطانوی فوج نے اس بے ترتیب ہجوم کو تتر بتر کر دیا۔ سینکڑوں لوگ مارے گئے۔ اور بیسیوں گرفتار ہو کر قید و بند میں ڈال دیئے گئے۔ سرکردہ ہنماؤں کو ملٹری گراؤنڈ میں توپ دم کیا گیا۔ لوگوں نے انسانی اعضا کو روئی کے گالوں کی طرح دُھنک ڈالا۔ گورے سپاہیوں نے دیوانہ وار مسرت کے قہقہے بلند کئے۔ اور تمام پہاڑ پر درد نالوں میں ڈوب گیا۔ ایک سردار کا سر کلمۂ طیبہ کا ورد کرتے ہوئے میدان سے قریباً ایک فرلانگ نیچے جا گرا۔ جہاں کسی دردمند مسلمان نے اسے ایک کچی قبر میں دفن کر دیا۔ کلفڈن روڈ پر یہ کچی قبر آج بھی عوام کی عقیدت کا مرکز بنی ہوئی ہے۔

آزادی کی اس جنگ کے بعد مری کے لوگ اس حقیقت کو سمجھ گئے۔ کہ تاریخ کا جو دور ختم ہو چکا اس کے لوٹ آنے کی کوئی اُمید نہیں۔ چنانچہ مایوسی کے عالم میں انہوں نے اپنے آپ کو تقدیر کے سپرد کر دیا۔ اور غیر ملکی سامراج کی اطاعت کا جُوا چار و ناچار اپنے کندھوں پر ڈال لیا۔ انگریزوں نے "بغاوت" کی پاداش میں ڈھونڈ قبیلے کے جوانوں پر فوج کا دروازہ بند کر دیا۔ اور ۱۹۱۴ء تک ان پر یہ پابندی عائد رہی۔ حتیٰ کہ پہلی جنگ عظیم میں انہیں سپاہیوں کی ضرورت نے مجبور کیا اور ڈھونڈ قبیلے کے لوگوں کو فوج میں بھرتی

ہونے کی اجازت حاصل ہوئی۔ چنانچہ ان لوگوں کے بیٹے پوتے جو برطانوی سامراج سے ٹکراتے تھے۔ اسی سامراج کی حفاظت کے لئے ہتھیلی پر سر لئے آگے بڑھے۔ اور یورپ اور ایشیا میں مختلف محاذوں پر داد شجاعت دیتے رہے۔

رفتہ رفتہ مری کی آبادی بڑھنے لگی تو کاروباری لوگوں نے بھی ادھر کا رُخ کیا۔ یہاں کے کوہستانی لوگ تو کاروبار کی ابجد سے بھی ناواقف تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ راولپنڈی کے ایک قریبی گاؤں سے جس کا نام کوری تھا۔ بہت سے ہندو اور سکھ بنیئے یہاں پہنچے۔ پہاڑ پر تو حیا ڈنی بن رہی تھی۔ نشیبی حصے ہیں، ان لوگوں نے ڈیرے ڈال دئے۔ لکڑی کی کوئی کمی نہ تھی۔ درخت کٹوا کٹوا کر انہوں نے جھونپڑے بنوا لئے۔ یہی جھونپڑے اُن کے مکان تھے اور یہی دکانیں۔ جب کاروبار میں قدم جم گئے۔ اور مالی حالت مضبوط ہو گئی تو جھونپڑے غائب ہو گئے۔ اور ان کی جگہ پتھر کی پختہ دکانیں اور مکان نظر آنے لگے۔ مری کا یہ قدیم ترین کاروباری بازار کوری بازار کہلانے لگا جو آج تک اسی نام سے پکارا جاتا ہے۔

بنیوں نے تھوڑے ہی عرصے میں اپنے کاروباری ہتھکنڈوں سے اس علاقے پر پورا پورا اقتصادی غلبہ حاصل کر لیا۔ وہ مقامی پیداوار کوڑیوں کے مول خرید لیتے۔ اور راولپنڈی کی منڈیوں میں لے جا کر مہنگے داموں بیچتے۔ وہاں سے گڑ، شکر، چاول، کپڑا، اور نمک لے کر آتے۔ اور یہاں مہنگے داموں بیچتے۔ آج مری کاروباری لحاظ سے بہت پست ہو گیا ہے۔ لیکن اس زمانے میں یہاں مقامی پیداوار کی بڑی منڈی تھی چنانچہ آج بھی ان بازاروں کو آلو منڈی۔ کنک (گندم) منڈی اور سبزی منڈی کے نام سے پکارا جاتا ہے۔

یہاں اُن دنوں بنکوں کا تصور بھی موجود نہ تھا۔ لوگ چوری چکاری کے ڈر سے روپیہ گھروں میں نہ رکھتے تھے۔ بلکہ انہی مہاجنوں کے پاس جمع کر دیتے تھے۔ یہ مہاجن امانتیں رکھنے پر بھی سود لیتے تھے۔ اور ان امانتوں ہی سے قرض دے کر بھی بڑی بھاری شرح سے سود حاصل کیا کرتے تھے۔ پچیس تیس سال کے مختصر سے عرصے میں ان بنیوں نے علاقے کی تمام دولت کو اپنی مٹھی میں لے لی۔ اور مسلمان ان کے دست نگر بلکہ صحیح معنوں میں اقتصادی طور پر غلام ہو گئے۔ پہاڑ کے لوگ قدرتی طور پر جفاکش اور محنت کے عادی ہوتے ہیں۔ چنانچہ یہ لوگ دیس بدیس محنت مزدوری کرتے پھرتے اور ملازمتیں کرتے۔ لیکن اپنا خون پسینہ ایک کر کے جو کچھ بھی کماتے اس کا بڑا حصہ بنیوں کی نذر ہو جاتا۔ دو بڑی جنگوں میں ان لوگوں نے اپنی محنت سے بہت کچھ کمایا لیکن بنئے نے سُود کے تانے بانے سے کچھ ایسا جال پھیلایا تھا کہ یہ اُس کے چنگل سے چھٹکارا حاصل کر کے خوشحال نہ ہو سکے۔

مری میں دو سرسبز قدرتی سیرگاہیں ہیں۔ ایک تو ڈیہی پہلی پہاڑی جس کا ذکر پہلے آ چکا ہے۔ اور دوسری کشمیر پوائنٹ۔ یہ دونوں مقام اُس سلسلۂ کہسار کی آخری پہاڑیاں ہیں جس پر مری آباد ہے۔ دونوں کے گرد ایک چکر کی صورت میں سڑکیں گھوم جاتی ہیں۔ کشمیر پوائنٹ کے چکر سے دریائے جہلم کی وادی دُور تک نظر آتی ہے۔ اور اس کے پیچھے کشمیر کے سر بفلک پہاڑ دکھائی دیتے ہیں، جن پر ہمیشہ برف جمی رہتی ہے۔ کسی زمانے میں اس پہاڑی پر ایک مشہور ہوٹل تھا جو شرابی کا ہوٹل کہلاتا تھا۔ یہ ہوٹل ۱۹۴۷ء کے فسادات میں جل گیا تھا۔ تین چار سال تک اس پہاڑی پر ویران کھنڈر رہے۔ آخر حکومت کی نظرِ انتخاب اس پر پڑی۔ اور گورنمنٹ ہاؤس کی تعمیر کے لئے اسے چُن لیا گیا۔ پچھلے سال ہی گورنمنٹ ہاؤس مکمل ہوا ہے، جو دُور سے ایک قلعہ نما محل دکھائی دیتا ہے۔

کشمیر پوائنٹ کے قریب "پنج پانڈو پارک" ہے جو سفیدے اور شاہ بلوط کے تناور درختوں سے ڈھکا ہوا ہے۔ ڈھلانوں پر میونسپل کمیٹی نے کیاریاں بنوا رکھی ہیں۔ جن میں اپریل، مئی اور ستمبر اکتوبر کے مہینوں میں بے شمار پھول کھلتے ہیں۔ اور تمام پہاڑی ایک تختۂ گل دکھائی دیتی ہے۔ پہاڑی کی چوٹی پر ایک چبوترہ بنا ہوا ہے۔ جسے پنج پانڈو کی بیٹھک کہا جاتا ہے۔ ہندوؤں کی ایک روایت کے مطابق پانڈو بھائی کشمیر جاتے ہوئے تھوڑی دیر کے لئے یہاں ٹھہرے تھے۔ ۱۹۴۷ء سے پہلے اس مقام پر ہر پورن ماشی کے روز میلہ لگا کرتا تھا جس میں شہر بھر کے مرد، عورتیں اور بچے شامل ہوا کرتے تھے۔

پنج پانڈو پارک کے قریب ہی پانی کے تالاب ہیں۔ پہلے یہ تالاب سات تھے۔ لیکن پچھلے سال دو تالابوں کو ملا کر ایک کر دیا گیا ہے۔ جس سے ان کی تعداد چھ رہ گئی ہے۔ مری میں مقامی طور پر چشموں کی تعداد بہت کم ہے۔ ابتداءً جب یہ ایک چھوٹی سی جگہ تھی۔ تو انہی مقامی چشموں

کے پانی سے گزارہ ہو جاتا تھا۔ شہر بڑھنے لگا اور اردگرد چھاؤنیاں بننے لگیں۔ تو ان چشموں کا پانی ناکافی ہو گیا۔ چنانچہ ۱۸۹۲ء میں ٹانلے نامی ایک انگریز انجینئر کی نگرانی میں تین تالاب بنائے گئے۔ اور ڈونگا گلی سے جو مری ایبٹ آباد روڈ پر مری سے بیس میل کے فاصلے پر واقع ہے، پائپ لائن بچھا کر مری تک پانی پہنچایا گیا۔ ۱۹۰۰ء میں تین تالاب اور بنائے گئے۔ آخری اور سب سے بڑا تالاب ۱۹۴۶ء میں تعمیر کیا گیا۔ ان تمام تالابوں میں مجموعی طور پر پچاس لاکھ گیلن پانی ذخیرہ کیا جا سکتا ہے جو موسم گرما میں، جب مری بھرپور ہوتی ہے، تقریباً تین ہفتے کی ضرورت کے لئے کافی ہوتا ہے۔

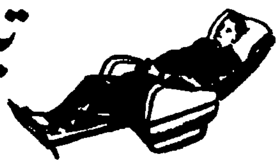
پانی کی قلت کے مسئلے کو مستقل طور پر حل کرنے کے لئے چند سال ہوئے دریائے جہلم سے پانی درآمد کرنے کا ایک منصوبہ بنایا گیا تھا جس پر قریباً پچاس لاکھ روپے کا خرچ آتا تھا۔ حال ہی میں جوائنٹ واٹر بورڈ نے سولہ لاکھ روپے کے تخمینے سے ڈونگا گلی سے مری تک ڈبل پائپ لائن بچھانے کی ایک سکیم منظور کی ہے۔ توقع ہے کہ اس سکیم کے مکمل ہو جانے سے بہت زیادہ مقدار میں پانی درآمد کیا جا سکے گا۔ اور آئندہ پانی کی قلت کا اندیشہ نہ رہے گا۔

موسم گرما میں یہاں کی بارونق ترین تفریح گاہ مال روڈ کا وہ حصہ ہے جو سکینڈل پوائنٹ اور چوک گرجا گھر کے درمیان واقع ہے۔ چار فرلانگ کے اس ٹکڑے میں لوگ دن بھر چلتے پھرتے رہتے ہیں۔ لیکن سہ پہر کے وقت تو یہاں ایک میلہ سا لگ جاتا ہے۔ شہر کی تمام اطراف سے خلق خدا امڈ امڈ کر یہیں پہنچ جاتی ہے۔ اور بھیڑ بھاڑ کا وہ عالم ہو جاتا ہے کہ تیزی سے گذرنا محال ہوتا ہے۔ رات کے نو دس بجے تک لوگ ادھر سے ادھر گھومتے پھرتے رہتے ہیں۔ جب ذرا تھک جاتے ہیں۔ تو سکینڈل پوائنٹ پر یا چوک گرجا گھر پر کھڑے ہو کر تھوڑی دیر تکان دور کرتے ہیں۔ یا کسی ریستوران میں بیٹھ کر چائے پیتے اور گپ شپ اڑاتے ہیں۔ یہاں آئے ہوئے لوگ چونکہ بالعموم سیلانی ہوتے ہیں۔ اس لئے موضوع خواہ کتنا ہی سنجیدہ ہو، ان کی گفتگو کا انداز کبھی سنجیدہ نہیں ہوتا۔ ملک کسی ہنگامی صورت حال سے دوچار ہو رہا ہو، ملکی سیاست میں الجھاؤ پیدا ہو رہے ہوں، ایک اور جنگ کے بادل منڈلا رہے ہوں، دنیا پر قیامت ٹوٹنے والی ہو، یہاں کی فضا کوئی خاص اثر قبول نہیں کرتی۔ اس ماحول پر وہی رنگینی اور بے فکری چھائی رہتی ہے جو اس شہر کے آباد ہونے سے لے کر اب تک چلی آ رہی ہے۔ اور جب تک شہر آباد ہے، قائم رہے گی۔

مری کی تاریخ کا یہ مختصر سا جائزہ نامکمل رہے گا۔ اگر یہاں کے تعلیمی حالات کا تذکرہ نہ کیا جائے۔ تعلیمی اعتبار سے یہ علاقہ پاکستان کے پس ماندہ ترین علاقوں میں سے رہا ہے۔ یہاں ۱۹۲۶ء سے پہلے کوئی ہائی سکول نہ تھا۔ صرف میونسپل کمیٹی کے زیر انتظام ایک مڈل سکول قائم تھا جسے ۱۹۲۶ء میں گورنمنٹ نے ہائی سکول کا درجہ دے کر اپنی تحویل میں لے لیا۔ ۱۹۳۰ء میں پہلی بار اس سکول سے چار طلبا میٹریکولیشن کے امتحان میں شریک ہوئے۔ اس وقت سے لیکر آج تک اوسطاً بیس پچیس لڑکے ہر سال میٹرک پاس کرتے چلے آتے ہیں۔ ان میں بہت سے وہ بھی ہیں جو تقسیم ہند کے ساتھ وانگہ کے اس پار چلے گئے۔ چنانچہ اس تمام آبادی میں گریجویٹ انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔

لڑکیوں کی تعلیم کا حال اور بھی خراب تھا۔ آج سے بیس پچیس سال پہلے شہر میں لڑکیوں کا کوئی سکول نہ تھا۔ ۱۹۳۵ء کے قریب لڑکیوں کے لئے ایک پرائمری سکول کھولا گیا۔ جو رفتہ رفتہ مڈل بنا اور تین سال سے ہائی اسکول بنا دیا گیا ہے۔ اس سکول میں سے دو چار لڑکیاں گذشتہ تین سالوں سے میٹرک پاس کر کے نکلتی ہیں۔ دیہات میں چند مڈل سکول ہیں اور کہیں کہیں پرائمری سکول۔ اب تعلیم نسواں کے خلاف لوگوں کا تعصب کم ہو رہا ہے۔ اور لوگ روز بروز لڑکیوں کی تعلیم کی طرف زیادہ توجہ دے رہے ہیں۔ جن دیہات میں لڑکیوں کے علیحدہ سکول نہیں۔ وہاں لڑکوں کے پرائمری سکولوں میں لڑکیاں بھی تعلیم حاصل کر رہی ہیں۔ آج سے پندرہ بیس برس پہلے پرائمری درجے میں بھی مخلوط تعلیم کو گوارا نہ کیا جاتا تھا۔ اور یہاں بعض انگریزی سکول بہت کامیابی سے چل رہے ہیں۔

قیام پاکستان کے بعد ان اسکولوں کی اہمیت بڑھ گئی ہے۔ آج کل پاکستان کے تمام حصوں سے بچے داخلہ لینے یہاں آتے ہیں۔ داخل ہونے کے خواہشمندوں کی تعداد اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ بعض اوقات ایک بچے کو کئی کئی سال تک انتظار کرنا پڑتا ہے۔ یہ تمام سکول اقامتی ہیں +



تیز ترین پرواز
اور
مکمل ترین آسائش

لندن
براہِ قاہرہ



ہر منگل کو اب اٹھارہ گھنٹے سے بھی کم وقفے میں پہنچ جائیگا!
اب آپ اپنی کم سے کم فرصت میں بھی قاہرہ اور لندن کا سفر کر سکتے ہیں اور لطف یہ
کہ یہ سفر کم خرچ بالانشین بھی رہیگا اور اسمیں آپکو اعلیٰ ترین آسائشیں بھی حاصل ہونگی،
پی، آئی، اے کے سپر کانسٹیلیشن طیاروں میں جسطرح اپنے مسافروں کی خاطرداری، آرام
اور حفاظت کا خیال رکھا جاتا ہے اسکا مقابلہ دنیا کی ہر بہتر ایئر لائن سے کیا جا سکتا ہے۔
ہمارے طیارے ہر منگل کو کراچی سے براستہ قاہرہ لندن کیلئے پرواز کرتے ہیں اور موسم و فضا کی
خرابیوں سے بے نیاز ۲۰ ہزار فیٹ کی بلندی پر پرواز کرتے ہوئے ۱۸ گھنٹے میں
لندن پہنچ جاتے ہیں۔ یہ طیارے ہر جمعہ کو لندن اور قاہرہ سے واپس آتے ہیں، آپکو فرسٹ کلاس
اور ٹورسٹ کلاس، دونوں میں نشستیں مل سکتی ہیں، فرسٹ کلاس میں بیحد مخصوص قسم کی انتہائی
آرامدہ نشستیں رکھی گئی ہیں جنپر دن اور رات میں بڑی سہولت اور سکون سے وقت گذارا جا سکتا ہے۔

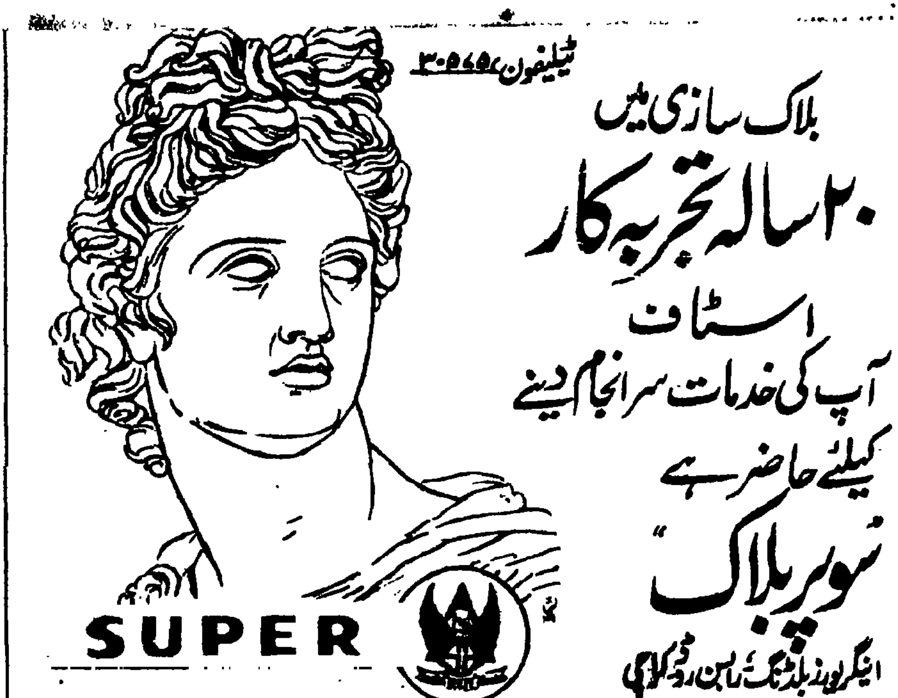
مزید تفصیلات ٹریول ایجنٹس سے حاصل کیجئے۔

پاکستان انٹرنیشنل ایئر لائنز

کھوڑو روڈ۔ کراچی

(فون نمبر ۳۳-۲۰۶۲)

ریزرویشن کے لئے فون نمبر ۳۲۵۵۵ پر ہماری خدمات ۲۴ گھنٹے حاضر ہیں۔



ٹیلیفون ۳۰۵۷۵
بلاک سازی میں
۲۰ سالہ تجربہ کار
اسٹاف
آپ کی خدمات سرانجام دینے
کیلئے حاضر ہے
سوپر بلاک
SUPER
اینگرویورز بلڈنگ، رابسن روڈ کراچی



ذائقہ ہی
بتا دیتا ہے
کہ یہ
یعقوب بسکٹ فیکٹری لمیٹڈ

پیاسی پرند — بقیہ صفحہ ۸۴

معرکۂ حق کے اسرار کھل رہے ہیں' وہ اس کے دروازہ کے گرد جمع ہو جاتے اور کان لگا کے ان آوازوں کو سنتے اُس وقت ان سب کے دل خوف اور عقیدت سے لبریز ہوتے۔ آخر وہ دن آیا کہ تم متولی جھپٹ کر اپنے کمرہ سے نکلا۔ اس کے بال پریشان تھے اور آنکھیں دہکتے ہوئے انگارہ کی طرح سرخ۔ وہ اپنی تلوار دائیں بائیں گھماتا ہوا قریب کے قہوہ خانہ میں جا گھسا اور وہاں بیٹھے ہوئے لوگوں پر بے پناہ وار شروع کر دیئے۔ وہ چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا "بھاگ جاؤ، باغیو اور بدکارو، بھاگ جاؤ" خلقت سراسیمہ ہو گئی۔ لوگوں نے ہجوم کر کے اسے پکڑنا چاہا اور کچھ دیر یہی سماں رہا۔ خدا خدا کر کے طوفان ٹھنڈا ہوا اور میں نے اس کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ اب اس کی آواز نحیف ہو گئی تھی اور وہ کہہ رہا تھا "خدا کے بزرگ و برتر، تیری شان اعلیٰ ہے اور تیرا بول بالا ہے۔ اس عاجز نے اپنا فرض ادا کر دیا۔ میں مقدس جنگ لڑ چکا..... " ___ اور پھر اس کا جسم ساکت ہو گیا....!

(عربی سے)

دہلیز: — (بقیہ صفحہ ۴۳)

وہ اندر اندھیرے میں قدم بڑھا رہی تھی کہ تپکے اتر رہی تھی، زمین میں سما رہی تھی۔ نشے کی ایک اور لہر سی آئی اور اس کے شعور پر چھانے لگی۔ ایک سرشاری کا عالم، ایک مبہم سا ڈر کہ کوئی بہت بڑا مرحلہ پیش آنے والا ہے، دھڑکا کہ جانے کیا ہو جائے۔ اس نے چلتے چلتے اپنے قدموں کے نیچے نرم نرم مٹی محسوس کی۔ مٹی جس پہ کبھی وہ ننگے پیر چلا کرتی تھی اور اس کے پاؤں کے نشان ایک ایک خط کے ساتھ اس پہ ابھر آیا کرتے تھے۔ اس نے قدموں کے قریب کی مٹی کو دیکھا، مٹی سے اُنسیت کی وہ لہر یا لکیر کہاں تھی؟ مٹ گئی، یا کبھی ظاہر ہی نہیں تھی؟ کھونٹی کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ چٹیلا آنار گرد میں اٹا ہوا میلا پیکٹ چٹیلن اس نے اسے پھر کھونٹی پہ ٹانگ دیا۔

کوٹھری سے جب وہ باہر نکل رہی تھی تو دماغ میں لبسی ہوئی دلنشیں آمد خوشبو اڑ چکی تھی اور اس کے روکھے پھیکے بالوں جیسی بے رنگی اس پر غبار بن کر چھاتی جا رہی تھی۔

گلاب خاص: — بقیہ صفحہ ۶۸

درختوں کی لام تو قطاریں آتی چلی گئیں جیسے کسی مصنف کے شعور میں اپنی تصنیف کی سطر سطر رچی ہوتی ہے، مگر ان کی تفصیل تو اس کے دماغ سے چھین کر زمینداروں کے نقشوں خسروں میں لکھی ہوئی تھی، اور اس نے اس وقت محسوس کیا کہ وہ اس ماحول کو آج تک چھوڑ کر چلے جانے پر کیوں قادر نہ تھا، اور ذرا سی پھلوار کے سہارے کیوں یہاں پڑا رہا جبکہ شہر کے چوراہوں پر پھولوں کے ہار بیچ کر وہ ایک شام میں اتنا کما سکتا تھا جتنا یہ پھلوار اسے ایک ماہ میں بھی نہیں دے سکتی، اور آج اس علاقہ کو چھوڑتے وقت اسے پتہ چلا کہ ان باغوں کا پودا پودا دراصل اس کا بیٹا تھا اور جیسے وہ آج ہمیشہ کے لئے اپنے جوان تنومند بھاری بیٹوں کی بڑی لمبی چوڑی پھولی پھلی بستی چھوڑ کر تن تنہا جا رہا ہے اور وہ بڑھتا رہا یہاں تک کہ برسات کی نم تاریکی میں اپنا سب کچھ، اپنے اتنے بہت سے نازک پالے دوسروں کے لئے پیچھے چھوڑ کر نیاتی ریلوے اسٹیشن کی جانب پھیلی ہوئی سیاہی میں حل ہو گیا۔ اور پیچھے پیچھے سندریا گلاب خاص زرخیز قلمیں بغل میں دبائے، شاید نئی دھرتی کی تلاش میں، جس کی چھاتی سے نیا دودھ پا کر اپنے گلاب خاص کو پروان چڑھا سکے۔

(نوٹ: اس افسانہ کے سب کردار اور مقامات فرضی ہیں)

خزاں نے لوٹ لیا — بقیہ صفحہ ۸۰

دھاری دار ریشم نکالا۔ اسے سامنے پھیلا لیا۔ پریشان ہو کر مریض کے گلے کی طرف بار بار دیکھنے لگی۔ پھر منہ ہی منہ میں بڑبڑانے لگی "پہلے اس کا گلا ___ گریبان کاٹ لوں ___"

پھر بڑی مہارت اور تیزی سے گریبان کاٹنے لگی۔ مگر قمیص کے گلے کے ساتھ اس کی دو انگلیاں کٹتے کٹتے رہ گئیں۔ اگرچہ بری طرح زخمی ہو گئیں!

خزاں کی آندھی اب تھم گئی تھی!!


جب وقت کی پابندی
اور
کام کی نفاست کا سوال ہو
گولڈن بلاک
کی خدمات حاصل کیجئے
جہاں ہر قسم کے رنگین و سادہ لائن اور ہاف ٹون بلاک
ڈیزائن اور سینما سلائڈ تیار کئے جاتے ہیں۔
گولڈن بلاک ورکس۔ ساؤتھ نیپئر روڈ۔ کراچی



نئی مطبوعات

ش۔ ح

افکارِ غالب

مصنفہ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم
صفحات ۵۳۵، قیمت پانچ روپے
ناشر، مکتبہ معین ادب لاہور

غالب کے بارے میں اب تک جو دادِ تحقیق دی گئی اس کا زور زیادہ تر سوانح اور اشعار کی لفظی شرح پر رہا۔ غالب اہلِ فکر شاعر تھے اور کائنات و حیاتِ انسانی کے بارے میں ان کا مخصوص طرزِ نظر اگرچہ یکسر نیا نہ ہو، تاہم فکر انگیز ہے اور جرأت آمیز بھی۔ اس کتاب میں جناب مصنف نے غالب کے اجزائے فکر کو حکیمانہ دقتِ نظر کے ساتھ پرکھنے اور انہیں ایک مربوط شکل دینے کی کوشش کی ہے۔ کتاب کا مقدمہ جو ۵۰ صفحات پر پھیلا ہوا ہے، افکارِ غالب کا ایک مکمل جائزہ پیش کرتا ہے اور غالب کے تنقیدی ادب میں بلاشبہ ایک گرانقدر اضافہ ہے۔

کتاب کے بقیہ ابواب میں غالب کے منتخب اردو اور فارسی اشعار کی علیحدہ علیحدہ شرحیں لکھی گئی ہیں، جن میں لفظی موشگافی کے بجائے سچ مچ معارف کے دفتر کھولے گئے ہیں۔ یہ اشعار بہر صورت تشریح طلب نہ تھے بلکہ ڈاکٹر صاحب نے مبہم اشعار کو دانستہ نظر انداز کیا ہے اور صرف منتخب پُر مغز اشعار کی تشریح پر زورِ قلم صرف کیا ہے۔ یہ شرحیں خاصی طولانی ہو گئی ہیں اور تکرارِ مطالب کے باعث بعض جگہ درسی کتاب کا سا مزا پیدا ہو جاتا ہے۔ مگر ان کی افادیت اور کتاب کی مجموعی دلچسپی کا اعتراف شرط ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے علمی تصریحات کے ساتھ ساتھ تنقیدِ شعر کے نہایت اعلیٰ مذاق کا ثبوت دیا ہے اور اس مقولے کے معنی الٹ کر رکھ دیئے ہیں کہ شعر مرا به مدرسه که بُرد؟ غالب کے فارسی اشعار کے معنی و محاسن کے بیان میں فاضل مصنف نے جو کاوش کی خاص طور پر قابلِ داد ہے، جو ویسے بھی بے توجہی کا شکار رہا ہے۔

بنگال میں اردو

مولفہ وفا راشدی
مکتبہ اشاعتِ اردو حیدرآباد (سندھ)
(باتصویر)
۲۹۶ صفحات قیمت (مجلد) پانچ روپے

ادیبوں کا یہ تذکرہ کوٹری (سندھ) میں بیٹھ کر ترتیب دیا ہے، جو خود ہی کچھ کم بات نہیں۔ کتاب کے لئے مسالہ یقیناً بڑی جستجو سے فراہم کیا گیا ہے۔ مصنف کے مآخذ اردو کے متداول تذکروں سے لے کر خانگی بیاضوں تک پہنچتے ہیں۔ کتاب کی ترتیب بڑی معقول اور مفصل ہے۔ اردو کی ابتدائی تاریخ بنگال میں اردو کی ترویج اور فروغ کے مختلف ادوار، (مع فورٹ ولیم کالج، مٹیا برج) بنگال کے ہندو ادیب، اہلِ قلم خواتین، صحافت، ادبی انجمنیں۔ غرض تمام متعلقہ موضوعات پر علیحدہ ابواب قائم کئے گئے ہیں اور درحقیقت تالیف کا حق ادا کر دیا ہے۔ مطبوعات کی ایک طویل فہرست بھی مرتب کی ہے۔ کتاب ادبی تنقید کے لحاظ سے امتیاز نہیں رکھتی۔ مگر معلومات کا وافر ذخیرہ مہیا کرتی ہے جو خاصا بصیرت افروز ہے۔ اردو کی اس خانہ خرابی کے وقت میں جبکہ اپنے اور پرائے سبھی اس زبان سے دست کش ہو رہے ہیں، اس کتاب کی اشاعت بہت بروقت اور بڑی مفید ہے۔ بنگال میں اردو کے فروغ کا یہ کھلا ہوا بیان اس بات کی دلیل ہے کہ اردو کسی خطہ سے مخصوص بھی نہ تھی، بلکہ ایک تہذیب کی ترجمان تھی، اور جہاں جہاں اس تہذیب کے آثار رہے، اس کا چرچا بھی رہا۔ خود مولف کی اردو تحریر بڑی شائستہ مگر ان کے گھر کی زبان بنگالی ہے۔ اگر وہ اس قسم کا کوئی تذکرہ بنگالی میں بھی لکھیں تو مفید ہوگا۔

چاند نگر

مصنفہ ابن انشا
۲۵۶ صفحات۔ قیمت تین روپے (مجلد)
ناشر، مکتبہ اردو لاہور

یہ ابن انشا کی شاعری کا تازہ مجموعہ ہے جس میں ۱۹۴۷ء سے اب تک کا کلام ہے۔ "انشاجی" اردو کے نوجوان شاعروں میں کوئی ۱۵ سال سے متعارف اور جوہر شناسوں میں مقبول ہیں۔ ان کی نظموں اور غزلوں کا انداز بالکل اپنا اور بڑا دلپذیر ہے۔ دھیما دھیما لہجہ سلجھی سلجھی باتیں۔ انشا کی طبیعت میں بڑا گداز ہے مگر جذبات میں اسی قدر ٹھہراؤ بھی ہے۔ وہ کہیں بھی کھل کر نہیں برستے۔ ان کے دھیمے بولوں میں بڑی حرارت ہے مگر یہ کہیں بھڑکنے نہیں پاتی۔ ایک پرسوز لے ہے مگر کوئی جھنکار نہیں۔ بڑا گہرا احساس اور بڑے تلخ مشاہدات بھی ہیں مگر کوئی غصہ کوئی غوغا کوئی نعرہ نہیں۔

ان کی طبیعت نے ایسے بہت سے بہانے ڈھونڈے۔ ان کے موضوعات میں ان کی مشہور نظمیں "بغداد کی رات" اور "شنگھائی سے بنکاک کا چاند" "ڈھلتی رات" "خزاں کی شام" اور "سیل امروز" تک بہت کچھ ہے جس میں مشاہدات کی ایک خاصی بڑی دنیا سمائی ہوئی ہے مگر انہوں نے اپنی پُرگدازی کی خوب تعبیر کی ہے۔ ؎

یہ بھی سچ ہے نہ کچھ بات بھی کی نہ سونی راتوں میں دیکھا کئے چاندنی

پھر یہ سودا ہے ہم کو پرانا سجن" اور جینے کا اپنے بہانہ سجن"

یعنی: "کیا کریں اپنی زندگی ہے یہی"۔ شاعر نے اپنے خود نوشت مقدمے میں اپنا اور اپنی شاعری کا بڑے شگفتہ اور فہمیدہ انداز میں ذکر کیا ہے۔ اور اکثر باتیں دل کو لگتی ہوئی ہیں۔ مگر نہ یہ کہ وہ میر کے تتبع میں رواں بحریں اختیار کرتے ہیں۔ ان کی بحروں کی تعریف روانی نہیں بلکہ نرم روی ہے۔ ہمیں اس پر بھی تعجب ہے کہ وہ کہیں کہیں ناموزوں مصرعے کیونکر باندھ جاتے ہیں جو حروفِ علت کو بالکل نظر انداز کر کے بھی ٹھیک نہیں بیٹھتے۔ ان شاذ مثالوں سے قطع نظر اس ادبی خزاں گردی میں ہم انسانی، سلونی، دل تک پہنچنے والی شاعری کے اس نئے ستھرے مجموعے کو سر آنکھوں پر رکھنے کے لائق سمجھتے ہیں۔

حدیثِ عشق

(رباعیات بالتصویر)

۴۸ صفحات - اثر خواجہ عبدالحمید عرفانی

کتاب فروشی ابن سینا - طہران

قیمت ۱۵ ریال

خواجہ عرفانی کوئی چھ سال طہران میں پاکستانی سفارت خانے کے وابستۂ مطبوعاتی و مشاورِ فرہنگی رہے۔ ان کا ذوقِ فارسی ایران کے اکابر اساتذہ سے داد لے چکا ہے ان میں ملک الشعرا بہار مرحوم بھی شامل ہیں جن کی حیات پر عرفانی نے بڑی تحقیق سے ایک مقالہ بھی لکھا ہے۔ زیرِ نظر مجموعہ میں دکتر ناظم زادہ کرمانی کا تحریر کردہ مقدمہ شامل ہے جس میں اس ادبی خدمت کو بھی بہت اچھے الفاظ میں سراہا گیا ہے۔ عرفانی کی ایک تصنیف "رومیِ عصر" بھی علامہ اقبال کو ایرانیوں سے روشناس کرانے میں معاون ہوئی۔ اس مجموعے میں عرفانی کی فارسی رباعیات کے علاوہ چند نظمیں، چند غزلیں بھی ہیں۔ سارے کلام کا رنگ عارفانہ ہے۔ مگر اس کے پہلو بہ پہلو ان تصاویر کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے جن میں بڑی صفائی سے حسن پر عشق کو مچلتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ عرفانی کے کلام میں قندِ پارسی کی حلاوت کے ساتھ پاکستانی ارادتمندی اور خلوصِ دل بھی ہے جس نے اہلِ ایران کو ضرور متاثر کیا ہوگا۔ انہوں نے اپنی نظموں میں جیسے کہ "معراجِ خیال"، "تہران"، "آذربائیجان"، ایران کی سرزمین سے اپنی عقیدت کا بڑے پُرخلوص پیرائے میں اظہار کیا ہے۔ عرفانی جدید فارسی میں بڑی عمدہ دستگاہ رکھتے ہیں۔ بقول ناظم زادہ "این شاگردِ ہنرور اقبال، قدرا آہنگ خوش لہجہ دلکش فارسی را بہتر از بسیارے باز شناختہ گلہے شتابان در زمانے افتان و خیزان در راہے کہ گویندگان بزرگوار و سخن سرایان نامدار ما از آن گزشتہ اند گام نہد و با زبان شعر با اہلِ دل پیغام می دہد"

ماہنامہ ساقی - کراچی جوبلی نمبر

۵۰۰ صفحات قیمت ۵ روپے

دفتر رسالہ ساقی کراچی نمبر ۵

پچھلے چند مہینوں میں بعض رسائل نے نئے، دلچسپ موضوعات پر بڑی آب و تاب کے مجموعے شائع کئے۔ ساقی کا جوبلی نمبر اس سلسلے کی تازہ ترین اور بڑی وقیع تالیف ہے۔ جسے شاہد احمد کے خاص مددگار خالد حسن قادری نے بلاشبہ بڑی محنت سے مرتب کیا ہے۔ اس شمارے کی خصوصیت خاصہ پچیس سال کے پچیس تاریخی و تنقیدی جائزے ہیں جن میں "اردو زبان کے پچیس سال" سے لے کر ادب کی معروف اصناف حتیٰ کہ صحافت، رسائل اور بچوں کے ادب تک کے "پچیس سال" پر علیحدہ علیحدہ مضامین شامل ہیں۔ ان کے علاوہ پاکستان و ہند کی دوسری زبانوں اور عربی، فارسی، روسی، جاپانی، امریکی ادب کے پچیس سالہ جائزے بھی ہیں۔ دو مضامین "مشرق وسطیٰ کے پچیس سال" اور "معاشیات کے پچیس سال" بھی شامل اوراق ہیں۔ اس سلسلے کو تا حدِ قیاس طول دیا جا سکتا تھا لیکن ساقی نے ایک ہی اشاعت میں جتنے کچھ موضوعات سمیٹ لئے وہ بھی بڑے حوصلے کی بات ہے۔ پچیس سال کے پچیس اردو افسانوں کا انتخاب ان پر مستزاد ہے۔ اگرچہ ان میں سے بعض نہ منتخب کہے جا سکتے ہیں نہ افسانے۔ ظاہر ہے کہ اس طرح ہر موضوع کا حق ادا ہونا ممکن نہ تھا، مگر بیشتر مضامین کسی نہ کسی لحاظ سے مفید یا دلچسپ ہیں۔ اور پورا مجموعہ سچ مچ یادگار کہلانے کا مستحق ہے۔ اس چوتھائی صدی میں ساقی خود ایک انجمن رہا ہے جس سے بہت سے نامور ادیبوں کے نام اور کارنامے وابستہ ہیں یہاں اس کی کا صرف ذکر ہی کرنا ممکن ہے جسے شاہد نے باقی چھوڑ دیا یعنی "ساقی کے پچیس سال" مگر ہم ساقی کو اس کی جوبلی اور جوبلی نمبر دونوں پر مبارکباد دیتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ یہ ایک نئے، زندہ تر دور کا آغاز ہوگا۔

اُردو ادب اور نفسیات: ——— (بقیہ صـ ۴۳)

سارا ناول اسی ایک کردار کے گرد گھومتا ہے۔ عصمت نے نہ صرف اس کی خارجی زندگی کی عکاسی کی ہے، بلکہ اس کے دل و دماغ کو بھی ہمارے سامنے رکھ دیا ہے۔ کہیں اشاروں کنایوں میں، کہیں چٹکیاں لیکر صاف اور کھلے الفاظ میں چوٹیں کر کے انسانی نفسیات کے چہرے سے جس طرح نقاب اٹھائی ہے اور جس خوبصورتی اور باریکی سے نفسیاتی تجزیہ کی تکنیک کو اپنے آرٹ میں سمویا ہے، وہ ان کے سلیقہ اور کمال کی شاہد ہے۔ عصمت اگر نوجوان لڑکیوں اور لڑکوں کی روح کے اندر گھس کر ان کی فطرت کو بے نقاب نہ کرتیں، جو موجودہ دور کی الجھنوں سے ایک ٹیڑھی لکیر بنتی ہے، تو شاید ہمارے لئے ایک سیدھا راستہ بنانے میں بہت بڑی دشواری پیش آتی۔

کرشن چندر کا ناول "شکست" بھی انہی جدید ناولوں کے زمرے میں آتا ہے۔ اس میں بھی خارجی واقعات دحقائق کے ساتھ ساتھ داخلی واقعات وکوائف کی بھی عکاسی کی گئی ہے۔ کرشن چندر کو نفسیاتی کیفیات کو بیان کرنے کا ملکہ حاصل ہے، اضطراری فعل بھی انسان کی دماغی اور ذہنی کیفیات ظاہر کرتے ہیں اور کرشن چندر نے جہاں اضطراری افعال کا تذکرہ کیا ہے نفسیاتی حیثیت سے بہت کامیاب ہے۔

نفسیات اور ناول کے متعلق بحث کرتے ہوئے عزیز احمد کے ناول "گریز" کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ تحت الشعور کے طوفان میں جنسی اور نفسیاتی ہلچل کی مصوری جس چابکدستی اور بے باکی سے عزیز احمد نے کی ہے، وہ انہی کا حصہ ہے۔ اس ناول میں بھی اور نفسیاتی ناولوں کی طرح کہانی ایک ہی کردار کے گرد گھومتی ہے اور دوسرے کردار پس پشت پڑ جاتے ہیں، یا ابھرتے بھی ہیں تو محض ہیرو کے کرداری نقوش اور ذہنی عوامل کو اجاگر کرنے کے لئے۔ یہ تضاد اور تقابل کا فنکارانہ اسلوب و انداز نفسیاتی حیثیت سے ناول کو چار چاند لگا دیتا ہے۔ سارا ناول ہیرو نعیم کی ذہنی بے چینی اور اس کی غیر مطمئن زندگی کا غماز ہے۔ نعیم کی زندگی کے واقعات کہیں اس کے احساس کمتری کو نمایاں کرتے ہیں اور کہیں اس کو اس کی سیاسی غلامی کا احساس دلاتے ہیں، اور پھر اس شدتِ احساس کا ردعمل اور انتقامی جذبہ مختلف واقعات کی صورت میں نمودار ہوتا ہے۔ غرضکہ سارا ناول عمل اور ردعمل کی ایک نفسیاتی داستان ہے جس میں قدم قدم پر جنسی کشمکشیں اور ذہنی الجھنیں اپنا رنگ دکھاتی ہیں۔

قرۃ العین حیدر اور صالحہ عابد حسین نے بھی ایسے ناول لکھے ہیں جن میں تحت الشعور کا انکشاف اور نفسیاتی تجزیہ کارفرما ہے۔ دوسرے ناول نگار مثلاً رئیس احمد جعفری، رشید اختر ندوی، اور عادل رشید وغیرہ نے بھی اپنے ناولوں میں نفسیاتی اشارے اور کنائے سے کام لیا ہے۔

غرضکہ اردو ادب میں ایسے نفسیاتی ناولوں کا فقدان نہیں جن میں فطرت انسانی سے نقاب اٹھائی گئی ہو۔ یہ ضرور ہے کہ بعض اچھے لکھنے والوں نے اس صنف سے بے توجہی برتی ہے اور افسانے کے محدود کینوس پر ہی اپنے مشاہدات پیش کرتے رہتے ہیں۔

(تلخیص) بشکریہ ریڈیو پاکستان لاہور و راولپنڈی)

لکیروں کی زبان: ——— (بقیہ صفحہ ۹۱)

اپنے گھر پر دعوت دی۔ وہاں کے دوسرے فنکاروں سے ملانے کے لئے۔

اس کے بعد میرا معمول یہ تھا کہ گھر سے نکلتا تو سکیچ پیڈ اور پنسل ساتھ لیتا۔ ہوٹل میں پہنچ کر تصویروں کی مدد سے کسی انگریزی داں کو ڈھونڈ نکالتا اور پھر اس کی مدد سے فنکاروں اور دوسرے لوگوں سے ملتا۔

اسپین کے سفر میں لکیروں کی زبان ہی میری زبان تھی۔ اور اسی کی مدد سے میں نے سب کام نکال لئے ●

ایک اور صنم: ——— (بقیہ صفحہ ۱۴)

بیوقوف بنا کر دوسروں کو فائدہ پہنچاتا ہے، اس کی زندگی کی سب سے بڑی خواہش اپنے آپ کو دھوکا دینا ہے! "رنڈی کا کوٹھا اور پیر کا مزار بھی دو جگہیں ہیں جہاں میرے دل کو سکون ملتا ہے اور دونوں جگہوں کے فرش سے لے کر چھت تک دھوکا ہی دھوکا ہوتا ہے۔ جو آدمی خود کو دھوکا دیتا جاتا ہے، اس کے لئے اس سے اچھا مقام کیا ہو سکتا ہے۔" اس فلسفے کے باوجود بابو گوپی ناتھ جو کچھ کرتا ہے سوچ سمجھ اور جان بوجھ کر کرتا ہے۔ شاید اسی لئے بابو گوپی ناتھ کا کردار ایک دلکش رومانوی کردار سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا، اس کے فلسفہ میں اس کی زندگی اور اس کے اعمال کا پورا جواز نہیں ملتا۔

یہ ماحول اور اس ماحول کے کردار منٹو کی اصل یادگار رہیں، اور انہی میں منٹو کے جوہر کا ثبوت ملتا ہے۔ منٹو کو دیوتا بنا کر پوجنے والوں کو یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ ابھی اردو اور اردو افسانہ نگاری کو بہت آگے جانا ہے۔ منٹو اور اس کی افسانہ نگاری اس سفر کا ایک ابتدائی مقام ہے۔ اگر ہم اسی پر مطمئن ہو گئے تو اگلی منازل اور زیادہ دور ہو جائیں گی۔

بہادر یار جنگ: ——— (بقیہ صفحہ ۱۱۵)

تحریکوں کا جیسا اچھا تقابلی مطالعہ انہوں نے کیا تھا اور جیسا تجزیہ وہ کرتے تھے، بہت کم دیکھنے میں آیا ہے۔ عربی اور فارسی سے تو خیر اچھی واقفیت تھی ہی لیکن آخر عمر میں انگریزی بھی خاصی سیکھ لی تھی اور اکثر مسلم لیگ کے سالانہ جلسوں میں قائد اعظم کے خطبات کا فی البدیہہ ترجمہ کیا کرتے تھے۔

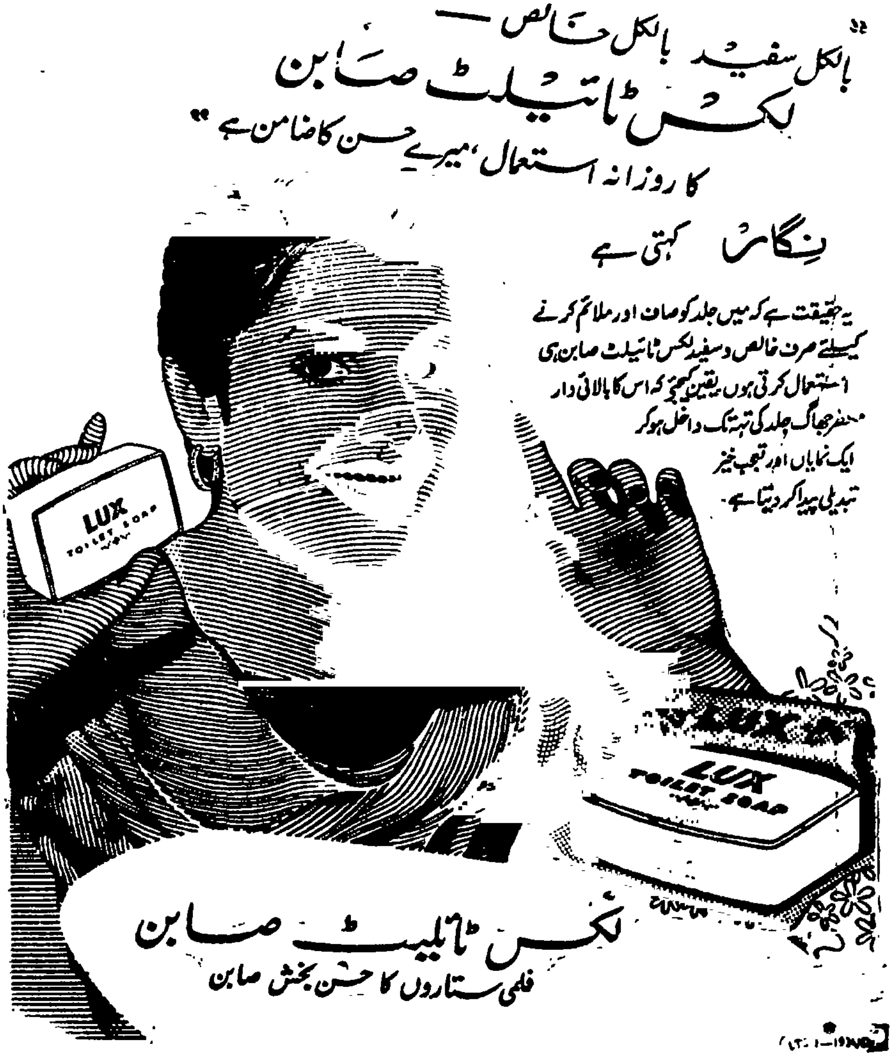
ان کے اٹھ جانے سے کیا ہندوستان کیا پاکستان ہر جگہ کے مسلمانوں کو نقصان پہنچا۔




فوراً جھاگ دینے والا سن لائٹ صابن
کپڑے پٹکے بغیر سفید اور اُجلے دھوتا ہے
SUNLIGHT
SOAP
سن لائٹ صابن


دِن بدِن
صاف اور حسین جلد
کیڈل ★ آمیز رکسونا
سے اپنے اصلی حسن کو
نکھرنے دیجیے
رکسونا کے کیڈل سے مالا مال جھاگ کو اپنی جلد پر نرمی سے ملئے
اور پھر دھو ڈالئے پھر دیکھئے آپ کی جلد دن بدن نرم اور
ملائم ہوتی جائے گی جس سے آپ کا حسن درخشاں ہو جائے گا
رکسونا
★ کیڈل آمیز واحد صابن
★ جلد کو ملائم کرنے اور مقوی جلد
تیلوں کے ایک خاص مرکب کا ملکیتی نام ہے


تندرست و توانا
ڈالڈا سے پکے ہوئے
کھانے کی بدولت
اس کی ماں جب اپنے بچہ کو دیکھتی ہے تو
محسوس کرتی ہے کہ تندرست و توانا بچہ کتنا پیارا
ہوتا ہے صحت مند ہنس مکھ اور کھانے کے وقت کبھی
چہرے سے بے لطفی ظاہر نہیں ہوتی اسی لئے تو وہ ہمیشہ
کھانا ڈالڈا وناسپتی سے پکاتی ہے جو کہ خالص و صحت مند
ہوتا ہے اور کھانے کی لذت بڑھاتا ہے اور پھر ڈالڈا
بیحد قوت بخش بھی تو ہوتا ہے۔ آج ہی ایک ہوا بند و مہر دار
ڈبہ خرید لیجئے۔
DALDA
VANASPATI
ڈالڈا
وناسپتی
صرف کھجور کے پیڑ کے
مارکے کا ڈبہ لیجئے۔
ڈالڈا بہتر کھانے کو بہترین بناتا ہے



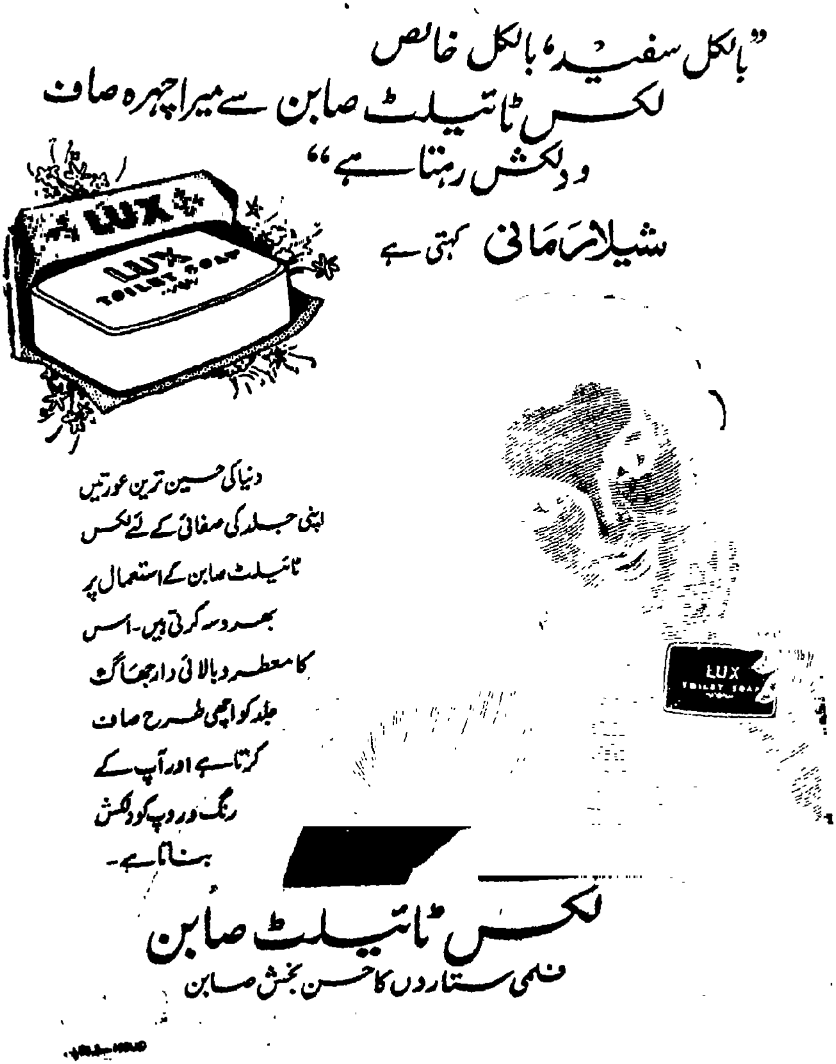
ادارہ مطبوعات پاکستان پوسٹ بکس نمبر ۱۸۳ کراچی نے شائع کیا - مطبوعہ ناظر پرنٹنگ پریس کراچی
مدیر :- رفیق خاور


ملیریا
آپ کا جانی دشمن
اور بدترین خطرہ ہے
کیا آپ جانتے ہیں کہ اس ملک میں ہر سال ہزاروں آدمی ملیریا کا شکار ہو کر مر جاتے ہیں۔ آپ کہیں بھی ہوں اس کی زد سے محفوظ نہیں ہیں۔ خاص کر دیہات میں سفر کرتے وقت آپ کو ہر لمحہ خطرہ ہے اس لیئے ہر ممکن احتیاط اور بچاؤ کا لحاظ رکھیئے خود کو اور اپنے کنبے کو "پیلوڈرین" کے ذریعہ ملیریا سے محفوظ رکھیئے۔
پیلوڈرین
ملیریا سے محفوظ رکھتا ہے
ساری دنیا میں پیلوڈرین کو موثر ترین "دافع ملیریا" تسلیم کیا جاتا ہے
پیلوڈرین کا استعمال برابر جاری رکھیئے
بالغوں اور ۱۲ سال سے اوپر کے بچوں کے لیئے۔ ایک ٹکیہ (0.3 Gm)
۶ سے ۱۲ سال تک کے بچوں کیلئے نصف ٹکیہ
کم عمر بچوں کے لیئے اپنے "ڈاکٹر" سے مشورہ کیجیئے۔
ہفتہ میں ایک بار اور اسی دن پیلوڈرین کا استعمال کھانا کھانے کے بعد ایک گلاس پانی کے ساتھ کیجیئے
ICI
ICP 410 (P)


آپ کو ہر روز گندگی کے جراثیم
سے بیماری کا خطرہ
رہتا ہے
لائف بوائے سے ان جراثیم کو اپنے
جسم سے دھو کر ہر روز اپنی حفاظت
کیجئے
لائف بوائے کا
محافظ جھاگ آپکی تندرستی
کی حفاظت کرتا
ہے
لائف بوائے
صابن
ہر روز کی گندگی کے جراثیم سے
آپ کی حفاظت کرتا ہے
LIFEBUOY
SOAP


ملیریا
آپ کا جانی دشمن
اور بدترین خطرہ ہے
کیا آپ جانتے ہیں کہ اس ملک میں ہر سال ہزاروں آدمی
ملیریا کا شکار ہو کر مر جاتے ہیں۔ آپ کہیں بھی ہوں اس کی زد
سے محفوظ نہیں ہیں۔ خاص کر دیہات میں سفر کرتے وقت
آپ کو ہر لمحہ خطرہ ہے اس لیے ہر ممکن احتیاط اور بچاؤ کا
لحاظ رکھیے خود کو اور بال بچوں کو "پیلوڈرین" کے
ذریعہ ملیریا سے محفوظ رکھیے۔
پیلوڈرین
ملیریا سے محفوظ رکھتی ہے
ساری دنیا میں پیلوڈرین کو موثر ترین "دافع ملیریا"
تسلیم کیا جاتا ہے
پیلوڈرین کا استعمال برابر جاری رکھیے
بالغوں اور ۱۲ سال سے اوپر کے بچوں
کے لیے۔ ایک ٹکیہ (0.3 Gm)
۶ سے ۱۲ سال تک کے بچوں کیلئے نصف ٹکیہ
کم عمر بچوں کے لیے اپنے ڈاکٹر سے
مشورہ کیجئے۔
ہفتے میں ایک بار اور اسی دن پیلوڈرین کا استعمال
کھانا کھانے کے بعد ایک گلاس پانی کے
ساتھ کیجئے
ICI
ICP 410 (P)


آپ کو ہر روز گندگی کے جراثیم سے بیماری کا خطرہ رہتا ہے
لائف بوائے سے ان جراثیم کو اپنے جسم سے دھو کر ہر روز اپنی حفاظت کیجئے
لائف بوائے کا محافظ جھاگ آپکی تندرستی کی حفاظت کرتا ہے
لائف بوائے
صابن
ہر روز کی گندگی کے جراثیم سے آپ کی حفاظت کرتا ہے
LIFEBUOY


"بالکل سفید، بالکل خالص
لکس ٹائیلٹ صابن سے میرا چہرہ صاف
و دلکش رہتا ہے"
شیلا رمانی کہتی ہے
LUX
LUX TOILET SOAP
دنیا کی حسین ترین عورتیں
اپنی جلد کی صفائی کے لئے لکس
ٹائیلٹ صابن کے استعمال پر
بھروسہ کرتی ہیں۔ اس
کا معطر دبالائی دار جھاگ
جلد کو اچھی طرح صاف
کرتا ہے اور آپ کے
رنگ و روپ کو دلکش
بناتا ہے۔
لکس ٹائیلٹ صابن
فلمی ستاروں کا حسن بخش صابن

ماہِ نو

جلد ۸ شمارہ ۷ اکتوبر ۱۹۵۵ء

مدیر:۔ رفیق خاور

نائب مدیر:۔ ظفر قریشی

پاکستان اور ہندوستان میں سالانہ چندہ پانچ روپے آٹھ آنے۔ فی کاپی پاکستان اور ہندوستان میں آٹھ آنے

آپس کی باتیں

شہیدِ ملت لیاقت علی خاں اُس جذبہ اور ذوق و شوق کا ایک عظیم مظہر تھے جس نے پاکستان کو جنم دیا تھا۔ وہ ان نازک ترین لمحات میں بھی قوم کی خدمت کے لئے سینہ سپر رہے جب آزادی کی جنگ جاری تھی اور اس زمانے میں بھی پیش پیش رہے جبکہ ہماری نوزائیدہ مملکت کو اندر اور باہر دونوں طرف سے نہایت پُرآشوب حالات کا سامنا تھا۔ چنانچہ اس مردِ غازی نے، جو تمام تر جذبۂ خدمت سے سرشار تھا، اپنے وطنِ عزیز ہی کی خاطر جامِ شہادت نوش کیا اور اپنے خون کے بے بہا قطروں سے کشتِ وطن کی آبیاری کی۔ اسی لئے ہماری آنکھیں آج بھی ان کے لئے گریہ ساماں ہیں اور ہمارے دل ان کی یاد سے معمور ہیں۔ ان کی بلند شخصیت، ان کے گوناگوں اوصاف اور عظیم کارنامے اس عظیم تر ہیئت کا جزو بن گئے ہیں جسے "پاکستان" کہتے ہیں۔ اسی لئے ان کا نقش اُس نگارخانے میں ہمیشہ آدینماں رہے گا۔

ڈھاکہ میں وقتاً فوقتاً مصوری کی نمائشیں منعقد ہوتی رہی ہیں جن سے ظاہر ہے کہ یہ فن وہاں شائستہ حلقوں میں روز بروز کس قدر مقبول ہوتا جا رہا ہے۔ چنانچہ "ڈھاکہ آرٹ کونسل" کے بعد "بلبل اکاڈیمی آف فائن آرٹس" کا قیام فنونِ لطیفہ کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کا ثبوت ہے۔ فنون صرف خواص ہی کی ملکیت نہیں۔ عوامی آرٹ شعوری فلسفیانہ اقدار سے معرا ہونے کے باوجود ایک ادائے خاص سے خالی نہیں ہوتا کیونکہ یہ درحقیقت ساری قوم کے دل و دماغ کی پیداوار ہوتا ہے۔ اور بسا اوقات عام سطح سے اُبھر کر ادب و فن میں ایک نئی روح پھونک دیتا ہے۔ جیسے کہ یادش بخیر بلبل چودھری مرحوم نے عوامی رقص کو نمایاں کرکے رقاصی کے فن میں جان ڈال دی تھی۔ کچھ عجب نہیں کہ عوامی فنون کی اس نمائش سے بھی ایسے ہی نتائج رونما ہوں جن کے کچھ نمونے اس شمارے میں پیش کئے جا رہے ہیں۔

اردو شاعری کی نئی اصناف میں سے ایک "سانیٹ" ہے۔ دیگر نئی اصناف — "نظم آزاد"، "ڈرامائی مونولاگ" وغیرہ کی طرح اس کی ابتدا کے بارے میں کچھ اختلاف موجود ہے۔ قاضی احمد میاں اختر جوناگڈھی مرحوم کا دعویٰ تھا کہ اردو میں پہلا سانیٹ انہوں نے لکھا۔ لیکن ان سے پہلے کچھ سانیٹ مولوی عظمت اللہ مرحوم لکھ چکے تھے جن میں ایک فقرے کو کئی کئی مصرعوں پر پھیلانے کا التزام کیا گیا تھا، گو وہ بھی قافیہ سے آسان نہ گزر سکے۔ سانیٹ نویسی کا مستقل سلسلہ "راوی" (گورنمنٹ کالج۔ لاہور) سے شروع ہوا جس کے کسی شمارہ میں ۱۹۳۰ء کے لگ بھگ، انگریزی کا ایک سانیٹ شائع ہوا تھا۔ اس کا ترجمہ ایک اور شاعر نے یوں کیا تھا —

فرصت لمحہ کاش اتنی بڑھے

دن سے مہ مہ سے سال ہو جائے (وغیرہ)

(یہ سانیٹ انگریزی سانیٹوں کی طرح ۱۴ مصرعوں پر مشتمل تھا)،

ن۔ م۔ راشد اسی درسگاہ میں تعلیم پا رہے تھے جہاں سے یہ رسالہ شائع ہوتا ہے۔ اس زمانے میں انہیں "ہیئت" کے تجربات کا شوق نیا نیا تھا۔ چنانچہ انہوں نے اس سراپا ہیئت صنف کو اپنا لیا اور اس کا نام "ہم ذک" رکھا جیسے کہ DRAMATIC MONOLOGUES کا نام "ڈرامائی واحد کلامیاں" رکھا تھا۔ اختر شیرانی بھی ہیئت کے دلدادہ تھے۔ انہیں سانیٹ بہت پسند آیا اور انہوں نے اس کثرت سے سانیٹ لکھے کہ یہ صنف انہی سے منسوب ہو کر رہ گئی۔ ایسے بعض حالات اور روایات عام طور پر نامعلوم مگر بیان کے لائق ہیں۔ جن حالات میں نئی اصناف ظہور پذیر ہوئیں ان کی وضاحت دلچسپ بھی ہوگی اور ضروری بھی ہے۔ اس شمارہ میں جناب قیوم نظر نے "اردو شاعری میں ہیئت کے تجربات" کے زیرِ عنوان دو نئی اصناف سانیٹ اور کینٹو کی اردو میں ترویج اور ترقی پر روشنی ڈالی ہے۔ امید ہے کہ ہیئت کے دیگر تجربات بالخصوص نظمِ آزاد کا بھی اسی طرح محرمانہ مطالعہ کیا جائے گا اور ان کی خصوصیات کے ساتھ ساتھ متعلقہ روایات کی بھی چھان بین کی جائے گی۔

ماہِ نو، کراچی۔ اکتوبر ۱۹۵۵ء

اردو کے غیر معروف ناول

(۳)
(جنونِ انتظار یعنی فسانۂ مرزا رسوا)

غلام عباس

ناول نگاری کی تکنیک کا ایک اسلوب یہ بھی ہے۔ کہ ناول نگار قصے میں زیادہ سے زیادہ تاثر پیدا کرنے اور اسے زیادہ سے زیادہ واقعیت کا رنگ دینے کے لئے ناول کے شروع میں اپنی ملاقات ہیرو، ہیروئن یا کسی اور اہم کردار سے کراتا ہے۔ اور پھر سارا قصہ اسی کی زبان سے بیان کر دیتا ہے۔ ناول لکھنے کا یہ طریق انیسویں صدی کے وسط کے یورپی ادب بالخصوص فرانسیسی حقیقت پسند ناول نویسوں کو بہت مرغوب تھا۔ ہمارے ہاں اردو میں مرزا محمد ہادی رسوا کا مشہور ناول "امراؤ جان ادا" اس تکنیک کی بہت عمدہ مثال ہے۔

اس ناول کے آغاز میں مصنف کی ملاقات ایک مختصر سی مجلس مشاعرہ میں ہیروئن سے ہوتی ہے۔ دونوں لکھنؤ کے رہنے والے، موزوں طبع اور سخن فہم ہیں۔ رفتہ رفتہ ربط بڑھتا ہے اور بالآخر امراؤ جان ادا اپنی سرگزشت مرزا رسوا کو سناتی ہے۔ جسے وہ قلمبند کر لیتے ہیں۔ یہ ناول انیسویں صدی کے اواخر میں (غالباً ۱۸۹۹ء میں) لکھنؤ میں شائع ہوا تھا۔ اسی زمانے میں ایک مختصر ناول "جنونِ انتظار یعنی فسانۂ مرزا رسوا" بھی چھپا تھا۔ جس کی مصنفہ کا نام امراؤ جان ادا تھا۔ اس کتاب میں مرزا رسوا کا افسانہ عشق بیان کیا گیا تھا۔ اور مصنفہ کا انداز تحریر، جیسا کہ اس کے دیباچے سے ظاہر ہوتا ہے، کچھ اس قسم کا تھا۔ کہ مرزا صاحب آپ نے جو میرے حالات چھاپ کر مجھے رسوا کیا ہے۔ میں بھی آپ کا کچا چٹھا چھاپ کر اس کا بدلہ لیتی ہوں۔

ایک مدت تک میں اس کتاب کو ایک قسم کی "ادبی شوخی" ہی تصور کرتا رہا۔ میرا خیال تھا۔ کہ بیچاری امراؤ جان ادا کے خلاف خواہ ایک افسانوی کردار ہی کیوں نہ ہو، مصنف اور ناشر نے ایک طرح سازش سی کر کے اپنا اپنا مقصد حل کیا ہے۔ یعنی یہ کہ مرزا رسوا نے اس بہانے اپنے افسانہ عشق کو خود الم نشرح کیا ہے اور ناشر نے کتابوں کی فروخت کے لئے اسے اشتہار بازی کا ذریعہ بنایا ہے۔

حال ہی میں "نقوش" کے شخصیات نمبر میں جناب علی عباس حسینی نے مرزا رسوا کے جو حالات تحریر کئے ہیں، ان میں میری نظر جب ان الفاظ پر پڑی:۔

"امراؤ جان ادا سے (مرزا رسوا کی) ملاقات بڑھی تو اس کی زبانی زنانِ بازاری کے تجربات و طرزِ معاشرت کا خاکہ ایک ناول کی صورت میں پیش کیا۔"

تو مجھے امراؤ جان ادا کے بارے میں اپنا نظریہ بدلنا پڑا۔ یہ الفاظ اس قدر واضح اور ان کے لکھنے والے ملک کے مشہور ادیب جناب حسینی ایسے ثقہ راوی ہیں کہ ادا کی شخصیت کے حقیقی ہونے میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش ہی باقی نہیں رہتی۔ اگر صاحب موصوف اس سلسلے میں مزید معلومات بہم پہنچائیں، تو مرزا رسوا کے مداحوں پر، جن میں یہ خاکسار بھی شامل ہے، ان کا بڑا کرم ہوگا، کیونکہ اس طرح انہیں مرزا رسوا کو، بہ حیثیت ایک فن کار اور بہ حیثیت ایک انسان زیادہ قریب سے دیکھنے اور سمجھنے کا موقع مل سکے گا۔

اس تمہید کے بعد اب میں اصل کتاب کی طرف رجوع کرتا ہوں۔ میں ابتدا ہی میں یہ بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں۔ کہ اس کتاب کی ادبی حیثیت کچھ زیادہ نہیں ہے۔ البتہ تاریخی اور سوانحی حیثیت سے یہ بہت اہمیت رکھتی ہے۔ کیونکہ اس سے ہمیں مرزا رسوا کی زندگی کے بعض ایسے حالات مل جاتے ہیں جو کسی تذکرے یا تاریخ ادب اردو میں نظر نہیں آتے۔ ان حالات کا تعلق مرزا رسوا کے اس عشق سے ہے، جو انہیں ایک فرنگن سے ہوا تھا۔ اور جس کا ذکر جناب علی عباس حسینی

نے بھی اپنے "نقوش" والے مضمون میں کیا ہے۔ مرزا رسوا کی فرضی ہیروئن خوش قسمت ہے۔ کہ امراؤ جان آدا کی بدولت اس پر سے گمنامی کا وہ پردہ اٹھ گیا ہے جو مرزا غالب کی ڈومنی پر ابھی تک پڑا ہوا ہے۔

"مجنون انتظار یعنی فسانہ مرزا رسوا" ایک مختصر سی کتاب ہے۔ سائز ۱۸x۲۲/۸ اور صفحات کی تعداد پچیس ۲۵ - اس کا تقریباً نصف حصہ نثر میں ہے۔ اور نصف مثنوی کی صورت میں۔ شروع میں مصنفہ نے ایک دلچسپ دیباچہ بھی لکھا ہے جس میں وہ کہتی ہیں۔

"ناظرین! مرزا رسوا صاحب نے جو میری سرگزشت تحریر کی ہے، وہ غالباً آپ کی نظر سے گزری ہوگی۔ خیر یہ میں اب نہیں کہتی کہ اچھا کیا یا بُرا۔ مگر پہلے سے اس کا اقرار نہ تھا۔ اس لئے کسی قدر ملال ہوا۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ میری آوارگی کا افسانہ چھاپ کر شائع کیا جائے گا تو شاید میں ہرگز اس کے بیان کرنے پر راضی نہ ہوتی۔ واقعی مرزا صاحب کا چکمہ چل گیا۔ لطف یہ ہے کہ آپ فرماتے ہیں میں نے تجھ پر احسان کیا۔ اگر درحقیقت یہ احسان ہے۔ تو میں بھی ان کے ساتھ اس کا عوض کرتی ہوں ؎

دشنام دیجے مجھ کو بہت خوش نہ ہو جیے
کیا کیجئے گا آپ جو میری زباں کھلی

جب سے آپ نے میری سوانح عمری کے شائع کرنے کا قصد کیا۔ مجھے بھی کد ہو گئی تھی۔ کہ آپ کے بعض اسرار سے دنیا کو واقف کراوں۔ اس کے لئے مجھے خاص اہتمام کرنا پڑا۔ آپ کا ایک ملازم خاص جس کے نام و نشان سے میں مطلع نہیں کر سکتی مجھ سے موافق ہو گیا۔ ایک دن آپ ایک دوست کے گھر پر مشاعرہ میں تشریف رکھتے تھے۔ بندی نے فوراً گاڑی کرایہ کی۔ اور آپ کی کوٹھی پہنچی۔ آپ کا آدمی جو مجھ سے مل گیا تھا اس نے چپہ چپہ مجھے دکھا دیا۔ اسی آدمی کے ذریعے سے آپ کی ایک کتاب جس میں ایک تصویر اور بہت سے خطوط اور ایک ناتمام مثنوی "نالۂ رسوا" میرے ہاتھ آ گئی۔ کچھ حالات بعض دوستوں سے معلوم ہوئے۔ غرض کہ ان سب واقعات کو میں نے بطور خود لکھ کے چھپوا لیا جس دن مرزا صاحب نے میری سوانح عمری شائع کی۔ اور ایک جلد میرے ملاحظہ کے لئے بھیجی، اسی دن میں نے اس مختصر تحریر کی ایک جلد ان کی خدمت میں روانہ کی یقیناً مرزا صاحب خوش تو ہوئے ہوں گے مگر کیا کر سکتے ہیں۔

فدویہ
امراؤ جان آدا"
یکم اپریل ۱۸۹۹ء

اب میں اختصار کے ساتھ مگر قصے کا تسلسل قائم رکھتے ہوئے "مجنون انتظار" کے جستہ جستہ اقتباسات پیش کرتا ہوں۔

مرزا رسوا صاحب کی وجاہت اور طلاقتِ لسانی میں غضب کی دلآویزی ہے جس محفل میں بیٹھ جاتے ہیں عورت مرد سب ان ہی کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں۔ روتے آدمی کو ہنسا دینا ان کی ایک ادنیٰ بات ہے۔ خدا کی دی ہوئی ذہانت پر طرہ علمیت اور تجربہ کاری۔ ان اوصاف نے ان کے جوہر ذاتی کو اور جلا دیدی ہے۔ طبیعت کی موزونی، شوقِ شعر و سخن کو حسن پرستی کے مذاق نے چمکا دیا ہے۔ ان سب اوصاف کے ساتھ مزاج میں کسی قدر سنک ہے۔ بعض طبیبوں کی یہ رائے ہے کہ دشمنوں کو جنون کے دورے پڑتے ہیں۔ کسی کو یہ خیال ہے۔ کہ آپ کو پریوں کی تسخیر کا شوق ہے غرضیکہ کچھ نہ کچھ اسرار ضرور ہے۔

آپ جہاں رہتے ہیں اس کو وحشت آباد کہنا چاہیئے۔ لکھنؤ سے دو کوس کے فاصلے پر اس سڑک کے قریب جو لوہے کے پل سے نواب گنج کو جاتی ہے۔ ایک باغ کی مختصر چار دیواری نظر آتی ہے۔ اس کے چاروں طرف کوسوں تک میدان ہے۔ کہیں آبادی کا نام و نشان نہیں۔ یہاں آپ مع دو تین ملازموں کے رہتے ہیں۔ اس باغ کے وسط میں ایک چھوٹی سی کوٹھی بہت خوشنما بنی ہوئی ہے۔ کوٹھی کے سامنے تھوڑی دور پر ایک پختہ گول چبوترا ہے۔ اس کے گرد چمن بندی ہے گرمیوں کے زمانے میں یہاں بڑی خنکی ہوتی ہے۔ کیونکہ کئی سقے متواتر پانی چھڑکا کرتے ہیں۔ مرزا صاحب دوپہر کو اکثر یہیں تشریف

رکھتے ہیں۔ فکرِ اشعار کے لئے یہ مقام بہت ہی مناسب ہے۔ کوٹھی اندر سے خوب سجی ہوئی ہے۔ اس کے ایک کمرے میں مرزا صاحب خود آرام کرتے ہیں۔ باقی اور کمرے مقفل رہتے ہیں۔

کوٹھی کے سامنے ایک چھوٹا سا چھپر پڑا ہے۔ اس کے چاروں طرف لوہے کے تاروں کی جالی ہے۔ اس میں طرح طرح کے آلات نصب ہیں۔ آدمی کی زبانی معلوم ہوا کہ ان کے دیکھنے سے گرمی، سردی، آندھی مینہہ زلزلے وغیرہ کے حالات معلوم ہو جاتے ہیں۔ باغ کے ایک طرف مجھ کو ایک پختہ بہت گہری باؤلی دکھائی گئی۔ اس پر لوہے کے ستونوں سے ایک بہت اونچا برج بنا ہوا ہے۔ اس باؤلی اور برج میں نیچے سے اوپر تک اندھیر گھپ ہے۔ دن کو لالٹین جلا کے جانا ہوتا ہے۔ برج کی چھت میں جا بجا سوراخ ہیں۔ ان سوراخوں میں سے دن کو ستارے نظر آتے ہیں۔ اس باؤلی کے قریب ایک چھوٹی سی پختہ کوٹھری ہے اس میں کئی بڑی بڑی دوربینیں، دو کرے اور کچھ اور سامان رکھا ہوا ہے جسے میں نہیں سمجھ سکتی۔ مثنوی "نالۂ رسوا" میں مرزا صاحب ان صاحب کے حال میں جن کی یہ کوٹھی اور باغ ہے۔ اس طرح تحریر فرماتے ہیں:-

ایک صاحب تھے پہلے اس میں مقیم ۔۔۔ صاحبِ علم اور عقیل و فہیم
شوق تھا ان کو علم و حکمت سے ۔۔۔ ذوق تھا نکتہ ہائے فطرت سے
ایک لڑکی تھی اُن کی حور لقا ۔۔۔ حسن میں مہر و ماہ سے بھی سوا
کیا کہوں تجھ سے کیسی صورت تھی ۔۔۔ بے تصویر ایسی صورت تھی

یہ تصویر خوش قسمتی سے ہمیں مل گئی تھی۔ مگر مرزا رسوا صاحب نے باصرار ہم سے واپس لے لی۔ ورنہ اس کی نقل ہم ضرور ہی شائع کرتے۔

لب و لہجہ میں اُس کے سوا اعجاز ۔۔۔ برق سے بڑھ کے شعلۂ آواز
اس پہ طرہ کمالِ موسیقی ۔۔۔ دل سے محوِ خیالِ موسیقی
کسی اُستاد کی سکھائی ہوئی ۔۔۔ دلِ کافر میں لے سمائی ہوئی
ان کے دادا کا تھا فرانس وطن ۔۔۔ اور نانا تھے ساکنِ لندن
ہوئے ماں باپ ہند میں پیدا ۔۔۔ دل سے اس سرزمیں کے تھے شیدا
لکھنؤ میں یہ خود ہوئیں پیدا ۔۔۔ تھا یہی شہر جائے نشو و نما
ان کی دایا بھی لکھنؤ کی تھیں ۔۔۔ ان کی آیا بھی لکھنؤ کی تھیں

بولتی تھیں زبانِ اردو صاف ۔۔۔ کس قدر با محاورہ شفاف
لکنت ان کی زباں میں ہو کیا دخل ۔۔۔ گنجلک انکے بیاں میں ہو کیا دخل

مرزا رسوا اپنے اور مس صاحبہ کے تعلقات کے وجوہ اس طرح تحریر کرتے ہیں:

میرے عموئی نامدار وغیور ۔۔۔ جو کہ ہیں سارے شہر میں مشہور
فوجِ شاہی میں تھے کمان افسر ۔۔۔ ان کے احساں تھے ان کے والد پر
غدر میں اپنے گھر میں کر کے نہاں ۔۔۔ دشمنوں سے بچائی ان کی جان
گو کہ وہ معرضِ خطر میں رہے ۔۔۔ مگر آرام سے یہ گھر میں رہے
عورتوں میں بڑھی ملنساری ۔۔۔ مدتوں تک یہ رسم تھا جاری
میم صاحب کبھی یہاں آئیں ۔۔۔ کبھی میری چچی وہاں جائیں
آدمی روز آتے جاتے تھے ۔۔۔ حصے بخرے بھی جاتے آتے تھے
یہ سوئیاں پکا کے بھیجتی تھیں ۔۔۔ عید گھر میں منا کے بھیجتی تھیں
باغ سے اُن کے پھول آتے تھے ۔۔۔ ان کی بیری کے بیر جاتے تھے

مرزا رسوا اور مس صاحبہ آپس میں کھیلا کرتے تھے۔ بچپنے ہی میں محبت دلوں میں اثر کر گئی تھی۔ چنانچہ اس واقعہ کو مرزا صاحب نے اس طرح موزوں کیا ہے:

جس زمانے میں تھا یہ رسم و راہ ۔۔۔ جن دنوں تھا یہ چاہتوں کا نباہ
سوفیہ سے ہوئی مجھے الفت ۔۔۔ بڑھ گئی رفتہ رفتہ کچھ وحشت
بڑھ گیا ارتباط حد سے سوا ۔۔۔ ہو گیا اختلاط حد سے سوا
دلِ نازک کا خون ہو ہی گیا ۔۔۔ رفتہ رفتہ جنون ہو ہی گیا

مگر یہ محبت یک طرفہ نہ تھی بلکہ:

بسکہ یہ ربط جانبین سے تھا ۔۔۔ کل اسے تھی نہیں ہی چین سے تھا
عشق صادق تھا پاک الفت تھی ۔۔۔ مجھ سے بڑھ کر اسے محبت تھی

اس کے بعد ان دونوں خاندانوں پر تباہی آئی۔ مرزا رسوا کے چچا نے انتقال کیا۔ اور اس کے چند ہی روز کے بعد چچی بھی مر گئیں۔ اور ادھر

اسی اثنا میں مر گئے صاحب ۔۔۔ اس جہاں سے گزر گئے صاحب
میم صاحب بھی کر چکی تھیں قضا ۔۔۔ سوفیہ گھر میں ہو گئی تنہا

مگر مرزا رسوا ماتم پرسی تک کو نہ جا سکے۔ اس لئے کہ سوفیہ کو اب صاحب کے ایک عزیز نے اپنی حفاظت میں لے لیا تھا۔ وہ مرزا رسوا اور ان کے خاندان کے رسم و راہ سے مطلع نہ تھا۔ دوسرے اختلاف قوم و مذہب۔ ان خیالات نے ان کو روکا۔

گو کہ یارائے ضبط مجھ کو نہ تھا ‏ ‏ مگر ایسا بھی خبط مجھ کو نہ تھا
کہ مری وجہ سے وہ ہو بدنام ‏ ‏ ایسی باتوں کا تھا بُرا انجام

مس صاحبہ کو ان کے عزیز نے پہاڑ پر بھیج دیا۔ اور جائداد ورثی کورٹ ہو گئی۔ اس زمانے میں جو کچھ مرزا رسوا کے دل پر گزری اس کا حال سوا اُن کے یا خدا کے کوئی نہیں جان سکتا۔ نالہ و زاری، بے قراری، راتوں کا جاگنا، ستارے گننا، دن بھر منہ لپیٹے پڑے رہنا۔ بھوک کا جاتا رہنا، چہرہ کا زرد اور لبوں کا خشک ہو جانا، چپکے چپکے دل سے باتیں کرنا، ہم نشینوں کی صحبت سے نفرت، ویرانوں کی سیر، عاشقانہ اشعار پڑھنا یا خود موزوں کرنا مگر ان باتوں سے دل کی اصلی حالت کا بیان بہت دشوار ہے۔

بچا کے مرنے کے بعد ان کی کل جائیداد پر ان کی چچا زاد بہن قابض ہو گئی تھیں۔ چچا نے اپنی زندگی میں چاہا تھا کہ اپنی لڑکی کے ساتھ (جو اب جائداد پر قابض ہوئیں) نکاح کر دیں مگر آپ نے نہیں معلوم کس وجہ سے انکار کر دیا تھا۔ غالباً اس کی وجہ سوفیہ کی محبت ہو۔ مگر اس کا حال ٹھیک معلوم نہیں۔ اتنا جانتے ہیں کہ چچا زاد بھائی بہنوں میں چچا کی زندگی تک نباہ میں رہا مگر جب سے ان کی شادی ہو گئی، وہ محبت بالکل عداوت سے بدل گئی۔ ان کو سب بڑھ کے مشکل یہ ہوئی کہ اب رہنے کا ٹھکانہ تک نہ رہا۔ اگرچہ مکان موروثی تھا مگر ان کے والد مجوب ہو گئے تھے۔ اس لئے ان کا کوئی حق اس میں نہ تھا۔ اس زمانہ میں ان کی ایک کھلائی بوا گل چہرہ انکے کام آئیں۔ انہیں، کے پاس یہ رہنے لگے۔ اسکول میں نام لکھوا لیا۔ انگریزی پڑھنا شروع کیا۔

ان کو مدرسہ میں پڑھتے کوئی چھ سات برس گزرے ہوں گے۔ کہ مس صاحبہ کا علاقہ اور جائداد کورٹ سے چھوٹا۔ اور وہ لکھنؤ میں آکر اپنی کوٹھی میں رہنے لگیں۔ مگر نہیں معلوم ان کو کیا ہو گیا تھا کہ نہ جانا تھا نہ گئے۔ اسی زمانہ میں یہ خط ان کو ملا جس کا ترجمہ لفظاً بلفظاً یہاں لکھا جاتا ہے:۔

"میرے پیارے دوست۔ واقعی تم بڑے بے مروت ہو۔ ہم پر کیا کیا آفتیں گزر گئیں۔ اور تم نے خبر نہ لی۔ ماں باپ دونوں قضا کر گئے۔ ہم شہر سے کالے کوسوں دور بھیج دئے گئے۔ برسوں گویا قیدی رہے۔ تم کو ان باتوں کی خبر ضرور پہنچی ہو گی۔ مگر افسوس ہے کہ تم نے ایک پرچہ خط بھی کبھی نہ لکھا۔

مجھ کو تمہارا پتہ معلوم نہ تھا نہیں تو میری طرف سے پہل ہوتی۔ اب آیا کی لڑکی سے جس کا میاں ماٹینیز کالج میں نوکر ہے معلوم ہوا کہ تم وہاں پڑھتے ہو۔ اسی پتے سے تم کو خط لکھا ہے۔ جلد جواب لکھو۔ بلکہ خود آؤ۔ اگر تم میں کچھ بھی انسانیت اور وفاداری کا شائبہ ہو تو ہم سے ضرور ملو۔ ہم اسی قدیم کوٹھی میں رہتے ہیں۔ جہاں لڑکپن کے دنوں میں کھیلا کرتے تھے۔ وہ درخت اب تک موجود ہیں۔ جن پر ہم چڑھ کے چڑیوں کے گھونسلے اُجاڑا کرتے تھے۔ وہ حوض ابھی باقی ہے جس میں گھنٹوں چھپا چھپ چھپا ہوتی تھی۔ وہ تمہارا ایک دن روٹھ جانا اور کھجور کے درخت کے نیچے پہل کے بیٹھ جانا اور پھر لڑ کے کوٹھی میں چلا جانا آج تک آنکھوں میں پھرتا ہے۔

بعض امور کا جو تمہیں خیال ہے، اس کو دل سے دور کرو۔ دوستی میں ایسی نازک خیالیوں سے کام نہیں چلتا۔ کیا تم مجھکو انسان نہیں سمجھتے۔ اگر ایسا ہے تو مجھے تمہاری بدگمانی پر افسوس ہے اور تمہیں مجھ سے معافی مانگنا چاہیئے۔ مگر میں تم سے خود معافی مانگتی ہوں کہ میں نے یہ دو تین کلمے کیوں لکھے۔ ممکن ہے تم کسی اور وجہ سے نہ آئے ہو۔ بہر طور اب آؤ اور جلد آؤ۔ مجھے تم سے ایک اور ضروری کام ہے۔ جس کا اظہار اس خط میں مناسب نہیں۔

تمہاری لڑکپن کی دوست

سوفیہ"

اس خط کے آنے کا حال مرزا نے اپنی مثنوی نالہ رسوا میں بڑی کمال مسرت کے ساتھ تحریر کیا ہے واقعی اس کی تعریف نہیں ہو سکتی۔ ابتدا ایک ساقی نامہ سے کی ہے:۔

بادۂ مشکبار لا ساقی ‏ ‏ میں جیوں اور تو جیا ساقی
اب نہیں تابِ انتظار مجھے ‏ ‏ بھر کے دے جام خوشگوار مجھے
آسماں مجھکو دے مبارکباد ‏ ‏ کہ ہوا قیدِ غم سے میں آزاد
قاصدِ شوق مژدہ جاں لایا ‏ ‏ نامۂ یارِ مہرباں لایا

میں ہوں اب اور آستانِ حبیب   نہ غمِ پاسباں نہ خوفِ رقیب
خانۂ دل سے حسرتیں نکلیں   حسبِ دلخواہ حسرتیں نکلیں
آج گویا کہ ہے برات کی رات   اور ہے انتظار رات کی رات
مژدہ اے دل کہ عید کا دن ہے   مژدہ اے چشم دید کا دن ہے

غرضکہ وہ رات پہاڑ ہوگئی مگر

دل سے حیلے ہزار ہا کرکے   رات کاٹی خدا خدا کرکے
صبح ہوتے ہی اپنے بستر سے   ہاتھ منہ دھو کے ہم چلے گھر سے
عازمِ کوئے گلعذار ہوئے   جا کے اس شوخ سے دوچار ہوئے

مس صاحبہ دوستانہ طور پر ملیں، میٹھی میٹھی باتیں کیں۔ گلے شکوے ہوئے اور

ہم کو ہونا تھا شرمسار آخر   ہمیں ٹھہرے گناہگار آخر
کیوں نہ آئے یہاں سے کیا کہتے   نہ بنا کچھ بجز "بجا" کہتے

اس کے بعد مطلب کی باتیں شروع ہوئیں:۔

پھر وہ کہنے لگی کہ اے رسوا   تم سے اک مدعا بھی ہے میرا
نفعِ ذاتی پہ ہے نظر سب کی   سچ ہے دنیا ہے پیٹ مطلب کی
بات یہ ہے کہ میں ہوں عورت ذات   اور علاقہ کی فکر ہے دن رات
میرے لائق یہ کاروبار نہیں   غیر کا مجھکو اعتبار نہیں
اپنے ذمے یہ کام تو مجھ سے   اختیارات عام تو مجھ سے
نوکری کا نہ سلسلہ سمجھو   اس کو اپنا معاملہ سمجھو
سن کے اس مہ لقا کی یہ گفتار   چاہتا تھا کہ میں کروں انکار
کہہ رہا تھا اُدھر دلِ گمراہ   ماننا ہی پڑے گا خواہ مخواہ
دل طرفدار ہوگیا اس کا   مدعی یار ہوگیا اس کا

خلاصہ یہ کہ مرزا رسوا کے نام مختارنامہ ہوگیا۔ چند روز لکھنؤ میں رہ کے پھر علاقہ پر گئے۔ یہاں ناتجربہ کاری کی وجہ سے ان کو بڑی دقتیں پیش آئیں، مگر دل میں جس بات کا ارادہ اور شوق ہوتا ہے اس کی کوئی نہ کوئی راہ نکل ہی آتی ہے۔ مرزا صاحب کا نوکر نوروز علی کسانی کے کام میں بہت ہوشیار تھا۔ لکھنؤ سے اُسے بلوا کے ضلعدار مقرر کیا۔ اس نے قرار واقعی بندوبست کیا۔ رفتہ رفتہ یہ خود بھی واقف کار ہوگئے۔ کام چلنے لگا۔ کئی سال تک یہی حال رہا۔

مرزا رسوا اور مس سوفیہ کے تعلقات ویسے ہی تھے جیسے انگریز منگیتروں کے سُنے جاتے ہیں۔ انگوٹھیاں بدل گئی تھیں۔ چاہ اور نباہ کے اقرار ہو چکے تھے۔ ظاہر میں بالکل انداز عاشق معشوق بلکہ میاں بیوی کا تھا۔ دونوں میں پاک بازی تھی۔ آتشِ شوق کے شعلے بلند تھے۔ دونوں بے تاب، دونوں بے قرار، صبر کا امتحان ضبط کی آزمائش۔

اس اثنا میں مس صاحبہ نے بمبئی جانے کا ارادہ ظاہر کیا۔ مرزا صاحب نے ساتھ چلنے کے لئے ضد کی۔ آخر انہیں بھی ہمراہ لیا۔ دونوں خوشی خوشی بمبئی روانہ ہوئے۔ وہاں جا کے ہوٹل کے دو کمرے کرائے پہ لئے۔ بمبئی کی خوب سیریں ہوئیں۔ صبح سے شام تک گشت کرنا، راتوں کو تھیٹروں میں جانا۔ غرض کہ ایک ہفتہ تک خوب جشن کیا۔ ایک دن سرِشام سے مس صاحبہ نے کہا۔ میرے سر میں درد ہے آج میں تماشہ میں نہ جاؤں گی۔ کھانے والے سے فراغت کرکے نو بجے سونے کے کمرے میں چلی گئیں۔ مرزا رسوا بھی اپنی جگہ سو رہے۔

صبح کے وقت دونوں ایک ہی ساتھ چائے پیا کرتے تھے۔ آج معمول سے زیادہ دیر ہوگئی۔ مس صاحبہ نہ برآمد ہوئیں۔ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ مرزا رسوا نے انتظار کیا۔ پھر جا کے دروازہ کھٹکھٹایا۔ کوئی آواز نہ آئی۔ آخر دروازہ کھولا اندر گئے۔ دیکھا مس صاحبہ ندارد ہیں۔ کمرہ خالی پڑا ہے۔ مرزا رسوا کی آنکھوں میں اندھیرا سا آگیا۔ ہوٹل کے نوکروں سے پوچھا۔ معلوم ہوا مس صاحبہ نے رات کو گیارہ بجے گاڑی مانگی تھی سوار ہوکے کہیں گئیں۔

اب تو مرزا رسوا صاحب کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔ کیوں گئیں کہاں گئیں۔ اسی شش و پنج میں تھے کہ لکھنے کی میز پر ایک لفافہ مس صاحبہ کے ہاتھ کا لکھا ہوا ان کے نام کا ملا۔ جلدی جلدی لفافہ کھولا۔ لکھا تھا:

میرے پیارے تم میرے دفعتہً بے اطلاع غائب ہو جانے سے ملول نہ ہونا۔ بات یہ ہے کہ بمبئی میں میں صرف سیر و سیاحت کے لئے نہیں آئی تھی ایک خاص مطلب تھا۔ مگر اس کا اظہار تم سے مناسب نہ تھا۔ مجھے لکھنؤ میں معلوم ہوا تھا کہ میری پھوپی جو پیرس میں رہتی تھیں کروڑوں کی جائداد چھوڑ کے انتقال کر گئیں۔ سوا میرے ان کا کوئی وارث نہیں ہے۔ ان کے مختار کے خط سے معلوم ہوا کہ وصیت نامہ بھی میرے نام کر گئی ہیں، مگر اس کے لئے مجھ کو پیرس جانا ضرور ہے۔

میں تمہیں اپنا شوہر اور لکھنؤ کو اپنا وطن سمجھتی ہوں۔ مگر اس معاملے کے لئے میرا جانا ضروری تھا تم کو ساتھ نہ لانے میں یہ مصلحت تھی کہ ولایت کے لوگ جن میں اکثر میرے دور کے رشتہ کے عزیز بھی ہیں

(باقی صفحہ ۶۹ پر)

اُردو شاعری میں ہیئت کے تجربات

(سانیٹ اور کینٹو)

قیوم نظر

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بعد جہاں ملک میں معاشی، سیاسی اور سماجی ہر قسم کی تبدیلیاں نظر آنے لگیں وہاں اُردو شاعری نے بھی ایک کروٹ لی۔ اگرچہ یہ کروٹ وضاحت کے ساتھ انیسویں صدی کے آخر بلکہ بیسویں صدی کے آغاز میں نظر آئی، لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اُردو شاعری کو جدید راستوں پر چلانے کی شعوری کوششیں ۱۸۶۷ء سے ہی شروع ہو چکی تھیں۔ یہ وہ سال ہے جب مولوی اسمٰعیل میرٹھی نے چند انگریزی نظموں کا اُردو نظم میں ترجمہ شائع کیا۔ اسی سال مولانا محمد حسین آزاد نے بھی ایک لیکچر کی صورت میں اپنے اس کام کی بنیاد رکھی۔ جس کو انہوں نے بعد میں حالی کی اعانت اور کرنل ہالرائیڈ کی سرپرستی میں انجام تک پہنچانے کا بیڑا اُٹھایا تھا۔ اگرچہ حالی اور آزاد کی مثنویاں، بعد میں حالی کے اپنے دیوان کا مقدمہ، اس بیمار شاعری سے نجات پانے کا شدید اظہار تھا جس کے شکنجے میں بعض شعرا پھنسے ہوئے تھے تاہم اس کی گرفت اس قدر مستحکم تھی کہ بھی بات بنائے نہ بنتی تھی۔

اُردو شاعری کا کثیر سرمایہ غزل کی صورت میں ملتا ہے۔ جتنی بے شمار غزلیں اُردو میں لکھی گئی ہیں کسی دوسری زبان میں شاید اس قدر اس کا تمام شعری سرمایہ بھی نہ ہو۔ پھر بھی غزل کی محدود وسعت آج بھی ایسی نہیں کہ اس میں کوئی بڑا شاعر اپنی تمام کائنات خاطر خواہ طور پر پیش کر سکے اور شاید یہی باعث تھا کہ غالب ایسے قادر الکلام شاعر کو بھی ایک صدی پہلے یہ کہنا پڑا ؎

بقدرِ شوق نہیں ظرفِ تنگنائے غزل
کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کیلئے

جب سرسید اور ان کے رفقاء نے ادب کی پرانی اقدار کو بلاواسطہ یا بالواسطہ طور پر بدلنا چاہا۔ تو سب سے زیادہ جو صنفِ ادب معرضِ بحث میں آئی یا نئے تقاضوں کی چیرہ دستیوں کا نشانہ بنی وہ غزل تھی۔ چنانچہ جب غزل کی چھان پھٹک ایک نئے انداز سے کی گئی تو اکثر ذہین شعرا کو اس کی تنگ دامانی کا شدید احساس ہوا۔ اس تنگ دامانی میں اس کی ہیئت اور روایات کو خاصا دخل تھا۔ غرض بیسویں صدی کے ربعِ اوّل کے آخر تک اگر ایک طرف غزل معتوب رہی تو اس کے ساتھ ساتھ انگریزی شاعری سے اُردو شاعری صراحتاً متاثر بھی ہوتی رہی۔ اس ضمن میں اقبال کی کوششیں نہایت کارگر ثابت ہوئیں۔ جن کے سائے میں جوش ملیح آبادی اور ابوالاثر حفیظ ایسے شعرا بھی اپنے افکار کو نئے نئے سانچوں میں ڈھالتے رہے۔ یہ دور کلاسیکیت سے ہٹ کر رومانیت کی آغوش میں پناہ لینے کا دور تھا۔ چنانچہ اس دور میں شعرا کو اپنی اس انفرادیت کی تلاش تھی، جس کو ان کے آباء نے قواعد و ضوابط کی پابندی، الفاظ کی تراش خراش، صنائع بدائع اور خارجی شوخی و طرحداری کے پردوں میں گم کر دیا تھا۔ اسی انفرادیت کو پانے کی لگن نے بعض من چلے شعراء کو نئے راستے سجھائے اور اگر ایک طرف عظمت اللہ ایسے نکتہ سنجوں نے اُردو شاعری کے سینے کو ہیئت کے بعض تجربوں کی ضیا سے منور کرنا چاہا تو بعض ذہین نوجوانوں نے اس ضمن میں شمعِ شعرِ فرنگ سے مستعار روشنی حاصل کرنے کو مستحسن خیال کیا۔ اس سلسلے میں کئی شعرا کے نام گنوائے جا سکتے ہیں لیکن ن۔ م۔ راشد اور اختر شیرانی کے نام شاعری میں ہیئت کی ایک خاص صنف سے بالخصوص منسلک ہیں۔ ن۔ م۔ راشد کا ذکر تو نظمِ آزاد کے علمبرداروں میں بھی منفرد حیثیت رکھتا ہے، لیکن جب یہ نام اختر شیرانی کے ساتھ آتا ہے تو دھیان ہیئت کے سلسلے میں اُردو میں سانیٹ کے آغاز کی طرف جاتا ہے۔



کسب وکار   عمل : زین‌العابدین

۱

ڈاکٹر تصدق حسین خالد کے کہنے کے مطابق اردو میں نظم آزاد کا آغاز خود انہوں نے کیا۔ لیکن اتفاق سے ان کی کہی ہوئی آزاد نظمیں جب چھپیں تک ن۔م راشد کی آزاد نظمیں چھپ کر لوگوں تک پہونچ چکی تھیں۔ اور اس طرح نظم آزاد کا بانی ن۔م راشد شمار کیا جانے لگا۔ اسی طرح ایک بیان کے مطابق اردو میں پہلا سانیٹ اگرچہ ن۔م راشد نے لکھا۔ لیکن جو سانیٹ عوام کے سامنے شائع شدہ صورت میں آیا وہ اختر شیرانی کا تھا۔ اور یوں اُردو میں سانیٹ کے آغاز کا سہرا اختر شیرانی کے سر بندھا۔

دنیائے شعر میں سانیٹ کی ابتدا پر اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ نظم کی یہ مخصوص شکل ردیف وقافیہ کے چند در چند تجربات کے بعد ظہور میں آئی۔ اطالوی زبان میں ان گنت گائی جانے والی چھوٹی چھوٹی نظموں نے اسے ایک مستقل صورت دی اور اس میں چودہ اور صرف چودہ مصرعوں کا ہونا ضروری قرار پایا۔ یہ چودہ مصرعے بھی دو بندوں کی صورت میں جلوہ گر ہوئے۔ پہلے بند میں آٹھ مصرعوں کا ہونا اور دوسرے بند کا چھ مصرعوں سے ترتیب پانا ضروری قرار دیا گیا۔ چونکہ یہ ایک شدید قسم کی پابند صنفِ سخن تھی۔ اسی لئے پہلے آٹھ مصرعوں میں ردیف وقافیہ کا بھی اس ترتیب سے آنا لازمی گردانا گیا۔

الف ب ب الف الف ب ب الف

لیکن دوسرے بند یعنی اگلے چھ مصرعوں میں اس ترتیب کا ہونا چنداں ضروری نہ تھا۔ زیادہ وضاحت کے لئے اختر شیرانی کے ایک سانیٹ کا پہلا بند سنئے۔ جس میں ردیف وقافیے کی یہی ترتیب ملتی ہے:۔

بہارِ حسن کا تو غنچۂ شاداب ہے سلمیٰ
تجھے فطرت نے اپنے دستِ رنگیں سے سنوارا ہے
بہشت رنگ دیا تو سراپا اک نظارہ ہے
تری صورت سراسر پیکرِ مہتاب ہے سلمیٰ
ترا جسم اک ہجومِ ریشم و کمخواب ہے سلمیٰ
شبستانِ جوانی کا تو اک زندہ ستارہ ہے
تو اس دنیا میں بحرِ حسنِ فطرت کا کنارا ہے
تو اس سنسار میں اک آسمانی خواب ہے سلمیٰ

اطالوی میں یہ صنف پیٹرارک اور دانتے کے ہاتھوں نہایت خوش اسلوبی سے بنی۔ انگریزی میں پہلے پہل وائٹ نے ترجمے کی صورت میں اس کی کوشش کیا اور پھر سانیٹ کہنے کا شوق اس قدر بڑھا کہ سولہویں صدی عیسوی کے آخر تک ہر چھوٹا بڑا شاعر اس صنف میں اپنے خیالات کا اظہار ضروری شمار کرنے لگا۔ لیکن ابتدائی دور میں انگلستان میں ردیف وقافیہ کی جو صورت ظہور میں آئی وہ یوں تھی،

الف، ب، الف ب، ج د، ج د

یہ آٹھ مصرعوں کا پہلا بند تھا اور دوسرا بند س س ص ص کی صورت میں رہا۔ مثال کے لئے معین احسن جذبی کا ایک سانیٹ، جس کا عنوان "لوائف" ہے، سنئے۔ اگرچہ اس میں اس ردیف وقافیہ کے التزام سے کسی قدر انحراف کیا گیا ہے جس کا ابھی ذکر آیا ہے لیکن یہ انحراف شاید اسی صنف کے جدید تر تقاضوں کے باعث ہے:

اپنی فطرت کی بلندی پہ مجھے ناز ہے کب
ہاں تری پست نگاہی سے گلہ ہے مجھ کو
تو گرا دے گی مجھے اپنی نظر سے ورنہ
تیرے قدموں پہ تو سجدہ بھی روا ہے مجھ کو
تو نے ہر آن بدلتی ہوئی اس دنیا میں
میری پائندگیِ غم کو تو دیکھا ہوتا
کلیاں بیزار ہیں شبنم کے تلون سے مگر
تو نے اس دیدۂ پرنم کو تو دیکھا ہوتا

ہائے جلتی ہوئی حسرت یہ تری آنکھوں میں
کہیں مل جائے محبت کا سہارا تجھ کو
اپنی پستی کا بھی احساس پھر اتنا احساس
کہ نہیں میری محبت بھی گوارا تجھ کو
اور یہ زرد سے رخسار یہ اشکوں کی قطار
مجھ سے بیزار مری عرضِ وفا سے بیزار

سترھویں صدی عیسوی کے آغاز تک ملکہ الزبتھ کے عہد میں علوم و فنون نے ترقی کی تو سانیٹ بھی شیکسپیئر ایسے نابغوں کے ہاتھوں بڑھتی چڑھتی رہی۔ بعد میں ملٹن اور ورڈزورتھ ایسے شعرا نے اس ردیف وقافیہ کے التزام میں اپنی اپنی افتادِ طبع کے مطابق تبدیلیاں کیں، جو انہی کے نام سے منسوب ہیں۔ اگرچہ اٹھارہویں صدی کے اختتام پر سانیٹ پر برا وقت بھی آیا اور اس سے عوام کی دلبستگی

کہ سے کم تر ہوتی گئی مگر یہ دَور عارضی سا تھا اور شعرا نے انیسویں صدی میں اس کو پھر اپنا لیا اور انگریزی ادب میں یہ صنف آج بھی نامقبول نہیں ہے۔

انگریزی میں سانیٹ کی اس سرسری سی تاریخ کے بعد ہم اردو میں سانیٹ کی طرف پھر پلٹتے ہیں۔ اختر شیرانی نے رومانی شاعری کو جس نہج پر چلایا۔ اس سے وہ عوام میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ اور اسکے انداز اور بیان کی مقبولیت نے ایک وبا کی سی صورت اختیار کرلی، جس کا لازمی نتیجہ یہ بھی ہوا کہ سانیٹ لکھنا، اور اختر شیرانی کی تقلید میں لکھنا فیشن میں داخل ہوگیا۔ چنانچہ ۱۹۳۰ء کے چند برس بعد تک اُردو میں بے شمار سانیٹ معرضِ وجود میں آئے۔ یہ الگ بات ہے کہ آج ان میں سے صرف چند ہی کا نشان تابش صدیقی ایسے شعرا کے ہاں ملتا ہے۔

اگرچہ ابتدا میں اختر اور راشد نے سانیٹ میں ردیف و قافیہ کا نہ ہی التزام رکھا جو اطالوی سانیٹ کا تھا لیکن بعد میں اختر کی تلون طبیعت نے اس میں کچھ ترامیم بھی کیں جن کی نقل دوسرے شعرا سے نہ ہوسکی۔ مثال کے طور پر اس کا یہ سانیٹ دیکھئے جس میں اگر ایک طرف ردیف قافیہ کا التزام مثنوی کے انداز پر رکھا ہوا ہے۔ تو دوسری طرف مستزاد نما ایک ٹکڑا بھی ہر مصرع کے ساتھ چپکا ہوا ہے جو مستزاد ہی کے مانند اپنے پہلے مصرع کے ساتھ ہم قافیہ بھی ہے اور سانیٹ کو ایک اعتبار سے مستزاد کا قالب دئے ہوئے ہے۔ لیکن یہ ایک الگ بحث ہے۔

سانیٹ سنئے، عنوان ہے "تیتری"

یہ تیتری ہے یا کوئی رنگ پریدہ ہے — بوئے چکیدہ ہے
آغوشِ گل میں یا کوئی نقشِ دمیدہ ہے — عکسِ کشیدہ ہے
اُٹھے تو ایک بوسۂ رقصیدہ سامنے — پاشیدہ سامنے
بیٹھے تو ایک لذتِ خوابیدہ سامنے — دامن کشیدہ ہے
جوئے صبا میں ہلکا سا طوفانِ رنگ و بو — ہیجانِ رنگ و بو
دوشِ فضا پہ چھوٹا سا نیسانِ رنگ و بو — جوصف کشیدہ ہے
اک پُر بہار نقش ہے عشرت کے خواب کا — عہدِ شباب کا
یا برگِ گل پہ لرزشِ جامِ شراب کا — عکسِ رسیدہ ہے
ہلکی سی اک شعاع ہے طورِ کلیم پر — بالِ نسیم پر
رقاصۂ بہار کا فرشِ شمیم پر — رقصِ پریدہ ہے
اُبھرا ابھرا سا عکس ہے رنگیں غبار کا — کیفِ خمار کا
یا شاخسارِ گل پہ عروسِ بہار کا • حسنِ دمیدہ ہے

• اک نو عروس کی نگہِ منفعل ہے — شرمِ وصال ہے
یا اک شعاعِ پرتوِ قوسِ ہلال ہے — اور لو دمیدہ ہے

اس سانیٹ میں، جو اپنی صنف میں ایک نادر تجربہ ہے، دیگر خصوصیات کے علاوہ ایک بات اور بھی ملتی ہے اور یہ وہی روایت سے بغاوت کا اعلان ہے۔ سانیٹ کے لئے اب تک یہ ضروری تھا کہ اس کا پہلا بند آٹھ اور دوسرا چھ مصرعوں کا ہو لیکن اختر شیرانی نے اس سلیقے کو بھی بدل دیا اور پہلا بند چھ اور دوسرا آٹھ مصرعوں سے پورا کیا۔

اردو میں سانیٹ کچھ جدت کی دھن اور کچھ غزل کی جکڑبندیوں کے ردِعمل کے سائے میں آیا تھا۔ صرف یہی نہیں اپنی مخصوص ہیئت کے پیشِ نظر اس کے مضامین میں زیادہ وسعت اور گہرائی کی گنجائش بھی کم ہی تھی۔ چنانچہ جب جدید تحریکوں نے اختر اور اس کے ڈھب کی غنائی شاعری کا طلسم توڑا تو شعرا نے محسوس کیا کہ سانیٹ کی ہیئت ان کے جدید شعری تقاضوں کو کم ہی پورا کرتی ہے اور پھر جب اس ایمائی فنکاری کے لئے اسی کلاسکیت کے سہاروں کی ضرورت محسوس ہوتی ہے جس کے خلاف بیسویں صدی کے وسط میں اس قدر جدوجہد سے کام لیا گیا تو ان کو یہ فعل عبث نظر آنے لگا۔ چنانچہ وہ صنفِ سخن جس کا غلغلہ ابھی بیس برس پہلے اس قدر بلند تھا کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی، اب اس قدر تیزی اور سرعت سے مدھم ہوگیا جیسے اس کا کوئی نام بھی باقی نہ رہا ہو تاہم اگر یوسف ظفر اور ضیا جالندھری ایسے بعض جدید شعرا کبھی کبھار زبان کا ذائقہ بدلنے کے لئے ایک آدھ سانیٹ کہہ لیتے ہیں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس میں زندگی کی ابھی کوئی رمق باقی ہے۔ اور اب کچھ اُردو میں کینٹوز کے بارے میں۔

ن۔م۔ راشد، جن کے ساتھ جدید اردو شاعری میں نئی اصناف کو داخل کرنے کے کچھ سلسلے وابستہ ہیں۔ گذشتہ جنگِ عظیم میں مصر، شام، ایران وغیرہ گئے۔ واپسی پر انہوں نے اپنی ایک طویل نظم سے اردو شاعری کو آشنا کرایا۔ اس نظم کا عنوان ہے "ایران میں اجنبی"۔

"ایران میں اجنبی" کے تحت راشد کے سامنے ایک بہت بڑا موضوع اور ایک نہایت وسیع کینوس تھا۔ ایک نئے ماحول بلکہ ایک نئی دنیا میں پرانی تہذیب کا ایک فرد تن تنہا کھڑا تھا۔ اگرچہ وہ کسی کا مبہوت تھا لیکن اس کے دل و دیدہ دونوں کھلے تھے اور ان میں حالات کا جائزہ لینے، زندگی کو پیش کرنے اور جذبات و احساسات سے ہمکنار

(باقی صفحہ ۵۵ پر)

شہیدِ ملّت

سردار امیر اعظم خاں

"قائد ملت" خان لیاقت علی خاں کو میں نے سب سے پہلی بار اس وقت دیکھا جب وہ ۲۵-۱۹۲۴ء میں یو پی کی مجلس قانون ساز کے انتخابات کے سلسلے میں کرنال سے مظفر نگر تشریف لائے۔ کئی دن سے اُن کی آمد آمد کا چرچا تھا اور ضلع کے بیشتر مقتدر حضرات، جو اُنکے انتخاب میں دلچسپی رکھتے تھے، اس وقت ان کے استقبال کو جمع تھے۔ مروم اس سے کچھ ہی عرصہ پیشتر اپنی تعلیم کی تکمیل کرکے انگلستان سے واپس آئے تھے۔ جب وہ کار سے اترے تو علی گڈھ کٹ کا پاجامہ اور گہرے نیلے رنگ کا بند گلے کا کوٹ زیب تن کئے ہوئے تھے، سر پر سُرخ رنگ کی چھوٹی باڑھ کی ترکی ٹوپی تھی اور پاؤں میں پمپ شو، علی گڈھ فیشن کی چھوٹی چھوٹی مونچھیں تھیں، اور آنکھوں پر عینک لگی تھی جب وہ لوگوں سے ہاتھ ملا رہے تھے۔ تو ان کے چہرہ پر ہلکی ہلکی مسکراہٹ تھی اور ان کے کھلتے ہوئے گندمی رنگ اور بھرے ہوئے جسم پر یہ لباس بہت بھلا اور خوش نما معلوم ہوتا تھا۔ ایسا نظر آتا تھا جیسے وہ انگلستان کے بجائے ابھی ابھی علی گڈھ سے آئے ہوں۔

جب وہ انتخاب میں کامیاب ہوگئے۔ تو ان کے مخالف نے اُنکے خلاف اپیل دائر کردیا، گو انتخاب کے دوران میں مرحوم کا کافی روپیہ صرف ہوا تھا، مگر اپیل کے سلسلے میں چند ماہ کے اندر اندر اس سے بھی کہیں زیادہ روپیہ صرف ہوگیا جس وقت عدالت کے روبرو اُن کا اپنا بیان قلم بند ہورہا تھا۔ عدالت نے کسی مخصوص فرد کے متعلق یہ دریافت کیا کہ کیا وہ الکشن کے دوران میں مرحوم کا ایجنٹ تھا یا نہیں؟ قائدملت نے لاعلمی کی حالت میں جواب دیا کہ نہیں۔ بیان ختم ہونے کے بعد جب وہ اپنی جگہ پر آکر بیٹھ گئے، تو اُنہیں بتایا گیا کہ اُنہوں نے بہت اچھا جواب دیا اور اگر وہ اقرار کرلیتے تو اپیل ہار جانے کا امکان تھا۔ مرحوم کو جب یہ حقیقت معلوم ہوئی تو فوراً دوبارہ عدالت کے سامنے جا کھڑے ہوئے اور کہدیا کہ وہ شخص ان کا ایجنٹ تھا اور لاعلمی کی حالت میں انہوں نے پہلے صحیح جواب نہیں دیا تھا۔ اُن کی اس صاف بیانی اور صداقت سے عدالت اور دیگر سب لوگ بے حد متاثر ہوئے اور اللہ نے انہیں اپیل میں بھی کامیابی عطا کی۔ قائد ملت کا اپنی سیاسی زندگی کے آغاز ہی سے یہ اصول تھا خواہ نقصان ہی کیوں نہ ہو۔ دیانت اور صداقت کو کبھی ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہئے۔ مروم تمام عمر اسی پر کاربند رہے۔

۱۹۴۶ء میں پاکستان کے حصول کے لئے جو انتخابات ہوئے ان میں مرحوم مرکزی مجلس قانون ساز کے لئے کمشنری میرٹھ کے حلقے سے امیدوار تھے۔ جمعیت العلماء دہلی اور علمائے دیوبند کی مخالفت کی وجہ سے مقابلہ بڑا شدید تھا۔ کانگریس نے اس حلقہ پر پورا زور دے رکھا تھا اور روپیہ پانی کی طرح بہا رہی تھی۔ کانگریس نے تقریباً ۸، ۹ لاکھ روپیہ صرف کردیا اور اس نشست کو ٹیسٹ الکشن بنالیا۔ ہر بالغ کو حق رائے دہندگی حاصل نہ ہونے کی وجہ سے رائے دہندگان کی فہرست مختصر تھی، اور ایک ایک رائے کی بڑی قیمت۔ مقابلہ اتنا سخت تھا کہ بعض اوقات یہ محسوس ہوتا تھا کہ کامیابی مشکل ہے۔ ہر روز رات کو میں انتخابات کے متعلق قائدملت کو رپورٹ دیا کرتا۔ ان کا حکم تھا کہ خبریں مخالف ہوں یا مایوس کن، انہیں صحیح صحیح اطلاع دی جائے۔ انتہائی بُری خبر سُن کر بھی میں نے کبھی ان کے چہرہ پر پریشانی کے آثار نہیں دیکھے۔ وہ ہمیشہ پُرسکون رہتے اور کہا کرتے کہ یہ میرا ذاتی الکشن نہیں ہے۔ یہ پوری قوم کا مسئلہ ہے۔ قوم کو طے کرنا ہے کہ وہ پاکستان کے حصول کے حق میں ہے یا نہیں۔

ایک گاؤں میں ایک ہی برادری کے تقریباً ڈھائی سو ووٹ تھے۔ وہ

مسلم لیگ کی سخت مخالفت کر رہے تھے معلوم ہوا کہ کانگریس نے ان سے وعدہ کیا ہے کہ وہ ان کی پنچایت کے لئے گاؤں میں ایک کنواں بنوا دینگے۔ مسلم لیگ والوں کے یہ سمجھانے پر کہ پوری قوم کے مستقبل کا سوال ہے۔ یہ لوگ اس بات پر آمادہ ہو گئے کہ اگر لیاقت علی خاں کنوئیں کی کھدائی کا نصف خرچ جو تین سو روپیہ ہوتا تھا، پنچایت کو دیں تو وہ اپنے سارے ووٹ مسلم لیگ کو دیدینگے۔ جب یہ بات قائدِ ملت کے گوش گذار کی گئی، اور کارکنانِ لیگ نے زور دیا کہ یہ رفاہِ عامہ کی بات ہے لہذا اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہونا چاہیئے تو قائدِ ملت نے بڑے اطمینان سے یہ جواب دیا کہ آپ کو بخوبی معلوم ہے کہ ہمارا مقابلہ ایک ایسی قوم سے ہے جو دولت میں ہم سے بہت آگے ہے۔ یہ کہاں کی دانشمندی ہے کہ ہم اس میدان میں ان کا مقابلہ کریں کہ جہاں ہماری ہار یقینی ہے۔ دوسرے یہ میری ذاتی ہار جیت کا سوال نہیں اصول کا سوال ہے۔ قوم کی قسمت کا فیصلہ ہونا ہے۔ ہمیں یہ طے کرنا ہے کہ ہم پاکستان قائم کر کے آزادی یا عزت کی زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں یا غلامی کی۔ اگر قوم پاکستان کے حق میں ہے تو روپیہ کے تصرف یا کسی رقم کے لالچ کا کوئی سوال نہیں ——— اور پھر اگر قائدِ اعظم اور ہم روپیہ صرف کر کے اہلِ قوم کے لئے پاکستان خرید بھی لیں تو ایسے پاکستان کی کیا قدر ہوگی اور اس بات کی کیا ضمانت ہوگی کہ یہ قوم پھر پاکستان کو ہندوؤں کے ہاتھ فروخت نہ کر دے گی؟ جب اس گاؤں کے لوگوں کو قائدِ ملت کے ان خیالات کا پتہ چلا تو انہوں نے متفقہ طور پر فیصلہ کر کے مسلم لیگ کے حق میں ووٹ دیئے۔ قائدِ ملت کا یہ فیصلہ ہمارے لئے مشعلِ ہدایت ہے۔ انہیں اپنی قوم پر بڑا اعتماد تھا۔ وہ قوم کے صحیح کردار کو پہچانتے تھے کہ وہ روپے کی خاطر اصول کو قربان نہیں کرے گی۔

قائدِ ملت کا ہاتھ ہمیشہ قوم کی نبض پر رہتا۔ وہ نہایت ٹھنڈے دماغ کے آدمی تھے، انہیں کبھی غصہ نہ آتا اور ہمیشہ اپنا دماغی توازن برقرار رکھتے۔ وہ ہر ایک کی بات بڑے غور سے سنتے۔ ان کے چہرے سے یہ اندازہ لگانا بڑا مشکل تھا کہ انہیں یہ بات پسند آئی یا ناپسند۔ ہر ایک کی بات بڑی خندہ پیشانی سے سن لیتے اور یہی وجہ تھی کہ وہ اس قدر مقبول تھے۔ ملک کے طول و عرض میں بیشتر سیاسی کارکنوں کو وہ نام اور شکل سے پہچانتے اور ہمیشہ ان کی ہمت افزائی اور دلجوئی کرتے۔ تمام سیاسی کارکن انہیں صحیح معنوں میں اپنا قائد اور دوست سمجھتے اور ان کی عزت کرتے۔ بلاشبہ وہ قوم کے قائد پہلے تھے اور وزیر اعظم بعد کو۔

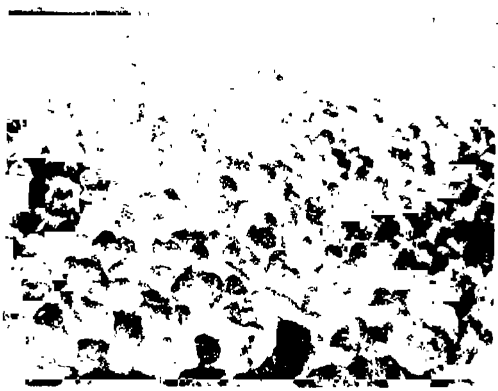
مرحوم کے کردار کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ وہ نہ کبھی کسی کی سفارش سنتے اور نہ کسی کی سفارش کرتے۔ صرف وہ کام کرتے جس میں پوری قوم کے مفاد کا سوال پنہاں ہوتا۔ انہوں نے اپنی زندگی میں کبھی کسی فرد کی اس لئے مدد نہیں کی کہ وہ ان کا رشتہ دار یا دوست تھا۔ وہ کہا کرتے کہ قائدِ اعظم کی اور ہماری یہ کوشش ہوتی ہے کہ قوم کو اس کا صحیح حق مل جائے۔ اس کے بعد ہر فرد اگر وہ کسی چیز کا اہل ہے تو خود اپنا حصہ اپنی قابلیت کی بنا حاصل کرے۔ جس زمانہ میں مرحوم ہندوستان کی عارضی حکومت میں وزیر خزانہ کے عہدہ پر فائز تھے۔ ان کے ایک دیرینہ ملنے والے نے ان سے اپنے تعلقات جتاتے ہوئے کچھ مراعات طلب کیں۔ قائدِ ملت نے جواب دیا کہ میرے دل میں ذاتی تعلقات کا بڑا احترام ہے۔ مگر مجھے افسوس ہے کہ انہیں تعلقات کی بنا پر میں آپ کے لئے کچھ نہیں کر سکتا۔ میرا تو عقیدہ ہے کہ جب کوئی شخص کسی بڑے عہدے پر فائز ہو جائے تو اس پر پوری قوم کا یکساں حق ہوتا ہے، نہ کہ اس کے احباب اور رشتہ داروں کا۔ بلکہ میرا تو یہ ایمان ہے کہ کسی شخص کا وزیر بن جانا اس کے احباب اور رشتہ داروں کے لئے ڈِس کریڈٹ ہونا چاہیئے۔

قائدِ ملت کو عمدہ لباس کا شوق تھا۔ ان کا عمومی رہن سہن بھی اعلیٰ درجہ کا تھا۔ دیکھنے والے یہ سمجھتے کہ ان کا خرچ زیادہ ہے، لیکن وہ بڑی احتیاط سے خرچ کرتے اور کوئی ان کے رہن سہن سے ان کے اخراجات کا اندازہ نہ لگا سکتا۔ وہ ایک بڑی جائداد کے مالک تھے جس کی آمدنی ہزارہا روپیہ ماہانہ تھی، مگر مرحوم نے کبھی اپنی ریاست سے ایک ہزار روپیہ ماہانہ سے زیادہ نہ لیا۔ اپنے علاقہ میں وہ واحد زمیندار تھے، جو مقروض نہ تھے۔ وہ روپیہ کا صحیح مصرف جانتے تھے اور انتہائی مصروفیت کے باوجود گھریلو معاملات اور نظام پر پوری نظر رکھتے تھے۔

مرحوم کی تمام جائداد ہندوستان میں رہ گئی۔ جو بعد کو متروکہ قرار دی گئی۔ وہ چاہتے تو اور لوگوں کی طرح اپنی جائداد کا آسانی سے تبادلہ کرلیتے لیکن یہ حقیقت ہے کہ جب ان کے کارکنوں نے ان کی جائداد کے تبادلہ کا انتظام کیا تو انہوں نے یہ کہہ کر تبادلہ کرنے سے انکار کر دیا کہ لاکھوں مہاجر ایسے ہیں جن کی جائداد وہاں رہ گئی ہے، ان کا یہاں کوئی سہارا نہیں۔ اگر اس حالت میں میں اپنی جائداد کا تبادلہ کرلوں تو کل خدا کو کیا منہ دکھاؤں گا؟

قائدِ ملت بڑے راسخ الاعتقاد مسلمان تھے۔ پاکستان اور پاکستان کے عوام کی محبت ان کی رگ رگ میں بسی ہوئی تھی۔ ان سے میری آخری ملاقات اس وقت ہوئی جب وہ پنجاب کے گذشتہ انتخابات کے بعد لاہور میں

(باقی صفحہ ۵۶ پر)





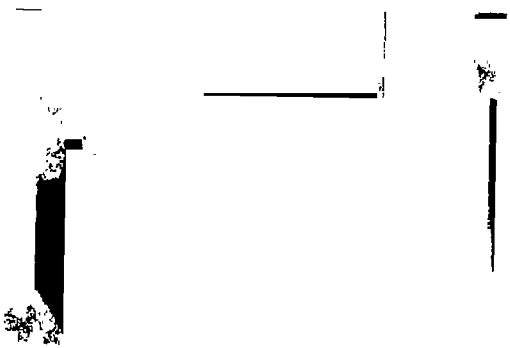
عزت ماب ڈاکٹر خان صاحب اور عزت ماب سردار بہادر خان کا سرحدی عوام سے خطاب

وحدت مغربی پاکستان



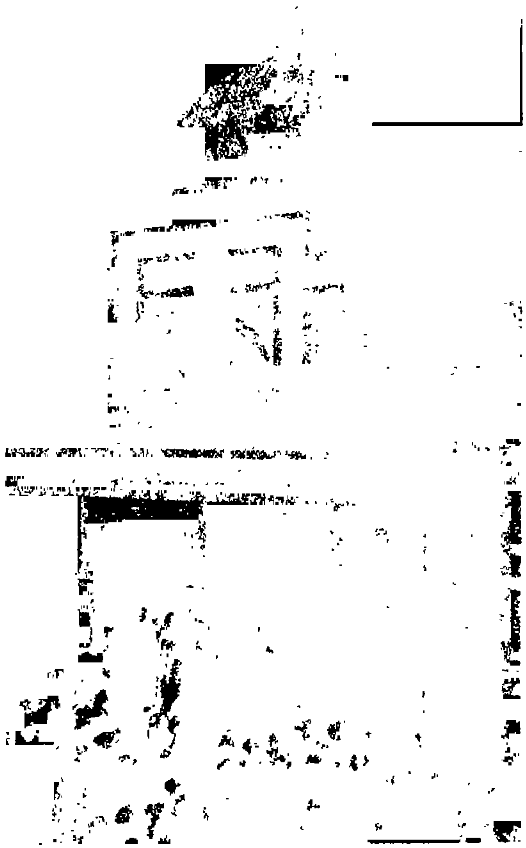
عزت ماب سردار امیر اعظم خان
دستورساز اسمبلی میں وحدت مغربی پاکستان
کا مسودہ قانون پیش کررہے ہیں

عزت‌ماب پیر علی محمد راشدی کی ’’وحدت مغربی پاکستان کانفرنس‘‘، حیدرآباد (سندھ) میں تقریر



عرس شاہ عبداللطیف بھٹائی رح

(مغربی پاکستان کا ایک اہم ثقافتی اجتماع)



زائرین کا ہجوم



عرس کے موقع پر شاہ عبداللطیف رح کے کلام کی ڈرامائی پیشکش



میلے پر رونق

''چون عشق حرم باشد سہل است بیابان ہا''





شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ

روشؔن صدیقی

کتابِ عشق کا رنگیں کلام لیکے اُٹھا
محبتِ ابدی کا پیام لیکے اُٹھا
قیودِ وقت سے آزاد تھا وہ بندۂ عشق
فروغِ صبح، بہ ہنگامِ شام لیکے اُٹھا
گمان و وہم کی ظلمت فرو زوادی میں
یقینِ عشق کا ماہِ تمام لیکے اُٹھا
پھر اُس نے جادۂ خاصانِ حق کیا روشن
ہزار مشعلِ سوزِ تمام لیکے اُٹھا
بہ قدرِ ذوق ملا جس سے میکشوں کو سرور
بنامِ عشق وہ کاس الکرام لیکے اُٹھا
لٹائے دیدۂ پُرنم سے اس نے لعل و گہر
خزانۂ غم و دردِ عوام لیکے اُٹھا
بہائے کوثر و تسنیم ریگ زاروں میں
اگرچہ ایک شکستہ سا جام لیکے اُٹھا
جہاں ہوس نے بنائے تھے لاکھ بت خانے
وہاں وہ وحدتِ بیت الحرام لیکے اُٹھا
محمدِ عربی کے سحابِ رحمت سے
گہرفشانیٔ فیضانِ عام لیکے اُٹھا

شہ لطیفؒ، عزیزِ انام، مردِ ولی
دیارِ سندھ، از اُو یافت دولتِ ازلی

صہبائے لطیف

شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ
مترجمہ: عاصمہ حسین

کونج

اُجلی اُجلی کونجیں، کل ہی کتنے جھرمٹ سے انکے
اُڑ اُڑ کر اس دیس سے جانے کتنی منزل دُور گئے
اب کیا اس اتھلے پانی کی کھائی میں رہنے سے حاصل؛
اُڑ کے گئے جب سارے ساتھی، بنکھ ملے اور دل سے دل
اپنی سنگت وہ کب چھوڑیں، کیوں چھوڑیں وہ اپنا ساتھ؛
ان کے من یوں ساتھ ملے ہیں جیسے باہم پات سے پات
سب جاتے ہیں سنگت میں، اس اجلی کھلی ٹولی میں
من میں جتنا پریم ہو بس اتنا ہی دھن ہے جھولی میں
اتنا ہی رس ہے، اتنی مٹھاس اور اس کا کوئی انت نہیں
کونجیں کونجیں ساتھ رہیں، بھٹکیں نہ سبھوں سے دور کہیں
اپنی قوم سے ہٹ کر رہنا کونجوں کا دستور نہیں
اس سے بڑا ان کی دنیا میں کوئی اور قصور نہیں
ننھی کونج، اے ننھی کونج! آواز کو اپنی خوب اٹھا
جیسے بھی بن آئے اس پیغام کو اپنوں تک پہنچا
دن بیتا اور رات بھئی، بھیگی رات اور رات گئی
قسمت تیری ٹولی کو اس نیارے دیس میں لائی تھی
لیکن ان کے من میں بسی تھی اپنی پہاڑوں کی بستی
اسی کی ان کے من میں لگن تھی۔ اسی کی من میں پریت بسی
اس میں کسی کا دوش نہیں ہے، رہ گئی تنہا پھر بھی کیا
اپنا دھنی ہے فکر میں اپنی، آن دے گا تجھے آن داتا
ننھی کونج! اس جھرمٹ میں کل خوب اک بات کا چرچا تھا:
دیپ ہے تیری پریت کا ہر ہر ساتھی کے من میں جلتا
پر افسوس! او جھل ہے تری آنکھوں سے جال شکاری کا
حال نہیں ہے تجھ پر روشن خود اپنی لاچاری کا

التجا

سنتی ہوں میں جھاڑ جھنکاڑوں سے پُر ہیں بن کے بن
میں یہ کیا جانوں۔ یہ باتیں کیسے جانے میرا من؟
لوگ کہتے ہیں کہ پھیلے ہیں کئی صحرا یہاں
لوٹ بھی آ جانِ من! جینا ہوا بارِ گراں
اے مرے ساجن! مرے دل کو نہ یوں ویران کر
یوں نہ لا کر چھوڑ دے لاچار سونی راہ پر
میں یہ کیا جانوں کہ پھیلے ہیں یہاں پُر خار دشت
خار کیسے بلکہ ہیں انگار ہی انگار دشت
دیکھ پیارے! گھونٹ پانی کا کبھی میں پیتی نہیں
گرچہ جیتی ہوں سمجھتی ہوں کہ میں جیتی نہیں
دیکھ کیسے دوڑتی ہے کاٹنے کو ہر چٹان
چلچلاتی دھوپ جھلساتی ہے، تڑپاتی ہے جان
دیوں کہے شاعر کہ تو چلتی ہے تو دیوانہ وار
سو ستم، سو آفتیں، سو مشکلیں اور ایک نار
آ بھی جا اب میرے ساتھی، آ بھی جا اے میرے میت
بات جب ہے آج اپنی لاج رکھ لے تیری پریت
دیکھ اس ویرانے میں ہیں کیسے بے ہنگم سے جھاڑ
روکتی ہے ہر قدم پر راستہ کانٹوں کی باڑھ
لوگ کہتے ہیں کہ ان جھاڑوں میں زہری ناگ ہیں
آگ کے اندر یہ گویا اور جیتی آگ ہیں
پاس آ میرے، مرے پیارے، مرے دلدار آ
تو ہی اس مہلک بیاباں میں ہے میرا رہنما
کوئی میرا، کوئی اپنا کیا مرا غمخوار ہو
تم ہی سامانِ تسلی اے مرے دلدار ہو

سید اچھی

اس بچاری نے نہ دیکھا تھا کبھی وہ ریگ زار
کوئی ہم صورت میسّر تھا نہ کوئی غمگسار
تیرہ و تاریک تھی دھرتی بھی اور آکاش بھی
پیاری بہنو! اس گھڑی، جو تھی قیامت کی گھڑی
ڈاچی والے کو بنایا اس نے اپنا دادخواہ
اس کی ہمدردی سے پائی رنج میں تسکین کی راہ

ماہِ نو، کراچی، اکتوبر ۱۹۵۵ء

بنگلہ افسانہ:

بجلی

مبین الدین احمد
مترجمہ: فیض احمد چودھری

سیدپور مشرقی پاکستان کا ایک گمنام گاؤں ہے۔ گاؤں بھر میں ان پڑھ کسان ہی بستے ہیں۔ بہت دن پہلے فقط ایک شریف گھرانا یہاں بستا تھا جو اس پرگنے کا زمیندار بھی تھا۔ اب زمینداری غیروں کے ہاتھ میں چلی گئی۔ اس زمیندار خاندان کا ایک ہی چشم و چراغ رہ گیا ہے ــــ وہ بھی بائیس تئیس سال سے پردیس گیا ہوا ہے اور ایک دن کے لیے بھی یہاں نہیں آتا۔ (اب یہاں) ان کی کھوئی ہوئی عظمت کی آخری نشانی صرف اس عالیشان عمارت کا کھنڈر باقی ہے جو بھوتوں اور جنات کا مسکن معلوم ہوتی ہے۔

گلتانی اس غیر مشہور گاؤں کے غریب کسان شیخ مدار کی اکلوتی بیٹی ہے۔ طبیعت میں اس کی شوخی اور اچپلاہٹ ہے، نہ کسی سے ڈرتی ہے اور نہ اسے کسی بات کی پروا۔ سارے طور طریق بالکل لاابالی۔ اسکا اصلی نام کریمن تھا مگر یہ نام اب کسی کو یاد نہیں۔ فطری عادات و اطوار کی مناسبت سے اس کا نام گلتانی پڑ گیا ہے۔

بچپن ہی میں اس کی شادی ہو چکی تھی۔ کوئی پانچ سال ہوئے شوہر کا انتقال ہو گیا۔ گلتانی اس وقت دس گیارہ سال کی تھی۔

آج وہ بھرپور جوانی کی آغوش میں ہے۔

گلتانی کالی ہے۔

صرف کالی کہنا کافی نہیں، بلکہ آبنوس کی طرح کالی ہے، مگر بدصورت نہیں۔ اس کی صورت میں بڑی دلکشی ہے۔

گلتانی گویا کسی ماہر سنگ تراش کی مدت کی مشق و ریاض کا نتیجہ ہے۔ اس کا مکمل سا حسین ملائم جسم۔ ناک نقشہ، آنکھیں اور بال سب کے سب اپنا جواب آپ ہی ہیں۔ بدن میں ناموزونی کہیں نام کو نہیں۔ کہیں بھی ذرا سا داغ یا ناہمواری نہیں۔ ہنستی ہے تو صرف گالوں میں گڑھے پڑ جاتے ہیں۔

گلتانی کے نادر حسن کو پرکھنے والی آنکھ اس گاؤں میں نہیں، یہ بات تو یقینی طور پر کہی جا سکتی ہے۔ مگر اس کے گالوں کے گڑھے پر سب کی نظر پڑتی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ گال کا گڑھا نحوست کی نشانی ہے کہتے ہیں ایسی عورتوں کے شوہر زندہ نہیں رہتے۔ گلتانی کے بیوہ ہونے پر سب کے دل میں یہ وہم اور بھی راسخ ہو گیا۔

سب لوگ کہتے ہیں زندگی میں اسے اور کوئی خوشی نصیب نہ ہوگی .... ہنستے وقت اس کے گالوں میں گڑھے پڑ جاتے ہیں۔

اگرچہ اس کے حسن و زیبائی کو کوئی نہیں دیکھتا اور اس کے گال میں منحوس گڑھے بھی پڑتے ہیں۔ پھر بھی گلتانی کی سرشار جوانی بہت سے لوگوں کو مقناطیس کی طرح اپنی طرف کھینچتی ہے۔ اس پر طرہ یہ کہ وہ ہر وقت بڑے سلیقے سے بن ٹھن کے رہتی ہے۔ خوشحال شیخ مدار کی اکلوتی بیٹی بدنصیب ہے تو کیا، باپ کی لاڈلی تو ہے۔ رنگین لباس پہن کے اور چوٹی میں کوئی پھول گوندھ کے وہ محلے میں سیر کو نکلتی ہے ......کسی کی روک ٹوک کو وہ سنتی ہی نہیں۔

عجیب لڑکی ہے گلتانی۔

سب کے سامنے نکل آتی ہے، بات کرتی ہے، اور موقع بے موقع ہنسی میں جھومنے لگتی ہے، لچک جاتی ہے گلتانی کی حرکات جسمانی،

ناز وادا، طور طریق اور بات چیت میں ایک ایسا شور انگیز، پُر معنی اور
لطیف اشارہ ہوتا ہے کہ بے ساختہ دل کو لبھاتا ہے مگر ہاتھ بڑھاؤ تو
گلتانی تک نہیں پہنچتا، گویا کہیں اٹک کے رہ جاتا ہے۔
جیسے وہ بلور کی شفاف اور سخت دیوار کی اوٹ میں چلتی پھرتی ہو۔
نظر سب کچھ آتا ہے مگر اسے کسی طرح چھوا نہیں جا سکتا۔

گلتانی صرف ایک ہی شخص سے ذرا کھنچتی ہے اور اس کا لحاظ
بھی کرتی ہے گجّو بائیس تئیس سال کا ہٹا کٹا نوجوان ہے۔ سر پر گھنے گھونگھر
والے بال۔
گجّو کے سامنے گلتانی کا اونچا سر خود بخود نیچا ہو جاتا ہے ——
سینے کے اندر دل دھک دھک کرنے لگتا ہے۔
گجّو گلتانی کو "گل" کہہ کے پکارتا ہے اور کبھی کبھی "گلی"۔

مراد مصور

ایک زمانے میں اسے اپنی فنکاری پر بڑا ناز تھا۔ اب مصوری اس کا
پیشہ ہے۔ باپ کے جیتے جی مراد کو فن کی تحصیل کا چنداں موقع نہ مل سکا
دولتمند باپ کا اکلوتا بیٹا معمولی مصور یا نقاش نہیں ہو سکتا۔ اسے تو جج
یا مجسٹریٹ ہونا چاہیے۔ باپ کی خواہش لے دے کے بس اتنی تھی۔
مراد کے باپ کے نزدیک دستکار اور نقاش میں کوئی فرق نہ تھا
گھٹیا چیز کو بڑا نام دینے ہی سے شاہ زادہ نہیں بن جاتی۔
مراد کے باپ کی رائے ایسی پختہ تھی کہ اسے ہلا دینے کی طاقت
مراد میں نہ تھی۔ لیکن مراد کی فطری صلاحیت باپ کی مرضی کے مطابق
کام نہ کر سکی۔ باپ بیٹے کی ان متضاد خواہشوں میں برابر کشمکش
جاری رہنے کی وجہ سے مراد نے ٹھوکریں کھاتے کھاتے کس طرح بی۔ اے
تو پاس کر لیا مگر جج یا مجسٹریٹ نہ بن سکا۔
ماں بہت دن پہلے مر چکی تھی، باپ کے انتقال کے بعد دنیا
میں اس کا اپنا کوئی نہ رہا۔ گاؤں کے عالیشان مکان کے سوا مراد
گاؤں کی ساری جائداد بیچ کر پیرس روانہ ہو گیا۔
فن کے سیکھنے میں لگاتار ریاض کے ساتھ ساتھ مراد نے پیرس
میں اور بھی بہت سی باتیں سیکھ لیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سارا روپیہ اڑا دینے
میں اسے چند سال سے زیادہ نہ لگے، اور جب وطن واپس آیا تو
بالکل خالی ہاتھ تھا۔
اتنی مدت تک گاؤں کی اس موروثی عمارت کا اسے خیال ہی نہ
آیا تھا۔ وطن واپس آنے کے چند روز بعد ایک دن یکایک اس کے
دل میں آیا کہ گاؤں کی اس عمارت کے بیچنے سے کئی ہزار روپیہ ہاتھ آئے گا۔
اور جب تک روزگار کی کوئی اچھی سبیل نہ نکلے اس وقت تک تنگدستی
اور فکر معاش سے نجات ملے گی۔
اس کے بیچنے میں کوئی دقت بھی اسے نظر نہیں آتی تھی۔ برابر کے
گاؤں کے جن لوگوں نے اس کی دوسری جائداد خریدی تھی ان میں سے
جس کو بھی یہ عمارت مل جائے وہ خوش ہی ہوگا۔

گاؤں میں گلتانی کے ناکام چاہنے والوں کا ایک گروہ تھا، جو
گلتانی سے انتقام لے کر اپنا جی ٹھنڈا کرنے کا موقع ڈھونڈھ رہا
تھا۔ یہ موقع ایک دن خود بخود ہی پیدا ہو گیا۔ شیخ سمیر گاؤں کا مکھیا تھا
گاؤں میں اس کا بڑا اثر تھا۔ شیخ سمیر کی پچاس سال کی عمر تھی، جب اس کی
تیسری بیوی دو تین چھوٹے چھوٹے بچے چھوڑ کر مر گئی تو لوگوں نے اسے
گلتانی سے شادی کرنے کا مشورہ دیا۔
—— گلتانی ہی سے نکاح کر لو پردھان —— دیکھو گے کہ وہ تمہارا
گھر بار کس طرح سنبھال لیتی ہے اور اس کا گھمنڈ بھی کم ہو جائے گا.......
گاؤں کے لونڈے بھی ٹھیک ہو جائیں گے۔
مکھیا نے کہا: گلتانی کے تو گاؤں میں گڑھے پڑتے ہیں، کیا اس
سے شادی کر کے میں وقت سے پہلے ہی مر جاؤں؟
—— تم کیوں مرنے لگے چودھری! اس سے شادی کرنے میں کوئی خرابی
نہیں۔ اس کا شوہر مرا۔ تمہاری بیوی مری.... نحوست کا چکر تو ختم ہوا۔
پردھان نے کہا: بات تو تم نے ٹھیک کہی..... اچھا میں
اسی سے نکاح کروں گا۔ دیکھنے میں وہ خاصی اچھی ہاتھ پاؤں کی ہے۔
چودھری کے چہرے پر ہنسی کی ہلکی سی لہر داڑھی مونچھوں کے
جنگل کو چیرتی ہوئی نکل گئی۔
مگر گلتانی نے چودھری کا پیغام بے دھڑک رد کر دیا۔ جو شخص
پیغام لے کے آیا تھا اس سے کہا اپنے پردھان سے کہہ دینا کہ گلتانی
گلے میں پھانسی ڈال کر مرنا منظور ہے مگر اس بڈھے کھوسٹ کا گھر آباد نہیں کرے گی۔
گلتانی کی ماں نے مارے ڈر کے ٹوکا کہ بات تو سن حرامزادی!

اری! یہ تیری قسمت جاگی ہو کہ چودھری تجھ سے نکاح کرنا چاہتا ہے۔ چودھری کے پاس دھن دولت، زمین سبھی کچھ ہے۔ تیرے دل میں آخر ہے کیا؟

گلتانی نے ناک بھوں چڑھا کے کہا: ایسے روپے پیسے اور زمین جھاڑ نہ پھرتی ہوں۔

جو شخص یہ پیغام لے کے آیا تھا، وہ گلتانی کا منہ بولا دولہا بھائی تھا۔ اس نے ذرا چھیڑ خانی کی کہ بوڑھا کتنا پیار کرے گا تمہیں، دیکھنا۔ پیچھے پیچھے پھرے گا جیسے پالتو کتا۔

دولہا بھائی نے زور کا قہقہہ لگایا۔

گلتانی نے کہا: تو پھر کہہ دینا کہ ویسا ہی ایک جانور ڈھونڈھ لے، اپنے لئے ——— میرے پیچھے کیوں پڑا ہے۔

زیادہ بات کی ضرورت نہیں۔ وہ شخص واپس چلا گیا۔

یہ باتیں سن کر شیخ سمیر بھڑک اٹھا، اتنی بڑی بات! گاؤں کے بڑے بوڑھوں نے کہا: دماغ دیکھا لونڈیا کا؟ تم اس کا کوئی علاج کرو چودھری! کوئی ترکیب نکالو۔

گلتانی کے ناکام عاشقوں نے کہا: گلتانی کے رنگ ڈھنگ بُرے اور چال چلن خراب ہے۔ رات کو تالاب کے کنارے اکیلے میں وہ اور گجر ایک دوسرے کی بغل میں بیٹھ کے پریت کے گیت گنگناتے ہیں۔

مُکھیا نے کہا: ہائیں! اچھا مزا چکھاتا ہوں میں ٹھہرو!

گاؤں میں پنچایت بیٹھی ہے۔

گلتانی کا مقدمہ درپیش ہے۔

گلتانی اپنے خلاف الزامات سن کر آگ بگولا ہو گئی۔ ایسی جھوٹی بات نہ کہو، چودھری۔ مجھ پر جو ایسا طوفان اٹھائے گا وہ کوڑھی ہو جائیگا۔

مُکھیا ہنسا اور کہا: وہ تو دیکھا جائے گا بعد میں ——— اب ناپ کے دو ہاتھ زمین سے ناک رگڑ۔ آئندہ کسی دن تجھے گجر کے پاس پھٹکتے دیکھا تو سخت سزا ملے گی۔ سمجھی؟

گجر اب تک مجلس کے ایک کونے میں خاموش بیٹھا تھا۔ یک بیک اٹھ کر بولا: تمہیں سزا دینی نہیں پڑے گی، پردھان ——— میں اس سے شادی کر لوں گا۔

مجلس پر بجلی سی گری۔ گلتانی نے گجر پر ایک نگاہ ڈال کے آنکھیں نیچی کر لیں۔ ساری مجلس ہکا بکا رہ گئی۔

مُکھیا نے گرج کر کہا: شادی کرو گے! منہ سے کہہ دیا اور ہو گئی شادی۔

——— کیوں، شادی پر تمہیں کیا اعتراض ہے؟

——— اعتراض! اعتراض تو بڑا بھاری ہے! مگر وہ ہم تمہیں بتائیں گے نہیں، گجر!

گجر خاں چلا اٹھا، بتاؤ گے کیسے نہیں۔ بتانا پڑے گا۔

——— اچھا رے۔ اتنی بڑی بات! مار حرامزادے کو۔

آن کی آن میں بہت سے مخالف ہاتھ گھونسے تان تان کے اٹھے اور گجر پر پل پڑے۔

ایک خوفناک ہڑبڑ اور شور و غل میں مجلس برخاست ہو گئی۔ اگلے دن معلوم ہوا کہ گجر گاؤں چھوڑ کے شاید کہیں چلا گیا۔ گلتانی بالکل گم سم رہ گئی۔

مراد بہت دنوں کے بعد گاؤں میں آیا ہے! اس کا عاشق فن دل گاؤں کے ہر منظر پر لوٹ ہے۔ سارے دن وہ بڑے شوق اور انہماک سے تصویریں کھینچتا ہے۔

کل جو لوگ اس کی رعیت تھے آج وہ اور وں کی پرجا ہیں، تب بھی پرانی رعیت میں سے ایک ایک کر کے بہت سے لوگ پرانے آقا کی اولاد سے ملاقات کرنے آئے۔ کوئی شخص اس سے زیادہ بات نہیں کرتا۔

——— شاید ہمت نہیں پڑتی ——— پھر بھی جو آتا ہے، سلام کرتا ہے اور چلا جاتا ہے۔

مراد انسانی صحبت کی کمی کو قدرتی مناظر کی زیبائی اور دلفریبی سے پورا کر لیتا ہے۔ گاؤں اسے بے حد بھلا لگ رہا ہے۔

مراد تصویر کھینچ رہا ہے۔

بل کھاتی ہوئی ندی کہیں نظروں سے اوجھل ہو گئی ہے۔ چھوٹی بڑی طرح طرح کی ناویں ایک کے بعد ایک بہی چلی جا رہی ہیں۔ اس پار جہاں تک نظر جاتی ہے دھان کا ہرا کھیت ہے۔ بیچ بیچ کھنڈرات میں ایک ٹوٹا پھوٹا محل۔

کتنی حسین تصویر! اسب گویا صبح کے باغ ـــــ صبح صبح کے درخت! کتنی خوبصورت چھوٹی چھوٹی نالیاں ـــــ جیسے بالکل اصلی! ناریل کا درخت ـــــ ناریل! واہ وا ...... ! مراد تصویر کی نظر اٹھا کر حیران رہ گیا۔ پندرہ سولہ سال کی ایک لڑکی .... رنگ سانولا۔ مگر جسم بے عیب نہایت متناسب جس میں عنفوانِ شباب کی بھرپور بہار ہے۔ ڈھیر کے ڈھیر کالے بالوں کی بھاری بھرکم چوٹی ـــ دھاری دار رنگین ساری میں لپٹی ہوئی پتلی کمر بڑی بڑی بادامی آنکھوں میں حیرت لیے ہوئی۔ ان باتوں نے مراد کا دل موہ لیا۔

ـــ تمہارا نام؟

ـــ گلتانی ....

ـــ گلتانی! نام تو بہت پیارا ہے۔

گلتانی نے کہا: جیسے آپ خوبصورت ہیں ویسی ہی سندر تصویر بھی کھینچی ہے۔

مراد نے کہا: میں کیا بہت خوبصورت ہوں؟

ـــ بیشک! کتنا سندر ہے آپ کے بدن کا رنگ ..... گورا گورا، خوبصورت۔

ـــ تم بھی سندر ہو .... مجھ سے کہیں زیادہ۔ گلتانی مسکرائی گالوں میں گڑھے پڑ گئے۔

گلتانی نے کہا: میں تو کالی ہوں۔

کالی ہو اسی لئے تو اور بھی خوبصورت لگتی ہو۔ تمہارا جسم، ناک، آنکھیں، چہرہ، بال، "ڈل" (گال کا گڑھا) سب مل ملا کے بے مثال ہو تم۔

"ڈل"؟ ڈل کیا؟

تم جب ہنستی ہو تو تمہارے گال میں جو ....

اوئی! ہنستے وقت گال میں گڑھے پڑ جاتا! ؟

گلتانی کھلکھلا کے ہنس دی۔ کیا اسے "ڈل" کہتے ہیں؟

گلتانی پھر ہنسی۔

ہنسیں کس بات پر؟

آپ کی بات سن کر۔ بڑا پیارا لفظ ہے ..... "ڈل"

فقط لفظ ہی پیارا نہیں ...... وہ خود بھی بہت پیارا ہے۔

گلتانی نے آنکھیں نیچی کرکے کہا: ہنستے وقت جن لڑکیوں کے گال میں گڑھے پڑ جاتے ہیں وہ تو بدنصیب ہوتی ہیں ..... شوہر ان کے زندہ نہیں رہتے۔

کون کہتا ہے؟

سب ہی کہتے ہیں ... میں بھی جانتی ہوں۔

غلط بالکل جھوٹ۔ گال میں "ڈل" تو چھپے پن کی علامت ہے ..... ایسی لڑکیاں پتی کو بہت پیاری ہوتی ہیں۔

مراد ہنسا۔

گلتانی کی بڑی بڑی آنکھیں خاموش مراد کا منہ دیکھتی رہیں۔

سعید پور گاؤں کا گاؤں مشتعل ہو گیا ہے۔ گاؤں والے سب بپھرے ہوئے ہیں۔ نشانہ مراد ہے۔

رات کے ایک بجے۔

مراد بستر پر چپ چاپ پڑا ہے۔ آنکھوں میں نیند نہیں۔ گھر کے کونے میں شمع جلتے جلتے ختم ہونے پر ہے۔ باہر چاروں طرف گھپ اندھیرا ہے۔ موسلا دھار بارش ہو رہی ہے۔ بہت سے جھینگر بلند اور کرخت آوازیں لگا، چلا رہے ہیں۔ کبھی کبھی گیدڑ کے بولنے اور ساتھ ہی کتے کے بھونکنے کی آواز سنائی دیتی ہے۔ کہیں دور بجلی گری۔

یہ تو واقعی بری بات ہوئی۔

مراد نے اٹھ کر اپنے کیس سے ایک نئی موم بتی نکال کے جلائی سگرٹ سلگا کے کمرے میں ادھر ادھر ٹہلنے لگا۔ کسان جس طرح بگڑے ہوئے ہیں۔ اگر مجھے مار بھی ڈالیں تو عجب نہیں۔ تصویر کھینچنا ان کی نظر میں ویسے ہی پاپ ہے۔ اس پر ایک نوجوان لڑکی کو ماڈل بنا کر تصویر کھینچنا! کئی چھوکرے تو ابھی ابھی دھمکی دے گئے ہیں۔ وہ ایک بوڑھے بزرگ بھی آئے تھے۔ چھوکروں کا غصہ ہی شاید تیز ہے۔ ہوتا ہی ہے۔

مراد نے ختم شدہ سگرٹ کا آخری کش لے کر اسے پھینک دیا۔ اور دوسرا سگرٹ سلگا کر بچھونے پر آ بیٹھا۔

"پیرس میں بیشک ایسی باتیں عام ہیں۔ مگر ہمارے ملک میں تو بڑے بڑے شہروں میں بھی جو لڑکیاں یا عورتیں ماڈل بن کے روپیہ کماتی ہیں وہ ہرگز شریف گھرانے کی نہیں سمجھی جاتیں۔ تو پھر میں نے کیوں ایسا احمقانہ کام کیا؟ لیکن قصور تو دراصل لڑکی کا ہے۔ اس نے خود ہی تو مجھ سے اپنی تصویر کھینچنے کہا اور پھر خود ہی شکایت کر دی۔ یہ لونڈیا بہت پاجی نکلی۔ البتہ اسے اس بات کا سان گمان بھی نہ ہوگا کہ میں اسے ایک جانگیا دوں گا!"

(بقیہ صفحہ ۴ ..)

افسانہ

کشمکش

حامد علی خاں

"کیوں بھئی۔ تھر میں بارش ہوئی؟" ہر جانی پہچانی صورت سے اللہ ڈنو کا پہلا سوال یہی ہوتا۔ وہ سارا دن کارخانے میں اور رات سٹیشن پر گزارا کرتا۔ تھر کی طرف سے آنے والے مسافروں کی تلاش کرتا اور طویل سندھی علیک سلیک کے بعد جو اسے ان دنوں گراں گزرتی پہلا سوال یہی کرتا تھا۔ جولائی کے مہینے کے ساتھ ہی اللہ ڈنو کا دل شہری زندگی سے اچاٹ ہو جاتا۔ وہ عبد پور خاص میں بھی صبح شام غیر متغیر نیلے آسمان اور بھورے افق کو دیکھا کرتا اور تھر کی سمت دیکھ کر بارش کے اندازے لگایا کرتا۔ اس کا بس چلتا تو وہ دن کی گاڑیوں سے بھی مسافروں سے برسات کا حال ضرور پوچھتا۔ سٹیشن پر وہ اس وقت تک ٹھہرتا جب تک آخری گاڑی کے سارے مسافر باہر نہ چلے گئے ہوں۔ اسے پچھلے دو سال سے مایوسی ہو رہی تھی۔ دو سال پہلے قحط کے حالات میں بادلِ ناخواستہ تھر چھوڑ کر وہ شہر آیا تھا۔ کارخانہ میں کام مشکل سے ملا تھا۔ لیکن اب بھی وہ بارش کی خبر سن کر اپنے ریگستان کو لوٹنے کے لئے بے تاب تھا۔

اب کی بار تیسرے سال اسے قوی امید تھی کہ بارش ضرور ہوگی اور وہ اپنے گاؤں رتن کا تڑ جا کر ریتیلے پہاڑوں کے درمیان گھری ہوئی وسیع زمین کو کاشت کرے گا اور باجرے کی مرغوب لہلہاتی فصل کاٹے گا۔ سٹیشن سے لوٹتے وقت اس کے پیروں میں فولادی طاقت آ گئی۔ تیز قدموں سے جب وہ گھر میں داخل ہوا تو منتظر بیوی نے شکایت کے لہجے میں کہا "آجکل رات گئے آتے ہو، ٹھنڈی روٹی کیا خاک اچھی لگے گی؟"

"اری جنت! تھر میں خوب برسات ہو گئی۔ اب یہ گندم کی روٹی کھا کر کون بیمار پڑے۔ چاکر تجیر کا بیٹا عرب آج سٹیشن پر ملا تھا۔ کہتا تھا ہمارے مکان کے ٹیلہ پہ گھٹنے برابر گھاس اگ آئی ہے۔"

جنت نے ایک لمبی ہوں بھری۔ وہ گویا نیم رضامندی کے انداز میں پوچھ رہی تھی، اب کیا ارادہ ہے؟ کیا تھر چلو گے؟

اللہ ڈنو کہے جا رہا تھا "اور ہاں، عرب کہہ رہا تھا کہ متارو کے پاس ہمارے جانور اچھی طرح ہیں۔" "گائے نے کیا جنا؟" جنت نے پوچھا۔

"بچھڑا۔ عرب نے تبلایا کہ متارو نے مشہور کر رکھا ہے کہ بچھڑا مر گیا۔ لیکن چوری چھپے اپنی سسرال بھیج دیا ہے۔ اب جاتے ہی اپنے جانور اس مردود کے شکنجے سے چھڑا لوں گا۔"

اللہ ڈنو خوشی سے چہک رہا تھا۔

"روٹی کھا لو" بیوی نے رکابی تھماتے ہوئے کہا۔

"خدا کی قسم جنت! باجرا نہ کھا کر دو سال گذر گئے۔ اب کی بار میں صرف باجرا بوؤں گا۔ تربوز بھی تھوڑے سے بو لوں گا۔ گوار بالکل نہیں۔"

"کیا جانوروں کو بھوکا مارو گے؟ گوار تو بونی ہی پڑے گی" جنت نے اعتراض کیا۔ اسے اٹھتا دیکھ کر پوچھنے لگی "بس۔ دو ہی نوالے تو کھائے ہو۔"

"ہوں ہوں ہوں" اس نے چباتے چباتے نفی میں سر ہلایا اور پہیلیوں کی طرح کہنے لگا "ذرا حساب لگا کر دیکھتا ہوں کہ اپنے جانور متارو سے مل سکیں گے۔" یہ کہتے ہوئے وہ ایک پٹاری اٹھا لایا اور رقم گننے لگا۔ اطمینان کا سانس لیکر اللہ ڈنو نے کہا "دھنی کی مہربانی سے تین سو ہیں۔ متارو کو دے کر اور سفر کا خرچ چھوڑ کر پچاس، ساٹھ بچ رہیں گے۔"

"اگر متارو انکار کر جائے تو؟"

"میں برادری میں فیصلہ کرواؤں گا! اگر برادری نہ مانے تو میں پیر صاحب سے فریاد کروں گا۔"

"ہاں پیر صاحب سے ضرور عرض کرنا" خوش عقیدہ جنت کو

آخری ترکیب بہتر معلوم ہوئی۔

"تم کو پانی کی رقم تو ضرور دینی پڑے گی اللہ ڈنو۔" رتن کاتر کے مکھی کمال جونیجو نے فیصلہ کی تجویز پیش کرتے ہوئے برادری کے ارکان سے کہا "پچھلے دو سال سے ڈکار (قحط) تھا۔ کنویں پر پہرے دار بٹھانے سے پانی مہنگا پڑا تھا۔ متارو نے دو سال تک تمہارے جانوروں کی دیکھ بھال کی۔ دو بیل اور ایک گائے کا دو سال کے لئے کیا خرچ بیٹھے گا؟ یہ آپ لوگ طے کریں گے۔"

"میں برادری کی ہر بات ماننے کو تیار ہوں۔ جو کچھ پانی کا حساب لگے گا وہ میں اسی وقت سب کے آگے دینے کو تیار ہوں۔ لیکن متارو کو بھی جانور سب کے سامنے اسی وقت حوالے کرنے ہوں گے۔" اللہ ڈنو نے اپنی شرائط گاؤں والوں کے آگے رکھ دیں۔

"سائیں سگورا" متارو نے جونیجو کی خوشامد کرتے ہوئے کہا "آپ سمجھتے ہیں کہ ان تین جانوروں کے علاوہ ایک بچھڑا بھی چھ مہینے تک زندہ رہا۔ اس کا حساب بھی تو ہونا چاہیئے۔"

"یہ جھوٹ ہے کہ بچھڑا مر گیا ہے۔ تم نے اسے کہیں چھپا دیا ہے۔ مجھے سب کچھ پتہ ہے۔" اللہ ڈنو نے کہا۔ "تو بتاؤ کہاں ہے؟" متارو نے بھی جھوٹ کا خود اعتمادی سے دفاع کیا۔

"تمہارے سسرال میں کسی نے یہاں اسے مردہ نہیں دیکھا" اللہ ڈنو نے جواب دیا۔

"ہم نے دیکھا ہے۔"

"ہم نے بھی مردہ دیکھا ہے۔"

"ارے وہ! میں نے ہی تو اس کی کھال کھینچی تھی۔"

یکے بعد دیگرے متارو کے ہوا خواہ گواہی دینے لگے۔ ابھی یہاں تک بحث ہونے پائی تھی کہ لوگ ایکدم اٹھ کھڑے ہوئے اور ہر طرف سے "سائیں بسم اللہ۔ سائیں بسم اللہ" کہہ کر سلام کیا جانے لگا۔ اللہ ڈنو کی فریاد سننے کے لئے پیر صاحب یعنی سائیں بادشاہ بھی اپنے گوٹھ سے آ چکے تھے۔ اللہ ڈنو نے بڑھ کر اوڈنٹ کی مہار تھامی اور پیر صاحب سب کو شرف قدم بوسی بخشتے ہوئے ریت کے سنگھاسن پر براجمان ہو گئے۔ مکھی جونیجو کو اپنی کرسی صدارت چھن جانے کا بری طرح احساس ہو رہا تھا لیکن پیر کے آگے دم مارنے کی مجال نہ تھی۔ متارو بھی مایوس ہو گیا۔ اسے اب پانی کے دام حسب دلخواہ ملنے کی امید نہ تھی۔ مکھی کی تمہید موثر تھی۔ برادری کا بھی پانی کی مہنگائی کی بات مان گئی تھی لیکن پیر صاحب سے خدشہ تھا کہ بات میں بات نہ پیدا کریں۔ پنچایت کا دوبارہ آغاز ہوا۔ طرفین نے صورت حال کی اپنے اپنے زاویۂ نگاہ سے وضاحت کی۔ پہلا مسئلہ یہ تھا کہ بچھڑا واقعی مر گیا یا متارو کے پاس موجود ہے۔ متارو نے اپنے گواہ پیش کئے۔

"یا سائیں بادشاہ" تیسرے گواہ نے کہا "اس کی کھال میں نے خود اتاری ہے۔"

"وہ کھال کس کے پاس ہے؟" پیر صاحب نے دریافت کیا۔

"متارو کے پاس" گواہ نے کہا۔

"کھال کی قیمت بچھڑے کے چھ مہینے کے پانی کے خرچ سے بہت کم ہے۔ باقی جانوروں کا خرچ بھی کھال کی قیمت میں سے وضع ہونا چاہیئے۔"

مجمع سے "سبحان اللہ" اور "ماشاء اللہ" کی تائیدی صدائیں بلند ہوئیں۔ پیر صاحب نے متانت سے اپنا استدلال جاری رکھا۔ جب بچھڑا چھ مہینے تک زندہ تھا تو متارو نے اس کا دودھ بھی استعمال کیا ہوگا۔ معاملہ میں صرف جانوروں کی نگرانی کا خرچ ہے۔ دودھ کا حق اللہ ڈنو کو پہنچتا ہے ــــ کھال اور دودھ کی قیمت پانی کے خرچ میں سے کم کر لینی چاہیئے۔"

"الحمد للہ۔ بہت ٹھیک ہے" حاضرین میں سے چند نے کہا۔

"پانی کا حساب کس بھاؤ سے لگایا جائے؟" کسی نے دریافت کیا۔

"پانی کی مہنگائی کا سوال تو وہاں پیدا ہوتا ہے جہاں کہ تنخواہ یاب پہرے دار بٹھائے گئے ہوں۔ رتن کاتر میں تو سب نے مل کر نگہبانی کی۔ خرچ تو اس سے لینا چاہیئے جو پہرے داری سے انکار کرتا۔ اللہ ڈنو تو گاؤں میں تھا نہیں۔ اس سال وہ اپنی کسر پوری کر دے گا لہٰذا وہی دام لگائے جائیں جو سب نے پچھلے دو سالوں میں ادا کئے" پیر صاحب نے اثبات میں ہلتے ہوئے سروں کے درمیان اپنا فیصلہ سنا دیا۔

"اللہ سائیں! بڑی خیر" اللہ ڈنو نے شکر اور احسانمندی کے جذبات سے کہا اور رقم گننے لگا۔ متارو کا منہ نکل آیا۔ قرضہ کی رقم اور دیگر واجبات سے زیادہ اسے کچھ نہیں ملا وہ کھسیانے ہو کر

اپنا جھگڑا درست کر رہا تھا۔

جنت گائے پاکر اتنی ہی خوش تھی جتنا اللہ ڈنو اپنے دو بیلوں سے۔ یہ دن بھر اپنے کھیت میں مست رہتا اور وہ اپنی کٹیا میں مگن۔ جنت نے دو بکریاں بھی پال لی تھیں۔ گائے اور بکریوں پر جان چھڑکتی۔ صبح ہوئی اور دونوں نے لسّی سے اپنا پیٹ بھر لیا۔ وہ کھیت کی طرف روانہ ہوتا اور جنت اپنے چوپائے لے کر دور ایک نئے ٹیلے کی طرف نکل جاتی۔ وہ مشکل سے اونچائی تلاش کرتی کیونکہ وہاں کی گھٹنے گھٹنے بھری گھاس کو کسی نے چھوا نہ ہوگا۔ انہیں اطمینان سے چرتا چھوڑ کر جنت گھر لوٹ آتی۔ دوپہر ہونے تک نمکین باجرے کی روٹی تیار کرتی۔ مکھن لسّی پیاز اور پانی لے کر وہ اللہ ڈنو کی طرف روانہ ہو جاتی۔ ایسے میں وہ ایک سندھی لوک گیت کی مجسم تصویر نظر آتی:۔

میرے محبوب! تو اگر راضی ہو تو میں تیری رانی بن جاؤں
تجھے روٹی کے ساتھ مکھن لگا کر دوں گی۔
اور ہوا میں تنکا بن کر تیری آنکھوں میں بیٹھ جاؤں گی۔

آدھا راستہ طے کرنے کے بعد وہ ہو ہو ہو ہو کی آوازیں لگاتی۔ اللہ ڈنو کی جوابی آواز سنکر اسے اس کی جگہ کا پتہ چل جاتا اور وہ باجرے کی فصل کو چیرتے ہوئے اس تک پہنچ جاتی۔

"کتنی گھاس جمع کی؟" وہ پوچھتی۔

"اب کی بار گھاس بہت ہے۔ اکھیڑتا ہوں پھر اگ جاتی ہے لیکن فصل کو زیادہ نقصان نہیں پہنچے گا۔"

"خدا کرے ابکی بار ہمیں شہر جانا نہ پڑے۔ میں بھی تمہارے ساتھ گھاس اکھیڑوں گی۔"

"اگر یہ فصل پوری کی پوری ہاتھ لگ گئی تو کبھی نہیں جاؤں گا۔ سال بھر کا غلہ رکھ کر ہم تین گائیں آسانی سے خرید سکتے ہیں۔"

"کیا چارہ کافی ہو جائے گا؟"

"چارہ تو پانچ جانوروں کا نکل سکتا ہے۔ دیکھتی نہیں فصل تیرے سر کو چھو رہی ہے۔"

"تو باقی گھاس سے ہم اپنی جھونپڑی درست کرلیں گے۔" جنت مستقبل کے نقشے بناتی۔

"ہاں ہاں ضرور۔" وہ کھلکھلاتے ہوئے ہنسا اور مست سے سر ہلاتا۔

شام تک دونوں کام کرتے۔ اللہ ڈنو کمر جھکا کر کمان بن جاتا اور گھنٹوں کدال سے گھاس اکھیڑتا۔ جنت اس کے پیچھے کھڑے ہوئے ڈھیلوں سے لمبی گھاس جمع کرتی تاکہ ان سے اپنی کٹیا کے سوراخ بند کر سکے۔ پھوس کی دیواروں کو گھاس کا پیوند ہی تو چاہیے۔ ریگستان میں برسات کا سورج کم گرم نہیں ہوتا۔ اللہ ڈنو کے پسینے چھوٹ جاتے، کدال کی ہتھی پسینے سے گیلی ہو جاتی اور وہ بار بار اپنے ہاتھ گرم ریت میں گھسیٹ کر خشک کرتا اور پھر کدال چلنے لگتی۔ جب وہ پسینہ خشک کرنے کے لئے بیٹھتا تو جنت اس کے لئے تربوز توڑ لاتی۔ مکا مار کر اس میں سوراخ کر دیتی اور تربوز کا پیالہ اس کے ہونٹوں سے لگا دیتی۔ پانی پی چکنے کے بعد اس کے دو حصے کر دیتی، ایک اپنے لئے اور ایک اللہ ڈنو کے لئے۔ دونوں خوب کھرچ کھرچ کر کھاتے، ایک دوسرے پر چھلکے پھینکتے اور سستا کر پھر دھرتی کا سینہ چیرنے لگ جاتے۔ جونہی سورج ریت کے پہاڑ نما ٹیلوں کو چومنے لگتا جنت کھیت چھوڑ کر مویشی لانے کے لئے نکل پڑتی۔ اللہ ڈنو دن بھر کی گھاس سر پر اٹھائے اس کے ساتھ ہوتا۔ ٹیلوں پر اترتے چڑھتے، اپنی زندہ دولت لئے، شام کے جھٹ پٹے کے ساتھ اپنے گھر پہنچتے۔ کام کاج کی تقسیم رضاکارانہ طور پر ہوتی۔ جنت نانِ شبینہ کا اہتمام کرتی اور اللہ ڈنو مویشی باندھ کر، دودھ دوہ کر، حقہ تیار کر لیتا۔ کٹیا کے باہر چھٹکی ہوئی چاندنی میں اپنی لہلہاتی کھیتی کی طرف رخ کئے امیدوں کے تانے بانے بنتے ہوئے دونوں محو خواب ہو جاتے۔ کون جانے ان دلوں میں کیسی کیسی آرزوئیں پلتی ہوں گی۔ لیکن ان کی تمناؤں کی شادابی زمین کی سرسبزی سے وابستہ رہی ہے، شاہ لطیف نے ان کے دلوں کو پالیا تھا۔ تبھی تو دعا فرماتے ہیں:۔

"میرے مولا! سندھ پر کرم کی نظر کیجو
اے دوست! اے دلدار! سارے عالم کو شاداب رکھیو!"

اونٹ کی چیخ، تملے جنت کا انتظار کرتے ہوئے وہ سو چکا تھا۔ اس کے کانوں میں اب بھی جنت کی دردناک آواز گونج رہی تھی۔

"گھوڑا رے! گھوڑا رے!" جنت کی ہائے ہائے سن کر وہ جھونپڑی سے باہر نکل آیا۔

"مگر۔ مگر گھوڑا رے!" جنت ہاتھ دکھا اڑتی ہوئی ٹڈیوں کی

(باقی صفحہ ۔۔۔ پر)

افسانہ:

"اپنا گھر"

انور عنایت اللہ

رضیہ کو کئی گھنٹوں کی مسلسل بے چینی کے بعد نیند آئی تو ذکیہ نے چپکے سے روشنی گل کر دی، دریچے بند کر دیئے، بھاری مخملی پردہ کھینچا اور پھر کمرے سے باہر آ گئی۔

ڈرائنگ روم کی گھڑی ایک بجا رہی تھی اور رات بے حد خاموش تھی۔ دن بھر کی دوڑ دھوپ نے شاہد کو بری طرح تھکا دیا تھا اور اب اسی کے اصرار پر وہ سو رہا تھا۔ ڈرائنگ روم میں تاریکی تھی لیکن اس سے ملحق برآمدے میں روشنی تھی۔ میز پر نئے مکان کے نقشے اب بھی یوں ہی پڑے تھے۔ ابھی وہ اور شاہد بیٹھے ان نقشوں کا مطالعہ کر رہے تھے کہ یکایک انہیں ایک چیخ سنائی دی۔ وہ تیزی سے اٹھ کر باہر آئے تو انہیں رضیہ نظر آئی جو سیڑھیوں سے قریب خون میں نہائی گٹھڑی بنی پڑی تھی۔ وہ حسب عادت بھاگتی ہوئی سیڑھیاں چڑھ رہی تھی کہ اس کا پیر پھسلا اور وہ لڑھکتی ہوئی نیچے آ رہی۔ ڈاکٹر کا کہنا تھا زخم جلد بھر جائیں گے لیکن شاید عمر بھر کے لئے اس کے داہنے پیر میں نقص رہ جائے۔

ذکیہ نے میز کا سہارا لے کر ٹھنڈا سانس لیا۔ یہ پچھلے چند گھنٹے قیامت کے گذرے تھے۔ وہ بری طرح نڈھال ہو رہی تھی۔ اس نے سارے نقشے سمیٹے اور انہیں ایک بار پھر الماری میں بند کر دیا۔ جب تک رضیہ مکمل طور پر صحتیاب نہیں ہو جاتی انہیں الماری ہی میں بند رہنا ہوگا۔ ذکیہ نے سوچا اور وہ برآمدے کی روشنی گل کر کے دوبارہ رضیہ کے کمرے میں لوٹ آئی۔ نئے مکان کے یہ نقشے پچھلے سولہ سال سے یوں ہی بنتے اور الماری میں بند ہوتے رہے تھے۔

آج رضیہ سے قریب صوفے پر نیم دراز لیٹ کر، آنکھیں بند کئے ذکیہ کو وہ دن شدت سے یاد آیا جب پہلی بار شاہد کے سینے سے لگ کر آنکھیں بند کئے سکون اور آسودگی کا ایک طویل سانس لیتے ہوئے اس نے آہستہ سے شاہد کو یقین دلایا تھا کہ اسے بھی شاہد سے بے انتہا محبت ہے۔ اسی دن پہلی بار ایک اپنے ہی مکان کا نقشہ اس کے ذہن میں ابھرا تھا۔ ان کی شادی اب سولہ سال ہو رہے تھے۔

شاہد ایک فوجی باپ کا بیٹا تھا جس کی کوٹھی میں آجکل یہ لوگ مقیم تھے۔ شادی کے وقت کرنل واجد زندہ تھے۔ ان کا تو ابھی پچھلے سال انتقال ہوا تھا۔ بڑے وضع دار اور زمانہ شناس بزرگ تھے۔ شادی کے بعد ذکیہ دلہن بن کر اسی کوٹھی میں آئی تھی۔ یہ دو منزلہ کوٹھی تھی تو قدیم وضع کی لیکن کرنل واجد کافی خوش ذوق انسان تھے۔ انہوں نے اپنے انجینئر بیٹے کی مدد سے اس میں بہت سی تبدیلیاں کر کے اسے خوبصورت اور آرام دہ بنا لیا تھا۔ چونکہ وہ گٹھیا کے مریض تھے اس لئے ان کی خوابگاہ نچلی منزل پر ہی تھی انہوں نے دوسری منزل کی سب سے خوبصورت خوابگاہ بہو بیٹے کے حوالے کر دی تھی۔ کوٹھی سے ملحق باغیچہ تھا جس کی بہت اچھی طرح سے دیکھ بھال ہوتی رہی تھی۔ ڈرائنگ روم کی بڑی کھڑکی سے باغ کی حسین ہری ہری روشیں بے حد بھلی لگتیں، جن سے ذرا پرے ایک حسین فوارہ تھا۔ شادی کے بعد اس خاموش کوٹھی میں منتقل ہو کر ذکیہ نے ایک عجیب سکون محسوس کیا تھا۔ لیکن چند ہفتوں کے قیام کے بعد باپ بیٹے بہو کے لئے شہر میں ایک خوبصورت فلیٹ کرایہ پر لے دیا جو شاہد کے دفتر سے قریب تھا۔ دونوں اپنی ایک علیحدہ خوبصورت دنیا میں منتقل ہو گئے جہاں ان کی آزادی میں خلل ہونے والا کوئی نہ تھا۔

اس فلیٹ میں منتقل ہونے کے فوراً بعد، ذکیہ کو ایک بار پھر اپنے گھر کی آرزو ہوئی تھی اور صرف اسی آرزو سے متاثر ہو کر شاہد نے شہر کے مضافات میں زمین خریدی تھی۔ اسی فلیٹ میں گھنٹوں دونوں اپنے نئے گھر کے نقشے تیار کرتے، اسکیمیں بناتے بحثیں کرتے اور ان دلچسپ باتوں کے دوران مستقبل کے سہانے خوابوں میں کھو جاتے۔

کئی دنوں کی محنت اور بحث مباحثے کے بعد کوٹھی کا پہلا نقشہ تیار ہوا تھا۔ بارشیں شروع ہو چکی تھیں۔ بارشوں کے فوراً بعد گھر کی تعمیر کا کام شروع کرنے کا ارادہ ہی کیا تھا کہ یکایک گھر کی تعمیر میں پہلی رکاوٹ پیدا ہوئی۔

ایک دن شاہد خلاف معمول وقت سے پہلے ہی دفتر سے لوٹ آیا تو ذکیہ پریشان ہو گئی۔ شاہد کا چہرہ قدرے اترا ہوا تھا۔ اس نے آتے ہی اداسی سے اپنی فائلیں ایک طرف رکھ دیں اور آہستہ سے یہ بری خبر سنائی تھی کہ اس کی ملازمت جاتی رہی۔ جنگ کے خاتمے پر تمام محکموں میں تخفیف ہو رہی تھی اور وہ اسی تخفیف کا شکار ہو گیا تھا۔

کرایہ کا فلیٹ چھوڑ دیا گیا اور وہ دونوں ایک بار پھر کرنل واجد کے یہاں منتقل ہونے پر مجبور ہو گئے۔ نئے مکان کے نقشے پہلی بار الماری میں بند کر دیئے گئے اور ملازمت کی تلاش شروع ہو گئی۔

دو مہینوں کے اندر اندر شاہد کو ایک بڑی فرم میں ملازمت مل گئی تنخواہ کچھ کم تھی لیکن مستقبل میں ترقی کی امید تھی۔ ایک بار پھر نئے گھر کے نقشے تیار ہونے لگے۔ شاہد اپنے باپ سے روپے لینے کے حق میں نہیں تھا۔ پہلے تو امید تھی کہ حکومت سے قرض مل جائے گا۔ اب وہ امید بھی جاتی رہی تھی۔ پاس اتنی رقم نہیں تھی کہ پچھلے نقشوں کے مطابق مکان تیار ہوتا۔ اس لئے شاہد نے ایک اور نقشہ تیار کیا۔ ایک بار پھر ایک نئے گھر کے خواب دیکھے جانے لگے۔ دونوں کو کرنل واجد کے یہاں ہر طرح کا آرام تھا۔ باپ کو اپنے اکلوتے بیٹے سے بڑی محبت تھی۔ بہو نے اپنے سگھڑاپے سے خسر کا دل موہ لیا تھا۔ خود ذکیہ کو کرنل واجد بہت پسند آئے۔ وہ ہر بات میں بہو کی رائے کو اہمیت دیتے، اس سے مشورے لیتے اور ہمیشہ وہی کرتے جو ذکیہ کو پسند ہوتا۔ ان تمام باتوں کے باوجود، ذکیہ کے دل میں ایک علیحدہ گھر کی آرزو پرورش پاتی رہی۔ نقشے تیار ہو گئے تو اس نے شاہد کو راضی کر لیا کہ وہ تعمیر کا کام اپنی نگرانی میں فوراً شروع کر دے۔

ٹھیکہ داروں سے ساری باتیں طے ہو گئیں اور کام شروع ہونے میں چند ہی دن رہ گئے تھے کہ یکایک اس کی طبیعت بگڑی۔ دو ایک دن تو اس نے شاہد سے یہ سب کچھ چھپا رکھا لیکن تا کجے؟ طبیعت روز بروز بگڑتی گئی۔ بوڑھے کرنل نے پریشان ہو کر فوراً ڈاکٹر کو بلوایا اور ڈاکٹر نے لیڈی ڈاکٹر کو۔ لیڈی ڈاکٹر نے پوری طرح اطمینان کر لینے کے بعد چپکے سے شاہد کے کان میں مبارکباد دی ـــــ

جب کافی علاج کے بعد بھی ذکیہ کی طبیعت نہیں سنبھلی اور سخت گرمیاں شروع ہو گئیں تو بیوی کی خاطر شاہد نے رخصت لی اور دونوں پہاڑ چلے گئے اور نئے مکان کا نقشہ ایک بار پھر الماری میں بند کر دیا گیا۔

اسی طرح یہ نقشہ بنتا اور بگڑتا رہا اور اب تو شادی کو سولہ سال ہو رہے تھے۔ ان کی پہلی لڑکی رضیہ اب پندرہ سال کی تھی اور آج صبح بری طرح سے زخمی ہو کر نیم بیہوش پڑی تھی۔ اس کا دوسرا بچہ حامد اب چودہ سال کا تھا اور نویں میں پڑھ رہا تھا۔ کرنل واجد کا انتقال ہو گیا تھا اور اب شاہد اپنی فرم میں چیف انجینئر تھا۔ اس کے بال کنپٹیوں پر سے سفید ہو گئے تھے اور ذکیہ کے سر میں بھی کئی سفید بالوں کی لٹیں ابھر آئی تھیں۔ اب تک وہ کرنل واجد ہی کی کوٹھی پر مقیم تھے۔ ان کا ارادہ تھا کہ نیا مکان بن جائے تو اسے فروخت کر دیں۔ کئی سال کے بعد اب شاہد نے ایک بار پھر بڑی محنت سے نئے مکان کا نقشہ تیار کیا تھا۔ اب تو اس نے وہ پرانی زمین فروخت کر کے شہر کی ایک نئی ابھرتی ہوئی کالونی میں ایک بڑا پلاٹ خرید لیا تھا۔ آج صبح وہ اس نئے نقشے کے متعلق ہی خوشی کے قہقہوں کے درمیان بحث کر رہے تھے کہ یکایک انہیں رضیہ کی چیخ سنائی دی تھی۔

رضیہ نے بے چینی سے کروٹ لی تو اس کے منہ سے ہلکی سی آہ نکل گئی۔ شاید وہ اب ہوش میں آ رہی تھی اس کی کراہ سے ذکیہ چونک گئی۔ اس نے اٹھ کر رضائی درست کی اور جھک کر غور سے اسے دیکھا۔ اس کا سر اور چہرہ پٹیوں سے ڈھکا ہوا تھا، آنکھیں بند تھیں اور چہرہ زرد۔ ذکیہ نے فرط محبت سے بیچین ہو کر اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھا جو بری طرح تپ رہی تھی۔ اس کے ہاتھ کی ٹھنڈک شاید رضیہ کو بھلی لگی اور اس کے ہونٹ آہستہ سے کھلے۔ "مجھے سونے دو حامد ـــ سونے دو، تمہاری شرارتوں سے میں تنگ آ گئی ہوں۔ آنے دو ابو کو ـــ امی کے لاڈ نے تمہیں بگاڑ رکھا ہے۔" وہ بڑبڑائی اور ذکیہ کی آنکھ میں آنسو آ گئے ـــ "سو جا میری بچی آرام سے سو جا۔ میں حامد کی وہ پٹائی کروں گی کہ ساری شرارتیں بھول جائے گا۔" وہ زیر لب بولی، یوں جیسے واقعی رضیہ ہوش میں ہو اور اس کی باتیں سن رہی ہو۔ اس کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہہ نکلے اور نہ جانے کب تک وہ یوں ہی بیٹھی روتی رہی۔

یکایک اس نے اپنے شانے پر شاہد کا ہاتھ محسوس کیا تو سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ وہ سامنے کھڑا تھا اور اس کے چہرے پر تھکن کے آثار نمایاں تھے۔ شاید وہ بھی سو نہ سکا تھا۔

"یہ کیا؟ خدا کے لئے ہمت سے کام لو۔ ہماری بچی اب بہتر ہے ڈاکٹر نے مجھے یقین دلایا ہے کہ وہ اچھی ہو جائے گی۔ بہت جلد اچھی ہو جائے گی۔"

یہ کہتے ہوئے وہ اس کے قریب بیٹھ گیا اور اسے تسلی دینے لگا صبح تک دونوں یوں ہی بیٹی کے سرہانے بیٹھے خدا سے اس کی زندگی کی بھیک مانگتے رہے صبح کی روشنی کے ساتھ رضیہ کی طبیعت سنبھلنے

گی اور آٹھ بجے تک وہ مکمل طور پر ہوش میں آ گئی۔ نو بجے ڈاکٹر نے اس کا ایک بار پھر معائنہ کیا اور ذکیہ کو تسلی دی کہ اس کی بیٹی خطرے سے باہر ہے۔ "زخم جلد اچھے ہو جائیں گے لیکن شاید داہنے پیر میں نقص رہ جائے کیونکہ ہڈی ٹوٹ گئی ہے۔ ابھی لڑکی کو کافی دن اسے بستر ہی میں رہنا ہوگا۔" اس نے جاتے ہوئے آہستہ سے شاہد سے کہا۔

ڈاکٹر چلا گیا تو ذکیہ نڈھال سی ہو کر بستر پر لیٹ گئی۔ لیٹتے ہی اس کی آنکھ لگ گئی اور نہ جانے کب تک یوں ہی بیہوش سوتی رہی۔ نیند میں اس نے بے شمار خواب دیکھے۔ بار بار وہ حسین کوٹھی اس کے سامنے آتی رہی جس کی شادی کے بعد سے اسے بڑی آرزو تھی، جس کے پچھلے پندرہ سولہ سال میں کئی نقشے بنے اور بگڑے۔ ان حسین خوابوں کے درمیان یکایک اسے رضیہ کی چیخ سنائی دی جو اوپر جاتے ہوئے سیڑھیوں پر سے نیچے لڑھک کر آ رہی تھی اور خون میں نہائی ہوئی خاموش گٹھڑی بنی پڑی تھی۔ رضیہ کی چیخ کے ساتھ وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھی۔

چار بج گئے تھے اور اب دن ڈھل رہا تھا۔ آسمانوں پر کالے بادل چھا گئے تھے جس سے کمرہ قبل از وقت نیم تاریک ہو گیا تھا۔ اس نے تھکی تھکی سی انگڑائی لی۔ رضیہ کے کمرے سے اب اسے باتوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ اس نے لیٹے ہی لیٹے آوازیں پہچاننے کی کوشش کی۔ شاہد کچھ کہہ رہا تھا۔ چند لمحوں کے بعد حامد کی آواز آئی۔ اور پھر یکایک رضیہ کی دھیمی سی آواز آئی۔ اس کی آواز سن کر ذکیہ نے خدا کا شکر ادا کیا۔

وہ اس کے کمرے میں پہنچی تو رضیہ نے مسکرا کر اسے دیکھا۔

"کیا حال ہے میری بچی کا؟" وہ اس کے قریب تپائی پر بیٹھ گئی۔

"اچھی ہوں۔ صرف پیر میں سخت درد ہے۔" رضیہ نے دھیمے لہجے میں جواب دیا۔ اس کے قریب شاہد بیٹھا تھا اور اس کے سامنے نئے گھر کا نقشہ پھیلا ہوا تھا۔ حامد اس پر جھکا ہوا غور سے اس کا مطالعہ کر رہا تھا۔

"ہم بڑی دیر سے باتیں کر رہے ہیں ذکیہ۔ تم بے خبر سو رہی تھیں اس لئے میں نے جگایا نہیں۔" شاہد نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔

"ڈاکٹر آیا تھا؟" ذکیہ نے رضیہ کی پیشانی پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں آیا تھا۔ اب بخار کم ہے۔ ایک آدھ ہفتے میں انشاءاللہ ٹھیک ہو جائے گی۔" شاہد نے تسلی دی۔

"لیکن شاید میں کافی عرصے تک چل پھر نہ سکوں۔ ڈاکٹر سے میں نے پوچھا تو انہوں نے گول سی بات کر دی۔ مجھے معلوم ہے امی۔ میرے پیر کی ہڈی ٹوٹ گئی ہے۔" رضیہ آہستہ سے بولی۔ اس پر شاہد نے مڑ کر کہا۔

"ہڈی وڈی نہیں ٹوٹی بیٹی۔ بس ذرا زیادہ چوٹ آ گئی ہے۔ کچھ دنوں میں ٹھیک ہو جاؤ گی۔ ہاں ذکیہ۔ تمہارے آنے سے پیشتر ہم اپنے نئے گھر کے بارے میں باتیں کر رہے تھے۔" شاہد نے فوراً موضوع بدلنے کی کوشش کی۔ اس کا فوراً خاطر خواہ اثر ہوا۔

"مجھے یہ پسند نہیں آیا امی۔ ویسے اچھا ہے لیکن نہ جانے کیوں مجھے کچھ عجیب سا لگا۔" رضیہ بولی۔ "میں اس میں تھوڑی سی تبدیلی چاہتا ہوں امی۔ میرا کمرہ بالکل ایسا ہی ہونا چاہیئے جیسا کہ یہاں ہے۔ یعنی کہ مکان کے دائیں حصے میں باغیچے کے ساتھ تاکہ میرے ہوائی جہاز کے کارخانے کے لئے گنجائش نکل سکے لیکن ابا راضی نہیں ہوتے۔ کہتے ہیں، یہ تبدیلی کی گئی تو گھر کا نقشہ یعنی اس کی صورت بگڑ جائے گی۔" حامد نے بھی فوراً شکایت کی۔

"اور میرا کمرہ دوسری منزل پر ہے امی۔ میں آئندہ کبھی دوسری منزل تک جا بھی سکوں گی؟" رضیہ بولی اور یکایک شاہد کا چہرہ اتر گیا۔ ذکیہ نے چونک کر شاہد کو دیکھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا جواب دے۔

"مجھے علی الصباح طلوع ہوتے ہوئے سورج کی روشنی بہت بھلی لگتی ہے۔ اسی لئے مجھے اپنے اس کمرے کی بڑی کھڑکی بے حد پسند ہے۔ میرے کمرے میں ایسی ہی کھڑکی ہوگی نا ابو؟" رضیہ نے شاہد سے پوچھا۔ اور شاہد نے سوچا۔ اتنی بہت سی تبدیلیاں ممکن بھی ہیں؟ نئے نقشے میں تو ان چیزوں کا خیال نہیں رکھا گیا تھا۔ اس نے بچوں کے اعتراضات سن کر غور سے نقشے کا ایک بار پھر جائزہ لیا تو اسے پہلی بار یوں محسوس ہوا جیسے واقعی اس میں بہت ساری خامیاں رہ گئی تھیں۔ اسے ہمیشہ سے ایک علیحدہ لائبریری کی آرزو تھی لیکن اخراجات کم کرنے کی خاطر اس نے عمداً اس نقشے میں ڈرائنگ روم اور لائبریری کے لئے ایک ہی بڑا سا کمرہ وقف کر رکھا تھا۔ اب بچوں کے اعتراضات سن کر نہ جانے کیوں صرف ایک لمحہ کے لئے اس کا جی چاہا

(باقی صفحہ ۴۰ پر)

پشتو رومان:

شہروز غزالہ (۳)

احمد فراز

نغمہ و رقص کے وسیلے سے
خود غرض داورس کے دامن میں
رہی دن رات دھن ہی برساتی
اور غزالہ نئی امیدوں پر
رقص کرتی رہی۔ تھرکتی رہی
گیت گاتی رہی، تڑپتی رہی

غزالہ

تجھ بن کالی رین
ستائے جی تڑپائے
تجھ بن کالی رین
تڑپ تڑپ کر گھڑیاں بیتیں پل پل برسے آگ
کوئی ہنسے اور کوئی روئے اپنے اپنے بھاگ
ہم کو نہ آئے چین
ستائے جی تڑپائے
تجھ بن کالی رین
جیون دُکھ کی قید میں بیتا اب سکھ کی کیا آس
جی کو جلائے چُپ تنہائی کوئی نہ آئے پاس
نیر بہائیں نین
ستائے جی تڑپائے
تجھ بن کالی رین
چاندوں اور اندھیارے برسیں ڈوبے تارے چاند
آشاؤں کا اک دیپک پڑنے لگا ہے ماند
گیت بھرے یہ نین

ستائے جی تڑپائے
تجھ بن کالی رین

ایک شب داورس نہ تھا گھر پر
اور غزالہ اُداس بیٹھی تھی
اپنے ماضی کے واقعات میں گم
گم جہانِ تصورات میں گم
کہ اچانک فضا میں لہرائی
ایک مانوس اجنبی آواز!

آواز:—

تیرے نگر میں آئیں مسافر
پگ پگ ٹھوکر کھائیں
گھور اندھیروں کی دنیا میں
تیرا کھوج نہ پائیں

جب غزالہ نے یہ سنی آواز
یوں اچانک تڑپ اُٹھی جیسے
خواب سے کوئی چونک اُٹھتا ہے
ہولے ہولے قدم اُٹھاتی ہوئی
آنے والی صدا کی سمت چلی
نیند میں جیسے کوئی چلتا ہے
جیسے بجھتا چراغ جلتا ہے

شمروز: آخر کار میرے دل کی فغاں
کھینچ ہی لائی تم کو جانِ جہاں!
کیا کہوں تیرے انتظار کے دن
کس قدر کرب ناک تھے لیکن
جی رہا ہوں کہ میری جان ہو تم
میری دنیا مرا جہان ہو تم

. . . .

مجھ سے مل کر اداس کیوں تم ہو؟
چپ ہو کیوں کس خیال میں گم ہو؟

غزالہ: کیا بتاؤں تمہیں مرے شمروز!
جی جلاتا ہے اک نہ اک غم روز
میں ترے پاس بھی ہوں دور بھی ہوں
خوش بھی ہوں، دردِ غم سے چور بھی ہوں
کتنی ویراں ہے رہگزارِ حیات!
چاندنی ہے کہ آگ کی برسات!

شمروز: جانے کیا غم ستا رہا ہے تمہیں
کونسا روگ کھا رہا ہے تمہیں
چند لمحوں کی یہ ملاقاتیں
یہ فضائیں یہ چاندنی راتیں
بیت جائیں تو پھر نہیں آتیں
کاش، تم دل کے بھید پا جائیں
زندگی دو دلوں کے میل کا نام
مسکراؤ کہ دور ہیں آلام

غزالہ: یہ لطافت، یہ چاند، یہ تارے
بس فریبِ نگاہ ہیں سارے
گلستانوں میں، مرغزاروں میں
کوہساروں میں، آبشاروں میں
مخملت کانٹوں میں، نرم پھولوں میں
تند موجوں، شگفتہ پھولوں میں
رقصِ شعلہ میں، رنگِ شبنم میں
مختصر یہ کہ سارے عالم میں

دل کی کیفیتوں کے آئینے
رکھ دیئے ہیں نظر فریبی نے
دل ہو گر خوش تو ظلمتیں بھی چراغ
دل حزیں ہو تو ماہتاب بھی داغ
جتنی رنج و خوشی کی باتیں ہیں
مختلف دل کی واردات ہیں

شمروز: ایسے عالم میں شکوہ کی کیا امید
خیر تم بے سبب ہو نا امید
گردشیں جب چلن بدلتی ہیں
گل شدہ مشعلیں بھی جلتی ہیں

. . . .

ہاں غزالہ وہ داورس کی سناؤ
کیا ہوئی اس سے کوئی بات بتاؤ

غزالہ: وہ مری ہر خوشی پہ غالب ہے
مجھ سے وہ سیم و زر کا طالب ہے
مجھ سے وہ عہد کر چکا ہے سجن!
اتنا میں دے چکی ہوں اس کو وچن
کہ مری ذات کی بدولت اگر
جمع کر لے وہ اتنا سیم اور زر
جس سے وہ زندگی سنوار سکے
رات دن چین سے گزار سکے
تو وہ مجھ کو کبھی نہ روکے گا
میں جدھر جاؤں وہ نہ ٹوکے گا
شرط مشکل ہے گو رہائی کی
پھر بھی تو آس ہے رہائی کی

شمروز: گر تمہیں اس کے قول پہ ہے یقیں
فکر کرنے کی پھر تو بات نہیں
داورس گر وچن پہ قائم ہے
اپنے عہدِ کہن پہ قائم ہے
تو یہ تو سیم و زر کی تھیلی ہے
جو اسے عمر بھر کو کافی ہے

غزالہ: نہیں شمروز یہ نہیں ممکن
تم مری زندگی سہی لیکن
یہ گراں بار میں اٹھاؤں گی
خود ہی اپنا وچن نبھاؤں گی
میرا دُکھ اپنے سر نہ لے کوئی
کیوں مری آگ میں جلے کوئی
کچھ دلوں کے ستم ہیں، یہ بھی سہی
جس طرح اور غم ہیں، یہ بھی سہی

شمروز: کیا مجھے غیر تم سمجھتی ہو؟
کس لئے مفت میں اُلجھتی ہو؟
اب یہ ضد چھوڑ دو مری مانو
دوستوں دشمنوں کو پہچانو
جاؤ اس دھن کو کام میں لاؤ
وقت کی پیشکش نہ ٹھکراؤ
یہ تمہارے لئے ہی لایا تھا
آج میں عہد کرکے آیا تھا
کہ میں اس داورس لٹیرے کو
رام دھن سے کروں گا پہلے تو
اور یوں بھی اگر نہ وہ مانا
پھر اسے یا مجھے ہے مر جانا

غزالہ: نہیں ایسا نہ تم کہو شمروز!
تم سلامت سدا رہو شمروز!
گر یہی فیصلہ تمہارا ہے
تو مجھے موت بھی گوارا ہے!
اچھا چلتی ہوں، تم یہیں ٹھہرو
(گھوڑے کی ٹاپ سنائی دیتی ہے
داورس غزالہ کو پکارتے ہوئے
قریب آجاتا ہے)
داورس آرہا ہے، چھُپ جاؤ!

. . . .

داورس: ہوں! تو یہ آدھی آدھی راتوں کو
فاحشہ! کس بجن سے ملتی ہو؟
بدچلن! دھوکہ باز! مکارہ!
تجھے اپنا وچن بھی یاد نہ تھا

غزالہ: داورس تم ذرا مری بھی سنو
کیا تم اپنے وچن پہ قائم ہو؟

داورس: ہوں، مگر تم سی بدزبان رنڈیں
جس کو اپنی قسم کا پاس نہیں
میں وفا کس لئے شعار کروں
سچ! میں تجھ پہ اعتبار کروں؟

غزالہ: تم کو ناحق ہوا ہے مجھ پہ شبہ
اب بھی ہے عہد استوار مرا
یہ لو تھیلی، مری ضمانت ہے
مرے عہدِ کہن کی قیمت ہے
اور اب تم بھی اپنا قول نبھاؤ
حسبِ وعدہ مجھے نہ اور ستاؤ

داورس: اتنی دولت! کہاں سے لائی ہو
سچ کہو کس کے ہاں سے لائی ہو؟

غزالہ: اس سے کیا تم کو چاہیے جو کچھ ہو
تم کو دھن سے غرض تھی وہ یہ لو

داورس: ہوں! یہ زیور، یہ سیم و زر، یہ گہر
ٹھیک ہے یہ مری طلب تھی مگر
زندگی اس کے ماسوا بھی ہے
خواہشِ حسنِ دلربا بھی ہے
خواہشِ زر تو اک بہانہ تھا
مطلب اپنا تمہیں بتانا تھا

غزالہ: او کمینے! ذلیل! وعدہ شکن!
اس قدر بھی نمک حرام نہ بن
تیرا باطن نہ چھپ سکا آخر
مرد اگر ہے تو بات سے مت پھر

داورس: یہ ادائیں بھرے شباب کے ساتھ
پیاری لگتی ہو کچھ عتاب کے ساتھ

یہ جوان جسم، یہ شباب حسیں
میری دولت ہے میری ماہ جبیں!
تم کہیں اور جا نہیں سکتیں
مجھ سے دامن چھڑا نہیں سکتیں

شمروز: (سامنے آتا ہے)
چپ رہو! بد زبان ضمیر فروش!!
ایک عورت کے سامنے یہ خروش!
مرد اگر ہو تو سامنے آؤ
دست و بازو کا زور دکھلاؤ

داورس: اچھا! یہ وہ رئیس زادے ہیں
کہو اے دوست! کیا ارادے ہیں؟

شمروز: فیصلہ تم سے بد شعاروں کا
جن سے اجڑا ہے گھر ہزاروں کا
لو یہ خنجر ہے، سامنے آؤ
تم غزالہ! پرے چلی جاؤ

داورس: نوجواں! یہ جنوں نہیں اچھا
بے سبب قتل و خوں نہیں اچھا
کیوں دلوں میں کدورتیں بھر لیں
آؤ ہم تم مفاہمت کر لیں

شمروز: کس سے؟ تم سے مفاہمت؟ کیا خوب
کبھی یکجا ہوئے شمال و جنوب؟

داورس: ہے عبث زعم زندگانی پر
تم تو مغرور ہو جوانی پر
پھینکو خنجر، نہ اتنا زعم کرو
کچھ جوانی پہ اپنی رحم کرو
باہر آؤ نہ اپنے آپے سے
خوف کھاؤ مرے بڑھاپے سے

شمروز: خیر باتوں سے اب نہ دھمکاؤ
جو بھی ہوتا ہے، ہونے دو، آؤ

داورس: ٹھہرو! یہ فیصلہ غزالہ کرے
چاہے کوئی جئے کہ کوئی مرے
وہ جسے چاہے اس کی ہو جائے
دکھ نہ ہو گا جسے بھی ٹھکرائے

شمروز: جو کہے گی وہ ماننا ہے ضرور

داورس: مجھ کو منظور ہے.... تمہیں؟

شمروز: منظور

غزالہ: مجھے شمروز سے محبت ہے

داورس: ٹھیک ہے اپنی اپنی قسمت ہے

شمروز: تم سمجھتے اگر تو پھر کیا تھا

داورس: میں غزالہ کو آزماتا تھا
گو اسے مجھ سے رابطہ کم ہے
مجھ کو اس کی خوشی مقدم ہے
جاؤ اب تم خوشی سے بیاہ کرو
تا قیامت جیو، نباہ کرو

غزالہ: سچ! مرے اچھے داورس، بابا!

داورس: اب بھی تم کو یقیں نہیں آتا
آؤ شمروز میرے پاس آؤ
آخری بار اب گلے لگ جاؤ

شمروز: (گلے ملتے ہوئے) تم بھی مجھ کو معاف کر دینا

(داورس خنجر بھونک دیتا ہے)

داورس: اپنے کرتوت کا صلہ لینا

شمروز: (کراہتے ہوئے) آہ!

غزالہ: شمروز....

داورس قہقہے لگاتا ہے

شمروز: آہ! دھوکہ..... آہ!

غزالہ: بزدل انساں نے اوچھا وار کیا

شمروز: دھند سی جم رہی ہے آنکھوں میں
روشنی کم رہی ہے آنکھوں میں
تم غزالہ کہاں ہو؟ پاس آؤ
آخری بار منہ تو دکھلاؤ

غزالہ: میں تمہارے قریب ہوں جانم!

شمروز: کتنا پیارا ہے موت کا ... عالم!
مرتے دم تم بھی ہو قریب مرے

غزالہ: داغِ فرقت نہ دو حبیب مرے

شمروز: پھیلتا جا رہا ہے سایہ سا
اب تو کچھ بھی نظر نہیں آتا
الوداع ... الوداع ... جانِ مری!

دارین: تم ہو میری متاعِ جانِ مری!
زخم رونے سے بھر نہیں جاتے
جانے والے کبھی نہیں آتے
سرد لاشوں سے کچھ نہیں ملتا
پھول مرجھا کے پھر نہیں کھلتا
آؤ زندہ دلوں کو پیار کرو
جینا سیکھو، خوشی شعار کرو

غزالہ: میں غمِ مرگ سے نہیں ڈرتی
اس لئے دل برا نہیں کرتی
جو غرض آشنا نہیں ہوتے
مرکے بھی وہ جدا نہیں ہوتے
پھول مٹ جائیں بو نہیں مٹتی
موت سے آرزو نہیں مٹتی
وہی خنجر ہو پیا جس نے
قتل شمروز کو کیا جس نے
اب مرا درد بھی مٹائے گا
مجھ کو شمروز سے ملائے گا!

(غزالہ خنجر فضا میں لہراتی ہے)

دارین: (خوفزدہ ہوکر) ٹھہرو! کیا کر رہی ہو، سوچو تو
کس لئے مر رہی ہو، سوچو تو

غزالہ: زندگی بے حبیب تنگِ طلب
مرگ با دوستاں ہے جشنِ طرب

دارین: خودکشی تم نہ کر سکو گی کبھی
میرے ہوتے نہ مر سکو گی کبھی
مجھے تم سے تو کوئی بیر نہیں

(خنجر کی طرف ہاتھ بڑھاتا ہے)

غزالہ: چھوڑو خنجر، وگرنہ خیر نہیں
اپنے ہاتھوں کو دور ہی رکھو

دارین: یہ نہ ہوگا ....

غزالہ: تو پھر مزہ چکھو

دارین: (کراہتے ہوئے) آہ! تو مارِ آستیں نکلی

غزالہ: آج حسرت مری کہیں نکلی
اب مروں گی کہیں سکون کے ساتھ
شکر ملا دارین کے خون کے ساتھ
اب بھٹکتی نہیں نگاہ مری
میرے شمروز! دیکھ راہ مری

(خنجر سینے میں پیوست کر لیتی ہے)

(دم توڑتے ہوئے)

زندگی بے حبیب تنگِ طلب
مرگ با دوستاں ہے جشنِ طرب

دور ان سرمئی پہاڑوں سے
ریگزاروں کی سرحدوں سے پرے
ایک سنسان سا خرابہ ہے
جس کی پھیلی ہوئی خموشی میں
جب کبھی چاندنی نکھرتی ہے
گھنگھروؤں کی دبی دبی آواز
ایک نغمے کے روپ میں ڈھل کر
دفعتاً جیسے ... چیخ اٹھتی ہے!

(گھنگروؤں کی چھنک کے ساتھ
پس منظر سے آواز ابھرتی ہے)

پریت کے دکھ اپنا کر
ہم نے
کیا کھویا کیا پایا!

○

مرگِ شب

عبدالرؤف عروج

ہجومِ راہرواں — محوِ انتظارِ جرس
حدیثِ خوش نظراں — جلوہ ہائے چند نفس
سکوتِ شامِ غریباں، چمن سے تا بہ قفس
مگر جبینِ تمدن پہ روشنی کی لکیر
اسی طرح سے ابھرتی ہے جگمگاتی ہے

بھٹکتی جاگتی راہوں کی صندلیں باہیں
ہجومِ راہرواں کے لئے کٹ دہ رہیں
لہو کی، گرد کی، طوفاں کی رداؤں میں
چراغ دیدہ و دل کی لویں بھی ڈوب گئیں

متاعِ ہوش لٹائیں بھی ہم تو کیا کہ ہمیں
بصد خرابیٔ جاں دلبروں کی راہ ملی
ملولِ شہر نگاراں، شکستہ خیمۂ گل
بہ اہتمامِ خلش، فرصتِ نگاہ ملی
ہر آفتاب کو ہم نے گلے لگایا تھا
ہر آفتاب سے ہم کو شبِ سیاہ ملی

جھپک رہی ہیں ستاروں کی نقرئی پلکیں
فضا میں گونج رہا ہے حسین سناٹا
اس آس پر کہ ہے نزدیک ہی دیارِ غزل
غمِ حیات نے اپنا کڑا سفر کاٹا

شہیدِ عشوۂ گلچیں، قتیلِ تیغِ نجات
ہر آرزو کی جوانی، ہر آرزو کی برات

جہانِ لالہ و انجم سے اٹھ رہا ہے دھواں
شمیمِ کوچۂ دلدار میں مہک بھی نہیں
یہ کون ساعتِ مایوس ہے کہ ہمسفرو
ہم اہلِ دل کو گمانِ بہار تک بھی نہیں
ہوائے سردِ جہنم کی آنچ آتی ہے
گلاب پیکر و شبنم سرشت نرم بدن
فروغِ شعلۂ سوزاں سے تلملاتے ہیں
ستیزہ کار اندھیروں میں ڈوب جاتے ہیں

ہمیں ہیں جلوہ فزائے حریمِ فکر و نظر
ہمیں ہیں نقش گرِ کائناتِ شام و سحر
ہمیں ہیں باعثِ شادابیٔ عروسِ بہار
ہمیں نے اپنے لہو سے چمن نکھارے ہیں
زبانِ راز میں کہیے جسے فرازِ رسن
ہمیں تو اس افقِ ناز کے ستارے ہیں
ہمیں ہیں لحنِ طرب زا ہمیں ہیں شورِ فغاں
ہمارے ساز پہ تہذیب مسکراتی ہے

کسی سے بجھ نہ سکیں گے شگفتگی کے دیے
زمانہ بادِ صبا کو ہلاک کر نہ سکا
خزاں کے جور سے صبحِ بہار مر نہ سکی
ستم کا قافلۂ تیرگی ٹھہر نہ سکا
ہمیں یہ راتِ گراں رات کیوں ڈراتی ہے
کہ پھر جبینِ تمدن پہ روشنی کی لکیر
اسی طرح سے ابھرتی ہے جگمگاتی ہے

ثقافت:

اُچ

ایس فیروز

پنجاب کے پانچ دریاؤں کے سنگم پر ایک چھوٹا سا قصبہ ہے، کھجوروں کے جھنڈوں اور سبز لہلہاتے کھیتوں کے درمیان۔ یہ اُچ کا قدیم شہر ہے۔ اس خراب آباد کی یادیں ہمارے دلوں کو عزیز ہیں، کیونکہ ہمارے کتنے ہی صاحب دل صوفیا و درویش اس خاک پاک میں آرامیدہ ہیں اور اس کا ہزار ہا سالہ ماضی تاریخ کا ایک روشن باب ہے۔ اب تو یہ محض ایک چھوٹا سا قصبہ ہے جس میں زیادہ سے زیادہ دس ہزار گھر ہوں گے، وہ بھی خستہ و خراب۔ ٹیڑھی میڑھی، تنگ و تاریک گلیاں، جابجا کوڑے کے ڈھیر، اونچی نیچی سڑکیں جن پر دھول اُڑتی رہتی ہے اور فضا وہی جو عام دیہات کی ہوتی ہے۔ لیکن ایک زمانہ تھا کہ یہ شہر سلطنت سندھ کا ایک عظیم و جلیل شہر اور پایہ تخت تھا اور اس کی آبادی ۳۶ میل لمبے اور ۲۰ میل چوڑے علاقے میں پھیلی ہوئی تھی۔ یہ شہر سیاسی اور ثقافتی سرگرمیوں کا مرکز اور تجارت کا گڑھ تھا اور دریائی حمل و نقل کا ایک اہم جنکشن۔ اس کے علمی مراکز اور درس گاہوں کی ایک دنیا میں دھوم تھی، اسے چھاؤنی کی حیثیت بھی حاصل تھی اور یہاں ہمیشہ بڑی تعداد میں فوج کا پڑاؤ رہتا تھا۔ سر چارلس میسن، جو ۱۸۲۶ء میں اُچ آیا تھا، اپنے سفرنامے میں لکھتا ہے:

"یہاں سے غلے کی بھری ہوئی کشتیاں سندھ روانہ ہوتی ہیں۔ یہاں تاریخی یادگاروں اور قدیم آثار کے لئے یہ شہر مشہور ہے۔"

اس برعظیم میں چند ہی شہر ایسے ہوں گے جو انہیں قدامت یا تاریخی، ثقافتی اور مذہبی اہمیت میں اس کے حریف قرار دئے جا سکیں۔

اُچ ریاست بہاولپور کے مشرقی حصے میں احمد پور تحصیل میں واقع ہے۔ آپ کو نارتھ ویسٹرن ریلوے کی بڑی لائن کے اسٹیشن ڈیرہ نواب صاحب پر اترنا پڑے گا۔ وہاں سے ۱۶ میل، بھٹے کی اینٹوں کی پختہ سڑک طے کر کے آپ اُچ پہنچ جائیں گے۔

اُچ کے باشندے زیادہ تر کاشتکار ہیں اور وہی تو سادہ وضع کی زندگی بسر کر رہے ہیں جو انہیں اپنے اجداد سے وراثت میں ملی۔ کسانوں کے جھونپڑوں میں وہی مٹی کے تیل کی لالٹینوں یا کڑوے تیل کے چراغوں کی مدھم روشنی نظر آتی ہے۔ البتہ درگاہوں کے سجادہ نشینوں کے بنگلے بجلی کے قمقموں سے جگمگاتے ہیں۔ بجلی پیدا کرنے کے لئے مشینیں بھی انہوں نے خرید لی ہیں۔

قدیم تاریخ:۔ اُچ نام کی توجیہیں تو آپ کو بہت ملیں گی، غالباً سب سے زیادہ قابل قبول وہ ہے جو صاحب "تحفۃ الکرام" نے لکھی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ مقامی بولی میں اُچ اونچی جگہ کو کہتے ہیں۔ سہسی نام کے ایک راجہ نے اُچ کے باشندوں سے لگان کے بدلے یہ خدمت لی کہ وہ ان نو، حات کو مٹی تو پ کر اونچا کر دیں۔ حکم حاکم، اس سے ایک اونچے گھاٹ کی سی صورت پیدا ہو گئی۔

اُچ کا ذکر بھی پہلے پہل ہندوؤں کی داستانوں میں ملتا ہے اور وہ اس عنوان سے کہ دریائے سندھ کے کنارے بسنے والے دو قبیلوں — جاٹوں اور میروں میں لڑائی ٹھن گئی۔ انہوں نے راجہ دریودھن سے درخواست کی کہ آپ اپنی طرف سے کسی کو حاکم بنا کر بھیج دیجئے جو امن قائم کرے۔ راجہ دریودھن نے اپنی

رانی دھسلا کو اس مقام کا حاکم مقرر کر دیا اور اس کی وجہ سے آچ میں امن و خوشحالی کا دور دورہ ہو گیا۔

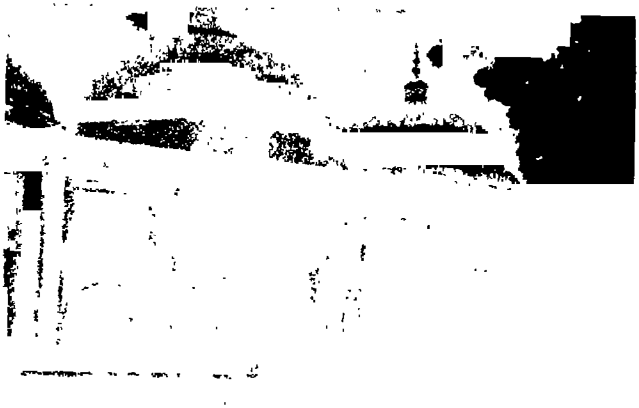
اس کے بعد ہم کافند نامی بادشاہ کا ذکر سنتے ہیں جس کی قلمرو سارے سندھ اور بلوچستان پر محیط تھی۔ اسی بادشاہ کے دور میں ایران کے ساسانی شہنشاہ بہمن نے، جس کا ذکر فردوسی کے ہاں آتا ہے سندھ پر یلغار کی۔ اس نے اس قلمرو کا ایک حصہ فتح کر کے وہاں اپنا نائب مقرر کر دیا، لیکن راجہ کافند نے تھوڑے ہی عرصے بعد اسے زیر کر لیا۔ کافند کے بعد اس کا بیٹا آنند سلطنت کا وارث ہوا۔ اس نے سلطنت کو چار صوبوں میں تقسیم کر دیا۔ جن میں سے ایک صوبہ آچ کا تھا۔ آچ پر بعد میں بھی، کئی پارس اور تاتاریوں کی اکثر یورشیں رہیں، اور اس زمانے کے کچھ طلائی اور نقرئی سکے حال ہی میں نہر بہاولپور کے نواحات میں دستیاب ہوئے ہیں۔ اسکندر نے پنجاب سے جنوب کا رخ کیا اور ملتان کو فتح کیا تو آچ کے راجہ نے فوراً اس کی، طاعت قبول کر لی۔ لیکن جب اسکندر کے لشکر نے آچ کی طرف پیشقدمی کی تو راجہ نے مقابلہ کرنے کی ٹھانی۔ اور اسکندر کے ہاتھوں شکست کھا کر ہار گیا۔ اس کے بعد اسکندر نے دریائے راوی اور چناب کے سنگم پر ایک نیا شہر تعمیر کیا اور اس کا نام اسکندریہ رکھا۔ کننگھم اور بعض دیگر ماہرین جغرافیہ کا خیال ہے کہ اسکندریہ وہیں واقع تھا جہاں آج کا آچ آباد ہے۔ جب اسکندر اپنے ملک واپس چلا گیا تو مقامی راجوں اور سرداروں نے بغاوت کر دی اور مقدونی گورنر کو تیغ کے گھاٹ اتار کر اپنا تسلط جما لیا۔ عربوں کے حملے سے پہلے کے دور میں سب سے اہم حکمران جس کا نام ہم سنتے ہیں، راجہ دیو راج تھا جس کا پایہ تخت موجودہ روہڑی کے قریب الور میں تھا۔ صاحب تحفۃ الکرام لکھتے ہیں کہ اس راجہ کے چار جانشینوں نے تقریباً ۱۳۷ سال تک سندھ کو زیر نگیں رکھا ان کے نام یہ ہیں: راجہ سہارس، راجہ سہسی، سہارس دوم اور سہسی دوم۔ معلوم ہوتا ہے کہ سہارس دوم لوگوں میں بہت مقبول تھا کیونکہ لوک گیتوں اور عوامی کہانیوں میں اس کا نمایاں ذکر ملتا ہے اور اس کے انصاف اور فیاضی کے قصے مشہور ہیں۔ چچ نامہ ہی کو لیجیے جو تاریخ و روایات کی قدیم سندھی کتابوں میں سے ہے۔ اس میں بھی اس دور کا بہت کچھ حال لکھا ہے۔ ایرانی شہنشاہ شاہ نیمروز نے اسے شکست دے کر قتل کر دیا تو سہسی دوم اس کا جانشین ہوا۔ راجہ سہسی دوم نے آچ کے قلعے کو نئے سرے سے تعمیر کیا۔ اس کے عہد کی ایک دلچسپ خصوصیت چچ سلائج نامی ایک قسمت آزما کے ڈرامائی عروج کی داستان ہے۔ کہتے ہیں کہ راجہ سہسی دوم کا ایک وزیر تھا، بدھیمان نامی جو حکومت کا سارا کاروبار چلاتا تھا۔ ایک دن جب کہ وہ کسی کے بادشاہ کے ہاں سے آئی ہوئی ایک اہم چٹھی کا مطالعہ کر رہا تھا۔ چچ سلائج نامی ایک برہمن اس کے پاس آیا اور اپنی خدمات کو پیش کیا۔ وزیر نے از راہ امتحان شاہ دیبل کی وہ اہم چٹھی اسے دے دی اور کہا اس کا جواب لکھو۔ چچ نے اس جواب میں غیر معمولی قابلیت کا مظاہرہ کیا۔ اس کی وجہ سے بدھیمان نے اسے نوکر رکھ لیا۔ ایک موقع پر جب کہ وزیر پایۂ تخت کے باہر تھا، چچ ایک اہم خدمت سرانجام دے کر راجہ سہسی کا مقرب بن گیا۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ رانی اس سے محبت کرنے لگی اور راجہ کے مرنے پر چچ ہی تخت کا مالک بن بیٹھا۔ اس نے رانی سے شادی کر لی اور تخت کے دوسرے دعویداروں کو بے رحمی سے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اسی سلسلے کا ایک مشہور قصہ وہ ہے جس میں چچ، راجہ دھارت کو دھوکے سے قتل کرتا ہے۔ دھارت نے سابق راجہ کا انتقام لینے کے لئے جو اس کا رشتہ دار تھا، آچ پر حملہ کیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس عیار و طرار برہمن نے پورے چالیس برس راج کیا اور طبعی موت مرا۔ اس کے بعد اس کا بھائی چندر سلائج سات برس تک برسر حکومت رہا۔ سندھ کا مشہور بادشاہ داہر، جسے اس ملک کے اولین مسلم فاتح محمد بن قاسم نے شکست دی تھی، اسی چچ کا بیٹا تھا۔

عہد اسلامی

محمد بن قاسم کی فتح سندھ (۷۱۲ عیسوی) ایک عظیم الشان کارنامہ تھی لیکن اسے ثبات نصیب نہ ہوا، کیونکہ محمد بن قاسم اس ملک میں ایک ہی سال رہ پایا تھا کہ واپس بلا لیا گیا۔ اس کے بعد یزید سکسکی گورنر مقرر ہوا۔ تقرر کے تھوڑے ہی دن بعد اس کا بھی انتقال ہو گیا اور سندھ کے مقامی سردار پھر اپنے علاقوں پر قابض ہو بیٹھے۔ ۱۰۰۰ء کے قریب جب سلطان محمود غزنوی نے ہندوستان پر حملوں کا سلسلہ شروع کیا تو جے پال پر فتح پانے کے بعد وہ اُچ پر بھی یلغار کر کے آیا۔ آچ پر ان دنوں ابوالفتح نامی ایک قرامطی حکمران تھا۔ سلطان محمود نے

اُچ

ن کا ایک قدیم علمی و ثقافتی مرکز)



جامع مسجد



روضہ حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت رح

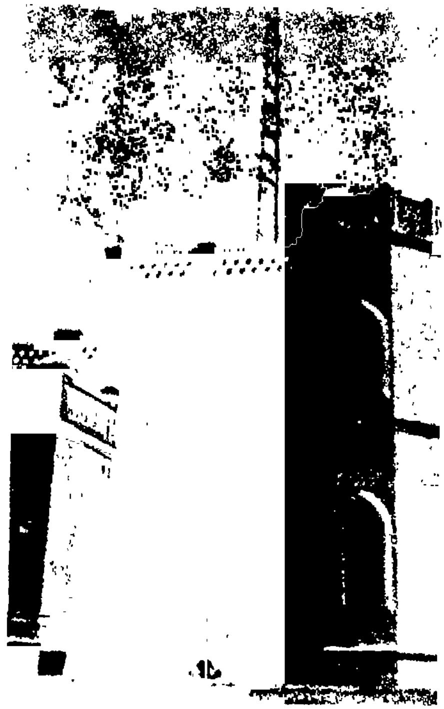


رت سید جلال بخاری رح



مقبرہ مائی جاوندی

پاکستان میں



ریڈیو پاکستان حیدرآباد (سندھ)



کراچی میں بین الاقوامی دنگل
فضیلت مآب میجر جنرل اسکندر مرزا انعامات تقسیم فرما رہے ہیں



ریڈیو پاکستان حیدرآباد (سندھ) میں نشریات کا آغاز





فضیلت مآب میجر جنرل اسکندر مرزا اور عزت مآب چودھری محمد
مشرقی پاکستان کے سیلاب زدہ علاقوں کا معائنہ فرما رہے ہیں

اسے شکست دی، لیکن بعد ازاں اس کو پنجاب کا حاکم بنا دیا جس میں اُچ بھی شامل تھا۔ سلطان محمود غزنوی کے بیٹے مسعود کے عہد حکومت میں اُچ غزنویوں کا مطیع فرمان رہا، لیکن جب مسعود کا بیٹا ابوالحسن تخت پر بیٹھا تو علی بن امیر نامی ایک موقع شناس شخص نے پشاور سے اُچ تک کے علاقے پر قبضہ کر لیا۔ سنہ ۱۱۷۵ء میں سلطان محمد غوری نے صحیح معنوں میں اس ملک کو فتح کرنا شروع کیا۔ اس نے ملتان اور اُچ پر بھی قبضہ کیا اور علی کرماخ کو وہاں اپنا نائب مقرر کر دیا۔ محمد غوری کے عہد حکومت میں اُچ کے مشہور دارالعلوم کی بنیاد رکھی گئی جس کے صدر معلم مشہور عالم اور درویش حضرت صفی الدین گزرانی تھے۔ اس دارالعلوم میں کوئی پچیس سو طالب علم رہتے اور تعلیم حاصل کرتے تھے۔ یہ بزرگ سنہ ۱۲۳۰ء میں بغداد سے وارد ہندوستان ہوئے تھے اور اس ملک میں اسلام کے پہلے جلیل القدر مبلغ تھے۔ ان کا مقبرہ آج بھی موجود ہے اور سارے برعظیم میں شاید ہی کوئی اور مقبرہ اس قدر قدیم اور اہم ہو۔

سلطان محمد غوری کی وفات کے بعد اس کے نائب قباچہ نے سرہند سے ٹھٹھہ تک سارے علاقے کی حکومت سنبھال لی اور اُچ کو پایۂ تخت قرار دیا۔ "طبقاتِ ناصری" کے مصنف مولانا منہاج السراج لکھتے ہیں:

> سنہ ۱۲۲۷ء میں جب میں اُچ پہنچا تو وہاں سلطان ناصر الدین قباچہ سریر آرائے سلطنت تھے۔ عوام میں تعلیم عام تھی۔ شاہی دارالعلوم کے علاوہ اُچ میں اور بھی پائے کی درسگاہیں تھیں۔

مولوی منہاج السراج خود اس دارالعلوم کے کچھ دنوں تک منتظم رہے اور چند سال قاضی کے عہدے پر بھی کام کیا۔

کھوکھر قبیلے سے جنگ و جدال کا معرکہ پیش آیا تو قباچہ اس کا مقابلہ نہ کر سکا۔ کھوکھروں کے سردار جلال الدین نے اسے نکال کر اُچ کو تاخت و تاراج کیا۔ جب چنگیز خاں کے جرنیل چغتائی خاں نے جلال الدین کو وہاں سے نکالا تو قباچہ پھر پناہ لینے کے لئے اُچ پہنچ گیا، لیکن اُچ کے باشندے اس کے مظالم سے خائف تھے۔ انہوں نے شہر کے دروازے بند کر دیئے اور اسے اندر نہ آنے دیا۔ ادھر جلال الدین اپنی ہزیمت پر برافروختہ تھا، اس لئے سارے شہر کو آگ لگا دی اور خود مکران کی طرف بھاگ گیا۔

سلطان ناصر الدین قباچہ پھر اُچ واپس آیا اور شہر کو نئے سرے سے آباد کیا، لیکن اس نوآبادکاری کو بمشکل دو سال گزرے تھے کہ سلطان شمس الدین التمش نے چڑھائی کر دی اور قباچہ کو جان کی سلامتی کے لئے راہ فرار اختیار کرنی پڑی۔

"تاریخ فرشتہ" میں اس حملے کی تقریب یہ بیان کی گئی ہے کہ قباچہ کے افسروں اور اہلکاروں نے بدکرداری اور بداخلاقی کو شعار بنا لیا تھا۔ حاکم ملتان، قاضی شرف الدین اور ایک مقامی بزرگ، حضرت شیخ بہاء الدین کو اس کا بہت رنج ہوا۔ انہوں نے سلطان التمش کو درخواست بھیجی کہ آ کر قباچہ کے دست تعدی سے لوگوں کو نجات دلائیے۔ سوء اتفاق سے ان کے خطوط قباچہ کے ہاتھ لگ گئے۔ اس نے فوراً ملتان پر چڑھائی کر دی اور وہاں کے گورنر قاضی شرف الدین کو شکست دے کر اس کا سر قلم کر دیا۔ کہا جاتا ہے کہ قباچہ نے حضرت شیخ بہاء الدین سے ان خطوط کے متعلق دریافت کیا تو انہوں نے نہ صرف یہ تسلیم کیا کہ انہوں نے یہ خط لکھے تھے بلکہ اسے سخت فہمائش بھی کی کہ خلق خدا پر ظلم و ستم سے باز رہے اور اپنے اعمال کی اصلاح کرے۔

منگولوں نے اُچ پر متعدد بار حملے کئے۔ سب سے پہلا حملہ انہوں نے سنہ ۱۲۴۵ء میں کیا جب کہ ان کا لشکر قندھار جا رہا تھا۔ انہوں نے اُچ کا محاصرہ کیا لیکن بعد میں یہ سوچ کر اٹھا لیا کہ اس میں خواہ مخواہ وقت ضائع ہوگا، ہمارا اصل مقصد تو فارس پر حملہ ہے۔ سلطان رکن الدین کی حکومت کا زمانہ اسی کے لگ بھگ پڑتا ہے، جب مشہور صوفی اور عالم سید جلال بخاری کی اُچ میں تشریف آوری ہوئی۔ ان کا مقبرہ شہر کے مغربی گوشے میں ایک ٹیکری پر کھنڈرات کے درمیان واقع ہے۔ یہ حصہ شہر انہی کے نام پر اُچ بخاری کہلاتا ہے۔ سید جلال بخاری سنہ ۱۱۹۵ء میں پیدا ہوئے اور سنہ ۱۲۹۱ء میں ۹۶ برس کی عمر میں فوت ہوئے۔ ان کی زندگی فقر اور نفس کشی کی ایک زندہ مثال تھی۔ وہ پندرہ بیس برس کے ہوئے تھے کہ ان سے روحانی کمالات کا ظہور ہونے لگا۔ کہتے ہیں کہ انہوں نے چنگیز خاں کو اسلام قبول کرنے کی دعوت دی تھی۔ اس پر اس وحشی اور تندخو خان نے انہیں آگ میں ڈال دینے کا حکم دیا۔ قدرت حق سے ان کا بال بھی بیکا نہ ہوا اور وہ آگ سے زندہ سلامت برآمد ہوئے۔ چنگیز خاں پر اس کا ایسا اثر

ہوا کہ اس نے اسلام قبول کر لیا اور جہانگیر خان کا نام اختیار کیا۔ یہی نہیں بلکہ اپنی بیٹی زینب بھی سید صاحب کے حبالۂ نکاح میں دے دی۔ سید جلال بخاری کے مریدوں اور حلقہ بگوشوں کی تعداد لاکھوں تک پہنچتی ہے اور وہ آج تک نہیں سارے برعظیم میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ان کے غیر معمولی کشف و کرامات کی بہت سی داستانیں لوگوں میں مشہور ہیں۔ ان کا وصال اُچ کے قریب ہی چناب رسول نامی ایک گاؤں میں ہوا اور وہ وہیں مدفون ہوئے۔ ایک بار سیلاب سے ان کے مزار کو شدید نقصان پہنچا، لہٰذا ان کا جسد مبارک "سید نک بیلا" میں منتقل کر دیا گیا لیکن وہاں بھی سیلاب سے اسے گزند پہنچنے لگا۔ آخر جسدِ مبارک کو وہاں سے نکال کر راجن قتال کے مقبرے کے قریب دفن کیا گیا۔ ۱۶۲۵ء میں اسے وہاں سے بھی نکال لیا گیا اور موجودہ جگہ پر ان کا مزار بنا۔ ان کے مزار پر جو مقبرہ اس وقت نظر آتا ہے وہ نواب بہاول خاں کے حکم سے ۱۳۵۰ء میں تعمیر کیا گیا تھا۔

مغلوں کے حملے

اس برعظیم میں مسند آرائے سلطنت ہونے سے قبل مغلوں نے دو بار اُچ اور ملتان پر حملے کئے۔ پہلی بار تو وہ غیاث الدین بلبن کے زمانے میں ۱۲۸۵ء میں چڑھائی کر کے آئے اور دوسری بار ۱۲۹۱ء میں جبکہ دہلی میں سلطان جلال الدین خلجی بادشاہ تھا۔ دونوں بار انہیں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ اُچ اور ملتان دونوں دہلی کی متابعت سے آزاد اور خود مختار ہو گئے تھے۔ علاء الدین تخت پر بیٹھا تو اس نے دوبارہ ان کو فتح کیا۔ مغلوں نے ۱۳۰۴ء اور ۱۳۰۵ء میں پھر دو بڑے حملے کئے۔ ان پر آشوب دنوں میں اس جگہ کئی حاکم آئے اور کئی گئے۔ آخر غازی بیگ گورنر ہوئے جو آگے چل کر غیاث الدین تغلق کے نام سے بادشاہ بنے۔

اُچ کا دارالعلوم غازی بیگ کی گورنری کے عہد میں قائم ہوا اور جب وہ دہلی کے تخت پر بیٹھا تو اس نے اُچ کی حکومت کی باگ ڈور اپنے بھائی بہرام کے سپرد کر دی۔ اس کے بعد سلطان محمد تغلق کے زمانے میں ۱۳۲۶ء میں مغل سردار "ترماشرین" نے اُچ اور ملتان پر زوروں کا حملہ کیا۔ مشہور سیاح ابن بطوطہ اس حملے کے چند سال بعد ۱۳۳۲ء میں اُچ میں وارد ہوا تھا۔

اس موقع پر ہم اس بزرگ روشن ضمیر کا بھی تذکرہ کریں گے جو مخدوم جہانیاں جہاں گشت "کے نام سے مشہور ہیں۔ آپ کا زمانہ بھی قریب قریب یہی تھا۔ ان کی ولادت ۱۳۰۸ء میں ہوئی اور وہ سید جلال بخاری کے پوتے تھے۔ انہوں نے علوم دینی دستری کی تحصیل قاضی بہاء الدین اور شاہ رخ عالم ملتانی سے کی اور روحانی فیض حضرت جمال شیخ سے حاصل کیا۔ محمد تغلق کے زمانے میں وہ شیخ الاسلام کے عہدے پر فائز رہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے وقت کے سب سے جلیل القدر اور واجب الاحترام عالم دین سمجھے جاتے تھے۔ اور مذہبی امور میں سرکاری مشیر کا درجہ بھی رکھتے تھے۔

کہا جاتا ہے کہ انہوں نے سارے اسلامی ممالک کا دورہ کیا تھا اور اسی سیاحی کی وجہ سے "جہاں گشت" کے لقب سے مشہور ہیں۔ "حقیقت الاسرار" میں لکھا ہے کہ ان کا انتقال ۱۳۸۳ء اور ۱۳۸۶ء کے درمیان ۷۷ برس کی عمر میں ہوا۔ ان کا مزار شہر کے شمالی حصے میں ہے، اور ان کے مقبرے پر زائرین کا ہجوم رہتا ہے۔

۱۳۰۶ء میں مغلوں نے پھر اُچ پر حملہ کیا لیکن اپنے شعار کے مطابق اُچ، ملتان اور دیپالپور کو تاخت و تاراج کرنے کے بعد شاہی افواج کی آمد سے قبل ہی فرار ہو گئے۔ ۱۳۹۷ء میں تیمور کا پوتا مرزا پیر محمد اُچ آیا۔ وہاں اسے دہلی پر تیمور کی چڑھائی کا حال معلوم ہوا تو اس نے بھی ملتان کے راستے دہلی کا رخ کیا۔ تیمور کے حملے کے بعد اُچ سیدوں کے زیر نگیں رہا، جن سے اسے لنگاہوں نے چھینا۔ لنگاہوں میں قطب الدین لنگاہ مشہور حکمران گزرا ہے، جس نے ۱۳۲۳ء میں وفات پائی۔ اس کی قبر حضرت بندگی محمد غوث کے قریب ہے۔

حضرت بندگی محمد غوث بھی ایک برگزیدہ بزرگ تھے۔ وہ سید بخاری کے کوئی ڈھائی سو سال بعد ۱۴۸۲ء میں لنگاہوں کے دور اقتدار میں اُچ تشریف لائے۔ وہ عالم اسلام کی عظیم المرتبت شخصیت شیخ عبدالقادر جیلانی کی نویں پشت میں تھے۔ حضرت شیخ کی آل سے جو بزرگ ہندوستان میں آ کر آباد ہوئے، وہ بھی روحانیت اور سلوک کے اعلیٰ مراتب کو پہنچے۔ ان کی کرامتوں کی بے شمار داستانیں مشہور ہیں لیکن ان کا سب سے بڑا اعجاز تو اس ملک میں نور حق کی اشاعت ہے۔ ان کی روشن کی ہوئی شمع حقیقت آج بھی اسی طرح فروزاں ہے اور لوگ دور و نزدیک سے آ کر اس سے کسب نور کرتے ہیں، روحانی فیض حاصل کرتے ہیں۔

حضرت بندگی کا وصال ۱۵۱۷ء میں نوے برس کی عمر میں ہوا۔ ان کے مزار پر جو مقبرہ ہے وہ بہت پرانا ہے، لیکن طرزِ تعمیر نہایت عمدہ اور دلکش ہے۔ اس مقبرے کے ساتھ ہی ایک خوبصورت مسجد بھی ہے جو ۱۵۱۵ء کی تعمیر ہے۔

اچ کے حکمران

لنگاہوں کے بعد اچ پر سمتوں اور ارغنوں کی بالادستی قائم رہی، حتیٰ کہ ۱۵۲۹ء میں جبکہ دہلی میں ہمایوں برسرِ حکومت تھا، اچ کو سلطنتِ مغلیہ میں شامل کر لیا گیا۔ اچ آئے دن کے حملوں اور ترکتازیوں سے تباہ و برباد ہو چکا تھا اور رہی سہی کسر طغیانیوں نے پوری کر دی تھی۔ مغل افسروں نے اس کی تعمیرِ نو کا بیڑا اٹھایا۔ انہوں نے قلعے کو مستحکم کیا اور اسکول، عدالت اور کوتوالی قائم کی۔ جب ہمایوں شیر شاہ کے ہاتھوں شکست کھا کر بھاگا تو اچ پر کچھ عرصے کے لیے پھر ارغنوں کا تسلط ہو گیا، لیکن ہمایوں کی دوبارہ تخت نشینی کے بعد پھر یہ دہلی کی قلمرو میں شامل کر لیا گیا۔ ہمایوں نے ابو المعالی کو اچ کا حاکم مقرر کیا۔

اکبر کے عہد میں اچ کی عنانِ حکومت یکے بعد دیگرے بہادر خان، بیرم خان اور شمس الدین اتگہ کے سپرد کی گئی۔ ۱۵۵۵ء میں اکبر نے محمد صادق خان بروہی کو شکست دے کر سیوستان پر قبضہ کیا تو اس نے ملتان، اچ اور سکھر کو الگ الگ صوبے بنا دیا اور ہر جگہ ایک علیحدہ صوبیدار مقرر کیا۔

شاہجہاں کے دور میں قلیچ خاں، پھر نواب جان محمد، اور اس کے بعد سید موسیٰ، اچ کے حاکم رہے۔ ان دنوں صوبیدار تو ملتان میں رہتا تھا، البتہ اس کا نائب اچ میں ہوتا تھا۔ اس وقت تک اچ تعلیمی اور ثقافتی مرکز کے طور پر اپنی پہلی اہمیت بہت کچھ کھو چکا تھا۔ اور انتظامی لحاظ سے صوبہ ملتان کا ایک جزو بن کر رہ گیا تھا۔ ۱۷۲۴ء میں عباسی شہزادوں نے بہاولپور ریاست قائم کی۔ اسی وقت سے اچ اس ریاست کا حصہ چلا آ رہا ہے۔

اسی علاقے میں جو دیگر درگاہیں اور مقبرے قابلِ زیارت ہیں ان میں ایک سید صدر الدین معروف بہ راجن قتال کا مقبرہ ہے جو حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت کے بھائی تھے۔ پھر حضرت جہاں گشت کے استاد، حضرت بہاول حلیم کا مقبرہ ہے۔ دریائے چناب میں جو طغیانی ۱۸۱۷ء میں آئی تھی، اس کی دستبرد سے اب یہ محض کھنڈر رہ گیا ہے۔ ان سے کہیں پرانا مقبرہ شیخ صفی الدین کا ہے، جو بغداد سے ۱۲۹۱ء میں یہاں آئے اور ۱۳۰۰ء میں فوت ہوئے۔ سید جلال بخاری کے مقبرے کے دروازے کے پاس ان کے ایک مرید سچل کی درگاہ ہے جنہوں نے یہ لقب اپنی بے خوفی اور راست گفتاری کی بنا کر حاصل کیا تھا۔ وہ ڈیرہ غازی خان کے حکمران خاندان کے ایک فرد تھے، جو آرام و آسائش کی زندگی ترک کر کے درویش ہو گئے تھے۔ وہ زندگی کی گہری صداقتوں اور حقیقتوں کے محرم ہونے کے ساتھ ساتھ بلا کے ظریف تھے۔ مقامی لوگوں میں یہ مشہور ہے کہ اگر کوئی شخص ان کے مزار کا متعدد بار طواف کرتا ہے تو قہقہہ مارے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ایک اور دلچسپ اور قابلِ دید مقام ایک خاتون بی بی جاوندی کا چھوٹا سا مقبرہ ہے۔ یہ اچ کے مغربی نواحات میں ایک اونچے ٹیلے پر واقع ہے، جس کے گرداگرد کھجوروں کے جھنڈ ہیں۔ بی بی جاوندی حضرت جہانیاں جہاں گشت کی دختر تھیں اور اپنے زہد و تقویٰ اور روحانی فیوض کی بنا پر اس خاک پاک کے اولیا میں شمار ہوتی ہیں۔

یہ ہے اچ کا شہر جس سے کتنی ہی پرانی یادیں، تاریخی داستانیں اور مذہبی عقیدتیں وابستہ ہیں۔ آج کے لوگوں کو مذہبی یادگاروں اور درگاہوں، صوفیوں اور درویشوں کی باتیں شاید افسانہ معلوم ہوں گی، لیکن یہ سب زندہ حقیقتیں ہیں اس لحاظ سے کہ یہاں کے سادہ دل دیہاتیوں اور دور و نزدیک کے بے شمار عقیدتمندوں کے لئے ان میں روحانی تسکین اور کیف و جذب کا سامان موجود ہے۔ تاریخ کا طالب علم تو اس مقام سے کسی طرح سرسری طور پر نہیں گزر سکتا، کیونکہ یہ اس برعظیم کی قدیم ترین بستیوں میں سے ہے اور صدیوں تک فکر و خیال اور انقلاباتِ زمانہ کے دھاروں کا سنگم رہی ہے ❊

(مترجمہ: ابن انشا)

> "ماہ نو" میں مطبوعہ مضامین نظم و نثر دوسرے جرائد میں نقل کئے جا سکتے ہیں بشرطیکہ "ماہ نو" کا حوالہ دیا جائے۔
>
> •
>
> "ماہ نو" میں ریویو کے لئے مطبوعات کی دو کاپیاں ارسال فرمائیں۔ (ادارہ)

غزل

جوشؔ ملیح آبادی

وہ درد کے دن باقی نہ رہے درماں کی وہ راتیں بیت گئیں
دل تھام کے جن میں روتے تھے ہجراں کی وہ راتیں بیت گئیں

نہروں پہ گلے جو ملتی تھیں، شاخوں میں اُلجھ کر ہلتی تھیں
شبنم سے جو دھل کر کھلتی تھیں بستاں کی وہ راتیں بیت گئیں

جو حسنِ رواں سے درخشاں تھیں، وہ مصر کی صبحیں شام ہوئیں
جو بوئے قبا سے رقصاں تھیں کنعاں کی وہ راتیں بیت گئیں

جو خوف سے آہیں بھرتی تھیں، آغوش میں آتے ڈرتی تھیں
جو چھپ کے چراغاں کرتی تھیں افشاں کی وہ راتیں بیت گئیں

ہر آہ میں اک بسطِ غلطاں، ہر مس میں اک لذتِ رقصاں
سو عیش کے دن جن پر قرباں، حرماں کی وہ راتیں بیت گئیں

جو دل پہ مصیبت لاتی تھیں، سینے میں گرجتی گاتی تھیں
آنکھوں سے جو مینہ برساتی تھیں طوفاں کی وہ راتیں بیت گئیں

گھنگھور اندھیرا چھایا ہے ارماں کے جواہر خانے میں
نیلم کی وہ شامیں خاک ہوئیں، مرجاں کی وہ راتیں بیت گئیں

خود ایماں جن سے تاباں تھا وہ کفر کا سورج ڈوب گیا
خود عصمت جن پہ نازاں تھی عصیاں کی وہ راتیں بیت گئیں

خطبے تھے مغاں کے معبد میں، سجدے تھے بتوں کے قدموں پر
ایماں کے وہ دن برباد ہوئے، عرفاں کی وہ راتیں بیت گئیں

آغوش میں گو بے ہوش تھے اور دوش پہ کالی زلفیں تھیں
وہ عہد کے لمحے روٹھ گئے، پیماں کی وہ راتیں بیت گئیں

وحشت کے جزیرے ڈوب گئے، پھولوں کی سواری رک گئی
صبحیں وہ گریباں کی نہ رہیں، داماں کی وہ راتیں بیت گئیں

دل جوشؔ دھڑکتا رہتا تھا جب زلفِ سیہ کے حلقوں میں
وہ قید کے دن باقی نہ رہے زنداں کی وہ راتیں بیت گئیں

غزل

ناصر کاظمی

حسن کو دل میں چھپا کر دیکھو
دھیان کی شمع جلا کر دیکھو

کیا عجب پھر کوئی نغمہ پھوٹے
دل پہ اک چوٹ تو کھا کر دیکھو

کیا خبر کوئی دفینہ مل جائے
کوئی دیوار گرا کر دیکھو

فاختہ چپ ہے، بڑی دیر سے کیوں
سرو کی شاخ ہلا کر دیکھو

نہر کیوں سو گئی چلتے چلتے
کوئی پتھر ہی گرا کر دیکھو

کیوں چمن چھوڑ دیا خوشبو نے
پھول کے پاس تو جا کر دیکھو

دل میں بیتاب ہیں کیا کیا منظر
کبھی اس شہر میں آ کر دیکھو

ان اندھیروں میں کرن ہے کوئی
شب زدو آنکھ اٹھا کر دیکھو

کل یہاں جشنِ بہاراں ہوگا
وہ سماں دھیان میں لا کر دیکھو

غزل

باقیؔ صدیقی

تیرے در تک نہیں جانے پاتے
ہم کہاں اور ٹھکانے پاتے

ہر قدم پر ہے نیا ہنگامہ
ہوش میں ہم نہیں آنے پاتے

تم عناں گیرِ جنوں ہو ورنہ
چور چور آئنہ خانے پاتے

لوگ غربت کا گلہ کرتے ہیں
ہم وطن سے نہیں جانے پاتے

درد ہوتا تو مسلسل ہوتا
دل کو ہم دل تو بنانے پاتے

تیری محفل نہیں غم کی محفل
بار کیا میرے فسانے پاتے

ہم بگولے بھی نہیں تھے ورنہ
گردِ منزل تو اڑانے پاتے

غم اگر ساتھ نہ دیتا باقیؔ
دشت بھی ہم نہ بسانے پاتے

غزل

شان الحق حقی

اگرچہ ہے نہیں اپنے ہر اک بیاں سے گریز
کروگے قول سے نظروں کے کس زباں سے گریز

وہیں چھپے نہ ہوں اے دل حقیقتوں کے نشاں
مری نظر نے کیا ہے جہاں جہاں سے گریز

بقدرِ شوق تھی تمہیدِ مدعا لیکن
کوئی مقام نہ سوجھا کہ ہو کہاں سے گریز

شروعِ راہِ وفا ہے ابھی تو دیکھئے گا
کوئی یہاں سے کرے گا کوئی وہاں سے گریز

بڑی حسیں ہے یہ کیفیّتِ قبولِ وفا
کہ دل سے سیکڑوں اقرار اور زباں سے گریز

کسے فسانۂ ہستی کی ابتدا معلوم
جز ایں قدر کہ ہوا دل کی داستاں سے گریز

لکھی تھیں دل کے مقدر میں الجھنیں ورنہ
مری وفا نے تو چاہا تھا ہر گماں سے گریز

غزل

حبیب جالب

سونی ہیں آنکھوں کی گلیاں دل کی بستی ویراں ہے
ایک خموشی، ایک اندھیرا چاروں جانب رقصاں ہے

ایک زمانہ وہ کہ تجھے میں یاد تھا اور اب یاد نہیں
تیرا ہر انداز مری جاں ایک انوکھا احساں ہے

کتنی دُور چلا آیا ہوں چھوڑ کے تیری بستی
لیکن دل تیری گلیوں میں آج تلک سرگرداں ہے

پھر سورج کے ساتھ ترے ملنے کا امکاں ڈوب گیا
پھر بام و در کی تاریکی دیدہ و دل پر خنداں ہے

پھر اُن پیار بھری ندیوں کی یاد میں آنکھیں پُرنم ہیں
پھر اُس بچھڑے دیس کے غم میں شہرِ دل و جاں ویراں ہے

جالب اب اُس جانِ غزل کے پیار سے لاکھ انکار کریں
آنکھوں کی پُرسوز چمک سے دل کا درد نمایاں ہے

غزل

صہبا اختر

سایۂ زلف میں اک رات بسر ہونے تک
کتنی صبحوں کو تراشا ہے سحر ہونے تک

دل کی دنیا ہے جہنم کی طرح شعلہ فروز
یہ جہنم ہے مگر تیرا گزر ہونے تک

تیرگی بننے لگی شوخ اجالوں کے کفن
دیکھیں کیا گذرے ستاروں پہ سحر ہونے تک

کتنے طوفانوں سے ظلمت کے گذرنا ہے ہنوز
چاند تاروں کو تری راہگذر ہونے تک

دیدۂ تر ابھی تیرا ہے شبستانِ وجود
کچھ دیئے اور جلا خونِ جگر ہونے تک

زندگی ایک چراغاں ہے بجائے خود بھی
سب اندھیرے ہیں تجلی نظر ہونے تک

اک قیامت ہی سہی دل سے گذرنا تیرا
ہم بھی زندہ ہیں قیامت کا گذر ہونے تک

میں نے اک زندگی تازہ خدا سے مانگی
اور وہ بھی کسی ظالم پہ اثر ہونے تک

راکھ ہو جائے گی یہ شمعِ تمنا صہبا
ان کو اس دل کے اندھیروں کی خبر ہونے تک

غزل

ادیب سہارنپوری

دل اب موہوم امیدوں سے بہلائے نہیں جاتے
جو دھوکے عمر بھر کھائے ہیں وہ کھائے نہیں جاتے

تری مخمور آنکھوں میں ترے گل رنگ ہونٹوں پر
ہزاروں گیت ایسے بھی ہیں جو گائے نہیں جاتے

بغیر ان کے بسا اوقات یہ محسوس ہوتا ہے
کہ جیسے ہم دو عالم میں کہیں پائے نہیں جاتے

خوشی کی چھاؤں میں بیٹھے، غموں کی دھوپ بھی جھیلی
خیالوں سے تری دیوار کے سائے نہیں جاتے

بہار اور گلوں کا رنگِ وحشت ایک جیسا ہے
نکل جاتے ہیں یوں دامن کہ سلوائے نہیں جاتے

سکوں کی جستجو، آسودگی کی آرزوؤں نے
قدم ایسے نکالے ہیں کہ ٹھہرائے نہیں جاتے

ہماری تشنگی کی شرم رکھ لے ساقیِ محفل
بھری محفل میں ہم سے ہاتھ پھیلائے نہیں جاتے

چلو خود ہی ادیبؔ اس بزم میں تم بھی کہ پروانے
حضورِ شمع خود جاتے ہیں بلوائے نہیں جاتے

اقوامِ متحدہ

مشرقی بنگال میں تپِ دق کی روک تھام

آغا محمد اشرف

پاکستان میں ہر سال تقریباً ڈیڑھ لاکھ قیمتی جانیں تپِ دق اور سل کے نامراد مرض کی نذر ہو جاتی ہیں۔ شہروں کی گنجان آبادیاں، تاریک اور متعفن گلی کوچے اور ایسے چھوٹے چھوٹے اندھیرے گھر کہ جہاں صاف ہوا کا مشکل سے گذر ہوتا ہے، اس مرض کی بہترین آماجگاہ ہیں۔ اس کے علاوہ ناکافی غذا اور عوام کی غربت اس موذی بیماری کو اپنے شکار پھیلانے میں اور ہاتھ بٹاتی ہے۔ اب تک اس مرض کی روک تھام کے لئے کسی قسم کی مسلسل کوشش نہیں کی گئی تھی۔ کیونکہ مریضوں کے علاج اور مرض کے تدارک کے لئے ہسپتالوں، ڈاکٹروں، نرسوں اور اس نئے سامان کی ضرورت ہے جو بیسویں صدی میں تپِ دق کے خلاف جنگ کے لئے سائنس کے تجربوں نے ہمیں دیا ہے لیکن ہمارے ملک میں نئے سامان کا تو ذکر ہی کیا ہے، شفا خانوں اور ہسپتالوں کی اس قدر کمی ہے کہ اس بڑھتے ہوئے روگ کی تباہی کو روکنے کے لئے پہلا مورچہ بھی قائم نہیں ہو سکا تھا۔ ۔۔۔ ڈاکٹروں کے متعلق اعداد و شمار یہ بتاتے ہیں کہ ہر ۴۲ ہزار باشندوں کے لئے صرف ایک ڈاکٹر مہیا ہو سکتا ہے۔

مثال کے طور پر مشرقی بنگال کو ہی لے لیجئے۔ سنہ ۱۹۵۱ء کی مردم شماری کے مطابق اس صوبے کی آبادی تقریباً ۴ کروڑ ۲۰ لاکھ ہے۔ اس علاقے میں فی مربع میل ۷۰۰ سے لے کر ایک ہزار تک انسان آباد ہیں۔ اور آبادی کی یہ اوسط ڈھاکے جیسے شہر میں اس سے بھی زیادہ ہے۔ اس اعتبار سے مشرقی بنگال کا شمار دنیا کے سب سے زیادہ گنجان آباد علاقوں میں ہوتا ہے۔

آبادی کی کثرت کے ساتھ اگر حفظانِ صحت کے اصولوں پر عمل نہ کیا جائے تو اس کا لازمی نتیجہ تپِ دق اور سل کے مرض کی شکل میں نکلتا پڑتا ہے۔ اس کے علاوہ آئے دن ان شہریوں پر ملیریا، ہیضے اور اسی قسم کی دوسری بیماریاں نازل ہوتی رہتی ہیں۔ بدقسمتی سے صحت کے متعلق اب تک ہمارے ہاں مکمل اعداد و شمار موجود نہیں لیکن جتنی معلومات فراہم ہو سکی ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ سنہ ۱۹۵۱ء میں مشرقی بنگال کے تین دیہاتی علاقوں میں بسنے والے باشندوں میں سے ۵۰ فیصدی سے زیادہ تپ کی زد میں آ چکے تھے۔ اس سے قبل سنہ ۱۹۳۶ء میں ایک اور سرکاری رپورٹ کے مطابق ہر ایک لاکھ باشندوں میں سے ۱۷۹ باشندوں کی موت کا موجب تپِ دق کا مرض تھا۔

یہ اعداد و شمار اپنی جگہ پر تباہی اور بربادی کی منہ بولتی داستان ہیں کہ جس پر کسی قسم کا حاشیہ چڑھانے کی ضرورت نہیں۔ اس کا علاج صرف ایک ہی طرح ممکن تھا اور وہ یہ کہ مشرقی پاکستان میں کسی بیرونی ادارے کی امداد سے تپِ دق کی روک تھام کا منصوبہ مرتب کیا جائے۔ اور اس طرح جو چند تجربے حاصل ہوں، ان کی روشنی میں صوبے میں جگہ جگہ ہسپتال، طبی امداد کے مرکز اور شفا خانے کھولے جائیں۔ چنانچہ سنہ ۱۹۵۲ء میں حکومتِ پاکستان کی درخواست پر عالمی ادارۂ صحت کے چند ماہر ڈھاکے پہونچے۔ کام شروع کرنے سے پہلے انہوں نے ڈھاکہ کے حالات کا جائزہ لیا تو پتہ چلا کہ اس وقت ڈھاکہ شہر کی آبادی ۵ لاکھ کے لگ بھگ تھی اور اتنے بڑے شہر میں تپِ دق کے مریضوں کے لئے کوئی شفاخانہ موجود نہیں تھا۔ ایک ہسپتال ضرور تھا مگر وہاں تپِ دق کے مریضوں کے لئے صرف ۶۹ بستروں کا اہتمام تھا جو مرض کی وسعت کو دیکھتے ہوئے یقیناً ناکافی تھا۔ عالمی ادارۂ صحت کے ماہروں نے ڈھاکہ پہنچتے ہی ایک کنٹرول سنٹر قائم کیا۔ جو اس علاقے میں اپنی قسم کا پہلا ادارہ تھا۔ اس سنٹر میں تپِ دق کی روک تھام کے لئے مستند طریقوں کے مطابق عمل کیا گیا اور

(باقی صفحہ ۔۔۔ پر)

جاپانی ادب

(۲)

کیمیا ڈوئی

"اکاواحیبی ویولی" کا ناول "شیطان کی چھوڑی ہوئی دولت" اسکا محض خاکہ یہ ہے کہ اس کہانی کا ہیرو اخبار نویس ہے۔ اخبار کیلئے رپورٹ لکھنے کے لئے ہیروشیما جاتا ہے۔ جانے سے پہلے اس کا خیال تھا کہ اب ہیروشیما اچھی طرح بس چکا ہے اور بم کا اثر دیکھنا مشکل ہوگا۔ مگر جب وہ ہیروشیما پہنچا، تو امید کے خلاف بم کے بہت سے اثرات اس کی نظر سے گزرے۔ ہیروشیما میں چچا کے گھر میں ٹھہرا تھا۔ چچا ایک بیمار پڑگیا مگر اس بیماری کا سبب بالکل معلوم نہ ہوسکا۔ شہر میں ایک اسپتال ہے جہاں ایٹم بم کے اثرات کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ اس اسپتال میں ایک جاپانی ڈاکٹر سے ملاقات ہوئی اور شکایت سنی کہ اس اسپتال میں ایٹم بم کے بیماروں میں پیدا شدہ اثرات کا مطالعہ تو کرتے ہیں لیکن ان بیماروں کا علاج بالکل نہیں کرتے۔ ایک دن بچی کے ساتھ شہر میں سیر کر رہا تھا تو دیکھا ایک بچی کے چہرہ پر ورم آگیا اور وہ سخت بیمار پڑ گئی۔ اس طرح باہر سے کچھ آثار نظر نہیں آتے لیکن ایٹم بم کا اثر بدن میں ہوتا رہتا ہے اور ایک دن دیکا یک اسکا اثر ظاہر ہو جاتا ہے۔ آخر ہیرو معلوم کر رہا تھا کہ خبر آئی کہ اس کا لڑکا بھی ایٹم کے اثر سے بیمار پڑ گیا ہے۔

ہر دلعزیز مصنفوں میں گیبن جی کے تا خاصکر دفتر کے کلرکوں کی زندگی پر غور کرنے کے باعث مشہور رہے۔ ان کے ایک ناول "امن و امان کا زمانہ" میں ہیرو ایک کارخانہ میں کلرک تھا لڑائی کے وقت اس کو فوج میں بھرتی ہو کر جانا پڑا۔ اتنے میں کارخانہ کی حالت بہت خراب ہوگئی اور صدر نے بہت سے حصے بیچ ڈالے۔ ایک دوسرے کارخانہ کے ڈائرکٹر نے یہ سب حصے خرید لئے اور وہ خود آکر کارخانہ کو سنبھالنے لگا۔ اس کے کارخانہ سے کلرک بھی آگئے۔ پرانا صدر معمولی ڈائرکٹر بنا دیا گیا اور دفتر میں ایک شعبہ کا صدر مقرر کر دیا گیا۔ آہستہ آہستہ ایسا ہونے لگا کہ نئے صدر کے کارخانہ سے آئے ہوئے کلرکوں کے مقابلہ میں پرانے کلرکوں کی حالت بگڑتی گئی۔ اتنے میں ہیرو لڑائی سے واپس آتا ہے۔ اس نے دیکھا کہ کارخانہ کا حال بالکل بدلا ہوا ہے۔ پرانا صدر تنزل پاکر اب معمولی افسر ہو گیا ہے۔ یہ دیکھ کر اس کے دل میں خیال آتا ہے کہ کسی نہ کسی طرح وہ حصے جو پرانے صدر نے بیچ ڈالے تھے، پھر خرید لے اور اسی طریقہ سے پرانے صدر کو دوبارہ صدر بنا دے۔ اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کرنے کی بہت کوشش کرتا ہے مگر کبھی کبھی ناامید ہو جاتا ہے۔ آخر ایک دوست کی مدد سے چور بازار میں کافی روپیہ کماتا ہے اور اس کارخانہ کے حصص خرید کر پرانے کلرکوں کی حالت سدھارنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ بے شک اس ناول میں محبت کا قصہ بھی شامل ہے۔ نئے صدر کا لڑکا اور پرانے صدر کی لڑکی ایک ہی دفتر میں کام کرتے تھے اور آپس میں محبت کرتے تھے۔ جب یہ معلوم ہو گیا کہ دونوں کے باپ شادی کی اجازت نہیں دیتے تو گھر سے علیحدہ ہو کر رہنے کو تیار ہوتے ہیں اور ہیرو کی مدد سے شادی کرتے ہیں۔ دونوں کی مائیں اپنے اپنے شوہر سے اپنے لڑکے اور لڑکی کی شادی کی اجازت حاصل کرنے کی کوشش کرتی ہیں، لیکن ناکامیاب رہتی ہیں۔ آخر جب یہ خبر آئی کہ نئی بیوی حاملہ ہوگئی تو دونوں کی ماں اپنے اپنے شوہر کی اجازت کے بغیر جوان میاں بیوی سے ملنے جاتی ہیں۔ کارخانہ میں کلرک لڑکی ہے جو ہیرو سے محبت کرتی ہے۔ اس کی مدد سے کارخانہ کی خبریں ہیرو کو پہونچتی رہتی ہیں۔ لیکن ہیرو کے روپیہ کمانے اور کارخانہ کے حصے خریدنے کے خیال میں لگے رہنے سے شادی کا موقع نہیں ملتا۔ اتنے میں ہیرو کا دوست بھی اس لڑکی سے محبت کرنے لگتا ہے۔ ہیرو کے کارخانہ کے حصے خریدنے میں بہت بڑی مدد دینے والا ایک بہت امیر ہے جس کے ایک لڑکا اور ایک لڑکی ہے۔ اتفاق سے یہ لڑکی اور کلرک لڑکی سہیلیاں ہیں۔ اس امیر کا لڑکا کلرک لڑکی سے اور لڑکی ہیرو سے محبت کرنے لگتے ہیں۔

آخر کار کلرک لڑکی کی شادی ہیرو کے دوست سے اور ہیرو کی شادی اس امیر کی لڑکی سے ہوتی ہے۔

تاریخی ناول نویسی میں یوشی کاوا ایے جی اور مورا کامی گین زو بہت مشہور ہیں۔ یوشی کاوا کا مام پسند ناول "سے کے مونوگاتاری" لوگوں میں بہت پڑھا جا رہا ہے۔

شاعری

مے جی کے ابتدائی دور میں شاعری میں بڑی تبدیلی ہو گئی تھی، اس وقت تک جاپان میں صرف واکا اور ہائکو رائج تھیں جو بہت ہی چھوٹی نظمیں ہوتی ہیں۔ واکا میں صرف ۳۱ بول ہوتے ہیں اور ہائکو میں ۱۷۔

واکا:

"آکی نو کامی
یودا رو وا مُوشی نو
کوئی نو میکا
کیکو وارے ٹو یُمو
مینو می یا دا آرو"

ترجمہ:۔ خزاں آ گئی، ہوتی جاتی ہے کمزور کیڑوں کے گانے کی آواز
مچلتا ہے مجھ سننے والے کا دل بھی

ہائیکو میں صرف تین مصرعے ہوتے ہیں جن میں سے پہلے مصرعے میں پانچ بول ہوتے ہیں، دوسرے میں سات اور تیسرے میں پانچ مثلاً

"نی نی شی مویا
یوسی نو کو شی اد
نایانی نو مو"

ترجمہ: میں تھرتھر کانپ اٹھا
خوابگہ میں پاؤں جا پڑا
مرحومہ بیوی کی کنگھی پر!

دورِ مے جی میں جب یورپ کا تمدن آیا اور یورپ کے ادب سے لوگ واقف ہوئے تو انہیں خیال آیا کہ جاپان کی پرانی نظموں میں بہت چھوٹی ہونے کی وجہ سے، پورا خیال ظاہر نہیں کر سکتے۔ مے جی کے پندرھویں سال یعنی ۱۸۸۲ء میں کچھ علماء نے یورپ کی نظموں کا ترجمہ شائع کیا جس کا نام تھا "نئی نظمیں"۔ اس کے بعد مودی اوگائی اور اُسٹے ڈابن نے بھی یورپی نظموں کا ترجمہ کیا۔ ان ترجموں سے لوگوں پر بہت اثر پڑا۔ خود جاپانی نظموں کا پہلا اچھا مجموعہ شیمازاکی توسون کا ہے جو "واکانا شو" کے نام سے ۱۸۹۷ء میں شائع ہوا۔ ان کی نظم کا ایک نمونہ یہ ہے:۔

دُور اک جزیرہ ہے --- نام بھی معلوم نہیں
بہتا ہوا آ گیا ناریل کا ایک پھل

اپنے وطن سے جدا ہو کے سفر میں تجھے
کتنے مہینے لگے لہروں میں بہتے ہوئے؟

اونچا اور سایہ دار ہوگا ٹھکانا ترا
ڈالیاں دے رہی ہوں گی پیام امن کا

میں بھی تیری طرح لہروں کو ساحل کے پاس
تکیہ بنا کر ہوں سونے والا مسافر اداس

ناریل کے پھل کو اس نے چھاتی سے چمٹا لیا
دیس سے دوری کا پھر زخم ہرا ہو گیا
دیکھتا ہوں سورج کو دُور اُفق پہ ڈوبتے
آتی ہے وطن کی یاد گرتے ہیں آنسو مرے
یہ سب لہریں بے قرار کرتی ہیں کیا کیا مجھے
لوٹ کے کب جا سکوں اپنے وطن، دیکھئے

اس نظم کی خصوصیت یہ ہے کہ تمام مصرعے پانچ اور سات بولوں سے بنے ہیں، جیسے

نا موشیرا مو تو کی شیما یوری
ناگو ری یورو یاشی نو می ہیتو تسو

یہ کسی حد تک واکا کی طرح ہے جس کے مصرعوں میں "۵"، "۷"، "۵" بول ہوتے ہیں۔

شروع شروع میں جب لوگ یورپی نظموں کی نقل کرتے تھے تو قافیہ بندی کی کوشش کی لیکن جاپانی زبان میں ہر بول کے آخر میں

حرف علت ہونے کی وجہ سے دیگر زبانوں کی طرح قافیہ نہیں جوڑ سکتے۔ اس لئے کے بعد دیگرے پانچ اور سات بولوں سے مصرعے بنانے لگے۔ اس کے بعد واوں کے ساتھ ساتھ نظم کی نشو و نما ہوتی گئی۔ فطرت نگاری کے زمانے یعنی تقریباً ۱۸۹۰ء سے روزمرہ کی بول چال کی زبان میں آزاد نظم بہت لکھی جانے لگی۔ آجکل کی نظم کی مثال یہ ہے:۔

رس بھری کا میدان

پگڈنڈی کے آس پاس جنگل میں
ہیں لگی رس بھریاں بہت ساری
توڑتے تو گر جاتی ہیں ان سہانی
لال لال گولیوں کی دلفزا طراوت کا
میرے ساتھ کیا نہ لطف اٹھاؤ گے کو کتی کوئل کی پرسکون وادی میں!

●

آج ہر پہاڑ سے اٹھ رہے ہیں دل بادل
جولائی کی ہریالی بڑھ رہی ہے ہر طرف دن بہ دن۔
پیلے پیلے پھولوں کے بن کے بہت ہی قریب
آتی ہیں مجھ کو نظر الپس کی چوٹیاں۔۔۔۔

●

پکی ہوئی رس بھری بنتی ہے خود ہی شراب، کرتی ہے جو ترقی کو مست
بخت نے کی یاوری، ساتھ رہی زندگی
اب ہے بڑھاپا مرا جیسے پرانی شراب۔ تند و تیز۔

واکا جاپان میں سب سے پرانی وضع کی نظم ہے۔ جاپان میں سب سے پرانی واکاؤں کا مجموعہ مان یوشو ہے جو ۷۶۰ء کے بعد لکھا گیا۔ اس زمانے کی واکا بہت سیدھی سادی تھی۔ ۹۰۵ء میں بادشاہ کے حکم سے واکاؤں کا ایک اور مجموعہ تیار کیا گیا جس کو کوکین شو کہتے ہیں۔ اس کوکین شو کی واکا میں طرز ادا کی بہت نشو و نما ہوئی۔ اس کے بعد ۱۲۰۵ء میں ایک اور مجموعہ بادشاہ کے حکم سے بنا جس کو شین کوکین شو کہتے ہیں۔ اس مجموعہ میں واکا کی طرز ادا کوکین شو کی طرح ہے، لیکن کلام میں بہت اصلاح ہو گئی ہے۔ یہ تین کتابیں واکا کے لئے سب سے اچھی کتابیں مانی جاتی ہیں اور بعد کے ہر شاعر ان تینوں میں سے کسی ایک کی نقل کرتے ہیں۔ ہائی کو کی نشو و نما دور امے دو میں ہوئی تھی۔ ہائیکو میں سب سے بڑا شاعر ماتسوا و باشو (۱۶۴۴ء–۱۶۹۴ء) ہے۔ ان کے کلام کا ہر زمانہ میں مطالعہ کیا جاتا رہا ہے۔

جیسا کہ پیچھے بیان کیا گیا ہے، جب عہد میجی شروع ہوا تو لوگوں کو یہ خیال ہوا کہ واکا اور ہائی کو آجکل کے خیالات کے اظہار کے لئے بہت مختصر ہیں اور اب جدید طرز کی شاعری کو رواج دینا چاہیئے۔ لیکن واکا اور ہائی کو جاپانی کی رگ و ریشہ میں سرایت کر چکی ہیں۔ انہیں اتنی آسانی سے چھوڑا نہیں جا سکتا۔

دور میجی میں واکا اور ہائی کو کو پھر سے ترقی دینے والوں میں ماساؤکا شیکی (۱۸۶۷ء–۱۹۰۲ء) سب سے بڑے آدمی تھے۔ انہوں نے واکا میں مان یوشیو اور ہائی کو میں باشو کا خاص مطالعہ کیا تھا۔ ان کا قول ہے کہ شعر میں اسکیچ سب سے ضروری ہے یعنی تصویر بنانے کی طرح نظم میں بھی خیال کے خدوخال ظاہر ہونے چاہئیں۔ ان کے بعد بہت سے شاعر ہوئے اور اسکیچ کے نقطہ میں نئے نئے مطالب پیدا کرتے رہے۔

واکا اور ہائی کو لوگوں میں بہت مقبول ہیں۔ لڑائی کے وقت سپاہیوں نے اچھی اچھی واکا اور ہائی کو نظمیں لکھی ہیں، جیسے

چینی لوگ
کھیتوں میں بوتے ہیں دھان
آتی ہے وطن کی یاد
میں بھی ہوں اپنے وطن کا کسان

لڑائی کے بعد پھر کچھ لوگوں کو خیال آیا کہ واکا اور ہائی کو نظم کہنے کے لئے بہت چھوٹی ہے لیکن آجکل لوگوں کا دھیان قدیم رسموں کے احیاء کی طرف ہونے کی وجہ سے واکا اور ہائی کو زیادہ لپک کی جا رہی ہے۔ معمولی لوگوں کے لکھے ہوئے ایک دو نمونے دیکھ لیجئے۔

کیسی خوبصورت ہے
یہ زمین کی پالی ہوئی شے،

ہاتھ میں لے لیا
لال لال دانوں کو

خزاں کے مچھر
بھنبھناتے ہیں سینے کی مشین کے گرد

اس کی آخری قسط ادا کر دی گئی۔ +

ماہ نو، کراچی، اکتوبر ۱۹۵۵ء
مکاهیہ،

حکیم جی

ضمیر جعفری

یہ ان مشہور حکیم بوعلی سینا کا تذکرہ نہیں جو علم طب کے امام مانے گئے ہیں جن حکیم سینا کا ذکر میں کر رہا ہوں اگرچہ ویسے خود وہ بھی اپنے آپ کو وقت کا بوعلی سینا ہی سمجھتے تھے مگر عملاً ہمارے شہر کی ایک ایسی تنگ و تاریک سی گلی میں مطب کرتے تھے جہاں طبیب و مریض تو بڑی چیزیں ہیں بنفسہ علم طب کا گزر بھی مشکل معلوم ہوتا تھا لیکن انسان وہ مخلوق ہے کہ جب کچھ کرنے پر آتا ہے تو ایک شاعر کے بقول۔ سمندر چیرتا ہے کوہ سے دریا بہاتا ہے۔ اور جب ایک دوسرے شاعر کے بقول۔ کچھ بھی کرنے کو نہیں جی چاہتا۔ تو اس گلی میں مطب تک کر لیتا ہے۔

جینا اسی گلی میں مرنا اسی گلی میں

طبیب کی حیثیت سے حکیم سینا کی شہرت صرف اسی قدر تھی کہ وہ تقریباً اسی نوے برس تک زندہ رہے۔ شہرت سے زیادہ لوگوں کو ان کی سخت جانی پر حیرت تھی کہ جس تنگ دستی مگر پھر جس وضع داری کے ساتھ انہوں نے زندگی بسر کی ہے وہ اتنی مدت تک زندہ ہی کیونکر رہ سکے تھے۔ محلے کی طرف سے کمیٹی کے منسوخ ممبر بابو مولا داد سیاہ نویس اکثر کہا کرتے ہیں کہ حکیم سینا اگر اسی گلی کے نکڑ پر خوانچے میں مونگ پھلی لے کر بیٹھ جاتے تو زیادہ آسودہ ہوتے مگر حکیم صاحب تھے کہ جہاں ایک مرتبہ بیٹھ گئے تھے بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ پچھلی صدی کے چوتھے یا تیسرے ربع میں ان کے والد مرحوم جو عطاری کا دھندا کرتے تھے جہاں ان کو بٹھا گئے تھے وہ پھر وہاں سے اٹھے نہیں۔ آخر آخر میں تو خیر کئی سال سے بذاتِ خود ان کا جینا ہی کئی معنوں میں بے معنی ہو چکا تھا مگر پچھلے دنوں میں بھی اہل الرائے اصحاب کی رائے یہ تھی کہ حکیم سینا اور امام مسجد مولوی لطف اللہ خاں علی الترتیب حکمت و امامت کے علاوہ کوئی دوسرا دھندا کر ہی نہیں سکتے۔ مولوی لطف اللہ خاں تو نسبتاً پھر بھی آسودہ حال تھے مگر حکیم صاحب کا حال ساری عمر یہ رہا کہ محلے کی بوڑھی خوش عقیدہ عورتوں کو جب کبھی اللہ کی رزاقی و قدرت پر گفتگو مقصود ہوتی تو مثال کے طور پر وہ پتھر کے سینے میں جینے والے کیڑے اور اندھی گلی میں مطب کرنے والے حکیم سینا کا تذکرہ عموماً ایک ہی سانس میں کیا کرتیں۔

حکیم سینا میری طفلی ہی کے زمانے میں جس کو آج کوئی پچیس تیس برس گزر چلے ہیں، اس مقام پر پہنچ چکے تھے جہاں کوئی آدمی اپنی افادیت کھو دینے کے بعد محض ایک رائے بیچر یا مشغلہ یا قہقہہ رہ جاتا ہے۔ ہمارا شہر کچھ اس قسم کا ہے جہاں ہر شخص ہر شخص کو جانتا ہے بلکہ لوگ ایک دوسرے کے شجرۂ نسب تک سے واقف تھے۔ ہمارے شہر کا ایک معروف معزز شخص جو وزیر تک رہ چکا ہے اپنے شہر میں اب تک میاں حشمت علی ہاشمی ہی کہلاتا ہے۔ یہ دراصل ایک بڑا قصبہ ہے جس کو زرعی ملک کی سیر چشمی نے شہر کا نام دے رکھا ہے۔ چنانچہ حکیم سینا کو شہر کا بچہ بچہ جانتا تھا۔ بلکہ بڑوں کو چونکہ مدت سے ان میں کوئی دلچسپی باقی نہیں رہ گئی تھی اس لئے شہر کے بچے ان کو کچھ زیادہ ہی جانتے تھے۔ مجھے جس وقت ابھی یہ تمیز بھی نہ تھی کہ طبیب کیا ہوتا ہے اور مطب کسے کہتے ہیں یہ معلوم تھا کہ لہراتی ہوئی سفید ڈاڑھی والا وہ مرد ننگ جو ہر روز شام کو بلا ناغہ ہاتھ میں موٹا سا عصا لے کر ایک مقررہ راستے پر سیر کو نکلتا ہے، حکیم سینا ہے۔ ذرا بڑا ہوا تو ان کے متعلق اور بہت سی باتیں معلوم ہو گئیں۔ مثلاً یہ کہ ان کا نام تو عبدالوہاب یا عبدالمعبود تھا مگر اپنے آپ کو خاک پائے بوعلی سینا کہتے تھے جو کثرت استعمال سے گھس کر صرف سینا رہ گیا تھا۔ کسی طبیب یا طبی درسگاہ سے فن کی تحصیل قطعاً نہیں کی تھی لیکن خود کو فن کا مجتہد سمجھتے تھے۔ خود بہت چلتے تھے مگر مطب بالکل نہیں چلتا تھا۔ معمولی عوارض کا علاج

یہ نہیں کرتے اور بڑے امراض کے مریض ان سے علاج نہیں کرواتے۔
عمر بھر شادی نہیں کی۔ نہایت عسرت میں بسر ہوتی ہے، مگر منشی رکھنے کا
شوق اتنا ہے کہ کوئی ڈیڑھ درجن جنتری بدل چکے ہیں۔ آگ پر پکی ہوئی
کوئی چیز نہیں کھاتے چنانچہ ۱۹۲۰ء تک وہ اپنے اس معمول پر پچیس
برس کی پابندی کا رکارڈ قائم کر چکے تھے۔ ٹوکری کی کلاہ پر نیلے رنگ
کی جو پگڑی باندھ کر نکلتے ہیں وہ گزشتہ بیس برس سے بندھی ہوئی ہے۔
مطب میں مریض ملنے کو آ جائے تو اس کو تضیعِ اوقات گردانتے ہیں۔ طبیعت
میں تلخی ہے۔ مزاج چڑچڑا ہے عمر بڑی، صحت اچھی۔ الغرض ایک سے
ایک دلچسپ تر سینکڑوں باتیں ان سے منسوب اور زبان زدِ عام ہیں۔

حکیم سینا سے میری باضابطہ ملاقات اس وقت ہوئی جب
میں زندگی میں داخل ہونے کے لئے اپنے شہر سے باہر جا رہا تھا۔
حکیم صاحب اس وقت عمر کے اس مقام پر کھڑے تھے جس کے بعد
آدمی اچانک کسی دن مر تو جاتا ہے مگر اس سے زیادہ بوڑھا نہیں
ہو سکتا۔ مطب گھر پر ہی تھا بلکہ جیسا کہ بعد میں دیکھا گھر مطب میں تھا۔
چھوٹی اینٹوں کا چھوٹا سا پرانا مکان تھا جس کی بوسیدہ بیرونی دیواروں
کے کئی مختلف شگافوں میں سے دس پندرہ کائی اور سوکھے کے لاڈلے
پودے اور بیری اور شہتوت کے معزز درخت بیک وقت پروان
چڑھتے ہوئے ایک دوسرے پر چڑھ گئے تھے۔ مکان اور درختوں کا
رشتہ اتنا قدیم و محکم تھا کہ اب مکان ان ہی کے سہارے کھڑا تھا۔
غالب نے کسی ایسے ہی مکان کی نسبت کہا ہوگا۔

دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

مطب والی کوٹھڑی گلی میں کھلتی تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ بند ہی
نہ ہو سکتی تھی۔ اندر پہنچا تو عام شہرت کے مطابق مطب سائیں سائیں
کر رہا تھا۔ حکیم سینا متروک وضع کے ایک پرانے صوفے کی لمبی نشست
پر دراز تھے۔ سامنے بے دلی سے چھلا ہوا دیار کا ایک گرانڈیل میز پڑا
تھا جس پر تنگ اور چوڑے دہانوں کی کوئی چھ سات بوتلیں رکھی تھیں
جن میں سے بالخصوص سرمئی رنگ کی ایک بوتل میں سفید سفید گولیاں
مطب کے نمناک دھندلکے میں بھی چمک رہی تھیں۔ میز سے لگی ہوئی
بے بازو کی دو چوکیاں تھیں اور دیواروں کے تین چار کشادہ طاقوں
میں بے شمار چھوٹی بڑی بوتلیں گرد و غبار میں اس اطمینان کے ساتھ
اٹی پڑی تھیں کہ اب ان کو چھیڑنے سے نہ معلوم کتنی صدیوں کی دل آزاری کا
احتمال ہوتا تھا۔ ان کے علاوہ پھٹے پرانے کپڑے، مختلف طول و عرض کے
کھرل اور انواع و اقسام کے ہاون دستے بے ترتیبی سے پڑے تھے۔

میری آہٹ سن کر حکیم صاحب اکڑوں ہو کر بیٹھ گئے۔ وہ پہلے
مجھے کوئی مریض ہی سمجھے۔ نبض کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولے:۔
"کیا عارضہ ہے؟" میں نے عرض کیا محض اشتیاقِ ملاقات کھینچ لایا۔
اس پر اپنے خشونت آمیز رویے پن کو چہرے کی شکنوں سے ظاہر کر کے
پہلو سمیٹتے ہوئے بولے:۔

"آپ غالباً اس شہر میں نووارد ہیں۔ میں نے اس قسم کی ملاقاتوں
کو کبھی نہیں سراہا۔ خیر اب آپ آ ہی گئے ہیں تو بیٹھیے لیکن پہلے ذرا میز پر سے
میری عینک اٹھا دیجئے۔ مہربانی۔ مگر نہیں رہنے دیجئے۔" اور پھر
خود ہی عینک اٹھاتے ہوئے کہا۔ "میں نے زندگی بھر اپنا ہر کام
اپنے ہاتھ سے کیا ہے۔ یہ عادت کچھ ایسی راسخ ہو چکی ہے کہ مثلاً اب
آپ عینک اٹھا کر دیتے تو بہت ممکن تھا مجھے اس میں سے کچھ سجھائی ہی
نہ دیتا۔"

"اچھا" میں کچھ تعجب سے بولا

"نہیں۔ یہ نئی پود اس بات کو سمجھ ہی نہیں سکتی۔ تم لوگ تو معاف
کرنا یہ چاہتے ہو کہ تمہاری جگہ حوائجِ فطریہ بھی کوئی دوسرا ہی بھگتا آئے۔"
پھر عینک کو ناک کی گھوڑی پر سوار کرتے ہوئے۔ "لیجئے اب بات کیجئے۔
کیا کہوں میری کچھ ایسی عادت ہو گئی ہے کہ عینک کے بغیر میں گفتگو بھی
نہیں کر سکتا۔ ہاں تو آپ کہاں سے تشریف لائے ہیں؟ کون ہو
عزیزِ من؟"

اس تمہید کے بعد اس روز کوئی تین گھنٹے ہماری سیر حاصل
ملاقات رہی۔ کہاں تو ان کی نسبت یہ مشہور تھا کہ وہ کاٹ کھانے کو
دوڑتے ہیں اور کہاں یہ کیفیت جو میں نے دیکھی کہ بیچ میں تین چار مرتبہ
اٹھنا چاہا تو زبردستی بٹھا بٹھا لیا۔

ان سے اپنی پوری گفتگو قلمبند کرنے کے لئے تو ظاہر ہے کم از کم
تین ہی گھنٹے چاہئیں بہرحال خلاصہ کلام یہ کہ حکیم صاحب اپنے آپ کو
واقعی دیانتداری کے ساتھ وقت کا بوعلی سینا سمجھتے تھے۔ بوعلی سینا تو
خیر ان کے پیکر میں دوبارہ پیدا ہو ہی گئے تھے لیکن ان میں بقراط، سقراط،
ابونصر اور نہ جانے کن کن دوسرے حکمائے اجل کی خوبیاں بھی مجتمع تھیں
اس لئے ان کے نزدیک ان کے پایہ کا طبیب آئندہ پیدا ہی نہیں

ہو سکتا تھا۔ دنیا سے وہ شاکی ضرور تھے مگر کچھ اس طرح جیسے کوئی باپ نالائق اولاد کی شکایت کرتا ہو۔ انسانوں کو وہ چمگادڑ سمجھتے تھے جو چشمۂ آفتاب کی روشنی سے محروم ہے۔ فن میں اپنی عظمت کا شعور بدرجۂ اتم ان میں اتنا قوی تھا کہ اس پہ جان کی بازی لگا بیٹھتے اور حقائق سے کسی قیمت پر سمجھوتہ کرنے پر آمادہ نہ ہوتے۔ وہ کہتے تھے کہ رات ری کمزوری کے بعض لمحوں میں جب کبھی ان کے ذہن میں طب چھوڑ کر کوئی دوسرا دھندا کرنے کا خیال آیا تو اسی رات حکیم جالینوس۔ بقراط۔ خود حضرت بو علی سینا اور علم طب کے بعض دوسرے اعالی داکابر خواب میں آکر کبھی لعنت ملامت کرتے، کبھی ہاتھ جوڑ کر منت سماجت سے کہ دیکھو اس دور میں طب کی ایک ہی تو شمع فروزاں رہ گئی ہے۔ حکیم سینا دراصل ان ہاتھ الطبا میں سے تھے جو فن کو اس کی بقا کے لئے سینے سے لگائے ہوئے تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ نہ فن زندہ تھا نہ خود آپ۔ پھر بعض نازک مزاج باکمال شعرا کی طرح وہ اپنے آپ کو ایک مقدس قومی امانت سمجھتے تھے ان کی عزت و آسائش کے ساتھ زندہ رکھنا قوم کا فرض تھا اور ان کا اپنا فرض صرف اتنا تھا کہ بس وہ پیدا ہو گئے۔ میرا اپنا خیال یہ ہے کہ حکیم صاحب اگر "بو علی سینا" نہ ہوتے تو "میر تقی میر" ہوتے۔

بحر گر بحر نہ ہوتا تو بیاباں ہوتا

ہر چند وہ اب قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھے تھے مگر مستقبل کی طرف سے مایوس ہرگز نہ تھے۔ یہ سوچے بغیر کہ اس گلی میں بکری کا بچہ بھی گزر سکتا ہے یا نہیں، اس بات کا پختہ یقین تھا کہ قوم ایک دن ہاتھی گھوڑے لے کر ان کے دروازے پر پہنچے گی اور مرنے کے بعد ان کے جنازے پر خلق خدا کا ہجوم دیدنی ہوگا۔ انہوں نے بڑے تیقن کے ساتھ مجھ سے کہا تھا "میں اپنی کامیابی کو اس طرح دیکھ رہا ہوں جیسے اس وقت تمہیں دیکھ رہا ہوں مجھے بس ایک معرکے کے مریض کا انتظار ہے"

مجھے اعتراف ہے کہ میں حکیم صاحب سے اس پہلی ملاقات میں کافی متاثر ہوا تھا۔ ان کی مضبوط قوت ارادی حیرت انگیز تھی میں نے محسوس کیا کہ ملنے والا ترحم اور ہمدردی کی ملی جلی کیفیات کے ساتھ ان کی شخصیت کا ایک گونہ اثر ضرور قبول کرتا تھا۔ بالکل اس طرح جیسے کسی تاریخی قبرستان کے کھنڈروں میں ایک خاص عظمت و ہیبت کا احساس ہوتا ہے۔ اس ملاقات کے بعد مختلف وقفوں میں حکیم صاحب سے میری تین چار ملاقاتیں اور ہوئیں۔ میرے کاروبار کی نوعیت ایسی ہے کہ سال میں بمشکل ایک مرتبہ اپنے آبائی شہر میں آنے کی مہلت ہے مگر جب کبھی موقع ملتا میں حکیم صاحب کی خدمت میں ضرور حاضر ہوتا۔

ایک مرتبہ اثنائے گفتگو میں میں نے جدید زمانہ کے تقاضوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پروپیگنڈے کی اہمیت پر زور دینا چاہا تو حکیم صاحب اس طرح بھڑک اٹھے کہ ان کی عمر کا آدمی اس شدت سے بالعموم بھڑک ہی نہیں سکتا۔ غضبناک ہو کر بولے۔

"کیا کہا پروپیگنڈا؟"

"جی ہاں"

"جی نہیں مجھ سے یہ نہیں ہو سکتا۔ نہیں ہو سکتا۔ نہیں ہو سکتا۔ اب تم کہو گے کہ چوک میں جا کر مجمع بھی لگایا کروں! — صاحبزادہ صاحب مشک آنست ...... " اور پھر میز پر سے سفوف کی دو بوتلیں اٹھا کر باہر گلی کی بدرو میں پھینکتے ہوئے کہا۔ "یہ لو آج میں نے انسانوں کی بدبختی پہ ایک اور مہر ثبت کر دی۔ اگر کسی کتے نے اس نالی میں سے ایک بوند بھی پی لی تو دیکھ لینا کہ وجع المفاصل اور عرق النسا کے امراض سے محفوظ و مامون ہو جائے گا، مگر انسانوں کے لئے ان امراض کی شفا اب دنیا سے اٹھ گئی۔ اٹھ گئی —" اور حکیم صاحب خود بھی اٹھ کر کرب کی ایک خوفناک کیفیت میں ادھر سے ادھر ٹہلنے لگے۔

مدت کے بعد پھر حاضر ہونے کا اتفاق ہوا تو میز کی پانچ بوتلوں میں سے تین ہی سلامت رہ گئی تھیں۔ معلوم ہوا کہ اس درمیان میں آپ صرع اور سرطان کے بیماروں کا بیڑا بھی غرق کر چکے ہیں۔ اس مرتبہ ان کی امیدیں بڑی تیزی سے ایک ایسی مایوسی میں بدلتی جا رہی تھیں، جس میں انسانوں کے خلاف نفرت اور جذبہ انتقام کی جھلک صاف نظر آتی تھی۔ انہوں نے بیس برس کی بندھی ہوئی پگڑی کھول کر اس کی جگہ یہ عہد باندھ لیا تھا کہ اب میت ہی دہلیز سے باہر نکلے گی۔ ایک خدا ترس ہمسائے کی معرفت پرانی بوتلیں بیچ کر گزر اوقات کے مرتبان۔ ہاون دستے اور کھرلیں بیچ بیچ کر کھا رہے تھے۔ اپنا پلنگ موجود تھا مگر جھلنگی والی چارپائی غائب تھی۔ میں نے مزاج پرسی کی تو کہنے لگے۔

"اور تو کچھ نہیں، ہاں یہ صدمہ ضرور ہے شمس میاں کہ میں زندہ ہوں اور دنیا مرتی جا رہی ہے۔ مگر خیر۔ اللہ کے بھیجے ہوئے کتنے سچے رسول بھی بظاہر اپنے مشن میں کامیاب نہ ہو سکے"۔ اس

ملاقات میں یہ لطیفہ بھی ہوا کہ میرے بیٹھے بیٹھے خدا معلوم کہاں سے اور کیوں خاصی معقول وضع کا ایک مریض لنگڑاتا لنگڑاتا مطب میں آنکلا۔ میں خوش ہوا کہ شاید حکیم صاحب کی ساعتِ مراد آپہونچی مگر وہ تو اسے دیکھتے ہی آگ بگولا ہوگئے۔

"اب آئے ہو وجع المفاصل لے کر جب چڑیاں چگ گئیں کھیت"۔

"لیکن قبلہ" مریض بولا "میرا مرض ابھی کچھ زیادہ پیچیدہ نہیں ہونے پایا"۔

"جی ہاں" میں نے بھی مداخلت کی۔

"جی نہیں" حکیم صاحب بولے۔ "بندہ نواز اس مرض کی شفا اب انسانوں کے مقدر ہی میں نہیں رہی۔ اب تو لوگوں کو وجع المفاصل سمیت ہی جینا پڑے گا" پھر مجھ سے مخاطب ہو کر "میاں! میرا خیال ہے کہ خط نسخ کوفی میں اس مضمون کا طغرا لکھوا کر بازار میں آویزاں کرا دوں؟"

مجھے معلوم تھا کہ حکیم صاحب اس دوا کی بوتل ہی توڑ چکے ہیں مگر اس خیال سے کہ آیا ہوا مریض ہاتھ سے نکلنے نہ پائے میں نے پھر گذارش کی۔

"لیکن قبلہ وہ دوا دوبارہ بھی تو بنائی جا سکتی ہے جی ہاں"۔

"جی نہیں۔ وہ نسخہ مسلسل بارہ برس کی ریاضت چاہتا ہے اور وجع المفاصل کا مریض پانچ برس سے زیادہ نہیں ٹھہر سکتا"۔

یہ سنکر مریض کے پیر تلے کی زمین نکل گئی۔ پہلے اس نے کانسی کے پیالے میں صراحی سے پانی انڈیل کر پیا اور پھر پہلے سے بھی زیادہ لنگڑاتا ہوا واپس ہوگیا لیکن ابھی اس کی ایک ہی ٹانگ دہلیز کے پار ہوگی کہ حکیم صاحب بولے :-

"شمس میاں مجھے اس شخص کی جانا مرگی کا بڑا رنج ہوگا مگر کیا کر سکتا ہوں شمس میاں بخدا مجھے اس وقت کے تصور ہی سے ہول آتا ہے جب لوگ پاگلوں کی طرح پکار پکار کر مجھے آوازیں دیں گے مگر حکیم سینا اس دنیا میں نہیں ہوگا"۔

حکیم صاحب سے میری آخری ملاقات دلچسپ ترین ملاقات ثابت ہوئی۔ مطب کی ویرانی پہلے سے سوا تھی۔ میز پر صرف سفید گولیوں والی ایک سرمئی بوتل رہ گئی تھی۔ پلنگ تک اٹھ چکا تھا مگر چہرے سے وہ گھٹاٹوپ مایوسی چھٹ چکی تھی۔ جتنی بشاشت اس مرتبہ میں نے ان کے چہرے پر دیکھی پہلے کبھی نہ دیکھی تھی۔ مجھ سے تقریباً لپٹتے ہوئے بولے :-

"بھئی بڑے اچھے موقع پر آئے! آج میں اپنی زندگی کا سب سے بڑا تجربہ کرنے والا ہوں۔ زندگی کی سب سے بڑی کامرانی سے ہمکنار ہونے والا ہوں"۔ (میز والی بوتل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) "دیکھتے ہو یہ کیا ہے؟"

"جی ہاں۔ بوتل ہے"

"جی نہیں۔ بوتل نہیں ہے۔ میری زندگی ہے۔ اس میں علم طب کا وہ راز بند ہے جو آج تک نہیں کھل سکا۔ بس آج ہی کھلے گا"۔

"خوب۔ بہت خوب!"

"حیرت سے میرا منہ کیا تک رہے ہو؟۔ اس نسخے کے اجزا خود حضرت بو علی سینا رحمتہ اللہ علیہ نے عالم رویا میں اس عاجز پر منکشف فرمائے تھے اور فرمایا تھا کہ اس میں بقراط و سقراط کی روحیں بند ہیں۔ چاند اور ستارے بند ہیں!"

"یہ پھر تو واقعی بڑی عجیب چیز ہوئی"

"اور پھر حضرت نے فرمایا تھا کہ تمہاری زندگی میں فشار الدم کا ایک لاعلاج مریض آئے گا یہ گولیاں اس پر آزمانا!"

"تو پھر آپ نے آزمائی؟" میں نے شوق کی بیتابی میں پوچھا۔

"کس پر آزماتا۔ تم پر؟" وہ قدرے جھلا گئے۔ مگر فوراً ہی دھیمے بھی ہوگئے "آج تو وہ موعودہ مریض پہونچا ہے جس کی بشارت آج سے پچاس ساٹھ برس پہلے مجھے دی گئی تھی۔ اور ہاں۔ حضرت نے یہ بھی فرمایا تھا کہ اس کے بعد مجھ پر رزق۔ شہرت۔ عزت کے چالیس دروازے کھل جائیں گے۔ میں سمجھتا ہوں وہ مبارک ساعت آگئی ہے۔ مگر شمس میاں میں سوچتا ہوں کہ اگر مجھ پر اس طرح یکبارگی چالیس دروازے کھل گئے تو میں کس کس دروازے میں سے گذرا کروں گا؟"

اس کے بعد حکیم صاحب نے پورے تحمل کے ساتھ ساری روداد سنائی کہ فشار الدم کا ایک مایوس العلاج مریض کل اچانک ان کے ہاں آگیا تھا۔ خود مریض کو تو کچھ معلوم نہیں کہ اسے کیا مرض ہے مگر حکیم صاحب کی تشخیص تھی کہ اسے فشار الدم ہی کا عارضہ تھا۔ آج وہ معالجہ کے لئے مطب میں آنے والا تھا کیونکہ ان گولیوں کا تجربہ حکیم صاحب خود اپنے سامنے کرنا چاہتے تھے۔ گولیوں کے سلسلہ میں حکیم صاحب نے بتایا کہ بہت مدت ہوئی انہوں نے ایک ناگوری بیل پر دو گولیاں آزما کر دیکھی تھیں جس کا ردعمل خاطر خواہ نظر آیا تھا۔ بیل تو خیر ردعمل کے مہینے میں صرف اچھلتا کودتا ہی رہا لیکن حکیم صاحب کی رائے میں بیل کو دراصل بقراط اور جالینوس دکھائی دے رہے تھے۔ اس مرحلہ پر میں نے پوچھا کہ

آخر بقراط اور جالینوس کے نظر آجانے سے مرض کیونکر دور ہو سکتا ہے تو اس کے جواب میں حکیم صاحب نے اقبال کا یہ مصرع پڑھ دیا کہ ؎

"نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں"

ہم یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ سچ مچ مریض آگیا جو بظاہر ہٹا کٹا گنوار سا دیہاتی نوجوان تھا۔ بات کی تو محسوس ہوا کہ فشار الدم کا مریض تو ہو یا نہ ہو ذہنی خلفشار کا مریض یقیناً تھا۔ بدحواس، پریشان خیال، پریشان وضع۔ بہرحال حکیم صاحب نے صوفے ہی پر اپنے پاس بٹھا کر کنوئیں کے آبِ تازہ کے ساتھ دودھیا نقرہ میں لپٹی ہوئی ایک گولی اس کے حوالے کر دی جس کو حلق سے اتارنے کے بعد مریض فوراً بولا۔

"تلخی ہے۔" "ذرا منہ اندر دیکھئے" حکیم صاحب سنی ان سنی کر کے نبض تھام کر ردِعمل کے انتظار میں بیٹھ گئے۔ کچھ وقفے کے بعد مریض سے پوچھا۔

"کیوں میاں کیا کچھ محسوس ہو رہا ہے؟" جس کے جواب میں مریض نے دونوں آنکھیں بند کر کے گردن کو اس زور سے اپنی چھاتی پر پھینک دیا کہ اگر رگ پٹھے مضبوط نہ ہوتے تو کچھ عجب نہ تھا کہ گردن ٹوٹ کر باہر جا گرتی۔ حکیم صاحب بولے "اب ان پر غنودگی طاری ہو رہی ہے۔ ناگوری بیل پر بھی اسی طرح پہلے غنودگی طاری ہوئی تھی۔ پھر مریض کو خواب آتا ہے۔ پھر بقراط۔ جالینوس۔ چاند۔ ستارے۔۔۔۔۔۔" حکیم صاحب ردِعمل کے مختلف مراحل پر روشنی ڈال رہے تھے کہ ادھر مریض پر ردِعمل شروع بھی ہو گیا۔ ردِعمل کیا تھا اچھلنے کودنے کا ایک مضحکہ انگیز سلسلہ تھا۔ مریض صوفے سے اچھل کر میز پر جا بیٹھتا اور میز سے اچھل کر صوفے پر۔ حکیم صاحب جو نبض کو کسی حالت میں چھوڑنے پر تیار نہ تھے اس ردِعمل میں برابر کے شریک رہے۔ کچھ دیر کی اچھل کود کے بعد بالآخر مریض بیہوش ہو کر میز پر اس طرح جا لیٹا جیسے عامل کے سامنے معمول پڑا رہتا ہے۔ اس پر حکیم صاحب نے گرد و پیش پر یوں نظر ڈالی جیسے کوئی قلعہ سر کر لیا ہو۔

"لیجئے اب ردِعمل شروع ہوتا ہے۔"

"جی ہاں ۔۔۔"

"جی نہیں ۔۔ ابھی کیا ہے۔ آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا" ۔۔

(اور پھر مریض پر جھکتے ہوئے)

"کیوں میاں؟"

"ارے کچھ بولو تو سہی۔"

"ہاں بھئی۔ کہو کوئی چیز نظر آئی؟"

"ہاں ۔۔ کچھ ہے تو سہی"۔ مریض مری سی آواز میں بولا

"کیا ہے؟" حکیم صاحب فرطِ مسرت سے بچوں کی طرح اچھل کر بولے ۔ "کیا چیز ہے ۔ سورج ۔ چاند ۔ ستارہ ۔ انسان ۔۔"

"ابھی تو ایک لمبا سا کان ہی لٹک رہا ہے"

"الٰہی تیرا شکر ہے ۔۔ میاں میرا خیال ہے حکیم بقراط ابھر کر سامنے آ رہے ہیں۔ کتابوں میں آیا ہے کہ حکیم بقراط کے کان غیر معمولی طویل تھے (مریض سے) ہاں تو کوئی اور چیز بھی دکھائی دی؟"

"جی ہاں ۔ چھوٹی چھوٹی آنکھیں ۔ بڑے بڑے دانت ۔۔۔۔۔"

"شاباش! ۔۔ یہ سمجھو تمہارا نصف مرض جا چکا ۔۔ دیکھا تم نے میاں ان گولیوں کا طلسمی تصرف"

"جی ہاں" میں بولا ۔

"جی نہیں" حکیم صاحب جی ہاں کو کم ہی برداشت کرتے تھے ۔۔ "دیکھتے جائیے ۔ ابھی تو اس شخص کے کف دست پر شمس و قمر اترنے والے ہیں۔ بخدا اس وقت اگر یہ شخص چاہے تو پورے نظامِ شمسی کو اِدھر سے اٹھا کر اُدھر پھینک دے ۔ (مریض سے مخاطب ہو کر) ۔۔ ہاں تو میاں اور کچھ۔۔۔"

"دم! ۔۔۔ لمبی دم ۔۔" مریض یکبارگی چلایا۔ اس کی آواز میں خوشی کا جذبہ تھا۔ "دم؟" حکیم صاحب دم بخود ہو گئے ۔ "دم؟ شاید کوئی دم دار ستارہ طلوع ہو رہا ہے" ۔۔ اتنے میں مریض پورے زور سے چلایا ۔۔ "وہی ۔ بالکل وہی ۔ ہمارا اپنا کیدیا گدھا"

"گدھا؟ ۔۔ لاحول ولا قوۃ ۔ میرا خیال ہے مریض کو ایک اور گولی درکار ہے" حکیم صاحب میز پر سے بوتل اٹھا ہی رہے تھے کہ ناگاہ دو اجڈ سے دیہاتی مطب میں داخل ہوئے جن میں سے ایک نے آتے ہی زن سے ایک طمانچہ مریض کی کنپٹی پر جما دیا۔

"حرامخور کہیں کا ۔ کہاں بھیجا تھا اور کہاں آ کر لیٹا ہوا ہے ۔۔ اٹھ ہے ۔۔ اٹھتا ہے یا ۔۔" اور مریض اٹھ کر بیٹھ گیا۔ حکیم صاحب اور میں، دونوں ہکا بکا تھے کہ یہ کیا ماجرا ہے ۔ پتہ چلا کہ یہ لوگ ایک نواحی گاؤں کے کمہار تھے۔ کئی روز سے ان کا ایک گدھا کھو گیا ہے "مریض" ان کا ایک نیم فاتر العقل بھتیجا تھا جو تین دن سے گدھے کی تلاش میں نکلا ہوا تھا ۔۔

یہ سن کر حکیم صاحب نے سفید گولیوں والی وہ آخری بوتل بھی باہر نالی میں پھینک دی ٭

مشرقی بنگال میں تپ دق کی روک تھام: ـــــ بقیہ صفحہ [illegible]

اس کام کے لیے پاکستانی سٹاف کو تربیت بھی دی گئی۔ اس ماہرین مقامی باشندوں کو تربیت دینے کا کام سب سے اہم سمجھا جاتا ہے۔ کیونکہ جب تک نئے طریقوں اور آلات کے استعمال کرنے والے نہ ہوں، ان سے خاطر خواہ فائدہ نہیں اٹھایا جا سکتا۔

عالمی ادارۂ صحت کے بین الاقوامی ماہروں کی ٹیم کے افسر اعلیٰ ڈاکٹر ماریو ڈی مارکی اٹلی کے باشندے ہیں اور تپ دق کے متعلق یورپ کے بڑے بڑے ہسپتالوں میں مدت تک علاج معالجے کے تجربے حاصل کر چکے ہیں۔ ان کے ہمراہ تپ دق کے مریضوں کی دیکھ بھال کرنے کے لئے مس ایشٹن نرس کے طور پر آئی تھیں۔ یہ برطانیہ کی رہنے والی ہیں، اور اپنے کام میں بین الاقوامی شہرت کی مالک ہیں۔ سنٹر میں ایکسرے کی مشین اور دوسرے آلات اقوام متحدہ کے بچوں کے امدادی فنڈ نے دئیے تھے اور ڈھاکہ یونیورسٹی کے قریب ایک خوبصورت عمارت کہ جس میں یہ سنٹر قائم کیا گیا تھا مشرقی پاکستان کی حکومت کا عطیہ تھی۔ اس طرح اس منصوبے کو صحیح معنوں میں اقوام متحدہ کے فنی امداد کے پروگرام کا ایک کامیاب نمونہ کہا جا سکتا ہے۔

ڈھاکہ سنٹر کا سب سے بڑا کارنامہ اس شہر کے باشندوں میں اس بات کا احساس پیدا کرنا ہے کہ تپ دق کے خلاف سب شہریوں کو مل کر جدوجہد کرنی چاہیئے۔ اور اس جدوجہد کو کامیاب بنانے کے لیے ان کے اپنے شہر میں ایک ایسا مرکز قائم ہے کہ جہاں سے انہیں ہر قسم کی امداد مل سکتی ہے۔

ڈھاکہ کنٹرول سنٹر کی عمارت میں داخل ہوتے ہی سب سے پہلے نظر ڈھاکہ شہر کے ایک بہت بڑے نقشے پر پڑتی ہے جو ایک بورڈ پر بنایا گیا ہے۔ اس نقشے پر محلوں، گلیوں اور کوچوں پر جگہ جگہ سبز رنگ کے موٹے موٹے پن لگے ہوئے ہیں۔ اس سے مراد یہ ہے کہ ان مقامات تک ڈھاکہ سنٹر کے ہوم وزیٹر گھر گھر پہنچ چکے ہیں۔ یہ کام کیسے ہوتا ہے اس کی داستان اپنی جگہ بڑی دلچسپ ہے۔ پاکستانی مردوں اور عورتوں کو ڈھاکہ سنٹر میں [illegible]ء میں اس کام کی تربیت دی گئی تھی۔ پہلے کورس کی کامیابی اس قدر ہمت افزا تھی کہ اسی سال ہوم وزیٹروں کی تربیت کا دوسرا کورس شروع کیا گیا، اور اس نصاب کی تکمیل بھی وقت پر ہو گئی۔ یہی ہوم وزیٹر اب ڈھاکہ شہر کے مختلف علاقوں میں گھر گھر جا کر تپ دق کے مریضوں کو مشورے اور ہدایتیں دیتے ہیں۔

ڈھاکہ سنٹر میں ہر ہفتے سینکڑوں مریض پھیپھڑوں کا ایکسرے لینے کے لئے آتے ہیں۔ ایکسرے کی تصاویر کے بغیر تپ دق کا علاج ناممکن ہے۔ اور اب تک مشینیں نہ ہونے کی وجہ سے صحیح طریقے سے علاج نہیں ہو سکتا تھا۔ اب بغیر کسی خرچ کے ایکسرے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ شروع میں ایکسرے کی مشین پر کام کرنے کے لیے عالمی ادارۂ صحت کے ایک ماہر کی خدمات حاصل کی گئی تھیں)۔ اب یہ کام ایک پاکستانی کی نگرانی میں ہوتا ہے۔ اور تصویروں کو مکمل کرنے کے مختلف مرحلے بھی پاکستانی کاریگروں کے ہاتھ سے تکمیل پاتے ہیں۔

اقوام متحدہ کے فنی امداد کے پروگرام کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ اسے ایک منصوبے کی صورت میں شروع کیا جاتا ہے۔ اور اس منصوبے کو ابتدا میں غیر ملکی ماہر شروع کرتے ہیں۔ مگر ہر ہر قدم پر اس کی تکمیل میں مقامی ماہروں کو کام سکھایا جاتا ہے۔ تاکہ کچھ عرصے بعد جب یہ منصوبہ پایۂ تکمیل کو پہنچ جائے تو بین الاقوامی ماہر واپس چلے جائیں اور پورا کام مقامی باشندوں کے ہاتھ میں آ جائے۔ یہی حال ڈھاکہ کے کنٹرول سنٹر کا ہے۔ ۲ سال تک اس کام کو سکھلانے کے بعد اب بین الاقوامی ماہر آہستہ آہستہ واپس جا رہے ہیں اور ان کی جگہ وہ پاکستانی ماہر کام کر رہے ہیں جنہیں اس منصوبے کے ماتحت خاص طور سے تربیت دی گئی تھی۔ اب صرف ڈاکٹر ڈی مارکی باقی رہ گئے ہیں لیکن ان کا تعلق بھی ڈھاکہ کنٹرول سنٹر کی نسبت ان دوسرے مرکزوں سے زیادہ ہے جو تمام مشرقی پاکستان میں تپ دق کی روک تھام کے لئے بہت جلد کھولے جانے والے ہیں۔

[illegible]ء میں وہ مرکز جو پہلی بار ڈھاکہ میں تجربہ کے طور پر قائم کیا گیا تھا آج تمام مشرقی ایشیا میں اپنی قسم کا بہترین ادارہ بن چکا ہے۔ اس تجربے کی روشنی میں [illegible]ء کے شروع میں اسی قسم کے تین اور مرکز مشرقی بنگال کے دوسرے ضلعوں میں کھولے جا چکے ہیں۔

ڈھاکہ شہر میں تپِ دق کے مریضوں کے لئے ایک بڑا ہسپتال تقریباً مکمل ہو چکا ہے جس میں دو سو مریض بیک وقت زیرِ علاج رہ سکیں گے۔ بہت جلد اسی قسم کے دو اور ہسپتال بھی جلد مکمل ہو جائیں گے۔ مشرقی بنگال میں آمد و رفت کے ذرائع میں ناؤ اور کشتی کو بہت بڑا دخل ہے۔ یہ تجویز بھی زیرِ غور ہے کہ تپِ دق کے گشتی ہسپتال کشتیوں میں قائم کئے جائیں تاکہ دور افتادہ قصبوں اور دیہات تک ان کی پہنچ ہو سکے۔ حال ہی میں عالمی ادارہ صحت نے فیصلہ کیا ہے کہ دوسرے ملکوں کے ڈاکٹروں کو تپ دق کی روک تھام کا کام سکھانے کے لئے ڈھاکہ کے سنٹر میں بھیجا جائے۔ کیونکہ یہ اپنی قسم کا سب سے نیا اور کامیاب مرکز ہے۔

آج سے دو سال پہلے ۱۹۵۳ء کے حالات کا مقابلہ آج سے کیجئے تو حیرت ہوگی کہ جہاں تپ دق کے مریضوں کی دیکھ بھال کیلئے کوئی سامان نہیں تھا اب اسی جگہ تین ہسپتال زیرِ تعمیر ہیں یا مکمل ہو چکے ہیں، اور تمام صوبے میں اسی قسم کے چودہ مرکز کھولے جا رہے ہیں۔

اقوامِ متحدہ کے فنی امداد کے خاموش عمل کارناموں کی یہ ایک عمدہ مثال ہے۔

تجلی: —— بقیہ صفحہ ۲۲

کہنے لگا کہ یہ پہن لو اور ساری اتار دو —— اور کونے میں جا کے چپ چاپ کھڑی ہو جاؤ —— میں تمہاری تصویر کھینچے دیتا ہوں۔"

تحیر اور خوف زدہ گلتانی کے چہرے کا نقش مراد کی آنکھوں کے سامنے پھر گیا —— اس کے خوف زدہ بھاگنے کا انداز۔

"لیکن حضور، کیا ہی نوکھی جوانی ہے اس کے سارے بدن میں جھلکتی ہے۔ بات چیت میں بھی ذرہ برابر جھجک نہیں —— تعجب ہے۔"

اچانک کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا اور —— دبی آواز میں کہا؛ دروازہ کھولئے۔ مراد چونک پڑا۔ ڈرتے ڈرتے پوچھا: کون؟

مراد کے دروازہ کھولتے ہی گلتانی گھر کے اندر آ گئی۔ احتیاط سے دروازہ بند کر دیا اور کہا: جلد چلئے میرے ساتھ —— کپڑا لتا جو اور جیسا بھی ہے جلدی جلدی سمیٹ لیجئے۔ مگر کیوں؟ مراد نے پوچھا۔ سارے گاؤں کے لوگ آپ سے بگڑ گئے ہیں۔ کل وہ آپ کو مار ڈالیں گے۔

مارے خوف کے مراد کا سارا جسم سن پڑ گیا۔ مگر اس نے کہا: میں پروا نہیں کرتا۔

"کیا مطلب؟

میں مرنے سے ڈرتا نہیں!

مرنے سے نہیں ڈرتے، مارے تو ڈرنا چاہئے۔

گلتانی ہنسنے کو تھی، مگر رک گئی۔

مراد نے کہا: میں تمہارے ساتھ نہیں جاؤں گا۔ خدا جانے اور کس مصیبت میں ڈال دو گی۔ تم ہی نے تو شکایت کر کے یہ فتنہ برپا کیا ہے۔

گلتانی نے کہا: میں نے تو کچھ نہیں کہا —— آم کے پیڑ پر چھپ کے دو آدمیوں نے ہمیں دیکھا۔ انہوں نے جا کے سب سے کہہ دیا اور بھی بہت سے جھوٹے الزام لگائے۔ خدا جانے کیا کیا کہا۔ یہ دیکھئے ان نے مجھے کتنا مارا ہے۔

گلتانی نے مراد کا ہاتھ پکڑ کے کھینچا، چلئے جلدی کیجئے۔ ناؤ گھاٹ پر لگی ہوئی ہے کسی نے بھانپ لیا تو پھر بچنا مشکل ہے۔

بارش میں گلتانی بالکل بھیگ گئی ہے بھیگی ہوئی ساری اس کے بدن سے چمٹ گئی ہے، بری طرح لپٹی ہوئی ہے۔ گلتانی کو اس عالم میں دیکھ کر مراد کا دل بے اختیار ہو گیا۔

مراد نے کہا: تم چلو گی میرے ساتھ گلتانی!

کہاں؟

کلکتے۔ میرے گھر۔

مجھے لے جا کے آپ کیا کریں گے؟ جانگیا پہنا کے تصویر کھینچیں گے۔

گلتانی دبی آواز میں کھکھلا کے ہنس پڑی۔

شادی کروں گا میں تجھ سے۔

آپ نے اب تک شادی نہیں کی؟

نہیں۔ ایسا موقع کہاں ملا کہ اس ذلیل گاؤں میں پڑی سڑتی رہو گی یہاں کوئی تمہاری پوری طرح قدر نہیں کرے گا۔ مجھے کا کبھی نہیں تمہاری اصلی قدر و قیمت۔

گلتانی مراد کی طرف نظر جمائے چند لمحے دیکھتی رہی پھر بولی: چلئے ناؤ میں گنجر اکیلا ہے۔

گنجر کون؟



مکتا نے مسکرائی۔ نانو میں آئیے۔ دیکھتے رہئے ہم بھی بھاگ رہے ہیں۔ میں اور گنجر۔

شہر کے کارخانے میں اسے نوکری مل گئی ہے۔ ہم دونوں وہیں گھر بنا کے رہیں گے۔ مراد احمقوں کی طرح دیکھتا رہا۔

دور ایک اور بجلی گری۔

اردو شاعری میں ہیئت کے تجربات: ـــــ (ابیہ عمر)

بھرنے کی پوری قوت تھی۔ ظاہر ہے اس قدر طویل سلسلے کو ایک ہی سانس میں پیش نہیں کیا جا سکتا تھا۔ چنانچہ راشد نے ایک بار پھر انگریزی کا سہارا لیا۔ اور وہاں کے کینٹو کی صورت میں اپنے خیالات کو پیش کرنے کا سامان کیا۔ کینٹو کا لفظ اطالوی ہے جس کے معانی گیت یا نغمہ گانا، دلکش موسیقی وغیرہ وغیرہ بہت کچھ ہیں۔ لیکن قدیم ایام سے جب شعر بیشتر گانے ہی کے لئے ہوتا تھا، کینٹو کا مفہوم طویل نظموں کے درمیانی وقفوں ہی کا تھا۔ انگریزی شاعری میں اکثر بڑے شعرا نے طویل نظمیں لکھی ہیں اور ان کو مختلف حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ ہر حصے کو ایک کینٹو کہا جاتا ہے۔ راشد نے بھی اپنی نظم "ایران میں اجنبی" کو تقریباً تیس حصوں میں تقسیم کرنے کا ڈھانچہ بنایا ہے۔ اس نظم کے بعض کینٹو چھپ چکے ہیں جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اول تو نظم آزاد کے سانچے میں ڈھالے گئے ہیں، دوسرے ہر کینٹو میں مصرعوں کی تعداد مختلف ہے جو اتی سے لے کر چار سو سے اوپر تک پہنچتی ہے۔

"ایران میں اجنبی" ابھی ہمارے سامنے مکمل طور پر نہیں آئی تھی کہ ایک اور شاعر جعفر طاہر نے ایسے ہی کینٹو کی صورت میں ایک اور طویل نظم پیش کرنا شروع کی۔ یہ میر امن کے "قصہ چہار درویش" کے انداز پر مختلف درویشوں کی سیروں کا تذکرہ ہے جو نا ڈھال میں مختلف ملکوں کی تہذیب و معاشرت میں ہر لحظہ بدلتے ہوئے جدید رجحانات کو دیکھتے ہیں۔ اس نظم میں قدیم و جدید کی ایک دلچسپ آویزش ملتی ہے جو نہ جانے نظم کے ختم ہونے تک بالآخر کس نتیجے پر پہنچے گی۔ جعفر طاہر کی یہ نظم راشد کے برعکس پابند شاعری کا نمونہ ہے جس میں بندوں کی ساخت اور ان کے مصرعوں کی تعداد اکثر یکساں ہے۔ کینٹو کے میدان میں ابھی تک صرف یہی دو نامکمل نمونے ہمارے سامنے آئے ہیں۔ اس لئے اس صنف کے بارے میں ابھی کوئی پیشگوئی کرنا قبل از وقت ہے تاہم اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ جدید تجربوں سے ہم آہنگی کے لئے اس قالب میں خاص جان ہے۔

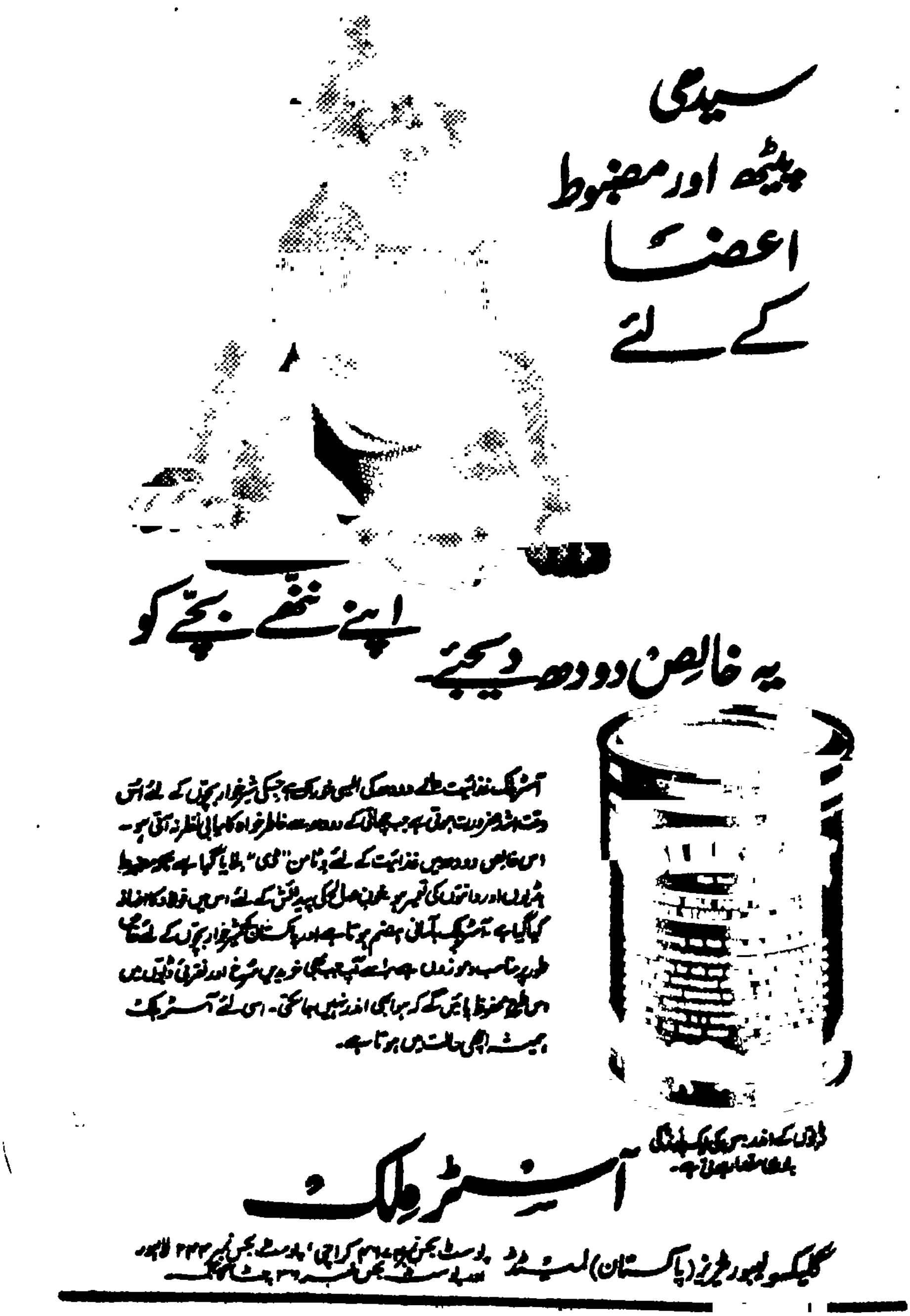
(بشکریہ ریڈیو پاکستان لاہور)

شہید ملت: (بقیہ صفحہ ۱۶)

وزارت مرتب کرنے کے سلسلے میں مقیم تھے۔ اس سے چند دن پہلے راولپنڈی کی سازش کا واقعہ ہو چکا تھا۔ گفتگو کے دوران میں اس سازش کا حوالہ دیتے ہوئے میں نے قائد ملت سے کہا۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ جب آپ کو یہ معلوم تھا کہ یہ سازش ہو رہی ہے تو آپ نے پورے صوبے کا دورہ کر کے جگہ جگہ جلسوں کو اس طرح کیوں خطاب کیا، جس میں آپ کی جان کا اندیشہ تھا؟ قائد ملت یہ سن کر مسکرانے لگے اور کہا کہ جب میں کراچی سے پنجاب کے دورہ پر روانہ ہوا تو ملتان پہنچنے پر مجھے سازش کی اطلاع مل گئی تھی۔ اگر کوئی اور ہوتا تو بیماری کا بہانہ کر کے کراچی لوٹ جاتا۔ کہنے لگے کہ لوگ کہتے ہیں مگر میرا تو یہ ایمان ہے کہ موت کا ایک وقت مقرر ہے، وہ آگے پیچھے نہیں ہو سکتا۔ اس لئے موت کے خوف سے اپنے کام کو بند کر دینا ضعف ایمان کی نشانی ہے۔ جب تک خدا کو مجھ سے پاکستان کی اور اس قوم کی خدمت لینی منظور ہے وہ مجھے زندہ رکھے گا۔ کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ جب میرا وقت آ جائے گا تو تمہاری یہ پولیس اور فوج مجھے موت کے ہاتھوں سے بچا سکتی ہے؟ یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ ایک سفاک نے ایسی ہستی کو ہم سے چھین لیا جس نے ملک اور قوم کی بے لوث خدمت کی اور پاکستان کی بنیادوں کو ایک قلیل عرصے میں مضبوط بنایا۔ رخصت ہوتے وقت بھی مملکت پاکستان اور ملت کی ترقی اور سربلندی کی دعا ان کے لب پر تھی۔ وہ ہم سے رخصت ہو گئے، مگر ان کی محبت ہمارے دلوں پر نقش ہے۔ ان کا غم آج بھی تازہ ہے۔ قائد ملت آج ہمارے درمیان نہیں ہیں، مگر ان کے زریں اصول، ان کا اعلیٰ عمل اور ان کا قابل تقلید کردار آج بھی ہمارے سامنے ہے اور ہر لحظہ ہماری رہنمائی کر رہا ہے۔

ع
مرنے والوں کی جبیں روشن ہے اس ظلمات میں
جس طرح تارے چمکتے ہیں اندھیری رات میں

(بشکریہ ریڈیو پاکستان۔ کراچی)


سیدھی
پیٹھ اور مضبوط
اعضا
کے لئے
اپنے ننھے بچے کو
یہ خالص دودھ دیجئے
آسٹر ملک غذائیت والے دودھ کی ایسی خوراک ہے جس کی شیرخوار بچوں کے لئے اس وقت اشد ضرورت ہوتی ہے جب ماں کے دودھ سے خاطر خواہ کامیابی نظر نہ آتی ہو۔
اس خالص دودھ میں غذائیت کے لئے وٹامن "ڈی" ملایا گیا ہے تاکہ مضبوط ہڈیوں اور دانتوں کی تعمیر ہو۔ خون صالح کی پیدائش کے لئے اس میں فولاد کا اضافہ کیا گیا ہے۔ آسٹر ملک آسانی سے ہضم ہوتا ہے اور پاکستانی شیرخوار بچوں کے لئے خاص طور پر مناسب ہے۔ اسی لئے آسٹر ملک ہمیشہ اچھی حالت میں ہوتا ہے۔
آسٹر ملک
گلیکسو لیبوریٹریز (پاکستان) لمیٹڈ

اردو کے غیر معروف ناول ۔۔۔۔ (بقیہ صفحہ ۱۱)

نہیں ہمراہ دیکھ کر بڑا مانتے اور شاید میرے معاملات میں کچھ شکلیں
ہو جاتیں بلکہ ممکن تھا کہ ناکامیابی ہوتی۔ وہاں کے اکثر لوگ مجھے اتنی
بڑی جائداد کی وارثہ سمجھ کے امید موہوم سے خوشامد میں کام کریں گے۔
یقین ہے کہ بہت جلد کل جائداد لقد و جنس میرے قبضے میں آجائے
میرے اندازے سے تین ماہ میں بالکل درست ہو جائے گی۔ اس کے بعد
معلوم پھر وہاں نہ ٹھیروں گی۔ اس درمیان میں تم کو خطوط لکھتی رہوں گی۔
اس میں شک نہیں کہ تم مجھے وفادار جانتے ہو، مگر مزید اطمینان کے لئے
میں نے لکھنؤ کی کل جائداد کا بیع نامہ تمہارے نام کردیا ہے۔ کاغذات
وری میرے بکس میں موجود ہیں۔ جس وقت تم کو یہ خط ملے گا میں بمبئی
سے بہت دور نکل گئی ہونگی۔ تم آج ہی لکھنؤ چلے جاؤ، اور تین مہینے انتظار
کرو۔ خدا وہ دن کرے گا کہ ہم تم دونوں باغ کے صحن میں شام کے وقت
بیٹھے ہونگے، کھانا ہوتا ہوگا۔ تم اپنی غزلیں پڑھتے ہوگے میں سنتی ہونگی۔
بعد روزانہ انتظار کرو۔ فقط۔ راقمہ،

تمہاری سوفیہ"

"مکرر یہ ہے کہ میرے باغ کو درست رکھنا۔ جرانیم کے درخت جو
میں نے نئے لگائے ہیں ان کا مجھے بہت خیال ہے۔ مالی پر تاکید رکھنا"

اس خط کو دیکھ کر مرزا رسوا کے دل پر جو کچھ صدمہ گزرا گزرا مگر پھر
ان کو تسکین دے کے لکھنؤ چلے آئے۔ ایک خط عدن سے آیا تھا۔ دو تین
ماہ پیرس سے آئے تھے۔ ان میں مقامات کا مفصل حال تھا۔ اس کے بعد
پیرس سے روانہ ہوتے وقت ایک تار دیا:۔

"ہم آج یوٹوپیا نامی جہاز پر ہندوستان روانہ ہوتے ہیں"۔
اس کے آنے کے بعد دن گنے، مرزا رسوا گھڑیاں گننے لگے۔ مگر وہ جہاز نہ آج آتا
ہے نہ کل۔ مرزا رسوا کے دوستوں کا اور کچھ خیال ہے مگر اس کا ذکر مناسب
نہیں سمجھنے والے سمجھ ہی لیں گے۔

روز سر شام تمام باغ میں چھڑکاؤ ہوتا ہے۔ درختوں کی ایک ایک
دھوئی جاتی ہے۔ جابجا فانوس روشن کردئے جاتے ہیں۔ صحن
بیچوں بیچ ہے پھر کرسیاں بچھائی جاتی ہیں۔ جرانیم کے نئے گملے لگائے
جاتے ہیں مرزا رسوا خود بیٹھتے ہیں۔ غزلوں کی بیاض سامنے رکھی جاتی
ایک کرسی کے سامنے ارگن باجا لگا دیا جاتا ہے نگاہیں دروازے
کی طرف لگی رہتی ہیں۔ آج تک اس معشوقۂ وفادار کا انتظار ہے۔ اس کو
پندرہ برس ہو گئے۔ مگر ان کے ہوش و خرد میں کسی طرح کی کمی نہیں
ہوئی۔ دن بھر اچھے رہتے ہیں مگر شام کو اس جنون کا دورہ ہوتا ہے۔
دل قابو سے نکل جاتا ہے۔ خدا ان کے حال پر رحم کرے ؎

موت آجائے گی اک دن یہی کہتے کہتے
آج آتا ہے، کل آتا ہے کہیں سے کوئی

کشمکش ۔۔۔۔ بقیہ صفحہ ۲۵

طرف اشارہ کرکے چلا رہی تھی۔ اللہ ڈنو کو کچھ نہ سوجھا۔ اندر جاکر وہ
ٹین کے ڈبے اٹھا لایا۔ دونوں ان لکڑیوں سے بجانے لگے اور کھیتی کی
طرف دوڑ پڑے۔ وہ بے تحاشا بھاگے جا رہے تھے۔ ٹڈیوں کی تعداد
بتدریج بڑھ رہی تھی۔ "ادھر دیکھنا۔ غضب ہو گیا" جنت چیخی۔

ایک زبردست ٹڈی دل تا حد نگاہ آسمان پر پھیلا ہوا بڑھتا
چلا آرہا تھا۔ یکایک دھوپ غائب ہو گئی اور ٹڈیوں کا سایہ چھا گیا۔
جہاں کہیں سبزی تھی اس پر ٹڈیاں ٹوٹی پڑتی تھیں۔ اللہ ڈنو نے کھیت
کے چاروں کونوں پر آگ لگا دی۔ دونوں دیوانوں کی طرح ٹین کے
ڈبے بجاتے اور ہا ہو کرتے رہے۔ لیکن سب تدبیریں بے سود
ثابت ہوئیں۔ بڑی بڑی ٹکڑیاں ٹڈی دل سے ہٹ کر شاداب فصل پر
بیٹھنے لگیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے ساری فصل پر ان کی چادر بچھ گئی۔ پودے
درخت، ہر جگہ جو سبز ہو ٹڈیوں سے پر تھی۔ اب بھی ان کا ایک سیلاب
ہواہیں بہتا آگے بڑھ رہا تھا۔ جنت کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور
اللہ ڈنو خاموش تھا۔ دونوں گھنٹوں اپنی کھیتی برباد ہوتے دیکھا
کئے۔ نہ اللہ ڈنو نے جنت کے نالہ و شیون کو روکنے کی کوشش کی
اور نہ جنت نے اس سے غمگساری کی فکر کی۔ رات بھیگنے پر وہ اپنی
جگہ آ گئے۔ کسی نے کچھ کھایا نہ پیا۔ جانوروں کا دودھ دوہنے کی کسے
سدھ تھی۔ نگاہیں کھیت پر لگی تھیں اور دونوں اپنے خیال میں غرق
تھے۔ جنت کبھی کبھی دبی آہ کے ساتھ کہہ اٹھتی "ہائے! ظلم ہو گیا!"

"رونے دھونے سے فائدہ؟" اللہ ڈنو صبر کا پتلا بنا ہوا تھا۔
یہ سن کر جنت اور چلانے لگی۔ بہت دیر بعد دونوں کے ہوش ٹھکانے

ہوئے۔ شوہر نے بیوی سے کہا "دیکھو بیٹھنے کو ہے۔ شبنم دیر سے گر رہی ہے۔ ٹڈیاں اڑ نہ سکیں گی۔ اب چل کر جتنی ہو سکیں پکڑ لیں۔ چند دن انہی پر گزارا ہو جائے گا۔"

جنت کچھ نہ بولی۔ اٹھ کر اندر سے چند بورے لے آئی۔ پانی بھر کر ایک بڑے برتن کو چولہے پر رکھ دیا۔ پانی میں نمک ملانے کے بعد بورے لے کر اپنے شوہر کے ساتھ ہو لی۔ ٹڈیوں کے پر بھاری ہو چکے تھے۔ دونوں نے بورے اس طرح بھرے جیسے فصل پر باجرا۔ انہیں گرم پانی میں ڈال کر تھوڑی دیر بعد زمین پر پھینک دیتے۔ سورج نکلنے تک انہوں نے ٹڈیوں کا ایک ڈھیر لگا دیا۔ اللہ ڈنو کا دل چاہنے لگا کہ وہ ساری ٹڈیوں کو اسی طرح بھون ڈالے، لیکن وہ اپنی جھونپڑی کے آنگن کی ساری ٹڈیاں بھی نہ مار سکا۔ پر سوکھنے کی دیر تھی کہ کھیت پر سے ٹڈیوں کا ایک جم غفیر اٹھا اور آندھی کی طرح آگے بڑھ گیا اور پیچھے ایک اجڑا ہوا میدان چھوڑ گیا!

ان سب کا حاصل وہ چند بوریاں تھیں جو اب اونٹ پر لدی تھیں۔ یہ اونٹ بھی بچی کچی گھاس اور تمام جانوروں کے بدلے خریدا گیا تھا۔ جب بوروں پر نظر پڑی تو قسمت خالی نظر آئی لیکن جنت سامنے آ رہی تھی۔ بیوی نے اونٹ پر بیٹھنے کے لئے میاں سے اصرار کیا۔

"تم آرام سے بیٹھو۔ میں پیدل چلوں گا۔" اللہ ڈنو نے جواب دیا "لوگ کہتے ہیں آندھیاں ۔۔۔ میں احتیاط بہت ضروری ہے۔"

وہ پھر شہر جا رہا تھا۔

اپنا گھر ۔۔۔۔ بقیہ صفحہ ۳۵

۔ کاش وہ لائبریری کے لئے گنجائش نکال سکتا۔" اس میں بڑی تبدیلیاں کرنی ہوں گی ابو۔" حامد نے باپ کو خاموش دیکھ کر کہا "ہم دونوں کے لئے نیچے ہی جگہ نکالئے نا۔ یہاں آپ اپنے لئے کمرہ بنوا سکتے ہیں۔ دوسری منزل کی خوابگاہ، جہاں خانہ بن سکتی ہے۔ یہ رضیہ ٹھیک کہہ رہی ہے۔ اس کا کمرہ بھی نچلی منزل ہی پر ہونا چاہئے۔ میرے کارخانے کیلئے تو آپ کو جگہ نکالنی ہی ہوگی۔ اب اس [illegible] والی کوٹھی میں دیکھئے کتنی آسانی سے انہوں نے میرے لئے جگہ نکالی تھی۔ رضیہ کی طرح دراصل ابو مجھے اپنے کمرے اور کارخانے سے بے حد محبت ہو گئی ہے۔ اب اگر ہم یہاں سے کہیں اور گئے اور وہ جگہ ویسی نہ ہوئی تو ہمیں بہت دکھ ہوگا۔"

"اس کا مطلب یہ کہ یہ نقشہ بیکار ہو گیا۔ اس میں اب اتنی بہت سی تبدیلیوں کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔" شاہد نے سگریٹ ایش ٹرے میں رکھتے ہوئے کہا۔ "پھر

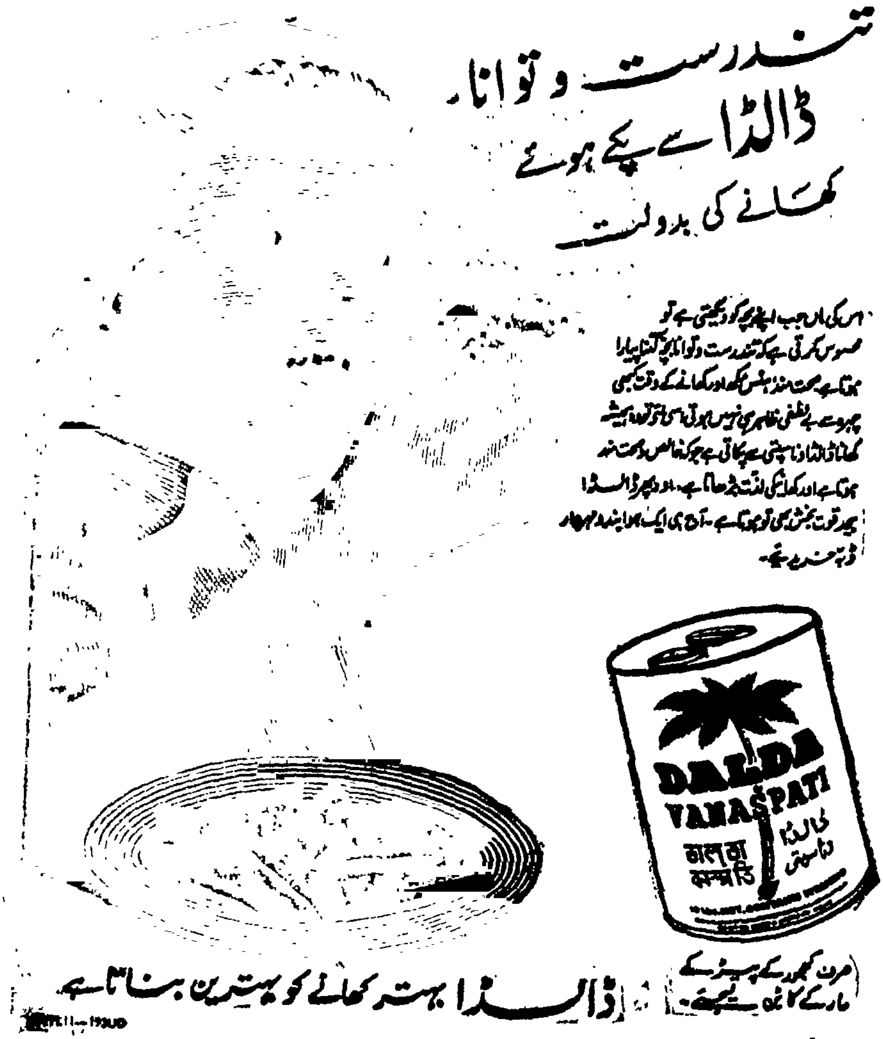
لینے لگی۔ "ہاں واقعی۔ اس میں تبدیلیوں کی کوئی گنجائش نہیں کس قدر مکمل ہے یہ۔" اس نے سوچا اور یوں ہی غیر ارادی طور پر اس کی نگاہیں رضیہ تک گئیں جو بستر پر زرد زرد سی خاموش لیٹی باپ کو دیکھ رہی تھی۔ وہ کتنی پیاری اور اداس لگ رہی تھی۔ نہ جانے کیوں ذکیہ کو اس کی آنکھوں میں ایک عجیب مایوسی نظر آئی اور وہ بے چین ہو گئی۔ یکایک اس کے ذہن میں ایک خیال آیا اور اس نے کھوئے کھوئے سے انداز میں کمرے کی ہر شے کا جائزہ لیا اور پھر شاہد سے قریب ہو کر وہ آہستہ سے بولی، یوں جیسے آپ ہی آپ بڑبڑا رہی ہو۔

"آخر اس کوٹھی میں کیا خرابی ہے جو ہم نئی کوٹھی کی آرزو کر رہے ہیں؟ حامد کا اچھا خاصا کارخانہ بھی ہے۔ اس سے ملحق باغیچہ ہے۔ رضیہ کا کمرہ بھی اچھا ہے اور نچلی منزل پر ہے۔ ہوادار ہے، خوبصورت ہے، بڑا دریچہ بھی ہے جس میں سے سورج کی پہلی کرنیں اندر آتی ہیں۔ خود مجھے اپنی خوابگاہ بہت پسند ہے جو بچوں کے کمروں سے قریب ہے اور نچلی منزل پر ہے۔ نئے نقشے میں تو ہماری خوابگاہ دوسری منزل پر ہے۔"

ذکیہ کی باتیں شاہد کو کچھ عجیب سی لگیں اور اس نے ذرا غور سے اپنی بیوی کو دیکھا اور یکایک ایک خیال اس کے ذہن میں ابھرا۔ یہاں لائبریری بھی تو ڈرائنگ روم سے علیحدہ بنا ہے۔ دونوں کی نظریں ملیں اور دونوں نے ایک ساتھ محسوس کیا جیسے آج پہلی بار انہیں اس کوٹھی کی خوبیاں معلوم ہوئی ہوں، جیسے پہلی بار وہ یہاں آئے ہوں اور اپنے اس گھر کو ڈھونڈ نکالا ہو، اس کے تمام راز پا لئے ہوں ۔۔۔ ان کا یہ اپنا گھر جس میں پہلی بار ذکیہ دلہن بن کر آئی تھی، جہاں شادی کے بعد انہوں نے ابتدائی چند ہفتے ہنسی خوشی گزارے تھے، جہاں ان کے بچے پیدا ہوئے تھے، جہاں رضیہ نے ہوش سنبھالا تھا اور حامد نے بوڑھے دادا کے ساتھ بے شمار ہوائی جہاز بنائے تھے جن کے خوبصورت باغیچے سے برسوں اس نے اپنے بچوں کے قہقہے، ان کی چیخ پکار سنی تھی ۔۔۔ یہ گھر جو ان کی زندگی میں، ان کے ماضی اور اس کی بے شمار یادوں میں کچھ اس طرح رچ بس گیا تھا کہ اسے خیرباد کا خیال ہی کس قدر تکلیف دہ تھا۔ جو اینٹوں اور سیمنٹ کا ڈھانچہ نہیں تھا، بلکہ شاید ان کے عزیز ماضی نے اس گھر کا روپ کچھ اس طرح اختیار کر لیا تھا کہ اب وہ جب بھی ایک نئے گھر کا۔ اپنے گھر کا تصور کرتے، تو وہ کرنل واجد کی اس کوٹھی سے زیادہ مختلف نہ ہوتا۔

کمرے میں سب خاموش تھے، دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا ایک دوسرے کی آنکھوں کا خاموش پیغام پڑھا اور پھر شاہد چپکے سے اٹھا اور اس نے نقشہ الماری میں بند کر دیا۔

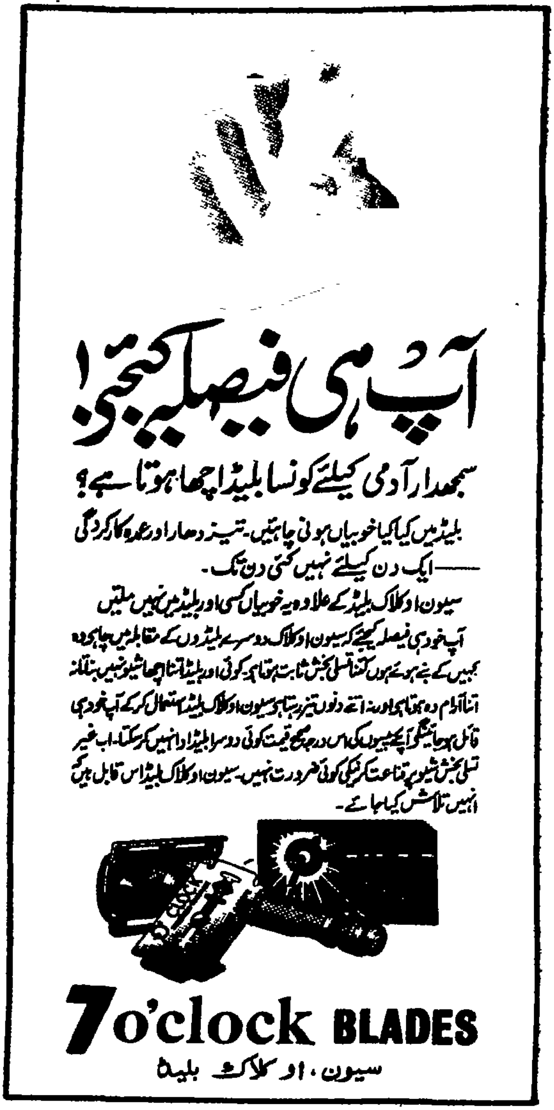

فوراً جھاگ دینے والا سن لائٹ صابن
کپڑے پٹکے بغیر سفید اور اجلے دھوتا ہے
اپنے کپڑوں کی احتیاط کیجئے اور ان کو زیادہ پٹکا مت بنائیے۔ سن لائٹ کے لاجواب جھاگ میں کپڑے دھوئیے۔ دھوتے وقت کپڑے پٹکنے کی ضرورت نہیں ہے۔ صرف جھاگ میں جلدی جلدی کپڑے ملئے اور دھو ڈالئے۔ اتنی کم محنت کے باوجود سن لائٹ میں دھلے ہوئے کپڑے بہت سفید اور اجلے ہوتے ہیں۔ خود محنت سے بچئے اور کپڑوں کو نقصان سے بچائیے۔ ہمیشہ سن لائٹ صابن سے کپڑے دھوئیے
SUNLIGHT SOAP
سن لائٹ صابن
کپڑا بچاتا ہے • محنت بچاتا ہے • پیسہ بچاتا ہے

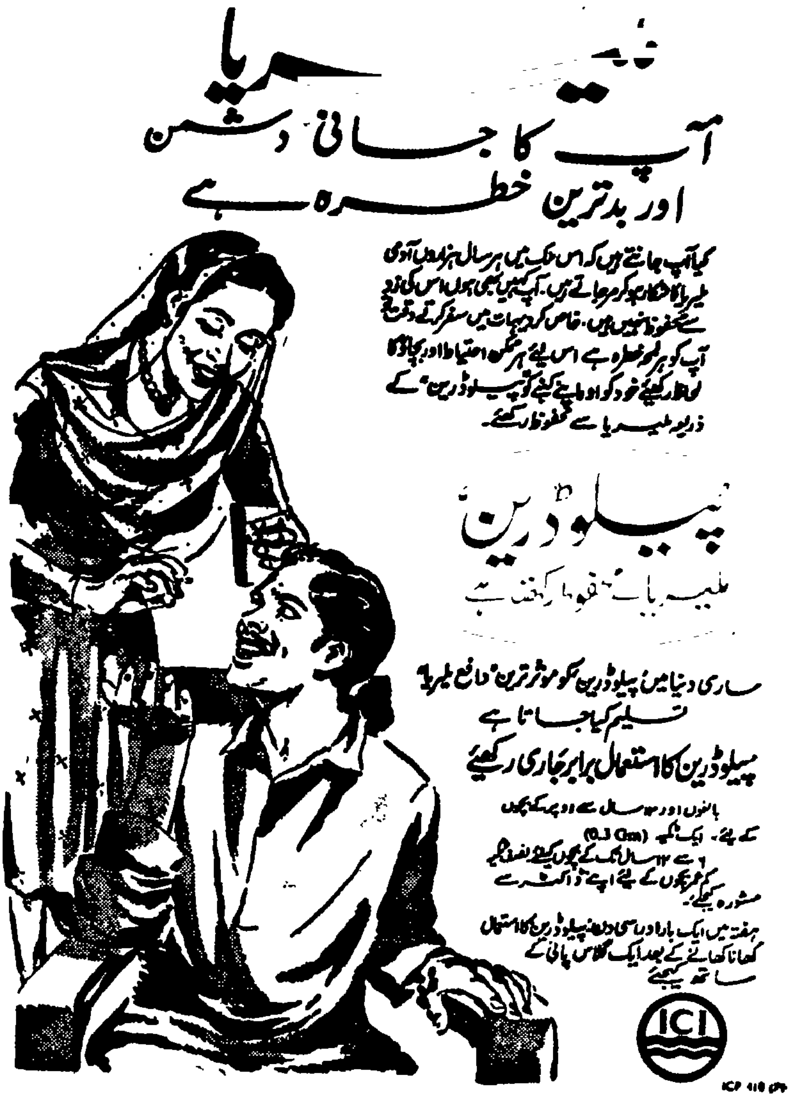

تندرست و توانا
ڈالڈا سے پکے ہوئے
کھانے کی بدولت
اس کی ماں جب اپنے بچہ کو دیکھتی ہے تو
محسوس کرتی ہے کہ تندرست و توانا بچہ کتنا پیارا
ہوتا ہے صحت مند ہنس مکھ اور کھانے کے وقت کبھی
چہرے پر بے لطفی ظاہر ہی نہیں ہوتی اسی لئے تو وہ ہمیشہ
کھانا ڈالڈا وناسپتی سے پکاتی ہے جو کہ خالص و صحت مند
ہوتا ہے اور کھانے کی لذت بڑھاتا ہے۔ اور پھر ڈالڈا
بہت قوت بخش بھی تو ہوتا ہے۔ آج ہی ایک ہوا بند مہر دار
ڈبہ خریدئیے۔
DALDA
VANASPATI
ڈالڈا وناسپتی
ڈالڈا بہتر کھانے کو بہترین بناتا ہے۔
(صرف کھجور کے پیڑ کے مارکے کا ڈبہ لیجئے)


دن بدن
صاف اور حسین جلد
کیڈل ★ آمیز ریکسونا
سے اپنے اصلی حسن کو
نکھر نے دیجئے
اور پھر دھو ڈالئے پھر دیکھئے آپ کی جلد دن بدن نرم اور
ملائم ہوتی جائے گی جس سے آپ کا حسن درخشاں ہو جائے گا
ریکسونا
★ کیڈل آمیز واحد صابن
★ جلد کو ملائم کرنے اور مقوی جلد
تیلوں کے ایک خاص مرکب کا ملکیتی نام ہے

ادارہ مطبوعات پاکستان پوسٹ بکس ۱۸۳ کراچی نے شائع کیا۔ مدیر: رفیق خاور۔ مطبوعہ ناظر پرنٹنگ پریس مکلوڈ روڈ - کراچی


دن بدن
صاف اور حسین جلد
کیڈل ٭ آمیز رکسونا
سے اپنے اصلی حسن کو
نکھرنے دیجئے
رکسونا کے کیڈل سے ماالمال جھاگ کو اپنی جلد پر نرمی سے ملئے
اور پھر دھو ڈالئے پھر دیکھئے آپ کی جلد دن بدن نرم اور
ملوانم ہوتی جائے گی جس سے آپ کا حسن درخشاں ہو جائے گا
رکسونا
٭ کیڈل آمیز واحد صابن
٭ جلد کو ملائم کرنے اور مقوی جلد
تیلوں کے ایک خاص مرکب کا ملکیتی نام ہے


آپ ہی فیصلہ کیجئے!
سمجھدار آدمی کیلئے کونسا بلیڈ اچھا ہوتا ہے؟
بلیڈ میں کیا کیا خوبیاں ہونی چاہئیں۔ تیز دھار اور عمدہ کارکردگی
—— ایک دن کیلئے نہیں کئی دن تک۔
سیون او کلاک بلیڈ کے علاوہ یہ خوبیاں کسی اور بلیڈ میں نہیں ملتیں
آپ خود ہی فیصلہ کیجئے کہ سیون او کلاک دوسرے بلیڈوں کے مقابلہ میں چاہے وہ کہیں کے بنے ہوئے ہوں کتنا تسلی بخش ثابت ہوتا ہے۔ کوئی اور بلیڈ اتنا اچھا شیو نہیں بناتا نہ اتنا آرام دہ ہوتا ہے اور نہ اتنے دنوں تیز رہتا ہے۔ سیون او کلاک بلیڈ استعمال کرکے آپ خود ہی قائل ہو جائینگے کہ آپکے پیسوں کی اس درجہ صحیح قیمت کوئی دوسرا بلیڈ ادا نہیں کر سکتا۔ اب غیر تسلی بخش شیو پر قناعت کرنیکی کوئی ضرورت نہیں۔ سیون او کلاک بلیڈ اس قابل ہیں کہ انہیں تلاش کیا جائے۔
7 o'clock BLADES
سیون، او کلاک بلیڈ


ملیریا
آپ کا جانی دشمن
اور بدترین خطرہ ہے
کیا آپ جانتے ہیں کہ اس ملک میں ہر سال ہزاروں آدمی ملیریا کا شکار ہو کر مر جاتے ہیں۔ آپ کہیں بھی ہوں اس کی زد سے محفوظ نہیں ہیں۔ خاص کر دیہات میں سفر کرتے وقت آپ کو ہر لمحہ خطرہ ہے اس لیے ہر ممکن احتیاط اور بچاؤ کا لحاظ رکھیے خود کو اور اپنے کنبے کو "پیلوڈرین" کے ذریعہ ملیریا سے محفوظ رکھیے۔
پیلوڈرین
ملیریا سے محفوظ رکھتی ہے
ساری دنیا میں پیلوڈرین کو موثر ترین "دافع ملیریا" تسلیم کیا جاتا ہے
پیلوڈرین کا استعمال برابر جاری رکھیے
بالغوں اور ۱۲ سال سے اوپر کے بچوں کے لیے۔ ایک ٹکیہ (0.1 Gm)
۶ سے ۱۲ سال تک کے بچوں کے لیے نصف ٹکیہ
کم عمر بچوں کے لیے اپنے ڈاکٹر سے مشورہ کیجیے۔
ہفتہ میں ایک بار اور اسی دن پیلوڈرین کا استعمال کھانا کھانے کے بعد ایک گلاس پانی کے ساتھ کیجیے
ICI
ICP 418 (P)


آپ کو ہر روز گندگی کے جراثیم سے بیماری کا خطرہ رہتا ہے
لائف بوائے سے ان جراثیم کو اپنے جسم سے دھو کر ہر روز اپنی حفاظت کیجئے
لائف بوائے کا محافظ جھاگ آپکی تندرستی کی حفاظت کرتا ہے
لائف بوائے
صابن
ہر روز کی گندگی کے جراثیم سے آپ کی حفاظت کرتا ہے
LIFEBUOY

ماہِ نو

جلد ۸ شمارہ ۱۲ مارچ ۱۹۵۶ء

مدیر: رفیق خاور
نائب مدیر: ظفر قریشی

پاکستان اور ہندوستان میں سالانہ چندہ پانچ روپے آٹھ آنے - فی کاپی آٹھ آنے

آپس کی باتیں

پچھلے دنوں ڈھاکہ میں گورنمنٹ انسٹی ٹیوٹ آف آرٹس کی نئی عمارت کے افتتاح کے موقع پر فضیلت مآب میجر جنرل اسکندر مرزا نے فنونِ لطیفہ کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے کہا کہ یہ محض تفریح اور دل لگی کا سامان ہی نہیں بلکہ زندگی کا خلاصہ اور اس کی روح رواں ہیں۔ آپ نے فرمایا "اس میں شبہ نہیں کہ جب سے پاکستان قائم ہوا ہے ہم اور ہماری حکومت ان مسئلوں کو حل کرنے میں مصروف رہے ہیں جو ہمارے مخصوص حالات کا لازمی نتیجہ تھے۔ اب جبکہ ہم اس بحرانی دور سے گزر چکے ہیں جس میں ہم اپنی قومی حفظِ بقا کے لئے سرتوڑ کوشش کر رہے تھے، وہ وقت آپہنچا ہے کہ ہم زیادہ لطیف قدروں کو اپنائیں ــــ وہ قدریں جو فنونِ جمیلہ میں جلوہ گر ہوتی ہیں۔ آرٹ کوئی ہلکی چیز نہیں اور نہ ہم اس کو ذہنی عیاشی قرار دے سکتے ہیں۔ درحقیقت یہ زندگی کا لطیف جوہر ہے۔ خواہ یہ زندگی کی گھناؤنی اصلیتوں کو بے نقاب کرے یا اس کی رعنائیوں سے پردہ اٹھائے۔ آرٹ ہمیشہ یا تو زندگی کی عکاسی کرتا ہے یا اس پر تبصرہ کرتا ہے۔ دونوں صورتوں میں اس کی سرگرمیاں بڑی تعمیری ہیں اور ہماری بصیرت و مسرت میں اضافہ کرتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ اگر آرٹ عالمگیر بنیادی قدروں کا حامل ہوگا تو یہ بین الاقوامی تعلقات کو خوشگوار بنانے اور باہمی خیرخواہی پیدا کرنے میں کس قدر مفید ہوگا۔ آرٹ کی ایک اپنی ہی زبان، اپنا ہی مزاج ہے جو تمام مقامی و علاقائی حدود سے بالاتر ہے۔ کوئی قوم اس وقت تک ذہنی و تمدنی حیثیت سے بالغ نہیں کہلا سکتی جب تک وہ فنونِ لطیفہ کی نشو و نما کو اپنی زندگی میں نمایاں جگہ نہ دے"۔

یہ افکار ہماری قومی ترقی و ثقافتی ترقی کے لئے بڑی نیک فال ہیں۔ مشہور نقاد رسکن نے اپنے اس قول میں ایک کھلی ہوئی حقیقت کا اظہار کیا ہے کہ کسی قوم کا فن ہی اس کی صحیح عظمت کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ ادب اور فن ہمارے قدیم قومی سرمائے ہیں۔ زندگی کی دوسری سرگرمیوں کے ساتھ ہمارا فنی شعور بھی نئے سرے سے بیدار ہو رہا ہے۔ ماہِ نو ابتدا سے پاکستان کی ادبی و فنی سرگرمیوں کا ترجمان رہا ہے اور آئندہ بھی رہے گا۔

ہمارے ہاں اوقاف کا استعمال نا پید تھا بلکہ قرآنِ کریم کے اوقاف تو علومِ قرآنی میں ایک مستقل باب کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ہر ترقی یافتہ زبان کے لئے ایسی علامات ضروری ہیں جن سے عبارت میں صحیح نظم و ترتیب پیدا ہو۔ اس دور میں اردو کے لئے ہم نے بعض انگریزی علامات اپنا لی ہیں، لیکن ان کے استعمال میں باقاعدگی پیدا نہیں ہو سکی۔ اسی لئے ہر شخص اپنی پسند اور مزاج کے مطابق انھیں برتتا ہے۔ یہ صورتِ حال ایک ترقی یافتہ اور ترقی پذیر زبان کے شایانِ شان نہیں۔ ہمارے خیال میں بہتر ہوگا کہ کم از کم چند علامات کے سلسلہ میں یکساں روش اختیار کر لی جائے، مثلاً:-

۱- فقرے کے خاتمے پر ـــ
۲- فقرے کے درمیان زیادہ توقف کے لئے ؛
۳- تشریح کے لئے :
۴- پیراگراف کا خاتمہ +
۵- الفاظ اور جملوں کے مابین توقف کے لئے ،
۶- تشریح کے لئے کشش ــــــ

یہ وہ علامات ہیں جن کا استعمال کم و بیش تسلیم شدہ ہے، لیکن پابندی سے نہیں کیا جاتا۔ اگر ان کی عام طور پر پابندی کی جائے تو عبارت میں یقیناً زیادہ سلجھاؤ پیدا ہو سکتا ہے۔ انگریزی میں سیمی کولن (؛) اور کولن (:) کے استعمال کا ایک عام اصول یہ ہے کہ یہ علی الترتیب "خفیف اور واضح وقفہ کے لئے استعمال ہوتے ہیں" جو کوما (،) اور فل اسٹاپ کے بین بین ہیں۔ ان سے طویل جملوں یا فقروں کو باہم پیوست اور مربوط کرنے کا کام بھی لیا جاتا ہے، جہاں عبارت کا تسلسل قائم رکھنا مقصود ہو اور بعد وقفہ تسلسلِ خیال میں حارج ہو۔ البتہ یہ علامات ہمارے ہاں ابھی نہیں اپنائی گئیں۔ ہم اپنے ناظرین کو اس مسئلے پر اظہارِ خیال کی دعوت دیتے ہیں +

دستِ قضا نے افقِ ادب سے دو اور روشن ستارے چن لئے ــــ قاضی عبدالغفار اور میرزا یاس یگانہ چنگیزی۔ دونوں نے اپنے اپنے دوروں میں وہ گرم اور آب و تاب دکھائی جو ادب میں یادگار رہے گی۔ یہ وہ ستارے ہیں جو ٹوٹ کر اپنے پیچھے ایک روشن لکیر چھوڑ جاتے ہیں۔ لیلیٰ کے خطوط اور مجنوں کی ڈائری ہمارے ادب و فن کی شاہراہ پر مینارۂ نور کی حیثیت رکھتے ہیں۔ صحافت اور ادب دونوں میں قاضی صاحب پیش کار رہے تھے۔ یگانہ نے غزل کی محفل میں نئی رونق پیدا کی، وہ اکثر اہلِ کمال کی طرح تختۂ مشق ہوا ہے اور جہاں جہاں کبھی زمانے سے الجھتے رہے، لیکن موت مرنے والے کی زبان کے ساتھ دنیا کی زبان کو بھی خاموش کر دیتی ہے۔

غالب و میرزا یگانہ کا ٭ آج کیا فیصلہ کرے کوئی

مرحوم نے وفات سے کچھ عرصہ پہلے یہیں ایک غزل اور چند رباعیاں کہی تھیں۔ کیا معلوم تھا کہ یہ معلوم کرنے کے لئے ان کا آخری ہدیہ ہوگا۔ غزل فروری کے شمارہ میں پیش کر دی گئی تھی۔ اس بار رباعیات ان کی یادگار کے طور پر پیش کی جا رہی ہیں۔

سرسید کے قلمی کارنامے

محمد امین زبیری

سرسید کی زندگی ایسی متنوع خصوصیات سے معمور ہے کہ ان میں سے ہر ایک خصوصیت نہایت شرح و بسط سے بیان کی متقاضی ہے۔ ہنوز ان کی سوانح حیات، تذکرے اور مقالے وغیرہ سب ناتمام و تشنہ ہیں، اس لئے کسی رسالے کے چند محدود صفحات میں کسی ایک خصوصیت پر اور کسی ایک شخص کے قلم سے ہلکی سی بھی روشنی نہیں ڈالی جاسکتی، تاہم خطا بالا میں ان کی علمی و ادبی خصوصیتِ ذوق اور اس میں تدریجی ترقی کا بیان کچھ سے دیکھا جائیگا +

سرسید دہلی میں ۱۸۱۷ء میں پیدا ہوئے۔ اس وقت یہ مرکز علم و فضل اُجڑ چکا تھا، تاہم چند نفوس، جو قدیم علم و ادب اور تہذیب کے نمونے تھے، زندہ و موجود تھے۔ ان بزرگوں میں سرسید کی چشم ہوش کھلی اور ان کی تربیت و تعلیم سے دل و دماغ منور ہوا۔ ان کی عمر ۱۹، ۲۰ سال کی تھی کہ انہوں نے سب سے پہلے صحافت کے میدان میں قدم رکھا +

۱۹ ویں صدی کے آغاز میں صحافت کو خصوصاً ملکی زبان میں اجازی ہوئے بہت کم مدت گذری تھی۔ سرسید کے بڑے بھائی سید محمد نے بھی ایک اخبار "سید الاخبار" کے نام سے جاری کیا تھا۔ سرسید اس کے بڑے سرگرم مضمون نگار تھے مگر مجبوریوں نے سرکاری ملازمت کی طرف مائل کیا۔ کمپنی کی حکومت تھی۔ قوانین و قواعد بھی ملکی زبان اردو میں جاری تھے۔ عدالتی و دفتری کاروائی بھی اسی میں ہوتی تھی۔ وہ ۱۸۳۸ء میں سررشتہ دار مقرر ہو گئے اور خدمتِ متعلقہ میں کامیابی کے ساتھ ساتھ ترقی کرتے کرتے صدر الصدوری تک پہنچے جہاں سے ۱۸۷۶ء میں پنشن لی +

علمی ذوق اور حصولِ علم کا ولولہ و شوق رگ و پے میں ساری اور دل و دماغ پر مستولی تھا۔ سررشتہ داری کے زمانے میں بھی تصنیف و تعلیم کی طرف بھی رجحان پیدا ہوا اور سب سے اوّل ترتیب دفتر کا دستور العمل اور پھر قواعد منصفی کا خلاصہ مرتب کیا۔ دونوں کتابیں عملے اور امیدواران ملازمت کے لئے بے حد مفید ثابت ہوئیں۔ اس زمانے میں ہائی کورٹ کے مماثل صدر عدالتیں قائم تھیں۔ ان کے فیصلوں کی زبان انگریزی تھی۔ ان کے ترجمے کرائے اور بطور نظائر شائع کیا، جو اردو داں حکامِ عدالت کے لئے بڑے رہنما تھے +

اب یہ شوق روز بروز بڑھتا رہا اور زندگی بھر باوجود دیگر اہم سرکاری اور قومی تعلیمی و سیاسی مصروفیتوں کے قائم رہا، حتیٰ کہ رحلت سے ایک ہفتہ پہلے تک یعنی جب تک ہاتھ میں قلم پکڑنے کی طاقت رہی اس میں مصروف رہے +

بہر حال زندگی کی یہ شصت سالہ مدت جو صحافت سے شروع ہوئی علاوہ متذکرہ بالا کتب کے، مذہب و تاریخ، تصوف، ریاضی، ادب سب ہی پر پھیلا ہے +

مذہب میں جلاء القلوب بذکر المحبوب محافلِ میلاد کے لئے ہدایاتِ محمدیؐ تحفے کے لئے "تحفہ حسن" (ترجمہ تحفۂ حسن اثنا عشری باب ۱۰، ۱۲) کلمۃ الحق در بیان پیری مریدی، ترجمہ چند ابواب کیمیائے سعادت، نمیقہ در بیان تصورِ شیخ، تبیین الکلام تفسیر توریت و الانجیل پھر رسالۂ احکام طعام اہلِ کتاب

پاکستان کی جمہوریتِ اسلامیہ

۱۳ — ۵ — ۷

ملتِ پاک کے جمہور کا دستورِ حقیقی — عین آئینِ خداوندی کی پابندی ہے
رفعتِ عرش بریں سے پیہم تائید آئی — ایک آوازیہ دستورِ خداوندی تو ہے

۱۳ — ۵ — ۷

حفیظ ہوشیارپوری

الخطبات الاحمدیہ علی ملت الاسلام تالیف و ترجمہ کیں۔ تبیین الکلام ۱۸۶۲ء میں لکھی جس کا تفصیلی مقصد یہ تھا کہ عیسائیوں اور مسلمانوں کے تعصبات دور ہوں اور ان میں اصولی مطابقت دکھائی جائے۔ اسی مقصد سے انہوں نے عبرانی بھی پڑھی۔ یہ بالکل ایک جدید تصنیف تھی، اب تک کسی عالم نے اس موضوع پر قلم نہیں اٹھایا تھا۔ انہوں نے اپنے دعووں کے اثبات میں عیسائیوں کے مسلّمہ مسائل پیش کئے۔ یہ کتاب یورپ کے مستشرقین میں مقبول ہوئی۔ اس کتاب کے لئے سرسید نے کئی ہزار کا ایک ٹائپ پریس خریدا اور اردو، انگریزی اور عبرانی حروف بھی منگائے۔

سرسید جو کچھ لکھتے تھے، انگریزی ترجمہ ساتھ ساتھ ہوتا تھا۔ ایک کالم میں عبرانی توریت کی عبارت عبری حروف اور اس کا اردو و انگریزی ترجمہ اس کے نیچے ٹائپ میں ہوتا۔ اسی طرح دوسرے کالم میں اسی مضمون میں کوئی آیتِ قرآنی یا حدیث اردو، انگریزی میں مع تفسیر ہوتی۔

فرنچ مستشرق گارسن دتاسی نے ۱۸۶۳ء میں اپنے لکچر میں اس کتاب پر سرسید کی معلومات و قابلیت کی پوری پوری ستائش کی تھی اور اس تعجب کا اظہار کیا تھا کہ یورپ کی تصانیف تک ان کو کس طرح رسائی ہوئی۔ یہ کتاب درحقیقت وسیع علم کا نتیجہ ہے۔

اسی طرح دورِ اوّل میں تاریخ کا بھی بڑا حصہ ہے:-

(۱) جامِ جم: امیر تیمور سے بہادر شاہ تک کے مختصر حالات، ۴۳ خلفاء کی جدولیں میں۔

(۲) سلسلۃ الملوک: دہلی کے راجاؤں، بادشاہوں کی فہرست اور مختصر تاریخ ہے۔

(۳) آثار الصنادید: اس زمانہ کی معرکۃ الآرا کتاب جس میں عمارات کے نقشے، اُن کا جغرافیہ، طول و عرض وغیرہ ہے۔ ایک باب میں بتقسیم عنوانات ۱۲۰ مشاہیر جو اس زمانہ میں تھے، کا حال ہے جس میں علماء، شعراء، صوفیا و مشائخ، مجاذیب وغیرہ ہیں۔ مگر دوسرے اڈیشن میں ترمیم ہے اور اسی مرتبہ نسخہ کو ایک فرانسیسی مستشرق گارساں دتاسی نے فرنچ میں ترجمہ کر کے فرانس میں شائع کیا۔

(۴) آئین اکبری: یہ ایک بڑی مشہور کتاب ہے۔ انگریزی میں بھی اس کا ترجمہ ہو چکا تھا، لیکن اس میں بہت سی غلطیاں تھیں اور بہت سی جگہ ایک مہتم کا خلا تھا، اس کی تصحیح کی اور خلا کو معمور کیا۔

(۵) تاریخ فیروز شاہی: اس کی صحت کر کے اس پر ایک تاریخی دیباچہ مع ذکر مؤلف لکھا۔ یہ نسخہ مصححہ ۱۸۶۲ء میں ایشیاٹک سوسائٹی بنگال نے شائع کیا۔

(۶) سیرت فریدیہ: اپنے نانا خواجہ فرید[1] کی سیرت

(۷) رسالہ قدیم نظام دیہی ہندوستان۔

(۸) رسالہ اسباب بغاوت ہند: اس دور کی تصانیف میں ایک ایسی جرأت مندانہ کتاب ہے جو خدا نے سرسید کے ہی لئے مخصوص کی تھی۔

ریاضی میں تسہیل فی جرّ الثقیل عربی سے ترجمہ ہے۔ دوسرا ترجمہ فوائد الافکار فی اعمال الفرجار ہے۔ اس میں خود مثالوں کا اضافہ کیا ہے۔

ایک رسالہ قول متین در ابطالِ حرکت زمین تصنیف کیا۔

دوسرے دور میں مذہب کے موضوع پر متعدد رسائل ہیں:-

(۱) رسالہ تحقیق لفظ نصاریٰ[2] (۲) رسالہ طعام اہلِ کتاب۔ (۳) النظر فی بعض مسائل امام الغزالی۔ (۴) رسالہ ابطالِ غلامی (۵) ترقیم فی قصہ اصحاب الکہف والرقیم (۶) ازالۃ الغین عن ذی القرنین (۷) تحریر فی اصول التفسیر (۸) تفسیر السمٰوات (۹) الدعا والاستجابت (۱۰) تفسیر القرآن (۱۲) خطبات احمدیہ اور (۱۱) ازواج مطہرات مستقل کتابیں ہیں، لیکن تفسیر مکمل نہ ہو سکی۔

خطبات احمدیہ کا انگریزی ترجمہ بھی ہوا۔ یہ کتاب لندن کے قیام کے زمانہ میں لکھی اور سر ولیم میور، لفٹننٹ گورنر کی کتاب "لائف آف محمدؐ" کا گویا جواب ہے۔

ازواج مطہرات بھی مکمل نہیں۔ رحلت سے دس یوم پہلے تک اس کے لکھنے میں مصروف تھے۔ پھر قلم پکڑنے کی طاقت جب سلب ہو گئی تو مجبور ہو گئے۔

---

[1] خواجہ فرید ایک متبحر عالم اور علم ریاضی کے فاضل تھے۔ انہوں نے ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت میں بڑے بڑے مناصب و اعزاز حاصل کئے۔ اکبر شاہ ثانی نے "دبیر الدولہ امین الملک مصلح جنگ" کا خطاب دیا تھا۔

[2] رسالہ "تحقیق لفظ نصاریٰ" کے لکھنے کی وجہ یہ تھی کہ کسی مسلمان نے انگریزوں کی نسبت یہ لفظ لکھا تھا۔ اس کو تحقیر و ذلت کے مرادف سمجھا گیا اور اس کو پھانسی کی سزا دی گئی۔ سرسید نے ثابت کیا کہ یہ لفظ عزت و احترام کا ہے۔ اسی طرح انگریزوں کے ساتھ خورد و نوش کو برملا مذہب جائز ثابت کرنے کی ضرورت تھی، اس غرض سے رسالہ "حلتِ طعام اہلِ کتاب" تالیف کیا۔ باقی مسائل علمی ہیں۔

ہومیو پیتھک طریق علاج پر بھی ایک رسالہ لکھا ایک رسالہ ہندوستان کے طریقۂ تعلیم پر تنقید ہے۔ یہ انگریزی میں بمقام لندن شائع ہوا۔

تفسیر القرآن کی ۶ جلدوں میں ۱۶ سورتوں کی تفسیر ہے۔ باقی سورتوں کی تفسیر بعض مجبوریوں کے سبب سے نہ لکھ سکے، تاہم قرآن مجید کے مقاماتِ مشکلہ کی توضیح اور ان شکوک کے جو بعض معترضین اسلام نے کئے تھے، ذدمیں چند چھوٹے چھوٹے رسائل نے کچھ کمی پوری کی۔ ان مذہبی تصانیف و تالیفات کا ایک مجموعہ بھی تصانیف احمدیہ کے نام سے شائع کیا اور اوّل دور کی کتابوں پر خود ایک تبصرہ بھی لکھا جو ایک جدّت و ندرت تھی۔

خطبات : خطباتِ احمدیہ جس جذبہ و جوش اور محنت و انہماک سے لکھی، اس کا کچھ اندازہ ان خطوط سے ہوتا ہے جو نواب محسن الملک کے نام لندن سے لکھے تھے۔ یہ کتاب سرسید کا ایک زبردست کارنامہ ہے اور کتب سیرت میں اس کو زبردست شرف حاصل ہے۔ بقول مولوی عبدالماجد دریا بادی خطبات احمدیہ کو شرف اوّلیت ہی حاصل نہیں، اس کے جو دلائل و شواہد فرنگیوں کے مقابلہ میں اثبات رسالت میں پیش کر دئے تھے خصوصاً بشارات توریت و انجیل کے ذیل میں، ان پر اضافہ آج تک شاید ہی کچھ ہو سکا ہو۔

۱۸۸۰ء میں سرسید نے اپنی مذہبی تالیفات : تصانیف کا جو اس وقت تھیں، ایک مجموعہ تصانیف احمدیہ کے نام سے مرتب کیا۔ اولاً ایک تمہید لکھی، پھر ہر کتاب پر ریویو کیا۔ یہ گویا مصنف کی زبان سے اپنے خیالات کے انقلاب اور ارتقائے فکر و ادب کی دلچسپ داستان ہے۔

۱۸۹۷ء میں ایک عیسائی احمد شاہ شائق نے بعنوان "امہات المومنین" ایک کتاب شائع کی، جو تہذیب اور سنجیدہ دہنی کی ایک دل آزار اور بدترین مثال تھی۔ سرسید نے اس کے جواب میں رسالہ "ازواج مطہرات" لکھا۔ اوّل ام اعتراضوں کا جواب ہے۔ پھر ازواج مطہرات کا تاریخی حال ہے، لیکن وہ حضرت خدیجۃ الکبریٰ، حضرت سودہ، حضرت زینب بنت جحش، حضرت حفصہ، حضرت اُمِ حبیبہ، حضرت اُمِ سلمہ اور اُم المساکین حضرت زینب کے ہی متعلق لکھنے پائے تھے کہ پیغام اجل آگیا۔

اسبابِ بغاوتِ ہند رسالہ "اسباب بغاوت ہند" کا لکھنا حقیقتاً ایک بڑا جراُت کا کام تھا، رضاوند جل جلالہ نے سرسید کے لئے ہی مخصوص کیا تھا۔ اس زمانہ میں تمام انگریزی اخبارات اور مستقل و غیر مستقل رسائل میں مسلمانوں پر ہی بغاوت کا الزام قائم کیا جاتا تھا اور وہ ہی انتقامی تیروں کا نشانہ تھے۔ سرسید نے تمام خطرات کو نظر انداز کر کے اور باوجود سرکاری ملازم ہونے کے اسباب بغاوت پر جدید روشنی ڈالی، اس میں پوری ذمہ داری حکومت پر آتی تھی۔ ہندوستانیوں کا مجلس واضع قوانین میں، جو ۱۸۵۳ء میں قائم تھی، شریک نہ کیا جانا، مذہبی مباحثوں میں حکام کا شریک ہونا اور مشنری طریقے برتنا، مشنریوں کے دل آزار مواعظ، مشنری مدرسوں کا بہ کثرت اجرا، ابتدائی اور اعلیٰ تعلیم کے طریقوں کی خرابی ایسے قوانین کا اجرا جو اہل ہند کی عادات کے مناسب نہ تھے، عام افلاس جو حکومت کی معاشی پالیسی کا نتیجہ تھا، انگریزوں کی ہندوستانیوں سے بیگانگی، سخت مزاجی، بدزبانی: فوجی نظام کی غلطیاں اور بد انتظامی ان سب امور کو بہ تفصیل و دلائل و شواہد ظاہر کیا۔

اس رسالہ کو اکثر حکام نے باغیانہ تصور کیا، لیکن چند ممتاز انگریزوں نے اس کی تائید کی اور مخلصانہ بتایا۔ انگریزی پارلیمنٹ میں بھی اس پر بحثیں ہوئیں، چنانچہ ۱۸۶۱ء میں ہی اصلاحات شروع ہو گئیں اور گورنر جنرل کی کونسل میں ہندوستانی بھی شامل ہوئے۔

۱۸۶۰ء میں جبکہ ہر طرف سے مسلمان قوم و مذہب کے اعتبار سے نشانۂ بغاوت تھے، سرسید نے یہ ثابت کرنے کے لئے کہ اگر قومیت و مذہب وجہ بغاوت ہوتی تو کوئی مسلمان حکومت کا وفادار نہ ہوتا، ایک رسالہ "لائل محمڈنز آف انڈیا" جاری کیا۔ اس میں ان مسلمانوں کا حال شائع ہوتا تھا جنہوں نے حکومت کی وفاداری کی تھی۔

ایک رسالہ سر ولیم ہنٹر کی ایک زہریلی کتاب کے جواب میں لکھا۔ سر ولیم نے ثابت کیا تھا کہ مسلمان حکومت انگریزی کے از روئے مذہب وفادار نہیں ہو سکتے۔ یہ کتاب ایسے وقت میں شائع ہوئی تھی جبکہ ایک طرف سرحدی خطرہ نمودار تھا، دوسری طرف انڈمان اور کلکتہ میں گورنر جنرل اور ایک جج ہائیکورٹ کو دو مسلمانوں نے قتل کر دیا تھا۔ سر ولیم نے وہابی فرقہ کو بڑا ہدف بنایا تھا، مگر سرسید کے جواب سے یہ زہر پورا اثر نہ کر سکا۔

ایک علمی سوسائٹی ۱۸۶۴ء میں سرسید نے ایک علمی ادارہ سائنٹیفک سوسائٹی کے نام سے قائم کیا تھا جس کی تاسیس تو گورکھپور میں ہوئی لیکن بعد کو وہ علی گڑھ منتقل ہو گیا۔ یہاں اس کی عالیشان عمارت تعمیر ہوئی جس کے ساتھ وسیع باغ اور زراعتی تجربات کے لئے خاصا رقبہ بھی تھا۔ اس میں ہر قوم اور ہر فرقہ کے قابل اصحاب ممبر ہوتے تھے۔ سائنس اور علمی کتابوں کے ترجمے کی اردو میں اشاعت ہوتی تھی۔ اس کا اپنا پریس بھی تھا۔ مقاصد کی اشاعت کے لئے ۱۸۶۶ء سے ایک اخبار انسٹیٹیوٹ

گزٹ کے نام سے بھی شائع کیا جاتا تھا جس کے مدیر خود سرسید تھے۔ اس طرح آخر تک صحافت کا رشتہ قائم رہا۔ علمی مضامین پر لیکچر بھی دئے جاتے تھے۔ سرسید علماً قانون پر لیکچر دیتے اور زراعتی تجربات بھی کرتے تھے۔ انہوں نے تخم ریزی کے لئے ایک شیشے کی نلکی بھی ایجاد کی تھی۔

۱۸۶۷ء میں اس ادارہ کی جانب سے ایک ورنیکلر یونیورسٹی کے قیام پر حکومت کو بذریعہ عرضداشت متوجہ کیا گیا۔

اس سوسائٹی کے نمونہ پر بعض مقامات پر اور سوسائٹیاں بھی قائم ہوئیں اور ملک میں ایک خاص شوق مغربی ادب و علم کو اردو میں منتقل کرنے کا پیدا ہو گیا۔

تہذیب الاخلاق "معاشرتی، تہذیبی، اخلاقی و علمی و ادبی اصلاح کے لئے ۱۸۷۰ء سے رسالہ "تہذیب الاخلاق" جاری کیا۔ خود سرسید ادارتی فرائض انجام دیتے تھے۔ اگرچہ اس کے مضمون نگاروں میں متعدد بڑے بڑے قابل اصحاب — مولوی سید مہدی علی خاں محسن الملک، مولوی مشتاق حسین وقار الملک، مولوی چراغ علی اعظم یار جنگ، سید محمود وغیرہ تھے، مگر سرسید کے مضامین سب سے زیادہ تھے، چنانچہ کم و بیش سات سال میں مجلد ۲۲۴ کے ۱۱۲ مضامین سرسید نے لکھے تھے۔ یہ رسالہ ۱۸۷۶ء میں بند ہو گیا، پھر تین سال بعد جاری ہوا، مگر ڈھائی سال بعد بند ہو گیا۔ اس کے متعلق سرسید نے یہ معذرت کی۔ "چونکہ دیگر اصلاحی ہی ہوائی کے کاموں سے مجھے فرصت نہیں ملتی اس لئے بند کیا جاتا ہے۔" بہرحال "تہذیب الاخلاق" نے بہت بڑا ذہنی انقلاب پیدا کیا اور صحیح تہذیب کا مفہوم ذہن نشین کیا، ساتھ ہی اردو لٹریچر کا قالب ہی تبدیل کر دیا۔ تعلیم کی ضرورت کا عام احساس ہو گیا۔ سرسید کے یہ مضامین کتابی صورت میں بھی شائع ہوئے ہیں۔ اوّل مرتبہ بند ہونے پر سرسید نے لکھا تھا کہ:

"سات سال تک ہم نے بذریعہ اس پرچہ کے اپنی قوم کی خدمت کی۔ مذہبی بے جا جوش سے جس تاریک گڑھے میں اپنی قوم گری تھی اس سے خبردار کیا۔ دنیاوی باتوں میں جن تاریک خیالات کے اندھیرے میں مبتلا تھی ان میں اس کو روشنی دکھائی۔ اردو زبان کا علم جو بد خیالات اور موٹے اور بھدے الفاظ کا مجموعہ تھا اس میں جہاں تک ہم سے ہو سکا ہم نے اصلاح چاہی۔ قومی ہمدردی، قومی عزت، سیلف آنر یعنی آپ عزت کا خیال اگر ہم نے اپنی قوم میں پیدا نہیں کیا تو ان لفظوں کو تو ضرور اردو زبان کے مضامین میں داخل کیا۔ ہم نے کچھ کیا ہو یا نہ کیا ہو مگر ہر طرف سے تہذیب و شائستگی کا غلغلہ سننا، قومی ہمدردی کی صداؤں کا ہمارے کانوں میں آنا، اردو زبان کے علم و ادب کا ترقی پانا، یہی ہماری مرادیں تھیں۔ اگرچہ ہم جانتے ہیں کہ ہمارے بہت سے ایسے دوست ہیں جو اس پرچہ کے بند ہونے سے نہایت ہی شکستہ خاطر ہوں گے، مگر ہم ان سے معذرت کرتے ہیں اور اب اس پرچہ کو ان سے رخصت کرتے ہیں اور وہ ان بھی [illegible] کہ ہم خود بھی ان سے رخصت ہوں گے۔"

خطوط زمانہ قدیم سے اپنے اپنے وقت کے مشاہیر و اکابر کے ملفوظات و مکتوبات جمع کرنے کا ایک خاص شوق و ذوق رہا ہے۔ اسی ذیل میں بادشاہوں کے فرامین بھی ہیں۔ ان سے اکثر اہم تاریخی واقعات پر اور کاتب خط کے نجی حالات اور سیرت پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ اردو میں اس کا سلسلہ غالب کے خطوط سے شروع ہوا۔

سرسید کے خطوط ان کی رحلت کے بعد رسالہ "معارف" علی گڑھ میں شائع ہوئے، لیکن ان کی تعداد بہت کم تھی۔ پھر ۱۹۲۴ء میں سر سید راس مسعود نے بڑی کوشش سے خطوط جمع کر کے ان کا مجموعہ شائع کیا۔ ان خطوط میں طرز تحریر کا سانچہ بھی نیا ہے اور تنوع کے لحاظ سے وہ ایک نادر نمونہ اور ادبی لحاظ سے نہایت بلند پایہ ہیں۔ ان میں بعض خاص دوستوں کے نام کے خطوط ہیں۔ بعض موقع پر جو شعر لکھ دیا ہے وہ گویا انگوٹھی میں نگینہ معلوم ہوتا ہے۔ بعض لوگ ان کے پاس از نام یا گمنام دل آزار خطوط بھی بھیجتے تھے۔ ایک گمنام خط موصول ہونے پر "انسٹی ٹیوٹ گزٹ" میں لکھا کہ:

"ہمارے پاس ایک خط جس کے لفافہ پر الہ آباد کی مہر تھی بذریعہ ڈاک پہونچا جب ہم نے کھولا تو اس میں ایک پرچہ پر یہ شعر لکھا ہوا تھا:

ہرگز نبرد دل و جاں گاہ خورد برایماں
مار زلف تو ندانم کہ چہ در سر دارد"

چونکہ ہم اس دوست کے نام و نشان سے واقف نہیں ہیں اس لئے اخبار میں اس کا جواب چھاپ دیتے ہیں:

"نہ نہد گوش بر افسانۂ من ہیچ گہے
یا بلیغ ندانم کہ چہ در سر دارد"

فارسی کا ادبی مذاق باوجودیکہ سرسید اردو کی ترقی اور اس کو ادب کی رفعت پر پہنچانے میں ساعی و

سرگرم تھے، لیکن فارسی ادب کا بھی پورا مذاق تھا۔ خطوں میں اکثر فارسی اشعار بھی لکھتے تھے۔ بعض خطوط فارسی میں بھی لکھے ہیں۔ مثلاً ایک خط مولوی مہدی علی خاں (نواب محسن الملک) کو لکھتے ہیں کہ:۔

مخدومی و محبوبی من سلامت — تسلیم نہ صرف تسلیم بلکہ دل و جان تسلیم
نامۂ محبت مورخہ ۸ ار جولائی یافتم بمسرتے کہ بر آں پذیرفتم پایانے
ندارد۔ اے وقتیکہ تو خوش کہ وقت ما خوش کردی، اشعار آں بدار
آں محبت نامہ بجانم خلیدگر ہیں اتحاد روحانی و جسمانی بلا باید نگریست
کہ احمد و مہدی دریک بحر و مضمون گنجینہ اندر ع
لہ مشتاقِ جمال است ایں احمد شیدا ہم۔ در مصرع اول کہ خطاب
بمن فرمودہ اند اگر بجائے لفظ دید احوالت بودے مناسب
حال من بودے ؎ آنی کہ بہ احوالت خلقے ست تماشائی،
ولنعم ما قال حق، ــ آنم کہ بہ احوالم خلقے است تماشائی۔
اگر غم است ہمیں است کہ نمی دانم، خدائے من تماشائے
کدام احوال من می کند۔ ہو الغفور الرحیم۔
گناہ من ار نامدے در شمار — ترا نام کے بودے آمرزگار

یہ ذوق اتنا تھا کہ ان کے زمانہ کی کالج کی عمارتوں پر جس قدر کتبات ہیں، وہ سب فارسی ہیں اور انہی کے افکار طبع ہیں:

تاریخی جمل سے دل چسپی:۔ مادۂ تاریخ نکالنے سے بھی ان کو دلچسپی تھی۔ کالج کی بعض عمارتوں کے انہوں نے خود مادے نکالے جیسے:

(۱) بنائے یادگار برکت علی خاں بہادر ۱۸۹۴ء
(۲) ای بشر قدر بنا اخوان الصفا و الوداد ۱۲۹۲ھ

شاعری:۔ سر سید باقاعدہ یا پیشہ ور شاعر نہ تھے لیکن شعر گوئی ان کی فطرت میں تھی۔ مصنف حیات جاوید نے بڑی کوشش سے ان کا صرف ایک شعر اردو کا حاصل کیا ؎

ہزار حیف کہ عمر اپنی مفت صرف ہوئی
نہ کچھ خدا کی عبادت کی نے بتوں کی چاہ

انہوں نے تخلص بھی آہی لکھا ہے، مگر فارسی میں ان کے ایسے متعدد اشعار ہیں، جن کو انہوں نے "ہمارا شعر" کہہ کر لکھا ہے۔ مثلاً کالج کی ایک رپورٹ میں لکھتے ہیں کہ:۔

"کوئی زمانہ ایسا نہیں ہوتا کہ ہم اپنے دوستوں سے کالج کے کسی نہ کسی فنڈ کے لئے چندہ نہ مانگتے رہتے ہوں، مگر ہمارے دوست بھی ہمارے شعر کو کبھی کبھی پڑھ لیا کریں ؎

در کمر ز لبت بوسہ گرفتیم مرنج
سرخی لعل لبت بیں کہ چہ زیبا گشتہ است"

ان کے مزار پر ایک کتبہ نصب ہے اور اس پر ان کا یہ شعر کندہ ہے ؎

تاب یک جلوہ نیاورد نہ موسیٰ و نہ طور
ایں دلم ہست کہ زیں گونہ ہزاراں دیدہ است

دو انگریزوں کا بیان:۔ بعض انگریز، خصوصاً حکام ضلع جن کو علمی ذوق ہوتا عموماً سر سید کی خدمت میں آتے رہتے۔ ان میں جو زیادہ بلند خیال ہوتے، ان کو ایک قسم کی عقیدت ہو جاتی اور سر سید کے مقاصد تعلیم و علمی کے معاون بن جاتے۔ ایسے ہی انگریزوں میں ایک مسٹر کنیڈی تھے۔ انہوں نے سر سید کی وفات پر ایک بڑا مضمون لکھا تھا۔ اس میں ایک موقع پر لکھا ہے:۔

"۱۸۸۶ء میں سر سید کالج کے قریب ایک اینگلو انڈین بنگلہ میں رہتے تھے۔ مجھے مرکزی کمرہ میں لے جایا گیا جو شاندار بھی تھا اور اس میں اندھیرا بھی تھا اور یورپین طرز پر سجایا گیا تھا۔ فوراً ہی سر سید داخل ہوئے، ان کا لباس مشرقی تھا۔ وہ ایک معمر آدمی تھے، جن کا قد میانہ تھا اور جسم دوہرا لیکن مطالعہ اور عمر کے سبب ان کی کمر کچھ خمیدہ تھی۔ ان کا سر بہت بھاری تھا، چہرہ زرد تھا اور سر اور ڈاڑھی کے بال سفید تھے اور ان کی آواز خاص طور سے شیریں اور نمایاں تھی۔ پہلی نظر میں ان کی بہت بڑی خصوصیات اخلاق اور شان معلوم ہوتی تھیں۔ جب اس کے بعد میرا ان سے بہت تعلق رہا اور مجھے اکثر ان کو مختلف حیثیتوں میں دیکھنے کا موقع ملا۔ سرکاری مواقع پر جب وہ اسمبلی میں تقریر کرتے یا وائسرائں اور لفٹنٹ گورنروں کی مہمان نوازی کرتے یا کالج کے جلسوں میں صدارت کرتے اور پرائیویٹ زندگی میں اپنی میز پر کام کرتے ہوتے یا اپنے مطالعہ میں مصروف ہوتے، ان تمام حالات پر ان کی شخصیت پر کوئی تغیر نہ واقع ہوتا۔ وہ ہر وقت و حالت میں یکساں رہتے۔

لہ شاید یہ مصرع اس طرح ہے:۔
مشتاقِ جمالِ تست ایں احمد شیدا ہم — یا مشتاق جمال حضرت ایں احمد شیدا ہم (مدیر)

بے باک، صاف گو اور مستقل مزاج رہتے۔ لیکن میں ان سے اس وقت زیادہ محبت کرتا تھا جب وہ تنہا ہوتے۔ بعض اوقات میری ان سے ملاقات کالج میں ان کی صبح کی مصروفیات کے دوران میں ہوتی، جبکہ وہ اپنے اسٹاف پر سایہ کی طرح چھائے ہوتے یا اینٹوں کے کام کرنے والے مستریوں کی نگہداشت کرتے۔ چونکہ بڑی حد تک اپنے کالج کے معمار اور تعمیر کرنے والے بھی تھے۔ یا میں ان کو مطالعہ کے کمرہ میں کتابوں پر جھکا ہوا دیکھتا:

"...ایک شام میرے حافظہ میں بہت تازہ ہے، جبکہ میں غروبِ آفتاب کے بعد سر سید سے ملنے گیا۔ وہ آرام کرسی پر ایک چھوٹے سے کمرہ میں، جو ان کا مطالعہ کا کمرہ تھا، بیٹھے تھے۔ سامنے میز پر لیمپ جل رہا تھا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا اور سامنے باغ اور لان کا منظر تھا اور ایک ملازم سفید چادر اوڑھے برآمدہ کے سائے میں سو رہا تھا اور اندر ان کے بھاری سر اور داڑھی پر روشنی پڑ رہی تھی اور وہ عربی فلسفہ کی ایک ضخیم کتاب پر جھکے ہوئے تھے۔ انہوں نے قلم رکھتے ہوئے مجھ سے کہا کہ میں غروبِ آفتاب کے بعد اکثر دنیا سے غائب ہو کر صدیوں پہلے کے عظیم دماغوں کے ساتھ وقت گزارتا ہوں۔ اس زمانہ میں وہ ایک عرب فلسفی پر تنقید کر رہے تھے۔"

دوسرے انگریز کرنل گراہم تھے۔ انہوں نے سر سید کی زندگی میں ہی ان کی لائف لکھی تھی۔ اس میں ایک موقع پر لکھا ہے کہ:-

"سر سید اب کئی سال سے علی گڈھ میں اپنے آرام دہ مکان میں رہتے ہیں۔ یہ مکان ان کے لئے ان کے بیٹے سید محمود نے خریدا اور اس کو یورپین طرز پر سجایا ہے۔ یہاں پر وہ اپنے سب شناسا دوستوں کی خاطر مدارات کرتے ہیں جن میں مسلمان، سکھ، ہندو اور انگریز سب شامل ہیں اور جو ہندوستان کے ہر حصہ سے ان کے پاس آتے ہیں۔ اس گھر کے دروازے ہمیشہ کھلے رہتے ہیں اور سارے میں لٹریری ماحول چھایا ہوا ہے۔ ان کے بیٹھنے کے کمرہ میں، جہاں وہ اپنا ان کا زیادہ حصہ گزارتے ہیں، ایک میز ہے جس پر کتابیں اور کاغذات بھرے ہوئے ہیں اور ان کے کھانے کے کمرہ میں دیواروں کے ساتھ ساتھ کتابوں کی الماریاں لگی ہوئی ہیں جن میں معیاری انگریزی کتابیں ہیں۔ ان کی ایک لائبریری بھی ہے جس کا کمرہ بہت شاندار ہے۔ اس میں انواع و اقسام کی

(باقی صفحہ ۵۷ پر)

طرزِ یگانہ

میرزا یاس یگانہ چنگیزی (مرحوم)

نغمہ بھی کوئی وجد میں لاتا نہیں اب
کیسا ہی مزہ ہو دل کو بھاتا نہیں اب
آغاز وہ تھا حسن کا انجام ہے یہ
پیاری صورت پہ پیار آتا نہیں اب

ہر گام پہ تازہ گل کھلاتے چلئے
ہر روز کوئی فتنہ اٹھاتے چلئے
فطرت کے ساتھ ساتھ چلنا ہے اگر
ہر وقت بگاڑتے بناتے چلئے

پستی سے بلندی پہ جو چڑھتا جائے
ہر خطرہ پہ لاحول ہی پڑھتا جائے
ایسے کو سہارا نہ ملے کیا معنی
گرتا پڑتا جو آگے بڑھتا جائے

مردانِ عمل کو رجز کی پروا کیا
خود ذوقِ عمل رجز ہے اندیشہ کیا
دنیا میری بلا سے خوش ہو کہ نہ ہو
میں اپنے سے خوش ہوں تو غمِ دنیا کیا

غزل

سیماب اکبر آبادی (مرحوم)

اتفاقاتِ نظر تھے کہ اُدھر سے گزرے — آہ! وہ چند مناظر جو نظر سے گزرے

آدمی، اور قیودِ تن و سر سے گزرے — کیا فرشتے تھے جو اس راہگزر سے گزرے

مختلف راستوں کا مرکز و مرجع تو تھا — تیری ہی راہ تھی جس راہگزر سے گزرے

بحرِ غم تا کمر آیا بھی تو کیا خاک آیا — آبرو ہے اُسی پانی کی جو سر سے گزرے

اے نہے عالمِ یک رنگ شبستانِ لحد — آج ہم مرحلۂ شام و سحر سے گزرے

تنگ و محدود ہے پروازِ نگہِ فکر و نظر — جس پہ سب بند ہوں رستے وہ کدھر سے گزرے

میرے صحرائے جنوں میں نہیں ایسا کوئی خار — جو کفِ پا میں چبھے اور نہ سر سے گزرے

کسی انسان کی تحقیر کرے کیوں انساں — اپنا عالم اگر اپنی ہی نظر سے گزرے

کوئی افسانہ ہو، بن جائیگا افسانۂ دل — شرط یہ ہے کہ محبّت کی نظر سے گزرے

ساری دنیا سے بہت دُور ترا گھر نکلا — ساری دُنیا سے گزر کر ترے در سے گزرے

کر دیا سب کو بلندیٔ نظر نے نظری — جتنے جلوے نگہِ سیر نگر سے گزرے

تھا کہاں وقت کہ ہستی کے فسانے پڑھتے — صرف عنوان ہی عنوانِ نظر سے گزرے

سعیِ پرواز، کچھ اس ڈھب سے کیا مجھ کو اسیر — کہ ہوا تک بھی نہ ہو کر کسی پر سے گزرے

اپنی رُودادِ محبت پہ نگاہِ تنقید — نہیں معلوم یہ کس کس کی نظر سے گزرے

نالۂ شبگیر کیا تو نے تو کیا مارا تیر — نالہ وہ ہے جو گریبانِ سحر سے گزرے

منزل اُس کی ہے جو منزل سے رہے مستغنی — طلب اُسکی ہے جو بچ کر ترے در سے گزرے

یہ مرا گفتۂ بے کیف و پریشاں سیماب
کاش اُن کی نظرِ کیف اثر سے گزرے

ماہ نو، کراچی، مارچ ۱۹۵۶ء

افسانہ

آپ بیتی

غلام عباس

میری جیب میں جو تھوڑے سے پیسے رہ گئے تھے وہ سر شام ہی میں نے کافی ہاؤس کی نذر کر دئے تھے۔ مجھے اُمید تھی کہ کافی پی کر میرے قویٰ کو تقویت پہونچے گی۔ میرے تخیل میں جنبش پیدا ہوگی۔ مگر ایسی کوئی بات نہ ہوئی۔ میں کافی کا ایسا عادی ہو گیا تھا کہ اس کا پینا اب مجھ پر کوئی اثر نہیں کرتا تھا۔

اُس زمانے میں روٹی کی بھوک تو مجھے رہتی ہی تھی مگر ساتھ ہی میں شہرت کا بھی بھوکا تھا۔ میں دنیا میں جلد نام پیدا کرنا چاہتا تھا۔ میرا آگے پیچھے کوئی نہ تھا۔ نہ کوئی یار تھا نہ مددگار۔ ہاں ایک رسالے کا اڈیٹر جو ایک موٹا، تندرو خاموش سا آدمی تھا جب کبھی اس کے پاس رسالے میں چھاپنے کے لئے کوئی بہتر چیز نہ ہوتی تو وہ میری کہانی خرید لیا کرتا۔ وہ مجھے دس روپے فی کہانی دیا کرتا۔ اور اس بات کا مطلق خیال نہ کرتا کہ کہانی کتنی لمبی یا کس پایہ کی ہے۔

جس شام کا میں ذکر کر رہا ہوں وہ جنوری کی ایک شام تھی۔ کڑاکے کی سردی پڑ رہی تھی۔ ساتھ ہی تند و تیز جھکڑ بھی چل رہا تھا۔ میں معمول سے کچھ دیر پہلے ہی کافی ہاؤس پہونچ گیا تھا۔ میں نے کافی کی پیالی کو بہت دھیرے دھیرے ختم کیا تھا۔ اس دوران میں میرا ذہن سخت جد و جہد کرتا رہا تھا کہ کوئی انوکھی بات مجھے سوجھ جائے، جس پر میں اپنی کہانی کا تانا بانا تیار کر سکوں۔ اس رات میرے لئے ایک کہانی لکھنا اشد ضروری تھا، تاکہ میں صبح اُسے اڈیٹر کے حوالے کر کے دو تین روز کے لئے پیٹ بھرنے کا سامان کر سکوں۔ اگر میں اس میں کامیاب نہ ہوا تو نوبت فاقوں تک پہونچ جائے گی۔ یہی وجہ تھی کہ میرا ذہن کہانی سوچنے کی انتہائی کوشش کر رہا تھا۔ لیکن معلوم ہوتا تھا۔ اس شام میرے تخیل نے میرا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔

میں پورے دو گھنٹے اپنے سامنے کورے کاغذوں کا پیڈ رکھے یونہی گزار چکا تھا۔ جوں جوں وقت گزرتا جاتا، میرا اضطراب بڑھتا جاتا تھا۔ میرا ذہن خالی تھا۔ میرا تخیل پراگندہ اور دماغ مضمحل آخر تھک کر میں نے لکھنے لکھانے کا خیال ہی چھوڑ دیا۔ اور جو چند آنے میری جیب میں تھے اُن سے کافی کا بل چکا کر باہر نکل آیا۔ کافی ہاؤس سے نکلتے ہی اچانک ایک فقرہ میرے ذہن میں اُبھرا۔ یہ فقرہ میں نے دو تین مرتبہ کسی تنقیدی مضمون کے سلسلے میں پڑھا تھا لیکن تنقید نگار کا نام یاد نہیں آ رہا تھا۔ فقرہ یہ تھا:-

"اگر کوئی آدمی خواہ وہ کتنا ہی معمولی کیوں نہ ہو، اپنی زندگی کے واقعات بلاکم و کاست قلمبند کر دے تو وہ ایک عظیم ناول بن سکتا ہے، جس کا افسانوی ادب میں جواب نہ ہوگا"

کوئی دس منٹ تک میں اس فقرے پر غور کرتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ میرے ذہن پر نقش ہو گیا۔ میں گھر کی طرف جا رہا تھا۔ چلتا جاتا تھا، اور سوچتا جاتا تھا۔ جیسے ہی میں گھر کے قریب پہنچا یکبارگی میرے قدم رُک گئے۔ ایک بات میرے ذہن میں آئی۔ میں نے دل میں کہا:

"کیوں نہ تم خود ہی اس نسخے کو آزماؤ۔ اور آج رات سب سے پہلے جس آدمی سے بھی، خواہ وہ کتنا ہی معمولی کیوں نہ ہو، تمہاری مڈبھیڑ ہو اس کی منت خوشامد کر کے اس کی آپ بیتی معلوم کر لو اور پھر خود ہی اسے لکھ ڈالو۔"

اس تجویز پر میں دل ہی دل میں بہت خوش ہوا۔ یہ تجویز تھی تو انوکھی سی مگر ساتھ ہی کچھ ایسی آسان معلوم ہوئی کہ میں نے فوراً اس پر عمل کرنے کی ٹھان لی۔

آپ شاید پوچھیں کہ میں نے اپنی آپ بیتی سے یہ فائدہ کیوں نہ

اٹھایا تو میں عرض کروں گا کہ میں اپنے واقعات زندگی کو پہلے ہی اتنی مرتبہ لکھ چکا تھا کہ اب ان میں کوئی بات لکھنے کے قابل رہی نہیں گئی تھی چنانچہ میرے لئے اس کے سوا چارہ نہ رہا کہ میں کسی اور شخص کو کسی انجانے شخص کو تلاش کروں اور اس کی آپ بیتی کو کام میں لاؤں۔

میں نے تلاش شروع کر دی۔ میں گھر نہ گیا۔ بلکہ شہر کے ایک ایسے حصے کا رُخ کیا۔ جو نسبتاً بارونق تھا۔ اور جہاں اتنی رات گزر جانے پر بھی تند و تیز جھکڑ چلنے پر بھی امید ہو سکتی تھی، کہ کوئی نہ کوئی اللہ کا بندہ مل ہی جائے گا۔

میں اپنے چاروں طرف دیکھتا بھالتا تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا چلا جا رہا تھا ابھی تک کسی شخص سے میری مڈبھیڑ نہیں ہوئی تھی۔ آخر میں ایک چوراہے پر پہنچ کر رک گیا۔ اور بجلی کے ایک کھمبے سے ذرا ہٹ کر ایک رہزن کی طرح اپنے شکار کا انتظار کرنے لگا۔

سب سے پہلے جو شخص اس کھمبے کے پاس سے گزرا وہ ادھیڑ عمر کا تھا اس نے میلے کچیلے کپڑے پہن رکھے تھے۔ چہرے پر جھریاں تھیں، جو بڑھاپے نے وقت سے پہلے ہی ڈال دی تھیں۔ میں نے دل میں کہا اس سے کیا پوچھوں۔ اس کی داستان حیات تو اس کے چہرے ہی پر صاف لکھی ہے۔ میں نے اس سے کچھ تعرض نہ کیا اور وہ اپنی راہ چلا گیا۔ اس کے بعد ایک نوجوان گزرا۔ وہ ایک لمبا کوٹ پہنے تھا قمیص کا گریبان کھلا ہوا، ڈاڑھی بڑھی ہوئی، سر پر لمبے لمبے بال جو ہوا میں اُڑ رہے تھے مگر وہ سردی اور جھکڑ سے بے نیاز جھومتا جھامتا چلا جا رہا تھا۔ اس کا پر جوش چہرہ دیکھ کر میں نے بھانپ لیا کہ کوئی شاعر واعر ہے۔ اس کو اتنا ہوش کہاں کہ میری بات پر دھیان دے۔ اور میں اس سے بھی کنارہ کش ہو گیا۔

تیسرا شخص جو اُدھر سے گزرا، خاصا عمر رسیدہ تھا مگر ابھی آنکھوں میں زندگی کی کچھ رمق سی باقی تھی۔ اس کی چٹی ڈاڑھی میں کالے بال اکا دکا ہی رہ گئے تھے۔ اس نے شلوار قمیص پر کوٹ پہن رکھا تھا سر پر ترکی ٹوپی تھی جس کا پھندنا غائب تھا۔ وہ دھیرے دھیرے قدم اٹھا رہا تھا۔ جیسے خواب میں چل رہا ہو ساتھ ساتھ وہ پنجابی زبان کا ایک درد بھرا لوک گیت بھی گنگناتا جا رہا تھا۔ اس کی چال ڈھال اور وارفتگی کہے دیتی تھی کہ بُڈھے میاں نے عجب رنگینیوں میں اپنی جوانی گزاری ہو گی اور اس وقت بھی بلاشبہ انہی کی یاد میں یہ گیت اس کے لبوں پر آیا ہو گا۔ ہم جانتے اس کی محویت کے اس طلسم کو توڑنے کی مجھے جرأت نہ ہو سکی اور یوں وہ بھی میرے ہاتھ سے نکل گیا۔

میں شکار کی آس لگائے اسی کھمبے کے پاس کھڑا رہا۔ رفتہ رفتہ بازار بالکل سنسان ہو گئے تھے۔ کیونکہ راتوں کو سرگشت کرنے کے رسیا آج کی کڑاکے کی سردی اور تند ہوا سے گھبرا کر معمول سے سویرے ہی اپنے اپنے ٹھکانوں میں جا دبکے تھے اور اب خاصے وقفے کے بعد کسی کے قدموں کی چاپ سڑکوں کی خاموشی کو توڑتی ہوئی سنائی دیتی تھی۔

آخر کار ایک سایہ اس روشنی کے نیچے سے گزرا۔ جہاں میں کھڑا تھا۔ میں نے جھٹ بھانپ لیا۔ کہ جس شخص کی مجھے جستجو تھی وہ یہی ہے۔ اس کو دیکھ کر اس کی عمر کا اندازہ کرنا سخت مشکل تھا۔ وہ نہ تو بوڑھا تھا نہ جوان، نہ بدصورت نہ خوبصورت۔ اس کے چہرے سے سکون اور اطمینان جھلکتا تھا۔ داڑھی صاف، چھوٹی چھوٹی کتروان مونچھیں۔ اس نے ایک موٹا سا کوٹ پہن رکھا تھا اور گلے کو گلوبند سے خوب لپیٹ رکھا تھا۔

جیسے ہی وہ میرے قریب پہنچا میں اس کی طرف لپکا۔ وہ ٹھٹھر گیا اور خوفزدہ نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا۔ میں نے فوراً اس کی تشفی کر دی۔ اور نہایت ملائم لہجے میں کہا۔

"صاحب ڈریئے نہیں، میں کوئی قاتل یا چور اچکا نہیں ہوں اور میں کوئی بھیک منگا بھی نہیں ہوں، اس لئے آپ بالکل پریشان نہ ہوں مجھے آپ کے روپے پیسے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ آپ سے میں جس چیز کا طالب ہوں اس پر آپ کا کچھ خرچ نہیں آئے گا یعنی یہ کہ مجھے آپ کی آپ بیتی چاہیئے۔"

اس شخص نے حیرت زدہ ہو کر مجھے دیکھا اور ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ بلاشبہ اس نے مجھے کوئی سودائی خیال کیا ہو گا۔ چنانچہ میں نے پہلے سے بھی زیادہ ملائم لہجے میں کہا:

"نہیں میں پاگل بھی نہیں ہوں۔ میں تو...... اب میں کیا عرض کروں۔ میں ایک حقیر سا مصنف ہوں۔ مجھے آج رات ایک کہانی لکھنی ہے، اگر یہ کہانی میں نہ لکھ سکا تو کل مجھے فاقہ کرنا ہو گا۔ میرے پاس کہانی لکھنے کے لئے جو کچھ مواد تھا وہ سارا ختم ہو چکا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مجھے آپ کے واقعات زندگی کی ضرورت ہے۔ مجھے آپ کی ذات گرامی سے پوری امید ہے کہ آپ مجھے اس نوازش سے محروم نہیں رکھیں گے آپ کے حالات مجھے مرحمت کریں گے کیا عجب کہ میں اس سے ایک لافانی شاہکار تحریر کر سکوں۔"

معلوم ہوتا تھا کہ وہ شخص میری درخواست سے متاثر ہو گیا ہے۔

اب اس نے مجھے جن نظروں سے دیکھنا شروع کیا ان میں خوف کے بجائے ترحم پایا جاتا تھا۔ اس نے کہا "اگر میری آپ بیتی سے آپ کا کوئی کام نکل سکتا ہے تو مجھے اس کے سنانے میں کوئی عذر نہیں۔ لیکن میری کہانی بڑی سیدھی سادی ہے۔ میری پیدائش کو ۳۰ برس گزر چکے ہیں۔ میرے ماں باپ خاصے کھاتے پیتے عزت دار لوگ تھے۔ والد صاحب قبلہ کپڑے کا کاروبار کیا کرتے تھے۔ میں ان کا اکلوتا بیٹا تھا۔ جب میری عمر چھ برس کی ہوئی تو مجھے مسجد کے ملّا کے پاس بھیجا گیا اس کے بعد میں ایک مدرسے میں داخل ہو گیا۔ سولہ برس کی عمر میں میں نے میٹرک پاس کر لیا۔ میں نے نہ تو کسی خاص ذہانت کا اظہار کیا تھا اور نہ میں نرا احمق ہی تھا۔ میٹرک کے بعد والد صاحب نے مجھے ریلوے کے دفتر میں ملازم کرا دیا اور اپنی برادری کی ایک لڑکی سے میری شادی بھی کر دی۔ شادی سے پہلے میں نے اپنی بیوی کو نہیں دیکھا تھا مگر وہ میری توقع سے کچھ اچھی ہی نکلی۔ مجھے روزانہ آٹھ گھنٹے دفتر میں کام کرنا پڑتا ہے جس میں کسی خاص لیاقت یا ذہانت کی ضرورت نہیں، بس اچھے حافظے اور تن دہی کی ضرورت ہے۔ ہر سال میری تنخواہ میں چھ سات روپے کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ پچپن برس کی عمر میں جب میں ریٹائر ہوں گا تو مجھے کوئی دو پونے دو سو پنشن مل جائے گی۔ مجھے اپنے بیوی بچوں سے بڑی محبت ہے۔ میرے ایک لڑکا ہے اور ایک لڑکی۔ لڑکے کی عمر اب دس برس کی ہو چکی ہے، میرا ارادہ ہے کہ اس کو انجینئر بناؤں۔ لڑکی کی عمر نو برس ہے، خدا نے چاہا تو وہ اُستانی بنے گی۔ ہم لوگ بڑی خاموش زندگی گزارتے ہیں۔ میں ہر روز صبح آٹھ بجے اٹھتا ہوں اور نو بجے تک نہانے دھونے سے فارغ ہو کر دفتر چلا جاتا ہوں اور پانچ بجے لوٹ آتا ہوں۔ میرے چار پانچ دوست ہیں، جن سے کبھی کبھی کافی ہاؤس میں ملاقات ہو جاتی ہے، اور ہم چند منٹ اِدھر اُدھر کی باتیں کر لیتے ہیں، کبھی کبھار کسی دوست کے اصرار پر ایک آدھ مشاعرہ بھی سن لیتا ہوں۔ لو میں نے تمہاری فرمائش پوری کر دی ہے خدا کرے کہ تم اس سے کچھ فائدہ اٹھا سکو۔ اب میں اجازت چاہتا ہوں۔ میرے بیوی بچے گھر پر انتظار کر رہے ہوں گے، اچھا، فی امان اللہ۔"

یہ کہہ کر وہ چل دیا، لمحہ بھر کے لئے میں بھونچکا سا رہ گیا۔ اس نے مجھے اپنی جو آپ بیتی سنائی تھی اس پر مجھے بے اختیار رونا آ رہا تھا، جی چاہتا تھا کہ اپنا سر پیٹ لوں اور کپڑے پھاڑ کر کسی طرف نکل جاؤں۔

لیکن ابھی میں پورے طور پر مایوس نہیں ہوا۔ میں لپک کر اس کے پیچھے گیا میں نے پوچھا،-

"کیا آپ کی زندگی میں اس کے سوا اور کوئی بات نہیں ہوئی؟ کیا کبھی آپ پر کوئی حادثہ نہیں گزرا؟ کیا کبھی آپ کو کسی نے قتل کرنے کی کوشش نہیں کی؟ کیا آپ اپنی بیوی کی طرف سے کبھی بدگمان نہیں ہوئے؟ کیا آپ کے بڑے افسروں نے کبھی آپ کو کچلنا نہیں چاہا؟"

"نہیں نہیں ویسی کوئی بات نہیں ہوئی۔" اس نے میری بات کاٹ کر کہا۔ ظاہر تھا کہ وہ میرے ان آخری سوالات کا کچھ برا مان گیا۔ "جن باتوں کا آپ نے ذکر کیا ہے ان میں سے ایک سے بھی مجھے کبھی واسطہ نہیں پڑا۔ میری زندگی ہمیشہ پرسکون، ہموار اور باقاعدہ رہی ہے۔"

"کیا سچ مچ کچھ نہیں؟" میں نے کہا۔ "ذرا پھر سوچئے اور غور کیجئے مجھے یقین نہیں آ سکتا کہ آپ کی زندگی میں کوئی نشیب و فراز نہ آیا ہو۔ اس کے بغیر تو آپکی زندگی بڑی بے کیف اور بے رنگ ہو گی۔"

"آپ باور کیجئے کہ مجھ پر اس قسم کی کوئی افتاد نہیں پڑی۔" ظاہر تھا کہ اس کا پیمانۂ صبر لبریز ہو چکا ہے۔ پھر بھی اس نے خوش اخلاقی کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ اور بڑے تحمل سے کہا۔ "کم از کم کل تک تو ایسا نہیں ہوا تھا۔ ہاں آج آپ سے ملاقات میری زندگی میں ایک نئی بات ہے۔"

اور پھر میرے جواب کا انتظار کئے بغیر وہ وہاں سے چل پڑا۔ میں کئی منٹ تک گم سم، سکتے کے سے عالم میں کھڑا اس کے قدموں کی چاپ سنتا رہا، جو رفتہ رفتہ دھیمی ہوتی گئی، اور بالآخر رات کے سناٹے میں گم ہو کے رہ گئی۔

(ماخوذ)

(افسانہ)

تشنگی

شکیلہ معظم علی

آپا زاہدہ نے بالوں کے جھنڈ کو سپنوں کی قید سے آزاد کرتے ہوئے ایک سرسری سی نگاہ آئینہ پر ڈالی اور آہ بھرتے ہوئے سر کو دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔ ان کی بڑی بڑی بے رونق آنکھیں جن میں کچلی ہوئی اُمنگیں مدفون تھیں، آپ ہی آپ بند ہو گئیں اور جب کچھ دیر بعد انہوں نے سر اُٹھایا، تو ان کی آنکھوں میں آنسو چمک رہے تھے۔ کمرہ میں ایک سبز رنگ کا مدھم سا بلب ٹمٹما رہا تھا اور اُس ہلکی سی روشنی میں ہر چیز دھندلی دھندلی اور پُراسرار سی دکھائی دے رہی تھی۔ اوّل تو اس کمرہ میں تھا ہی کیا۔ ایک لمبا سا پلنگ جس کی صاف ستھری چادر پر ایک بھی شکن نہیں تھی، سرہانے چھوٹی سی میز پر رکھی ہوئی چند کتابیں، ایک ڈریسنگ ٹیبل، ایک وارڈروب اور سامنے دیوار پر لگی ہوئی ایک تصویر۔ اُفوہ! اس تصویر سے انہیں کتنی نفرت تھی۔ ایک پریشان حال سی لڑکی ایک چٹان سے چمٹی ہوئی، اس پانی کی طرف حسرت سے دیکھ رہی تھی، جو اس کی پہنچ سے دور، لیکن اسی چٹان کے کسی سوراخ سے نکل رہا تھا۔ اس تصویر کو دیکھ کر ان کا ذہن مسلسل اُلجھن میں مبتلا ہو جاتا تھا، لیکن نہ وہ اسے اپنے کمرہ سے نکال سکتی تھیں، نہ اُس سبز رنگ کے بلب کو بدل سکتی تھیں جو ان کی اماں نے کفایت کے خیال سے ان کے کمرہ میں لگا دیا تھا۔ ان کی اماں کی حد سے بڑھی ہوئی کفایت کی وجہ ان کے لئے بڑی کشش آمیز تھی کہ اماں ان کی شادی کے لئے پیسے جمع کر رہی تھیں۔ شادی! اس چھوٹے سے لفظ میں کتنی کشش اور کتنے معنی پوشیدہ تھے۔ انہوں نے ایک اچٹتی سی نظر آئینہ پر ڈالی اور اُن کے دل میں ایک ٹیس سی اٹھی۔ کیا انہیں اب سے بہت پیشتر شادی نہیں کر لینا چاہئے تھی؟ انہوں نے ایسا کیوں نہیں کیا؟ اس سوال کا جواب وہ صفائی سے اپنے آپ کو بتلاتے ہوئے بھی ڈرتی تھیں۔ شاید اُن کے خوابوں کا راجہ اُن کی زندگی میں اب تک آیا ہی نہیں۔ انہوں نے اس خیال سے اپنے دل کو تسلی دینا چاہی۔ مگر اُن کی بے تکلف اور پھیکی زندگی میں آیا ہی کون تھا۔ آپا زاہدہ نے بے چینی سے اپنے سر کو جھٹک دیا۔ وہ ان حقیقت آمیز خیالوں کی یورش سے بری طرح گھبراتی تھیں، لیکن اس سبز بلب کی ٹمٹماتی ہوئی روشنی واضح طور پر احساسِ تنہائی کو تیز تر کر رہی تھی۔ کاش! وہاں کوئی ہوتا۔ وہیں اس بے شکن چادر والے پلنگ پر ہلکے سبز سلیپنگ سوٹ میں ملبوس، بے ڈھنگے پن سے لیٹا ہوا کوئی ایسا شخص جو ان کی ویران آنکھوں کی گہرائیوں میں جھانک سکتا۔ انہوں نے جھنجھلا کر بتی بجھا دی۔ تاریکی اور تنہائی نے مل کر ان کے دل پر موہوم سا خوف طاری کر دیا۔ ان کا جی بے اختیار رو دینے کو چاہا، لیکن وہ آسانی سے شکست ماننے والی نہیں تھیں۔ "ہے آدمی بجائے خود اک محشرِ خیال"، انہوں نے سوچا؛

وہ نیم فلسفیانہ دماغ کی مالک تھیں، جس کی وجہ سے لوگ انہیں سنکی سمجھتے تھے، مگر کہتے نہیں تھے۔ لیکن ریحانہ کی زبان کو کون روکتا؟ اسے تو جیسے دوسروں پر فقرے کسے بغیر نیند نہیں آتی تھی۔ وہ کہتی:

"آپا زاہدہ! آپ کی زندگی کی دوسری ٹریجیڈیوں کے متعلق مجھے علم نہیں، لیکن سب سے بڑا المیہ غالباً یہی ہے کہ آپ غیر ضروری طور پر فلسفی ہیں؟"

کیا چبھتی ہوئی بات کہی تھی اُس کمبخت نے! گویا اسے اس کا احساس تھا کہ آپا زاہدہ اپنی زندگی سے مطمئن نہیں ہیں اور وہ مطمئن تھیں ہی کب؟ ان کی زندگی کا بیشتر حصہ اپنی اماں کی ڈانٹ پھٹکار سہنے اور اسکول کی چند بے حیا چنچل لڑکیوں کے ساتھ، جو اپنے آپ کو ان کی شاگرد نہیں بلکہ ساتھی سمجھتی تھیں، سر کھپانے میں گزرا تھا۔ ماضی سے متعلق چند ناخوشگوار یادیں اور بھی تھیں، جن کا تصور کچھ خوش کن نہیں تھا۔ آپا زاہدہ کو اس کا خوب احساس تھا اور وہ ماضی کی راکھ کو چھیڑنے سے گھبراتی

تھیں، مبادا اُن کی انگلیاں دبی دبائی چنگاریوں سے جھلس جائیں؛ لیکن ریحانہ کو کیا کہا جائے جو نادانستہ اور غیر شعوری طور پر اُن کے مصائب میں زیادتی کا سبب بن چکی تھی +

"ہائے اللہ! آپا زاہدہ، آپ کا کمرہ کیسا صاف ستھرا رہتا ہے۔ ایک ہمارا کمرہ دیکھئے۔ کیا گندگی پھیلائی ہے میرے میاں نے۔ کیا مجال جو اپنے کپڑے تک ڈھنگ سے رکھ لیں۔ صفائی کرتے کرتے ناک میں دم آگیا ہے"

آپا زاہدہ کے دل کو ٹھیس سی لگتی۔ ریحانہ کو کیا معلوم کہ وہ اپنے کمرے کی ان ویرانیوں سے، جسے وہ صفائی کہتی ہے، کتنی بیزار ہیں اور انہیں دن بھر کسی اکرم کے چاروں طرف بکھرے ہوئے کپڑوں، شیو کا سامان اور موزوں جوتوں کے انبار کو ٹھکانے سے سنبھالنے میں کوئی اعتراض نہیں؛

"کیا کر رہی ہے؛ سوئی نہیں تو اب تک؛ چل سو، ساتھ کے کمرے" ان کی اماں نے ڈانٹ کر حکم دیا اور وہ جیسے سہم کر کھلی ہوئی کھڑکی کے سامنے کھڑی کی کھڑی رہ گئیں۔ کیا انہیں سو جانا چاہیئے؛ انہوں نے آج تک اپنی اماں کے حکم سے سرتابی نہیں کی تھی اور شاید ——— انہوں نے ڈرتے ڈرتے سوچا۔ شاید یہ ان کی اماں کی حکومت پسندی اور انانیت کا ہی نتیجہ ہے کہ آج ان کا دل ہزاروں مچلتی ہوئی آرزوؤں کا مدفن ہے، لیکن وہ اماں کو زیادہ دیر تک قصوروار نہ ٹھہرا سکیں۔ اماں نے ان کی بہتری کے خیال ہی سے شروع شروع میں ان کے لئے آئے ہوئے پیاموں کو رد کیا تھا۔ وہ انہیں اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے قابل بنانا چاہتی تھیں اور اب کہ تعلیم مکمل کرکے انہیں اپنے پاؤں پر کھڑے ہوئے عرصہ ہو چکا ہے، اماں گھر کے اخراجات میں کاٹ چھانٹ کر کے ان کے لئے جہیز تیار کرنے میں تندہی سے مصروف ہیں۔ انہیں کس طرح قصوروار ٹھہرایا جا سکتا ہے۔ اگر انہوں نے آپا زاہدہ کی نقل و حرکت پر لاتعداد غیر ضروری پابندیاں عائد کر رکھی ہیں، تو یہ بھی انہی کی بہتری کے خیال سے۔ دنیا کی زبان کو کون روک سکتا ہے؛ عورت کی عزت موتی کی سی آب ہے۔ ذرا سی بے احتیاطی ہوئی اور ساری چمک زائل ہوئی، لیکن ریحانہ پر تو یہ نکتہ واضح ہی نہیں ہوتا تھا۔ وہ کہتی "عزت نہ ہوئی چھوئی موئی کا پودا ہو گئی۔ ہنستا بولنا، کھانا پینا سب کچھ حرام۔ کیوں جی، دوپٹہ ذرا سر سے ڈھلک گیا، تو کیا بے عزتی ہو گئی؟ آپا زاہدہ، جینا سیکھئے جینا، ہنسیے کھیلئے اور اپنی اماں سے کہہ دیجئے کہ آپ کی نگاہوں کا تعاقب نہ کیا کریں اور نہ آپ کی بے ضرر مسکراہٹ کی چھان بین۔ آپ کوئی بچی تو ہیں نہیں کہ بھلے بُرے میں تمیز نہ کر سکیں"

ریحانہ کی باتیں آپا زاہدہ کے دل کو لگتی ضرور تھیں، لیکن نہ جانے انہیں اس کی باتوں سے طنز کی بُو آتی تھی۔ اب بھلا بچپن کے ذکر کا کیا تھا؛ کیا یہ مرکا اُن پر نقو نہیں کسا گیا؛ یہ خود پسند اور مغرور لڑکی حقیر سمجھتی ہے۔ اُن کے دل میں بغاوت کا جذبہ پیدا کر کے ان ٹھیری ہوئی زندگی میں ہلچل مچا دینا چاہتی ہے، لیکن آپا زاہدہ اتنی بیوقوف نہیں ہیں کہ اُسے اپنے پر غالب آجانے دیں۔ انہیں اس سے مقابلہ کرکے اُسے نیچا دکھانا ہی ہوگا، مگر مشکل یہ تھی کہ یہ سانولے رنگ کی دُبلی پتلی سی لڑکی فتنہ تھی بالکل۔ اسے ہرا دینا آسان نہ تھا۔ بیزار آ کے بُرا بھی کہہ لو، بے غیرتی سے بیٹھی ہوئی کھلکھلایا کرتی اور پھر چپکے سے ایک آدھ جملہ کہہ جاتی جو سب کئے کرائے پر پانی پھیر دیتا۔ وہ مردوں کے مشورے غور سے سنتی۔ مگر کرتی وہی تھی جو اس کا اپنا جی چاہتا۔ اعلیٰ درجہ کی ضدی تھی وہ۔ اور لوگ اسے سمجھدار کہتے تھے۔ اُس چھوٹی سی جماعت کے ہر فرد نے، جسے آپا زاہدہ شیطانی لشکر کے نام سے موسوم کرتی تھیں، آپا زاہدہ کے بقول ریحانہ کو سر پہ چڑھا رکھا تھا کوئی بھی اس کی بات بُرا نہیں مانتا تھا۔ اسی دن ظہیر صاحب نے کہا "بھئی ریحانہ، تم قطعی منافقت پسند ہو۔ تمہارے منہ سے کبھی کسی کی بُرائی نہیں سُنی۔ اب یہ تو ہو نہیں سکتا کہ اس وسیع دنیا میں کوئی تمہیں بُرا ہی نہ لگتا؛ اگر کسی کو گدھا سمجھتی ہو، تو گدھا ہی کہو نا"

اور ریحانہ نے نہایت سنجیدگی سے سوال نما جواب دیا تھا "آپ بُرا تو نہیں مانیں گے" سب ہنسنے لگے تھے۔ اور سب میں نمایاں ظہیر صاحب کا قہقہہ تھا۔ لیکن آپا زاہدہ کو بہت غصہ آیا۔

ریحانہ کے بعد انہیں سب سے زیادہ چڑ ظہیر صاحب سے تھی۔ پتہ نہیں اس کی کیا وجہ تھی۔ ہر چند کہ اس جماعت میں ان کی حیثیت ایک بزرگ کی سی تھی۔ وہ ہر ایک سے بزرگانہ شفقت سے بات چیت کرتے تھے۔ موقع بے موقع ہر ایک کو ڈانٹتے بھی تھے لیکن آپا زاہدہ کا بہت ادب کرتے تھے۔ جب تک آپا زاہدہ کسی غیر اہم مسئلہ پر اہم تقریر کرتی رہتیں، وہ کرسی پر پہلو بدلا کرتے۔ اور اچانک گھڑی دیکھ کر اٹھ کھڑے ہوتے۔ ریحانہ کہتی "واہ؛ ابھی تو آپا زاہدہ ہمیں جانے نہ دیں گی" آپا زاہدہ اس بیجا مداخلت پر سٹپٹا جاتیں اور

رہا کر مسکراتے ہوئے اوپری خانہ کا رخ کرتیں۔ ظہیر صاحب ریحانہ
بت دیکھ کر مسکراتے اور پھر تاش کی محفل جم جاتی۔ تاش کھیلنے کا
ب کو بہت شوق تھا اور ریحانہ تو جیسے برج پر مرتی تھی۔ تو کیا آپا زاہدہ
اس کھیل میں حصہ لینے کو نہیں چاہتا تھا؟ مگر وہ کیا کریں ہر دوں
ساتھ تاش کھیلنا اُن کی اماں کی نظروں میں ناقابلِ معافی جرم تھا۔
نہیں عافیت اسی میں نظر آتی تھی، کہ بالوں کو اچھی طرح ڈھانپ
سز ظہیر کے پاس جا بیٹھتیں جو اس جماعت میں ان کی واحد
ان تھیں۔

"مسز ظہیر" وہ ہمیشہ منہ کو گول بنا کر ظہیر کا تلفظ ادا کرتی تھیں "آپ
لی کو آپ سے بہت محبت ہے نا؟" آپا زاہدہ نے معنی خیز مسکراہٹ
ہلے ظہیر صاحب کو دیکھا، اور پھر ریحانہ کو دیکھتے ہوئے مسز ظہیر کی
ں میں آنکھیں ڈال دیں۔ مسز ظہیر اس غیر ضروری سوال سے متعجب سی
ہا۔ ان کی بارہ چودہ سال کی شادی شدہ خوشگوار زندگی اس
کا جیتا جاگتا جواب تھی، لیکن آپا زاہدہ نے کہا۔

"مرد کا اعتبار ہی کیا۔ نہ جانے کب کس پر طبیعت پھسل جائے"
ہوں نے پھر ریحانہ کو دیکھا! پھر ظہیر صاحب پر حقارت آمیز نظر ڈالی
ر مسکرا دیں۔ مسز ظہیر کی نظروں نے ان کی نگاہوں کا تعاقب کیا۔
بھر کے لئے ان کی نظر ریحانہ کے دمکتے ہوئے چہرہ پر اٹک گئی جو اکرم
وق نظروں سے تک رہی تھی۔ مسز ظہیر نے اطمینان کا سانس لیا اور
ہدہ سے کہنے لگیں "آپ کی طبیعت میں شک بہت زیادہ ہے"

"خدا نہ کرے کہ آپ کو اپنی خوش فہمی کی قیمت دینا پڑے" آپا زاہدہ نے
چونکا دینے والے لہجے میں کہا۔ اور مسز ظہیر کے اچانک چونک پڑنے
ا زاہدہ نے آہستہ آہستہ انہیں بہت سی باتیں بتائیں "آپ کے
سے پہلے آپ کو معلوم ہے یہاں کیا ہوتا تھا؟
سینما چلیں گے" ریحانہ صاحبہ اٹھلائیں۔ اور سب لوگوں کی مخالفت
جود ظہیر صاحب سینما چلنے پر مصر ہوتے۔ پوچھئے کیوں؟ کیونکہ یہ ریحانہ
ہش تھی۔ اللہ! کیسی اچھی چاندنی ہے، چلئے پکنک کریں" اور ظہیر صاحب
سے آگے آگے چل دئے۔ کیوں بھئی؟ ریحانہ کا جی نہ میلا ہو جائے۔ یہی
ہوں گے ساری پارٹی باہر جانے پر آمادہ ہے لیکن چونکہ ریحانہ کے
یا گھر بیٹھ کر تاش کھیلنے میں زیادہ دلچسپی رہے گی، ظہیر صاحب بیٹھے
بیٹھ گئے ہیں۔ یہ سب کچھ کیوں؟ اگر درمیان میں کچھ نہیں ہے؟

انہیں ریحانہ کی بات کا اتنا ملال کیوں ہے؟ آپ کہتی ہیں ظہیر صاحب خود
برج کے بہت شوقین ہیں۔ چاندنی راتیں انہیں پسند ہیں۔ سینما سے
انہیں دلچسپی ہے۔ اس وقت ان کی سینما سے دلچسپی کہاں چلی گئی تھی جب
ایک بار میں نے سینما چلنے کی تجویز پیش کی تھی تو ظہیر صاحب کسی سے ملنے کا
بہانہ کر کے چل دئے تھے؟" آپا زاہدہ نے حقارت سے ظہیر صاحب کو دیکھا۔

مسز ظہیر نہ آپا زاہدہ کی نگاہوں کو دیکھ سکیں، نہ ان کے لہجے کی تلخی کو
محسوس کر سکیں۔ وہ سوچ رہی تھیں۔ ریحانہ کی خواہشوں کا احترام! ریحانہ کا
جی میلا ہو جانے کا خیال! انہیں ظہیر صاحب کی وقتاً فوقتاً کہی ہوئی باتیں
یاد آنے لگیں "ریحانہ بہت سمجھ دار ہے۔ ریحانہ غیر معقول باتیں نہیں کرتی۔
ریحانہ ——" تو اسلئے ریحانہ کے نام کی تسبیح پڑھی جاتی ہے۔ انہیں خیال
آیا کہ وہ کچھ مبالغہ کر رہی ہیں۔ اور ناانصافی بھی۔ ظہیر صاحب نے کبھی ریحانہ کے
متعلق زیادہ باتیں نہیں کیں۔ "مرد کا اعتبار ہی کیا" آپا زاہدہ کے الفاظ ان
کے کانوں میں گونجے۔ ظہیر صاحب کا ریحانہ کے متعلق زیادہ باتیں نہ کرنا ہی ان
کی مکاری کا بیّن ثبوت ہے۔

اور ظہیر صاحب ریحانہ کے استفسار پر کہہ رہے تھے "ہاں آجکل ایک
بہت اچھی تصویر چل رہی ہے۔ کیوں بھئی چلتی ہو؟" وہ اپنی بیوی کی طرف
مخاطب تھے۔ مسز ظہیر کچھ چڑ سی گئیں "میرا جی نہیں چاہتا آپ لوگ
جائیے"

اور جیسے ظہیر صاحب اور ریحانہ نے یک زبان ہو کر کہا "آج آپ کا
جی نہیں چاہتا تو چلئے پھر کبھی سہی" مسز ظہیر زیادہ چڑ گئیں "مکار!" انہوں
نے دل ہی دل میں پتہ نہیں دونوں میں کس کے متعلق کہا۔

اور ظہیر صاحب اور ان کی بیوی کے جانے کے بعد ریحانہ نے بچوں کی
طرح مچل کر کہا "آج تو ضرور ہی سینما دیکھیں گے"

"ضرور" اس کی بات ختم ہونے سے پہلے ہی اکرم اپنی ٹائی ٹھیک کرتا
ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔

"ضرور" احمد نے جوتوں کے تسمے کستے ہوئے کہا۔

"خوب!" آپا زاہدہ نے جیسے بل کھاتے ہوئے سوچا۔ احمد ان کا اپنا
بھائی بھی ریحانہ سے متاثر ہو چلا ہے۔ ہونا ہی تھا۔ آپا زاہدہ اور اُن کی اماں
کو آئے ہوئے ابھی دن ہی کتنے ہوئے ہیں۔ پورے ایک سال سے وہ ریحانہ
اور اکرم کے ساتھ ایک ہی مکان میں رہتا ہے۔ ریحانہ جیسی جیسے دوسروں
کو اپنا بنانے، یا یوں کہئے کہ دوسروں کو بیوقوف بنانے کے سینکڑوں گُر

آتے ہیں اور احمد ایسا سیدھا سادا مخلص سا لڑکا، جو چھوٹی چھوٹی باتوں سے متاثر ہو جاتا ہے۔ اگر ریحانہ نے اس کے سوٹ پر استری کر دی تو وہ ممنون ہے۔ اس کا کمرہ صاف کر دیا گیا، وہ شکرگزار ہے، اس کی فرمائش پر کوئی چیز پکا دی، وہ خوش ہے۔ اسے پاگل بنانا کونسا مشکل ہے۔

ریحانہ، اکرم اور احمد کے جانے کے بعد (آپا زاہدہ نے خفا ہو کر ساتھ جانے سے انکار کر دیا تھا) انہوں نے اپنی اماں سے کہا: "دیکھا آپ نے، آپ نے یہاں پہنچنے میں دیر کی، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ احمد اس حد تک ان لوگوں کے اثر میں آ چکا ہے کہ اسے اپنی ماں اور بہن کی پروا نہیں رہی، میں نے ان لوگوں کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا تھا۔ تو کیا اسے یہ نہیں چاہئے تھا کہ وہ بھی ہمارے ساتھ گھر پر ہی رہے؟"

اماں پہلے ہی احمد سے اس بنا پر خوش نہیں تھیں کہ ان کے بار بار لکھنے کے باوجود احمد نے الگ گھر کا انتظام نہیں کیا تھا اور اب بھی کہ ان لوگوں کو آئے ہوئے دو ماہ ہو چکے ہیں، وہ ان کے اصرار پر ہمیشہ یہی کہتا ہے: "آپ کو معلوم نہیں اماں جس وقت میں تنہا، اور تنہائی کی وجہ سے زندگی سے بیزار تھا، یہ لوگ کمال مہربانی سے میرے ساتھ رہنے پر آمادہ ہو گئے، اور ہم لوگ ہمیشہ بہت خوش رہے ہیں۔ آپ کی آمد کی خبر پر مسز اکرم نے علیحدہ مکان لے لینے کی تجویز پیش کی تھی۔ اس خیال سے کہ اکٹھے رہنے کی وجہ سے شاید عورتوں میں چھوٹی چھوٹی باتوں پر غلط فہمیاں پیدا ہو کر رنجشوں کی شکل اختیار کر لیں۔ میں نے ان کے اس خیال کا مذاق اڑایا تھا۔ اب میں ان سے کس طرح کہوں کہ وہ علیحدہ گھر کا انتظام کریں، جبکہ مجھے ان سے کوئی شکایت نہیں ہے۔" اور اماں کے بدلتے ہوئے رنگ کو دیکھ کر اس نے جلدی سے کہا: "اب اگر ان کی طرف سے اس قسم کی خواہش کا اظہار ہوتا ہے تو آپ کی مرضی کے مطابق میں ان سے ہمارے ساتھ ٹھہرنے پر اصرار نہیں کروں گا۔" اور احمد نے غیر محسوس سی ٹھنڈی سی سانس لی۔

اماں نے بگڑ کر کہا: "ان کی طرف سے ابتداء کاہے کو ہوگی — دیکھتے نہیں ہو ریحانہ کو۔ رانی بنی بیٹھی ہے سارے گھر پر قبضہ کئے ہوئے۔ کرایہ کا ایک پیسہ نہیں دینا پڑتا۔ تم اپنی ساری تنخواہ دوسروں پر اڑا دیتے ہو۔"

اور احمد نے جیسے برا مان کر کہا: "مکان کا کرایہ تو مجھے بھی اپنی جیب سے نہیں دینا پڑتا، حکومت دیتی ہے اور میری تنخواہ کے اڑ جانے میں ریحانہ کا کوئی ہاتھ نہیں ہے۔ میں نے شروع شروع میں ریحانہ اور اکرم سے کہا تھا کہ ہم مل جل کر گھر چلائیں گے، لیکن ریحانہ نے جواب دیا تھا "کمال آپ کا۔ کرایہ کمپنی سے ملے ہیں اس سے بحث نہیں اور باقی سارے اخراجات کے ہم ذمہ دار ہیں"۔ اور مجھے تو اتنا بھی معلوم نہیں کہ میرے کپڑوں کی دھلائی کہاں سے جاتی ہے۔ میری تمام ضرورتیں کس طرح پوری ہوتی ہیں۔ اکثر میرے دوستوں کی دعوتیں ہوتی ہیں، کس طرح؟ مجھے معلوم نہیں۔ مجھ سے اگر کبھی کچھ پیسے لئے گئے ہیں تو بطور قرض، جو میرے نہ لینے کے اصرار کے باوجود مجھے واپس مل گئے ہیں۔

"رہا ریحانہ کا گھر پر قبضہ جما کر رانی بننے کا سوال۔ اس نے کتنی بار مجھ سے اور آپ سے کہا ہے کہ آپ بزرگ ہیں، گھر آپ سنبھال لیجئے۔ معلوم نہیں کن وجوہ کی بنا پر آپ یہ ذمہ داری قبول کرنے پر تیار نہیں ہیں۔ اور ان لوگوں نے میرے اخراجات کا ذمہ لیا تھا۔ میرے خاندان والوں کی پرورش کا بیڑا نہیں اٹھایا تھا۔ آپ لوگوں کو یہاں آئے ہوئے دو ماہ ہو چکے ہیں۔ مہمانداری کی بھی انتہا ہوتی ہے۔ ہمیں خرچ آدھا آدھا بانٹ لینا چاہئے۔ ان لوگوں پر اتنا بوجھ ڈالنا مناسب نہیں ہے۔ میں جانتا ہوں وہ خود کچھ نہیں کہیں گے مگر —" احمد اماں کے بگڑے ہوئے تیور دیکھ کر سہم کر خاموش ہو گیا۔

"وہ کہہ بھی کیا سکتے ہیں؟" اماں چلائیں۔ "پانچ سو روپے ماہوار کے مکان میں بادشاہت کر رہے ہیں۔ اپنے پلے سے اتنی رقم نکلتی تو پتہ چلتا۔ اور تم انہیں کی ہمدردی کر رہے ہو۔ اپنے مستقبل کا کچھ خیال ہے، نہ ماں بہن کی پروا۔ کیسی قیدیوں کی سی زندگی گذار رہے ہیں ہم لوگ۔ کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگا سکتے۔ کسی کام میں دخل نہیں دے سکتے۔ اور —"

لیکن احمد سے خاموش نہ رہا گیا: "آپ کو منع کون کرتا ہے اماں، بلکہ مجھے تو ترس آتا ہے کہ ریحانہ دن بھر گھر کے کاموں میں لگی رہتی ہے۔ اور آپا زاہدہ مزے سے اپنے کمرے میں آرام کیا کرتی ہیں۔ اور —"

اچانک احمد کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ اماں اتنے زیادہ غصہ میں ہیں کہ انہیں اس طرح قائل نہیں کیا جا سکتا۔ صاف گوئی اور سچائی سے حالات کبھی سدھرتے بھی ہیں۔ اور اس نے ایک دم بات پلٹ دی: "چلئے اماں مسز ظہیر کے ہاں چلیں۔"

اماں کو اپنے بیٹے سے بہت زیادہ محبت تھی۔ وہ اس کی کسی بھی ضروری فرمائش کو، جب تک کہ وہ ان کی اپنی کسی خواہش سے نہ ٹکرائے، نہیں ٹالتی تھیں۔

اور آپا زاہدہ اس ساری بحث سے بے خبر بیٹھی ہوئی اماں کے کہے ہوئے صرف ایک لفظ پر غور کر رہی تھیں۔ ان میں یہ زبردست خوبی تھی، کہ وہ جب چاہتی تھیں، ماحول سے بے خبر ہو جاتی تھیں۔ "رانی! رانی!" انہوں نے زیرِ لب دہرایا۔ اور بالکل غیر متعلق طور پر انہیں ریحانہ کے والدین پر غصہ آ گیا۔ آخر انہوں نے اس کے لئے یہ نام کیوں چنا تھا۔ اگر اس کا نام ریحانہ نہ ہوتا تو اکرم اسے نام کی رعایت سے پیار سے رانی کہکر نہ پکارتا، تو ریحانہ کی آنکھوں کی چمک نہ بڑھ جایا کرتی، جسے محسوس کر کے آپا زاہدہ کی طبیعت جھنجھلا جاتی ہے۔ یہ خوشامد پسند مرد لفظوں کی الٹ پھیر سے کس طرح عورتوں کو بیوقوف بنا لیتے ہیں۔ اور وہ بڑی خوشی سے مردوں کے ہاتھوں کھلونا بننے پر آمادہ ہو جاتی ہیں — لیکن یہاں تو معاملہ ہی الٹا تھا۔ خود اکرم ریحانہ کے اشاروں پر ناچتا تھا۔ آپا زاہدہ کو اکرم ناپسند نہ تھا، بلکہ ظریف الحسن کے بعد ان لوگوں میں وہ اکرم کو ہی پسندیدگی کی نظر سے دیکھتی تھیں، لیکن ان کی طبیعت کس بری طرح الجھتی تھی جب ریحانہ کے آتے ہی اکرم آپا زاہدہ کے ساتھ زیرِ بحث سنجیدہ موضوع کو بیچ میں چھوڑ کر اس کی بے تکی باتوں کی طرف متوجہ ہو جاتا تھا۔ اور خواہ مخواہ نخرے کرنا شروع کر دیتا۔ "تھک گئیں رانی؟" "ہاں ذرا پانی پلا دو نا۔" اور وہ سعادتمندی سے پانی لینے چلا جاتا۔

آپا زاہدہ کو اکرم کی حالت پر افسوس ہونے لگتا۔ اتنا اچھا لڑکا، کیا اس چھوکری کے ہاتھوں بیوقوف بن رہا ہے۔ اسے اپنی خودداری کا بھی احساس نہیں ہے۔ اس کی خدمت کے لئے اس طرح تیار رہتا ہے گویا وہ سچ مچ رانی ہی ہے اور وہ ایک ادنیٰ خادم۔ عورتوں کو کس طرح قابو میں رکھا جاتا ہے، اسے بالکل علم نہیں۔ وہ یہ بھی نہیں جانتا کہ اسے ریحانہ سے بہت بہتر لڑکیاں مل سکتی تھیں، جو اسے دیوتا بنا کر پوجتیں اور اچانک وہ ریحانہ پر بے رحمی سے تنقیدی اور اپنے ساتھ موازنہ کرنے لگیں۔ اس میں دھرا ہی کیا ہے۔ نہایت ہی واجبی سی شکل ہے۔ آپا زاہدہ کی بڑی بڑی آنکھوں، غیر معمولی طور پر پتلے ہونٹوں اور وسیع پیشانی کے مقابلے میں، اس کا کوئی بھی نقش اتنا تیکھا نہیں ہے۔ رنگت اس کی کونسی ایسی کھلتی ہوئی ہے، البتہ اسے میک اپ کا ایسا ڈھنگ آتا ہے کہ خاصی قبول صورت لگتی ہے اور کمبخت کی آنکھوں میں کاجل بلا کا جچتا ہے اور اس کا سر کو قدرے جھکا کر، پوری آنکھیں کھول کر غور سے دیکھنے کا بے جھجک انداز جیسے مخاطب کے دل کی گہرائیوں ہی میں تو اتر جائے گی۔

جانے لوگ اس ادا سے متاثر ہوتے ہوں، مگر آپا زاہدہ کو تو اس چھچھورپن اور بے حیائی پر غصہ ہی آتا ہے۔ شرم عورت کا زیور ہے۔ آپا زاہدہ اس کی سختی سے قائل تھیں اور آنچل کو رکھ کے سر پہ، شرما کے مسکرانا ان کی خاص ادا تھی اور ریحانہ انہیں ٹوکتی۔ "آنا مت شرمایا کرو آپا زاہدہ! غیر ضروری شرم دوسرے کی ہمت بڑھاتی ہے۔ ویسے بھی اگر ظریف الحسن آپ کی خیریت پوچھتے ہیں تو اس میں شرمانے کی کیا بات ہے؟"

وہ ریحانہ سے زیادہ سمجھدار تھیں۔ اس سے بہت زیادہ تعلیم یافتہ تھیں۔ اور دنیا کا انہیں اس سے زیادہ تجربہ تھا۔ لیکن اگر ریحانہ ڈھٹائی سے کم بختی پر اتر آئے تو اس کا کیا علاج۔ "زندگی کا تجربہ محض کتابوں سے تو حاصل نہیں ہوتا، آپا زاہدہ۔ اگر آپ کتابوں کے انبار سے نکل کر صرف شرمانے اور مسکرانے میں وقت گذار دیں گی اور شرمیلی مسکراہٹ سے تھک کر پھر کتابوں میں جت جائیں گی، تو آپ کو یہ معمولی سی بات بھی معلوم نہیں ہو سکتی، کہ ایک ہی ماحول کا مختلف انسانوں پر کیا مختلف اثر ہوسکتا ہوتا ہے اور کیوں ہوتا ہے؟ اور — اچھا یہ تو اندازہ لگائیے کہ ظریف الحسن اس وقت کیا سوچ رہے ہیں؟"

ریحانہ عموماً ایک بات ختم کئے بغیر بے تکے پن سے موضوع بدل دیا کرتی تھی۔ آپا زاہدہ کو یقین تھا کہ اس میں سنجیدگی سے بات کرنے اور سنجیدہ بات کو سمجھنے کی صلاحیت ہی نہیں ہے۔ اس کے علاوہ ریحانہ کو قصداً یا غیر ارادی طور پہ دکھتی رگیں چھیڑنے کا ملکہ تھا۔ آپا زاہدہ کو عافیت اسی میں نظر آتی تھی، کہ وہ اس کے ساتھ کسی بحث میں نہ الجھیں۔ اور آپا زاہدہ کو نفسیات سے بہت لگاؤ تھا اور اس بات پہ ناز بھی کہ وہ انسان کی صورت دیکھ کر، اس کی صحیح فطرت کو پہچان سکتی ہیں اور صحیح طور پہ اندازہ لگا سکتی ہیں کہ کون کس وقت کیا سوچ رہا ہے۔ انہیں خیال آیا کہ یہ ریحانہ کو قائل کر کے شرمندہ کرنے کا اچھا موقع ہے۔ انہوں نے غور سے ظریف الحسن کو دیکھا، جو بہت دیر سے کسی رسالہ کے ایک ہی صفحہ پہ نظر جمائے ہوئے کچھ سوچ رہے تھے اور ایک بار کاغذ پہ کچھ لکھ کر کاٹ چکے تھے اور اب ریحانہ کے منہ سے اپنا نام سن کر اس کی طرف دیکھنے لگے تھے۔ اور انہوں نے دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔ "آپ دونوں میں سے جو بھی ٹھیک ٹھیک بتائے گا کہ میں کیا سوچ رہا تھا، میں اسے مان لوں گا۔"

"ریحانہ برا تو نہیں مانیں گی؟" آپا زاہدہ نے اطمینان کہتے ہوئے کہا۔

"ظریف الحسن سوچ رہے تھے کہ ریحانہ نے آپ کو اتنا اونچا اور سمجھدار کیوں سمجھتی ہے۔ اسے وہی سمجھنا چاہیئے جو وہ دراصل ہے۔" آپا زاہدہ نے نہایت صفائی سے اپنی اسی رائے کا جو وہ ریحانہ کے متعلق قائم کر چکی تھیں، اظہار کر دیا۔ "خواہ آپ مانئے نہیں، مگر آپ کے دل میں قطعی یہ خیال تھا" انہوں نے شرماتے ہوئے زور دیا۔

"آپ نے کس طرح یہ اندازہ لگایا؟" ظریف الحسن نے حسب عادت جرح کی۔

"ریحانہ کی بے تکی باتیں سن کر ہر سمجھدار شخص کو یہی اندازہ ہوتا ہے۔ اور پھر اس کی طرف آپ کا غور سے دیکھنا۔ ظاہر ہے آپ اسی کے متعلق سوچ رہے تھے۔"

"اب آپ بولئے مسز اکرم۔" ظریف الحسن نے فرمائش کی۔

"میں اب کیا بولوں۔ آپا زاہدہ جیت گئیں۔" ریحانہ شرارت سے مسکرائی۔ "ویسے میرا خیال تھا کہ آپ زیرِ نظر مضمون کا ترجمہ کرنا چاہتے تھے۔ عنوان کا ترجمہ آپ نے کیا بھی، جو آپ کو پسند نہیں آیا۔" ریحانہ کو ان کے ادبی ذوق کا علم تھا۔

ظریف الحسن نے لمحہ بھر کے لئے ٹھٹک کر اسے غور سے دیکھا۔ اور رسالہ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "آپا زاہدہ جیت گئیں۔ میں مان گیا۔ مسز اکرم واقعی آپ کو اپنے متعلق وہی سمجھنا چاہیئے، جو آپ ہیں۔" انہوں نے آخری الفاظ پر زور دیا۔

آپا زاہدہ نے خوش ہو کر ریحانہ کو دیکھا۔ ان کا خیال تھا کہ ریحانہ جھینپ کر چڑ جائے گی۔ اس کے چہرہ پر ہلکی سی سرخی دیکھ کر جیسے ان کے خیال کی تائید ہو گئی، لیکن وہ فوراً ہی جیسے سمجھ کر ہنسنے لگی۔

اور آپا زاہدہ نے سوچا "کوئی اس حد تک بے غیرت نہ ہو۔"

اور ریحانہ نے سوچا "ظریف الحسن کی باتیں اتنی بے معنی نہیں ہوتیں جیسا کہ سمجھی جاتی ہیں۔"

اور ظریف الحسن نے سوچا۔ "آپا زاہدہ نہ جانے ریحانہ سے کیوں بدظن ہیں۔ اس میں کوئی خرابی نہیں۔ بہت سمجھدار اور نہایت گہری لڑکی ہے۔"

ظریف الحسن بہت شریف، نیک اور مخلص قسم کے لوگوں میں سے تھے۔ عام خیال تھا کہ وہ بہت سیدھے سادے ہیں اور آسانی سے بیوقوف بنائے جا سکتے ہیں۔ ریحانہ کو اس خیال سے اتفاق نہیں تھا۔ وہ کہتی تھی کہ ظریف الحسن ان لوگوں میں سے ہیں جنہیں اپنے آپ کو ظاہر کر کے، دوسروں کو بیوقوف بنانے میں مزا آتا ہے۔ بہر صورت وہ ہر ایک کی دلچسپی کا مرکز تھے اور سب کو ان پر بھروسہ تھا کہ برا نہیں مانیں گے۔ ان کی دلچسپ شخصیت اور پُر خلوص برتاؤ کی وجہ ہر شخص ان کا خیال رکھتا تھا۔ ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ اس پردیس میں تنہا تھے۔ یوں بھی وہ شادی شدہ نہ تھے اور غالباً اسی لئے آپا زاہدہ سب سے زیادہ ان کے بچاؤ کی فکر تھی اور انہیں یقین تھا کہ جب بڑے بڑے ذمہ دار آدمیوں کو (ان کا اشارہ ظہیر صاحب کی طرف) بیوقوف بنانے سے نہیں چوکتی، تو ظریف الحسن کو جن پر کوئی ذمہ داری نہیں ہے اور جو خود مخلص ہونے کی بناء پر تصنع آمیز برتاؤ کو بھی خلوص سمجھ لیتے ہیں، پاگل بنانے میں کوئی رکاوٹ نہیں ہو سکتی۔ ویسے ظریف الحسن انہیں پسند بھی تھے اور ان کے متعلق وہ ظہیر صاحب اور اکرم سے زیادہ سوچ سکتی تھیں۔ آپا زاہدہ نے وقتاً فوقتاً ریحانہ کی مکاری اور دوسری خامیوں کے متعلق، جن پر محض ان کی تیز نظر ہی پڑی تھی، بڑی ہوشیاری سے ظریف الحسن کے سامنے تنقید کی تھی اور یہ بھی بتایا تھا، کہ جب ریحانہ ان کا مذاق اڑاتی ہے تو آپا زاہدہ کو اچھا نہیں لگتا۔

ظریف الحسن سب کی سن لیتے تھے۔ انہوں نے آپا زاہدہ کی بھی سنی۔ اب یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ ان باتوں کا اثر تھا، یا ریحانہ کے تیز تیز فقرے اور شوخ جملے ان کے لئے کشش آمیز تھے، لیکن یہ دیکھا گیا کہ وہ بات بات پر ریحانہ سے الجھ پڑتے تھے اور طرح طرح سے بحث میں الجھا کر اسے قائل کرنے کی کوشش کرتے جو عموماً ناکامیاب رہتی تھی۔ اور آپا زاہدہ خوش تھیں کہ ان کی کوششوں کی بناء پر ظریف الحسن ریحانہ سے مرعوب نہیں ہوئے۔

اور اب حالات بدل رہے تھے۔ دلچسپیاں محدود ہو رہی تھیں۔ اماں نے ریحانہ سے بات کرنا چھوڑ دیا تھا۔ احمد جھینپا ہوا سا نظر آتا تھا۔ مسز ظہیر کی گفتگو میں ریحانہ کو رکھائی محسوس ہوتی تھی۔ ظریف الحسن اس کے ہر فقرے کو خاموشی سے پی لیتے تھے۔ اور ظہیر صاحب خاموش تھے۔

"کیوں آخر؟" ریحانہ نے آپا زاہدہ سے پوچھا۔

"یونہی تمہیں خیال ہو گیا ہے۔ سب لوگ پہلے ہی کی طرح تم سے محبت کرتے ہیں۔" آپا زاہدہ کے لہجہ کی تلخی نے ریحانہ کو سوچنے پر مجبور کر دیا۔ محبت کی ضرورت نہ اسے پہلے تھی نہ اب ہے۔ لیکن مل جل کر

بیٹھنے اور ہنس کھیل کر وقت گذارنے میں یہ رکاوٹیں کیوں پیش آرہی ہیں۔ اب سب ملتے ہیں، تو ہر شخص سنبھل سنبھل کر بات کرتا ہوا کیوں محسوس ہوتا ہے؟ احمد کو کیا ہوگیا ہے؟ اماں کیوں بگڑی ہوئی ہیں؟ ظہیر صاحب اور مسز ظہیر کی اس نے ہمیشہ عزت کی ہے، اس نے تو کسی کا بھی کچھ نہیں بگاڑا۔ آپا زاہدہ سے البتہ بے ضرر سی چھیڑ چھاڑ چلتی ہی رہتی ہے اور اب تو وہ بھی اکثر اپنا کمرہ اندر سے مقفل کئے رہتی ہیں اور ریحانہ کچھ نہ سمجھ سکی۔ اور اکرم نے کہا: "بیوقوف مت بنو۔ سب کے سب ٹھیک ہیں" لیکن ریحانہ کو محسوس ہو رہا تھا کہ ہر بات غلط ہو رہی ہے۔ اور اسے بہت جلد ثبوت مل گیا۔ ناشتہ پر بسکٹوں کے خالی ڈبہ کے اندر جھانکتے ہوئے اس نے بے دھیانی میں احمد کو مخاطب کیا:

"کیوں بھئی، کل شام چائے پر ڈبہ بھرا ہوا تھا نا۔ ایں؟"

"تو احمد سے کیا پوچھ رہی ہو؟ کیا اس نے آدھی رات کو اٹھ کر بسکٹ نگل لئے" احمد کی بجائے اس کی اماں نے بپھر کر جواب دیا۔

اور ریحانہ سہم گئی۔ چند لمحوں کے بعد جب وہ کچھ سمجھی تو اس نے شرمندگی سے کہا: "میرا یہ مطلب نہیں تھا اماں۔ مجھے خیال تھا کہ شام چائے کے بعد بسکٹ موجود تھے۔ میں نے سوچا کہ پہلے تصدیق کر لوں تو نوکر سے باز پرس کروں۔ اب یہ اتفاق ہے کہ میری نظر سب سے پہلے احمد صاحب پر پڑی اور میں نے انہیں کو مخاطب کر لیا۔" اور وہ تیزی سے کمرے سے باہر نکل گئی۔ احمد دیر ہونے کا بہانہ کر کے ناشتہ کئے بغیر دفتر چلا گیا۔

اور اکرم نے ریحانہ سے کہا "غلطی تمہاری ہی ہے تمہیں سوچ سمجھ کر بات کرنی چاہیئے" لیکن اب آئے دن اس قسم کے واقعات پیش آرہے تھے اور اب ہر بات تو ریحانہ کی غلطی کہہ کر اسکے سر نہیں منڈھی جاسکتی تھی۔ تین چار دن کے بعد احمد کے ہاتھوں میں کھانے پینے کی چیزوں کے چند ڈبے دیکھ کر وہ حسب دستور خوش ہو کر آگے بڑھی "اہا۔ احمد صاحب کیا کیا لے آئے آپ؟" "آپ صبح ذکر کر رہی تھیں نا کہ چائے کی پتی ختم ہو گئی ہے اور یہ دیکھئے یہ کچھ پھلوں کے ٹین ہیں یہ جام ہے یہ مکھن اور جناب" احمد نے ایک خوبصورت سے ڈبے کو اٹھا کر کہا "اگر آپ بوجھ جائیے کہ یہ میں آپ کے لئے کیا لایا ہوں تو جانوں۔"

ریحانہ نے خوش ہو کر ہاتھ بڑھایا "دیکھوں"

"ادھر کیا دیکھتی ہو۔ یہ دیکھو یہ" اماں نے اس کے بڑھے ہوئے ہاتھوں میں بل تھما دیا۔

ریحانہ غیر محسوس طور پر کانپ سی گئی۔ اس کے ہونٹ لرزے اس نے احمد کی جھکی ہوئی آنکھوں کو دیکھا اور کچھ کہہ نہ سکی۔ اکرم نے خاموشی سے اپنا بٹوا نکالا۔

"اکرم صاحب۔ اماں کا یہ مطلب نہیں تھا۔ میں ان چیزوں کی قیمت ادا کر چکا ہوں" احمد نے بےبسی سے اکرم کو دیکھا۔ اکرم نے احمد پر بھرپور نظر ڈالی اور اس نے سوچا۔ احمد مجبور ہے اس کا کوئی قصور نہیں اور اس نے بات ٹال دی۔

اور اسی دن اکرم نے خود ریحانہ سے کہا "اپنا سامان سنبھالو بی۔ اب یہ سوال پیدا نہیں ہوتا کہ ہماری علیحدگی سے احمد کو تکلیف ہوگی۔ ہماری موجودگی البتہ اس کے لئے تکلیف کا باعث ہے۔"

فرحت صاحب کے کانوں میں ان باتوں کی بھنک نہ پڑ سکی۔ لیکن ان کی دوربیں آنکھوں نے کچھ دیکھا ضرور۔ انھوں نے اکرم سے کہا "اگر ریحانہ اسی سرعت سے دبلے پن کی طرف مائل رہی تو کچھ دن بعد اسے پالنے کے لئے تمہیں یقیناً بستر کی چادر کو جانا پڑے گا" یہ اور کچھ سنجیدگی سے کہنے لگے "ریحانہ کی اور ان لوگوں کی طبیعتوں میں بہت اختلاف ہے۔ مجھے تو حیرت ہے اس نے تین ماہ یہاں کس طرح گذارے ہیں۔ میں تو اب یہاں ان کے ڈر سے کانپتا ہوا داخل ہوتا ہوں اور ریحانہ کی آپا زاہدہ کی موجودگی سے مجھے دہشت ہوتی ہے۔ جب تک مکان کا انتظام ہو، تم لوگ میرے یہاں چلے آؤ۔"

فرحت صاحب بامذاق مہذب اور سمجھدار لوگوں میں سے تھے اور چونکہ انھوں نے ان سب سے زیادہ دنیا دیکھی ہوئی تھی اور انسانوں کو سمجھا تھا وہ کامیابی سے زندگی گذارنے کا ڈھنگ جانتے تھے۔

"نہ میٹھا بن کہ چٹ کر جائیں بھوکے
نہ کڑوا بن کہ جو چکھے سو تھوکے"

یہ ان کا اصول تھا جو وہ اکثر ریحانہ کو بتایا کرتے تھے اور اسی بنا پر ہر ایک سے ان کے واجبی سے تعلقات تھے جن میں ناخوشگواری کا پہلو مشکل سے نکلتا ہے۔ لیکن ریحانہ کو انھوں نے نہ صرف زبانی طور پر اپنی چھوٹی بہن مان لیا تھا بلکہ ریحانہ کو ان کے برتاؤ میں ہمیشہ برادرانہ شفقت محسوس ہوتی تھی۔

اور جب کچھ دن بعد ریحانہ اپنے چھوٹے سے گھر میں آباد ہوگئی، تو ظریف الطبع وہاں آکر پھر چہکنے لگے "یہ ایک کمرہ تو بس میرے لئے نذر کر دیجئے مسز اکرم"

احمد نے ٹیلیفون پر کہا" ہم آپ کا گھر دیکھنے آ رہے ہیں "

اور آپا زاہدہ نے گھر میں قدم رکھتے ہی ریحانہ کو گلے لگا لیا"بے مروّت مجھے اکیلا چھوڑ کے چلی آئی " اور ریحانہ ٹھٹک گئی، لیکن فوراً ہی اس نے سوچا۔ شاید وہ سب خرابیاں ایک جگہ رہنے کے باعث پیدا ہو گئی تھیں۔ اب سب ٹھیک ہے۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ وہ خوش ہو گئی، لیکن زیادہ دیر تک خوش نہ رہ سکی " مگر" اسے خیال آیا۔ مسز ظہیر کی رکھائی کا کیا سبب ہے۔ اب انھیں آپا زاہدہ اور ان کی اماں سے اتنا زیادہ انس تو نہیں ہو سکتا کہ وہ ان کی ہمدردی میں اس سے ملنا جلنا تقریباً چھوڑ دیں۔ پھر ـــ

اور اکرم نے اسے بتایا کہ ان دنوں ظہیر صاحب کے اور اس کے درمیان کاروباری معاملات میں کچھ اختلاف پیدا ہو گیا ہے جو اس کھنچاوٹ کا سبب ہے ÷

"لیکن میرا تو اس میں کوئی قصور نہیں۔ پھر مجھ پر اس کا اثر کیوں پڑے" ریحانہ واقعی یہ بات نہیں سمجھ سکی تھی ÷

اور اکرم نے کہا" کھلی ہوئی سی بات تو ہے کند ذہن کہیں کی۔ تم میری بیوی نہیں ہو کیا " وہ اس زبردست حقیقت سے انکار نہ کر سکی تھی اور جب فرحت صاحب نے اکرم کی تائید کی تو وہ خاموش ہو گئی، لیکن مطمئن نہ ہو سکی۔ آپا زاہدہ اور ان کی اماں کے غیر مناسب سلوک کی وجہ سے اسے احمد سے کوئی شکایت نہیں پیدا ہوئی تھی۔ اس نے بتانا چاہا مگر کچھ کہا نہیں۔ وہ بہت سی باتیں سوچتی تھی مگر بہت کم کہتی تھی ÷

اور اب اسے سوچنے کے لئے بہت کچھ مواد ملنے لگا۔ آپا زاہدہ نے کہا" ہم لوگ آپس میں کتنی اچھی طرح وقت گذارتے تھے، مگر لوگوں کو اس بات سے جلن ہوئی اور ہمارے درمیان غلط فہمیاں پیدا کر دی گئیں"

"کن لوگوں کو؟" اس نے چونک کر پوچھا۔ اور آپا زاہدہ نے جواب دینے کی بجائے ریحانہ سے ظہیر صاحب کے متعلق اس کی رائے معلوم کی" تم انھیں پہلے سے جانتی ہو۔ کیسے آدمی ہیں؟" اور ریحانہ کو اپنے سوال کے جواب کی ضرورت باقی نہیں رہی اور یکایک اس کی شوخی عود کر آئی ÷

"بہت اچھے۔ مجھے تو بے حد پسند ہیں" وہ ہنسی" اور آپ کو؟" اس نے پوچھا ÷

"اچھے ہوں گے، لیکن قابلِ اعتماد نہیں۔ مسز ظہیر بہت اچھی ہیں یہ ظاہر ہے۔ آخر آپ کی مسز ظہیر سے اتنی دوستی بھی تو ہے جو آپ کی پسندیدگی کا کھلا ہوا ثبوت ہے" ریحانہ نے کچھ کہنے کی خاطر کہا لیکن وہ ان کے پہلے جملے پر غور کر رہی تھی۔ آپا زاہدہ کا اس غیر ضروری کیا مطلب ہے ÷

"دوستی ہی کیا۔ اس دنیا میں کوئی کسی کا نہیں ہوتا" آپا زاہدہ نے گہری سی سانس لی اور پھر عجیب سے لہجے میں کہا ÷

"تمھارے تو یہاں بہت سے ایسے دوست ہیں جو تمھارے لئے بڑی سے بڑی قربانی دے سکتے ہیں۔ ظہیر صاحب، فرحت صاحب، ظریف الحسن اور وہ رضیہ! جس کے یہاں تم پورا پورا دن گذار دیا کرتی"

"ہاں" ریحانہ نے ان کے لہجہ کی طنز کو محسوس کیا، لیکن اس کا اظہار نہیں ہونے دیا" رضیہ بڑی اچھی لڑکی ہے"۔ اس نے مختصراً کہا۔

"اور تمہاری موجودگی میں تو جیسے وہ تمہاری پرستش کرتی۔" آپا زاہدہ کی آواز میں حدت تھی ÷

"ہاں" ریحانہ کچھ سوچ رہی تھی ÷

"تمہارا ذہن کس خیال میں الجھا ہوا ہے ریحانہ۔ پریشان کیوں ہو۔ کیا سوچ رہی ہو؟" اور جواب سنے بغیر انہوں نے بظاہر غیر متعلق سی بات کہی "ظہیر صاحب صرف پندرہ دن کے لئے ہی تو باہر جا رہے ہیں نا" وہ عجیب انداز سے مسکرائیں ÷

اور ریحانہ کی کنپٹیاں جلنے لگیں۔ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا! جیسے اس کے سامنے سے تہ در تہ پردے سرکنے لگے۔ آپا زاہدہ کا رنگ اس پر واضح ہو گیا۔ مسز ظہیر کی رکھائی کا اصلی سبب اس سے پوشیدہ نہ رہ سکا۔ ظہیر صاحب کے متعلق اس سے مختلف لوگوں کے مختلف سوالات کرنے کی وجہ اس کی سمجھ میں آ گئی۔ ظہیر صاحب کی خاموشی ایک بار ان کا دفتر میں اس کے ٹیلیفون کر دینے پر یہ کہنے کا کہ بھئی کام میں کیوں گڑبڑ کرتی ہو۔ دفتر کے بعد تو میں گھر پر ہی ہوتا ہوں، وہیں بات کیا کرو تو بہتر ہے" مطلب وضاحت سے اس کے سامنے تھا۔

اچھا۔ تو یہ سب کچھ یوں تھا اور ریحانہ بیگم آپ اپنے آپ ہی مگن رہیں۔ آپ کو آپا زاہدہ کے پھیلائے ہوئے جال کا بالکل علم نہ ہو سکا۔ لعنت ہے آپ پر!

آپا زاہدہ نے مسز ظہیر سے کیا کچھ کہا ہے۔ یہ پوچھنے کی ضرورت نہ تھی لیکن آپا زاہدہ نے ایسا کیوں کیا؟ ریحانہ سمجھ نہ سکی۔ اس نے سوچا خواہ مخواہ کون کسی سے الجھتا ہے۔ شاید یہ اس کی غلط فہمی ہی ہو۔ مسز

کے برتاؤ میں ظہیر صاحب اور اکرم کے اختلاف کی بنا پر ہی سرد مہری آ گئی ہو۔ ریحانہ نے کسی کے ساتھ کوئی برائی نہیں کی تھی۔ اور اسے اطمینان تھا کہ کوئی بھی اسے بلا وجہ نقصان نہ پہنچائے گا۔ آپا زاہدہ زندہ باد۔ اس نے دل ہی دل میں کہا۔

اور ایک دن رضیہ نے ریحانہ سے کہا "آپا زاہدہ کو تم سے بہت شکایتیں ہیں ریحانہ"۔ ریحانہ نے کچھ دیر خاموشی سے انتظار کیا کہ رضیہ ان شکایتوں کی وضاحت کرے۔ رضیہ کی عادت تھی کہ جب تک کوئی اس کی بات میں دلچسپی نہ لے وہ آگے نہ بڑھتی تھی۔ ریحانہ کا خیال تھا جو بات کسی کو کہنی ہے وہ بہر صورت کہے گا۔ کریدنے کی ضرورت نہیں ہے۔

اور جب رضیہ کچھ نہ بولی تو ریحانہ نے کہا "مگر تمہیں تو مجھ سے کوئی شکایت نہیں ہے نا؟"

"ابھی تک تو میں متاثر نہیں ہوئی"۔ رضیہ نے دھیمے سے کہا اور ریحانہ کو محسوس ہوا کہ رضیہ کچھ باتوں کو اپنے ذہن میں اجاگر کر رہی ہے۔

"تمہیں یاد ہے ریحانہ۔ میں نے ایک بار تمہیں بتایا تھا کہ نہ جانے کیا وجہ ہے کہ امی میری دوستوں سے زیادہ دنوں تک خوش نہیں رہ سکتیں۔ دو سال کا لمبا عرصہ خیریت سے گذر جانے پر میں خوش تھی کہ قدیم روایتیں مٹ رہی ہیں۔ امی واقعی تمہیں چاہتی تھیں ریحانہ اور ابا جان اب تک تم سے خوش ہیں"۔ رضیہ جلدی سے پلکیں جھپک کر مسکرائی۔

"اور تمہیں بھی اداس ہونے کی ضرورت نہیں"۔ ریحانہ عجیب طرح ہنسی "تم تو جانتی ہو ریحانہ۔ ہمارا گھرانہ کتنا قدامت پسند ہے۔ یہاں سر سے دوپٹے کا کھسک جانا اور ذرا زور سے ہنس لینا بھی معیوب ہے"۔

"ہوں!" ریحانہ نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"اور آپا زاہدہ کی اماں ہی یہاں امی کی ہمعصر لوگوں میں سے ہیں۔ ظاہر ہے امی کو ان کی باتوں سے کتنی دلچسپی ہوگی۔ اور آپا زاہدہ کو سر ڈھانپ کے نیچی نظروں سے مسکرانا خوب آتا ہے۔ مسز ظہیر سے آپا زاہدہ کی بہت دوستی ہے اور مسز ظہیر دوسروں کی ہمدردی حاصل کر لینے کے گر سے واقف ہیں"۔

"ہوں!" ریحانہ بدستور سوچ رہی تھی۔

"اور ریحانہ۔ کیا انسان میں اتنی قدرت ہوتی ہے کہ وہ اپنے آپ کو کہیں کچھ ہو کہیں کچھ ظاہر کر سکے۔ آپا زاہدہ مجھے اتنی عجیب عجیب باتیں بتاتی ہیں کہ مرد جیسی متلون مزاج ہستی کو کس طرح قابو میں رکھا جا سکتا ہے۔ پوچھو انھیں کیا معلوم؟ مگر وہ بہت پڑھی لکھی ہیں"۔ رضیہ نے مسخرے پن سے کہا۔

ریحانہ بے اختیار ہنس پڑی "ہاں جب وہ شروع شروع میں مجھ سے خوش تھیں تو انھوں نے مجھے بھی بہت سی پتے کی باتیں بتائی تھیں۔ بتاؤں تمہیں؟"

"نہیں" رضیہ نے بات کاٹی "مجھے معلوم ہے کہ تم بہت بد سلیقہ اور بہت خود پسند ہو۔ دن چڑھے تک اپنے میاں کے سامنے بال بکھرائے پھرتی ہو۔ نہ جانے تم اپنے آپ کو کیا سمجھتی ہو اور تمہیں اپنی مدقوق سی شکل پر کیوں ناز ہے۔ آخر اکرم صاحب کب تمہیں، تمہاری حماقت آمیز حرکتوں کو برداشت کریں گے؟ دیکھتی رہو کیا ہوتا ہے۔ ہاں ذرا یہ تو بتا دو کہ تم کونسی فاؤنڈیشن کریم استعمال کرتی ہو؟ آپا زاہدہ پوچھ رہی تھیں"۔

وہ دونوں کھلکھلا کر ہنسنے لگیں اور ریحانہ نے ہنستے ہنستے سوچا۔ یہ سب کچھ اتنی ہنسی کی بات تو نہیں ہے۔

اور پھر جب ایک دن رضیہ نے طنز سے پوچھا "ریحانہ وہ کونسی بیہودہ کتابیں ہیں جنہیں تم گھر والوں سے چھپا کر پڑھا کرتی ہو؟" تو ریحانہ کی ہنسی نے بالکل دم توڑ دیا "آپا زاہدہ خوش رہو۔ تمہاری زہر پاشیوں میں گل کھلانے کی اہلیت ہے"۔ اس نے دل ہی دل میں کہا اور رضیہ کو کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ اپنی صفائی پیش کرنے کی قائل نہیں تھی۔ اس کے بے تکے عقیدوں میں سے ایک خیال یہ بھی تھا کہ جب کوئی خود سوچنے سمجھنے کی قوتوں سے کام لینا چھوڑ دے تو اسے سمجھانے کی کچھ ضرورت نہیں اور پھر رضیہ جو اس کی نظروں میں عام لوگوں سے بلند تھی۔ "رضیہ!" اس نے حسرت سے دل ہی دل میں رضیہ کو اس طرح پکارا جیسے وہ اس سے بہت فاصلہ پر ہو۔

اور پھر آپا زاہدہ نے ریحانہ کو ٹیلی فون پر اطلاع دی "یہ جو نئی صاحبہ آئی ہیں مسز حمید اصغر۔ انھیں تم سے ملنے کا بہت اشتیاق ہے۔ ہم نے اُن سے تمہاری بہت تعریفیں کی ہیں"۔ "تو شاید وہ مجھ سے کبھی نہ ملیں"۔ ریحانہ نے بیساختگی سے کہا اور پھر اس نے سنبھلکر ایک دم بات پلٹ دی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ آپا زاہدہ کو اس بات کا علم ہو جائے کہ وہ انھیں کس حد تک سمجھ چکی ہے۔

اور آپا زاہدہ بار بار ریحانہ کو اس بات کا احساس دلانے لگیں کہ مسز حمید اصغر کا اس سے اب تک نہ ملنا ان کی بہت زیادتی ہے، ہوگی چلو نہ سہی وہ جن لوگوں سے ملی تھی، ان میں سے کس نے اسے سمجھا تھا۔ فرحت صاحب کی مصروفیتیں بہت بڑھ گئی تھیں۔ رضیہ کو گھر کے کاموں سے یک لخت اتنی دلچسپی ہو گئی تھی کہ اس کی طولانی باتوں میں اختصار پیدا ہو گیا تھا۔ مسز ظہیر جب بھی اس سے ملتیں، بڑے اخلاق سے کہتیں "اتفاق سے آپ سے بہت دن سے ملاقات نہ ہو سکی"۔

"جی ہاں۔ اتفاق ہی تو ہے" وہ اسی اخلاق سے سیدھے سادے لہجے میں جواب دیتی۔

ظہیر صاحب بدستور خاموش تھے! البتہ ظریف الحسن پرانی وضعداری سے اسی طرح چہکا کرتے تھے اور کچھ دن چہک لو میاں ظریف الحسن، کب تک آپا زاہدہ کے اثر سے محفوظ رہ سکو گے۔ وہ دن بہت دور نہیں ہے، جب زمانہ بھر کی برائیاں مجسّم ہو کر ریحانہ کی شکل اختیار کر لیں گی۔

اور جب کافی عرصہ کے بعد ایک پارٹی کے اختتام پر مسز حمید صغر کی مڈبھیڑ مجبوراً ریحانہ سے ہو گئی (وہ بار بار اس کے قریب سے گذری تھیں، لیکن چونکہ وہ چاہتی تھیں، کہ ابتدا ریحانہ کی طرف سے ہو، بار بار اس کے وجود کو نظر انداز کر چکی تھیں۔) انھوں نے ریحانہ سے کہا "آپ سے ملنے کا بہت شوق تھا۔ آپا زاہدہ نے آپ کی بہت تعریفیں کی ہیں۔"

اور سنبھلتے سنبھلتے بھی ریحانہ کے منہ سے نکل گیا: "اسی لئے آپ نے ابتک مجھ سے ملنے کی زحمت نہیں کی۔"

"وہ آپ کا مکان بہت دور ہے نا کبھی دن ہمارے یہاں آیئے" مسز حمید صغر نے ریحانہ کو دعوت دی۔

"انشاء اللہ۔ ضرور۔ لیکن میرے اور آپ کے گھر کے درمیان اتنا ہی فاصلہ ہے، جتنا آپ کے اور میرے گھر کے درمیان۔"

اور اس سے پیشتر کہ وہ کچھ بولتیں، آپا زاہدہ نے چونک کر کہا "میں نے آپ کا مسز اکرم سے تعارف کرا دیا ہے نا؟"

اور واپسی پر مسز حمید صغر نے آپا زاہدہ سے کہا: "مسز اکرم کو اپنی شکل پر بہت ناز معلوم ہوتا ہے۔"

"ہاں۔ دیکھ لو، صورت نہ شکل۔ اور مزاج پریوں کے سے۔ دیکھا تمہارے دیکھ کر کس طرح جل گئی تھی" آپا زاہدہ نے خوش ہو کر کہا۔

"ویسے شکل میں تو کوئی برائی نظر نہیں آتی اور کپڑے تو وہ خود بہت اچھے پہنے ہوئے تھیں" حمید صغر خواہ مخواہ بول پڑے اور آپا زاہدہ کو غصہ آ گیا۔ یہ حضرت بھی یونہی سے نکلے۔ عام مردوں کی طرح نرے بیوقوف۔ آخر یہ سب لوگ ریحانہ کو آپا زاہدہ کی نظروں سے کیوں نہیں دیکھتے؟"

آپا زاہدہ کو معلوم تھا کہ ریحانہ کمبخت اتنی چالاک ہے کہ ایک بار کوئی اس سے مل لے تو وہ، آپا زاہدہ کے الفاظ میں اسے بڑے مزے میں پھنسا لیتی ہے۔ اسی لئے انھوں نے اس کے متعلق بہت سے قصے گھڑ کے ان لوگوں کو سنائے تھے کہ وہ اس سے دور رہیں اور اکیلے میں مسز حمید صغر کو نصیحت کی تھی۔

"ڈیر۔ تم تو ہو بے وقوف تمہیں دنیا کا کچھ تجربہ نہیں ہے۔ اپنے میاں کی محبت پر زیادہ بھروسہ مت کرو۔ ریحانہ سے دور ہی رکھنا"

مسز حمید صغر نے جو یوں بھی تصویر کے تاریک رُخ پر زیادہ توجہ دیتی تھیں، بڑی خوشی سے ان کی نصیحت مان لی تھی اور مسز صغر کی عادت تھی کہ جو کچھ ان کے دل میں آتا تھا بڑی صفائی سے اس کا اظہار کر دیتی تھیں۔ انھوں نے کہا "مگر آپا زاہدہ۔ ریحانہ تو شادی شدہ ہے۔ مجھے تو زیادہ خطرہ آپ کی طرف سے ہے۔"

"تمہیں نہیں معلوم ڈیر۔ مردوں کو زیادہ دلچسپی کدھر ہوتی ہے۔" انھوں نے بے دھیانی میں ٹھنڈی سانس لی "اور مجھ سے کیا خطرہ، میں تو بالکل بے ضرر ہوں۔"

"ٹھیک ہے آپا زاہدہ۔ آپ تو بالکل بے ضرر ہیں" مسز حمید صغر نے انھیں غور سے دیکھتے ہوئے شرارت سے کہا اور جب یہ بات انھوں نے اپنے میاں کو سنائی تو حمید صغر کے شرارت پسند ذہن میں یہ سوال پیدا ہوا کہ کیوں نہ آپا زاہدہ کو بیوقوف بنایا جائے۔ ذرا دل لگی ہی رہے گی۔ انھوں نے اپنی بیوی سے سازش کی۔ نہ جانے دونوں میاں بیوی کو کس بنا پر یہ یقین تھا کہ دل لگی، دل لگی ہی رہے گی، دل کی لگی نہ بن پائے گی۔ اور حمید صغر نے آپا زاہدہ سے کھل کر باتیں کرنا شروع کر دیں لیکن وہ کتنا گھبرائے جب انھوں نے دیکھا کہ تھوڑی سی جھجک کے بعد آپا زاہدہ نے بڑی بے تکلفی سے فرائڈ کے فلسفے پر بحث کرنا شروع کر دی ہے۔ وہ زیادہ تر انگریزی بولتی تھیں جو ان کی اماں نہیں سمجھتی تھیں۔ ایک دن موقع پا کر وہ آپا زاہدہ کے پیچھے پیچھے باورچی خانے میں گھس گئے۔

"آپا زاہدہ۔ آپ کو اللہ میاں نے ان فضول کاموں کے لئے نہیں بنایا ہے۔ چائے میں بناؤں گا۔ آپ بیٹھئے" حمید صغر نے اسٹوول ان کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"مگر ——————" آپا زاہدہ نے جن کے دل میں اچانک انجانی سی خوشی ہلکورے لینے لگی تھی، غیر شعوری طور پر اٹھلا کر اور غیر ضروری طور پر شرما کر احتجاج کیا۔

"نہیں۔ آپ کے اتنے اچھے ہاتھ آگ جلانے میں خراب ہو جائیں گے، بس آپ میرے سامنے بیٹھی رہیئے" حمید صغر نے دیا سلائی سنبھالتے ہوئے کہا۔

آپا زاہدہ کا دل اچھلا، ڈوبا اور پھر اچھلنے لگا۔ انھوں نے کن انکھیوں سے

حمید صغر پر نظر ڈالی اور پھر اپنے ہاتھوں کو جو خود انھیں بھی پسند نہیں تھے دوپٹے کے آنچل میں چھپا لیا۔ یہ ستائیس اٹھائیس سالہ خوش شکل سا لڑکا کیا ان کا مذاق اڑا رہا ہے؟ انھوں نے سوچا، مگر آج کوئی نئی بات تو نہیں حمید صغر ہمیشہ ہی ان کی تعریف کرتا رہا ہے۔ خیر، ظہیر صاحب جیسے بد مذاق آدمی کا تو خیال ہی انھیں جھنجلا دیتا تھا۔ ظریف الحسن نے ان کی باتیں غور سے سنی تھیں۔ اکرم نے ان کی معلومات کی وسعت کو سراہا تھا، لیکن یہ پہلا موقع تھا جو کسی کی نظر ان کے جسمانی محاسن پر پڑی تھی۔ انھوں نے زیادہ غور سے حمید صغر کو دیکھا جس کی پیشانی پر شاید آگ کے قرب کی وجہ سے پسینے کے قطرے چمک رہے تھے۔ یا آپا زاہدہ کی نگاہوں کی گرمی کا اثر تھا۔ کچھ پتہ نہیں لیکن وہ آپا زاہدہ کے چہرے کے آثار چڑھاؤ سے کچھ گھبرا ضرور گیا تھا۔

"کچھ رنگ بدل رہی ہے میری انکی بات چیت" وہ دل ہی دل میں گنگنایا اور اس نے مزید شرارت سے کہا "کہیں اماں ناراض نہ ہو جائیں کہ ہم اکیلے یہاں کیا کر رہے ہیں۔ بڑی مشکل ہے ذرا دیر کو کھل کے باتیں کرنے کا موقع نہیں ملتا" اور اس نے چلنے کی ٹھانی۔

"سنو تو حمید" آپا زاہدہ نے آہستہ سے اسے پکارا۔ مگر حمید صغر نے جیسے کچھ نہیں سنا۔ آپا زاہدہ نے سوچا۔ حمید اُن سب سے بہت اچھا ہے بہت زیادہ اچھا اور بہت سمجھدار۔ اسے ریحانہ سے ملنے کا موقع نہیں ملا ورنہ شاید وہ بھی باقی سب کی طرح اس پر اتنی توجہ نہ دیتا۔ "دیکھنا اگر تمہیں سب کی نظروں سے گرایا نہ ہو تو میرا نام زاہدہ نہیں" انھوں نے ریحانہ کو غائبانہ دھمکی دی۔

اور پھر کچھ ایسا ہوا کہ کئی ماہ کے بعد مسز حمید صغر کو آپا زاہدہ کی کسی بات پر ارمان کرا چانک خیال آیا کہ ریحانہ سے ملنا تو چاہیئے۔ پتہ تو چلے کہ آپا زاہدہ نے جتنے الزامات اس پر لگائے ہیں، ان میں کتنی اصلیت ہے۔

اور پھر کچھ ایسا ہوا کہ مسز حمید صغر نے آپا زاہدہ کی کہی ہوئی سب باتیں ریحانہ کے سامنے دہرا دیں۔ اور ریحانہ کو پتہ چلا کہ کس طرح اس نے ظریف الحسن کو پھانسنے کی کوشش کی۔ کیسے احمد پر ڈورے ڈالے جو آپا زاہدہ اور ان کی اماں کی آمد کی وجہ سے بال بال بچ گیا۔ فرحت صاحب کو بیوقوف بنایا۔ ظہیر صاحب کو تو خیر پاگل کر ہی دیا۔ حد ہے کہ رضیہ کے ساٹھ سالہ ابا بھی، اس سے متاثر ہیں۔

ریحانہ سنتی رہی، ہنستی رہی۔ جیسے کوئی غیر متعلق سی دلچسپ کہانی سن رہی ہے۔ اور اس نے صرف اتنا سوچا کہ مسز حمید اصغر اسے یہ سب کچھ کیوں بتا رہی ہیں۔ اور انہیں کم از کم الفاظ میں احتیاط کرنی چاہیئے تھی۔

مسز حمید اصغر کو غصہ آ رہا تھا کہ ریحانہ کو ان باتوں پر غصہ کیوں نہیں آ رہا۔ کم از کم آپا زاہدہ کی اس بات میں بالکل سچائی ہے کہ ریحانہ حد سے زیادہ بےغیرت ہے۔

اور مسز حمید صغر کے جانے کے ریحانہ نے سوچا۔ "اُف رے میری بےخبری! میرے اردگرد چاہنے والوں کا اتنا مجمع تھا"

"تم نے مجھے بتایا کیوں نہیں" اس نے مسز صغر کی باتیں ہنس ہنس کر دہراتے ہوئے اچانک رک کر اکرم سے پوچھا۔

"تم اتنی بیوقوف ہو رانی! ان بےسروپا باتوں سے متاثر ہو رہی ہو۔ ایں؟" اکرم نے پیار سے اسے تھپتھپاتے ہوئے کہا "چلو آپا زاہدہ کے یہاں چلیں۔ مجھے ان پر بے حد ترس آ رہا ہے۔ اگر آج سے دس پندرہ سال پہلے ان کی شادی ہو گئی ہوتی۔ اور ان کا نوٹس لیا گیا ہوتا تو انھیں تمہارے اس شدت سے احساس کمتری نہ ہوتا۔ خیر ان بےچاری سے لڑنا مت"

"تم مجھ سے بھی بےغیرت ہو اکرم" دونوں ہنسنے لگے۔

مسز حمید صغر پردہ داری کی قائل نہیں تھیں۔ کچھ ایسا ہوا کہ یہ سب باتیں پھوس میں لگی ہوئی آگ کی سی تیزی سے سارے شہر میں پھیل گئیں اور وہ چھوٹی سی جماعت جو آپا زاہدہ کی کوششوں سے منتشر ہو گئی تھی، جیسے پھر ایک مرکز پر سمٹ آئی اور ریحانہ کبھی اور ان کبھی ہمدردیوں کے ڈھیر میں جیسے دب سی گئی، لیکن ریحانہ کو ان ہمدردیوں سے کچھ ہمدردی نہ تھی، وہ چاہتی تھی کہ اسے تنہا چھوڑ دیا جائے، مگر اس نے اپنی اس خواہش کا اظہار نہیں ہونے دیا اور لوگ منتظر تھے کہ ریحانہ کا اگلا قدم کیا ہو گا وہ کس طرح آپا زاہدہ سے اپنی توہین کا بدلہ لے گی۔ عام خیال یہ تھا کہ وہ آپا زاہدہ پر برس پڑے گی اور یوں خوب چہل پہل ہو جائے گی، لیکن بڑے غور سے ان ترکیبوں کو سنتی رہی کہ آپا زاہدہ کو کس طرح انتقاماً بدنام کرنا چاہیئے اور خاموشی سے انسانی فطرت کی شر پسندی کا مطالعہ کرتی رہی۔

اور خود آپا زاہدہ کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ ریحانہ اسی طرح ان سے مل جل رہی ہے۔ وہ ظہیر صاحب کے متعلق زیادہ باتیں کرنے لگی تھی۔ ظریف الحسن کو زیادہ چھیڑتی تھی اور بات بات پر احمد کو مخاطب کرتی تھی۔ "بےحیائی تیرا ہی آسرا ہے" آپا زاہدہ کے ساتھ ساتھ باقی سب نے بھی یہی سوچا اور مسز حمید صغر نے

تو گویا جل کر صاف صاف کہہ بھی دیا۔ "میں تو آپ کو بالکل نہیں سمجھ سکی۔ مسز اکرم اگر آپ کی جگہ کوئی اور خوددار شخص ہوتا تو آپا زاہدہ کی شکل بھی نہ دیکھتا۔ محض آپ کی خاطر میں نے ان سے ملنا جلنا چھوڑ دیا ہے۔ اور آپ ہیں کہ ـــــ"

"میری خاطر لوگوں کو کتنی عزیز ہے۔ اُفوہ!" ریحانہ نے سوچا اور ہنس دی۔ اس کی ہنسی میں تلخی پیدا ہو چلی تھی۔

اور ظہیر صاحب نے جو شاید ریحانہ ہی کی خاطر اس سے بات چیت میں احتیاط برت رہے تھے اور اب وہ سب کچھ منظرِ عام پر آ جانے کے بعد وہ خدشہ جو واقعے کے ہونے سے پہلے زیادہ تکلیف کا باعث ہوتا ہے، مٹ چکا تھا۔ ریحانہ سے کہا: "اب کیا کرو گی؟"

"کیا کروں؟" اس نے پوچھا۔

"وہی جو تمہاری چہیتی آپا زاہدہ نے تمہارے ساتھ کیا ہے۔" ظہیر صاحب کو واقعی بہت غصہ آ رہا تھا۔

ریحانہ نے سوچا۔ کیا آپا زاہدہ کی من گھڑت کہانیوں کا ظہیر صاحب کی زندگی پر کچھ اثر پڑا ہے؟ ہو سکتا ہے۔ مسز ظہیر کوئی فرشتہ تو ہیں نہیں اور ہو سکتا ہے کہ وہ ریحانہ سے بات چیت میں احتیاط مسز ظہیر کی خاطر اور اپنے بچاؤ کے لئے برت رہے ہوں۔

لیکن ریحانہ کو ظہیر صاحب کے منہ سے اتنی سستی سی بات سن کر بہت تعجب ہوا وہ انھیں عام لوگوں سے زیادہ سمجھدار سمجھتی تھی۔

اور ظہیر صاحب نے قدرے تلخی سے کہا: "میں نہیں سمجھ سکتا کہ وہ کونسی وجہ ہے جس کی بنا پر تم آپا زاہدہ سے بدلہ لینے پر تیار نہیں ہو۔"

"میں نہیں چاہتی کہ آپا زاہدہ سمجھیں کہ میں نے ان کی ذلیل باتوں کو کچھ اہمیت دی ہے اور میں ان سے شکست کھا گئی ہوں۔" ریحانہ نے دھیرے سے کہا۔

"کیا فلسفہ ہے ماشاءاللہ۔" ظہیر صاحب نے طنزیہ کہا۔ "تم قطعی ہار گئی ہو تم میں مقابلہ کرنے کی قوت بالکل نہیں ہے۔"

ریحانہ نے چونک کر ظہیر صاحب کو دیکھا اور اچانک تیزی سے کہا: "کیا آپ چاہتے ہیں کہ میں انہیں کی سطح پر آ گروں؟ ریحانہ نے سوچا۔ کوئی نہیں سمجھتا اس کی باتوں کو کوئی نہیں سمجھے گا اور اچانک اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔"

ظہیر صاحب خاموشی سے اسے دیکھتے رہے اور پھر انھوں نے کہا۔ "شاید تم ٹھیک ہی کہتی ہو۔ اب میں اس مسئلہ پر کبھی کچھ نہیں کہوں گا۔ دراصل ان بے سروپا باتوں سے مجھے جو تکلیف ہوئی ہے اور اسی لئے مجھے تم پر غصہ آ گیا کہ تم نہایت بے حسی کا مظاہرہ کر رہی ہو۔ اب میں سمجھتا ہوں کہ میں غلطی پر تھا۔ پھر بھی تمہیں پوری طور پر نہیں سمجھ سکا۔" اور ظہیر صاحب خواہ مخواہ ہنسنے لگے اور مسز ظہیر نے مزے لے لے کر ریحانہ کو بتایا کہ آپا زاہدہ نے کس کس طرح انھیں ریحانہ کے خلاف اکسانے کی کوشش کی ہے۔

"کامیاب کوشش۔ لیکن اب یہ سب کچھ اسے کیوں بتایا جا رہا ہے؟ اگر واقعی سب کو پہلے سے آپا زاہدہ کی باتوں میں شرارت اور جلن کا عنصر دکھائی دیتا تھا تو سب اس حد تک متاثر کیوں ہوئے اور اب سب کے سب کیوں اپنی سمجھ داری کا مظاہرہ کر رہے ہیں؟ انسان کو سمجھنا کتنا مشکل ہے۔" ریحانہ نے سوچا۔

اور کھلی ہوئی کھڑکی کی چوکھٹ پر ٹکے ہوئے سر کو اٹھاتے ہوئے آپا زاہدہ نے چاروں طرف بکھری ہوئی چاندنی کو بے بسی سے دیکھا اور آنکھیں پھر چھلکنے لگیں۔ پورے دو ماہ گندی ہوئی باتوں کو دہرائے بغیر ہنستے کھیلتے گذارنے کے بعد آج ریحانہ نے انھیں کس طرح ذلیل کیا تھا۔

آپا زاہدہ جنہیں ریحانہ کا سلوک دیکھ اپنے ضمیر کے مجرم ہونے کا احساس ہونے لگا تھا آج اچانک کہہ بیٹھیں: "مجھے معلوم ہے ریحانہ کہ میرے خلاف تم سے کیا کیا باتیں کہی گئی ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ میں نے کچھ باتیں کی ضرور ہیں اور وہ اس لئے کہ مجھے محسوس ہوتا تھا کہ تم مجھ سے جلتی ہو خاص طور اکرم بھائی کا مجھ سے باتیں کرنا تمہیں بالکل پسند نہیں تھا۔ ایک بار تم نے میری بہت بے عزتی کی تھی۔ میں نے کھانے کی میز پر کوئی چیز اکرم بھائی کی طرف بڑھائی تو تم نے لینے سے منع کر دیا۔ کیا تم نے سمجھا تھا کہ میں انھیں پھسلا رہی تھی؟"

اچھا تو یہ یوں تھا۔ ریحانہ نے سوچا۔ اسے یہ واقعہ یاد نہ تھا لیکن اس کی عادت تھی کہ وہ اکرم کے روز بروز موٹا ہوتے جانے کی وجہ سے اسے زیادہ کھانے پر ٹوکا کرتی تھی۔

اور ریحانہ نے کہا: "خیر آپا زاہدہ، جو نہ ہونا چاہیئے تھا، وہ ہو چکا، مگر بتایئے کہ آپ نے ظہیر صاحب کو تختۂ مشق کیوں بنایا؟ آپ نے یہ نہ سوچا مسز ظہیر کے دل میں غلط فہمیوں کے پیدا ہو جانے کا ان دونوں کی خوشگوار زندگی پر تلخ اثر پڑ سکتا ہے؟ اور اگر اکرم بچپن سے مجھ سے واقف نہ ہوتے تو کا متاثر ہو جانا بھی کچھ تعجب آمیز نہ تھا۔ اور پھر ـــــ پھر کیا ہوتا؟ آپ کو کیا ملتا آپا زاہدہ؟" ریحانہ غیر محسوس طور پر کانپ سی گئی۔

آپا زاہدہ نے کچھ پریشان ہو کر بیچ بولا: "دراصل میں نے دیکھا کہ ظہیر صا

(باقی صفحہ ۵۳ پر)

حشرِ نو

ہادی حسین

مرے ذہن کے خلاؤ، میں تمہیں کیسے دکھاؤں؟
مرے سینے کے سکوتو، میں تمہیں کیسے سناؤں؟
مرے گم شدہ خیالو، میں تمہیں کہاں سے لاؤں؟
مری خلوتو، میں کیونکر تمہیں انجمن بناؤں؟
مری شاعری کا ایواں ہی بہت دنوں سے ویراں
مرے اجڑے اجڑے خوابو، میں تمہیں کہاں بساؤں؟
مری حسیاتِ مردہ، میں تمہیں جلاؤں کیونکر؟
میں جہانِ دل میں کیونکر کوئی حشرِ نو اٹھاؤں؟
مری خاک کے شرارو، مرے آنسوؤں کے تارو
میں کس آسمانِ غم سے تمہیں جا کے توڑ لاؤں؟
مرے تابناک داغو، مرے سینے کے چراغو
کوئی تو نئی لگا کر تمہیں کس طرح جلاؤں؟
مرا سینہ کب سے گنبد ہے مزارِ شاعری کا
مرے جذبو، پھر سے کیونکر تمہیں بولنا سکھاؤں؟

تخلیقِ سحر

صدیق کلیم

یہ مقاصد کی کشاکش یہ امنگوں کا تضاد
زندگی خود زندگی سے برسرِ پیکار ہے
نیم روشن رہگذاروں کی چمک بڑھتی گئی
شاید اندھیارے کی منزل طے ہو جانے کی کرن
زیست کا یہ ارتقا ہی زیست کی تعبیر ہے
زندگی خلاق لمحوں کی امر تصویر ہے
بارہا ہم نے ستاروں پر کمندیں ڈال دیں
بارہا افلاک تک پھیلا ہے اپنا اقتدار
بارہا امید کی شمعیں فروزاں ہو گئیں
بارہا ہم نے بسائے اس زمیں پر خلد زار
لیکن اپنی آرزوئیں ہیں کہ دیو خشمناک
زیست کی تخریب بھی ہے ابن آدم کا مزاج
اختیارِ زیست کے پہلو میں جبر احتیاج
آرزوؤں کی کشاکش ہی جہنم بن گئی
اب تو اک اک سانس پر جی کی دھڑکن ہے نگراں
موت کی بے مہر ظلمت روشنی پر چھا گئی
دھیرے دھیرے کس روش پر آ گئی یہ زندگی
دھیرے دھیرے کچھ گھٹی گھٹی سی یہ زندگی
ہم ہیں اک سلجھی ہوئی بکھری انجمن کے اسیر
گو پریشاں دلکشی زہراب بن کر رہ گئی
پھر بھی انساں کی قسم اس زندگی سے پیار ہے
شاید اب بھی آرزو کی روشنی بڑھتی رہے
شاید اب یہ تیرگی خود ہی سحر پیدا کرے
حسن کی تخلیق ہی انسان کا اظہار ہے
شوق پھر زندہ ہوا ہے آس پھر بیدار ہے

نینن سیج
(کافی)

بلھے شاہ

ترجمہ: شفقت تنویر مرزا

راہ تکوں میں توری ساجن، کرو تو پھیرا
بیتے [illegible] دن سے ساجن بھیجے سندیسہ کوئی
نینن سیج بچھائی ہے میں تیری ہوئی
لٹک لٹک کرائے شاہ عنایت میرا
راہ تکوں میں توری ساجن، کرو تو پھیرا
کون ہے جا کے کہے پیا سے بات میری
بھول ہوئی کیا موسے، میں تو داسی تیری
بناں ترے مورا کون ہے؟ جی ڈھاؤ نہ میرا
راہ تکوں میں توری ساجن، کرو تو پھیرا
برہا ہوک اٹھی ہے، ہردے پتھر تیرا
پریم جال میں پھانس کے لے گیو منوا میرا
تو نے مورے سیج میں اب کس کا ڈیرا
راہ تکوں میں توری ساجن، کرو تو پھیرا
کنگن چوڑیاں بتیاں میں، تن جوگن جوڑا
پاگل کر کے ساجن! مجھ رانجھن کو چھوڑا
نئے نویلے دکھ آئے، برہا نے گھیرا
راہ تکوں میں توری ساجن، کرو تو پھیرا
موری ساری سکھیاں بھی اب آن پھنسی ہیں
ہک ہک کر جلتی آگ میں آن جلی ہیں
آن بنی اب سر پہ کیسا جھگڑا بکھیڑا
راہ تکوں میں توری ساجن، کرو تو پھیرا

کسے خبر

شاہین غازی پوری

ڈھلی ڈھلی سی ہوائیں خرام آہستہ
وہ دور نیم کی شاخوں سے جھانکتا مہتاب
روش روش پہ ہے ساون کی چاندنی رقصاں
سرک رہا ہے کنول کے رخ د نظر سے حجاب
تمام پھیل گئے قافلے بہاروں کے
فضائے گلشن ہستی میں کھو گیا ہوں میں
تصورات میں کتنا سکون ملتا ہے
غم حیات سے بیگانہ ہو گیا ہوں میں
کچھ اس طرح سے پریشاں ہیں پیڑ کے سائے
کہ جیسے روح لرزتی ہو ماہ پاروں کی
بکھیرتی ہوئی نغمے رواں دواں ہے ندی
کہ جیسے گاتی ہو دوشیزہ کوہساروں کی
کچھ ایسا ہوتا ہے محسوس چاندنی کے تلے
جبینِ شب پہ ہو جیسے غرورِ عظمت کا
کہ جیسے وادیٔ ماہ و نجوم میں جا کر
کسی نے چھیڑ دیا ہو رباب فطرت کا
کہ جیسے خواب بسے ہوں نگاہِ نرگس میں
کہ جیسے رقص کناں ہو شباب فطرت کا
کہ جیسے پھول بچھائے گئے ہوں راہوں میں
کہ جیسے محوِ سفر کارواں ہو نکہت کا
ڈھلی ڈھلی سی ہوائیں خرام آہستہ
کہ جیسے صحنِ چمن میں چلے نگارِ حسیں
تمام پھیلے ہوئے قافلے بہاروں کے
کسے خبر کہ زمیں پر بھی ہے بہشتِ بریں

وادیٔ اُلفت

طاہرہ کاظمی

آج پھر وادیٔ اُلفت میں مجھے میرے قدم
رات کے پچھلے پہر کھینچ کے لے آئے ہیں
کس قدر دلکش و مانوس ہے یہ خوابِ حسیں
ہے مگر کیسا یہ چھایا ہوا تاریک غُبار؟
ایک ہی شب میں یہ دیوارِ ستم کی تعمیر
اور ہر در پہ یہ جبروت کی خونیں تحریر
"عشق قانون و قواعد میں گرفتار رہے!"
روشنی روح کی اور روح سے بیزار رہے؟
تھے جہاں لالہ و سنبل ہیں وہیں سنگِ مزار
جلوہ فرما ہے سیہ پوش ہیولوں کی قطار
کتنی ظلمت ہے فضاؤں کے جلو میں رقصاں
شب کی آغوش میں سہمی ہوئی تنہائی میں
سینکڑوں غنچہ و گُل، نرگسِ شہلا کے چراغ
گھٹ کے رہ جائیں گے ماحول کی تاریکی میں

درونِ دل

ضمیر اظہر

نگارِ سکوں کی تمنّا میں اکثر
سمندِ تجسس کو مثلِ صبا اجنبی وادیوں میں پھرایا ہے میں نے
برنگِ تخیّل خیاباں خیاباں، بیاباں بیاباں
پہاڑوں کی حلقہ نما، گھومتی رہگزاروں میں اس کو گھمایا ہے میں نے
تھکن سے ہوا چُور تو از سرِ نو نئے راستوں پر چلانے کی خاطر
جواں مرغزاروں کا منظر دکھایا
گھنی چھاؤں سے اسکے دل کو لبھایا
اسے گنگناتی ہوئی ندیوں کا حسیں آبشاروں کا پانی پلایا
بہارِ سکوں کی تمنا میں مَیں نے
کہاں تک نہ پھیلایا دامِ محبت
کہاں پر نہ دوڑایا اسپِ تجسس
مگر روئے منزل نہاں ہی رہا حُسنِ نادیدہ و آرمیدہ کی صورت
اُبھر کر یہ یم دقت کی رَو سے اک ایسا لمحہ خیالوں کی خلوت میں آیا
عجب معجزہ جس نے آکر دکھایا
کہ پیشِ نظر وا دریچہ تھا دل کا
اور اس میں نگارِ سکوں صاف و براق نورانی پوشاک پہنے کھڑی تھی
لبوں پر بہارِ تبسم عیاں تھی!

کرن نے کہا

فضا ابن فیضی

سورج کی اک ننھی کرن — اک پیکرِ گل پیرہن
تعبیرِ الماس و گہر — عینِ تجلی در نظر
صبحِ ازل کی آبرو — پھولوں کی معصوم آرزو
پہلوئے شبنم کی خلش — پروردۂ سوز و تپش
جس کی نگاہِ دلبری — پیرایۂ رامش گری
ہر سبزیٔ شاخِ نو — صد پارہ سونے کا سبو
بلور پگھلایا ہوا — ہیرے کا دل چیرا ہوا
یا نور میں ڈوبا ہوا — تارِ نظر کا سلسلہ
وارفتۂ پندارِ نمو — تنویرِ شبنم جس کی لَو
موجِ غبارِ صاعقہ — رنگِ شکستِ آئینہ
اک آبشارِ گوہریں — جس کا طلوعِ دل نشیں
آئینۂ عرشِ بریں — جس کی جبینِ احمریں
جس کے تجسس میں رہی — شبنم کی نا آسودگی
جس کی نگاہوں کی تھکن — ابرو پہ جلووں کی شکن
اتری افق سے خاک پہ — صد طور و فاراں بر نظر
گویا ہوئی یوں پھول سے — اے میری جاں صدقے ترے

اے پھول! اے رنگِ سحر
اے کعبۂ حسنِ نظر

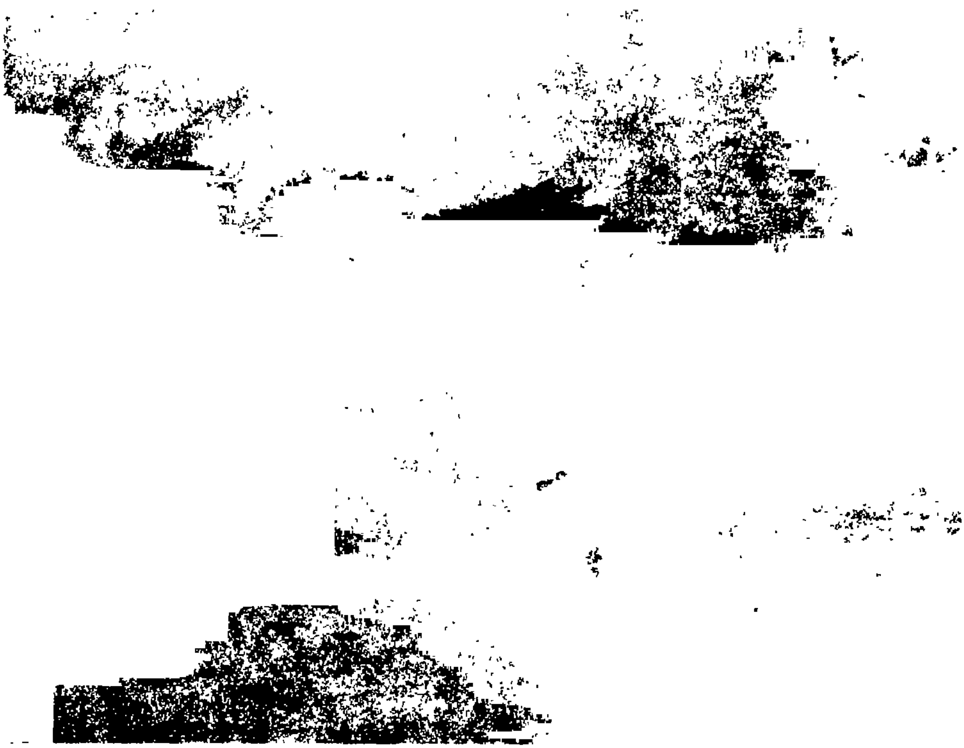
تو مہر کی ہے آرزو — گلشن کو تیری جستجو
مستی طرازِ انجمن — تیری نظر کا بانکپن
پندارِ شبنم تجھ سے ہے — نکہت مجسم تجھ سے ہے
سیمِ سمن کا تاج ہے — تو خاک کی معراج ہے
پروردۂ نازِ ہوا — عنوانِ آغازِ صبا
ہونٹوں کا خم شہد آفریں — پلکوں کے سائے احمریں
مشکیں نفس، رنگیں نظر — سب کچھ ہے تو المختصر
اے خاتمِ نزہت نگیں — لیکن بہ ایں طرزِ حسیں
آزاد ہے نکہت تری — پابند ہے فطرت تری
گو تو سراپا ہوش ہے — آتش تری خاموش ہے
اے کردگارِ رنگ و بو — خالی ہے کیوں تیرا سبو؟
اک بے سبب آزردگی — کیوں ہے دخیلِ زندگی؟
ہیں کس لئے تیرے قدم — نا آشنائے ذوقِ رم؟
کیوں ہے متاعِ رائیگاں — تیرا جمالِ زرفشاں؟
تو خاک سے پیدا ہوا — اور خاک پیما ہی رہا
ناپے مری پرواز نے — عرش و زمیں کے فاصلے

تیری ضعیفی بارہا
تجھ سے ہوئی گرمِ نوا

بن ایک فردوسِ رواں — اے جلوۂ خاک آشیاں
کس دام میں ہے قید تو — صیاد ہے یا صید تو؟
یہ دامِ رنگیں توڑ دے — حالات کا رخ موڑ دے
ہیں نصب ہمت کے علم — صحرا بہ صحرا، یم بہ یم
تا کے یہ حسنِ منفعل — برقِ تجلی — پا بہ گل؟
فکرِ بلندی شرط ہے — عرفانِ ہستی شرط ہے
یہ کائنات گلستاں — ہیں اس سے آگے بھی جہاں
قیدِ مقامی سے نکل — ہاں اس غلامی سے نکل
میں تیری شمعِ رہگزر — لے نکہتوں سے بال و پر

آ! اٹھ کے میرے ساتھ آ!
گلشن سے کاشانہ اٹھا!

●



مشرقی پاکستان کی شاداب تھیلیاں



از حضرت سید احمد شہید بریلوی رح ([illegible])

لالہ زار



ایک درہ





شوگران بستی

پریوں کی وادی - کاغان

ایک عورت



پریوں کی وادی — کاغان

حبیب الرحمان

پاکستان کی یہ وادی، جو اپنے حسن و جمال کی بدولت کافی شہرت حاصل کر چکی ہے اور جس کا شمار دنیا کے حسین ترین خطوں میں ہوتا ہے، یعنی موجودہ پشاور ڈویژن کے ہزارہ نامی ضلع میں واقع ہے۔ یوں تو اس ضلع میں کئی اور بھی حسین خطے اور وادیاں موجود ہیں مثلاً گلیات، ایبٹ آباد (مغربی پاکستان کا گرمائی دارالخلافہ) ٹھنڈیانی، وادی بھوگرمنگ وغیرہ وغیرہ، لیکن مصورِ فطرت کے حسن کار ہاتھوں نے جس طرح وادیٔ کاغان کو آراستہ کیا ہے، وہ اپنی مثال آپ ہے۔

یہ ۹۲ میل لمبی اور اوسطاً ۱۵ میل چوڑی وادی بالاکوٹ سے شروع ہو کر درۂ بابوسر پر ختم ہوتی ہے۔ اس کے بیچوں بیچ دریائے کنہار شور مچاتا اور بڑی بڑی چٹانوں کا سینہ چیرتا ہوا بہتا ہے۔ دریا کے دونوں جانب پہاڑوں کے اونچے اونچے سلسلے چلتے ہیں جو راستے میں متعدد درّے اور چھوٹی بڑی وادیاں بناتے چلے جاتے ہیں۔

بالاکوٹ سے چند میل آگے تک پہاڑ اور پہاڑیاں تمام تر سبزے سے ڈھکی ہوئی ہیں اور کہیں کہیں تھوڑے بہت درخت بھی ہیں، مگر اس کے بعد جنگلات کا باقاعدہ ایک سلسلہ شروع ہو جاتا ہے جو پہاڑوں کی چوٹیوں سے لے کر دریا کے کناروں تک پھیلتا چلا گیا ہے۔ خوش قسمتی سے یہ جنگلات انسانی دستبرد سے بہت حد تک محفوظ رہے ہیں اور بہت گھنے اور خوشنما ہونے کی وجہ سے آج اس وادی کی خوبصورتی میں معتدبہ اضافہ کر رہے ہیں۔

وادیٔ کاغان کی سرسبز ڈھلانیں اور گھاٹیاں، جنگلات سے ڈھکے ہوئے پہاڑ اور درے، پہاڑوں کی برف پوش چوٹیاں جنہیں صبح و شام سورج آ کر سنہری تاج پہنا دیتا ہے، سرد اور شیریں پانی کے چشمے، مترنم پہاڑی نالے، انواع و اقسام کے خوبصورت اور خوش الحان پرندے، درختوں کی گھنی، خنک اور تسکین بخش چھاؤں، چیل، دیودار، پڑتل، صنوبر اور اسی قسم کے دیگر فلک بوس درختوں کی روح پرور سائیں سائیں اور مسحور کن مہک، پُرسکون، وسیع، گہری اور شفاف برفانی جھیلیں، سانپ کی طرح بل کھاتے ہوئے دریائے کنہار کا پرکیف نظارہ اور خواب آور شور، انواع و اقسام کے خودرو پھولوں سے اٹے ہوئے سبزہ زار اور پہاڑوں کے دامن، دلکش آبشار اور لطیف و صحت بخش آب و ہوا ہر انسان، ہر ناظر کو اپنا مداح بنا لیتی ہے۔ کون ہے جو اس قدر حسین و دلکش نظاروں سے لطف اندوز ہونے کے لئے بیتاب نہ ہو۔

پاکستان سے پہلے اس سراپا حسین وادی کا نظارہ بہت ہی کم لوگوں کو نصیب ہوتا تھا۔ اسے حکمران طبقے نے اپنے ہی لئے مخصوص کر رکھا تھا، چنانچہ اُس وقت بالاکوٹ سے لے کر بابوسر تک صرف ایک پگڈنڈی تھی۔ انگریز افسر اور سیاح گھوڑوں یا خچروں پر یہ راستہ طے کرتے، کئی کئی ہفتے اس وادی کے مختلف حسین حصوں میں خیمے لگا کر مچھلی وغیرہ کا شکار کھیلتے اور اس کے نظاروں سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ وہ ضروری اشیاء، خوراک و دیگر سامان اور نوکر چاکر اپنے ساتھ لے جاتے تھے، مگر عام آدمی کو یہ سہولتیں میسر نہ تھیں۔

قیامِ پاکستان کے بعد حکومتِ پاکستان نے اس پگڈنڈی کو صرف تین ماہ کے مختصر عرصے میں ایک جیپ گاڑی کی سڑک میں تبدیل کر دیا، اور اس طرح اس گمنام اور بھولی بسری وادی کے بھاگ کھل گئے۔ اب اس سڑک کو کشادہ کرنے کا کام شروع ہو چکا ہے اور مستقبل قریب میں اس پر لاری موٹر کی آمد و رفت بھی شروع ہو جائے گی۔ یہ سڑک جو بالاکوٹ سے لے کر درۂ بابوسر تک دریائے کنہار کے ساتھ ساتھ، کبھی دائیں کبھی بائیں ہو کر جاتی

ہے، بابوسر سے گزر کر دریائے سندھ کے ساتھ ساتھ چلتی ہوئی گلگت تک جا پہنچتی ہے۔ اب یہ دنیا کی دوسری بلند ترین سڑک شمار ہوتی ہے۔

آغاز سفر: وادی کاغان کو جانے والے شائقین کی رہنمائی کے لئے یہ بتانا ضروری ہے کہ انہیں اس وادی میں پہنچنے کے لئے ایبٹ آباد سے ہو کر جانا پڑے گا جو مغربی پاکستان کا گرمائی دارالخلافہ اور ضلع ہزارہ کا صدر مقام ہونے کے علاوہ ایک اہم اور خوبصورت صحت افزا مقام بھی ہے۔ یہ رش ایک سرسبز میدان میں واقع ہے اور اس کے ارد گرد چھوٹی بڑی پہاڑیوں کے سلسلے ہیں جو چیل کے درختوں اور سبزے سے ڈھکے ہوئے ہیں۔ ایبٹ آباد سطح سمندر سے ۴۱۰۰ فٹ بلند ہے، اور پشاور اور راولپنڈی سے بذریعہ ریل اور سڑک ملا ہوا ہے۔ یہ پشاور سے ۱۲۳ میل اور راولپنڈی سے ۷۰ میل پر ہے۔ ریل سے آنے والے لوگ حویلیاں سے بذریعہ بس یا ٹیکسی ایبٹ آباد پہنچ سکتے ہیں جو حویلیاں سے صرف دس میل کے فاصلہ پر ہے۔

ایبٹ آباد میں ٹھہرنے کے لئے ایک معیاری ہوٹل کے علاوہ دو تین کیمپ، ایک ڈاک بنگلہ اور ایک سرکٹ ہاؤس بھی موجود ہیں۔ سرکٹ ہاؤس یا ڈاک بنگلے میں ٹھہرنے کے لئے محکمۂ تعمیرات عامہ اور ڈپٹی کمشنر ہزارہ کے اجازت نامے ضروری ہیں۔ اگر کسی کو کاغان جاتے ہوئے ایبٹ آباد میں ایک آدھ رات گزارنے کے لئے جگہ نہ مل سکے تو مایوسی کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ مانسہرہ یا گڑھی حبیب اللہ کے ڈاک بنگلوں میں ٹھہرنے کے انتظامات بخوبی ہو سکتے ہیں۔ یہ دونوں مقامات بجائے خود خوش منظر ہونے کے علاوہ وادی کاغان کے بھی بہت قریب ہیں۔ جو لوگ ضروری سامان ساتھ نہ لا سکیں، وہ اپنی ضروریات ایبٹ آباد کے صاف ستھرے اور پُر رونق بازاروں سے پوری کر سکتے ہیں۔

حال ہی میں ایبٹ آباد سے شمال کو چار میل کے فاصلہ پر میرپور نامی مقام پر حکومت نے ایک یوتھ ہاسٹل تعمیر کیا ہے جو عنقریب سیاحوں کے لئے کھلنے والا ہے۔ اس طرح قیام کی سہولت میں مزید اضافہ ہو جائے گا۔

بالاکوٹ: بالاکوٹ، جو ایبٹ آباد سے ۴۵ میل کے فاصلے پر واقع ہے، وادی کاغان کا دروازہ ہے اور ایبٹ آباد سے پختہ سڑک کے ذریعے ملا ہوا ہے۔ ایبٹ آباد اور بالاکوٹ کے درمیان ٹیکسی گاڑیاں، اور بسیں عام چلتی ہیں اور سفر میں کوئی خاص دقت نہیں ہوتی۔ رہائش کے لئے یہاں دو ڈاک بنگلے موجود ہیں۔ اگر ڈاک بنگلوں میں جگہ نہ مل سکے تو یہاں کے ہائی سکول میں رات بھر کے قیام کا انتظام ہیڈ ماسٹر صاحب کی اجازت سے ہو سکتا ہے۔ طعام کا انتظام بھی آسانی سے حسب منشاء ہو جاتا ہے۔ یہاں چھوٹی موٹی کھانے کی دکانیں موجود ہیں جو فرمائش کے مطابق کھانا تیار کر دیتی ہیں۔

بالاکوٹ نام کا پہلا حصہ بالا پیر صاحب کے نام سے موسوم ہے جن کا مزار قریب ہی پل کے اُس پار واقع ہے۔ ان کے متعلق مشہور ہے کہ وہ کوڑھیوں کو اپنی کرامت سے اچھا کر دیتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ آج سے چند برس پہلے تک درجنوں کوڑھی اس مزار پر پڑے نظر آتے تھے۔ اب حکومت نے ان کوڑھیوں کے لئے آبادی سے دور ایک ہسپتال بنا دیا ہے جہاں علاج کے مناسب انتظامات موجود ہیں۔ یہاں ایک گورنمنٹ ہائی سکول، ایک تھانہ، گورنمنٹ ٹرانسپورٹ سروس کا دفتر اور ایک سول ہسپتال موجود ہے۔

بالاکوٹ وادی کاغان کا دروازہ اور منڈی ہونے کے علاوہ ایک اہم تاریخی مقام بھی ہے یہاں مجاہدین اسلام حضرت سید احمد صاحب بریلویؒ اور حضرت اسماعیل صاحب کے مزار ہیں جو ۱۸۳۰ء میں سکھوں کے مقابلے میں لڑتے ہوئے شہید ہو گئے تھے۔ یہاں سے لے کر بابوسر تک تمام راستے میں اوسطاً ہر بارہ میل کے فاصلے پر ایک پڑاؤ آتا ہے جہاں رہائش وغیرہ کے انتظامات موجود ہیں۔

پہلا پڑاؤ کوائی: بالاکوٹ سے چل کر ۱۲ میل کے فاصلے پر پہلا پڑاؤ پڑتا ہے جسے کوائی کہتے ہیں۔ یہاں ایک مختصر سا پی ڈبلیو ڈی ریسٹ ہاؤس موجود ہے۔ ۱۹۵۲ء میں جب پاکستان کے گورنر جنرل کاغان کے دورے پر گئے تھے تو انہوں نے اور ان کی پارٹی نے اسی مقام پر قیام کیا تھا۔ یہ پڑاؤ سطح سمندر سے ۴۸۰۰ فٹ بلند ہے۔

کوائی سے تھوڑے ہی فاصلے پر سڑک کی دائیں جانب ایک اور سڑک بڑی سڑک سے جدا ہو کر بل کھاتی ہوئی سامنے کی پہاڑی کی چوٹی تک چلی جاتی ہے جہاں شوگراں واقع ہے۔ یہ سڑک کوئی چار میل لمبی ہے اور اس پر جیپ گاڑی بخوبی جا سکتی ہے۔ یہ راستہ تقریباً تمام کا تمام چڑھائی کا ہے اور خوشنما جنگل میں سے گزرتا ہے۔

شوگراں جو ۷۹۰۰ فٹ کی بلندی پر ایک سرسبز اور جنگلات سے ڈھکی ہوئی پہاڑی کی چوٹی پر واقع ہے، کاغان کے ان چند نہایت حسین اور دلکش مقامات میں سے ہے جہاں پہنچ کر انسان پر عجیب کیفیت طاری ہوتی ہے۔ شوگراں ریسٹ ہاؤس سے جنوب مغرب، شمال اور شمال مشرق میں وادی کاغان کے تمام رنگین مناظر کی خوب سیر ہو سکتی ہے سوائے چند ایک

بلند چوٹیوں کے باقی وادی کا بہت سا حصہ قدموں کے نیچے نظر آتا ہے۔ یہاں سے دور شمال مشرق کو راجہ بھوگی اور تلکا پربت کی برفانی چوٹیاں آسمان سے باتیں کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ اسی طرح مغرب کی جانب موسیٰ کا مصلےٰ اور مشرق میں مکڑا کی اونچی اور سفید چوٹیاں دکھائی دیتی ہیں۔ تلکا پربت کاغان میں بلند ترین چوٹی ہے جو سطح سمندر سے ۱۷،۳۶۰ فٹ بلند ہے۔

شوگراں میں محکمۂ جنگلات کے دو عمدہ اور کشادہ ریسٹ ہاؤس موجود ہیں جن کے سامنے ایک اچھا وسیع اور شاداب چمن ہے۔ اس چمن میں اخروٹ کے بڑے بڑے سرسبز درخت ہیں جن کی خوشبو سے تمام چمن مہکتا رہتا ہے۔ جیپ میں یا پیادہ سفر کرنے کے بعد آدمی جب یہاں پہنچتا ہے تو اکثر چت لیٹ کر سستانے۔ آپ کو ایک حسین خواب کے عالم میں محسوس کرتا ہے اور گھنٹوں اٹھنے کا نام نہیں لیتا کیونکہ ہوا کے سرد اور فرحت بخش جھونکے ایک خواب آور دوا کا سا عمل کرتے ہیں۔

دوسرا پڑاؤ: کوائی سے ۱۴ میل کے فاصلے پر دوسرا پڑاؤ آتا ہے، جسے دہانڈری کہتے ہیں۔ یہاں تمام وادی کی آرجار (ٹریفک) کی تنظیم کی جاتی ہے۔ اس مقام پر ایک پھاٹک ہے اور قریب ہی پولیس کی چوکی۔ چونکہ وادی کاغان میں ٹریفک یک طرفہ ہے۔ اس لئے پولیس اس پھاٹک کو صرف مقررہ وقت پر کھولتی اور بند کرتی ہے۔ بالاکوٹ سے ناران اور ناران سے بالاکوٹ جانے والی جیپ گاڑیاں یہاں آکر رک جاتی ہیں اور پھاٹک کھلتے ہی اپنی اپنی منزل کو روانہ ہو جاتی ہیں۔ عام حالات میں یہ پھاٹک دن میں دو بار کھلتا اور بند ہوتا ہے۔

مہانڈری میں محکمۂ تعمیرات عامہ کا ایک مختصر سا ریسٹ ہاؤس موجود ہے جو لب دریا واقع ہے۔ اس ریسٹ ہاؤس کے سامنے ایک چھوٹا سا سرسبز چمن ہے جہاں بیٹھ کر دریا کے نظارے کا لطف اٹھایا جا سکتا ہے۔ یہ مقام سطح سمندر سے ۵،۸۰۰ فٹ بلند ہے۔

مہانڈری پہنچنے سے قبل راستے میں ایک مقام آتا ہے، جسے شینو کہتے ہیں۔ یہاں محکمۂ جنگلات نے ٹراؤٹ مچھلی کی پرورش گاہ قائم کر رکھی ہے۔ اس پرورش گاہ میں مچھلی کی پرورش کی جاتی ہے اور ایک خاص میعاد کے بعد انہیں دریا میں ڈالا جاتا ہے تاکہ ان کی نسل زیادہ ہو اور دریا میں مچھلی کم نہ ہونے پائے۔

تیسرا پڑاؤ: مہانڈری سے چل کر گیارھویں میل پر تیسرا اور اہم پڑاؤ کاغان ہے جس کے نام سے تمام وادی موسوم ہے۔ یہاں ایک ریسٹ ہاؤس، ایک ہسپتال، ایک ڈاک خانہ، تار گھر، ایک مڈل سکول، ایک زنانہ پرائمری سکول اور ایک زراعتی فارم ہے۔ یہاں وادی قدرے کھلی ہے اور لوگ تھوڑی بہت کھیتی باڑی کرتے ہیں۔ یہ مقام ۸،۰۰۰ فٹ بلند ہے۔

مہانڈری سے کاغان جاتے ہوئے راستے میں ایک نالہ آتا ہے جسے نمنی کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ اس نالے کو پار کر کے چلئے تو تھوڑے ہی فاصلے پر ایک پگڈنڈی سڑک سے جدا ہو کر نیچے بائیں ہاتھ کو اتر جاتی ہے۔ یہ کمال بن کا راستہ ہے جو ریچھ کے شکار کے لئے بہت اہم اور مشہور مقام ہے۔ یہاں محکمۂ جنگلات کا ایک چھوٹا سا ریسٹ ہاؤس موجود ہے۔ نمنی نالے سے کمال بن تک کوئی چار میل فاصلہ ہے جو پیادہ یا سواری کے جانوروں پر ہی طے کیا جا سکتا ہے۔ کمال بن اور کاغان سے ڈاڈر ایک پگڈنڈی کے ذریعے ملا ہوا ہے جس کا ذکر آگے چل کر قدرے تفصیل سے بیان کیا جائے گا۔

چوتھا پڑاؤ: کاغان سے چل کر کوئی ساڑھے چودہ میل پر چوتھا پڑاؤ ناران آتا ہے، جو نہ صرف اس وادی کا صدر مقام ہے بلکہ کئی اور وجوہات سے بھی اہم ہے۔ جوں جوں آپ ناران کے قریب ہوتے جاتے ہیں آپ کو جنگلات بتدریج کم ہوتے نظر آئیں گے۔ اس کمی کی وجہ محض بلندی ہے۔ درخت ایک خاص اونچائی تک ہی پھل پھول سکتے ہیں اور اس سے زیادہ بلندی پر درختوں کا کم ہونا ایک لازمی امر ہے۔ ناران کی بلندی ۸،۰۸۶ فٹ ہے۔

برف کے تودے: ناران جاتے ہوئے راستے میں برف کے متعدد بڑے بڑے تودے جنہیں انگریزی میں گلیشیرز کہتے ہیں، پڑے ہوئے ملتے ہیں اور جیپ کو ان تودوں کے اوپر سے یا بیچ میں سے ہو کر گزرنا پڑتا ہے۔ یہ تودے سال بھر رہتے ہیں اور ٹریفک کے لئے بڑی دشواریاں پیدا کرتے ہیں۔ کئی کئی ماہ تک آرجار محض ان تودوں کے باعث رکی رہتی ہے۔ ناران سے لے کر بابوسر تک درجنوں ایسے نالے آتے ہیں جہاں برف کے تودے پڑے ہوتے ہیں اور جن کو مشکل سے کاٹ کاٹ کر جیپ کے گزرنے کے لئے راستہ بنایا جاتا ہے۔

ناران ایک مختصر سی جگہ ہے۔ یہاں ایک چھوٹا سا بازار، محکمۂ تعمیرات کے اوورسیر کا دفتر، فرنٹیئر کانسٹیبلری کاغان کا ہیڈ کوارٹر، محکمۂ جنگلات کے

ریسٹ افسر کا دفتر، پولیس کی چوکی اور ایک پرائمری سکول ہے۔ علاوہ ازیں یہاں آٹھ کمروں پر مشتمل محکمۂ تعمیرات کی ایک قیام گاہ ہے جس میں ہوٹل کی سی سہولتیں میسر ہیں۔ اس ہوٹل کے علاوہ بھی مقامی آدمیوں کے دو تین ہوٹل ہیں جہاں رہائش اور خوراک کا عمدہ اور ارزاں بندوبست موجود ہے۔

ناران سے شمال کو تقریباً ایک میل دور ایک شاندار عمارت ہے جو حال ہی میں تعمیر ہوئی ہے۔ یہ سرکٹ ہاؤس ہے جو ناران کٹھہ اور دریائے کنہار کے سنگم پر واقع ہے یہاں دریائے کنہار ایک جھیل کی شکل اختیار کرتا ہوا بہتا ہے اور اس کا نظارہ اتنا دلفریب ہے کہ یہاں سے اور کہیں جانے کو جی نہیں چاہتا۔ یہاں دریا کا پاٹ مچھلی کے شکار کے لئے نہایت عمدہ جگہ ہے اور عموماً شکاری اسی مقام یا اس سے چار میل اوپر تک کے علاقے کو ہی ترجیح دیتے ہیں یہ علاقہ، جسے سونچ کہتے ہیں، مچھلی کی سب سے مقبول شکارگاہ ہے۔

سرکٹ ہاؤس کے قریب ہی ناران کٹھہ پر ایک لکڑی کا پل ہے جس پر سے سڑک گزر کر بابوسر جاتی ہے۔ اس پل کے دائیں اور بائیں اطراف سے دو راستے نکل کر مشرق کی طرف جاتے ہیں اور تقریباً ڈیڑھ میل تک جدا جدا چل کر آپس میں مل جاتے ہیں۔ یہ راستہ سیف الملوک جھیل کو جاتا ہے جو ناران سے ۶ میل کے فاصلے پر ایک درے میں واقع ہے۔ اس کی پشت اور دائیں بائیں ڈھلانوں سے برفانی تودے پگھل پگھل کر اس جھیل کا پیٹ بھرتے رہتے ہیں۔ یہ تقریباً نصف میل لمبی اور ۵۰۰ گز چوڑی ایک بے قاعدہ دائرے کی شکل میں ہے۔ یہ کافی گہری ہے اور اس میں قوس قزح کے رنگ سے ملتی جلتی ٹراؤٹ مچھلی پائی جاتی ہے جو وادی کاغان کی باقی ٹراؤٹ مچھلی سے وزن میں دو یا چار پونڈ زیادہ ہوتی ہے۔ سنہ ۱۹۵۰ء میں پشاور کے ایک مشہور شکاری نے اس جھیل میں سے ۱۰ پونڈ وزنی قوس قزح کے رنگ سے ملتی جلتی ایک ٹراؤٹ مچھلی پکڑی تھی۔ بعد میں محکمۂ جنگلات نے تین سال کی مدت کے لئے یہاں شکار بند کر دیا تاکہ اس میں مچھلی ختم نہ ہو جائے۔

جھیل سیف الملوک تک راستہ قدرے دشوار ضرور ہے مگر ہمت نہیں ہارنا چاہئیے کیونکہ آپ جب یہ مسافت طے کر کے جھیل کے کنارے قدم رکھیں گے تو آپ کو یوں محسوس ہوگا جیسے آپ پریوں کی کسی وادی میں پہنچ گئے ہیں۔ اس جھیل کے متعلق ایک عجیب چیز یہ ہے کہ یہاں پہنچنے کے بعد عام طور پر صاف موسم میں بھی بادل کا ایک آدھ ٹکڑا نمودار ہو کر سرد ہوا اور بارش کا سبب بن جاتا ہے اور بہت سے لوگ اس رومانی داستان پر یقین کرنا شروع کر دیتے ہیں جو اس جھیل کے متعلق صدیوں سے مشہور چلی آتی ہے۔ یہ جھیل سطح سمندر سے ۱۰،۵۰۰ فٹ اور ناران سے ۳،۴۰۰ فٹ کی بلندی پر واقع ہے۔

پرانی کہانی

وہ داستان یوں ہے کہ ایک دفعہ دہلی کے ایک مسلمان شہزادے سیف الملوک نے ایک رات خواب میں پریوں کی شہزادی بدرجمال کو دیکھا اور دیکھتے ہی اس پر لٹو ہو گیا۔ اس خواب نے شہزادے کی زندگی میں تلاطم پیدا کر دیا۔ اسے پل بھر چین نصیب نہ تھا اور اس کی آنکھیں نیند سے بیگانہ ہو گئیں۔ وہ اپنی زندگی میں اب ایک ایسا خلا محسوس کرنے لگا جس کا بدرجمال پری کے بغیر پر ہونا ناممکن تھا۔ اس کے کسی کاہن درباری نجومی نے زائچہ کھینچ کر مشورہ دیا کہ وہ شمال کی سمت پہاڑوں میں جائے، جہاں کچھ مدت کے بعد اس کی معشوقہ اسے مل جائے گی۔ چنانچہ عشق اسے کشاں کشاں ناران تک لے آیا، جو ان دنوں ایک بہت بڑا اور مشہور شہر تھا۔ یہاں لوگوں نے شہزادے کو بتایا کہ اس جھیل پر ہر بارہ سال کے بعد پریوں کا ایک غول نہانے کے لئے آتا ہے اور ان میں ان کی ایک شہزادی بھی ہوتی ہے جو تخت پر سوار ہو کر آتی ہے۔ اتنی رہنمائی شہزادے کے لئے کافی تھی، چنانچہ وہ اس جھیل پر چلا گیا اور ایک طویل مدت کے بعد آنے والے سنہرے موقع کا بے صبری سے انتظار کرنے لگا۔ آخر ایک دن اسے آسمان پر زور کی گڑگڑاہٹ سنائی دی۔ جب اس نے اوپر دیکھا تو پریوں کا ایک جمگھٹا ایک تخت اٹھائے نیچے اتر رہا تھا۔ یہ نظارہ دیکھ کر شہزادہ ایک محفوظ جگہ چھپ گیا۔ جب پریاں نیچے اتریں اور اپنے اپنے کپڑے اتار کر جھیل میں اتر گئیں تو شہزادہ اٹھا اور شہزادی بدرجمال کے کپڑے چرا لئے۔ باقی پریاں آدم زاد کو دیکھ کر اپنے اپنے کپڑے پہن کر اڑ گئیں، مگر ملکہ بدرجمال بے بس ہو کر رہ گئی۔ شہزادہ سیف الملوک کی سچی محبت اپنا اثر کئے بغیر نہ رہ سکی اور ملکہ بدرجمال نے بخوشی اس کی زوجہ بننا منظور کر لیا۔ یہ دونوں جھیل چھوڑ کر نیچے ناران آ رہے تھے کہ اس واقعہ کا علم اس دیو کو ہو گیا جو ملکہ بدرجمال پر دل و جان سے فریفتہ تھا۔ اسے ملکہ کی بے وفائی اور ایک آدم زاد کی جرأت پر بہت غصہ آیا اور دونوں کو بیک وقت ختم کرنے کی ٹھان لی۔ ان دونوں کو نیچے وادی میں اترتے دیکھ کر اس نے جھیل کے ایک کنارے کو اپنی ایڑی کی ٹھوکر سے توڑ دیا جس سے تمام وادی میں عظیم الشان سیلاب آ گیا۔ شہزادہ سیف الملوک اور ملکہ بدرجمال نے ایک پہاڑی پر چڑھ کر پناہ لی، مگر ناران کا شہر اس سیلاب کی نذر ہو گیا۔ سرکٹ ہاؤس کے قریب ایک معمولی سا ٹیلہ ہے جس کے اندر ایک بہت بڑا غار ہے۔ اس غار کے متعلق مشہور ہے کہ یہ اس دیو کی قیام گاہ تھی جسے سیلاب کے بعد اس نے ہمیشہ

کے لئے خالی کر دیا ۔

جھیل سیف الملوک سے جو نالہ نکل کر بہتا ہوا دریائے کنہار میں مل جاتا ہے اسے ناران کنڈ کہتے ہیں۔ یہ ایک کافی بڑا تیز رفتار نالہ ہے۔ سرکٹ ہاؤس کے لئے پینے کا پانی اسی سے حاصل کیا جاتا ہے۔ پل سے لے کر تقریباً آدھ میل اوپر تک اس کنڈ کے کنارے اچھے خاصے رقبہ میں محکمۂ جنگلات کا نرسری فارم ہے جس میں کافی پودے اب جوان ہو چکے ہیں۔ ناران کنڈ اس نرسری فارم کے سارے رقبے کو چھوٹی چھوٹی نالیوں کے ذریعہ سیراب کرتا ہے گھنی چھاؤں اور سبزے میں سے گذرتے وقت پانی ان نالیوں میں یوں معلوم ہوتا ہے جیسے پگھلی ہوئی چاندی۔ یہ مقام سیر و تفریح اور پکنک کیلئے بہت موزوں ہے۔ جو لوگ پہاڑی راستوں کی صعوبتوں کے متحمل نہیں ہو سکتے وہ اس خوبصورت فارم میں دل بہلاوے کا کافی سامان پائیں گے ۔

ناران تجارتی لحاظ سے بھی ایک اہم جگہ ہے۔ بالاکوٹ کے بعد وادیٔ کاغان میں ناران کی منڈی کا نمبر آتا ہے۔ یہاں کاغانی کمبل، اخروٹ، شہد، کاغانی گھی، کھالیں، زیرہ گچھی وغیرہ ارزاں نرخوں پر دستیاب ہوتی ہیں ۔

پانچواں پڑاؤ: ناران کے بعد دس میل کے فاصلے پر پانچواں پڑاؤ پڑتا ہے اسے بٹہ کونڈی کہتے ہیں، جو دریائے کنہار کے کنارے ایک کھلے اور سر سبز میدان میں واقع ہے۔ بٹہ کونڈی سے دریا کی سطح کافی نیچے ہے۔ یہاں محکمۂ تعمیرات کی دو فرودگاہیں ہیں ان کے علاوہ یہاں ایک یوتھ ہاسٹل بھی بن چکا ہے جو وادیٔ کاغان کے چار یوتھ ہاسٹلوں میں سے ایک ہے۔ ایک ایسا ہی ہاسٹل ناران میں تعمیر کیا جا چکا ہے۔ بٹہ کونڈی سطح سمندر سے ۸،۶۴۹ فٹ بلند ہے۔ ناران سے جوں جوں آگے چلیں وادی وسیع ہوتی جاتی ہے اور ساتھ ہی ساتھ پہاڑوں پر درخت بھی کم ہوتے جاتے ہیں جس سے یہ خیال پیدا ہونے لگتا ہے کہ یہ کوئی نئی وادی ہے ۔

بٹہ کونڈی ریسٹ ہاؤس سے شمال مشرق کو ایک بلند چوٹی نظر آتی ہے جو ہمیشہ برف سے سفید رہتی ہے۔ اس چوٹی کا نام ڈبوکا ہے جو سطح سمندر سے ۱۶،۱۹۶ فٹ بلند ہے۔ اس چوٹی پر سورج کی تمازت کا بہت ہی کم اثر ہوتا ہے چنانچہ یہاں لاکھوں برس پرانی برف موجود ہے جو پتھر سے زیادہ سخت اور نیلے رنگ کی ہے ۔

بٹہ کونڈی ریسٹ ہاؤس ایک برفانی نالے کے کنارے واقع ہے جسے ڈونڈ نالہ کہتے ہیں۔ اس نالے کے ساتھ ساتھ داہنی طرف ایک پگڈنڈی دور تک درے کے اندر چلی گئی ہے۔ یہ راستہ کشمیر تک جاتا ہے۔ کاغان کے لوگ اسی راستے کشمیر جایا آیا کرتے تھے۔ اب بھی اس راستے کے ذریعے کاغان اور آزاد کشمیر کے درمیان آمد و رفت ہوتی ہے ۔

لالہ زار: بٹہ کونڈی ریسٹ ہاؤس سے تھوڑے فاصلے پر جنوب مشرق کی ایک سر سبز پہاڑی ہے جو ڈونڈ نالے کی بائیں طرف، چلتی ہوئی یکدم جنوب مشرق کو رخ پھیر لیتی ہے۔ اس پہاڑی کی چوٹی بٹہ کونڈی سے بذریعہ سڑک ملی ہوئی ہے۔ یہ سڑک جو پہاڑی کی چوٹی تک جاتی ہے کوئی دو میل کے لگ بھگ ہی ہوگی۔ پہاڑی کی چوٹی پر پہنچ کر اچانک وسیع اور دلکش سبزہ زاروں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ یہ سبزہ زار تعداد میں کل سات ہیں اور یکے بعد دیگرے سیڑھیوں کی صورت میں سمٹتے والی اونچی پہاڑی کی چوٹی تک چلے جاتے ہیں۔ یہ سبزہ زار ڈھلوان کی شکل کے ہیں اور جنگلی پھولوں سے اٹے رہتے ہیں۔ ان کے عین وسط میں ایک برفانی نالہ گذرتا ہے۔ ان میں جا بجا دیودار اور پڑتل کے سر سبز اور خوشنما درخت ایسا سماں پیدا کرتے ہیں جو نہایت ہی دلفریب ہوتا ہے۔ جی بے اختیار سبزے پر لوٹنے کو چاہتا ہے ۔

حسین قدرتی مناظر کے دلدادہ اصحاب کو لالہ زار ہر وقت دعوت دیتا ہے۔ یہ جگہ کاغان کے حسین ترین مقامات میں سے ہے اور کیمپ کے لئے نہایت موزوں ہے۔ یہاں چند دن گذارنے پر انسان کے مردہ جسم میں تر و تازگی کا پیدا ہونا ایک قدرتی امر ہے ۔

چھٹا پڑاؤ: بٹہ کونڈی سے آگے کوئی آٹھ میل کے فاصلے پر بوڑاوائی نامی چھٹا پڑاؤ پڑتا ہے۔ یہ ایک کھلے مگر پتھریلے رقبے میں واقع ہے، جہاں کچھ خودرو پھول اور جڑی بوٹیاں بھی دیکھنے میں آتی ہیں۔ یہ مقام سطح سمندر سے ۱۰،۰۰۹ فٹ بلند ہے۔ اس کے پہلو میں ایک برفانی نالہ بہتا ہے جسے بوڑا کنڈ کہتے ہیں۔ بوڑاوائی کاغان میں سب سے بلند مقام ہے جہاں کھیتی باڑی ہوتی ہے۔ یہاں بھی محکمۂ تعمیرات کی ایک مختصر سی فرودگاہ ہے۔ بوڑاوائی سے آگے بابوسر تک جتنے بھی پڑاؤ آتے ہیں وہاں کوئی قیام گاہ نہیں ہے۔ اگر کسی کے پاس اپنا خیمہ وغیرہ ہو تو وہ بغیر کسی خطرے کے ان میں سے کسی پڑاؤ پر خیمہ نصب کر کے رہ سکتا ہے۔ بہتر ہے کہ خیمہ فرنٹیئر کانسٹیبلری کی پوسٹ کے متصل نصب کیا جائے ۔

ساتواں پڑاؤ: جھیل اس وادی میں ساتواں پڑاؤ ہے جو بوڑاوائی سے گیارہ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ یہ مقام سطح سمندر سے ۱۰،۶۶۰ فٹ بلند ہے اور گوجر قوم (کاغان کی قدیم مشہور خانہ بدوش

قوم جس کا پیشہ مال مویشی پالنا ہے) کا گرمائی مرکز ہے۔ یہاں پہاڑوں کی ڈھلانوں پر سبزے اور جڑی بوٹیوں کی بہتات، دروں کے اندر شاداب چھوٹے بڑے ٹیلے، برفانی نالوں کے کشادہ اور سبزے سے لہلہاتے ہوئے کنارے اور پانی کی فراوانی ایسی چیزیں ہیں جو مال مویشی کے لئے بہشت سے کم نہیں۔ کاغان وادی میں یہ سب سے مشہور اور عمدہ چراگاہ ہے ÷

گوجروں کے قافلے: بالاکوٹ سے روانہ ہونے کے بعد راستے میں جگہ جگہ آپ کو جا بجا گوجروں کے چھوٹے بڑے قافلے ملیں گے جو اپنی بھیڑ بکریاں اور مال مویشی وادی کاغان کی چراگاہوں میں لئے جاتے ہیں۔ ان چراگاہوں کو گوجر اپنی اصطلاح میں ماحل کہتے ہیں۔ ان قافلوں میں سے اکثر کی منزلِ مقصود بیسل ہوتی ہے۔ وادی کاغان کی لطیف اور تازہ ہوا، سرد پانی اور جڑی بوٹیوں سے اٹی ہوئی چراگاہیں بھیڑ بکریوں اور مال مویشی کو صحت مند اور فربہ کرنے میں جادو کا سا اثر رکھتی ہیں۔ جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے بیسل میں کوئی ریسٹ ہاؤس نہیں۔ اگر خیمہ ساتھ ہو تو اسے کانسٹیبلری کی چوکی کے متصل گراؤنڈ میں نصب کر کے بے خوف و خطر رہائش اختیار کی جا سکتی ہے ÷

بیسل پہنچنے سے کچھ قبل دائیں جانب ایک برفانی نالہ ایک درے سے نکل کر دریائے کنہار کی آغوش میں سما جاتا ہے۔ اسے پوربیا کٹھہ کہتے ہیں۔ اس کے دوسرے سرے پر وادی کی دوسری مشہور جھیل دُودی پت واقع ہے۔ یہ جھیل بیسل سے ۱۲ میل دور مشرق میں واقع ہے۔ اس کی شکل گول دائرے سے مشابہ ہے اور اس کا قطر تقریباً نصف میل ہے۔ سطح سمندر سے اس کی اونچائی ۱۲،۰۰۰ فٹ ہے۔ سڑک سے دور ہونے کی وجہ سے یہاں شاذ و نادر ہی کسی سیاح کا گذر ہوتا ہے۔ البتہ پاکستان بننے سے قبل جو انگریز بھی اس وادی کو جاتا تھا اس کی کوشش یہی ہوتی تھی کہ وہ اس جھیل کے نظارے سے ضرور لطف اندوز ہو ÷

بٹہ کونڈی سے لے کر بوڑا وائی اور بوڑا وائی سے لے کر بیسل تک دریائے کنہار کے اس پار پہاڑوں کے ڈھلوان اس قیمتی بوٹی سے ڈھکے ہوئے ہیں جس کی بدولت وادی کاغان کے لوگ خوشحال ہو چکے ہیں۔ اسے انگریزی زبان میں آرٹی میزیا، پشتو میں ترخہ اور مقامی زبان میں چاہو کہتے ہیں۔ اس بوٹی سے ایک دوائی بنتی ہے جسے انگریزی میں سینٹونین کہتے ہیں۔ یہ دوا پیٹ کے کیڑوں کے لئے تیر بہدف سمجھی جاتی ہے۔ اس بوٹی کے نکاس کے لئے کوئی قدم اٹھایا جائے تو یہ وادی کے لوگوں کی اقتصادی حالت سدھارنے میں اہم کردار ادا کر سکتی ہے۔ بوڑا وائی سے آگے تمام پہاڑوں پر بالخصوص اس بوٹی کی اتنی بہتات ہے کہ اس کی تیز بو سے سر چکرانے لگ جاتا ہے۔ کاغان کے لوگ اس بو کے اثر سے محفوظ ر[illegible] عام طور پہ پیاز پاس رکھتے ہیں اور بوقت ضرورت استعمال کرتے ہیں۔

آخری پڑاؤ: بیسل سے چل کر آٹھ میل کے فاصلے پر نالہ گیٹی داس کنارے آٹھواں اور آخری پڑاؤ پڑتا ہے جسے گیٹی داس کہتے ہیں۔ یہ مقام سطح سمندر سے ۱۱،۸۶۰ فٹ بلند ہے۔ بیسل کی طرح یہاں بھی کوئی ریسٹ ہاؤس وغیرہ نہیں۔ نالہ گیٹی داس جھیل لولوسر کا ایک اہم ترین معاون ہے ÷

بیسل سے آگے تقریباً دو میل چل کر ایک لکڑی کا پُل آتا ہے جس کے پار سڑک دائیں ہاتھ کو مڑ جاتی ہے۔ یہ پُل دریائے کنہار کے اس مقام پر ہے جہاں دریا اس جھیل سے نکلتا ہے۔ پُل پار کرنے کے بعد سڑک جھیل لولوسر کے ساتھ ساتھ چلتی ہے۔ یہ جھیل جو شکل میں بے ہلال جیسی ہے، بہت وسیع ہے اور ڈیڑھ میل کے لگ بھگ لمبی، ۴۰۰ گز اور ۱۵۰ فٹ گہری بتائی جاتی ہے۔ عموماً اس کے وسط میں مرغابیوں کے جھنڈ بڑے مزے سے تیرتے اور کلیلیں کرتے نظر آتے ہیں۔ یہاں مچھلی کافی ملتی ہے مگر اس جھیل میں شکار کا تجربہ لازمی ہے۔ یہاں سینکڑوں کی تعداد میں سگِ آبی (کتے کی قسم کا ایک دریائی جانور) موجود ہیں جو بہت نقصان پہنچاتے رہتے ہیں۔ ان کا قلع قمع کرنے کی غرض سے جنگلات نے اس جانور کے مارنے کے لئے انعام مقرر کر رکھا ہے۔ اس کا شکار بے حد مشکل ہے، کیونکہ یہ دن کے وقت شاذ و نادر ہی باہر آتا ہے اس کا شکار بہت ہی تجربہ کار شکاری کر سکتے ہیں وہ بھی صرف رات کے وقت ÷

جھیل لولوسر جب سڑک کے ساتھ ساتھ چل کر اچانک دائیں ہاتھ مڑ جاتی ہے تو عین اس موڑ پر جھیل کے دوسرے کنارے ایک برفانی نالہ آکر جھیل میں گرتا ہے جس کا نام آپٹھ کٹھہ ہے۔ یہ اس جھیل کے دو اہم معاونوں میں سے ایک ہے۔ اس کٹھہ کے ساتھ ساتھ ایک پگڈنڈی چلتی ہوئی آپ کو جل کوٹ لے جاتی ہے جو آزاد کوہستان کا مرکز ہے۔ آزاد کوہستان چھوٹا سا قبائلی علاقہ ہے جو کاغان سے شمال کو، گلگت سے جنوب کو اور کالام (ریاست سوات) سے مشرق کو دریائے سندھ کے اس پار واقع ہے ÷

درۂ بابوسر: درۂ بابوسر جو وادیٔ کاغان کا دوسرا دروازہ ہے گیٹی داس سے چار میل کے فاصلے پر دو پہاڑیوں کے درمیان ہے اور گیٹی داس سے دکھائی دیتا ہے۔ نالہ گیٹی داس سے کو عبور کرنے کے بعد آپ کا سفر تھوڑی دور تک ایک سرسبز میدان سے ہوتا ہے۔ یہ میدان اور اردگرد کی پہاڑیوں کے ڈھلوان وادیٔ کاغان اور چلاس کے چرواہوں کی بیش قیمت چراگاہیں ہیں۔

اس چھوٹے سے میدان کو عبور کرنے کے فوراً بعد چڑھائی شروع ہو جاتی ہے جو بابوسر پر جا ختم ہوتی ہے۔ سڑک گیٹی داس نالے کے ساتھ ساتھ پیچ و خم کھاتی ہوئی چڑھتی جاتی ہے اور کچھ دور جا کر نالے کو بائیں ہاتھ پر چھوڑ دیتی ہے۔ یہ نالہ ایک گول شکل کی سرسبز وادی میں اپنا وجود برقرار رکھتا ہوا بڑھتا جاتا ہے اور وادی کے آخری سرے پر پہنچ کر بتدریج کم ہوتے ہوتے اپنا وجود ختم کر دیتا ہے۔ اس نالے کا وجود بھی دیگر نالوں کی طرح ان برفانی تودوں کا رہین منت ہے۔ جو اس وادی میں پہاڑوں کی ڈھلوانوں اور گہرے کھڈوں میں سال بھر پڑی رہتی ہیں۔

سڑک اوپر چڑھتے چڑھتے آپ کو ایک ایسے درّے میں پہنچا دیتی ہے جس کی دونوں جانب کوئی پانچ پانچ سو فٹ اونچی پہاڑیاں ہیں۔ یہ درہ بابوسر کے نام سے مشہور ہے اور سطح سمندر سے ۱۲،۵۸۹ فٹ بلند ہے۔ یہاں ضلع ہزارہ کی حد ختم ہو جاتی ہے اور گلگت ایجنسی کی حد شروع ہو جاتی ہے۔ یہاں سے گلگت ایجنسی کا بہت سا علاقہ سامنے دور دور تک دکھائی دیتا ہے۔ درۂ بابوسر کے بعد فوراً اترائی شروع ہو جاتی ہے، جو چلاس تک چلی جاتی ہے۔

کوہ قراقرم: عموماً یہ مشاہدے میں آیا ہے کہ دن ڈھلتے ہی بابوسر کے درے میں موسم خراب ہو جایا کرتا ہے۔ ہوا جو بعض اوقات ایک تند آندھی کی شکل اختیار کر لیتی ہے چلنے لگتی ہے، بادل اور گرد سے اُمڈ آتے ہیں اور گرد و پیش کا نظارہ اوجھل ہو جاتا ہے، مگر صاف موسم میں دور گلگت ایجنسی میں آپ کو قراقرم کا عظیم الشان سلسلہ نظر آتا ہے۔ اس کی سب سے اونچی چوٹی نانگا پربت جو ۲۶،۶۲۰ فٹ بلند ہے برفانی لباس اوڑھے سر اٹھائے آسمان سے باتیں کرتی دکھائی دیتی ہے۔ نانگا پربت کا نظارہ کرنے کے لیے چاہیے کہ دائیں اور بائیں جانب والی پہاڑیوں میں سے کسی پر آدمی چڑھ جائے جہاں سے یہ چوٹی اچھی طرح دکھائی دیتی ہے۔ دوربین کی مدد سے اس کا اچھی طرح جائزہ لیا جا سکتا ہے۔ درۂ بابوسر سے نانگا پربت تک ہوائی فاصلہ کوئی ۲۵ میل ہے۔

درۂ بابوسر پر پہنچ کر آپ کو ایک سنگ میل نصب نظر آئے گا۔ جو حد بندی کا نشان ہونے کے ساتھ ساتھ بالاکوٹ سے فاصلہ بھی بتاتا ہے۔ اس کے اردگرد پتھروں کے کئی ایک مورچے بنے ہوئے ہیں جنہیں ژوب ملیشیا کانسٹیبلری کے سپاہی گشت کے دوران استعمال میں لاتے ہیں۔

اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ درۂ بابوسر کی چڑھائی طے کرتے وقت لوگوں کو سر میں خفیف درد اور سانس رکنے کی شکایت ہو جایا کرتی ہے مگر اس میں گھبرانے کی کوئی بات نہیں کیونکہ زیادہ بلندی پر چڑھتے وقت ایسی علامات کا پیدا ہونا قدرتی بات ہے، البتہ جو لوگ زیادہ احتیاط کرنا چاہیں انہیں چاہیے کہ وہ اپنے ساتھ خشک خوبانیاں لے جائیں جن کے کھانے سے یہ شکایت رفع ہو جاتی ہے۔ ہاں وہ لوگ جو دل کے کسی عارضے میں مبتلا ہوں انہیں اس بلندی پر چڑھنے سے مزید احتراز کرنا چاہیے۔

دوسرا راستہ: وادیٔ کاغان میں داخل ہونے کا ایک اور راستہ بھی ہے جو وادیٔ سِرن سے ہو کر آتا ہے۔ یہ راستہ صرف ۲ فٹ چوڑا ہے اور اس پر پیدل یا گھوڑے، خچر، ٹٹو وغیرہ ہی کے ذریعہ سفر ہو سکتا ہے۔ یہ تمام راستہ خوبصورت کہساروں حسین گھاٹیوں اور دلکش گھنے جنگلات میں سے گزرتا ہے اور اس کی دلکشی سفر کی تمام صعوبتیں یکسر بھلا دیتی ہے۔ حسین قدرتی مناظر کی بہتات کے باعث یہ راستہ وادیٔ کاغان کے دوسرے راستے سے زیادہ دلکش اور پُرکیف ہے۔ یہ راستہ ڈاڈر نامی مقام سے شروع ہو جاتا ہے جو ایبٹ آباد سے ۲۵ میل کے فاصلہ پر وادیٔ سِرن میں واقع ہے۔ یہاں تپ دق کے مریضوں کے لئے پاکستان بھر میں بڑا ہسپتال ہے۔ جس کے باعث یہ مقام ملک بھر میں مشہور ہے۔ اس کی بلندی سطح سمندر سے ۳،۹۰۰ فٹ ہے۔

ایبٹ آباد اور ڈاڈر کے درمیان سڑک پختہ ہے، اور بسیں دن میں کئی بار آتی جاتی رہتی ہیں۔ علاوہ بریں ایبٹ آباد سے ڈاڈر کے لئے ٹیکسی موٹر بھی آسانی سے مل جاتی ہے یہاں محکمہ جنگلات کا ایک اچھا خاصا ریسٹ ہاؤس موجود ہے باربرداری کے جانور یا قلی وغیرہ یہاں سے بآسانی مل سکتے ہیں۔

ڈاڈر سے روانہ ہونے کے بعد پہلا پڑاؤ کنڈ آتا ہے جو ڈاڈر کے بالکل سامنے پہاڑ کے اوپر نظر آتا ہے۔ ڈاڈر سے کنڈ ۶ میل کے فاصلے پر ہے اور اس کی بلندی سطح سمندر سے ۸۰۰۰ فٹ ہے۔ ڈاڈر اور کنڈ کے درمیان جتنا فاصلہ ہے وہ سب چڑھائی کا ہے۔ کنڈ سے تمام زیریں وادی کی اچھی طرح سیر ہو سکتی ہے ۔

کنڈ کے بعد دوسرا پڑاؤ شہید پانی آتا ہے جو کنڈ سے ۳ میل کے فاصلے پر ہے۔ یہ مقام سطح سمندر سے ۹۴۰۰ فٹ اور کنڈ سے ۱۴۰۰ فٹ بلند ہے ۔

شہید پانی کے بعد تیسرا پڑاؤ نڑی ہے جو شہید پانی سے ۹ میل کے فاصلہ پر ہے۔ نڑی کی بلندی سطح سمندر سے ۸۰۰۰ فٹ ہے۔ یہ مقام شہید پانی سے ۱۴۰۰ فٹ نیچا ہے ۔

اگر آپ شہید پانی کے راستے جانا نہ چاہیں تو کنڈ سے ایک اور راستہ آپ کو براہ راست نڑی لے جاتا ہے۔ یہ راستہ کل ۱۴ میل لمبا ہے ۔

نڑی کے بعد آخری پڑاؤ شیراں ہے جو نڑی سے ۹ میل آگے ہے۔ یہ مقام سطح سمندر سے ۸۲۰۰ فٹ بلند ہے ۔

شیراں سے چل کر آپ وادی کاغان میں داخل ہو جاتے ہیں۔ شیراں سے کاغان ۱۴ میل، مہانڈری ۵ میل اور کواٹی ۹ میل کے فاصلے پر ہیں۔ وادی سرن کے راستے میں متذکرہ بالا جتنے بھی پڑاؤ آتے ہیں، وہاں محکمہ جنگلات کے ریسٹ ہاؤس موجود ہیں ۔

بالائی اور زیریں وادیاں: موسمی لحاظ سے وادی کاغان دو حصوں میں منقسم ہے۔ بالائی وادی اور زیریں وادی۔ زیریں وادی بالاکوٹ سے لے کر کاغان تک اور بالائی وادی کاغان سے لے کر بابوسر تک ہے۔ وادی کاغان میں مون سون جون کے آخر یا جولائی کے پہلے ہفتے میں شروع ہو کر اگست کے آخر تک جاری رہتی ہیں مگر خوبی کی بات یہ ہے کہ جہاں نچلی وادی جولائی اور اگست کے مہینوں میں عموماً دھند اور بارشوں کی لپیٹ میں رہتی ہے وہاں بالائی وادی میں موسم صاف اور خوشگوار رہتا ہے اور جو لوگ دھند، بارش، نمی وغیرہ سے گھبراتے ہوں انہیں چاہئے کہ وہ بالائی وادی میں ٹھہریں اور لطف اٹھائیں ۔

شکار: شکار کے لحاظ سے بھی کاغان کچھ کم اہم نہیں۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس وادی میں شکار کم ہے۔ ایسے لوگ یا تو خود شکاری نہیں یا وہ کاغان کے تمام حصے سے بخوبی واقف نہیں۔ ستمبر کے آخر دریائے کنہار پر مرغابی بکثرت ملتی ہے جو اکتوبر کے آخر تک رہتی اس کے بعد اپریل اور مئی میں بھی ملتی ہے۔ مرغابی کے علاوہ اس وادی میں زریں چکور، رام چکور، جنگلی مرغ، جنگلی بکریاں، نافہ ہرن، ریچھ اور بھی کافی ملتے ہیں۔ چونکہ شکار کا موسم ہر سال ۱۵ ستمبر کے بعد شروع ہوتا ہے جب کہ سردی شروع ہو جاتی ہے اور کئی مقامات پر برف بھی شروع ہو جاتی ہے۔ اس لئے پرندوں اور چند جنگلی جانوروں کے شکار کا سوال خصوصاً بالائی وادی میں بہت کم پیدا ہوتا ہے۔ ریچھ کا شکار البتہ ہے جو عام ہونے کے علاوہ گرمیوں میں ہو سکتا ہے۔ وادی میں ریچھ کے شکار کے لئے بہترین موسم جولائی کے آخری چند روز اور اگست کا پورا مہینہ ہے۔ اس موسم میں مکئی کے بھٹے خوراک کے قابل ہو جاتے ہیں اور ریچھ پہاڑوں کی بلندیوں سے اتر کر مکئی کے کھیتوں میں پہنچ جاتا ہے اور اسے مکئی کے کھیت میں آسانی سے شکار کیا جا سکتا ہے کسان یہاں ریچھ کے شکاریوں کی بہت آؤ بھگت کرتے ہیں اور انہیں شکار کرنے میں پوری مدد دیتے ہیں کیونکہ اس جانور کے ہاتھوں جو ان کی فصل کا ستیاناس کر کے رکھ دیتا ہے، کسان بہت نالاں ہیں ۔

اس وادی کو مچھلی کے شکار کی وجہ سے بھی کافی اہمیت حاصل ہے۔ یہاں دریائے کنہار اور جھیلوں میں برفانی ٹراؤٹ مچھلی بکثرت ملتی ہے جو کھانے میں نہایت لذیذ ہوتی ہے۔ اس کا شکار صرف کنڈی سے ہی کرنے کی اجازت ہے جس کے لئے محکمہ جنگلات کے دفتر سے اجازت نامہ حاصل کرنا ضروری ہے۔ یہ اجازت نامہ مقررہ فیس ادا کرنے پر ہر شکاری کو فوراً مل سکتا ہے۔ ایک کنڈی سے ایک دن میں صرف چھ بڑی مچھلیاں پکڑنے کی اجازت ہے مچھلی کے شکار کا موسم یکم اپریل سے ۱۵ اکتوبر تک ہے ۔

باشندے: کاغان میں تین مشہور قومیں آباد ہیں یعنی سید، سواتی اور گوجر۔ سید اور سواتی اس وادی میں مالکانہ حیثیت رکھتے ہیں اور تقریباً تمام کی تمام وادی کے مالک ہیں لیکن گوجر سب کے سب مزارعین ہیں جو کھیتی باڑی کے علاوہ بھیڑ بکریاں اور مال مویشی پال کر گذر اوقات کرتے ہیں۔ گوجروں کو اپنے جانوروں سے اتنی محبت ہوتی ہے کہ کئی دفعہ انہیں بچانے کے لئے

(باقی صفحہ ۵۶ پر)

افسانہ

محرومیاں

نسیمہ اشرف علی

دیوانگی کی حد تک پیار ہے تمہیں چاند اور تاروں سے ؛ میرے متعلق سب کا یہی خیال ہے، لیکن کسی کو کیا معلوم کہ اگر یہ چاند تاروں کی ذرسی دلچسپی بھی میری دنیا سے نکال لی جائے تو پھر...... میری دنیا میں باقی ہی کیا رہ جاتا ہے !

اُف ! وہ کوہِ الماس کی بے برگ و گیاہ، اونچی نیچی پہاڑیاں، جنکے بازوؤں سے بل کھاتے ہوئے حسین ناگوں کے سے چشمے لپٹے ہوئے ہیں۔ ندیاں بجاتی ہوئی ان کے اوپر سے گزرتی ہے۔ جہاں نہ جھینگر شور مچاتے ہیں اور نہ زمین کے اشکِ ندامت سے اُن کا دامن تر ہے، نہ آبادی ہے نہ بازار، بس دور نیچے کہیں کہیں مزدوروں کے بوسیدہ جھونپڑے نظر آتے ہیں، جیسے زمین میں بھوری بھوری میخیں گاڑ رکھی ہوں اور ان کے اپنے تھکے ہوئے، بجھے بجھے سے چہرے فضا میں اور بھی اداسی سمو دیتے ہیں۔ ایسی اُداسی جو تلخی کا احساس لئے ہوئے ہوتی ہے۔ ہر چیز پر جمود طاری ہے، ایک بے کیف سا ٹھہراؤ، جیسے زندگی کی تیز رفتار گاڑی یہاں آکر تھم گئی ہو، جیسے آگے کوئی منزل ہی نہیں ہے۔ بس خلا ہی خلا ہے۔ اُف ! وہ خاموش، سنسان اور غیر دلچسپ کوہ الماس" گہری اداسیوں کا حال :

ابّا جان تو خیر ملازمت کی وجہ سے یہاں رہنے پر مجبور تھے ہی، لیکن امّی، ورد و وظیفہ کی دلدادہ تھیں۔ ایسے خاموش مقام پر ہی تو یادِ خدا آتی ہے اور اس خاموشی اور سکوت ہی میں تو خدا ملتا ہے۔ وہ اکثر فرمایا کرتی تھیں، لیکن ہمیں تو یہاں نئے ساتھیوں کی یاد آتی تھی جنکو ہم نے کبھی نہیں دیکھا تھا اور جن کی کمی ہمیں شدت سے محسوس ہوتی تھی۔ جانے امی احساس کا نام یادِ خدا تھا جو "خیال اپنا اپنا، نظر اپنی اپنی" کے مصداق ہو۔

شام کے وقت میں اپنی گورنس کے ہمراہ پہاڑیوں پر دور تک ٹہلنے کے لیے چلی جاتی، جہاں حدِ نظر تک پھیلی ہوئی تہہ در تہہ پہاڑیوں میں کس سکوت چھایا رہتا۔ نہ سرسبز درخت، نہ سبزہ، خود رو پھولوں کی بہار، نہ جھرنے، نہ چشمے۔ بس نیچے ڈھلانوں میں سیلانی، مزدوروں کے ننگ دھڑنگ کالے کلوٹے بچے کھیلتے ہوئے نظر آتے اور بچوں کی مائیں یا تو اپنے اپنے کام میں مشغول ہوتیں یا پھر فرصت کے وقت ایک دوسری سے لڑتی ہوئی گتھم گتھا ہو جاتیں جس کا خاتمہ ان کے خاوندوں کی لاٹھیاں کرتیں —— بس یہ ایک ذرا سا دلچسپ مشغلہ تھا، لیکن کوئی انسان کب تک اس مکروہ منظر کو برداشت کر سکتا ہے ؟ اور میرا دل اپنی تنہائی اور اس بے کیف ماحول سے اکتا جاتا۔ جہاں نہ عزیز ہوں نہ بہن بھائی۔ نہ سہیلیاں نہ دوست، وہاں چاند تارے ہی دوست ہیں جو یہاں سے انتہائی نزدیک معلوم ہوتے تھے، جو اپنی خاموش زبان میں سینکڑوں داستانیں کہہ رہے تھے اور میرا دلچسپ اور محبوب مشغلہ پہروں چاند اور تاروں کو تکنا تھا۔ کاش میں ان کو چھو سکتی۔ چاند کی نرم و نازک ملائم کرنیں ایسے کرخت پہاڑوں کو بھی تھوڑی دیر کے لئے حسن بخش دیتیں، جن میں زندگی کے آثار قریباً معدوم ہی تھے۔ ان میں زندگی کی رو دوڑ جاتی ؛

بچپن کا حسین اور خوشگوار زمانہ اس بے کیف ماحول میں گزر گیا۔ بس چاند تاروں سے کھیلتے اور ان کو ایک معصوم بچے کی طرح ہاتھوں سے کر الٹ پلٹ کر کے دیکھنے کی تمنائیں۔ اور طبیعت مجبوراً اسی ماحول اور ان ہی حالات سے مانوس ہو گئی۔ اچانک والد صاحب اس موت کے سے سکوت سے اکتا گئے اور ملازمت چھوڑ کر وطن چلے آئے۔ سالہا سال کا مقید پنچھی قید سے چھوٹ کر خود کو کتنا حقیر، بے حقیقت اور دنیا اور اس کی دلچسپیوں سے کتنا بے تعلق محسوس کرتا ہے، بس یہی حال میرا تھا جس خاموشی اور تنہائی سے مجھے شدید نفرت محسوس ہوتی تھی شاید اب وہی میری فطرت بن چکی تھی اور وطن اور اس کی گہما گہمی اجنبیت کے بھاری بھاری پردوں کے پیچھے گم ہو گئی تھی۔ یہاں اگر کبھی میرے ہم جلیس وہی چاند تارے ہی

رہے، گویا میں پہاڑی وحشی ہوں "بدوماغ" اور نہ جانے کیا کیا مشہور ہو گئی!

محبت ہر انسان کی فطرت ہے لیکن کسی میں کم کسی میں زیادہ اور بعض انسانوں کا تو خمیر ہی محبت کی مٹی سے تیار ہوتا ہے شاید! لیکن جسے محبت ہی نہ مل سکے، محبت اور لطیف جذبے سے ہمیشہ محروم رہے اس کی مایوسیوں کا کون اندازہ لگا سکتا ہے؟ دنیا اور دنیا والے جسے دوست نہ رکھیں، چاند تاروں کی خاموش دنیا ہی اس کی دوست ہو سکتی ہے!

جوان لڑکیوں کو کب کسی سے ملنے یا بات چیت کرنے کا موقع ملتا ہے اور پھر امی تو اس معاملے میں بہت ہی محتاط تھیں۔ سہیل، عمران اور شاکر بھائی اگر کبھی ہمارے گھر آتے تو میں انہی کی ہدایت کے مطابق فوراً دوسرے کمرے میں چلی جاتی۔ مجھے تو یوں ہی تو شاید انسانوں سے نفرت تھی۔ لڑکیوں نے میری خاموشی کو بددماغی پر محمول کر کے مجھے نظر انداز کر دیا اور لڑکے ——؟ سماجی پابندیوں کے سبب مجھ سے دور رہے۔ انس، یگانگت، محبت یہ تمام الفاظ میرے لئے محض الفاظ ہی رہے حقیقت نہ بن سکے۔ میری زندگی کے مضمحل دامن میں رومان کا پیوند کبھی نہ لگ سکا! اُف یہ تشنۂ محبت دل!

میری سالگرہ کے تحفوں میں منظور بھائی کا تحفہ سب سے زیادہ حسین تھا، اور شاید میری نظروں میں سب سے زیادہ قیمتی بھی۔ وہ ایک انتہائی خوب صورت سیٹ تھا جھلملاتا ہوا۔ قمیص، غرارہ، دوپٹہ اور جاکٹ جس پر ستاروں سے انتہائی نفیس "اختر کاری" کی ہوئی تھی۔ خبر نہیں انہیں کیسے معلوم ہوا کہ مجھے چاند تارے بہت ہی پسند ہیں۔ منظور خود بھی تو بہت حسین تھے میرے محبوب چاند تاروں کی طرح کہ ہیں خواہش نہ ہونے کے باوجود انہیں دیکھنے پر مجبور ہو جاتی۔ اور مجھے ایسا محسوس ہونے لگا کہ منظور مجھ سے قریب، بہت ہی قریب ہوتے جا رہے ہیں اور پھر یہ احساس رفتہ رفتہ مجھے "کوہِ الماس" کی پہاڑیوں سے بھی زیادہ خاموش اور سنسان پگڈنڈیوں میں بھٹکتا ہوا چھوڑ کر خود کہیں گم ہو گیا۔ منظور بھائی کی شادی ہو گئی اور —— میری دنیا میں بس چاند اور تارے رہ گئے!

پھر چاند تاروں سے کھیلنے والی یہ خاموش، تشنۂ محبت زندگی نجانے قسمت کے ایک ٹیڑھے میڑھے موڑ پر گم ہو گئی۔ شادی بھی کتنی عجیب کیفیت کا نام ہے۔ اچھے بھلے لڑکے لڑکیوں کو مرد، عورت کی کردہ اصطلاحوں میں مدغم کر کے رکھ دیتی ہے۔ جہاں محبت کا گلا گھونٹ دیا جاتا ہے، خوابوں کی سی رومانی دنیا کسی ڈائن کی طرح خوفناک جبڑے کھول کر سامنے آ جاتی ہے اور وہ لڑکی جو ہزار آرزوؤں سے ایک محبوبہ کی شکل میں کسی کے آستانے پر حاضر ہوتی ہے ایک بیوی یا عورت بن کر رہ جاتی ہے، محض ایک کل!

بھلا فلسفہ پڑھانے والے ایک خشک طبیعت پروفیسر سے محبت کی توقع حماقت نہیں تھی تو اور کیا تھا؟ جو محبت کو محض ایک وقت ضائع کرنے کا ذریعہ سمجھے، اور بیوی کو گھر کے لئے ایک قفل سے زیادہ اور کچھ درجہ نہ دے سکے جس کا یقین ہو کہ محبوبہ وہ ہوتی ہے جو نظر نہ آ سکے، جسے ہم چھو نہ سکیں، خیالی۔ محض ایک ذہنی شبیہہ! محبوبہ کبھی بیوی نہیں بن سکتی اور بیوی محبوبہ نہیں بن سکتی۔ محبت ایک عام جذبہ سے اونچا کوئی جذبہ نہیں ہے۔ وہ چاند تاروں کی کرنوں کی نرم و نازک باتیں کیا جانے، اسے پھولوں اور بہار سے کیا نسبت ہو سکتی ہے؟ وہ صبح کو نکلتے ہوئے سورج کی بے عذر اور اچھوتی کرنوں کی لطافت اور شام کی شفق گوں رنگینیوں کو کیا سمجھ سکتا ہے جس کی آنکھوں پر فلسفہ کی دبیز عینک چڑھی ہوئی ہو۔ خیر، یہ زندگی تو کسی نہ کسی طرح گزر ہی جائیگی۔ چاند تاروں کی معیت میں، لیکن کہیں یہ چاند بھی نہ ڈوب جائے، میری خاموش زندگی کا خاموش ساتھی! یہ تارے چمکنا ہی نہ چھوڑ دیں اور میں تاریکی میں بھٹکتی رہ جاؤں!!

زندگی کے غبارے دھیرے دھیرے اٹھتے رہتے ہیں اور فضا میں تحلیل ہوتے رہتے ہیں۔ کب تک؟ یہ کوئی نہیں کہہ سکتا۔ کب اس پگڈنڈی پر تار کول بچھا دیا جائے اور کب یہ غبارِ زندگی ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے۔ "کون ہیں یہ انجم؟" پروفیسر نے مجھ سے پوچھا تھا!

"کیا معلوم کون ہیں؟" کہتے ہوئے میں نے لفافہ چاک کر کے پڑھنا شروع کر دیا تھا۔ "کچھ خاص بات تو نہیں کسی انجم نے میری تازہ نظم "ستارے" کی تعریف کی ہے۔" میں نے جواب دیا تھا۔ "ہوگا کوئی بیکار اور تمہارے جیسا دیوانہ جس کے پاس ان فضول کاموں اور باتوں کے لئے وقت کافی ہوگا۔" انہوں نے خشک سی مسکراہٹ کے دوران میں کہا تھا۔

اور پھر انجم کے خطوط آتے رہے مسلسل۔ کتنی پاکیزہ اور شگفتہ تحریر تھی ان کی! بس خوابوں کی دنیا سے آیا ہوا کوئی انتہائی حسین اور پاکیزہ لمحہ معلوم ہوتا تھا۔ خواہ میں جواب نہ بھی دوں، مہینوں خط نہ لکھوں لیکن وہ پابندی سے خط لکھتے، ہر ہفتہ دو خط، متواتر دو سال انہی خواب کی سی کیفیات سے لبریز خطوط مجھے ملتے رہے!

"یا اللہ۔ کیا ہے ان خطوط میں؟" کبھی کبھی مجھے شک سا گزرنے لگتا، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ چاند اور تاروں کی خاموش محفل میں اب میں ہی اکیلی شریک نہیں

تھی، بلکہ انجم بھی اپنی حسین کھلونوں سے کھیل رہے تھے۔ وہ کون ہیں؟ کیسے ہیں، غیر شادی شدہ یا ـــــ؟ کتنا عجیب معمہ ہیں وہ! کبھی کبھی میں نہ جانے کیوں یہ سب باتیں سوچنے لگتی۔

بھلا خوابوں کی حسین دنیا کی متلاشی حقیقت کی تلخی کب گوارا کر سکتی ہے۔ نہ انجم سے کچھ پوچھنے کی ضرورت محسوس ہوئی نہ اس معاملے میں کوئی قدم اٹھایا۔ ہم یونہی رہے۔ اپنی اپنی پگڈنڈیوں پر بیگانے اور غیر متعارف سے۔

"لو بھئی رخشاں! تمہارے انجم سے بھی مل آئے ہم اس دفعہ سلہٹ میں ایک پُر فضا جگہ ایک خوب صورت سے بنگلے میں رہتا ہے۔ سچ مچ اپنے خطوط ہی کی طرح خوب صورت ہے۔ پچیس چھبیس سال کا نوجوان ہے غالباً اپنے والد کی فرم ہی میں کام کرتا ہے۔" پروفیسر صاحب نے سلہٹ سے واپسی پر مجھے بتایا تھا۔ "کیا کہا جا سکتا ہے یہ وہی انجم ہے؟ کیا ثبوت ہے اس کا؟"

"بھئی ادیب انجم تو وہی ہے وہاں۔"

رخشاں!

ہم اتنے عرصے سے ایک دوسرے کی معیت میں زندگی کی پگڈنڈیوں پر چل رہے ہیں، لیکن الگ تھلگ اور بالکل اجنبی سے۔

مگر یہ غیر متعارف زندگی، طویل اور بے کیف سفر اور یہ خوابوں کی سی کیفیات کب تک برداشت کی جا سکتی ہیں؟ کاش ہم تصورات کی دنیا سے نکل کر حقیقت کی دنیا میں آنے کی جرأت کر سکیں!

میں کون ہوں، کیا ہوں اور کیسا ہوں؟ ان سب سوالوں کے جواب میں اپنی تصویر بھیج رہا ہوں۔ قلم جن جذبات کو ظاہر نہ کر سکا شاید آنکھیں ان کی کچھ ترجمانی کر سکیں۔

آپ کا ـــــ "انجم"

اُف یہ کیا ہوا؟ خط پڑھ کر میرا دماغ چکرا گیا، آنکھوں کے آگے اندھیرا چھانے لگا۔ یہ سب کچھ کیسے ہو گیا اور کب ہوا؟ جب ...... جب ......

"انجم ـــ سجیا!

میں وہ نہیں ہوں جو کچھ آپ سمجھے۔ میں اب منزل نہیں ہوں، محض گردِ کارواں ہوں۔ میر کارواں کا غازہ کی خرید و فروخت کے سلسلے میں شاید ایک مہینہ گزرا آپ سے کل مل چکے ہیں اور متاعِ کارواں آپ کی خدمت میں حاضر ہے۔ ان کی کلاس تفریح کے لئے سنہٹ آئی ہوئی ہے۔

ـــــ عرف رخشاں"

جانے کیا ہوا کہ انجم، گھر بار سب کو چھوڑ کر سوئٹزرلینڈ چلا گیا۔ کتنے پریشان، کتنے غمگین ہیں اس کے اس طرح چلے جانے سے! بیوقوف نوجوان ـــ دیکھا، میں نہ کہتا تھا کہ یہ خوابوں کی ذہنی دنیا بسانے والے عقلمند ہرگز نہیں ہو سکتے، ویسے کچھ ہی کیوں نہ ہوں۔" پروفیسر صاحب نے حسبِ معمول خشک لہجے میں مجھے بتایا۔

"آپ کو کیسے معلوم ہوا؟" میں نے انتہائی حیرانی اور پریشانی کے ملے جلے جذبات کے تحت پوچھا۔

"اس کے والد کا خط آیا ہے، سلہٹ میں ملاقات کے بعد ہماری خاصی دوستی ہو گئی ہے۔"

اب بھی کچھ شک ہے کہ مجھے چاند اور تاروں سے پیار کیوں ہے؟ میری خاموش زندگی کے خاموش ساتھی یہی تو ہیں!

اب بھی رات کی تاریکیوں میں میرے ذہن پر ایک ہیولیٰ ابھرتا ہے۔ آہ! یہ تم نے کیا کیا؟ کہاں چلے گئے؟ کیا محبت صرف محبت کے لئے نہیں کی جا سکتی؟ کیا ہم اپنی خود غرضیوں کو دفنا نہیں سکتے؟ انجم چلا گیا، لیکن میرے ساتھی انجم اب بھی آسمان پر اسی طرح جھلملاتے ہیں۔ اداسیاں اور محرومیاں لئے ہوئے! میں ان سے بارہا پوچھتی ہوں کہ انجم، کہیں تمہاری ہی دنیا میں تو نہیں پہنچ گئے؟ اور جب جواب کے لئے ان کی طرف دیکھتی ہوں تو وہ جھلملا جھلملا کر روپوش ہو جاتے ہیں اور چاند؟ تو دونوں نظر ہی نہیں آتے زندگی میں اگر محبت کی بھیک ملی بھی تو ـــــ؟

غزلیات

سید آلِ رضا

محبت نا شناسوں میں محبت کی فغاں کب تک
نہ جانے کٹ کے دل سے کام دیتی ہے زباں کب تک

فسانۂ دردِ دل کا آپ ایسے کیوں سنے جائیں
مگر دیکھیں کہ ہم ایسے ہیں مصروفِ بیاں کب تک

گلوں کی چلتی پھرتی چھاؤں میں کیا چین سے بیٹھیں
نگاہوں میں یونہی کھٹکا کرے گا آشیاں کب تک

وہی جس کو ہمیں اب بھول جانا چاہیئے شاید
اسی کی یاد آخر دل میں لے گی چٹکیاں کب تک

کھلے کچھ بیکراں امید یا یہ وہم مٹ جائے
نظر آئیں گی دھندلی دھندلی سی پرچھائیاں کب تک

تمہارے نام پر کس کس طرح دل کو نہ سمجھایا
مگر یہ اہتمامِ خود فریبی مہرباں، کب تک

رضاؔ کب سے یہی فریاد ہے باغِ تمنا کی
مجھے لوٹے چلا جائے گا میرا باغباں کب تک

سراج الدین ظفر

دن کو بحر و بر کا سینہ چیر کر رکھ دیجئے
رات کو پھر پائے گل رویاں پہ سر رکھ دیجئے

مفلسی موسم کی جائے گی نہ بے نقد
جام چھلکا کر کفِ ہر گل میں زرر

دیکھئے پھر کیا دمکتے ہیں گل اندامانِ شہر
اک ذرا ان میں محبت کا شرر رکھ دیجئے

گرمیِ آغوش سے بھر دیجئے عزمِ
پھر ہمالہ کو ہمارے دوش پر رکھ

آہوانِ شب گریزاں ہوں تو ان کی راہ میں
دامِ دل رکھ دیجئے، دامِ نظر رکھ دیجئے

زہد اگر جنگ آزما ہو کھینچئے شمشیر
حسن اگر تیرِ مقابل ہو، سپر رکھ د

مدرسے کافر نگاہی سے نہیں لذت شناس
ان کے سینے میں بھی سوفارِ نظر رکھ دیجئے

بت بھی دلکش، حور بھی دلجو ہے، پھول اغا
کچھ ادھر رکھ دیجئے اور کچھ ادھر رکھ

گردشِ جام انقلابی شے نہیں تو کچھ نہیں
اس میں جزوِ گردشِ شام و سحر رکھ دیجئے

راحتِ جانِ ظفرؔ ہیں شاہدانِ بے
رونمانے کو ان کے قدموں میں ہنر ر

عبدالحمید عدمؔ

قرطاس لو، قلم لو اور لکھ ہی دو فسانہ
کس طرح دو دلوں کے بیچ آگیا زمانہ

کس حیلہ جو جہاں میں بھیجا ہے تونے ہم کو
تدبیر بھی بہانہ تقدیر بھی بہانہ

دو بے خطا دِلوں کو تکلیف دے کے ناحق
محسوس ہو رہا ہے شرما گیا زمانہ

تم سے تو بات کی تھی تسکینِ دل کی خاطر
تم کو بھی آگئی ہے تقریرِ ناصحانہ

چُپ ہو کے میکدے کے نزدیک سے نکل جا
ورنہ خراب ہوگی اے گردشِ زمانہ

شیشے، رباب، شاہد، خوشبو عدمؔ گلوں کی
موسم گزر رہا ہے کیا مست و والہانہ!

ناصرؔ کاظمی

ہنت نئی سوچ میں لگے رہنا
ہمیں ہر حال میں غزل کہنا
صحنِ مکتب میں ہمسنوں کے ساتھ
سنگریزوں کو ڈھونڈتے رہنا
گھر کے آنگن میں آدھی آدھی رات
مل کے باہم کہانیاں کہنا
دن چڑھے چھاؤں میں ببولوں کی
رم آہو کو دیکھتے رہنا
ابر پاروں کو سبزہ زاروں کو
دیکھتے رہنا سوچتے رہنا
شہر والوں سے چھپ کے پچھلی رات
چاند میں بیٹھ کر غزل کہنا
ریت کے پھول آگ کے تارے
یہ ہے فصلِ مراد کا گہنا
بوئے خوں آرہی ہے پھولوں سے
کیا ہے ایسی بہار سے لینا
سوچتا ہوں کہ سنگِ منزل نے
چاندنی کا لباس کیوں پہنا؟
کیا خبر کب کوئی کرن پھوٹے
جاگنے والو جاگتے رہنا!

عبدالباقی بلوچ

چشمِ فسوں گر جب مری جانب نگراں نگراں گزری ہے
دامن چیدہ میری طرف سے گردشِ دوراں گزری ہے

میں نے اپنی شمعِ ہستی دونوں سروں سے جلائی ہے
شب نہ کٹے گی لیکن اب تک خوب فروزاں گزری ہے

زیست بہر صورت گزراں تھی ہمدم اس کا ذکر ہی کیا
خندہ بلب، یا اشک فشاں یا بے خود و حیراں گزری ہے

اکثر دل کے ہاتھ سے تیری یاد کا دامن چھوٹ گیا
ایسے چند مراحل سے بھی عمرِ گریزاں گزری ہے

آبلہ پائی کے افسانے اب بھی زبانِ خار پہ ہیں
اس انداز سے میری وحشت سوئے بیاباں گزری ہے

آنکھوں سے حسرت کے فسانے آنسو بن کر ٹپکے ہیں
عمر ہماری منزل منزل اشک بداماں گزری ہے

موسمِ گل ہے جوش پہ لیکن تو جو نہیں اے جانِ بہار
چشمِ تماشا منظر منظر خار بداماں گزری ہے

کیسے پھول تھے کیا رنگت تھی مجھ کو کچھ معلوم نہیں
اب کے جانے کس صورت سے فصلِ بہاراں گزری ہے

عمر جو تیری راہ میں گزری، غم کا بار اٹھا کر بھی
رقصاں رقصاں خنداں خنداں مست و غزلخواں گزری ہے

جب تک دل رنگیں تھا باقیؔ دنیا اپنے ساتھ رہی
جب سے دل کچھ بجھ سا گیا ہے ویراں ویراں گزری ہے

شیر افضل جعفری

ندی کنارے جو نغمہ سرا ملنگ ہوئے
حباب موج میں آ آ کے جلترنگ ہوئے

ارم کے پھول، ازل کا نکھار، طور کی لو
سمٹ چناب کی وادی میں آ کے جھنگ ہوئے

یہ ریگ زار، یہ ٹیلے، یہ خشک ویرانے
ہمارے لطفِ نظر سے گلاب رنگ ہوئے

شہیدِ لالہ رخاں کے لہو لہو نغمے
لہک لہک کے فضا میں اڑے پتنگ ہوئے

کبھی جو ساز کو چھیڑا بہار مستوں نے
تو گنگ گنگ شجر ہم زبانِ چنگ ہوئے

مری شریر دعاؤں کے دلربا جادو
مزاجِ وقت میں قوسِ قزح کے رنگ ہوئے

گدازِ شام کے باغ و بہار سنّاٹے
مرے جنوں کے لئے گونجتی امنگ ہوئے

عطا کیا ترے ماتھے نے جن کو عید کا چاند
نثار اُن پہ ستاروں کے راگ رنگ ہوئے

شبِ حیات میں انساں کے ولولے افضلؔ
ابھر کے تارے بنے کہکشاں کے سنگ ہوئے

افسانہ

تصویر

شریف الحسن

"اور یہ کیسی آئی ہے؟"

"خاصی ہے"

"دیکھوں، دیکھوں، ذرا میں بھی تو دیکھوں" اماں نے اشتیاق سے بیٹی کے ہاتھ سے تصویر لی اور تکلف سے سنہری عینک خانہ سے نکال کر ریشمی ساڑی کے پلو سے پونچھ کر لگائی۔ "پیاری، تم بھی کمال کرتی ہو، ماشاءاللہ! اتنی اچھی تو کھچی ہے اور تم ہو کہ خاصی کہہ رہی ہو"۔

مسعود کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آئی، اس لئے نہیں کہ اس کو مصوری کی داد ملی تھی، بلکہ اس لئے کہ وہ عقیلہ سے بھی عقیلہ کی برائی نہیں سن سکتا تھا اور اب خالہ جان نے تصویر کی تعریف کر دی تھی۔ عقیلہ کے اس انکسار پر اس کو غصہ بھی آتا تھا اور دلی تکلیف بھی ہوتی تھی۔ یہ انکسار کبھی تو اس کو تصنع معلوم ہوتا اور کبھی یہ جھنجھلاہٹ ہوتی کہ عقیلہ کو بھی عقیلہ کی تصویر یا صورت شکل کو برا کہنے کا کیا حق حاصل ہے۔

مسعود کو اب باقی تصویریں دکھلانے میں تامل تھا، مگر ماں بیٹیوں کے اصرار پر دکھلانے لگا۔ اس نے یہ بھی سوچا کہ بناوٹی انکسار بھی حسن طلب کا ایک انداز ہوتا ہے، تاکہ دوسروں کے منہ سے اپنی تعریف سنی جائے۔ اس مرتبہ عقیلہ نے اتنی رعایت کی کہ "خاصی اچھی ہے" "ہاں اچھی ہے" وغیرہ کہنا شروع کر دیا۔ تصویریں سب اسی کی تھیں اور پچیس تیس سے کم نہیں، بلکہ زیادہ ہی ہوں گی۔

مسعود ہوائی فوج میں تھا اور عراق سے چار ہفتے کی رخصت پر آیا ہوا تھا جو اس کو دو سال کے بعد ملی تھی۔ عقیلہ کے لئے بہت بڑھیا کیمرا تحفتہً لایا تھا۔ آج کل اس کا دل پسند مشغلہ عقیلہ کی تصویریں اتارنا ہی تھا۔ کوئی تصویر سارے میں تھی تو کوئی دوپٹہ اور رکھڑے پائجامہ میں اور کوئی شلوار قمیص میں، کسی میں پھول توڑ رہی ہے، کسی میں مصروف مطالعہ ہے، کسی میں چوٹی گوندھ رہی ہے۔

اب عقیلہ وہ دو سال پہلے کی عقیلہ نہیں تھی۔ شرمائی لجائی، بقدر ہوجانے سو پہلے مسعود نے تصویر کھینچنی چاہی تھی تو کتنے جتن کرنے پڑے تھے۔ خالہ جان بگڑی سنوری تھیں کہ بھلا بھائیوں سے کوئی اتنا شرماتا ہوگا، تب جا کر اس شرط پر راضی ہوئی تھی کہ اماں جان اور چھوٹا بھائی بھی شامل ہوں تو کھچواؤں گی، اکیلی نہیں کھچواؤں گی۔ اماں تو اکیلی تصویر میں کوئی ہرج نہیں سمجھتی تھیں، مگر بیٹی کی جھجک دیکھ کر انہوں نے اس روشن خیالی کے اظہار کو مناسب نہیں سمجھا اور چپ ہو گئیں۔ پھر بھی تصویر کھچواتے وقت عقیلہ کا چہرہ شرم کے مارے سرخ ہو گیا تھا، مگر اب تو کالج میں دو سال پڑھ کر اس نے خاصے پر پرزے نکال لئے تھے اور جبلی شرم و حیا کے باوجود جھجک باقی نہیں رہی تھی، جو خواہ مخواہ کنبے کے لڑکوں کے سامنے پیدا ہو جاتی تھی۔ شاید یہ سبب بھی تھا کہ دو سال پہلے شرمانے کے دن نئے نئے آئے تھے، احساسِ شباب بات کرتے، اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے، سوتے جاگتے، شعور پر غالب رہتا اور بن بات کے شرم آتی رہتی، مگر اب دو سال گزرنے کے بعد وہ اس کو اولو محسوس نہیں کرتی تھی۔

"بھئی یہ تصویر تو بہت پیاری آئی ہے، اسے بڑا کرا دو، میں اسے چوکھٹے میں لگا کر اپنی سنگھار میز پر رکھوں گی" خالہ جان نے مسعود سے کہا۔ درحقیقت تصویر بہت عمدہ آئی تھی، اس تصویر میں عقیلہ دانتوں تلے قلم دبائے مصروف مطالعہ تھی، تصویر میں بے ساختگی تھی اور یہ گمان نہیں گزرتا تھا کہ تصویر کی خاطر یہ نشست اختیار کی ہے۔

ایک تصویر میں عقیلہ اپنی زنانہ سائیکل لئے کھڑی تھی، پیچھے کتابیں بندھی تھیں اور ایک پاؤں پائدان پر تھا، گویا کالج جانے کے لئے پا بہ رکاب ہے۔ یہ تصویر عقیلہ نے ایک سہیلی کی فرمائش پوری کرنے کے لئے لے لی۔

اگلی تصویر میں عقیلہ کوٹھے پر منڈیر کے سہارے کہنی ٹکائے اور ہاتھ کی پشت پر ٹھوڑی دھرے کھڑی تھی۔ یہ تصویر سب تصویروں سے

البیلی تھی۔ مسعود اس کو دیکھ کر پھڑک گیا، کیونکہ یہ ادا کسی اور تصویر میں نہیں آنے پائی تھی۔

"ذرا مجھے دکھائیے" کہہ کر عقیلہ نے یہ تصویر تھمالی اور کتاب میں رکھ کر بغل کے نیچے دبالی۔ مسعود نے وہ تصویر واپس مانگی تو انکار کر دیا، جس پر مسعود بہت جز بز ہوا، کیونکہ تمام تصویروں میں اسے یہی تصویر سب سے زیادہ پسند آئی تھی اور اس نے سوچا تھا کہ وہ اسے ہر وقت اپنے بٹوہ میں رکھا کرے گا، مگر اماں کے کہنے پر بھی عقیلہ نے وہ تصویر نہ دی اور یہی کہتی رہی کہ "یہ تصویر بہت خراب آئی ہے، میں نہیں دوں گی"۔

یہ بات نظاہر ہٹ دھرمی کی تھی، کوئی بھی اس تصویر کی تعریف کئے بغیر نہ رہ سکتا تھا۔ یہ بھی نہیں تھا کہ تصویر میں بیباکی و شوخی ہو اور اسے مسعود کے پاس چھوڑنا وہ معیوب سمجھتی ہو، یا اس خیال سے شرماتی ہو کہ ایسی دلکش تصویر مسعود کے پاس رہے۔ وہ تصویر اسے خود بہت بھائی تھی آج صبح یہ سب تصویریں وہ خود مصور کے ہاں سے لے کر آئی تھی اور مسعود کے آنے سے پہلے اس تصویر کو چھپ چھپ کر دیر دیر تک دیکھتی رہی تھی، اسے اپنی خوب روئی اور رعنائی کا پورا پورا احساس تھا، مگر اس وقت محض مسعود کو چڑانے کے لئے یا اوپری انکسار سے وہ تصویر کو برا بتا رہی تھی، دراصل تو یہ ہے کہ عقیلہ نے دل میں یہ تصویر مسعود ہی کے لئے انتخاب کی تھی، دانستہ و نادانستہ یا نیم دانستہ طور پر مسعود کی آتشِ شوق کو بھڑکا رہی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ جوئندہ یابندہ۔ مسعود خود مرقع چغتائی اس کی کتابوں کی الماری میں سے ڈھونڈھ کر نکال لے گا اور اس میں سے یہ تصویر چرا کر لے جائے گا۔

اماں جان بیٹھی مسکرا رہی تھیں اور ان دونوں کی چھیڑ چھاڑ سے دل ہی دل میں خوش ہو رہی تھیں۔ کئی برس سے ان کو یہ لڑکا پسند تھا اور جب سے وہ ہوائی فوج میں اچھے عہدہ اور بڑی تنخواہ پر ملازم ہو گیا تھا، ان کی دلی خواہش تھی کہ ان کی لڑکی کی شادی اس لڑکے سے ہو۔ یہ خیال دو برس پرانا تھا جب مسعود نیا نیا فوج میں بھرتی ہو کر عراق گیا تھا۔ مگر انہیں ڈر لگتا تھا تو یہ کہ ہوائی جہاز اڑانے کی ملازمت بہت جوکھوں کی ہے، وہ کرید کرید کر مسعود سے پوچھتیں کہ کیا وہ بری فوج میں منتقل نہیں ہو سکتا، مگر اس کو تو بچپن سے ہوائی جہاز اڑانے کا شوق تھا۔

اپنے والد سے چوری چھپے وہ تعلیم کے دوران ہی میں ہوائی کلب میں شامل ہو گیا تھا اور والد کو اس نے اس وقت خبر کی تھی جب اس کو تنہا ہوائی جہاز اڑانے کی سند مل چکی تھی۔ یہ اس کے والد کے اچانک انتقال سے کچھ پہلے اور دوسری عالمگیر جنگ کے چھڑنے کے کچھ بعد کی بات تھی۔ والد زندہ رہتے تو ممکن تھا کہ وہ اسے ہوائی فوج میں بھرتی ہونے سے باز رکھتے، مگر اس کی بیوہ ماں کا گریہ و زاری مسعود کو اپنے ارادہ سے باز نہ رکھ سکی۔ وہ اپنی والدہ سے بے دل آزار مذاق کرتا کہ اس کے ایک چھوڑ دو دو بڑے بھائی، جو اس سے زیادہ صالح، فرماں بردار اور خدمت گزار ہیں، ان کی مامتا کو ٹھنڈا رکھنے کے لئے موجود ہیں۔ یہ باتیں سن کر والدہ اور آٹھ آٹھ آنسو روتیں کہ کون ایسی منحوس ماں ہو گی جو اولاد کا مرنا چاہے۔

مگر حقیقت یہ ہے کہ مسعود نے بادلِ ناخواستہ ہی والدہ کی دل شکنی گوارا کی تھی، ورنہ اس کی دلی تمنا کچھ اور تھی۔ بچپن سے اسے پڑھنے لکھنے کا بے حد شوق تھا۔ وہ فلسفہ کے ایم اے کے امتحان میں اول درجہ میں امتیازِ خصوصی سے کامیاب ہوا تھا۔ اس کی آرزو تھی کہ اپنی زندگی درس و تدریس اور تصنیف و تالیف کے لئے وقف کر دے۔ اسے یقین تھا کہ وہ فلسفہ سے ازلی مناسبت رکھتا ہے، فلسفہ کے لاینحل مسائل کو پانی کر دے گا، اس کی کتابیں مستند قرار پائیں گی اور شہرت و ناموری بھی اس کے قدم لے گی۔ مسعود محض شمعِ علم کا پروانہ اور فلسفہ و حکمت کا پرستار تھا۔ والد مرحوم اور بڑے بھائیوں نے بارہا اصرار کیا کہ وہ سرکاری ملازمت اختیار کرے، ان کی تمنا تھی کہ وہ گھر کا چراغ بنے مگر اسے انگریزی ملازمت سے نفرت تھی۔ جنگ شروع ہو چکی تھی مگر کشت و خون کا بازار گرم نہیں ہوا تھا۔ جرمنوں نے نہ ابھی مغربی یورپ فتح کیا تھا، نہ روس پر چڑھائی کی تھی، نہ جاپان ابھی میدانِ جنگ میں کودا تھا۔ مگر ہندوستان میں فوجی بھرتی زور و شور سے ہو رہی تھی اور اس گرم بازاری میں ہر کس و ناکس دھڑا دھڑ بحری، بری اور ہوائی فوج میں بھرتی ہو رہا تھا۔ اسے یہ مشورہ بھی دیا گیا، مگر اس زمانہ میں جب کہ وہ نیا نیا کالج سے نکلا تھا، فوجی ملازمت کو وطن فروشی قرار دیتا تھا۔ وہ اس وقت انگریزوں کی شکست اور اپنے ملک کی آزادی کے خواب دیکھتا تھا۔ بہرحال مسعود نے کسی کی ایک نہ سنی۔ اس کی والدہ اس کی ہٹ سے ہمیشہ نالاں رہیں۔ کہا کرتی تھیں کہ پوت کے پاؤں پالنے میں نظر آتے ہیں۔

بچپنے سے مسعود کی طبیعت میں ضد کا مادہ تھا۔ اس کی والدہ سناتی تھیں کہ کسی بات سے روکا جاتا تو روتا تو نہیں تھا، مگر دھڑا دھڑ دیوار سے ایسا سر پھوڑتا تھا کہ موٹے موٹے گومڑے پڑ جاتے تھے۔ لڑکپن سے کتاب کا کیڑا تھا، ہمجولیوں کے ساتھ زیادہ کھیلتا کودتا نہیں تھا، مدرسہ میں سب استاد بھی مداح تھے، مگر ایک مرتبہ حسبِ عادت دیر سے مدرسہ پہنچنے پر

دنے تحصیل پر بیداری تو اس دن سے پھر مدرسہ کا رخ نہیں کیا۔ سب نے
برا بھلا سمجھایا، ڈانٹ ڈپٹ بھی کی، مگر کوئی اثر نہیں ہوا، البتہ پڑھنے
نے کا مشغلہ جاری رکھا اور گھر ہی پر پڑھ کر میٹرک پاس کیا۔ کالج میں قدم
اتو شطرنج کا چسکا لگ گیا۔ بس پھر کیا تھا، میاں مسعود ہیں اور دن رات
رنج کا دسترخوان بچھا ہوا ہے۔ دھن یہ سمائی کہ شطرنج میں کمال پیدا کیا جائے،
پہلے ہی سال میں سہ ماہی اور ششماہی امتحان میں پے در پے ناکام ہوا
رے آنکھیں کھلیں اور شطرنج کا شوق دھیما پڑا ۔

بی، اے میں ہوا بازی کا شوق دامنگیر ہوا تھا اور ایم اے میں آ کر
فہ کی دھن سوار ہو گئی تھی۔ ایم اے کر کے اس نے پی، ایچ، ڈی میں
لے لیا تھا اور فلسفۂ جمالیات پر تحقیق شروع کر دی تھی۔ اساتذہ اس سے
ت خوش تھے اور اس سے از خود وعدہ کیا تھا کہ تعلیم کی تکمیل کے بعد اسے
لکچرار مقرر کرا دینگے اور پانچ سال بعد اعلیٰ تعلیم کے لئے سرکاری وظیفہ پر
یت بھجوا دیں گے۔ مسعود سے زیادہ خوش قسمت کون ہوگا، نو عمری میں
اس نے اپنا مقصدِ حیات متعین کر لیا تھا اور اب ذریعۂ معاش کا بھی انتظام
ہو گیا تھا، سو روپے ماہوار وظیفہ مل رہا تھا ۔

شادی کا کبھی اسے خیال بھی نہیں آیا تھا، مگر علی گڑھ سے گرمیوں کی
چھٹیوں میں پہلی بار دہرہ دون جانے کا اتفاق ہوا تو وہاں برسوں کے
بعد عقیلہ اور اس کی والدہ سے ملاقات ہو گئی۔ رفتہ رفتہ بے تکلفی ہو گئی
آنا جانا بہت بڑھ گیا۔ بچپن اور لڑکپن میں ان لوگوں سے شاذ و نادر
ملنا ہوتا تھا۔ عقیلہ کی شکل و صورت بچپن میں معمولی تھی۔ مسعود کا کبھی اس کی
طرف خیال بھی نہیں گیا تھا اور نہ اس کو اس کی والدہ کے طور طریق
پسند تھے ۔

عقیلہ کی والدہ وقار النساء نواحِ لکھنؤ کے ایک قصبہ کی رہنے والی
تھیں، شادی سے پہلے تنگ مہری کا آڑا پاجامہ اور سلیم شاہی جوتی پہنتی تھیں،
شادی کے بعد اونچی ایڑی کی جوتی اور ساڑی پہننے لگی تھیں۔ ان کے شوہر
ریاستِ حیدرآباد میں تحصیل دار تھے، جہاں مشہور ہے کہ دھن برستا تھا اور
رفتہ رفتہ اول تعلقدار ہو گئے تھے۔ وقار النساء کے دماغ میں وہی ریاستی
فضا بس گئی تھی، اور جاہ پرستی ان کی فطرت میں داخل ہو گئی تھی۔ اپنے سے
کم درجہ عزیزوں کو حقارت کی نظر سے دیکھتی تھیں۔ رشتہ داروں کے نام
بلکہ ان کے بچوں کی تعداد تک اکثر بھول جاتی تھیں، مگر حیدرآباد کے امراء
متوسلین اور ملکیوں ملک کے نام انہیں ازبر تھے، جس سے ان کی حکام رسی

اور روٴسا کے گھرانوں سے خلاء ملاء کا پتہ نکلتا تھا۔ لکھنؤ آتیں تو عزیزوں
کے ہاں شادی غمی کے موقعوں ہی پر، یا خاص طور پر بلانے سے، تھوڑی دیر کو
بڑے ٹھسّے سے جاتیں، مگر فرش پر اس طرح بے آرام ہو کر بیٹھتیں گویا ہمیشہ
سے صوفوں پر بیٹھتی آئی ہیں، فرش پر بیٹھنے کی عادت نہیں ہے۔ ہاتھ سے کھانا
اس تکلف سے کھاتیں گویا ماں کے پیٹ سے چھری کانٹا ہاتھوں میں پکڑے
پیدا ہوئی تھیں، غرض نہ ان کی مغربیت اور رعونت کسی کو گوارا تھی،
نہ عزیزوں کی مشرقیت ان کو بھاتی تھی ۔

بھلا وہ مسعود کے متوسط درجہ کے گھرانے کو قریبی رشتہ کے
باوجود کب خاطر میں لاتی تھیں، مگر بیوہ ہونے کے بعد ان کی کمان ذرا
اتر گئی تھی اور حیدرآباد سے یوسفِ بے کارواں ہو کر لکھنؤ آئیں تو رفتہ
رفتہ عزیزوں سے التفات فرمانے لگی تھیں اور جب سے انہیں مسعود کی
ہونہاری کا اندازہ ہوا تھا، ان کی نظرِ انتخاب اس پر پڑنے لگی تھی۔ ہر چند
ان کی عمر حیدرآباد کی زرپرست اور جاہ طلب فضا میں گزری تھی، مگر
وہاں کے نوجوانوں کے اطوار کو پسند نہیں کرتی تھیں۔ جہاں بیری ہوتی ہے
وہاں پتھر آتے ہی ہیں۔ عقیلہ کے بھی پیام آتے رہتے تھے، مگر ملکیوں میں
بیٹی دینے پر ان کا دل نہیں ٹھکتا تھا ۔

دہرہ دون میں انہوں نے مسعود کو آتے جاتے اچھی طرح پرکھا
تھا تو وہ اسے پسند کرنے لگیں اور وجاہت کی قدر ہونے لگی۔ مسعود
کے دل میں بھی عقیلہ کی محبت انگڑائیاں لینے لگی۔ یہ پہلا موقع
تھا کہ اسے کسی تعلیم یافتہ لڑکی سے بلا تکلف گفتگو کرنے اور ملنے جلنے کا
اتفاق ہوا تھا۔ عنفوانِ شباب میں احساسِ محبت کا بیدار ہونا طبعی امر تھا۔
چند ہی روز میں عقیلہ اس کے دل و دماغ میں بس گئی، اس کی والدہ کے
طور طریق جو لڑکپن میں ناپسند تھے، بدل گئے تھے اور اب شفقت کی آمیزش
سے خوش آیند ہو گئے تھے۔ مسعود نے مصمم ارادہ کر لیا کہ شادی کرے گا تو
عقیلہ سے، مگر خالہ جان پھر دنیادار اور جاہ طلب تھیں۔ انسان بکری کو بھی
چھوڑتا ہے تو ہرا دیکھ کر، اور عقیلہ تو ان کی پہلوٹھی کی بیٹی تھی۔ انہیں ایک سو
پچاس تا تین سو پچاس کی لونڈوں کو پڑھانے کی نوکری ایک آنکھ نہیں
بھاتی تھی۔ چند اور روز میں انہوں نے مسعود پر ایسا روغنِ قاز ملا اور
اس کو ایسا شیشہ میں اتارا کہ عقیلہ کو حاصل کرنے کے لئے وہ پجاری کا خیال چھوڑ کر
اور پی ایچ ڈی کو خیرباد کہہ کر بہتر ملازمت تلاش کرنے پر آمادہ ہو گیا ۔

وہ مسعود جو کل تک علم کی دیوی کا پجاری تھا، جسے انگریزی کی ملازمت

سے نفرت تھی جس نے والدین اور بڑے بھائیوں کی بیل منڈھے نہیں چڑھنے دی تھی، اب اس بات پر کفِ افسوس مل رہا تھا کہ چند ہی مہینے پہلے اس کی عمر مقابلے کے امتحانوں کے لئے زیادہ ہو چکی تھی۔ وہ مسعود جو کل تک محبِ عسلی نہیں بلکہ بُغضِ معاویہ کے تحت جرمنوں کی پیش قدمی اور انگریزوں کی پسپائی سے اس امید میں خوش ہوتا تھا کہ اس کا وطن آزاد ہو جائے گا، چار و ناچار ہوائی فوج میں بھرتی ہونے اور سلطنت معظم پر سے جان قربان کرنے کے لئے آمادہ ہو گیا۔

پھر بھی وہ طرح طرح سے اپنے دل کو فریب دیتا تھا کہ جنگ کے اختتام پر فوجی خدمت کے صلہ میں اسے یونیورسٹی میں پہلے سے دو چند تنخواہ کی جگہ مل جائے گی اور شادی کے بعد زمامِ اختیار خالہ جان کے ہاتھ میں نہیں، اس کے اپنے ہاتھ میں ہو گی۔ عقیلہ کو وہ اپنے مزاج کے مطابق ڈھال لے گا اور پھر اس کا نصب العین علمی خدمت ہو گا۔

عراق جانے سے قبل اس کی دلی خواہش تھی کہ اس کی منگنی ہو جائے، مگر خالہ جان بڑی زمانہ شناس تھیں، جنگ گھمسان کی ہو رہی تھی، عراق میں جرمنوں کی سازش سے رشید عالی گیلانی نے جو بغاوت برپا کی تھی، اس کی آگ ابھی پوری طرح فرو نہیں ہوئی تھی، جنگ کی ہولناکیاں بڑھ رہی تھیں اور جنگ کے ختم ہونے کے ابھی کوئی آثار نہیں تھے، چنانچہ خالہ جان لطائف الحیل سے ٹال گئیں، بلکہ پیغام کو بھی بیچ ادھر میں لٹکائے رکھا، ہاں یا ناں دو ٹوک جواب نہیں دیا، جو مسعود کو سخت ناگوار گزرا اور اس نے بھی عہد کیا کہ اب وہ خالہ جان سے انتظار کی گھڑیاں گنوائے گا۔

بغداد میں وہ پہلی مرتبہ مغربی تہذیب و معاشرت سے روشناس ہوا، نوجوان انگریز فوجی افسروں کا دن رات کا ساتھ تھا، شارع ہارون الرشید میں، ہوٹلوں میں، ناچ گھروں میں، سینماؤں میں، مغربی لباس میں ملبوس یہودی، انگریز اور عرب لڑکیوں کے جھرمٹ کے جھرمٹ نظر آتے تھے۔ چند بیباک غریب گھروں کی یہودی لڑکیوں نے جنہیں اپنا جہیز فراہم کرنے کی فکر تھی، اس پر طرح طرح کے ڈورے ڈالے۔ جب وہ فوجی ہسپتال میں تین ہفتے بیمار رہا تو انگریز نرسوں نے اس کے سرہانے شب زندہ داریاں کیں اور اس سے پینگیں بڑھانی چاہیں، مگر کبھی ان کی باہمی رقابتوں کی بدولت، اور کبھی اپنی دور اندیشی سے وہ صاحبین کے تارکی طرح ان کے دام سے نکل آیا۔ یہ نہیں کہ وہ جزا و سزا کی امید و بیم میں مبتلا تھا یا شوقِ گریزاں کو معصیت سمجھتا تھا، بلکہ وہ اسے عقیلہ کے ساتھ دغا تصور کرتا تھا، مرد و زن کی مساوات پر اس کا ایمان تھا، جو یہ اجازت نہیں دیتا تھا کہ جو بات عقیلہ کے لئے روا نہ رکھے اسے اپنے لئے جائز ٹھہرائے۔ اور عقیلہ کی عصمت و عفت پر یقین اس کے ایمان کا جزو تھا۔

اس کے بٹوہ میں اور اس کی میز پر عقیلہ کی تصویر رہتی تھی، جو آنکھوں آنکھوں میں اس کے دل کا چور دیکھ کر اس سے نظریں چرانے لگتی تھی۔ جب وہ جہاز نفس کر کے کسی یہودی لڑکی یا انگریز نرس کا تصور دل سے نکال پھینکتا تو عقیلہ کی آنکھیں پھر پہلے کی طرح مسکرانے لگتیں۔ اس کے پاس عقیلہ کی اور بھی تصویریں تھیں۔ بغداد کی بے پناہ گرمی کی دوپہروں میں وہ اپنے کمرہ میں اکیلا بیٹھا اکثر ان تصویروں کو دیکھا کرتا اور خیالات میں ڈوب کر عجیب و غریب نظر فریب اور مسحور کن جزیروں میں جا نکلتا۔

عراق سے واپسی پر باتوں باتوں میں مسعود نے سادہ لوحی سے یہودی اور عرب لڑکیوں کی مغرب زدگی، شراب نوشی، رقص و سرود اور بیباکیوں کے قصے سنائے تو خواہ مخواہ خالہ جان کا ماتھا ٹھنکا۔ یا تو وہ پہلے منگنی پر راضی نہ ہوئی تھیں یا اب انہوں نے دل میں فیصلہ کر لیا کہ بیچ میں ڈال کر مسعود کے واپس جانے سے پہلے اس سے عقیلہ کا نکاح کر دینگی، وداع جنگ کے بعد ہوتی رہے گی۔ انہیں یہ اندیشہ ہو گیا تھا کہ کہیں یہ سونے کی چڑیا اُڑ نہ جائے۔ مسعود کے کان تک یہ بات پہنچائی گئی، اسے اپنا پچھلا اصرار، خالہ جان کا انکار اور اپنا عہد یاد آیا۔ اب اس کا ناز برداری کرانے کا وقت تھا۔ ویسے بھی باہر کی دنیا کی ہوا کھا کر وہ سراب و تشنہ لبی کی برزخ کا قائل نہیں رہا تھا، چنانچہ اس نے خوش اسلوبی سے بات ٹال دی۔

عقیلہ کی بے شمار تصویریں مسعود نے اسی زمانہ میں کھینچی تھیں اور اب اس کی رخصت ختم ہو رہی تھی۔ آخر روانگی کا دن بھی آ گیا۔ اس روز وہ عقیلہ اور خالہ جان کے پاس بیٹھا عقیلہ کی تازہ اور پرانی تصویروں کی البم اپنے ساتھ لے جانے کے لئے مرتب کر رہا تھا۔ بیشتر اس کی اپنی کھینچی ہوئی تھیں، جو فنِ تصویر کشی کے اعلیٰ معیار پر پوری اترتی تھیں۔ بعض تصویریں عقیلہ کے بچپن، اسکول اور کالج کی تھیں، ایک گومتی کے کنارے کھیل کود کی تھی، ایک ہولی کھیلنے کی تھی، ایک بیڈمنٹن کھیلنے کی تھی، کچھ دہرہ دون اور منصوری میں پکنکوں کی تھیں، کچھ تاج محل اور ہمایوں کے مقبرہ اور بمبئی کی چوپاٹی کے سیر سپاٹوں کی وغیرہ وغیرہ۔

.... مگر ایک تصویر پر مسعود ذرا ٹھٹکا، تصویر نہایت معمولی تھی، عقیلہ سفید ساڑی پہنے نہایت سادگی اور انکسار سے کرسی پر

بیٹی تھی اور اس کا چھوٹا بھائی، جو دس گیارہ سال کا ہوگا نیکر اور قمیص پہنے پاس کھڑا تھا۔ تصویر معلوم ہوتا تھا کہ مدھم روشنی میں برآمدہ میں کھینچی گئی ہے، کیونکہ پس منظر بہت زیادہ اندھیرا تھا، پھر بھی تصویر میں بات تھی کہ عقیلہ کے دیکھنے کا انداز نہایت معصومانہ مگر بہت دلربا ہے۔ اس نے عقیلہ سے یہ تصویر مانگی، مگر چونکہ اسے خود بہت پسند تھی، اس لئے اس نے حسب عادت اس تصویر کی برائی کی اور دینے سے انکار کیا، مگر مسعود نے وہ تصویر جھپٹ ہی لی۔ اسے اپنی یہ تصویر سب سے زیادہ عزیز تھی، مگر مجبوراً خاموش ہوگئی۔

اتنے میں کچھ سن رسیدہ پرانے خیال کے عزیز آنکلے۔ خالہ جان نے روشن خیالی کا مظاہرہ کچھ نامناسب سمجھ کر البم اور بیٹی کی تصویریں جلدی جلدی سمیٹ دیں۔ اس کے بعد یہ نوبت ہی نہیں آئی کہ مسعود یہ تفصیل معلوم کرتا کہ یہ تصویر کس نے اور کب اور کہاں کھینچی تھی۔ اسی روز وہ عراق روانہ ہوگیا۔ وہ خط لکھنے کا سخت چور تھا اور خالہ جان سے یہ تفصیلات خط لکھ کر پوچھنا اسے نامناسب معلوم ہوا۔

مگر وہ تصویر اسے بار بار اپنی طرف کھینچتی۔ البم کھول کر اس تصویر کو پہروں دیکھتا۔ بعد میں البم میں سے نکال کر ہر وقت ساتھ رکھنے لگا جب موقع ملتا چھپ چھپ کر دیر تک دیکھتا رہتا۔ اس تصویر میں عقیلہ کی آنکھوں میں عجیب و غریب کشش تھی جس کی کیفیت ناقابلِ بیان تھی۔ اس نے خود عقیلہ کی بے شمار تصویریں کھینچی تھیں، جن پر اپنی چابکدستی اور مہارت ختم کر دی تھی مگر کسی میں وہ پراسرار سحر آفریں کیفیت نہ تھی۔ نگاہیں کسی نقطہ پر جمی ہوئی نہیں تھیں۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ فضا میں سے بہت دور ابد کی سرحد سے بھی پرے، لامکاں کو چیرتی ہوئی حقیقت کی تلاش میں رواں دواں بکھری چلی جا رہی ہیں۔ ان آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتا تو ان گہری جھیلوں کے اتھاہ سمندر میں ان نگاہوں کی … وت نہ ملتی۔ مسعود کی بصارت بھی اور بصیرت بھی ان کا سراغ نہ پا کر ہار کر لوٹ آتی۔ ان پراسرار نگاہوں کے ڈانڈے ازل و ابد سے ملتے معلوم ہوتے۔ اس کا تخیل جس قدر دور جاتا وہ سرچشمہ اسی قدر اسی طرح دور تر ہوتا جاتا اور اس کی تشنہ لبی بڑھتی جاتی۔ جتنا وہ اسے سلجھاتا، اتنی ہی وہ اور الجھ جاتی۔ کبھی ان نگاہوں میں سمندر کی تہ کا سناٹا ہوتا، کبھی طوفانی موجوں کا تلاطم، کبھی دنیا سے بے نیازی برستی، یاس ٹپکتی، کبھی گوشۂ چشم میں خفیف تبسم رقصاں معلوم ہوتا غرض وہ آنکھیں اس کی انہی دگرگوں کیفیات کی آئینہ داری کرتیں۔ مسعود کے نزدیک لیونارڈو ڈاونچی اپنے کمالِ فن کے باوجود مونالیزا کی آنکھوں میں وہ جادو نہ بھر سکا، جو کسی نوآموز تصویر کھینچنے والے نے ان آنکھوں میں جگا دیا تھا۔ اس کو ہر سو سے وہی نگاہیں دل میں اترتی اور نس نس میں نشتر کی طرح چبھتی معلوم ہوتیں۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا کہ ان آنکھوں میں یہ کشش، یہ جاذبیت، یہ مقناطیسیت کہاں سے سمٹ آئی ہے۔

اس نے عقیلہ کو خلوت و جلوت میں، ہر آن ہر ادا میں دیکھا تھا، مگر جو ناقابلِ بیان کیفیت تصویر میں بھر لی تھی، کبھی اس کی جھلک بھی اس کو خود عقیلہ کی آنکھوں میں نظر نہیں آئی تھی۔ اسے یہ معلوم ہوتا تھا کہ یہ عکسی تصویر اصلی عقیلہ ہے اور وہ عقیلہ جو لکھنؤ میں رہتی ہے اس اصل کا محض عکس ہے، وہ اصل حقیقت جو اس تصویر میں عکس ریز تھی اب وہ عقیلہ سے بھی بہت دور تھی اور مسعود سے بھی بہت دور، بہت دور۔ مسعود کی روح بیقرار تھی کہ مادی جسمانی بندھن توڑ کر اس حقیقت سے ہمکنار ہو جائے۔

عراق واپس آنے کے بعد وہ کئی ہفتے انہی خیالات میں محو رہا۔ وہ ہر وقت چپ چپ کھویا کھویا رہتا۔ ایک روز وہ حبانیہ کے ہوائی اڈے سے جہاز لے کر اڑا اور پھر کبھی واپس نہ آیا۔ شبانہ روز کی تلاش کے کئی روز بعد اس کے ہوائی جہاز کا جلا ہوا انجر پنجر حیفہ کے قریب جھاڑیوں میں پڑا ملا۔ جہاز کے ڈھانچہ سے سو قدم کے فاصلہ پر "بینیڈٹو کروچے" کے شاہکار "جمالیات" کے ادھ جلے صفحات میں ایک تصویر ملی جو دھوئیں سے سیاہ ہوگئی تھی اور نیچے سے آدھی جل چکی تھی، ایک لڑکی کے چہرہ کی پرچھائیں سی نظر آتی تھی، مگر وہ آنکھیں اسی طرح درخشاں اور ہر سو نگراں تھیں!

ماہِ نو، کراچی، مارچ ۱۹۵۶ء

فکاہیہ

نکتہ چیں

سید محمد جعفری

صبح سے شام تک نکتہ چینی کرتا ہوں، قینچی کی طرح زبان چلتی ہے، بحث اور مناظرہ کا بادشاہ ہوں، بلکہ شہنشاہ۔ نکتہ چینی کے میدان میں بڑے بڑے رستمِ زماں مقابلے میں آئے اور خون تھوک گئے، بڑے بڑے بولنے والوں کے ناطقے بند کر دیئے، انسان کے عیب پر، چیزوں کے نقص پر، معاملات کی خرابی پر، کاموں کی خامیوں پر جتنی جلد میری نظر جاتی ہے شاید ہی کسی کی نظر جاتی ہوگی۔ خدا کے فضل سے کبھی کوئی روشن پہلو نہیں دیکھا، جب نظر آیا عیب ہی نظر آیا، دیکھ جب بھی ڈالی بُری نظر ڈالی۔ ایسا ذہن رسا پایا ہے کہ کبھی دھوکا نہیں کھایا ہے۔ پہلی نظر میں تول لیتا ہوں بقول مرزا غالب ؎

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

اک کھیل ہے اورنگِ سلیماں مرے نزدیک اک بات ہے اعجازِ مسیحا مرے آگے

اور مرزا غالب کی بھی کیا حقیقت ہے۔ وہ تو کہئے ایک آدھ صدی پہلے انتقال فرما گئے۔ میرے زمانے میں ہوتے، میرے ہم عصر ہوتے اور یہاں کراچی میں کلفٹن پر ٹہلتے ہوئے مل جاتے۔ تو وہ نکتہ چینی کرتا، وہ نکتہ چینی کرتا کہ مرزا حیران ہو کر بے ساختہ میرے لئے کہتے کہ "ناطقہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہئے" مرزا کے کلام پر وہ نکتہ چینی کرتا کہ مرزا شعر گوئی سے توبہ کر لیتے۔ "غمِ روزگار" اور "غمِ دل" کا نام نہ لیتے اور جہاں یہ ذکر آتا گھبرا کر کہتے کہ ؎

نکتہ چیں ہے غمِ دل اس کو سنائے نہ بنے

کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے

اور مرزا غالب پر کیا منحصر ہے، صبح سے شام تک نکتہ چینی کرتا ہوں، زبان کی تلوار سے معلوم نہیں کتنے اپنے فن کا، روں کو موت کے گھاٹ اتار چکا ہوں کہ جو زندہ رہتے تو موسیقی و مصوری و شاعری کے آسمان پر آفتاب و ماہتاب بن کر چمکتے۔ سالہا سال سے، صبح سے شام تک نکتہ چینی کرتا ہوں۔ اب حسن و خوبی و رعنائی کی بہاروں سے لطف حاصل کرنے کی قوتیں اور صلاحیتیں کھو چکا ہوں۔ میں خزاں کا پیغمبر ہوں، بربادی و خرابی دیکھ کر خوش ہو جاتا ہوں اور جہاں کوئی اچھی چیز نظر آئی میں نے ناک بھوں چڑھائی۔ مدتیں ہو چکیں کہ ہمدردی کا جذبہ میرے دل و دماغ سے رخصت ہو چکا، آدمی کی حقیقت میری نظر میں کچھ بھی نہیں ؎

مزے جہان کے اپنی نظر میں خاک نہیں

سوائے خونِ جگر، سو جگر میں خاک نہیں

نہ مجھے کسی سے ہمدردی ہے نہ کسی کو مجھ سے ہمدردی ہے۔ لوگ اپنے معاملات مجھ سے چھپاتے ہیں، رشتے دار اور عزیز مجھ سے کتراتے ہیں، دوست اپنے حالات مجھے نہیں سناتے ہیں، ان کا خیال ہے کہ نکتہ چینی کروں گا، بنا بنایا کام بگڑ جائیگا، غضب ہو جائے گا، لیکن واقعہ یہ ہے کہ میں نکتہ چینی اُن کے بھلے کے لئے کرتا ہوں۔ اللہ نے مجھے یہ کمال عطا کیا ہے، یہ صلاحیت اور یہ استعداد بخشی ہے کہ ایک نظر میں دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کر کے دکھا دوں۔ جب مجھے خدا نے یہ نکتہ چینی کی نعمت دی ہے تو اسے خلقِ خدا کے فائدے کے لئے کیوں نہ کام میں لاؤں۔ اب یہ میری قسمت ہے کہ میں لوگوں کی خدمت کرتا ہوں اور لوگ مجھ سے نفرت کرتے ہیں، یہاں نکتہ چینی کی بدولت ساری دنیا میں اکیلا ہوں، دنیا والے حسد کرتے ہیں، مجھ سے جلتے ہیں کہ یہ اتنا بڑا نکتہ چیں کیوں ہے۔ کوئی میرے پاس پھٹکتا بھی نہیں، میں تنہا ہوں، بالکل تنہا۔

میری سمجھ میں ایک بات نہیں آتی۔ جو لوگ میری نکتہ چینی کے تختۂ مشق رہ چکے ہیں، جو لوگ میری زبان کی تلوار سے گھائل ہو چکے ہیں، وہ مجھ سے بیزار ہو کر دور دور رہتے ہیں تو انہیں اس بات کا حق ہے، اور وہ بالکل ٹھیک کرتے ہیں، لیکن اب تو اُن لوگوں نے بھی ملنا ترک کر دیا ہے جن پر میں نے ابھی تک وار نہیں کیا ہے، جن پر اپنے نکتہ چینی کے ہنر کو میں نے ابھی تک نہیں آزمایا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اب میری شہرت مجھ سے آگے آگے چلتی ہے۔ یہ میری نکتہ چینی کی شہرت ان مقامات پر جا پہنچی ہے جہاں میں ابھی تک نہیں پہنچ سکا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اب شکار بڑی مشکل سے ہاتھ آتا ہے۔ کم از کم اس شہر کے لوگ تو خوب چوکنے

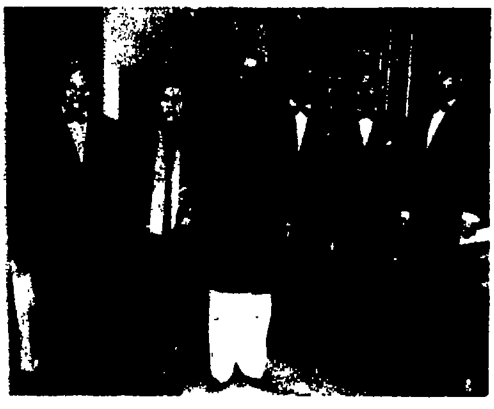
پاکستان میں

پاکستان کی چھٹی تاریخی کانفرنس میں گورنر جنرل صاحب کی تقریر

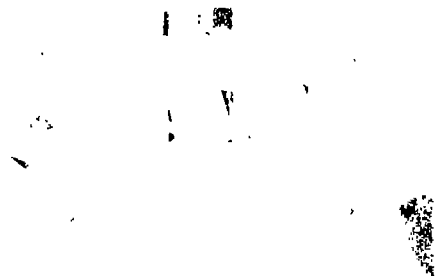




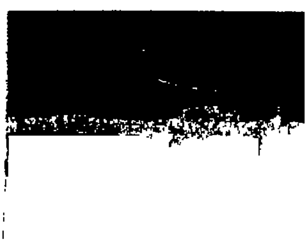
وزیر قانون، اسلامی جمہوریہ پاکستان کا مسودہ دستور پیش کر رہے ہیں

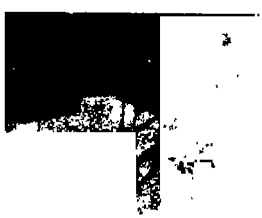


جمہوریہ چین کی نائب صدر مادام سونگ چنگ لنگ کراچی تشریف لائیں



میں جرمن ریڈنگ روم کی
ح ۔ عزت مآب سید امجد علی،
وزیر مالیات کی تقریر





زیل پاک سیمنٹ فیکٹری
حیدرآباد کا افتتاح

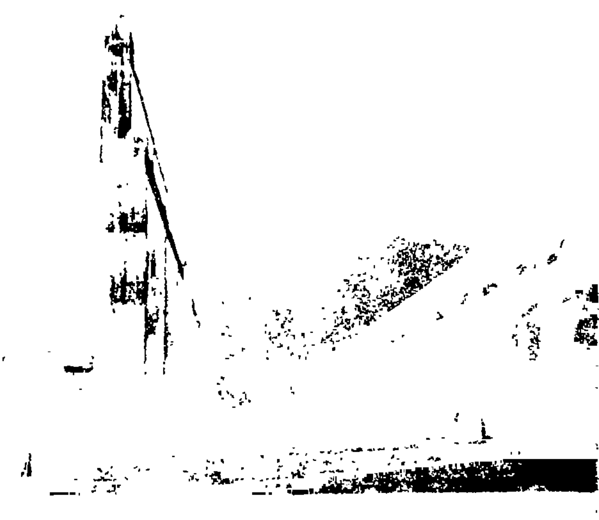
پاکستان شاہراہ ترقی پر

(کراچی میں جہاز سازی کے جدید
کارخانے کا قیام)

تکمیل شدہ ورکشاپ کا ایک حصہ

کارخانہ کا عمومی منظر
اور ایک عظیم‌الجثہ کرین

کارخانہ میں کام شروع ہوچکا ہے لیکن مزید توسیع کی جارہی ہے



ہو گئے ہیں۔ کوئی بھولا بھٹکا مسافر باہر سے آجائے تو لاعلمی میں پھنس جاتا ہے۔ میں صبح سے شام تک نکتہ چینی کرتا ہوں اور جب تک جی بھر کے نکتہ چینی نہ کر لوں کھانا ہضم نہیں ہوتا اور صحت خراب ہو جاتی ہے۔ اس لئے میں نے نکتہ چینی کے متعدد اسلوب ایجاد کر لئے ہیں۔ مجھے اس سے کوئی مطلب نہیں ہے کہ جو بات میں کہہ رہا ہوں وہ صحیح ہے یا غلط، مجھے صرف نکتہ چینی کرنے کی ضرورت ہے۔ ہر شخص اور ہر چیز پر نکتہ چینی کرنے کا ایک فارمولا یا ایک نسخہ ہے۔ جیسا آدمی ہوگا ویسا ہی فارمولا یا نسخۂ نکتہ چینی استعمال ہوگا۔ کوئی تاجر ہوگا تو اس کے لئے کہوں گا چور بازاری کرتا ہے، اپنے بھائیوں کا خون چوستا ہے، سماج دشمن عناصر میں سے ہے، اسے روپیہ سے الفت ہے، روپیہ ہی اس کا دین ایمان ہے۔ کوئی وکیل ہوگا تو کہوں گا کہ یہ غریبوں میں مقدمہ بازی کی آگ بھڑکا کر خود ہاتھ سینکتا ہے، اپنی وکالت چمکانے کے لئے اس نے خاندانوں کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ کوئی سرکاری ملازم ہے تو کہتا ہوں کہ رشوت لیتا ہے، دوزخ میں جلے گا، خویش پروری کرتا ہے، اس کا انجام برا ہوگا۔ کبھی صوبائی تعصب کا الزام لگا کر اسے بدنام کرتا ہوں، کبھی یہ کہتا ہوں کہ سفارش سے ملازم ہو گیا ہے، اپنے افسروں کی خوشامد کر کے اپنا الو سیدھا کرتا ہے، ورنہ کام سے بالکل ناواقف ہے۔ کوئی ڈاکٹر ہو تو کہتا ہوں کہ آدمیوں کی جانوں سے کھیلتا ہے، فیس کی شکل میں مریض کا خون چوس لیتا ہے، جس کی موت کی گھڑی نزدیک ہو وہ تو اس کے ہاتھ سے بچ کر نکل بھاگتا ہے، ورنہ شہر کے قبرستان اسی ڈاکٹر نے آباد کئے ہیں۔

میں نے یہ کبھی نہیں سوچا کہ ایک تاجر، ایک وکیل، ایک سرکاری ملازم، ایک ڈاکٹر شریف اور ایماندار بھی ہو سکتا ہے یعنی یہ کبھی نہیں سوچا کہ ہر طبقہ کے لوگوں میں اچھے آدمیوں کی تعداد بہت کافی ہوتی ہے، ورنہ عالم کا انتظام ایک دن نہ چل سکے۔

نکتہ چینی کرنے کیلئے بڑی سوجھ بوجھ، بڑی احتیاط اور بڑے سلیقہ کی ضرورت ہے۔ مثال کے طور پر اگر نکتہ چیں غلط فارمولا یا نسخہ استعمال کرے تب بھی بات بگڑ جاتی ہے، اگر کسی وکیل کے لئے کہہ جائے کہ مریض کا خون چوس لیتا ہے یا اسکول کے طالب علم کے لئے کہا جائے کہ مقدمہ بازی کی آگ بھڑکاتا ہے یا تاجر کے لئے کہا جائے کہ سفارش سے ملازم ہو گیا ہے تو کون یقین کرے گا۔ تیر ہرگز نشانے پر نہیں بیٹھے گا۔ اس لئے نکتہ چیں کو ایک شاطر شکاری کی طرح جال بچھانا پڑتا ہے۔ اگر وار اوچھا پڑے تو شکار زخمی ہو کر بھاگ جاتا ہے اور پھر اس وقت تک ہاتھ نہیں آتا جب تک کہ اس کا حافظہ بالکل

خراب نہ ہو جائے یا نکل ہی بے وقوف نہ ہو۔ اسی لئے تو کہا گیا ہے کہ ع

عیب بھی کرنے کو ہنر چاہیئے

میں صبح سے شام تک نکتہ چینی کرتا ہوں۔ مجھے بڑی مشق ہے، میں نے بڑے بڑے ببر شیروں کو مار گرایا ہے، لیکن بعض اناڑی نکتہ چینوں کی وجہ سے اس شہر میں شکار آسانی سے نہیں ملتا۔ لوگ آسانی سے ہاتھ نہیں لگتے، پاس پھٹکنے نہیں دیتے۔ دور سے ہی مجھے آتا دیکھ کر راہِ فرار اختیار کر لیتے ہیں۔ مجھے "بور" کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ ایک شاعر نے تو میری تعریف میں ایک قصیدہ کہہ ڈالا ہے۔ اس قصیدے میں مجھے "بور" کے نام سے مخاطب کر کے یوں کہا گیا ہے کہ ؎

تو مرا دوست نہ اور دوست سے چلتا نہیں نقد
میری تقدیر کی گردش نے بنایا تجھے "بور"
"وقت" کہتے ہیں جسے لوگ کہ سرمایہ ہے"
کتنی افراط سے حصے میں ترے آیا ہے
دور سے دیکھ کے انساں تجھے گھبراتے ہیں
شاہ رہ چھوڑ کے گلیوں میں نکل جاتے ہیں
نکتہ چینی سے تری بھاگتے ہیں خورد و کلاں
تو جو چاہے تو کراچی میں بھی خالی ہوں مکاں

دیکھا آپ نے اب یہ صورت حالات ہو گئی ہے۔ اب کوئی فرد بشر ہاتھ نہیں آتا۔ اس لئے میں نے یہ طریقہ نکالا ہے کہ حکومت پر نکتہ چینی کرتا ہوں۔ حکومت پر نکتہ چینی کرنے کے لئے کوئی زیادہ دشواری نہیں ہوتی۔ بہت سے فارمولے استعمال ہو چکے ہیں، مثلاً اگر اب کے سال سردی کی لہر آئی تو میں کہوں گا کہ یہ حکومت اور حکام کی سرد مہری کی وجہ سے آئی ہے، یہ باہر کے ملکوں سے جاڑا منگوا لیتے ہیں اور عوام کا خیال نہیں کرتے اور اگر بفرضِ محال انہوں نے جاڑا نہیں منگوایا اور وہ بغیر ویزا کے چلا آیا ہے تو یہ سرحد پر بیٹھے بیٹھے مکھیاں مار رہے تھے۔ اس نکتہ چینی میں تمام سابق سزا یافتہ لوگ، وہ لوگ جو کسی الیکشن میں ہار چکے ہیں یا وہ لوگ جو نام و نمود کے خواہشمند ہیں یا کسی ٹھیکے کے حاصل کرنے میں ناکام رہے یا جن پر کام نہ کرنے کی وجہ سے اُن کے افسر نے سختی کی ہے سب لوگ میرے ہم آواز ہو جائیں گے۔

یہ ایک خاص فن ہے، اس کو نکتہ چینی برائے نکتہ چینی کہتے ہیں۔ اس سے قوم اور ملک کو بہت فائدہ پہنچتا ہے۔ حکام اس کی وجہ سے بہرے ہو جاتے ہیں، پھر وہ سچی بات بھی نہیں سنتے۔ اس سے دنیا اور عاقبت دونوں سنورتی ہیں، اللہ مجھے معاف کرے میرا انجام کیا ہوگا۔ (بشکریہ ریڈیو پاکستان کراچی)

لاہور کا عجائب گھر

ملک شمس

لاہور کا عجائب گھر پاکستان بھر میں سب سے قدیم اور عظیم عجائب گھر ہے۔ اس کا آغاز [illegible] میں ایک صنعتی نمائش (پنجاب ایگزیبیشن) سے ہوا جو اس عمارت میں منعقد کی گئی تھی، جہاں آج کل گوشت سبزی کی مارکیٹ ہے۔ اس نمائش کا مقصد پنجاب کی صناعی اور ہنرمندی کے اعلیٰ اور رنگین نمونے پیش کرنا تھا۔ نمائش کے اختتام پر دستکاریوں کے چیدہ چیدہ نمونے مستقل نمائش کے لئے رکھ لئے گئے۔ اس طرح موجودہ مارکیٹ میں لاہور کے عجائب خانے کی داغ بیل ڈالی گئی۔ پھر صناعی کے نمونوں کے علاوہ قدیم مجسمے، پہلے وقتوں کے سکے اور دیگر پرانی اشیاء بھی فراہم ہونے لگیں، حتیٰ کہ تیس سال کے عرصے میں جدید و قدیم اشیاء کا اس قدر وسیع ذخیرہ ہو گیا کہ کسی دوسری عمارت کی ضرورت لاحق ہوئی۔ لہٰذا ۱۸۹۰ء میں لاہور عجائب گھر کی موجودہ عمارت کی بنیاد اس چندے سے رکھی گئی جو ملکہ وکٹوریہ کی گولڈن جوبلی کے سلسلے میں فراہم کیا گیا تھا۔

تکمیلِ عمارت پر عجائب گھر کی اشیاء اپنی اس وقت کی عمارت میں منتقل ہوئیں اور اس کے ذخیروں میں برابر اضافہ ہوتا چلا گیا۔ پہلی جنگ عظیم کے اختتام پر لاہور عجائب گھر کے ذخیرے اور نوادرات شعبہ جات پر مشتمل ہے: صنعت و حرفت کے نمونے، ازمنہ قدیم کے آثار، پرانے سکے، پتھروں، اور معدنی اشیاء کے نمونے، اسلحہ، فنِ مصوری اور نقش نگاری کے نمونے، مسودات، محکمہ جنگلات، محکمہ زراعت اور محکمہ اصلاح دیہات سے متعلق اشیاء اور ماڈل، نباتی نمونے اور مردہ حیوانات کا ذخیرہ، کتبات وغیرہ۔ لیکن آہستہ آہستہ لاہور عجائب گھر کا دائرہ محدود کیا جاتا رہا اور یکے بعد دیگرے کئی شعبے یہاں سے ہٹا دیئے گئے۔ مثلاً مردہ حیوانات کا شعبہ یہاں سے گورنمنٹ کالج لاہور منتقل کیا گیا۔ یہاں اس کا ایک الگ عجائب خانہ قائم ہوا۔ اب لاہور کا عجائب گھر صرف فنونِ لطیفہ اور آثارِ قدیمہ تک محدود کر دیا گیا ہے تاکہ یہ ایسے مخصوص شعبوں سے متعلقہ اشیاء کو فراہم اور محفوظ کرے اور ان سے متعلقہ علم کی تحقیق اور نشر و اشاعت کرے، چنانچہ لاہور کا عجائب خانہ پاکستان میں اپنی نوعیت کا سب سے عظیم ادارہ ہے، جس کی چہار دیواری کے اندر مختلف قوموں، اور زمانوں کی تہذیبوں اور ثقافتوں کے عروج و زوال کی داستانیں ہماری بصارت و بصیرت کو دعوت دیتی ہیں۔

اس عجائب گھر میں انسانی تہذیب کے کہنہ ترین نشانات ہزارہا برس پہلے کے پتھر کے ہتھیار ہیں، جنہیں حضرت انسان کی اولین صنعت کہا جا سکتا ہے۔ پتھر کے ان ترشے، بگڑے اور گھسے ہوئے مدور اور نوکدار شگروں میں ہمارے ازمنۂ قبل تاریخ کے مورثوں کی داستان کے وہ ابواب مضمر ہیں، جنہیں قدیم و جدید حجری زمانوں سے موسوم کیا جاتا ہے۔ آج سے کوئی پانچ چھ ہزار سال قبل انسان نے بڑی بڑی اہم ایجادات کیں، جن کی بدولت ہم تہذیب کے بام بلند پر پہنچے ہیں۔ اسی نوع کی ایک پانچ ہزار سالہ کہنہ تہذیب کے آثار موئن جو دڑو واقع سندھ اور ہڑپہ، پنجاب سے بے نقاب ہوئے ہیں، جو ہمارے عجائب گھر کی ایک چھوٹی سی گیلری میں پڑے زبانِ حال سے ہمیں اپنے وارثوں کے معاشرے، ان کے مذہب، ان کی صنعت و حرفت ان کے علوم و فنون اور افکار کا پتہ دیتے ہیں۔

موئن جو دڑو اور ہڑپہ کے آثار جس تمدن کے مظہر ہیں، وہ وادیٔ سندھ کی تہذیب کہلاتی ہے۔ یہ اپنے عروج کے زمانے میں تمام مغربی پاکستان میں اور اس سے پرے بہار اقصیٰ تک پھیلی ہوئی تھی۔ وادیٔ سندھ کی تہذیب کے حامل تانبہ اور ٹین ملا کر کانسی کے ہتھیار اور ظروف بناتے

تھے۔ وہ سونے چاندی کے زیورات بناتے اور انہیں دور دراز ممالک سے تجارت کے ذریعہ حاصل شدہ جواہرات سے مرصع کرتے، ان کی خوراک کاشت سے حاصل کئے ہوئے گیہوں پر بھی مشتمل تھی۔ وہ مچھلی کا شکار کانٹے سے کرتے تھے۔ دنیا میں سب سے پہلے کپاس بونے اور اسے کات کر سوتی کپڑا بننے کا سہرا انہی کے سر ہے۔ دو پہیوں والی گاڑی کا استعمال بھی ان کے ہاں تھا۔ وہ مجسمہ سازی کے فن کو بھی جانتے تھے ظروف کو نقش و نگار سے آراستہ کرتے تھے فطرت کی دیوی یعنی ماتا دیوی کی پوجا کرتے تھے۔ ان کے یہاں فن تحریر بھی تھا، جو تصویروں کے ذریعہ اظہار مطلب اور حروف تہجی کے بین بین تھا، مگر ان کی تحریروں کو، جو یقیناً بیش قیمت معلومات کی حامل ہیں، ابھی تک پڑھا نہیں جا سکا۔ ان کے رہائشی مکانوں اور مذہبی تعمیرات، شہروں کی فراخ اور سیدھی سڑکوں اور چوکوں اور شہری صفائی کے انتظامات سے ہر کوئی حیرت زدہ ہوتا ہے۔ لیکن اس بات پر بہت تعجب ہوتا ہے کہ ان کے پالتو جانوروں میں گھوڑے کا نشان نہیں ملتا اور نہ وہ لوہے جیسی دھات ہی سے آشنا تھے۔

مغربی پاکستان کی یہ عظیم الشان تہذیب آریا حملہ آوروں کے ہاتھوں کوئی ۱۵۰۰ ق۔م کے لگ بھگ تہ و بالا ہوئی، مگر ساتھ ہی اس تہذیب نے آریاؤں کی طرز معاشرت اور ان کے مذہبی تصورات پر گہرا اثر ڈالا۔ عجائب گھر لاہور کے گندھاری بت بےحد تاریخی، فنی اور ثقافتی اہمیت رکھتے ہیں۔ انہیں گوتم بدھ کے پیروکار پہلی صدی قبل مسیح سے شروع ہو کر چوتھی صدی قبل مسیح تک تراشتے رہے۔ ان مجسموں کا مسکن وہ علاقہ ہے جسے ویدوں کے زمانے سے گندھارا کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا اور جو وسط افغانستان سے لے کر راولپنڈی کے قرب و جوار تک پھیلا ہوا تھا۔ اس علاقائی نسبت کی وجہ سے ان کو گندھارا کے بت کہا جاتا ہے۔

گندھارا کے بت بیشتر گوتم بدھ کی زندگی سے متعلق ہیں جن میں تقریباً اس کی زندگی کے تمام واقعات تراشے گئے ہیں۔ ان بتوں کے عروج کا زمانہ کشان شہنشاہوں کا دور تھا۔ بالخصوص شہنشاہ کنشک کا زمانہ۔ گندھارا کے صنم سازوں نے ہی سب سے پہلے گوتم کی وفات کے کوئی پانچ سو سال بعد اس کی مورتی تراشنے کی جرأت کی۔ گندھارا کے بت بدھ مت کے اندر ایک عظیم انقلاب کے مظہر ہیں۔ جبکہ ہنایان فرقہ وجود میں آیا۔ گندھارا کی بت طرازی کی ایک نمایاں خصوصیت یونانی رومی عناصر ہیں۔ یہ ان اثرات کو ظاہر کرتے ہیں جن کا تعلق یونان کی ہیلنی دور کی تہذیب سے ہے یعنی وہ تہذیب جو اسکندر اعظم کی مشرقی فتوحات کے بعد اس کے جانشینوں کے عہد میں ظہور پذیر ہوئی۔

گندھارا کے بتوں میں ہیلنی اثرات ایشیائے کوچک اور شام کے رومی علاقوں سے کوشانوں کے عہد میں آئے جن کا رومیوں سے گہرا تجارتی تعلق اور ثقافتی رشتہ تھا اور جو رومی ہیلنی تہذیب و ثقافت کے علمبردار تھے۔ چنانچہ گندھارا کے بتوں میں یونانی تناسب اعضاء اور یونانی نقوش جا بجا نظر آتے ہیں۔ کہیں بدھ کے روپ میں اپالو کے خدوخال ہیں، کہیں رعد کا دیوتا زیس گوتم کے پیچھے پیچھے جا رہا ہے کہیں محبت کا دیوتا ایروس سامنے آ کھڑا ہوتا ہے، کہیں مشہور یونانی دیوی منروا جلوہ گر ہے۔ کہیں ایٹلس دنیا کو سر پر اٹھائے کھڑا ہے کہیں بیکس کی میخواری کا منظر پیش کیا گیا ہے۔ بہ حیثیت مجموعی جمالیاتی اعتبار سے گندھارا کی مورتیوں کا مقام اتنا زیادہ بلند نہیں، مگر ان کی تاریخی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ تبت، چین، منگولیا، کوریا، ترکستان اور جاپان تک بدھ دھرم گندھارا ہی کے راستے اور ذریعہ سے پھیلا، چنانچہ گندھارا کے آرٹ نے بھی مشرق بعید کے ایشیا کے بودھی آرٹ پر اثر ڈالا۔

قطع نظر فن کے، گندھارا کی مورتیاں اس چند سو سالہ بودھی تمدن کی بھی آئینہ دار ہیں، جن کا امتزاج متعدد ملکی و غیر ملکی عناصر سے ہوا اور جو بالآخر پانچویں صدی عیسوی میں ہن وحشی قوموں کے ہاتھوں تباہ ہوئی۔

لاہور کے عجائب گھر میں کچھ مورتیاں عہد گپت کی بھی ہیں جو قرون وسطیٰ کی ہندو ثقافت کا زریں زمانہ کہلاتا ہے۔ ان میں سے ایک عورت کا دھڑ گپتا آرٹ کا بلند ترین شاہکار ہے، جس میں نسوانی اعضاء کا تناسب مثالی طور پر حسین ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ کاریگر کے نسوانی حسن و جمال کے تخیل کو پتھر کی ایک مورتی میں ہمیشہ کے لئے منتقل کر دیا گیا ہے۔

لاہور کے عجائب گھر کا ایک مایۂ ناز ذخیرہ سکہ جات ہیں۔ ان میں باختری، یونانی، سیتھین، پارتھوی اور کوشان فرمانرواؤں کے سکوں کو ممتاز درجہ حاصل ہے۔ اگر یہ سکے نہ ملتے تو شمال مغربی پاکستان کی تاریخ کا

ایک اہم قدیم باب، جو تقریباً دو سو سالوں پر مشتمل ہے، ناپید ہو جاتا۔ ان سکوں ہی کے مطالعہ سے سکندر اعظم کے اُن یونانی جانشینوں کی تاریخ کو مرتب کیا گیا ہے جو موریا سلطنت کے زوال پذیر ہونے پر باختر سے اٹھ کر شمال مغربی پاکستان پر حملہ آور ہوئے اور جن کی بدولت اس خطے میں عرصۂ دراز تک ہیلنی آرٹ اور تمدن کا دور دورہ رہا۔ باختریوں کے یہ سکے آرٹ کے بھی بلند پایہ نمونے ہیں، جنہیں دیکھ کر یہ کہنا پڑتا ہے کہ شاید دنیا میں اس سے پیشتر اور اس کے بعد اتنے حسین سکے معرض وجود میں نہیں آئے گئے۔ ان سکوں کے ذریعہ ہماری تاریخ کا ایک اور اہم عقدہ بھی حل ہوا ہے۔ انہی کی رو سے خروشتی زبان، جو مردہ ہو چکی تھی، پڑھی گئی ہے اور اس سے ہمیں قیمتی تاریخی معلومات حاصل ہوئی ہیں۔ سلاطین غزنہ دہلی کے سکوں کا بھی ایک بے نظیر مجموعہ ہے، جس کے مطالعہ سے اس دور کی اسلامی تاریخ پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ مغل شہنشاہوں کے سکے بھی ایک لاثانی مجموعے کی شکل میں فراہم ہیں۔ ان سے ہمیں بے شمار دلچسپ معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ پاک و ہند کی سات سو سالہ اسلامی تاریخ کا مطالعہ کرنے کے لئے لاہور عجائب گھر کے ان سکوں سے کافی مدد ملتی ہے۔

اس عجائب گھر کے تصویر خانے کی زینت وہ حسین تصویریں ہیں جنہیں پہاڑی تصویریں کہنا چاہیئے۔ یہ تصویریں اٹھارویں صدی عیسوی میں کانگڑے کے چھوٹے چھوٹے راجپوت راجاؤں کی سرپرستی میں بنائی گئیں۔ اگرچہ یہ تصویریں مغل مصوری کے فنی تاثرات کا ہی نتیجہ ہیں۔ ان کی تکنیک مغل مصوری ہی کی تکنیک ہے، مگر ان کی روح مغل تصویروں سے جدا ہے، اور ان کے اسلوب کی جاذبیت الگ نوعیت رکھتی ہے۔ ان تصویروں میں ایک تغزل کا سا حسن ہے اور غنائی سی کشش ہے، ایک دلفریب رومانیت اور دلآویز ڈرامائیت! ان کی فضا اور ماحول افسانوی حسن و جمال کی دنیا میں ڈوبا ہوا ہے۔ ان پہاڑی تصویروں کا مقصد انسانوں کے حقیقی اور اصلی خدوخال کی نقش کشی نہیں، بلکہ جذبات نگاری ہے۔ یہ عشقیہ تصویریں ہیں جن کا محبوب ترین موضوع حسن و عشق کی رنگین داستانیں ہیں۔ ان میں وہی جذبات ہیں جو ماہیوں اور ڈھولوں میں ظاہر کئے جاتے ہیں۔ پیا سے جدائی، اس کا انتظار کرنا، اس سے ملنا اور روٹھنا اور منانا، غرض ان میں پریت کی وارداتوں کی نقش کشی ہے، جو یہ تصویریں اپنے دل لبھانے والے انداز میں کرتی ہیں۔ آئیے ذرا ایک تصویر پر بھی چلتی ہوئی نظر ڈالیں، جس میں اپنے محبوب سے بچھڑی ہوئی عورت کی دلی کیفیات کو مصورانہ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

ساون کا مہینہ ہے، پروا چل رہی ہے۔ یکایک آسمان پر گھنگھور گھٹائیں چھا گئیں اور بوندا باندی شروع ہو گئی۔ اور مور نے شور مچانا شروع کر دیا، بادل بھی گرجنے لگے اور کالی کالی بدلیوں سے بجلی بھی چمکنے لگی۔ برکھا رت کی اس ولولہ انگیز فضا میں ایک پُرشباب لڑکی لب بام کھڑی اپنے پردیس گئے ہوئے پیتم کی راہ تک رہی ہے، جس کا خیال اس کے دل میں بے اختیار چٹکیاں لے رہا ہے۔

عجائب گھر کی یہ چند ایک جھلکیاں ظاہر کرتی ہیں کہ اس کے بوسیدہ پتھر اور ٹھیکریاں، اس کے شکستہ بت، اس کے بوسیدہ پتھر، اس کے پرانے دفینوں کے سکے اور اس کی تصویریں، تاریخ و تمدن کے وہ اوراق ہیں جن سے چشم بصیرت بہت کچھ پڑھ سکتی ہے۔ (بشکریہ ریڈیو پاکستان۔ لاہور)

پریوں کی وادی - کاغان: بقیہ صفحہ ۴۲

اپنی جان بھی دے دیتے ہیں۔ صوبہ سرحد کے مزارعین ایکٹ مجریہ ۱۹۵۰ء کے نفاذ سے ان گوجروں کی حالت اب بہت بہتر ہو گئی ہے۔ چنانچہ کئی گوجر اب زمینوں کے مالک ہو چکے ہیں اور ان میں احساس کمتری کا تباہ کن جذبہ کم ہوتا جا رہا ہے۔

سامان سفر: وادی کاغان جانے والوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے ہمراہ گرم کپڑے، کمبل، مضبوط قسم کے جوتے، گرم موزے، عمدہ گرم بستر، چھتریاں اور برساتیاں، ضروری دوائیں، سگرٹ، ڈبوں میں بند میوے، پنیر وغیرہ لے جائیں۔ ان کے علاوہ کھانا لے جانے کے برتن (ٹفن کیریئر) اور فلاسک بھی ضروری ہیں۔

ناران کے بغیر اس وادی کے باقی ہر پڑاؤ پر کھانے پینے کی چیزیں مثلاً آٹا، چینی، نمک اور سبزیوں کا ساتھ لے جانا ضروری ہے۔ گھی، مکھن، انڈے، مرغ اور تازہ دودھ وادی کے ہر حصے میں مل سکتا ہے، اس لئے ان اشیاء کا ساتھ لے جانا غیر ضروری ہے۔ کھانا پکانے کا بندوبست ہر پڑاؤ پر ریسٹ ہاؤس کے چوکیدار بخوبی کر سکتے ہیں۔

ناران میں ہوٹل اور کھانے پینے کی دکانیں موجود ہیں، اس لئے ناران میں ٹھہرنے والوں کے لئے ضروری نہیں کہ وہ کھانے پینے کی ضروری اشیاء مثلاً آٹا، چینی وغیرہ ساتھ رکھیں۔ البتہ تازہ پھل اور سبزیاں ساتھ لے جائی جائیں تو اچھا ہے کیونکہ تازہ پھل اور سبزیاں دیگر مقامات کے علاوہ ناران میں بھی نہیں ملتیں۔

سر سیّد کے قلمی کارنامے: —— بقیہ ص ۱۲

بقیہ ص ۱۲

گو زیادہ تر مذہبی، کتابیں ہیں جن کی مدد سے انہوں نے قرآن شریف کی تفسیر لکھی اور انجیل کی شرح۔ اس میں ایک دلچسپ کتاب سید محمود کا وہ مضمون بھی شامل ہے، جس پر ان کو کیمبرج یونیورسٹی سے انعام ملا تھا۔ ان کے گول کمرہ میں وہ ڈپلوما لگا ہوا ہے، جو ان کو فیلو آف دی رائل ایشیاٹک سوسائٹی بننے پر ملا تھا اور اس پر ان کو بہت فخر بھی ہے۔ دیوار پر سر جان اسٹریچی کی جو ان کے دوست بھی ہیں، ایک قد آدم تصویر آویزاں ہے۔ دوسری تصاویر سر سالار جنگ، لارڈ لٹن اور ہز ہائی نس نظام حیدرآباد کی آویزاں ہیں۔ ان کے دن خوشگواری سے گذرتے ہیں۔ ان کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں ان تھک طاقت ہے۔ علاوہ قومی اہمیت کے مسائل پر وسیع النظری کے ان میں کام کرنے کی ایک خاص طاقت ہے اور وہ یہ کہ کام کے متعلق وہ بڑی سے باریک تفصیل کو بھی نظر انداز نہیں کرتے۔ وہ صبح ۷ بجے اٹھتے ہیں۔ اس وقت وہ اپنے اخباری آرٹیکل لکھتے ہیں یا کتابوں اور پمفلٹوں کی تصانیف کرتے ہیں۔ پھر آنے والوں سے ملتے ہیں جن میں سرکاری اور غیر سرکاری لوگ شامل ہوتے ہیں اور ساتھ کالج کی کمیٹیوں کی معتمدی کے فرائض ادا کرتے ہیں، جو اکثر دن تک محدود نہیں رہتے ہیں بلکہ زیادہ تر رات گئے تک ان کا وقت لے لیتے ہیں۔ ان کا نظریہ یہ ہے کہ اعلیٰ درجہ کی دماغی محنت، اچھی صحت اور طولانی زندگی کی ضامن ہے۔ ان کا کھانا یورپین طرز پر ہوتا ہے اور کسی قسم کی نشہ آور مشروبات استعمال نہیں کرتے، بلکہ صرف پانی پیتے ہیں۔ رات کے کھانے پر یا کھانے کے بعد ان کے بعض احباب آجاتے ہیں اور زیر گفتگو مسائل "میٹافزکس"، مذہب و سیاست، فارسی شعر و شاعری اور لطائف و ظرائف ہوتے ہیں۔ وہ اوسط قد کے ہیں، مگر جسم گٹھا ہوا اور وزن ۱۹۔ اسٹون سے نکلتا ہوا۔ ان کا چہرہ شاندار ہے اور اس سے ان کا عزم اور قوت ارادی جھلکتی ہے، جب وہ آرام کرتے ہیں تو چہرہ پر سختی کے آثار نمودار ہو جاتے ہیں، لیکن جب وہ بات کرتے ہیں تو چہرہ پر دل کا جوش جھلکنے لگتا ہے، جو ان کی خصوصیت ہے۔ وہ قہقہہ بھی لگاتے ہیں

اور عام لوگوں کی طرح مذاق بھی پسند کرتے ہیں۔ بعض دفعہ کھانے کی میز کے نیچے اپنی لکڑی چھپا دیتے ہیں اور ایک دم سے سانپ! سانپ! پکار اٹھتے ہیں تاکہ لوگ گھبرا جائیں۔ اکثر اوقات اصلاح قوم ہی پر گفتگو کرتے ہیں۔ ان کے ایک دوست کو اونگھنے کی عادت ہے۔ وہ ان کو چھیڑتے ہیں، وہ دوست مقدر رہتے ہیں کہ وہ سب سن رہے ہیں مگر پھر اونگھنے لگتے ہیں، چنانچہ بسا اوقات ان کو چونکانے کے لئے ایک دم سے شہ دیتے ہیں، اور دوست قہقہہ مارتے ہیں۔ ان کی بیوی کو مرے ہوئے عرصہ ہوچکا ہے۔ بعض وقت آنکھ مار کر کہتے ہیں کہ میرا ارادہ پھر شادی کرنے کا ہے، مگر اب کے کسی انگریز عورت سے کروں گا تاکہ میں انگریز سوسائٹی میں زیادہ گھل مل سکوں۔ مگر شرط یہ ہے کہ وہ ۶۰ برس کی بوڑھی ہو اور اس کے دانت کوئی نہ ہوں۔ وہ ایک بیدار اچھی مقرر و خطیب ہیں۔ وہ جس وقت گرمجوشی سے تقریر کرتے ہیں تو ان کا طرز تقریر گلیڈ اسٹون جیسا ہو جاتا ہے۔ جذبات سے ان کے ہونٹ کانپنے لگتے ہیں اور آواز بھرا جاتی ہے اور بدن میں کپکپی محسوس ہوتی ہے۔ شدت جذبات کا یہ اظہار سننے والوں پر خاص اور فوری اثر کرتا ہے"

"ماہ نو" میں مضامین کی اشاعت کے متعلق شرائط

۱۔ "ماہ نو" میں شائع شدہ مضامین کا مناسب معاوضہ ادا کیا جائے گا۔

۲۔ مضامین بھیجتے وقت مضمون نگار صاحبان یہ بھی تحریر فرمائیں کہ مضمون غیر مطبوعہ ہے اور اشاعت کے لئے کسی اور رسالہ یا اخبار کو نہیں بھیجا گیا۔

۳۔ ترجمہ یا تلخیص کی صورت میں اصل مصنف کا نام اور دیگر حوالہ جات دینے ضروری ہیں۔

۴۔ ضروری نہیں کہ مضمون وصول ہوتے ہی شائع ہو جائے۔

۵۔ مضمون کے قابل اشاعت ہونے کے بارے میں ایڈیٹر کا فیصلہ قطعی ہوگا۔

۶۔ ایڈیٹر مسودات میں ترمیم کرنے کا مجاز ہوگا۔ مگر اصل خیال میں کوئی تبدیلی نہ ہوگی ÷

تشنگی ——— بقیہ صفحہ ۲۸

تم سے بہت بے تکلفی سے بات کرتے ہیں۔ کیا وجہ کہ انھوں نے مجھ سے بات کرنے کی کبھی جرأت نہیں اور جب مسز تکمیر نے آنکھوں میں آنسو بھر کر مجھ سے کہا کہ ان کے میاں ان کا پورے طور پر خیال نہیں رکھتے تو میں نے سوچا کہ اس کی وجہ تم ہو ——— لیکن ریحانہ خدا گواہ ہے۔ میں نے وہ ذلیل باتیں ہرگز نہیں کیں جو مجھ سے منسوب کی جاتی ہیں۔ دراصل یہ سب مسز حمید صغریٰ کی جو خواہ مخواہ مجھ سے خفا ہوگئی ہیں، شرارت ہے۔ خود ان کا ذہن ان باتوں کا موجب ہے۔

"بس آپا زاہدہ" ریحانہ نے جو نئے نئے انکشافات سے الجھ گئی تھی بات کاٹی "اب جانے دیجئے۔ بے تعلق اور غیر ذمہ دار لوگوں سے خفا ہونا بھی میں اپنی توہین سمجھتی ہوں۔ مجھے یقین تھا اور ہے کہ کوئی بھی شریف اور معقول عورت، اس قسم کی گری ہوئی ذلیل باتیں منہ سے نہیں نکال سکتی۔ مجھے آپ سے کوئی شکایت ہے نہ مسز حمید صغریٰ سے۔ بہت سے لوگوں کو قابلِ معافی سمجھنا چاہیئے۔"

"تو تم نے مجھے معاف کر دیا" آپا زاہدہ خوش ہوگئیں۔ آخر کار انھیں نے پورے طور پر ریحانہ کو بے وقوف بنا لیا، لیکن جب رات کو اپنے کمرہ میں اگر انھوں نے ریحانہ کی باتوں کو اپنے ذہن میں دہرایا، تو وہ اچانک چونک پڑیں۔ ریحانہ کا کیا مطلب تھا۔ اس نے یہ تو نہیں کہا تھا کہ "اسے یقین ہے کہ آپا زاہدہ نے اس کے خلاف کچھ نہیں کہا، بلکہ اس کے الفاظ تھے "۔ یقین ہے کہ کوئی بھی شریف اور معقول عورت اس قسم کی گری ہوئی باتیں نہیں کر سکتی ——— " تو کیا اس نے جملہ غیر مکمل چھوڑ دیا تھا؟ وہ کہنا چاہتی تھی "جیسی کہ آپ نے کی ہیں" وہ اتنی غیر ذمہ دار ہیں کہ ریحانہ سے خفا ہونا بھی اپنی توہین سمجھتی ہے؟ وہ انھیں اس لئے قابلِ معافی سمجھتی ہے کہ ان کی فطرت بدلی نہیں جا سکتی؟

آپا زاہدہ نے اپنے سر کو ہاتھوں پر تھامتے ہوئے گذرے ہوئے واقعات پر بے لاگ نظر ڈالی۔ ریحانہ کی کوئی حرکت بھی قابلِ گرفت نہ تھی کیا ریحانہ کی ہر دلعزیزی آپا زاہدہ کو ان کی محرومیوں کا احساس دلاتی رہی؟ کیا وہ محض احساس کمتری کی بنا پر اسے نیچے گرا کر اس کی جگہ لینا چاہتی تھیں؟ اور اب ہر ایک ان کی باتوں کو تمسخر آمیز انداز سے سنتا ہے اور ان کی طرف یوں دیکھتا ہے گویا کہہ رہا ہو "ہم تمہاری حماقتوں سے اچھی طرح واقف ہیں" اور ریحانہ بدستور مسکرایا کرتی ہے۔ اگرچہ اب اس کی مسکراہٹ پھیکی پڑ گئی ہے۔

"ذلیل!" آپا زاہدہ نے اچانک زور سے نہ جانے کسے مخاطب کیا اور اپنے چہرے کو تکیے میں چھپا لیا۔

کتاب منزل لاہور کی بلند پایہ مطبوعات

اُردو ادب کے آٹھ سال" مصنفہ عشرت رحمانی

ناول

ہمزاد — عابدی جعفر — چار روپے
محبت کے سوا — " — چار روپے
دیدۂ تر — " — چار روپے
بھیب سائے — " — چار روپے
ساحل سے پہلے — " — تین روپے آٹھ آنے
دیوار — " — تین روپے آٹھ آنے

سعیدہ مظہر ایم - اے
شیریں — تین روپے آٹھ آنے
نئی صبح — چار روپے
پل صراط — چار روپے

رئیس احمد جعفری
چنگاری — پانچ روپے
الناصر — پانچ روپے
حق و باطل — چار روپے آٹھ آنے
ٹھوکر — چار روپے آٹھ آنے
عورت — چار روپے آٹھ آنے
مجاہد — پانچ روپے
دل — چھ روپے
ایک مہاجر — چار روپے
درد — دو روپے آٹھ آنے

قیام پاکستان کے آٹھ سال میں ہمارے ادب نے کن کن رجحانات کو جنم دیا، ادیبوں اور مفکروں کے سوچنے کے انداز میں کون کون سی تبدیلیاں ہوئیں اور ہمارے ادب نے ارتقا کی کتنی منزلیں طے کیں ان تمام مسائل کا جواب "اردو ادب کے آٹھ سال" میں ملے گا۔

یہ آٹھ سال کے نثر، نظم، غزل، افسانے، ڈرامے یا تنقید وغیرہ کا نمائندہ انتخاب ہے۔ پاکستان کے ادبی ارتقا کی مکمل تاریخ ہے، جو حضرت عشرت رحمانی کی گراں قدر تحقیق کا نتیجہ ہے اور اس تحقیق میں حامد اللہ افسر میرٹھی، ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی، پرکاش پنڈت، شوکت تھانوی، مولانا عرشی رامپوری کا تعاون بھی شامل ہے۔

۴۰۰ صفحات سے زائد مجلد قیمت پندرہ روپے

کلیاتِ حسرت موہانی

اردو شاعری میں حسرت پہلے مجتہد ہیں، جنہوں نے شاعری کو ایسی زبان دی، جو بلا تکلف جذباتی اظہار کا ذریعہ بنی اور اس کے سنیاں اور ترجیلے پن کا وہ روپ نکھرا، جو ساری اردو شاعری میں ناپید تھی لیکن حسرت کے کلام کا شیرازہ کچھ اتنا بکھرا ہوا تھا کہ ان کے کلام کے شائقین کو یکجا اور مکمل صورت میں اتنا مواد دستیاب نہ ہوتا تھا جس سے ان کی سیری ممکن ہوتی - اس ضرورت کے پیش نظر یہ مکمل مجموعۂ کلیات جو ۱۹۰۳ء سے لے کر حسرت کی وفات تک کی ساری غزلوں پر مشتمل ہے شائع کیا گیا ہے۔ یہ غزلیں ترتیب وار بارہ دواوین میں درج ہیں کلیات کے شروع میں حضرت عشرت رحمانی کا مبسوط اور جامع دیباچہ بھی شامل ہے جس سے کلیات کی افادیت میں اور زیادہ قوت آگئی ہے۔ طباعت اور گیٹ اپ حسرت کے کلام کے شایانِ شان ہے۔

سائز ۲۰×۲۶/۱۷ ضخامت ۴۱۲ صفحات قیمت پانچ روپے

(فہرست مطبوعات طلب کرنے پر مفت ارسال کی جاتی ہے)

ناول

عشرت رحمانی
ہنگامہ — پانچ روپے
بنی احمر کا خواب — تین روپے

رشید اختر ندوی
پندرہ اگست — دو روپے چار آنے
ایک پہیلی — دو روپے
کانٹوں کی سیج — دو روپے
اس نے محبت کی — تین روپے
یہ جہاں اور ہے — چار روپے
گل رخ — ایک روپیہ بارہ آنے

کمال احمد زیدی
وادی — تین روپے
نئے چراغ — دو روپے آٹھ آنے

افسانے

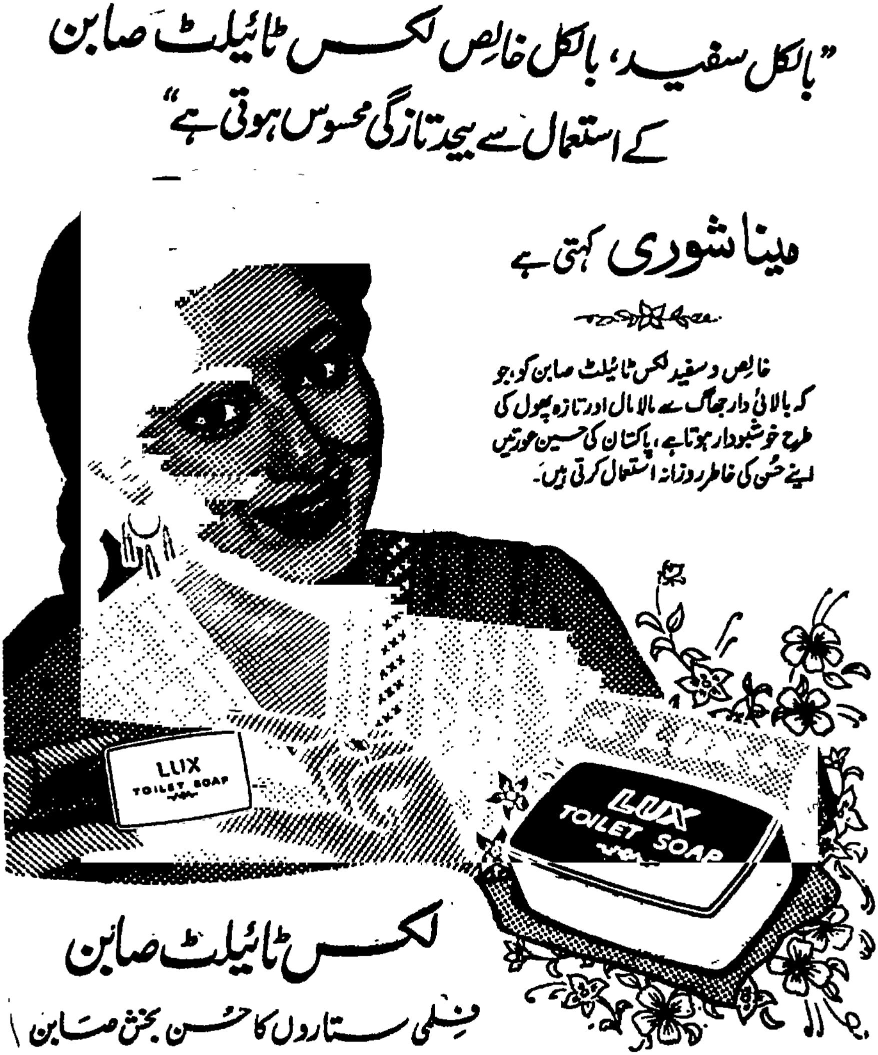
ڈاکٹر عندلیب شادانی
نوش و نیش — تین روپے آٹھ آنے
جھوٹا خدا — دو روپے چار آنے

ابراہیم جلیس
زمین جاگ رہی ہے — دو روپے چار آنے

عبد القدیر رشک
سنگم و سائے — ایک روپیہ بارہ آنے

(فہرست مطبوعات طلب کرنے پر مفت ارسال کی جاتی ہے۔)

شیخ غلام علی اینڈ سنز، ناشران و تاجران کتب، کتاب منزل، کشمیری بازار، لاہور


"بالکل سفید، بالکل خالص لکس ٹائیلٹ صابن
کے استعمال سے بیحد تازگی محسوس ہوتی ہے"
مینا شوری کہتی ہے
خالص و سفید لکس ٹائیلٹ صابن کو، جو کہ بالائی دار جھاگ سے مالا مال اور تازہ پھول کی طرح خوشبودار ہوتا ہے، پاکستان کی حسین عورتیں اپنے حسن کی خاطر روزانہ استعمال کرتی ہیں۔
LUX
TOILET SOAP
LUX
TOILET SOAP
لکس ٹائیلٹ صابن
فلمی ستاروں کا حسن بخش صابن
LTS.3—193UD


تندرست و توانا
ڈالڈا سے پکے ہوئے
کھانے کی بدولت
بالکل ان ہنس مکھ ماں کی طرح ان کے سب گھر والے
نہایت ہی تندرست و توانا ہیں محض اسلئے
کہ یہ اپنے گھر میں کھانا پکانے کیلئے قوت بخش ڈالڈا
وناسپتی استعمال کرتی ہیں۔ ڈالڈا سربمہر ولبند
ڈبہ میں بالکل خالص اور بیحد صحت بخش
ملتا ہے۔ اس سے کھانے کی لذت
بھی بڑھ جاتی ہے۔ آج ہی ڈالڈا برانڈ
وناسپتی خریدیئے
DALDA
VANASPATI
ڈالڈا
وناسپتی
لفظ ڈالڈا
رجسٹرڈ
ٹریڈ مارک ہے
ڈالڈا بہتر کھانے کو بہترین بناتا ہے۔

"پاکستان"

(۱۹۵۴-۵۵ء)

ایک مختصر جائزہ

"ادارۂ مطبوعات پاکستان" نے یہ مصور کتابچہ پاکستان کے آٹھویں جشن استقلال کی تقریب پر شائع کیا تھا - اس میں ملک کی ہر جہتی رفتار ترقی کا ایک سیر حاصل جائزہ پیش کیا گیا ہے- ضروری اعداد و شمار، حقائق و کوائف کو مناسب موضوعات کے تحت یکجا کردیا گیا ہے، تاکہ مختلف ملکی سرگرمیوں، اقتصادی تفصیلات، صنعتی و تجارتی کوائف، تجارتی و معاشی مسائل اور نظم و نسق کے مختلف شعبوں کی کارگزاریوں کا جامع مرقع سامنے آجائے تحریر میں اختصار بیان ملحوظ رکھا گیا ہے-

متن ۶۰ صفحات - ۱۶ صفحات کی تصاویر، جن میں ملک کی خاص خاص ترقیات کے نظر افروز مناظر ہیں -

دیدہ زیب سرورق—————قیمت صرف آٹھ آنے

ادارہ مطبوعات "پاکستان" - کراچی



ادارۂ مطبوعات پاکستان - پوسٹ بکس نمبر ۱۸۳، کراچی نے شائع کیا - مطبوعہ ناظر پرنٹنگ پریس، میکلوڈ روڈ - کراچی
مدیر:- رفیق خاور